سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
اقبال

ہندستانی ادب

سعادت ولا - ۱۷ - ۱۱ - ۱۶ سلیم نگر کالونی - ۱ - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ - آندھراپردیش - انڈیا

ایڈیٹر
جی ایم خان
ایم۔ اے (عثمانیہ)

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۶)
آذر۔ دے۔ بہمن ۱۳۸۵ ف
چندا سالانا سولا روپے

جلد (۳۶) نمبر (۱۔ ۲۔ ۳)
اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۵ء

ہندستانی ادب

دفتر: ۱۷۔ ۱۱۔ ۱۶ سلیم نگر کالونی۔ ا۔ ملک پیٹ۔ حیدرآباد (۳۶) آندھرا پردیش۔ انڈیا

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)

۲

جی - ام - خان نے دائرہ پریس - چھتا بازار - حیدرآباد میں چھپوا کر سعادت ولا - ۱۷ - ۱۱ - ۱۶ - سلیم نگر کالونی - ملک پیٹ - حیدر آباد ۳۶ سے شائع کیا -

ہمارے خیالات

"گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را"

"ہندستانی ادب" چھتیس (۳۶) سال میں

"ہندستانی ادب" کو بچانے کے لیے ہم نے اپنا مکان تک گرا دیا!

یہ [illegible] کہ "ہندستانی ادب" کو باقی رکھنے کے لیے ہم نے اپنا ذاتی ۹۹-۱ے۔ اعظم پورا شرقی حیدرآباد [illegible] کا مکان [illegible] میں چھتیس (۳۶) ہزار روپے میں بیچ دیا۔ اگر ہم اس وقت اپنا مکان نہ فروخت کرتے تو رسالے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے [illegible] پڑتا، اور ہمیں یہ ہرگز ہرگز گوارا نہ تھا کہ رسالے کا خون ضائع ہو [illegible] اس لیے کہ "ہندستانی ادب" کو ہم نے [illegible] [illegible] اور [illegible] تھا۔ غالباً ہم نے [illegible] مضمون میں اس رسالے کے [illegible] میں یہ لکھا تھا کہ ہماری [illegible] [illegible] کے [illegible] رسالے کے کسی نمبر کے جاری کرنے اور ہمارے "قرت قابلیت" کا [illegible] سوال پیدا ہوتا تو ہم ہر وقت اپنی زندگی پر رسالے کی [illegible] ترجیح دیا کرتے [illegible] فاقوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے اور زیادہ تر اپنی شخصی ضروریات پر خرچ کرتے تو اس وقت رسالے کا [illegible] جاری نہیں ہو سکتا [illegible] یہ ہوتا کہ صرف (۳۲) صفحے کے نمبر پر نمبر (۱-۲-۳) نکلتا پڑتا۔ مگر ہم نے ایک بار بھی ایسا نہیں کیا۔ اس رسالے کا [illegible] (۳۲) [illegible] ہے۔ اگر ہم نے دو مہینے کا [illegible] (۲۳) صفحے کا تھا اور اگر تین مہینے کا [illegible] جو [illegible] (۹۶) صفحے کا [illegible] [illegible] اور جلد فلاں اور نمبر (۱-۲-۳) لکھا جاتا ہے۔ ہم [illegible] یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ "ہندستانی ادب" [illegible] [illegible] کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ خدا ہم نے سخت [illegible] اور تکلیف و مصائب بھی اٹھائے ہیں [illegible] رسالے کے [illegible] [illegible] ہے — ہم رسالے کا سارا کا سارا ادھار یا قرض لے کر [illegible] کرتے تھے اور اپنی [illegible] "قوت لایموت" پر بھی خرچ کیا کرتے تھے۔

[illegible] رسالے کا [illegible] خریدار [illegible] ہے، [illegible] آف حیدرآباد [illegible] [illegible] ہر نمبر کی دو سو کاپیاں خریدتا ہے۔

اس کے علاوہ سنٹرل [illegible] نئی دہلی بھی صرف [illegible] اس رسالے کی تقریباً [illegible] سال سے خریدار ہے، اور [illegible] (۲۰) سال [illegible] اس رسالے کا مستقل خریدار ہے۔ "ہندستانی ادب" جون [illegible] سے پہلے [illegible] آج تک یہ ایک [illegible] رسالہ [illegible] [illegible] [illegible] ہر وقت تین مہینے کا ملا جلا نمبر نکلتے ہیں، چنانچہ [illegible] ہم ہر تیسرے مہینے کا ایک [illegible] شائع کرتے ہیں، اور ہر نمبر کے ساتھ [illegible] داخل کرتے ہیں۔ چند روز کے بعد [illegible] ہے، اور [illegible] بتانے کے بعد ہم یہ [illegible] [illegible] قرض دینے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے حوالے کرتے تھے۔ اس کے بعد کاتب، [illegible] پریس اور جلد ساز کا [illegible] [illegible] دیا کرتے تھے۔ رسالے کے ہر نمبر کے کاغذ کی قیمت ادا کرنے اور اپنی ضروریات زندگی سے پورا کرنے کے لیے ہم نے [illegible] کے [illegible] حضرات کو قرض دینے کی زحمت دی تھی۔ اس فہرست [illegible] کے اصل نام [illegible] ہم [illegible] نہیں سمجھتے۔ [illegible] کے ساتھ [illegible] [illegible] [illegible] قرض دینے سے انکار کیا تو ہم نے اپنی [illegible] کی بنا پر [illegible] حالت سے واقف کرایا، چنانچہ [illegible] [illegible] کو [illegible] کے لیے قرض دینے [illegible] اور ہم نے شکریے کے ساتھ ہر نمبر کے لیے قرض لینا [illegible] کر دیا [illegible] کے بعد [illegible] کے ساتھ [illegible] کے پیسے واپس کر دیا کرتے تھے۔ ایک [illegible] [illegible] [illegible] کے وقت [illegible] جواب [illegible] اور ہم اپنا [illegible] سے واپس آئے، اور [illegible] [illegible] حالت سے واقف کرایا۔ چنانچہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] شکریہ ادا کیا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

دیکھا ایک وقت میں دو روپیہ ہو گئے ایک رسالے کا دو سو ہا ماہ۔ ہر چند جب تک پیسے ہاتھ میں نہ آئیں کاغذ کیسے خریدا جا سکتا ہے جب کاغذ نہیں خریدا جائے گا تو پرچہ نہیں چھپے گا۔ پرچہ نہیں چھپے گا تو اپنی کے ساتھ پہلے ہی وصول نہیں ہو گا۔ اور جب پہلا ہی نہ ملے تو ہوا اب وہ کسی بیٹے اب بیسے نہیں ملتے تو رسالہ اور ہم دونوں بھلا باقی اور زندہ رہ سکتے ہیں — ؟

قریب قریب ٹکے سے نکا سا جواب دینے اور صاف انکار کر دینے کے بعد ہماری آنکھوں میں اپنی موت پھر گئی اور رسالے کے ختم ہونے کا خیال بھی ایسا رہ رہ کر ستانے لگا ہے۔ اس نوبت پر ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ زید - عمر - بکر تینوں نے کئی بار قرض دیا تو یقیناً ان تینوں کا ہم پر احسان تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم انہیں سود تو نہیں دیا کرتے تھے، بلکہ دوسرے طریقوں پر ہم ان کے ساتھ اتنا سلوک کرتے تھے کہ وہ سود سے بھی زیادہ گراں باری کا باعث بنتا تھا۔ ہم ان لوگوں کو اس لیے خوش رکھنا چاہتے تھے کہ بددلی کے سبب وہ ہمیں قرض دینے سے کہیں انکار نہ کر دیں۔ لیکن آہ کتنے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے اس فراخدلانہ اور حاتمانہ سلوک کے باوجود ان تینوں نے ایک کے بعد ایک قرض نہ دے کر ہمیں مایوس اور ناامیدی کے بھیانک کنویں میں ڈھکیل دیا۔ مگر اس کے باوجود ہم مرتے مرتے بچ گئے۔ اور ہمارا قدیم ساتھی رسالہ ختم ہوتے ہوتے بچ گیا! یہی وہ بھیانک منظر تھا جس نے ہمیں اپنا اے کلاس اور حقیقت میں فرسٹ کلاس مکان بیچنے پر مجبور کر دیا۔ اس افلاس اور تنگدستی کے زمانے میں بھی ہم انگریزی اخبار STATESMAN کے مستقل خریدار تھے۔ اخبار سپلائی کرنے والے کو ہم تین مہینے کے بعد اخبار کی قیمت دیا کرتے تھے۔ ہمارے مستقل اخبار کے علاوہ ہم اس سہارے پر دوسرے اخباروں کے سنڈے ایڈیشن اور بعض خاص نمبر وغیرہ بھی خرید لیا کرتے تھے، اور یہ سب پیسے بھی تین مہینے بعد ایک ساتھ دیا کرتے تھے۔ روزانہ شام میں تقریباً (۴) بجے چائے پینے کے بعد ہم ایک آرام کرسی اور ایک چھوٹا سا اسٹول اور وہ ہمارا انگریزی اخبار ساتھ لے کر مکان سے باہر چلے آتے اور نٹ پاتھ پر کرسی ڈال کر بیٹھ جاتے اور اخبار اسٹول پر رکھنے کے بعد اخبار دیکھنا شروع کر دیتے تھے — مکان بیچنے کا خیال کوئی نیا نہیں تھا، بلکہ بہت پرانا خیال تھا، اور وہ خیال اس لیے بھی تھا کہ مکان بیچنے کے بعد بھی کافی پیسا بچ جائے گا، اور ہم اس کو کسی بنک میں فکسڈ ڈپازٹ کی شکل میں رکھوا دیں گے تو سود کی آمدنی سے ہم اپنے اخراجات پورے کر سکتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرض لے کر ہم دوسروں کو جو بے جا تکلیف دیتے ہیں، جس کی وجہ سے خود ہمیں بھی سخت شرمندگی ہوتی ہے، اس سے ہم بچ جائیں گے۔ ہمارا آبائی مکان، حیدرآباد کے ایک قدیم اور مشہور محلے چھلکوڑہ میں تھا۔ ہمارا تعلق حیدرآباد کے ایک مفت خور گھرانے سے تھا۔ منصبدار - جمعدار، اور جاگیردار - انعام دار - پنچ دار - وظیفہ دار وغیرہ کو ہم نے مفت خوروں کا نام دیا تھا۔ آپ خود ہی الفاظ سے سمجھ لیجیے کہ یہ لوگ کیا کام کرتے تھے جو مفت میں ماہوار تنخواہ پاتے تھے اور جاگیردار وغیرہ اپنے علاقوں میں سے اور بے محنت کسانوں وغیرہ سے سالانہ یا ششماہی پر لگان کی شکل میں اپنا حق وصول کرتے تھے۔ اپنے شخصی تعلقات کی بنا پر جب کبھی ہم ان مفت خوروں سے کہتے کہ یہ تو بڑے ہی شرم کی بات ہے کہ منصبدار اور جمعدار جو کچھ بھی ہو ہر مہینا خزانۂ عامرہ یا اسٹیٹ ٹریژری سے ماہوار تنخواہ حاصل کرتے ہیں، اور جاگیردار - پنچ دار - انعام دار وغیرہ وغیرہ بھی محنت کرنے والے کسانوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی اپنے ملازمین کے ذریعے زبردستی بھی وصول کر کے اپنی اور اپنے سارے خاندان کی گذر بسر کرتے ہیں، نیز عیش و عشرت اور لہو و لعب میں اس ناپاک آمدنی کا بے جا استعمال کرتے ہیں تو وہ لوگ شرمندہ ہونے اور اثر لینے کی بجائے ہم سے بے حیائی کے ساتھ یہ کہتے کہ — واہ! ہمارے باپ دادا نے سابق میں اپنا خون بہایا تھا، اس لیے ہم لوگ آج اس کا صلہ پا رہے ہیں۔ ہماری یہ چھیڑ چھاڑ صرف ایک منصبدار یا ایک جمعدار یا جاگیردار وغیرہ سے نہیں، بلکہ موقع محل سے ہم ہر ایک کی بری طرح سے خبر لیا کرتے تھے، اور ان لوگوں کو تنبیہ کر کر کے رکھ دیا کرتے تھے، چنانچہ اسی بیچ فطری تقاضے کے تحت ہم نے ان تمام مفت خوروں کے خلاف ایک طویل اور مبسوط کڑا مضمون "منصبداری - جمعداری، جاگیرداری وغیرہ نظام کو فوراً ختم کر دینا چاہیے" لکھا تھا۔ تو وہ مضمون کئی مضامین "رہبرِ دکن" کے ایڈیٹر احمد محی الدین - بی۔ اے (علیگ) کے نام بھیجا تھا۔ اگر ہمارے کسی مضمون میں چھپا تو ایک روز ہم خود ان کے دفتر افضل گنج چلے گئے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے جانے سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کمرے میں ان کے بڑے بھائی یوسف الدین بھی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے ہماری آمد پر بہت خوشی ظاہر کی، اور مزاج پرسی اور کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد

رخصت لے کر وہ نے بھائی کے اجلاس پر آگئے۔ ان سے بھی خیر خیریت کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد ہم نے کہا کہ ایڈیٹر صاحب! ہم نے آپ کو ایک طویل اور معرکا آرا مضمون بھجوایا تھا، مگر کافی طویل وقفے کے بعد بھی وہ مضمون آج تک نہیں چھپا، حالانکہ آپ ہم سے مضامین کا بار بار تقاضا کرتے رہتے ہیں، اس کے جواب میں مسکراتے ہوئے انہوں نے جواب دیا، ہاں خاں صاحب! واقعی مجھے بھی افسوس ہے کہ میں آپ کا مضمون نہیں چھاپ سکا۔ یہ کہتے ہوئے میز کا نیچے کا خانا کھینچا، اور وہ مضمون ہمارے سامنے رکھتے ہوئے کہا یہ رہا آپ کا مضمون، میں نے اس کو ضایع نہیں کیا تھا، بلکہ یہ آپ کی امانت ہے، آپ اس کو اپنے ساتھ لیتے جائیے، اور کسی اور اخبار وغیرا میں چھپوا دیجیے۔ یہ کہتے ہوئے اپنے ایک ملازم کو آواز دی، اس کے آتے ہی کہا کہ آج کا اخبار لے آو، ملازم گیا اور فوراً "رہبر دکن" کی ایک کاپی لاکر ان کے سامنے رکھ دی، انہوں نے وہ اخبار اپنے ہات میں لیا، اور پھر ہمارے ہات میں تھماتے ہوئے کہا، آج کا یہ اخبار دیکھا ہے آپ نے؟ ہم نے کہا، جی ہاں دیکھا ہے، بلکہ پورا اخبار پڑھ ڈالا ہے، انہوں نے کہا، نہیں آپ اس اخبار کو اپنے ہات میں لیجیے، اور میں جس طرح کہتا ہوں، پھر سے پڑھ کر دیکھیے۔ ہم نے وہ اخبار اپنے ہات میں لیا تو انہوں نے کہا کہ اس اخبار کے پہلے صفحے کی پیشانی پر دہنی طرف کیا لکھا ہے، اور انہوں نے اپنے الفاظ میں کہا کہ یہ لکھا ہے کہ اس اخبار کا سالانا چندا سرکار عظمت مدار سے اتنے روپے، اور سرکار آصفیا سے اتنے روپے، اور ہر ایک پایگاہ سے اتنے روپے، اور جاگیرداروں سے اتنے روپے، اور عوام سے اتنے روپے، اب آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ ہم عوام کے مقابل ان تمام طبقوں سے سالانا اضافا چندا وصول کرتے ہیں، اور یہ تو آپ خود بھی تسلیم کرسکتے ہیں کہ اصولی طور پر جاگیرداروں وغیرا وغیرا سے زیادا چندا حاصل کرنے کے بعد "رہبر دکن" میں انہیں کے خلاف آپ کا معرکا آرا اور ہنگاما خیز مضمون کیسے چھاپ سکتا ہے۔؟ یہ سن کر ہم چپکے ہو رہے، اور واقعی اب کیا جواب دے سکتے تھے، وہ مضمون اپنے ساتھ لیے چلے بنے۔ اپنی کرسی سے اٹھ کر انہوں نے ہم سے ہات ملایا، اور یہ کہا کہ اصولی حد تک تو میں آپ کے زرین خیالات کا حامی ہوں، مگر نظری حد تک میرے لیے سخت مجبوری ہے، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں، اور آپ اپنا کوئی دوسرا مضمون جلد سے جلد بھجوا دیجیے! "رہبر دکن" کے علاوا، ہم دوسرے اخباروں وغیرا میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے، اس لیے انہوں نے ہم سے یہ خواہش کی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب "رہبر دکن" کو جاری ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصا ہوا تھا، اور ان کے محل کے پیچھے کے حصے میں وہ دستی یا ہینڈ پریس تھے۔

آمدم برسر مطلب یہ کہ ہم کیا کہہ رہے تھے، اور کیا کہہ گئے۔ ہم بھٹک نہیں گئے ہیں، ہم نے جو کچھ کہا، بجا کہا، ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ ہمارا تعلق بھی ایک منصب خور گھرانے سے تھا۔ ہمارے والد محترم باز دار خاں بزرگی بھی منصب دار اور جمعدار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد جمعداری ہمارے بڑے بھائی حکیم غلام علی خاں صاحب بزرگی مرحوم کے نام منتقل ہوئی اور منصب ہمارے منجھلے بھائی بہادر علی خاں صاحب بزرگی مرحوم بی۔ اے (عثمانیا) کے نام منتقل ہوا۔ ہم باقی تین بھائی یعنی دلیل خاں صاحب بزرگی مرحوم (عثمانیا)۔ جی۔ ایم۔ خاں، ایم۔ اے (عثمانیا)، ایڈیٹر "ہندستانی ادب" اور سلیم خاں صاحب بزرگی مرحوم، بانی سلیم نگر کالونی نمبر (۱) اور (۲) تھے، اور ہم تینوں منصب اور جمعداری، صلوات اور کلیات وغیرا وغیرا سے باہر کے دارے تھے۔ ہمارے بڑے دونوں بھائی مخدوم سرکار تھے۔ تیسرے بھائی دلیل خاں صاحب [illegible] داری منظور ہوئی تھی۔ [illegible] ہزار روپے کی منصب [illegible] ایک ادروائی [illegible]

سود پر قرض لینا چاہتے تھے، چنانچہ کفالت میں اپنا بڑا مکان رکھوایا تھا، اس سلسلے میں ایک اسٹامپ کے کاغذ پر تینوں بھائیوں کی دستخط لے لی تھی، اور وہ کاغذ ہمارے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں ایک مارواڑی سے قرض لے رہا ہوں، اور بڑا مکان کفالت میں رکھ رہا ہوں، یہ دیکھو اسٹامپ کا کاغذ ہے، دوسروں نے دستخط کر دی ہے، تم بھی اس پر اپنی دستخط کرو۔ ہم نے صاف انکار کر دیا، اور یہ کہہ دیا کہ ہم مفت خوروں کی جائیداد کے حصہ دار بننا نہیں چاہتے، اس لیے اس اسٹامپ کے کاغذ پر ہرگز ہرگز دستخط نہیں کریں گے، آپ تین روپے دیجیے کا دوسرا اسٹامپ کا کاغذ لے آیئے، ہم اس پر خود اپنے قلم سے لا دعوا لکھے دیتے ہیں۔ اس وقت دوسرے تمام بھائیوں نے ہم سے کہا کہ آیا تم ہوش میں بھی ہو یا نہیں؟ پھر کیا بک رہے ہو؟ کہیں تم جنونی اور پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ اور ہماری ماں سے کہا، اور گھر میں دو قریبی عزیز عورتیں بھی موجود تھیں، ان سے بھی کہا یہ دیوانا ہو گیا ہے، اور بکواس کر رہا ہے، جاؤ اس کو مناؤ سمجھاؤ تا کہ اس کی عقل ٹھکانے لگے، اور اس اسٹامپ کے کاغذ پر دستخط کرنے کے بعد اپنی آبائی جائیداد، منصب، جمعداری، مکانات اور کلیات وغیرا وغیرا کا برابر کا حصہ دار رہے، چنانچہ اس وقت چھوٹے بڑے سارے افراد خاندان نے ہمیں سمجھایا، منایا، مگر بقولے "قطب از جا نمی جنبد" ہم ٹس سے مس نہ ہوے، اور ہم نے ان سب کو ٹکا سا جواب دیدیا کہ ہمارا دماغ صحیح ہے، ہم دیوانے اور پاگل نہیں ہیں، ہمارا فیصلہ اٹل ہے، تم سب لوگوں کی طرح ہم بھی اپنا شمار مفت خوروں میں نہیں کرانا چاہتے، ہمارے اس آخری جواب کے بعد دلیل خان صاحب سٹپٹا گئے، اور مجبوراً تین روپے کا اسٹامپ کا کاغذ خرید لے آئے، اور ہمارے حوالے کرتے ہوئے ایک وکیل کی لکھی ہوئی لا دعوے کی عبارت بھی ہمارے ہات میں تھما دی، اور ہم سے یہ کہا کہ لا دعوے کے سلسلے میں یہ عبارت لکھنی چاہیے۔ ہم نے اپنے قلم سے اس اسٹامپ کے کاغذ پر لفظاً بہ لفظاً اس عبارت کی نقل کر دی، اس کے بعد وہ اسٹامپ کا کاغذ ان کے حوالے کر دیا، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی پشتینی، موروثی جائیداد سے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد صرف ہمارے سارے افراد خاندان نے ہمیں دیوانا اور پاگل کہا، بلکہ ہمارے سینکڑوں ملنے جلنے والوں نے بھی ہم پر دوسٹ آنکھ ملامت پاس کیا، اس لیے کہ اتنی بڑی موروثی جائیداد کے سلسلے میں لا دعوا لکھنے کی ہماری پہلی مثال تھی۔ پانچ دس روپے کے منصب وغیرا وغیرا کے لیے بھی لوگ باقاعدہ طور پر لڑتے تھے، اور وکیل وغیرا مقرر کر کے اپنا اپنا حصہ تسلیم کرواتے تھے، تا کہ اس آبائی مفت خوری کی آمدنی سے ان کی گذربسر ہو! دوسری طرف ہم بے حد خوش تھے کہ مفت خوروں کے ماحول سے ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی۔ ہم سنہ ۱۹۳۸ء سے سنہ ۱۹۴۳ء تک "رکن بلدیہ" یعنی کونسلر تھے، اور نواب مہدی نواز جنگ بہادر مرحوم سابق گورنر گجرات، "ناظم بلدیہ" یعنی کمشنر تھے۔ وہ عمر میں ہم سے دس سال بڑے تھے، مگر ہمارے ان کے تعلقات حد درجہ بے تکلفانہ تھے۔ وہ ہمارا بڑا ہی لحاظ اور خیال کرتے تھے۔ انہیں رہ رہ کر خیال ہوتا تھا کہ ایک عثمانیہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے اور بلکل ہی بے کار ہے۔ ایک روز انہوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ آپ قابل آدمی ہیں، اس لیے آپ روزانہ اخبار نکالیے۔ یہ سنتے ہی ہم نے اپنے لا دعوے کی ساری داستان کہہ سنائی، نواب صاحب نے بھی یہی کہا کہ یہ کیا کیا خان صاحب آپ نے! جی ہاں نواب صاحب ہم نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر کیا، اور آج ہمیں اس بات کی خوشی اور مسرت ہے کہ ہمارا تعلق مفت خور گروہ سے [illegible] کہ انہوں نے کہا کہ ایم۔ اے ہی [illegible] ہندستانی ادب کا

آپ کا موضوع رہا ہے، اس لیے آپ ایک علمی ادبی ماہوار رسالہ نکالیے۔ یہ سن کر ہم نے کہا، بہتر اور ادھر ہم نے محکمۂ اطلاعات حیدرآباد میں "ہندستانی ادب" نامی ماہوار علمی ادبی رسالہ کی درخواست دیدی۔ چند مہینے بعد اس کی منظوری آ گئی، اور ضروری تیاری کے بعد ہم نے امرداد ۱۳۵۰ف مطابق جون ۱۹۴۱ء میں "ہندستانی ادب" کا پہلا نمبر نکالا۔ یہ نمبر (۶۴) صفحے کا تھا، اور اس کا سالانہ چندہ صرف چار روپے تھا، اور ایک پرچے کی قیمت صرف ۸ آنے تھی۔ یہ نمبر اور آگے چل کر سب ہی نمبر ناروے یا ڈنمارک کے چکنے کاغذ پر چھپا کرتے تھے۔ اس وقت اس کی قیمت ساٹھ روپے فی ریم تھی، اور کناڈا یا دوسرے ممالک کے نیوز پرنٹ کی قیمت دو، ڈھائی روپے فی ریم تھی۔

پہلے نمبر کی تیاری کے سلسلے میں، ہم نے اپنے ایک ساتھی رکن بلدیہ شاہ عالم خان صاحب سے ایک سو روپے ادھار لیے تھے، تاکہ کاغذ کی خریدی اور چار جز کی کتابت کے سلسلے میں کاتب کو بھی پیسے دے سکیں۔ پہلے نمبر کی کتابت سید محمد مرحوم ساکن چنچلگوڑہ نے کی تھی، ان کا شمار حیدرآباد کے بہترین کاتبوں میں تھا۔ کاتب کو چار روپے فی جز چار جز کی اجرت جملہ سولہ روپے دینی پڑی۔ پہلے نمبر کی چھپائی عہد آفرین پریس معظم جاہی مارکٹ - حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ یہ چھپائی ادھار رہی، اس لیے کہ پریس کے مالک دونوں بھائیوں سے ہمارے پرانے اور قدیمانہ تعلقات تھے۔ چھوٹے بھائی کلیم اللہ صدیقی ہمارے کلاس میٹ یا ہم جماعت تھے۔ ان سے ہمارے بے حد گہرے تعلقات تھے، اور منظور اللہ صدیقی بڑے بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی کے کلاس میٹ ہونے کے باعث ان سے بھی اسی طرح کے گہرے تعلقات تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ دونوں بھائی کراچی منتقل ہو گئے تھے، اور ان دونوں کا وہاں عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

رسالہ جاری ہونے سے پہلے خریدار فراہم ہو گئے تھے، اور سالانہ چندے پیشگی وصول ہو رہے تھے۔ ادھر نظامت تعلیمات میں بھی ہم نے رسالے کی خریداری کی کوشش کی تھی۔ نظامت کے مترجم ڈپٹی کلرک سے لے کر ناظم تعلیمات یا ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن تک سے ہمارے تعلقات تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم مسلسل دس سال تک پبلک وظیفہ کمیٹی کے رکن یا ممبر تھے، اور ہماری یہ خدمات سو فیصد اعزازی تھیں۔ اس کمیٹی میں پبلک کی طرف سے دو رکن ہوا کرتے تھے۔ ہمارے علاوہ، ایک اور صاحب مشہود ایڈوکیٹ حیدرآباد بھی ہمارے ساتھ اعزازی خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ اس کمیٹی کا چیرمن ناظم یا ڈائرکٹر ہوا کرتا تھا، مگر ناظم کسی بھی کمیٹی میں نہیں آتا تھا، اس لیے ہمیشہ اس کمیٹی کی صدارت نایب ناظم ہی کرتے تھے، اور دفتر کا سپرنٹنڈنٹ مددگار وظیفہ کمیٹی بورڈ کا سکریٹری ہوا کرتا تھا۔ ہمارے انھیں قریبی تعلقات کی بنا پر ناظم تعلیمات نے دو سو مڈل اور ہائی اسکولس کے لیے ہمارے نکلنے والے رسالے "ہندستانی ادب" کی دو سو کاپیوں کی خریدی کی منظوری دیدی، جس کا چندہ انھیں بل داخل کرنے کے بعد ہر سہ ماہی پر ملا کرتا تھا۔

چونکہ مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ نکل آیا تھا، اس لیے ہم نے رسالہ جاری ہونے سے پہلے محکمۂ آرائیش بلدہ حیدرآباد میں مکان کے لیے ایک درخواست دیدی تھی۔ اس دفتر میں بھی کلرک سے لے کر ناظم آرائیش بلدہ تک ہمارے گہرے تعلقات تھے، اور مہتمم مکانات آرائیش بلدہ، خواجہ معین الدین، بی۔ اے، ال ال۔ بی (عثمانیہ) سے تو ہمارے خاص مراسم تھے۔ ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اب ہم چنچلگوڑہ کے مکان میں رہنا نہیں چاہتے، اس لیے آپ اس محلے سے قریب نیا ملک پیٹ [illegible] میں ایک مکان ہمارے نام الاٹ کر دیجیے۔ یہ سن کر انھوں نے کہا، خان صاحب! اس وقت ایک بھی مکان نیا ملک پیٹ میں خالی نہیں ہے، جوں ہی مکان خالی ہوگا، میں آپ کے نام [illegible] کر کے تحریری اطلاع بھیج دوں گا۔ ان کا شکریہ ادا کرتے [illegible] ہم واپس چلے آئے۔ [illegible]

مطابق ۱۰ مبر سنہ ۱۹۵۱ء میں انہوں نے نیا ملک پیٹ میں (۷۹) بی مکان الاٹ کرکے ہمارے نام اطلاع نامہ بھجوایا کہ ہم اس مکان میں منتقل ہو سکتے ہیں، چنانچہ ۱۹ اردے سنہ ۱۳۵۱ ف مطابق ۱۹ ار نومبر سنہ ۱۹۵۱ء کو ہم اس مکان میں منتقل ہو گئے۔ اس مکان میں تین کمرے تھے، اور اس کا کرایا سات روپے ماہوار تھا۔ ہم اس مکان میں ایک سال رہے۔ اس کے بعد بغیر کوشش کے ہمیں A کلاس مکان مل گیا۔ (۹-۹) کے کرایے دار کو B کلاس مکان کی ضرورت تھی، اور ہمیں A کلاس حاصل کرنے کی خواہش تھی، چنانچہ دراز کا فریقین سے مکانات کا تبادلہ ہو گیا، جس کی منتقلی کی منظوری ناظم آرائش بلدہ نے دی۔ ہمارے نئے A کلاس مکان میں تین چھوٹے اور ایک بڑا کمرا تھا۔ اس کے علاوہ ورانڈا، اور صحن کافی وسیع تھا۔ صحن کے علاوہ، اور دو کمرے بنانے کی گنجایش تھی۔ اس مکان میں نل اور بجلی باد فیشن ہم نے اپنے خرچ سے لی تھی۔ جب ہم نے اس مکان کو بیچنے کا ارادا کیا تو بعد کرسی یا دلالوں سے یہ کہہ رکھا تھا۔ جب کبھی خریدار آتے، ہم انہیں مکان دکھاتے۔ مکان ہر کوئی شخص پسند کرتا، اور مکان بہ اس کی تعریف کرتا تھا۔ معاملہ اس پہ جب بنتا تھا کہ قیمت سے بات ہی "تحو حد ہی است" والا معاملہ تھا۔ جون سنہ ۱۹۷۵ء ایک خریدار آئے تو ہم نے انہیں مکان دکھایا، انہوں نے مکان پسند کیا، اور قیمت دریافت کی، ہم نے کہا، اس مکان کی قیمت تیس ہزار ہے، انہوں نے کہا، یہ قیمت تو بہت زیادہ ہے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے، جو ہمارے بھی ملاقاتی تھے۔ انہوں نے بھی کہا، خان صاحب! میں آپکو بتلانا چاہتا ہوں کہ یہ دوست چیکار صاحب واقعی آپ کا مکان خریدنے کی نیت سے آئے ہیں، اسلیے آپ کچھ کمی کیجیے تو حقیقت میں معاملہ بن جائے گا۔ یہ سن کر ہم نے کہا، اگر یہ بات ہے، قاضی صاحب تو لیجیے ہم قیمت میں کمی کیے دیتے ہیں۔ اب اس مکان کی قیمت رہی چھبیس ہزار روپے، اور یہ چھبیس ہزار ایسے ہیں کہ اس میں ایک روپے کی کمی نہیں ہو سکتی۔ یہ سنتے ہی خریدار چیکار صاحب نے کہا، خان صاحب مجھے یہ قیمت منظور ہے، اور چھبیس ہزار میں، میں آپ کا مکان خریدنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے دریافت کیا، اس سلسلے میں آپ نے کیا شرطیں رکھی ہیں۔ ہم نے جواب میں کہا کہ پہلے ہمیں چھ ہزار روپے بطور بیعانا دیجیے، اس کے بعد باقی رقم رجسٹری کے وقت دیجیے گا، چنانچہ دوسرے ہی روز چیکار صاحب اپنے تمام افراد خاندان کے ساتھ آئے، اور ان کے دوست قاضی صاحب بھی ساتھ تھے۔ تمام افراد خاندان نے مکان کو پسند کیا، اور اسی وقت چیکار صاحب نے ہمیں چھ ہزار روپے بیعانے کے طور پر پیشگی دیے، جس کی رسید ہم نے ان کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد انہوں نے روزنامہ اخبار "سیاست" میں اشتہار دیا۔ اپنی تسلی کے بعد ۱۹ ار جون سنہ ۱۹۷۵ء کو سب رجسٹرار کے دفتر میں باقی رقم دے کر اپنے بیوی کے نام رجسٹری کروالی۔ ۳۰ ار جون تک ہم اس مکان میں رہے، اور پہلی جولائی سنہ ۱۹۷۵ء کو سعادت ولا ۱۷-۱۱-۱۶ سلیم نگر کالونی ۱- ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ میں منتقل ہو گئے۔

چھبیس ہزار میں سے ہم نے ایک ہزار رقم اپنے پاس رکھ لی، اور پچیس ہزار روپے نظام شوگر فیکٹری میں تین سال کی مدت کے لیے بطور FIXED DEPOSIT رکھوا دیے۔ یہاں سے (۱۲) فیصد سود کے حساب سے ہر سہ ماہی ہمیں (۷۵۰) روپے ملا کرتے ہیں۔

اپنے ایک ہزار میں سے ہم نے سات سو روپے اپنے قرض کی بابت دیدیے، اور تین سو روپے، رکھے گئے اور وہ کچھ ہو سے ضروری ضروریات پر خرچ کیے۔ اس طرح سے ہم نے رسالے کو ختم ہونے سے بچا لیا، اور رسالے کی خاطر اپنا اے کلاس اور فرسٹ کلاس مکان تک گنوا دیا!

"ہندستانی ادب" پائندہ باد

آذر - دے - بہمن ۱۳۸۵ ف   ہندستانی ادب   اکتوبر - نومبر - دسمبر ۱۹۷۵ء

غلام ربانی

ہندستانی لغات

ہندستانی زبان ہندستان میں پیدا ہوئی، مگر اس کی لغات ابتدا میں پرتگیزوں، ولندیزوں اور انگریزوں نے لکھیں۔ اہل زبان نے اس طرف بہت بعد میں توجہ کی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اہل زبان کی کتابیں اکثر ناقص ہیں۔ اس سلسلے میں انگریزوں نے جو لغات لکھی ہیں وہ بہت کارآمد ہیں۔ بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو ہماری ہندستانی لغات میں نہیں ملتے۔ ان کے لیے ہندستانی لغات کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ انہوں نے لفظ کی اصل سے بھی بحث کی ہے جس سے ہماری ہندستانی لغات معرا ہیں۔

انگریزوں کو ہندستانی زبان سے کوئی محبت یا دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے ملک کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں کی لغات اور صرف و نحو کی کتابیں لکھیں، مگر ہندستانی پر ان کی عنایت کچھ زیادہ تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز یہاں تجارت کرنے آئے تھے۔ جب تجارت کے ساتھ حکومت بھی ان کو ملنے لگی تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک ایسی زبان کی ضرورت ہوئی جو ان کے تجارتی کاروبار اور بعد میں ملکی معاملات بھی انجام دے سکے۔ ہندستانی اس وقت ملک کے بہت بڑے علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی، چنانچہ انہوں نے اس زبان کو خاص طور پر فروغ دیا۔

ہندستانی زبان کی پہلی لغت کا ذکر مسٹر کوارچ QUARICH نے اپنے اورینٹل کیٹلاگ میں کیا ہے، ان کے پاس اس لغت کا ایک قلمی مسودہ تھا۔ ان کے خیال میں یہ لغت سورت میں سنہ ۱۷۲۳ء میں لکھی گئی۔ یہ فارسی، ہندستانی، انگریزی اور پرتگالی الفاظ کی لغت ہے جو سورت کے انگریزی تجارت خانے کے لیے مرتب کی گئی تھی۔

گریرسن نے اسی طرح کی ایک اور لغت کا پتا لگایا ہے جو CAPUCHIN کی تالیف ہے، یہ بھی سورت میں لکھی گئی۔ اس کی دو جلدیں تھیں جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھیں۔

کچھ دنوں بعد جان جیشوا کٹلر JOHN JASHWA HETLER نے ایک کتاب ہندستانی لغت پر لکھی۔ کٹلر ہالینڈ کا باشندہ تھا۔ یہ شخص شاہ عالم اور جہاں دار شاہ کے دربار میں ڈچ سفیر کی حیثیت سے حاضر ہوا۔ اس کی کتاب کو ڈیوڈ مل نے شائع کیا۔ یہ لاطینی زبان میں ہے، لیکن ہندستانی الفاظ اور محاورات رومن حروف میں ہیں، اور املا ڈچ طریقے پر ہے۔

ہنری ہیرس HENRY HARRIS کی انگریزی ہندستانی ڈکشنری سنہ ۱۷۹۰ء میں مدراس سے شائع ہوئی۔ اس میں دکنی الفاظ خاص طور پر شامل کیے گئے ہیں۔

اس زمانے میں بہت سے لغات لکھی گئیں۔ ان میں سے چند ایسی کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو انگریز

لغت نویسوں کی تالیف ہیں — ان میں سب سے پہلا نام ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے۔ یہ فورٹ ولیم کالج میں ہندستانی کے استاد تھے۔ انہوں نے ہندستانی صرف و نحو، لغات، انشائیات اور بول چال پر متعدد کتابیں لکھیں، اور دوسروں سے لکھوائیں۔ اسی طرح جدید ہندستانی کا ڈول ڈالا۔

گلکرسٹ کی انگریزی ہندستانی ڈکشنری جو دو جلدوں میں ہے، ۱۷۹۰ء میں کلکتہ سے شایع ہوئی۔ اس میں انگریزی لفظوں کے معنی رومن حروف اور ہندستانی خوش خط نستعلیق ٹائپ میں ہیں۔ ہر لفظ کی اصل بھی بیان کی ہے کہ وہ کس زبان کا ہے۔

جان شیکسپیر کی لغت ۱۸۱۷ء میں لندن سے شایع ہوئی۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ تھوڑے دنوں میں اس کے کئی ایڈیشن چھپے۔ یہ لغت ضخیم ہے، اور اپنے وقت کی سب سے بہتر لغت ہے۔

ڈنکن فوربس کی ہندستانی انگریزی ڈکشنری لندن میں پہلی بار ۱۸۴۸ء میں شایع ہوئی۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں اصل لفظ ہندستانی رسم خط (نسخ ٹائپ) میں ہے۔ اس کا مترادف انگریزی لفظ دیا ہے۔ دوسرا حصہ پہلے کا جواب ہے۔ اس میں انگریزی لفظ کے ہندستانی رومن حروف میں ہیں — فوربس نے اپنے پیش رو لغت نویسوں کے مقابلے میں الفاظ کا بہت اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر فیلن کی مشہور ڈکشنری ۱۸۷۹ء میں شایع ہوئی۔ اس کی تیاری کے اخراجات حکومت ہندستان نے برداشت کیے۔ یہ ڈکشنری بہت کارآمد تھی۔ ابتدا میں انگریزی سے ہندستانی میں جو ترجمے ہوتے تھے وہ اسی کی مدد سے ہوتے تھے۔

پلیٹس PLATTS کی ہندستانی، ہندی، انگریزی لغت ۱۸۸۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے شایع ہوئی۔ یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے، اور حال میں لاہور سے بھی اس کا ایڈیشن طبع ہوا۔

ان دنوں اور بہت سی چھوٹی موٹی لغات شایع ہوئیں جو زیادہ تر شیکسپیئر، فوربس، فیلن اور پلیٹس کی لغات پر مبنی تھیں۔ ان تمام ڈکشنریوں میں فیلن اور پلیٹس کی لغات سب سے بڑی ہوئی ہیں —

فیلن نے الفاظ اور محاورات کی سند کے لیے اساتذہ کے اشعار بھی دیے ہیں، پلیٹس کی کتاب اس سے زیادہ ضخیم ہے۔ اس نے ہندستانی کے ساتھ ٹھیٹ ہندی کے تلفظ بھی دیے ہیں، اور ان کے معنی بیان کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے۔

انیسویں صدی کے شروع میں ہندستانی زبان اتنی ترقی کر چکی تھی کہ انگریزوں نے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں کی فرہنگیں مرتب کیں۔ ایسی زولومنز شرح اسلام (محمڈن لا) اور مالگذاری کی اصطلاحات کی لغت تیار کی۔ مشہور مورخ سر ہنری ایلیٹ نے اصطلاحات کی ایک مبسوط کتاب لکھی۔ اس میں شمالی مغربی اضلاع کی ہندو ذاتوں، رسم و رواج، مالگزاری، دفتری اصطلاحات اور دیہاتی زندگی کے مختلف الفاظ کی تشریح کی ہے۔

پیٹرک کارنے ایک لغت مرتب کی۔ جس میں دفاتر، عدالت، مالگزاری، صنعت و حرفت وغیرہ کے الفاظ جمع کیے ہیں۔ غرض اور بھی فرہنگیں تیار ہوئیں۔

اہل ملک کی لغات میں ہندستانی کی پہلی لغت کہا جا سکتا ہے، عبدالواسع ہانسوی کی کتاب "غرایب اللغات" ہے۔ اس کے بعد ہندستانی کی دوسری لغت سراج الدین علی خان آرزو کی "نوادر الالفاظ" ہے۔

یہ کتاب اصل میں "غرایب اللغات" کی تصحیح ہے۔ عبدالواسع چونکہ ہریانے کے رہنے والے تھے ان کی کتاب میں بہت سے الفاظ کا اضافہ بھی کیا ہے۔

یہ کتاب نایاب تھی، چند سال ہوئے انجمن ترقی اردو پاکستان نے کراچی سے شایع کی ہے۔ ڈاکٹر سید حمید اللہ نے اس کو بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا ہے، اور ایک فاضلانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط میں ہندستانی زبان خاصی ترقی کر چکی تھی۔ اس زمانے میں اہل لکھنؤ نے کئی لغات لکھیں جو زیادہ اہم نہیں۔ اس وقت تک ہندستانی کی جتنی لغات لکھی گئی تھیں، ان

- میں جامع اور کار آمد لغت مولوی سید احمد کی
لم آصفیا ہے - یہ کتاب چار جلدوں میں ہے -
وف نے ڈاکٹر فیلن کے ساتھ کام کیا تھا لیکن
کی لغت فیلن کی ڈکشنری سے الگ چیز ہے -
- تنہا آدمی جتنی محنت اور کاوش کر سکتا ہے،
ں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے -

ہندستانی زبان ہمیشہ ان کی احسان مند رہے
- اس فرہنگ سے بعد کے ہندستانی لغت نویسوں
فائدہ اٹھایا ہے، یہی نہیں، بلکہ ہندی لغت
یسوں نے بھی اس فرہنگ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے -

اس فرہنگ میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ
ش الفاظ اور محاورے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کیے
یں - یہ ان کے استاد ڈاکٹر فیلن کی صحبت کا
فیض ہے - ڈاکٹر فیلن نے بھی اپنی ڈکشنری میں
ش الفاظ چن چن کر رکھے ہیں - اسی طرح منشی چرنجی
ال کی "مخزن المحاورات" بھی جو بہت بلند پایہ
تاب ہے - فحش محاوروں سے بھری پڑی ہے -
یہ بھی ڈاکٹر فیلن کا فیض ہے، کیونکہ منشی صاحب
نے بھی فیلن کے ساتھ ان کی ڈکشنری میں کام کیا ہے -

فرہنگ آصفیا میں بعض الفاظ کے ضمن میں
ایسی بے تکی باتیں لکھی گئی ہیں جن کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے -
ان نقایص کے باوجود فرہنگ آصفیا ہندستانی
کی بے مثل لغت ہے، اور ہندستانی الفاظ کی
سند کے لیے حرف آخر کا حکم رکھتی ہے، حال میں
اردو بورڈ کی طرف سے اس کا دوسرا اڈیشن شایع
ہوا ہے -

فرہنگ آصفیا کی پہلی جلد شایع ہوئی تھی کہ
منشی امیر احمد مینائیؒ نے "امیر اللغات" لکھی
اس کا صرف پہلا حرف "ا" ہی شایع ہو سکا
اس کی تیاری میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے،
کہیں کہیں الفاظ کی اصل بھی بتائی گئی ہے، لیکن
ایک ایک لفظ یا محاورے کے لیے کئی کئی شعر
نقل کر دیے گئے ہیں، افسوس کہ منشی صاحب کی
عمر نے وفا نہیں کی اور یہ لغت نا تمام رہ گئی -
اس کمی کو مولوی نور الحسن نیر کی "نور اللغات"

نے پورا کر دیا - یہ چار جلدوں میں ہے - مولف نے
اس کی ترتیب میں بڑی کوشش کی ہے - تقریباً
ہر لفظ کی سند کے لیے اساتذہ کے شعر نقل کیے
ہیں - محاوروں کے جمع کرنے اور ان کو سلجھانے کی
پوری کوشش کی ہے، لیکن بعض عربی الفاظ ایسے
بھی درج ہیں جن کو شاعر یا انشا پرداز ہاتھ
نہیں لگاتے -

پہلی جلد کے دیباچے میں متروکات کی ایک
لمبی چوڑی فہرست ہے - اس میں ایسے لفظ بھی
ہیں جو متروک نہیں - ہر ایک مستند لغت میں
متروک لفظوں کو شامل کرنا ضروری ہے - اس
سے قدیم نظم و نثر کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے "باغ
و بہار" یا مثنوی میر حسن کچھ زیادہ پرانی کتابیں
نہیں، مگر ان میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو ہماری
آج کل کی لغات میں نہیں ملتے - ان کے لیے انگریز
لغت نویسوں کی ڈکشنریوں کو تلاش کرنا پڑتا
ہے -

"نور اللغات" کے بعد اور کئی لغات شایع
ہوئیں - ان میں ایک "فرہنگ شفق" ہے جو
منشی لالتا پرشاد لکھنوی کی تالیف ہے - اس
میں صرف وہی محاورے لکھے گئے ہیں جو ناسخ،
آتش، غالب اور ذوق کے کلام میں پائے جاتے ہیں
- ہندستانی کی آخری بڑی لغت خواجہ عبدالمجید
کی "جامع اللغات" ہے - یہ چار ضخیم جلدوں
میں ہے - اس میں سنسکرت اور عربی کے ایسے
الفاظ بھی بہت ہیں جو ہندستانی میں رائج نہیں
دنیا بھر کے مشہور شہروں، دریاؤں اور پہاڑوں کے
نام بھی درج کر دیے ہیں - لغت کی کتاب کو الف لیلہ
یا کسی شکل دینا ٹھیک نہیں - لفظوں اور محاوروں
کے استعمال کے لیے کوئی سند نہیں دی گئی اور
کی اصل کی تحقیق بھی نہیں کی گئی ہے - اس میں شک
نہیں کہ مرتب نے اس کی تیاری میں بہت محنت کی
ہے، مگر افسوس کہ یہ لغت مستند نہیں -

۱۹۲۵ء میں انجمن ترقی اردو نے فرہنگ
اصطلاحات علمیہ شایع کی یہ کام کی چیز ہے

...ادارہ کی امداد سے طبع ہوئی ہے

اسی زمانے میں "انجمن ترقی اردو" کی طرف سے فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں کا کام جاری تھا ایک ایک کر کے دس جلدوں میں اس کی تکمیل ہو گئی۔ یہ اصطلاحات مولوی ظفر الرحمان عباسی کی جمع کردہ ہیں۔ مرحوم نے اس سلسلے میں مختلف مقامات کا سفر کیا، اور اہل حرفہ سے اصطلاحوں کی تحقیق کی۔

صناع اور کاریگر تمدن کی جان ہوتے ہیں۔ ان کی منتھی زبان میں بڑی گھلاوٹ اور مزاج میں ظرافت ہوتی ہے۔ ہر زبان کے لفظ کی اس میں کھپت ہے۔ صناع بڑی آسانی سے لفظ گڑھ لیتے ہیں، جو چپکے چپکے زبان میں داخل ہو جاتا ہے۔

"انجمن ترقی اردو" کی مطبوعات میں سب سے اہم اور عظیم کتاب "انگریزی ہندستانی لغت" ہے جو آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کا ترجمہ ہے۔ مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے دس بارہ سال کی کوششوں کے بعد اس کو ایڈٹ کیا ہے۔ یہ لغت اس قدر کارآمد ہے کہ کوئی اسکول، کالج، دفتر، ادارہ اس سے خالی نہیں، یہ لغت انجمن کا یادگاری کام ہے۔ چند سال بعد انجمن نے

STUDENTSENGLIS
URDUDICTIONAY

کے نام سے اس کا اختصار شایع کیا جو باوجود اختصار کے مکمل اندراجات ہے۔ بڑی ڈکشنری میں سے صرف وہ الفاظ جو قدیم اور متروک ہیں یا ایسی اصطلاحات جو کسی خاص فن سے متعلق ہیں خارج کر دی گئی ہیں۔ اس سے لغت کی خوبی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ [illegible] جاتا ہے یہ لغت زیادہ جامع اور مکمل ہے کیونکہ بڑی کتاب کے بعد شایع ہوئی ہے۔ یہ نقش ثانی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا، جعفر علی خاں اثر نے فرہنگ اثر کے نام سے ایک لغت شایع کی ہے جو اصل میں ہندستانی کی مطبوعہ لغت "سرمایۂ زبان اردو" (از جلال لکھنوی) کی شرح ہے۔ زبان اور محاورے کے بارے میں اثر مرحوم بے حد راسخ العقیدہ واقع [illegible] ہندستان کے الفاظ [illegible]

بہت سے شہروں میں موجود ہیں، لیکن آخر میں ہندستانی نے لکھنوی محاوروں پر ہی نظر رکھتے تھے۔

لکھنو اسکول کے ایک دوسرے اسکالر مہذب لکھنوی نے "مہذب اللغات" چار جلدوں میں شایع کی ہے۔ یہ انفرادی کوشش کا نتیجہ ہے، اگرچہ اس لغت کی تدوین وسیع پیمانے پر کی گئی ہے، لیکن لغت نویسی کے بارے میں مصنف کے نظریات محدود ہیں۔ انہوں نے کسی معیار یا روزمرہ کے بجائے خدا جانے زبان کو مستند مانا ہے۔

"ترقی اردو بورڈ" پاکستان ایک عظیم لغت کی تدوین میں لگا ہوا ہے۔ یہ لغت آکسفورڈ ڈکشنری کے نہج پر تیار کی جا رہی ہے، چنانچہ ہندستانی نثر و نظم کی تمام مستند کتابیں پڑھ کر الفاظ فراہم کیے جا رہے ہیں۔ بورڈ کا سہ ماہی رسالہ "اردو نامہ" اس لغت کے نمونے پابندی سے شایع کر رہا ہے۔ اس میں ہندستانی الفاظ کے مسائل پر بھی دلچسپ مضمون شامل ہوتے ہیں۔

غزل

حمید قیصر

یوں جبینِ شوق رکھوں سنگِ در کے سامنے
جھک پڑے رحمت دعائے بااثر کے سامنے

اس قدر تاثیر ہو اپنی ہر اک فریاد کی
دادِ غم دینے آئیں چشمِ تر کے سامنے

روشنی کے سامنے تاریکیاں رہتی نہیں
شب کی تاریکی مٹی نورِ سحر کے سامنے

دیر اور کعبہ میں جا کر کیوں کرے قیصر تلاش
آپ تو موجود ہیں اس کی نظر کے سامنے

عطیہ پروین

چچی چمن کے گھر مہمان آئے

اللہ یہ پیاری پیاری ہنسی کس کی تھی ؟
حیرت ! حیرت !
چچی چمن ہنس رہی تھیں ! ہنسی کے مارے لوٹی جا رہی تھیں۔
میں جلدی سے امی اور خالا جان کے کمرے میں جا گھسی !
خالا جان اور چچی کسی بات پر ہنس رہی تھیں مجھے دیکھ کر وہ بھی چہکیں ۔

"آؤ آؤ پروین بیٹیا ۔ اوئی تم تو گولر کا پھول ہو گئیں دکھائی ہی نہیں دیتیں اے دہی مردی گدے بھر بھر ناولیں کہانیاں لکھا کرتی ہو گی ۔"

نہیں چچی لکھنے کی فرصت کس کم بخت کو ملتی ہے یہ چار پانچ فتنے جو اللہ میاں نے دے رکھے ہیں یہ بھلا لکھنے دیں گے ۔ میری اس فریاد پر چچی نے آنکھیں پھاڑ کر چیخ ماری ۔

"اوئی نوج ! اللہ اللہ کرو بی بی ۔ یہ کیا کہتی ہیں کفران نعمت (نعمت) نہ کرو اور سنو فتنے اے بی جس کو یہ فتنے نہیں ملتے وہ ترستا ہے ۔ اللہ کی مار اس موئی مردار محمودی خرافات پر اماں تانا مارا کرتی ہو اے بی اب سمجھ آیا کہ اکثر کام آئیں گے یہ بچے ہی"

"میں بیاہ برباد ہوں گی، مگر میرا علم زندہ رہے گا چچی۔"
پھر سے اس طرح کرکے چچی نے ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑا دیا جلدی سے اور پھر بیٹھ کر بولیں۔
"مجھ سے بولیں ہائے ایسا نام، ہوا اس نسوانہ ناولیں لکھ کر کے وہ کیا کہتے ہیں زندہ جاوید بنیں گی ۔"

"زندہ جاوید ۔۔۔" خالا جان نے اس کڑوی گولی کے ساتھ ہی یہ موئی تازی گلوری کلے میں دبا کر بولیں ۔

"یہی ہو گا ۔ ہزار دفعہ کہا کہ میری زبان پر یہ الفاظیں نہیں چڑھتیں ۔"

"الفاظیں نہیں چچی الفاظ ۔" میں نے بیچ زبان میں ٹوکا، اور تخت پر لٹک گئی ۔ چچی نے کلے میں دبی گلوری دانتوں کے نیچے لا کر سب درد سے کچلتے ہوئے کہا ۔

"دیکھو بی بی برا مانو چاہے بھلا میں کہے دیتی ہوں اب نہ مجھے ٹوکنا ہاں اور کیا میں کوئی طفل مکتب تو ہوں نہیں جو تم استر کی طرح میری زبان چھانٹا کرو ہو، اللہ رکھے گھر بار والی ہو چکی عادت نہیں جاتی اب اگر طفل مکتب کو طفل کتب کہہ دیا تو کیا ہوا زبان کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو جاتا اور وہ بھی بات پیچھے رہ جاتی، اس لیے خاموش رہنا اچھا ۔
چچی نے پلنگ کے نیچے جھک کر پیک تو تھوکی لیے شاید اگالدان تلاش کیا، جب نہ ملا تو اور کونے سے اگالدان اٹھا کر لائی ۔ انہوں نے صبر ہو کر کمرے کے آنچل سے فرش پونچھا پلنگ گلاب کے پھول کی صورت میں اور اطمینان سے بیٹھ کر بولیں ۔

"ائے ہے چمن کا بیڑہ غرق کر کے ناس کر دیا تم نے - اللہ قسم ابھی صبح اپنے ہاتھوں سے گھس گھس کر فرش دھویا تھا - کیا اچھا دالان تو رکھا ہوا تھا - سبھی صفا کر دیا تم نے -"

خلاف امید مجھ کو غصہ نہیں آیا بڑی سادگی سے بولیں —

"ائے ہاں بھابی سچ بڑی غلطی ہوئی نگوڑا چندن سا فرش بڑا اچھا تھا جانے دو میں ابھی کپڑے سے پونچھ دوں گی - اللہ قسم مجھے اسی لیے یہ پکے اور سیمنٹ کے فرش ایک آنکھ نہیں بھاتے - دنیا زمانے سے جتن کرو تب صاف ہوں اپنے کچے فرش اچھے زیادہ محنت [illegible] مٹی سے پات لیا کرو دھواں سیاہ پڑا گوبر ڈالا لو صاف چمکیلے لاک لاک سارا دالان آنگن چمکا کر رکھو ممی نے اس کان سن اس کان اڑا دیا میرے تو فرشتوں سے بھی دھلائی صفائی نہ ہوئی"

اتنا کہکر انہوں نے بات بدل دی —

"سنا ہے دیپ بی بی کی بڑا مزا آیا — "

ممی ہمہ تن گوش ہو کر بولی —

"کیا ہوا بجی ؟"

بجی کا جوڑا ڈھیلا ہو گیا تھا تھوڑا کھول کر دانت میں دبا ! چٹیا کو بل دیکر اس قدر کس کر دوسرا جوڑا بنایا کر گردن کے چھوٹے چھوٹے بال کھنچ کر رہ گئے - اس کے بعد ڈوپٹے پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر کر اور پہلو بدل کر بیٹھ گئیں -

"ائے بیٹی اعمال کی شامت کہوں بزار چلی گئی تھی"

"اف نو! بازار — خالہ جان نے یہ الفاظ کھینچ کر ادا کیے اور ممی تھیں یہ جیسی ہو کر بولیں -

"ائے ہے بڑا تعجب ہوا بیٹ بڑا اگن و کیا میں نے تم دنیا جہان کے پھیر سے کے گرد وہ کیا کہتے [illegible] (شاپنگ)، ٹیک ٹیک ستاد سب بیچتے - ایک ہی بزار کا بازار تو کتنا کار ہے"

"ائے بھیا ابھی تو مطلب نہیں ہے - میں نے تو بجی کا سر درد ست کر دیا - ہم لوگوں کو تو خشکہ

ایک تو یہ کہ انگریزی بولنے لگیں دوسرے بازار جانے لگیں —

ممی انکساری کے ساتھ بولیں —

"ائے بیٹی انگریزی پھنگریزی کیا لوگوں کی تھوڑی سی بہت الفاظیں استعمال کر لیتی ہوں پڑھی لکھی عورتوں سے ملنا پڑتا ہے -"

"کیوں نہیں کیوں نہیں - میں نے اور لقمہ لگایا بڑی بڑی عورتیں آتی ہیں میری چچی سے ملنے کے لیے "

چچی کو ایک دم جوش آ گیا سنبھل کر بیٹھتی ہوئی بولیں —

"ارے ہے بیٹی بس کچھ نہ پوچھو جانے کہاں کہاں سے آتی ہیں فلانے ڈپٹی کی بی بی ہیں فلانے تحصیلدار کی بی بی ہیں چڑک بھڑک کرتی یہ بڑا بیگ لٹکائے چشمہ چڑھائے وہ دو انگریزن جیسا [illegible] مانو ابھی ابھی لندن سے چلی آرہی ہوں میاں نے بھی خوب خوب انگریزی بولی ارے ہاں جیسا دیس ویسا بھیس کہاں تک اپنی دیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے بیٹھی رہوں -"

ارے ہاں مجھے ایک دم یاد آ گیا - پرسوں آپ کے یہاں کوئی مہمان آ گئے تھے چچی بھیا بتا رہے تھے -"

چچی نے غرور کے ساتھ گردن اکڑا کر چاروں طرف دیکھا پھر فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ بولیں -

"ہاں بی وہ جو نئے فیملی دلی آئے ہیں ان کی بیبی تھیں —"

"فیملی دلی !" خالہ جان نے دہرا کر چچی کو دیکھا -

"ہاں بی ڈپٹی کلکٹر کو انگریزی میں فیملی دلی کہتے ہیں" چچی نے ہماری جہالت یا نادانی پر گویا ترس کھاتے ہوئے کہا -

میرے دل میں بڑے زوروں سے گدگدی ہوئی ہنسی روکنے کے باوجود ہنسی پڑی اور چچی نے کچھ چتونوں سے مجھے دیکھ کر کہا —

"اور اور سنو جی کیا کہتے ہیں کوئی ہنسنے والی بات کہدی کیا میں نے"

"جی چچی کلکٹر کو ہندستان میں منشی دھیش کہتے ہیں فیملی دلی نہیں —"

بوا بہت کچھ معلوم ہے اچھن میاں مجھے بتایا کرتے ہیں اور سنو اپنا رعاب جانے کے لیے سہی بات کو بھی غلط کر دیں گی اسے اسی لیے میں اب کوئی نئی بات نہیں بتاتی ہوں۔" یہ کہکر چچی جانے کے ارادے سے پاؤں پلنگ سے اتار کر جوتیاں ٹٹولنے لگیں میں جلدی سے تخت پہ آگے کھسک کر بولی۔

"اف نوں تو کمشنر صاحب کی بیگم آئی تھیں، تب تو بڑے بڑے انتظام کیے ہوں گے چچی۔ ہائے مجھے جو ذرا نہ پوچھا آپ نے کچھ کام ہی کر دیتی!"

چچی کا موڈ آن واحد میں ٹھیک ہو گیا پاؤں پھر اوپر چڑھا کر چہکیں۔

"اے بیٹی انتظام کیا جو غریبا مئو ہو سا خاطر کی کمشنر ہوں یا کل کرٹ اندرا گاندھی بھی آجائیں تو بی بی میری دیہیں چولہے پاس بٹھا کے پیالا بھر چائے پلا دوں گی زیادہ سے زیادہ در آبدار کا ایک انڈا ابال کے کھلا دوں گی۔

ارے بی اب انڈے اور چائے سے بڑھ کر کون خاطر داری ہوگی ساٹھ ستر پیسے کا ایک انڈا اور ہوٹل ریسٹ پر تیس پیسے ایک چائے کی پیالی غریب آدمیوں کے لیے یہی بہت ہے، مگر بی تم نے کمشنر صاحب کی بیوی کو چولہے کے پاس بٹھا کے چائے پلا دی؟

خالا جان نے پوچھا اور مارے اشتیاق کے مع پاندان اپنا پلنگ چھوڑ چچی والے پلنگ پر آ بیٹھیں۔

چچی نے موقع غنیمت جان کر فوراً پاندان کھول لیا، اور ایک بڑی سی ڈلی نکال کر سروتے کے اندر دباتی ہوئی لاپرواہی کے انداز میں بولیں۔

"پھر اور کیا مسہری لگاتی قالین بچھاتی۔ اے کی بڑی ہوں گی اپنے گھر کی میری جتنی حیثیت ہوگی خاطر کروں گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے چچی کو خوش کر دیا۔

"ہے تو ٹھیک" چچی نے سروتا پلنگ کی پٹی پر رکھکر ڈلی کے دو ٹکڑوں میں بٹ گئی تو دو پیسے کے آنچل میں کترتے ہوئے بولیں۔

[illegible]

ہے بی بی جا ہے برا لگے کسی کو جا ہے بھلا میں خدا لگتی بات کہوں گی۔ اپنے گھر میں کوئی کیا جانے کس حال میں ہو ہم ملک الموت کی طرح آ دھمکو۔ اسے میں تو حق دق رہ گئی۔ آنگن نگوڑا سر پر چڑھا آ رہا تھا نیم کی پتیاں سینکیں اللہ رکھے ور آبدار اور تاجدار کے پروں اور بیٹ کا انبار سر چار لاد جھاڑ لگا رہا تب نہاؤں پورے پر نہانے کے لیے پانی چڑھا کے جھاڑو اٹھائی ہی تھی کہ نگا عطر کے گھر سے لڑکے جیسے وہ خشبو وہ خشبو کی وہ کیا کہتے ہیں مشام جان تر ہو گیا۔"

"مشام جان معطر ہو گیا" میری زبان کمبخت مانع نہ سکی، مگر اللہ کا ہزار ہزار احسان چچی کا جوش اور روانی زوروں پر تھی، اسی انداز میں کہتی اور نئی کاٹتی رہیں۔

"اب جو نگاہ اٹھائی تو دیکھا حور پری کی طرح جو تی کی دلہن بنی ایک بی بی کھڑی ہیں سمجھا بھی خشبو اڑ رہی ہیں، اے بی مجھے تو لگتا ہے عطر کی پوری شیشی انڈیل لی تھی۔ کھنچنے لگیں تسلیم میں نے کہا جیو سلامت رہو، مگر بی بی پہچانی نہیں میں اللہ رکھے کہاں سے آئی ہو۔ کہنے لگیں میں فلانے میاں کی بیاہی ہوئی۔"

چچی نے رک کر ڈبیا سے ایک پان اٹھایا اور چونا لگاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"بس بی بات پاؤں مورے ٹھنڈے ہو گئے، پالکی پھر پسینا بہہ گیا بھلا بتاؤ گھر پر کوئی مرد نہ عورت نوکر چاکر کے نام پر مرا چڑیا کا بچا بھی نہیں، گھر کی بی بی بھتنی کی صورت کھڑی ہیں اور یہ موذن مہمان بے بلائے بے بتائے سر پر کھڑے ہیں۔"

"موزن مہمان۔" خالا جان سے ضبط نہ ہو سکا۔

چچی کے جواب دینے سے پہلے میں نے کہا۔

"معزز مہمان۔ ہاں تو پھر چچی۔"

"پھر کیا بیٹی۔ چچی نے پان پر کتھا لگایا، کلا ڈالی تمباکو کو اک بڑے اہتمام سے گلوری بنائی پھر منہ میں رکھکر جگالی سی کرتی ہوئی بولیں۔

"ارے مرا مشکل کو بیار ادل کو تا رہیں گی خیال پیشانی سے ان کو پلنگ پر لا کے بٹھایا۔"

"خندہ پیشانی سے" میں بڑبڑائی۔ ہاں بڑبڑائی [illegible]

[illegible]

پھپک کر گلاب اُگا۔ خالہ جان اور میں دونوں ہی بے بسی سے دیکھتے رہے۔ بولنا یا ٹوکنا اس وقت بارود کے ڈھیر میں چنگاری ڈالنا تھا۔ پھپک تڑک کر پھپھی نے سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی سے ہونٹ پونچھے پھر وہ ہتھیلی پلنگ کی پٹی پر رگڑی اور کھنکار کر سلسلہ جوڑا۔

"کیا بتاؤں آئی ہو۔ آنکھوں پر چشم روشن دل شاد، مگر یہ یوں بن کہے بتائے کسی کے گھر جانا نہیں چاہیے۔ اللہ جانے کون کس حال میں ہو۔"

"اس طرح کہہ دیا آپ نے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کیوں نہ کہہ دیتی کسی کا ڈر تھا! اے بی وہ کیا کہتے ہیں راشن پتہ بھی آ جاتیں تو میرے اوپر رعاب د پڑسے کسی کی رعیت تو ہوں نہیں۔ اکبر بادشاہ کی نسل سے ہوں یہ شاہی خون دوڑتا ہے رگوں میں ابھی لاکھ لٹ جائے سوا لاکھ ٹکے کا۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے، مگر یہ راشن پتی۔" خالہ جان کی مشکل میں نے پھر حل کی۔

"واہ ری خالہ جان نہیں سمجھتیں کہ ہماری پھپھی ہندستانی بھی اب کتنے ٹھاٹ سے بولنے لگی ہیں راشن پتی کا مطلب ہوا صدر یعنی راشٹرپتی۔"

خالہ جان ہنسنے لگیں، اگرچہ پھپھی نے ان کی ہنسی کا نوٹس نہیں لیا اسی زور و شور سے کہتی رہیں۔

"اے یہ بڑی شرمندہ ہو گئیں آپ۔ ٹھیک عرض کرتی ہیں اب میں خیال رکھوں گی ہاں واقعی کسی کے غریب خانے پہ اس طرح نہ جانا چاہیے۔"

"عرض کرتی ہیں کا مطلب ہوا فرماتی ہیں۔ غریب خانے کا مطلب ہوا دولت خانہ۔" میں نے زیرِ لب تصحیح کر کے اپنے دل کو تسکین دے لی اور خالہ جان کو جو بولنے کے لیے بے چین تھیں چپ رہنے کا اشارہ کر کے پھپھی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"وہ پوچھنے لگیں آپ کا غالباً تعارف ہو چکا ہے بڑا باعثِ مسرت معلوم ہوئی ہے آپ سے۔"

اس بار خالہ جان باز نہ آئیں ٹوک کر کہہ دیا۔

"غالباً تعارف نہیں بی غائبانہ تعارف کہو"

پھپھی نے بھنویں سکوڑ کر ان کی طرف دیکھا، اور بڑی ہی بے دردی کے ساتھ بہت بڑی پھپک ارشاد فرما دی۔

"بس بی چپ رہو تمام خاہی میرا مجاز نہ خراب کرو میں اپنی اسی بولی میں ٹھیک ہوں — وہ بڑی طرح سے خالہ جان کی طرف پیٹھ کر کے گویا روٹھ کے بیٹھ گئیں اور مجھ سے مخاطب ہو گئیں۔

"سنا بیٹی محبتوں کے دریا بہا دیے نگوڑی نے، اے مجھے بھی للک آ گئی اتنی دور سے دوڑ کے آئی تھی نہانا اٹھا دوسرے روز پر اٹھا دیا، جلدی سے چائے بنائی دو انڈے ابالے چولہے کے سامنے پیڑھی ڈال دی آدی بی لو گرم گرم میں بیٹھو چائے پیو۔"

"بیٹھ گئیں؟" میں نے بے حد قلق کے ساتھ پوچھا۔

"اے ہے کیوں نہ بیٹھتیں باورچی خانے میں تھوڑے بٹھایا تھا وہ کیا کہتے ہیں کچن میں بٹھایا تھا۔"

"کچن کا مطلب ہوا کچن" میں پھر بڑبڑائی۔

"وہ وہ تو غنیمت کر کے چائے پی اُنہوں کی تیا لال" پھپھی تغزیہ لہجے میں کہہ رہی تھیں، اللہ رکھے دونوں انڈے ڈکار گئیں۔"

میں ہنسی تو خدا رکھے پھپھی بھی ہنس دیں۔

"اے ہاں بیٹی نہ ذرا سی شرم نہ تکلف تج! ہم لوگوں کی طرح کوئی کھائے گھر میں حلق تک ٹھونسیں گے باہر جا کے آدھا پیٹ کھائیں گے میں نے کبھی جو کسی دعوت میں بھر پیٹ کھانا کھایا ہو اور وہ کیا مزے سے دو انڈے اور دو پیالی چائے اڑ گئیں دودھ ختم ہو گیا تھا نہیں تو اور چائے پیتیں۔"

"اے ہے ان کے سامنے دودھ بھی ختم ہو گیا،" خالہ جان نے کہا تو پھپھی تنک کر بولیں۔

"تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے کیا خبر تھی وہ آ پڑیں گی تو انتظام نہ کر لیتی اب اس وقت کون تھا جو منگاتی شام کی چائے کے لیے رکھا تھا اسی میں کام نکال لیا تھا، اور آدھ پیاؤ ہاں اور کیا۔"

"پھپھی تو آپ خوب انگریزی بولیں؟" میں نے

ب کو پھر جوش دلانے کے لیے پوچھا۔
"اے نہیں بیٹی کیسی انگریزی!" چچی نے انکسار اور فخر کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ کہا، "جو الفاظ میں انہوں نے بولیں ان کو ہر ایرا غیرا نتھو خیرا سمجھ لیتا ہے میں نے بھی جواب دے دیا اور کہا۔
"اری بیٹی مثلاً احمق کیا انہوں نے کہا چائے بڑی گڈ بنائی ہے آپ نے میں نے کہا تھینک دو۔"
"کیا؟" میں نے اور خالا جان نے یک زبان ہوکر کہا۔ "تھینک دو؟"
"اور کیا" چچی نے شان بے نیازی کے ساتھ فرمایا۔ "انگریزی میں یہی تو کہتے ہیں۔"
"تھینک یو۔" خالا جان کے اوپر ہنسی کا شدید ترین دورا پڑا اور مجھ سے بھی ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ چچی نے بڑی حیرت سے ہم دونوں کو دیکھا اور بگڑ کر بولیں۔
"لو اور سنو زبردستی قصے کہانیاں بھی سنو اور مذاق بھی اڑاؤ بڑے بڑے میرے آگے پانی بھرتے ہیں اور تم لوگ یوں چٹکیوں میں اڑاتی ہو۔ اللہ کی شان ہے۔"
"چچی ہم آپ پر تھوڑے ہنس رہے ہیں، ان بیگم صاحبہ پر ہنس رہے ہیں" "دو دو انڈے کھا گئیں یعنی حد ہو گئی۔ ارے آبدار کے انڈے ماشاء اللہ اتنے بڑے بڑے ہوتے ہیں کہ سچ سے تو ایک انڈا بھی پورا نہ کھایا جائے۔" میں نے جی بھر بھر مکھن لگایا اور چچی غصہ کو بھول چہک اٹھیں۔
"اللہ نظر بد سے بچائے دوست شاد دشمن مرے پامال آنکھوں میں چرھے سے انگارے ارے بیٹی بس کچھ نہ پوچھو لہلوٹ ہو گئیں۔ ارے کیا لذت دار انڈا تو میں نے کھایا نہیں اور اتنا بڑا مزا بھی نہیں کھا۔"
ان کے جانے کے بعد میں نے اپنی درایدار کے اوپر سے تنگ مجھ سی آتاری ڈھیف بڑی چیز ہوتی ہے۔"
"ہاں واقعی۔" میں نے پرزور تائید کی۔ پھر کیا

"اری بیٹی کیا امیر حمزہ کا قصا ہو گیا۔ جی بھر بھر کھایا پیا گئیں بہت بلا گئیں ہیں ضرور ضرور وہ کیا کہتے ہیں میرے دولت خانے پر۔"
"غریب خانے پر۔" خالا جان نے لقما دیا۔
"دیکھو بھابھی اپنے آپے میں رہو زرا کھل رہا ہو میرا بیٹھنا تو کچھ برآمدے میں جا بیٹھوں کوئی تمہاری جاگیر یہ نہیں بیٹھی ہوں اللہ رکھے اسلم میاں اور بھائی جان کا بھی آدھا حصا ہے۔"
"ارے تم تو باقاعدہ مورچا سنبھال بیٹھیں۔" خالا جان کچھ کھسیانی سی ہو گئیں میں نے جلدی سے معاملا سنبھال لیا۔
"چھوڑیے بھی چچی یہ گرما گرمی۔ خدا یہ بتایئے آپ نے کیا کیا انگریزی بولی۔"
"اے کیا میں نرس بنا کے لائی ہوں جو بتادوں۔" چچی کا موڈ اب سنبھل رہا تھا سخت بے زاری کے ساتھ بولیں۔ چلنے لگیں تو کہنے لگیں "اچھا بھائی جاتی ہوں۔ میاں نے کہا ہی اکیلی ہوں گھر میں نہ بھاؤ بیان نہ بہن لڑکا ہے سو پردیس میں پڑا ہے ایک مردار تم میں سے بیٹھی ہو۔"
انہوں نے ہاں ہاں کہا ہوگا میں نے دل زبان میں کہا۔
"ہوگا بھاڑ میں جائے۔" چچی منہ بنا کر چپل پہننے لگیں
"آپ جایئے گا چچی تو مجھے بھی بنا تو دیجیے گا۔" میں نے کہا اور چچی ذرا خوش ہو کر بولیں۔
"اے سچ! ضرور چلنا کبھی تم سے چلنا کی چلتے چلتے نکاح کی طرح قبول اگئیں آپ کا فقیر غریب خانے پر ضرور ضرور قدم رنجا فرمایئے گا۔"
"قدم رنجا۔" کہہ کر میں نے فوراً بات بدل دی، اور وہ بازار والی بات تو رہ گئی چچی۔"
"بزار والی بات"! چچی نے ذرا غور کیا اور اچانک ہنس دیں۔ "اے ہے بیٹا مردار بڑی لمبی بات ہے پھر بتاؤں گی مجھے نماز کی دیر ہو رہی ہے لحاف بھروایا ہے تاگے بھی ڈلوانا ہیں ایک اکیلی جان کیا کروں کیا نہ کروں پوند بھر کا تو دن ہوتا ہے لوگ پھر اس لیے لاتے ہیں کہ بات سے کیا اچھی وقت آرام لے گا میری پھر آنے کے بجائے میرے لڑکے کا رخصت کروا [illegible] قصا سناتی ہے

محمد اقبال ندوی

سائپرس یا قبرص

ادھر کچھ عرصے سے اخبارات میں سائپرس یا قبرص کا ذکر بہت آرہا ہے، اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے تاریخی حالات بیان کر دیے جائیں۔ نیچے کی سطریں اسی خیال کے تحت سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔ — ندوی

سائپرس یا قبرص بحر متوسط کے مشرقی حصے میں ایک جزیرہ ہے جس کا رقبہ ۹ ہزار ۲ سو ۵۱ مربع کیلومیٹر ہے اور آبادی ۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۵ لاکھ ۳۰ ہزار ہے۔ یونانی ۴،۳۰،۰۰۰ اور ترک ایک لاکھ ہیں، اس کا دار السلطنت نکوسیا ہے، اور اس کے مشہور شہر لیماسول Limu ooe اور فاماگوسٹا Eamagwta ہیں۔

حضرت عمر کے زمانے میں جب شام پورے طور پر اسلامی حکومت کے دائرے میں شامل ہو گیا اور حضرت معاویہ اس کے گورنر مقرر ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ رومیوں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے مسلمانوں کو بحری طاقت حاصل کرنا ضروری ہے لیکن عراق شام اور مصر کے معرکوں میں بہت سے تجربہ کار سپہ سالار اور جان باز سپاہی شہید ہو چکے تھے، اور بری لڑائیوں کا سلسلہ ابھی تک بالکل ختم نہیں ہوا تھا، اس لیے حضرت عمر کی احتیاط پسند اور مآل اندیش طبیعت نے بحری لڑائی کی اجازت نہیں دی۔ چند برس میں جب اسلامی اقتدار مستحکم ہو گیا تو حضرت عثمان کے دور میں بحری مہم کی اجازت مل گئی۔ حضرت معاویہ نے جنگی کشتیوں کا ایک بڑا زبردست بیڑا تیار کیا، سائپرس یا قبرص بحر روم میں کلید کی حیثیت رکھتا تھا، اور شامی سرحد سے قریب تھا، مصر سے بھی آسانی سے مدد پہنچ سکتی تھی، اس لیے حضرت معاویہ نے اس طرف اپنے بیڑے کو حرکت دی۔ مصر سے عبداللہ بن سعد بھی کمک لیکر آگئے، اور قبرص پہنچکر اس کے ساحلی علاقے پر حملہ آور ہوئے، لیکن اہل قبرص نے جنگ کے بجائے سالانہ سات ہزار دینار ادا کرنے کے وعدے پر صلح کر لی، یہی رقم وہ اس سے پہلے رومیوں کو دیتے تھے، اس کے ساتھ انہوں نے یہ اقرار کیا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے، اور ہمیشہ مسلمانوں کو رومی دشمنوں کی نقل و حرکت سے باخبر کرتے رہیں گے۔

لیکن اس معاہدے کے خلاف انہوں نے ۳۲ھ میں مسلمانوں کے خلاف جنگی کشتیوں اور اسلحہ سے رومیوں کی مدد کی، تو حضرت معاویہ نے ۳۳ھ میں دوبارہ قبرص پر چڑھائی کی، لیکن وہاں کے باشندوں نے پھر صلح کر لی اس مرتبہ وہاں کا نظم و نسق قابو میں رکھنے کے

ثابت پایا تھا فوج روانہ کی جنہوں نے [illegible]
کیں اور شہر آباد کیے۔ امیر معاویہ کی وفات تک وہاں
کے باشندے خراج دیتے رہے، لیکن ان کے
بعد پھر خراج دینا بند کر دیا اس کے نتیجے میں تادیبی
کارروائی پھر کی جاتی رہی، اور بنی امیہ اور بنی عباس
کے فتوحات عہد میں یہ جزیرہ اسلامی حکومت کے
دائرے سے باہر نہیں نکلنے پایا۔

جب بارہویں صدی عیسوی میں صلیبی حملوں کا
سلسلہ شروع ہوا تو ۱۱۹۱ء میں انگلستان کا
بادشاہ رچرڈ سسلی سے فلسطینی شہر عکا کی جانب روانہ
ہوا تو تیز طوفانی ہواؤں نے اسے منزلِ مقصود کے
بجائے جزیرے قبرص کے ساحل پر پہنچا دیا۔

قبرص کے حکمران اسحاق کو جب اس کی اطلاع ہوئی
تو اس نے اس جنگی قافلے کو گرفتار کرنے اور اس
کے مال و اسباب پر قبضہ کر لینے کا حکم دیا۔ رچرڈ
خود تو ہاتھ نہیں آیا، مگر اس کی لڑکی "جوآنا"
اور اس کے خادم گرفتار ہو گئے۔ رچرڈ بہت
غضبناک ہوا اور چند دنوں کے بعد اس نے جواباً
قبرص پر فوج کشی کر دی، اور معمولی جنگ کے
بعد قبرص کے دارالسلطنت پر قابض ہو گیا۔ اسحاق
نے اپنے آپ کو رچرڈ کے حوالے کر دیا۔ اس کے
بعد رچرڈ قبرص کا انتظام ایک فوجی دستے کے سپرد
کر کے عکا کی جانب روانہ ہو گیا، اور ایک عرصے
تک محاصرے کے بعد جون ۱۱۹۱ء میں اسے فتح کر لیا۔

رچرڈ کی فتح کے بعد قبرص صلیبیوں کی تحریک
کا مرکز بن گیا، جس کا اندازہ [illegible] کے [illegible]
سے ہوتا ہے۔ ابن اثیر کے قول کے مطابق وہ
انگریزوں کی طاقت کا ایک مرکز ہو گیا۔ ۱۱۸۷ء
میں سلطان صلاح الدین نے جب بیت المقدس
فتح کر لیا تو یہاں کا فرنگی حکمران [illegible] قبرص
چلا گیا، اس طرح قبرص فرانسیسی ملکیت کا ایک
حصہ ہو گیا جس کی وجہ سے فرانسیسی تہذیب آج
[illegible] ہے۔ [illegible] فرانسیسی [illegible]
[illegible] مصر

نواح میں فرانسیسی معماروں کی تعمیر کردہ عمارتوں،
محلوں اور کلیساؤں سے فرانسیسی تہذیب و
ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔

قبرص ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بحر روم
کے دروازے مسیحی حملہ آوروں کے لیے کھل گئے
اور اسلامی ممالک ان کے حملوں کی آماجگاہ بن گئے
چنانچہ ۱۳۶۵ء میں اسکندریہ پر شدید حملہ [illegible]
یہ جو [illegible] تھا کہ حملہ کا خیال [illegible]
ہی میں تھے کہ عیسائی فوجیں اسکندریہ میں [illegible]
اور بڑی بے دردی سے قتل و غارت گری کی
لیکن اس جنگ میں مالِ غنیمت کی کثرت [illegible]
کے شدید نقصان کے باوجود پطرس کو [illegible]
کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ عباسی [illegible]
خلیفہ تھے، مصر پر مملوک سلاطین کی حکمرانی تھی
چنانچہ ان کی طرف سے [illegible]
حملہ آور [illegible] کا سردار پطرس اس سے پہلے
بھاگ چکے تھے، بقول [illegible] پطرس [illegible]
طرح اسکندریہ میں داخل ہوا، [illegible]
نکل گیا"۔ اس کے بعد [illegible]
حملہ نہیں ہوا، مگر [illegible]
اور مصر کے شمالی علاقے میں [illegible] حملے کا [illegible]
لگا رہتا تھا۔

آخر ۱۴۲۲ء میں جب سلطان برسبائے
مملوک سلطنت کا تخت نشین ہوا تو اس نے [illegible]
اولوالعزم بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلنے کا فیصلہ
کر لیا، اور قبرص کو فتح کر کے ازسرِنو [illegible]
میں شامل کر لینے کا منصوبہ بنایا، وہ ارادہ کر چکا
تھا کہ [illegible] حالات نے اس کا موقع پیدا
کر دیا کہ ۱۴۲۳ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کی
کشتیوں کو سازوسامان اور سپاہیوں سمیت [illegible]
کے ساتھ گرفتار کر لیا، اور قبرص کے حکمران نے
چاہا دے کر اپنے قبضے میں کر لیا تو برسبائے نے اپنے
ارادے کو مزید مستحکم کیا اور قبرص کو
فتح کرنے کا فیصلہ کیا۔

کی پہلی بار سنہ ۱۴۲۴ء میں حملہ کیا۔ ان کے جنگی جہازوں نے تباہ اور لیماسول کے بعض علاقوں کو تاراج کرنے کے بعد قیدیوں کی بڑی تعداد اور کثیر مال غنیمت کے ساتھ مصر واپس آیا۔

دوسرا حملہ پہلے کی بہ نسبت وسیع تھا سنہ ۱۴۲۵ء کے موسم گرما میں مصری ساحلوں سے حملہ آور ہوا اور بیروت، طرابلس اور شام سے گزرتا ہوا قبرص کے شمال مشرقی ساحل "کارپاس" کے بندرگاہ پر جا پہنچا اور وہاں "فماگوستا" کی جانب رخ کیا، سوار اور پیدل فوج کے خشکی پر قدم رکھتے ہی فماگوستا کے حکمران نے اطاعت اختیار کر لی، شہر کے قلعے پر فتح کا پرچم لہرانے کے بعد بادشاہ کو امان دی گئی، مسلمانوں نے چار روز میں قرب و جوار کے علاقے کو فتح کرکے لارناکا کا رخ کیا، جہاں قبرصیوں کے ساتھ سخت معرکہ ہوا، اس جنگ میں قبرصیوں اور ان کے معاون انگریزوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا، مسلمان شکست کا شائبہ دینے کے بعد لیماسول پہنچے اور قلعے کے ایک بڑے حصے کو مسمار کرتے شہر کے اندر داخل ہو گئے، اور قلعے پر اپنا شاہی علم نصب کر دیا، لیکن قبرص پر بنادقہ کے فوج کی چڑھائی کی خبر پا کر مسلمان قدم آگے بڑھانے کے بجائے قاہرہ لوٹ آئے۔ اس جنگ میں بہت سے قبرصی قید ہوئے اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا، لیکن برسبائے نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ اس کے حملے کا مقصد محض غارت گری، مال و دولت اور لوٹ کھسوٹ نہ تھا، بلکہ اس جزیرے پر پورا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ دشمن اس کو مصر پر حملہ کا اڈا نہ بنا سکیں، اس خیال کے مطابق سنہ ۱۴۲۶ء میں قبرص پر حملہ کیا اور لیماسول کو فتح کرکے دشمنوں کی ایسی سرکوبی کی کہ پھر انہیں سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو۔ اس نے فاتح ہو کر جزیرے کے اندرونی علاقے میں داخل ہوئے، لیکن قبرص کا حکمران جانوس بھی خیروکیتا کے مقام پر پانچ ہزار سواروں اور سات ہزار پیادوں کے ساتھ مقابلے کے لیے تیار تھا، دونوں فریقوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی، آخر کار قبرصیوں کو شکست ہوئی، اس لڑائی نے ان کا زور توڑ دیا، اور ان کی فوجی طاقت کا خاتمہ ہو گیا، مسلمانوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور جزیرے کے دارالسلطنت کی جانب بڑھے، اب قبرصیوں میں مقابلے کی طاقت باقی نہیں رہ گئی تھی، آسانی کے ساتھ نکوسیا فتح ہو گیا، اور اس کے گرجا بازار اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھے، اذان دی گئی جمعہ کی نماز پڑھی گئی، پائے تخت کے امرا، اہل علم اور پادری انجیل ہاتھ میں لے کر پناہ کے طالب گار ہوئے، مسلمانوں نے ان کی درخواست قبول کی اور امان عام کا اعلان کر دیا، اس دن سے قبرص باضابطہ سلطان اشرف برسبائے کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

سلطان قاہرہ واپس ہوئے تو قبرص کا سردار جانوس تین ہزار قیدی اور بے شمار مال غنیمت ساتھ تھا۔ شہر میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا، یہ جلوس جب قلعے جبل پہنچا تو جانوس اتر کر زمین بوس ہوا، پھر جب سلطان کے پاس حاضر ہوا تو قدم بوسی کی، اس کی جان بخشی کی گئی، لیکن احتیاط کے طور پر حراست میں قلعے کے برج میں رکھا گیا۔ یاد ہوگا کہ سنہ ۱۳۶۵ء میں اچانک اسکندریہ پر قبرص کی طرف سے حملہ کیا گیا تھا، اور بے شمار مسلمانوں کو بے دریغ تہ تیغ کیا گیا تھا۔ شاہ اشرف برسبائے کی اس فتح نے لوگوں کے جلے ہوئے دلوں پر مرہم رکھا اور ذلت کا احساس دور کیا، اور ان کے اندر نئے سرے سے اعتماد پیدا ہوا، از راہ کرم جانوس کو دو ہزار دینار فدیہ لے کر آزاد کر دیا گیا، اس کے بعد سے قبرص سلاطین مصر کی بقا حکومت تک مصر کے زیر اثر رہا۔ جب سنہ ۱۴۵۸ء اور سنہ ۱۴۵۹ء میں ارکان سلطنت میں شدید اختلاف شروع ہو گیا تو سنہ ۱۴۷۱ء میں بنادقہ پھر اپنا رسوخ قبرص پر وسیع کرنے لگے، یہاں تک کہ وہ جزیرے کے والی ہو گئے۔ سنہ ۱۵۱۷ء میں مصر ترکان آل عثمان کے قبضے میں آیا اور سلطان سلیم اول کے دور خلافت عثمانیہ کا آغاز ہوا، لیکن قبرص کی فتح دوسرے سلیم کی منتظر تھی۔

جب سلطان سلیم ثانی نے یمن کو فتح کرنے اور فتنے کو فرو کرنے کے بعد اطمینان کی سانس لی تو جزیرے قبرص کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ اگست ۱۵۷۰ء میں سپاہ سالار مصطفےٰ ایک لاک فوج سات کشتیوں اور تین جنگی جہازوں پر مشتمل عثمانی بیڑے کے ساتھ ایک قدیم شہر ۱۱ نوسٹ پہنچا۔ ترک فوج کی مزید کمک بھی جاری رہی، بنادقانے ۱۵۶۷ء میں شہر کی دیواروں کو مضبوط کر دیا تھا۔ اس کے ارد گرد خندق کھود دی تھی، اور اس نگرانی اور حفاظت کے لیے فوج کا ایک مضبوط دستہ متعین کر دیا تھا، لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں ان کا دفاع کارگر ثابت نہ ہوا یہ محاصرا عید تک ایک ماہ جاری رہا، لیکن ۹ ستمبر میں ترک شہر میں داخل ہو گئے۔ اس جنگ میں تقریباً بیس ہزار افراد قتل اور تقریباً بیس ہزار گرفتار کیے گئے۔ ایک ہفتے میں پورا تسلط قایم ہوا۔

ترک فماگوستا کے علاوہ تمام شہروں میں قابض ہو گئے اور طبلا بھی اسی سنہ میں فتح کیا، طویل مدت تک محاصرے سے پریشانی اور سخت سردی کی وجہ سے ۱۶ اپریل کو مسلمانوں نے جنگ چھیڑ دی، نیقولا اپنے حامیوں کی سات ہزار تعداد لیکر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا اور مسلمانوں کی پیش قدمی روک دی۔ نیقولا نے حفاظت کی غرض سے شہر کی دیواروں کو اور مضبوط کیا، اور اس کے چاروں طرف گہری خندق کھدوائی، لیکن غذا کی قلت نے شہر کو مسلمانوں کے حوالے کرنے پر مجبور کیا، انہوں نے یہ شرط رکھی کہ پیادوں اور سواروں کو کاندیا تک ترکی کشتیوں سے جانے کی اجازت دی جائے، لیکن مسلمانوں نے اس شرط کو تسلیم نہیں کیا، اور ان سب کو گرفتار کر لیا، نیقولا سارے ہنگامے اور کشت و خون کا ذمے دار تھا، اس کی وجہ سے ہزاروں شہریوں کی جانیں گئیں، اسلیے اس کی جان بخشی نہیں کی گئی، اور قتل کی سزا دی گئی۔

اس کے بعد قبرص عثمانی حکومت کا ایک [illegible] سے [illegible]

دولت عثمانیا کی حالت کمزور ہونے لگی تھی، اور یورپ کی حکومتیں اس کی نقصان رسانی میں معروف تھیں، اور آہستا آہستا یورپی مقبوضات ترکوں کے ہات سے نکلتے جارہے تھے، جنگی اہمیت کی بنا پر قبرص پران کی نظر تھی، وہ بحر روم کی کنجی سمجھا جاتا تھا، لیکن ترکی حکمرانوں نے ۱۸۷۸ء تک اسے ہات سے نکلنے نہیں دیا۔ ۱۸۷۶ء میں سلطان عبدالحمید تخت نشین ہوئے اس وقت دولت عثمانیا بڑی مصیبت میں مبتلا تھی۔ یورپی حکومتیں ترکی کی عیسائی رعایا کو بھڑکا کر جابجا بغاوت کرارہی تھیں اور چاہتی تھیں کہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔

سلطان عبد الحمید نے قسطنطنیا میں دول یورپ کے نمائندوں کی کانفرنس بلائی، تاکہ ان کے مشورے سے شکایت کا تدارک کیا جائے، لیکن ان لوگوں نے ایسی سخت شرطیں پیش کیں کہ کوئی باعزت حکومت انہیں قبول نہیں کر سکتی تھی۔ پھر کیا تھا روس نے لشکر کشی شروع کر دی، بالآخر پھر صلح کی گفتگو شروع ہوئی اور وسیع علاقے سے ترکوں کو دست بردار ہونا پڑا۔

اس صلح نامے کے بعد انگریزوں نے محسوس کیا کہ اس طرح روس کا اثر بڑھ جائے گا، اور ممکن ہے آگے چل کر ان کے مقبوضات خطرے میں پڑ جائیں، انگریزی سفیر نے اطمینان دلایا کہ روس کو اب پیش قدمی کا موقع نہ ملنے دیا جائیگا، بشرطیکہ قبرص انگریزوں کو اس لیے دیدیا جائے کہ وہاں ان کی فوجیں رہیں، اور روس کی پیش قدمی کو بروقت روک سکیں۔ اس ترکیب سے قبرص انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس شاطرانا چال کی کامیابی پر اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم نے ملکۂ وکٹوریا کو مبارکباد دی کہ بحر روم کی کنجی ہمارے ہات میں آگئی ہے۔

گو قبرص عملاً انگریزی علاقہ بن گیا تھا، مگر رسمی طور پر ترکی سیادت کا نام باقی تھا، پہلی جنگ عظیم میں جب ترکی حکومت نے جرمنی کا ساتھ دیا تو [illegible]

اور ۱۹۱۴ء سے باضابطہ قبرص کو برطانوی شہنشاہیت میں شامل کر لیا۔
جنگ کے بعد ۱۹۲۳ء میں لوزان کی صلح کانفرنس نے بھی اس کی تصدیق کر دی۔
عرصے تک یہ اس طرح برطانوی حکومت کے ماتحت رہا لیکن رفتہ رفتہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح یہاں کے باشندوں کو بھی آزادی کی خواہش ہوئی، برطانیہ کی طرف سے کچھ عرصہ تک ٹال مٹول ہوتی رہی پھر جب اس سے کام نہیں چلا تو کچھ معمولی اختیارات دیے گئے، لیکن وہاں کے باشندوں کا جذبۂ آزادی اس سے ختم نہیں ہوا، مجبور ہو کر مزید اختیارات دیے گئے، قبرص کی آزادی کی راہ میں سب سے بڑی دشواری وہاں کے باشندوں کا باہمی اختلاف تھا، جزیرے کی آبادی میں عیسائیوں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور ترک اقلیت میں ہیں، لیکن ان کی آبادی کا ایک مستقل علاقہ ہے، یونان قبرص عیسائیوں کا طرفدار تھا اور ترکی حکومت ترکوں کی حامی تھی، آخر کار فروری ۱۹۵۹ء کو جنیوا میں یونان اور ترکی کے درمیان معاہدہ ہو گیا، اور طے پایا کہ دو سال کی مدت میں بحر روم کے مشرق میں برطانیہ کے جنگی مصالح اور جزیرے میں ترکی کی اقلیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس معاہدے کو نافذ کر دیا جائے پھر ۱۳ دسمبر ۱۹۵۹ء میں انتخابات ہوئے جن کے بعد مکاریوس قبرص کے صدر اور ڈاکٹر کوچک نائب صدر ہوئے۔
لیکن اندرونی اختلافات رہ رہ کر ابھرتے رہے اور وقتاً فوقتاً جھگڑے ہوتے رہے۔
آخر جولائی ۱۹۷۴ء میں صدر مکاریوس کی حکومت کا یونانی سرداروں نے تختہ الٹ دیا، مکاریوس بھاگ کر [illegible] پناہ لی، چونکہ یہ نئی حکومت یونان کے ایما پر تھی اس وجہ سے ترکوں کو اپنے بچاؤ کی فکر ہوئی، ترکی حکومت نے ان ترک باشندوں کی حفاظت کے لئے اپنی فوج قبرص میں اتار دی، اس [illegible] ترکی حکومت نے [illegible] کر

وہ ترکوں کو لاوارث نہیں چھوڑ سکتی، اور جب تک کوئی قابل اطمینان انتظام نہ ہو جائے گا ان کی فوجیں علاقے سے نہیں ہٹیں گی اس صورت حال نے یونانی فوجیوں کو ڈھیلا کر دیا اور مکاریوس کی واپسی کی راہ صاف ہو گئی، چنانچہ جیتے ہوئے وہ قبرص میں آگئے مگر ان کا اثر عیسائی علاقے تک محدود ہے ترک فوج ترکی حصے میں ڈٹی ہوئی ہے، اور نظام کے بارے میں بات چیت جاری ہے۔

آؤ! ہم لوگ یہ کریں پیماں
علم جب سیکھ لیں تو دنیا میں
علم سے روشنی کریں پیدا
شہر آباد کر دیں صحرا میں
رشک جنت بنا دیں دنیا کو
ایسی دنیا کہ جس میں جنگ نہ ہو
یوں بنائیں نئی طرح کا گھر
جس میں رہنا کسی کو تنگ نہ ہو
دل ہو آزاد، عقل ہو آزاد
مل کے باہم بڑھیں زمانے میں
ہر طرف آرزو کے پھول کھلیں
روشنی ہو ہر آشیانے میں
کوئی افسردہ دل نہ ہو ہرگز
زندگی سے نہ ہو کوئی بیزار
رہیں آپس میں میل جول ایسا
لوگ ہوں ایک دوسرے کے یار
زندہ رہنے کا گر سکھا دیں ہم
دکھ اگر ہو تو بانٹ لیں دل سے
جس سے پیدا کوئی خرابی ہو
ایسی باتوں کو چھانٹ دیں دل سے
آؤ! ہم لوگ یہ کریں پیماں
علم جب سیکھ لیں تو دنیا میں
علم سے روشنی کریں پیدا
شہر آباد کر دیں صحرا میں

محمد حفیظ اللہ

ظہیر الدین محمد بابر کا علمی و ادبی ذوق

لودھی خاندان کے بعد ہندستان کی عنان حکومت مغلیہ خاندان میں آئی۔ ظہیر الدین محمد بابر اس خاندان کا بانی تھا۔ بابر کی فتوحات نے سے تاریخ کے آئینے میں ایک عظیم فاتح، ایک عظیم جنرل اور ایک جانباز کشور کشا کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

گلبدن بیگم بنت بابر شاہ کے بیان کے مطابق حضرت صاحب قرانی (تیمور) سے لے کر فردوس مکانی کے زمانے تک سلاطین ماضی میں سے کوئی بادشاہ بھی ایسا نہیں جس نے اتنی محنت کی ہو جتنی کہ میرے والد بزرگوار نے کی۔ یہ بابر کا تنہا عزم تھا، جس نے سینکڑوں سال کی تاریخ بدل ڈالی اور ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔

ابتدائی تعلیم

اگرچہ بابر بہت کم گیارہ سال کی عمر میں تخت نشین [illegible] اور اس کے بعد اسے کبھی فراغت کا وقت نصیب نہیں ہوا، جس میں وہ تحصیل علم و فن کی طرف متوجہ ہو سکتا، لیکن اس کے باوجود مورخین اس پر متفق ہیں کہ وہ کسی ابتدائی تعلیم [illegible] بہت [illegible] اس کو [illegible] فارسی [illegible] ایک عالم [illegible] بنا دیا۔ [illegible] بیٹھا۔

علم و کمال سے کچھ ازلی مناسبت تھی۔ مبدء فیاض سے ذوق سلیم عطا ہوا تھا۔ ان کی افکار اور انتشارات میں علم کی طرف ایک خاص توجہ رہی تھی۔

ابتدائی زمانے میں بہت کم فراغت حاصل ہوئی جو طالب علمانہ تحصیل علم کرتا، لیکن متواتر توجہ نے اس کے واسطے علمی شان بھی حاصل کرلی۔

بابر اہل علم پر نوازش کرتا تھا، اور اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ اسے علم سے دلچسپی تھی، لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بابر بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے مرنے تک ہمیشہ معروف کارزار رہا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی معرکے میں رہا، اور ایک سال سے زیادہ کبھی کسی مقام پر نہ ٹھہرا۔ ایسی ہنگامہ خیز زندگی میں بھی اس نے اس بات کے لیے وقت نکال لیا کہ وہ اس دور کے تمام علوم و فنون کو حاصل کر سکا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذہن تعلیم کی طرف کس شدت سے مائل تھا۔

پانچ سال کی عمر میں اس بچے (بابر) کو سمرقند لے جایا گیا تھا، اور اگلے چھ سال اس نے وہاں تعلیم حاصل کرنے میں گذارے ہوں گے، اور [illegible] طرح علم حاصل کیا ہوگا، کیونکہ اس کے بعد [illegible] اسے علمی [illegible] بڑھانے کی فرصت [illegible] دور [illegible] میں اس کی [illegible] تحریروں سے ظاہر ہے [illegible]

کرنے میں اس نے استقلال کے ساتھ محنت کی ہوگی۔

اوائل عمر میں اس کی تربیت کیوں کر ہوئی، اس کا ہمیں علم نہیں، لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ اس کو تعلیم دینے میں اس کے خاندان کی عورتوں کا کافی دخل ہوگا۔

بابر اپنی تعلیم کی کمی پوری کرنے سے غافل نہیں رہا۔ پہاڑوں پر جانے میں بھی وہ دل پسند کتابیں اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ پھر شہر میں خواجہ احرار کے مرید بعض مذہبی لوگ بھی ملنے آتے جنہیں بابر سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔ نوجوان بادشاہ اپنے سادا سہا ہیا تا افکار کو کبھی کبھی ترکی زبان میں بھی جو عوام کی بولی تھی، اور فارسی میں بھی جو خواص کی زبان تھی، اس کا کوئی مبہم عشق و محبت یا عورتوں کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا تھا۔

صبح کے اوقات میں بابر ہرات کی عمارات کی اچھی طرح سیر اور تحقیقات کرتا پھرتا تھا۔ مدارس، مقابر، خانقاہیں، کاریزیں، رصدگاہیں اس کے شوق کا اصل مرجع صاحبانِ علم و فن یا وہ درویش تھے جنہیں ان کی سیاحت کے دوران شہر اکر جہاں رکھا جاتا تھا یا عمداً حافظ کے لوگ جنہیں ماضی کی روایات رواں تھیں اور آخر میں "علوم دینا" کے جاننے والے، کیونکہ عالا علوم دین کی تعبیر و تشریح کی شاخوں سے منسلک تھے، بہر حال بابر کا بہت دل چاہتا تھا کہ علم و فضل کی دینی صحبتوں میں زندگی گزار دے۔

علمی صلاحیت تصنیف اور تالیف

بابر کی اصل زبان ترکی تھی، لیکن عربی اور فارسی زبانوں کا بھی وہ بڑا ماہر تھا۔ جغرافیا، تاریخ اور الٰہیات سے بھی اسے خاص دلچسپی تھی۔ وہ ماہر ریاضیات بھی تھا۔ بابر ایک بڑا ادیب اور متعدد کتابوں کا مصنف تھا۔ ارسکن کے بیان کے مطابق بابر نے جو زبان چنی اور جیسی لکھی کہ ترکی زبان ...

بابر صاحب علم اور علم دوست بادشاہ تھا، علم فقہ، انشا، اور فارسی اور ترکی شعر میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ ترکی زبان میں اس نے اپنی سوانح عمری لکھی جو اس کی یادگار ہے۔ باذوق حضرات میں اس کا مرتبہ ہمیشہ بلند رہا۔

بابر کی فقہ حنفی میں مہارت کے متعلق فرشتہ کا بیان ہے کہ وہ مجتہد انا صلاحیت رکھتا تھا۔

بابر بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا ترکی زبان کا دیوان فصاحت و بلاغت کے لیے مشہور ہے۔ "تاریخ رشیدی" کا مؤلف مرزا حیدر کہتا ہے کہ "امیر علی شیر بیگ نوائی کے سوا ترکی شاعری میں کوئی بابر کا ہمسر نہ تھا۔"

بابر علم موسیقی اور شاعری علم املا اور انشا میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، اپنے عہد کے واقعات ایسی شستہ اور فصیح ترکی زبان میں لکھے ہیں کہ اس زبان کے بڑے بڑے ماہروں نے اس کی انشا پردازی کا لوہا مان لیا۔

بابر تلوار ہی کا دھنی نہیں، بلکہ قلم و زبان کا دھنی بھی تھا۔ ادب و شاعری اس کی فطرت میں تھی جب وطن سے نکالا ہوا، اور تاشقند پہنچا تو وہاں شکار اور شاعری ہی اس کے دو بہترین مصاحب تھے کہ دیا باں میں تیر و تفنگ چلاتا اور آب رواں کے کنارے بیٹھا غزلوں سے جی بہلاتا۔ ایسی پرجوش طبیعت پر اس چمن کی سیر ایک اور تازیانہ تھی۔ وہ سودا یہاں اور بڑا، اور اپنے پرانے مشغلے کو ہمیشہ تازہ کرتا رہا۔

بابر اپنی تزک میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ "ذی الحجہ ۹۲۳ھ میں اپنے دیوان کی ترتیب دی، میں نے اس وقت تک چار مختلف اوزان میں پانچ سو شعر کہے ہیں۔"

بابر نے اپنے تاثرات کا اظہار فارسی اشعار میں بھی کیا، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے، پھر بھی جو کچھ ہیں ان کو اساتذہ نے نگاہِ تحسین سے دیکھا ہے۔ ابوالفضل نے بابر کی فارسی شاعری کی تعریف کی ہے۔ "... اشعار دل پذیر دارد"

بابر نثر کے ایک طرز متین کا موجد ہے اور علم اصول قانون پر مفید رسالا لکھا ہے۔

فن عروض میں بھی خوب ماہر تھا۔ ترکی کا ایک شعر کہا ہے جو (۵۰۴) وزن میں تقطیع ہو سکتا ہے۔ اس نے علم عروض پر ایک کتاب "مفصل" کے نام سے لکھی۔

بابر فطری طور پر مذہبی واقع ہوا تھا۔ اس نے ترکی زبان میں اپنے لڑکے کامران کے لیے ایک مثنوی "مبین" لکھی جس میں مذہبی، فقہی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں۔ یہ کتاب "فقہ بابری" کے نام سے مشہور ہے۔

"ہیرالڈلیم کا بیان ہے کہ" اس نے ترکی زبان میں عقاید اور اعمال کے سوا حکمرانوں کے مالی مسایل پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مثنوی کی طرز مولانا رومی اور صوفی شعرا سے لی ہے۔ فلسفیانہ افکار اور عملی نصیحتوں کو گویا نظم لطیف کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ممکن ہے اپنے بیٹوں کو اسے پڑھنے میں ترغیب کے لیے یہ پیرایا اختیار کیا ہو، اور یا یہ کہ اپنے ذوق کی تسکین مقصود ہو۔ یہ مثنوی جزءً روسی میں ترجما کی گئی۔"

بابر نے خواجا عبید اللہ احراری کے مشہور رسالے "والدیہ" کو بھی نظم کیا تھا۔ بابر کا بیان ہے کہ اس رسالے کو اسی وزن میں نظم کیا جس میں مولانا جامی کا "سبحہ" ہے یعنی بحر رمل مسدس مخبون میں۔

بابر کی سب سے زیادا قابل تعریف تصنیف "تزک بابری" ہے، جو علمی دنیا میں بہت مشہور ہے۔

بقول فرشتا، "جمیع تورشت کہ نفسا قبول دارند۔"

مسٹر بیل BEALE کے بیان کے مطابق تمام عالم نے اس کی تعریف کی ہے، اور بقول ہنری ایلیٹ یہ ان سوانح عمریوں میں ہے جو سب سے [illegible] سب سے سچی کہی جا سکتی ہیں۔

[illegible] کہتا ہے کہ "تزک [illegible] کا طرز نگارش بڑا سیدا سادا اور جاندار ہے۔

بابر کی تمام علمی اور ادبی خدمات میں "تزک" کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ ایشیا کی تاریخ پر یہی ایسی تاریخ کی کتاب ہے جس کو ایک شخصی تاریخی نمونے کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ تزک اپنی افادیت اور اپنے انداز کی بے مثل تصنیف ہے، اور تاریخ نگاروں کو اتفاق ہے کہ جن حالات میں اسے قلم بند کیا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت کو اور بھی زیادا بڑھا دیتے ہیں۔

بیورج BEVEERIDGE کا بیان ہے کہ "اس کی سوانح حیات دنیا کے گراں قدر تاریخی ریکارڈس میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے، اور اڈورڈس کا کہنا ہے کہ بے شک سینٹ اگسٹائن AUGUSTINE اور روسو ROUSEOV ST کی خود نوشت اعترافات COFESSION اور گبن اور نیوٹن کی حیات MEMOIRS کے ہم پلا ہے۔

کنگ کے قول کے مطابق "تزک بابری" مشرقی سوانح حیات میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، اور الیٹ ڈاوسن کے بیان کے مطابق اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہترین اور مثالی سوانح حیات ہے۔

لیبان لکھتا ہے کہ "بابر کی سوانح عمری کا مقابلا سیزر کی تاریخ سے کیا جاتا ہے۔ اس قسم میں واقعی ایک بہت اعلا درجے کی تصنیف ہے۔"

الفنسٹن کے خیال میں بابر کی سوانح عمری ایشیا کی صحیح تاریخ کا ایک نادر ٹکڑا ہے۔

لین پول لکھتا ہے کہ "اگر کوئی ایسا اتفاق ہوا ہے کہ کسی ایک تاریخی مسودے پر یقین کیا جائے جبکہ اس کی موافقت میں دوسرے ثبوت فراہم نہ ہو سکیں، اور اس مسودے کی موجودگی میں مکمل ثبوت بن جائے تو بابر کی سوانح عمری اس کی بہترین مثال ہے۔

ہیرالڈلیم کا بیان ہے کہ "بابر نے اپنی تمام سوانح عمری زبان چغتائی ترکی میں [illegible]

زندگی کے حالات لکھے۔ اس عہد فراموشی میں اس نے یہی آواز لوگوں کے کانوں تک پہنچا دی، چنانچہ اس میں کہ اس تحریر کو لکھے ہوئے پانچ سو برس کے قریب گذر چکے ہیں، وہ داستان کچھ اس طرح ہمیں سنائی دیتی ہے کہ گویا کہنے والا سامنے ہوتے پڑاؤ پہ پہنچا ہے، دن بھر دشمن کے تعاقب میں اور گویا واقعہ یہ کہ دشمن اس کے تعاقب میں تھا، گھوڑے سے اتر کر ڈیرے میں آگ کے پاس بیٹھا اپنا روداد سنا رہا ہے۔ اسی روزنامچہ روداد میں ہم کو اس عہد کی تصویر نظر آتی ہے جو یورپ والوں کے "زندگانی مشرق" پر چھا جانے سے پہلے کی کیفیت تھی۔

"تزک بابری" کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا کی کل اہم زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

"تزک بابری" میں ۸۹۹ھ سے ۹۲۶ھ / ۱۵۲۰ء تک کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں۔

"تزک بابری" کے نام "واقعات بابری" اور "بابرنامہ" بھی ہیں۔

"بابرنامہ کہاں لکھا گیا"

کے عنوان سے رفیق [illegible] نے ایک مضمون رسالے طلوع کراچی بابت اپریل ۱۹۶۶ء میں شائع کیا تھا لکھتا ہے۔

"مشرقی ممالک کے قرون وسطیٰ کے مسلمان ماہر اور جوان سال تاجک مورخ احرار مختار زادے کا کہنا ہے کہ مشرقی ادب کا ناقابل فراموش یادگار عظیم مغل خاندان کے بانی افغانی شاعر اور سپہ سالار کی خود نوشت سوانح "بابرنامہ" کے ادبی صفات وادی فرغانہ کی چٹانوں پر وجود میں آئے نہ کہ ہندستان کے آراستہ اور پیراستہ محلوں میں۔ ان صفحات کا زمانہ تصنیف ۱۵۰۴ء سے ۱۵۱۲ء کے درمیان کا ہے: جب بابر ایک چھوٹا سا خود مختار شاہزادہ تھا جس سے تخت سلطنت نکل چکا تھا اور پہاڑوں میں [illegible] والی [illegible] کی [illegible]

حیات کی ان نامعلوم حقیقتوں کو کوہستانی علاقوں کے گرد و نواح میں پائے جانے والی چٹانوں پر کندہ چھ کتبوں کی بنیاد پر دریافت کیا ہے، جن کے ساتھ تیمور کے وارث کا نام ہے۔ کندہ کرنے والے کی تحریر اور دستخطوں کی تحقیق کرنے کے بعد مورخ کو اس بات کا یقین ہے کہ وہ تمام کے تمام بابر کے ہاتھ کے ہیں (بابرنامہ میں ایسے صرف ایک ہی کتبے کا ذکر کیا ہے)

بابر کے ذریعہ ان کے کتبے قنوطیت کا گہرا رنگ لیے ہوئے ہیں، ہندستان کے ہونے والے شہنشاہ کو اب کوئی امید باقی نہ رہی تھی کہ وہ اپنے موروثی شہروں فرغانہ اور سمرقند کو دوبارہ حاصل کر سکے گا۔ ان خیالات کا اظہار زیادہ تر سعدی اور حافظ کی رباعیات میں کیا گیا ہے، بلکہ بابر نے ایک طرح سے ان عظیم شاعروں کے تخیلات کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنی بدبختی پر آنسو بہائے ہیں۔ احرار مختار زادے اس ابتدائی عبارت آرائی سے شہ پاروں کو غیر معمولی شعری صلاحیت کا حامل قرار دیتے ہیں، جس نے بعد میں بابر جیسے شاعر اور سپاہی کی تصنیف "بابرنامہ" اور دیگر تخلیقات کو جلا بخشی۔ بابر نے ہی چغتائی قدیم ازبک زبان میں ادب کی بنیاد رکھی۔

گلبدن بیگم کہتی ہیں کہ۔

"سیکری ہندستان میں اس کے شاہ بابا نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں سے ایک وہ تھی جہاں بیٹھ کر بادشاہ بابر اپنی تزک لکھا کرتا تھا"

تزک کا نسخہ

بابر کا خود اپنے قلم کا لکھا ہوا تزک کا نسخہ معدوم ہو گیا ہے تاہم اس کی زندگی ہی میں اور کچھ بعد اس کی نقول اور اکثر فارسی میں کی گئی تھیں۔ بظاہر ایک خاص نسخہ [illegible] کے پاس [illegible] غلطیاں [illegible] بیشتر [illegible] نے اپنے [illegible] شرحی [illegible]

...چسپ تھا اس کے افعال پر جو نکتہ چینی کی یہاں
...نے کو دل سے خزانے لٹوانے کے ذکر میں بھی کوئی
...چینی نہیں کی۔ گلبدن بیگم نے بھی صریحاً بابر
...ے کے فارسی نسخے سے کام لیا تھا۔ شاہجہاں
...کتب خانے میں اس کا مکمل نسخہ موجود تھا۔
...س کی بہت عمدہ تذہیب و تزئین کی گئی تھی۔
...اف معلوم ہوتا ہے کہ اہل خاندان اس سوانح عمری
...ہی قدر کرتے تھے اور دوسرے کتاب میں
...تزک نہایت محترم تھی۔ نتیجہ یہ کہ یہ مخطوطے
...بر کسی تدوین و تبویب کے اور یقیناً بلا
...رف ہم تک پہنچے۔ ان دور دور پھیلے ہوئے
...سی اور ترکی کے نسخوں میں لفظی اختلاف
...بے جاتے ہیں، مگر معنی اور مطالب میں فرق نہیں،
...بر جو خطوط بابر نے چھوڑ دیے تھے، وہ بھی سلامت
...دا نسخوں میں قریب قریب اسی طرح چھپے ہوئے
...ہم پورا یقین رکھ سکتے ہیں کہ جو تزک بابری
...آج پڑھ رہے ہیں، وہی ہے جسے ساڑھے چار
...و برس پہلے اس نے لکھا تھا، بجز چند مشکوک
...بیانات کے۔

تحقیقاتی مہم

قدیم مسودات کے یو گرچی عجایب گھر کے سابق
...یر کٹر اور اس تحقیقاتی مہم کے سربراہ، جو قدیم
...سودات اور نوادر کی تلاش کر رہے ہیں یوسف
...یب خلعوت کا جوان دنوں سوویت یونین میں مقیم
...کہنا ہے کہ ۱۹۵۵ء میں اس تحقیقاتی مہم کے دوران
...چار شہر میں ظہیرالدین بابر کی ایک کتاب ملی تھی۔
...اب کا یہ نسخہ خوبصورت تحریر میں "مہر آ نستعلیق"
...نقدیم کی گئی ہے۔ نسخہ سیاہ ہندستانی روشنائی
...تحریر ... سرخ روشنائی سے لکھے
...گئے ہیں۔ اس کتاب میں ترکی عروض کی وضاحت
...کی گئی ہے جو ... معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی
...نے ... تحریر کیا تھا اور اسی لیے اس
...کے ... گزر کر ... تاشقند ... میں موجود ملا۔

علی شیر نوائی کے کلام پر تنقید

ایک روسی ادیب لکھتا ہے۔

ظہیرالدین بابر مشرق کا ایک روشن خیال بادشاہ ایک ممتاز شاعر اور علم و دانش کا پرستار تھا۔ شہرۂ آفاق "بابر نامہ" کے علاوہ اس نے بہترین اشعار اور رباعیاں لکھیں، جن میں اسلام کے اصولوں کی تبلیغ کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ متعدد کتابیں فوجی معاملات، موسیقی اور شعریات کے بارے میں بھی تحریر کیں۔

"بابر نامہ" میں ہمعصروں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے عظیم شاعر، علی شیر نوائی کے (۲۴) بحروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے چار بحروں کی تشریح میں غلطی سرزد ہوئی ہے، دوسرے بحروں میں بھی اس نے غلطی کی ہے۔ اس کا احساس ہر وہ شخص کر سکتا ہے جو نظم گوئی کی طرف توجہ دے۔ شاعری سے متعلق بابر کی وہ کتاب محفوظ نہیں رہ سکی ہے جس میں بابر نے ان غلطیوں کی طرف مخصوص انداز میں اشارے کیے تھے۔ ۱۹۴۸ء میں ازبکستان کے مشہور مستشرق پروفیسر عزت سلطانوف نے علی شیر نوائی کی کتاب شائع کی ہے، اور اس پر تنقیدی دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں پروفیسر موصوف نے تسلیم کیا ہے کہ بابر کی تحریر کے مطابق اس نے چار غلطیوں کا پتا لگایا ہے جو علی شیر نوائی نے رباعیوں میں کی ہیں۔

اس طرح اب اس میں ذرا بھی شک نہیں رہ گیا کہ بابر نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف صحیح تھا، بلکہ اگر بابر علی شیر نوائی جیسے عظیم الشان شاعر اور اولین نقاد کے یہاں پتا چلا سکتا ہے تو اسے یقیناً شعریات پر بڑی گرفت حاصل رہی ہوگی اور عروض پر اس کی کتاب ترکی شاعری کی تاریخ اور اس کے فلسفے کی تاریخ میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتی ہوگی، لیکن یہ نادر تصنیف علم شعر و ادب کا مطالعہ کرنے والی دنیا کے سامنے

خواجا آصفی کے کلام پر تنقید

خواجا کے کلام کی نسبت بابر نے بڑی معتدل رائے دی ہے ؎

شعر او از رنگ و معنی خالی نیست
اگرچہ از عشق و حال خالیست

اگر کوئی مشاق شعر ہم خواجا کے کلام پر رائے ظاہر کرے، اس بیان سے تجاوز نہ ہوگی؛ مختصر یہ کہ بابر اچھا ادبی نقاد بھی تھا۔

بابر اور موسیقی

ولیم ارسکن کا بیان ہے کہ بابر موسیقی سے واقف

ہوتا تھا، بلکہ اس فن میں موجد بھی تھا۔ اس نے موسیقی کو دو سر عطا کیے، وہ اس کا نام ہمیشہ اس فن میں باقی رکھنے کے لیے کافی ہیں، چنانچہ ماہر موسیقاروں کے حسن و قبح پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔

میر الٰہ کا بیان ہے کہ بابر کے کلام میں گہرائی زیادہ ہے؛ وہ معین خیالات کو نغمے کی زبان میں ادا کرنے کا قدرتی میلان رکھتا ہے، اس پر انانیت کی کیفیت طاری ہوتی تو وہ خارجی اوزار کے ارشادات کو نظم کرتا کہ عام لوگ بھی استفادہ کر سکیں۔ شاعر پیشہ اشخاص سے مناسبت کرنے میں اسے باک نہ تھا، مگر تعجب ہے کہ موسیقی کے معاملے میں احتیاط سے کام لیتا، اور اس کا حق ان قسم کی راگنیاں نکالنے کے سوا شاذ و نادر ہی کوئی ساز بجاتا ہوگا، ان دکھوں کے ساز بجانے پر اچھی یا بری رائے لگانے سے باز رہتا ہے۔

بابر اور مصوری

مسٹر ایم۔ ایس۔ ڈیمنڈ کا بیان ہے کہ بابر بادشاہ کے معاصر میں پر تصویریں بنائی گئیں، ان کے بارے میں معلومات زیادہ نہیں ہیں، حالانکہ عراق ممالک سے پتا چلتا ہے کہ یہ بادشاہ ایک عالم، محقق، سیاح، جہاں گشت، ماہر شکار [illegible] ہوتا

کا دلدادہ ہونے کے علاوہ فنون لطیفہ کا سرپرست بھی تھا، تاہم اس کے عہد حکومت سے بہت کم تصاویر منسوب کی جا سکتی ہیں۔ کینل KUHNEL نے بجرہ جنگ کی ایک تصویر اس دور سے منسوب کی ہے۔ یہ تصویر ایک البم میں ہے جو کسی زمانے میں شہنشاہ جہانگیر کی ملکیت میں تھا، اور اب برلن کے سرکاری کتب خانے میں محفوظ ہے، اس میں بہزاد اور اس کے دبستان کا اثر صاف نظر آتا ہے۔

خطاطی

ولیم ارسکن کا بیان ہے کہ "ادب کے ساتھ بابر کو فن خطاطی سے بھی گہری دلچسپی تھی، اور اس نے اس میں بڑی مہارت حاصل کی، اس وقت کے مطابق خط نسخ و نستعلیق وغیرہ کا ماہر تھا۔"

منتخب التواریخ میں ہے کہ "بابر خطاطی کا بڑا قدر دان تھا اور ایک خاص نئے خط کا موجد تھا، جس کو "خط بابری" کہتے تھے، بابر نے اس خط میں قرآن مجید کا ایک نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر مکہ معظمہ بھیجا تھا۔"

بابر کا خط نہایت پاکیزہ تھا، اور خوش نویسی کے وقت خوش زیبا انداز میں ہوتا تھا۔ سطر اپنے ہاتھ سے بناتا تھا۔

بابر اور ہندستانی زبان

بابر کا یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

مجکا نہ ہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا ہلیغہ بس بولغوسیدر پانی و روتی

مولانا حکیم سید عبدالحی تحریر فرماتے ہیں کہ بابر کے ترکی دیوان کا جو نسخہ نواب رامپور کے کتب خانے میں ہے، وہ ۹۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے۔ کتاب نسخ میں لکھی ہوئی ہے، اس کے رسم خط کے مطابق اس شعر کو نقل کیا ہے۔

[illegible]

یہ شعر ایک ترکی کتاب میں خود اس کے ہاتھوں سے لکھا ہوا موجود ہے۔ یہ کتاب "رضا لائبریری" رام پور میں محفوظ ہے جس پر اکبر، خانخاناں اور شاہجہاں کی مہریں یا اصل دستخط موجود ہیں۔

شہنشاہ بابر نے سنہ ۹۳۲ھ میں ہندوستان فتح کیا۔ دلی اور آگرے کی تسخیر کے بعد سنہ ۹۳۳ھ میں جو فتح نامے اطراف واکناف میں روانہ کیے، ان میں لشکر کو " اردوے نصرت شعار" کے لقب سے موسوم کیا ہے۔

بابر کے ایک سکے پر جو سنہ ۹۳۷ھ میں مضروب ہوا ہے "حرب اردو" منقوش ہے۔ (دیکھو وائٹ ہیڈ کی فہرست سکہ جات سلاطین مغلیہ پنجاب میوزیم لاہور —)

کتابوں کے جمع کرنے کا شوق

بابر کو کتابوں کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ فتح پنجاب کے وقت بابر نے خصوصیت سے غازی خاں کا کتب خانہ دیکھا، اس کتب خانے کی بڑی شہرت تھی، لیکن وہ لکھتا ہے کہ کچھ کتابیں یقیناً اچھی تھیں، لیکن وہ لکھتا ہے کہ کچھ کتابیں یقیناً اچھی تھیں، لیکن باقی کچھ زیادہ قابل قدر نہ تھیں۔ ان میں سے کچھ کتابیں اس نے کامران کو بھجوائیں اور کچھ ہمایوں کو

میدان جنگ اور سفر میں علمی مشغلہ

بابر میدان جنگ اور سفر میں بھی لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتا۔ ہیرالڈ لیم لکھتا ہے کہ "سردی کی طویل راتوں میں وہ اپنے بیٹے ملک کے حالات روزنامچے میں لکھتا۔ موسم کی تعریفیں تو بہت کم تھیں لیکن یہ تحریریں پوستین کے لبادے میں لپٹ کر ہوا سے جھلملاتے تیل کے چراغ کی روشنی میں لکھی ہوتی تھیں"

ایک بات کہتا ہے جیسے وقت بار دوبارہ [illegible] اس وقت کو لکھنے میں مشغول تھا۔

وہ اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ لوگ تراویح سے فراغت پا چکے تھے، اور رات کا ایک پہر اور پانچ گھڑیاں گزر گئی تھیں، میں اپنے خیمے میں کتاب لکھنے میں مصروف تھا کہ اس درجہ خوفناک آندھی چلی کہ مجھے کتاب کے اوراق سمیٹنے کی مہلت نہ ملی، اور میرا خیمہ گاؤ اکھڑ کر میرے سر پر آن گرا، خیمے کی رسیاں ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں۔ میں نے بڑی مشکل سے کتاب کے اجزا اکھٹے کیے، اوراق بھیگ گئے تھے، انہیں اکٹھا کرکے میں نے پیٹ کے ساتھ چپکا لیا، اور اوپر سے کمبل اوڑھ لیا۔ اس رات بابر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا۔

یہ تھا شہنشاہ ہندوستان کے علمی ذوق کا عالم۔

رتن پنڈوری

غزل

سر جھکاؤں کون سے در پر ترے در کے سوا
اور بھی کیا گھر ہے کوئی اس ترے گھر کے سوا
نور بن کر چھپ رہا ہے ذرے ذرے میں تو
کیا کہوں میں اور تجھ کو نور پیکر کے سوا
ساقیا بے سود ہیں بے کار ہیں باتیں تری
کچھ نہیں درکار مجھ کو ایک ساغر کے سوا
دیکھتا کیا ہے منجم میرے ہاتھوں کے نقوش
کچھ نہیں ہے ان میں برگشتہ مقدر کے سوا
کیسے کیسے دن دکھاتے میری قسمت نے مجھے
زندگی میں کچھ نہ دیکھا ایک چکر کے سوا
اک اشارے سے گرا دے جو مرے دل کا محل
دوسرا کوئی نہیں ہے اس ستمگر کے سوا
جاگزیں ہے میرے ہی دل میں زمانے بھر کا غم
مل سکا اس کو کہیں مسکن نہ اس گھر کے سوا
سامنے آ کر کرے جو گفتگو محبوب سے
اے رتن کس میں طاقت ہے سخنور کے سوا

امیر احمد علوی، بی-اے ڈپٹی کلکٹر کانپور

چھیالیس سال پہلے کا سعودی عرب

جدے سے مکہ معظمہ تک پہلے دو دن کا رستا تھا۔ یہ آب ریگستان اور کوہستان سے گذرتا ہوا تھا۔ چوروں اور بدوؤں کا خوف تھا، مگر اب موٹروں کی بدولت دو گھنٹے کا رستا ہے۔ چار پانچ جگہ چوکیاں بنی ہیں جہاں چائے تیار ملتی ہے۔ پولیس کے ملازمین موجود رہتے ہیں اور نگرانی رکھتے ہیں کہ موٹر والے مقررہ تعداد سے زیادہ مسافر نہ سوار کر سکیں۔ آدھی رات کے وقت پیادہ مسافر تنہا سفر کرتا ہے، اور کسی چور ڈاکو کی مجال نہیں کہ اس سے مزاحمت کر سکے۔ آج کل رمضان کی وجہ سے بیشتر مسافر رات ہی کو سفر کرتے ہیں، لیکن لوٹ مار کبھی نہیں ہوتی۔ میری موٹر دس بجے شب کے اندھیری رات میں پہاڑیوں کے قریب خراب ہوگئی اور ہم لوگوں کو اترنا پڑا۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک ہم لوگ اس جنگل میں کھڑے رہے، اور موٹر والا تنہا پہیا چڑھاتا رہا، مگر کوئی خوف کی بات پیدا نہیں ہوئی۔ ہم کو رستے میں بہت سے مسافر اکیلے سفر کرتے ہوئے نظر پڑے۔ وہ سب بے خوف تھے۔ جس وقت ہماری موٹر چوکی کے قریب پہنچی تو وہاں میلا سا لگ جاتا تھا، اور طبیعت بہت خوش ہوتی تھی۔

بحرہ کی چوکی پر ہم لوگوں نے وضو کی تجدید کی اور چائے پی۔ روانگی کے وقت میرے ایک ہمراہی اپنے حصے کی حمایل تپائی پر بھول آئے۔ دو تین میل کے بعد یاد آیا۔ اسی حمایل میں ان کا پاسپورٹ اور واپسی کے ٹکٹ کی رسید بھی تھی۔ مجبوراً ہم نے [illegible] موٹر والے کی خوشامد کرنی پڑی کہ وہ چوکی تک واپس چلے۔ موٹر والا سماٹرا کا باشندہ تھا، اور جو کچھ ہم نے اس کو چائے پلائی تھی۔ وہ مہربانی سے فوراً واپس لے گیا۔ جب ہم چوکی کے پاس پہنچے تو چوکی والا ہم کو دیکھ کر ہنسا اور حمایل بجنسہ واپس کر دی۔ چھیالیس سال پہلے نہ تو چوکی تک واپس آنا ممکن تھا، اور نہ مال دستیاب ہونے کی امید کی جا سکتی تھی۔ سعودی حکومت حجاز نے ایسا امن اس جزیرے کو دیا تھا۔ کیا ہے کہ قرون اولیٰ کے بعد اس کی نظیر عرب میں نہیں مل سکتی۔

اللہ کا شکر ہے کہ مسجد الحرام میں رمضان کے آخری جمعہ ۲ مارچ ۱۹۲۹ء کی نماز نصیب ہوئی۔ [illegible] ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ قریب قریب دنیا کے ہر حصے کے باشندے اس وقت مکہ معظمہ میں موجود ہیں۔ سب سے زیادہ تعداد جاویوں کی ہے۔ جزیرہ جاوا کے رہنے والے نہایت عقیدت مند ہوتے [illegible] یہ حاضر ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ جب [illegible] حج ادا کر لیں نکاح نہیں کرتے۔ ان لوگوں سے [illegible] کے دکانداروں کو بہت نفع پہنچتا ہے [illegible] سے ہر ایک فرد ایک پورا جوڑا [illegible]

تک اپنے پیسے کو مفلسین میں خرید کرنا واجب سمجھتا ہے یہ لوگ با ہمت بھی ہیں ۔ روز آنا مسجد مستقیم سے عرسے لاتے ہیں، اور بیشتر وقت تلاوت کلام اللہ میں صرف کرتے ہیں ۔ سب سے بڑا وصف حاوا حجاج میں یہ ہے کہ وہ گدا گری نہیں کرتے ۔ میں نے کسی حاوی کو حرم شریف میں سوال کرتے نہیں دیکھا عرب اور سوڈان کے رہنے والے بے تکلف بھیک مانگتے ہیں، اور ہمارے جنت نشان ہندستان سے ایک معتد بہ مجمع حجاج کا شاید اسی نیت سے حجاز کا سفر کرتا ہے کہ وہ بیت الحرام میں گداگری کا پیشہ اختیار کرے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

ایک جماعت اناطولیا کے ترکوں کی بھی حج کی نیت سے حاضر ہوئی ہے ۔ ان کی صورتیں دیکھ کر نہایت حسرت ہوتی ہے ۔ ایک وقت تھا کہ وہ یہاں حکومت کرتے تھے، اور اب ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے ۔ مسجد الحرام کی موجودہ عمارت کا بیشتر حصہ سلطان سلیم اور سلطان اعظم کی یادگار ہے، اور مکہ کا گوشہ گوشہ ترکی سلاطین کی فیاضی اور اولوالعزمی کا رہین منت ہے ۔ حقیقت میں ترکوں نے حرمین شریفین کی ایسی خدمت کی کہ دنیائے اسلام کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتی ۔ ایک طرف وہ اپنے خون سے اسلامی سلطنت کی حفاظت کرتے رہے، اور دوسری طرف اپنی دولت سے مکہ و مدینہ کو زر و جواہر سے مالا مال کرتے رہے ۔ ترکوں کی مختصر جماعت بیت اللہ کا طواف کرتی ہے ۔ ان کی مسکینی و غربت دیکھ کر نہایت قلق ہوتا ہے ۔ اللہ ان کی خدمات کا اجر عطا کرے، اور ان کو پھر عروج و اقبال نصیب ہو، اور خدمت اسلام کی توفیق عطا ہو ۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

آج پنجشنبہ یکم مارچ ۱۹۲۹ء ہے بردہ فروشی کا بازار دیکھنے گیا ۔ ایک مکان میں پانچ حبشی عورتیں کرسیوں پر بیٹھی تھیں ۔ کم سے کم قیمت ایک لونڈی کی ۳۰۰ گنی بتائی گئی ۔ ان عورتوں میں سے ایک کا رنگ کسی قدر کم سیاہ تھا، اور اس کی قیمت

ساتھ تھے اور وہ مفت ملتے ۔ معلوم ہوا کہ آجکل بہ سبب رمضان کے لونڈیوں کی بکری کم ہے، اور مال عام طور پر دکھایا نہیں جاتا ۔ عید کے بعد اس بازار میں رونق ہوگی ۔ ہر قسم کی لونڈیاں اور غلام ملاحظہ کیے جا سکیں گے، اور نرخ بھی نسبتاً ارزاں ہو جائے گا ۔ ہمارے رہنما نے وعدہ کیا کہ عید بعد وہ ہم کو اس بازار کی خوب سیر کرائے گا، اور بردہ فروشی کی سب دکانیں دکھائے گا ۔

آج مکہ کے بازار دیکھنے کا موقع ملا ۔ سامان تجارت سے بازار بھرے ہوئے ہیں، اور دنیا کی کوئی ایسی جنس نہیں جو ان بازاروں میں دستیاب نہ ہو سکے ما شاء اللہ لا قوت الا باللہ !

افسوس ہے کہ میں ضرورت کی چیزیں ہندستان سے خرید کر لایا، اور بار برداری کی مشکلات برداشت کیں ۔ اندیشہ تھا کہ انگریزی ساخت کی اشیا جو ہماری ضروریات زندگی میں داخل ہو گئی ہیں عرب میں دستیاب نہ ہو سکیں گی، اس لیے ہر ایک ضرورت کی چیز ساتھ رکھ لی تھی ۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ یہ سب زحمت فضول برداشت کی گئی ۔ ہر ایک چیز یہاں مل جاتی اور سامان کم سے خرید کی جاتی تو ان کی امانت بھی ہوتی ۔ حرم شریف کے قریب ہر سمت میں بازار ہے، اور جس بازار میں پہنچ جاؤ معلوم ہوتا ہے کہ ضروریات زندگی کا تمام ذخیرہ اس جگہ موجود ہے ۔ آجکل رمضان کے سبب سے رات بھر چہل پہل رہتی ہے ۔ گیس کی روشنی سے شہر بقعۂ نور بنا رہتا ہے، اور بازار کی گلیوں میں وہ لطف آتا ہے کہ وہاں سے ہٹنے کو دل نہیں چاہتا ۔ اللہ! اللہ! یہی وہ جگہ ہے جس کے متعلق حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا رب انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع

ہندی نجومیوں کے حساب سے آج سوموار یعنی دوشنبہ ۱۱ مارچ ۱۹۲۹ء ہے، اور رویت ہلال کی کوئی صورت ممکن نہیں یہاں آج رمضان [illegible] کی ۳۰ تاریخ ہے، اور کل عید ہو [illegible]

کے نقارے کا اعلان ہوا - طلوع آفتاب سے چار گھنٹے پہلے سہ شنبہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۱ع کو بیدار ہوا - میزبانوں کی مہربانی سے غسل کے لیے گرم پانی ملا، کپڑے بدلے، چائے پی، اور حرم شریف میں حاضر ہو گیا - نماز تہجد کے بعد میزاب رحمت کے نیچے کھڑے ہو کر اور غلاف کعبہ کو آنکھوں سے لگا کر اپنے لیے اور اپنے اعزا احباب اور جمیع مسلمان کے لیے دعائے خیر کی - ابھی ایک ہی طواف کی نوبت آئی تھی کہ قلعۂ شاہی سے عید کی سلامی سر ہونا شروع ہوئی - صبح کا سہانا وقت موذنوں کی سریلی آواز، اذان کا دل کش ترنم اور اسی کے ساتھ توپوں کی گرج ایک عجیب عالم تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا -

آفتاب طلوع ہوا تو سارا شہر مکہ مسجد الحرام کے اندر تھا - میرا اندازہ تھا کہ دو تین لاکھ آدمیوں کا مجمع ہوگا، مگر یہاں کے باشندے کہتے ہیں کہ نفوس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے کم تھی - پھر خیال ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے اور مسجد الحرام میں باوجود اس وسعت تل دھرنے کی جگہ نہ تھی - عربوں کی زرق برق پوشاکیں، حاجیوں کے سادا سفید لباس، عورتوں کے رنگ برنگ برقعے، معلوم ہوتا تھا کہ آدمیوں کا باغ لگا ہے، اور صحن مسجد گل ہائے رنگا رنگ کا گلدستہ -

مکبروں نے تکبیر ثانی شروع کی۔ الله اکبر الله اکبر لا اله الا الله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد کے نعرے لگاتے تھے، اور حاضرین بھی دفعے سے بعد وہ الله اکبر کبیرا والحمد لله کثیرا - سبحان الله بکرة واصیلا وصلی الله علی سیدنا محمد وآلہ وصحبه وسلم تسلیما کثیرا نہایت دل کش لہجے سے پڑھتے تھے، اور اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ زمین سے آسمان تک دریائے نور موجزن ہے، اور رحمت حق نے سارے مسجد کو اپنے دامن میں چھپا لیا ہے - خانۂ کعبہ پر ایک خاص رونق تھی جو اس سے پہلے نظر نہ آئی تھی، اور جس وقت مکبرین صلی الله علی سیدنا محمد کا نعرہ لگاتے تھے تو دل دہل جاتا تھا، اور شوکت اسلام کا ایک عجیب منظر سامنے آ جاتا تھا، خیال آتا تھا کہ یہ اسی بزرگ ہستی کا اسم مبارک ہے - جس کو ایک دن کعبہ میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہ ملی تھی، اور سارا مکہ اس کا دشمن جانی تھا، مگر الله متم نورہ ولو کرہ الکافرون - آج یہاں کے ہر ایک بچے کی زبان اسی کے نام کی رٹ ہے، خدا کے نام کے بعد -

عرب کے حساب سے بارہ بجکر ۵ منٹ پر یعنی طلوع آفتاب سے آدھا گھنٹہ بعد نماز عید شروع ہوئی - نماز میں بارہ تکبیریں زائد تھیں، چھ پہلی رکعت میں ثنا کے بعد اور فاتحہ سے پہلے اور چھ دوسری رکعت میں فاتحہ سے پہلے - میں خطیب سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا، اور اس کی آواز سنائی دیتی تھی، مگر الفاظ صاف صاف مسموع نہ ہوتے تھے - خطبۂ ثانیہ کے وقت جب خطیب اللہم انصر الاسلام والمسلمین پر پہنچا تو جھنڈیاں ہلائی گئیں، اور قلعۂ شاہی سے توپیں چلنا شروع ہو گئیں - ان کی گرج سے دل اچھلتا تھا، اور شوکت و ہیبت اسلام کی ایک خاص کیفیت طاری تھی - کہن سال بزرگ کہتے ہیں کہ ترکوں کے وقت میں عید کے دن جس شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا، آج اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے، مگر میرے لیے یہی جاہ و جلال بہت تھا - ع

از دوزخیان پرس کہ اعراف بہشت است

نماز سے فارغ ہو کر حلیم کے ساتھ ان کے مکان پر گیا، اور عید کی دعوت کھائی - واپسی کے وقت عرب لڑکے اور لڑکیاں سڑک پر کھیلتے اور انگریزی باجے بجاتے نظر آئے - ہر طرف فرحت و انبساط کا دور دورا تھا، اور ہر کس و ناکس کے چہرے پر خوشی کا اثر ظاہر تھا - میں نے غلطی سے ناکس کا لفظ استعمال کیا - مکہ کا کوئی باشندہ ناکس نہیں ہے - بزرگوں کا قول ہے کہ سفہاء مکہ حشو الجنة - یہاں کے جاہل اور کم عقل بھی دوسری جگہ کے علماء سے بہتر ہیں - یہاں ہر ایک بچہ جب چالیس دن کا ہو جاتا ہے تو کپڑے میں لپیٹ کر باب الکعبہ کے سامنے ڈال دی

تا ہے، اور جب مرتا ہے تو اس کا جنازا کچھ دیر تک
ب الکعبہ کے سامنے رکھا جاتا ہے، اور پھر باب السلام
ے رستے سے گورستان کو جاتا ہے، نماز جنازا
ب الکعبہ کے سامنے ادا کی جاتی ہے، اور بعض
بعض نصیبوں کی صلواۃ الجنازا نماز فجر کے بعد پڑی
جاتی ہے، اور ہزار ہا مسلمان اس میت کے لیے
عاے مغفرت کرتے ہیں۔ مکیوں کے اعمال کا
ل خدا جانے۔ وہ ستار العیوب ہے، اور ہر
یک بندے کے ظاہر و باطن سے واقف ہے، لیکن
ن کا ایک وصف بہت جلد دریافت ہو جاتا ہے،
ور وہ یہ کہ مکہ کے باشندوں کا توکل بہت بڑا
ہوا ہے، اور ان کو رزاق مطلق پر پورا بھروسا
ہے۔ شیخ سعدی کہتے تھے "آں قدر تعلق ک
نان را با روزی است اگر با روزی دہ بودے
ر مقام از ملائکہ در گزشتے" لیکن یہاں آکر
یکھا کہ مکیوں کو روزی دہ پر اعتماد کلی ہے،
جو کچھ روپیا پیسا ان کے ہات آے وہ فوراً خرچ
کر ڈالتے ہیں، اور دوسرے دن کے لیے جمع رکھنا
فضول سمجھتے ہیں۔ ان کا قول ہے جس نے آج دیا
ہے وہ کل بھی دیگا ان شاء اللہ۔ نہ باسی بچے نہ
کتا کھاے۔ عید کے دو ایک روز قبل جن لوگوں
کو دست سوال دراز کرتے دیکھا تھا، آج پر تکلف
لباس سے آراستا پیراستا نظر آتے ہیں۔ ممکن
ہے کہ دوسرے دن یہ کپڑے کوڑیوں کے مول فروخت
کر دیے جائیں، اور یہ بیش قیمت جامے نان شبینا
کے لیے گرو کرنا پڑیں، لیکن آج تکلف اور تحدیث
نعمت کا کوئی دقیقا فروگذاشت نہ ہونا چاہیے۔
یہ اعتماد علی اللہ ان کے زبردست ایمان کی دلیل
ہے، اور ہر ایک مومن مغفرت و جنت کا امیدوار
ہے۔ تو بزرگوں کا یہ قول سفہاء الملکۃ حشو
الجنۃ غلط نہ سمجھنا چاہیے۔ ذالک فضل اللہ
یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ یہ
ہندستان کا رہنے والا عقیدے کا کچا، ایمان
کا کمزور، اسباب و علل پہ نظر کرنے والا اور
علل سے غافل۔ آج دارالاسلام کی

عید اور یہاں کی شان و شوکت دیکھ کر جس قدر
خوش ہوا اتنا ہی چند باتوں سے ملول بھی ہوا۔
خوشی کا بیان ہو چکا، اب غم کی داستان سنیے۔
حجاز کا بیشتر حصا یورپ کی حکومت سے بحمد اللہ
ابھی نیم آزاد ہے، لیکن عربستان کی اقتصادی
فتح لندن کو حاصل ہو چکی ہے، یہاں کے بازار ولایت
کی مصنوعات سے بھرے ہوے ہیں۔
آج شہر میں ہزاروں روپے کے کھلونے
فروخت ہوے، اور وہ سب یورپ کے بنے ہوے
تھے۔ ربر کی گیند، ربر کے پھوکنے، بدنے غبارے
ٹین کے انجن، ٹین کی ریل گاڑیاں، اور ارگن باجے
وغیرا آج لاکھوں کی تعداد میں یہاں بک رہے ہیں
کوئی لڑکا مجھ کو نظر نہ آیا جس کے ہات میں دو
چار کھلونے اس قسم کے نہ ہوں۔ افسوس ہے
کہ عرب حجاج کی کمائی اہل مکہ کے کام نہ آئی،
بلکہ یہاں سے بھی اسی طرح ولایت کو پہنچی جیسے
ہمارے بدنصیب ملک سے جاتی ہے۔ حیرت کا
مقام ہے کہ صرف موٹر کے لوازمات جو اس سال
۱۹۲۵ء انگلستان سے آے ان کی قیمت ۱۸
ہزار پونڈ تھی، یہ لوازمات یورپ کے دوسرے
مقامات سے بھی آے تھے، مگر ان کی قیمت مندرجہ
بالا حسابات میں شامل نہیں۔ اس طرح تمام دنیاے
اسلام کی کمائی مکہ کے رستے سے یورپ پہنچ رہی ہے۔
افسوس ہے کہ یہاں کی عورتوں کو انگریزی
فیشن کی طرف بدرجۂ غایت رغبت ہو گئی ہے۔
برقعا کسی وقت زینت چھپانے کے لیے تھا، مگر
افسوس اب اس کا مقصد زینت کو دوبالا کرنا ہے۔
زرق برق ریشمی کپڑوں اور اطلسی تھانوں کے
برقعے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی چمک دمک
لازماً ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ بالغ
لڑکیاں جو بے نقاب پھرتی ہیں وہ سر تا پا انگریزی
لباس میں ہیں۔ وہی ریشمی ساے اور ویسی ہی اونچی
ایڑی کے بوٹ جو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی
افسوس پر افسوس اور قلق پر قلق یہ کہ یہاں
کی عورتوں کی فیشن پرستی تمول و ثروت کے بعد

نہیں، بلکہ ایک معتبر راوی کے قول کے مطابق جدہ کے لیے جس قدر کا فرانیس بازار سے خرید کیے گئے ہیں ان کا بیشتر حصہ قرض آیا ہے اور ایام حج کے بعد ادائیگی کا وعدہ ہے۔ مشہور بازار میں، مسجدوں، راستے گلیوں میں حاجیوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اور اس قدر پیسے سے جو کچھ وصول ہوتا ہے وہ بیروں کے لیے سوٹ بوٹ اور سگریٹ خرید کے یورپ کے تاجروں کو نذر کر دیتا ہے۔ یا اللہ مسلمین مسلمانوں کے حال پر رحم کر، اور ان کو نیک و بد کی تمیز عطا کر۔ آپ کی نظر کی پھیری سارا زمانہ پھر گیا۔ اب آپ ہی کرم فرمائیں تو یہ قوم سنبھلے ورنہ بظاہر کوئی صورت اس کے سدھرنے کی باقی نہیں ہے۔

انگریزی مٹھائیاں، انگریزی بسکٹ کا بازار میں بھرے ہیں سگریٹ اور چائے شرط زندگی ہے۔ گوشت بارود ولایت سے آتا ہے، ڈاک کے ٹکٹ ولایت سے چھپ کر آتے ہیں، ریال و قرش لندن سے بن کر آتے ہیں، کپڑا انگلستان سے آتا ہے، اناج کے لیے ایشیا ہی سے، یہ وادی غیر ذی زرع ہے۔ یہاں کی خاص پیداوار صرف تربوز ہیں یا زمزم کا مقدس پانی۔ اونٹ معاش کا ذریعہ ہے، اور شریف حسین سابق ملک الحجاز کے قول کے مطابق جس وقت اونٹ کا بچہ پہلا بار گھر میں آتا تھا، اس وقت سے اور اس ساعت تک جبکہ وہ صرف پوست اور استخوان کا ڈھانچا رہ جاتا تھا۔ ہر ایک اونٹ بھرا خاندانوں کی پرورش کرتا تھا، کیونکہ اس آئے بار برداری کے تمام لوازمات کرایا اس کے ٹکٹ ہی میں تیار ہوتے تھے، اگر موٹروں کی بدولت وہ رزق کا دروازہ ہی قریب قریب بند ہے۔ ایک شرمناک بات ہے جس کو لکھتے شرم ہوتا ہے کہ جوان عورتیں بازار میں حاجیوں سے خیرات طلب کرتی ہیں، اور ان کو بدو پیا دیکر کرنے کے لیے افہاسے جنگلے پہ جاتے دیا بی غیرت نہیں آتی۔ زیادہ کتنا خلاف تہذیب ہے۔ تمدن یا شغل سفرنامہ لکھنا۔

معاشرت کا یہ حال تھا۔ اب سیاسیات پر غور کیجیے۔ جدہ میں خطبا بسکہ سلطان ابن سعود کا ہے، لیکن حکومت درحقیقت برٹش کانسل کرتا ہے ابن سعود کے زندی غلام بھاگ کر انگریزی سفارت خانے میں پناہ لیتے ہیں، اور کانسل جنرل ان کو جہازات پر سوار کر کے بے تکلف ملک سے باہر نکال دیتا ہے، لیکن ملک الحجاز دم نہیں مار سکتا۔ کانسل کی اجازت کے بغیر کوئی قافلہ جدہ سے مکہ یا مدینہ نہیں جا سکتا، اگر بادشاہ کو دخل دینے کا اختیار نہیں۔ سفارت خانے نے افغانیوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے واپسی کے ٹکٹ واشنس کانسل کے پاس جمع نہ کیے تو وہ مکہ نہ جانے پائیں گے، اگر عرب کا بزعم خود، خود مختار بادشاہ زبان ہلانے کی مجال نہیں رکھتا۔

مکہ معظمہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہے، اگر انگریزی کانسل جس دن چاہے چند گھنٹوں میں یہاں قبضہ کر سکتا ہے۔ نجدی فوج جو یہاں مقیم ہے وہ قواعد داں تو کیا ہوتی۔ آلات حرب سے بھی صحیح طور پر مسلح نہیں ہے۔ میں نے جمعۃ الوداع کے دن اور آج بھی ان کا جلوس دیکھا۔ کسی کے پاؤں میں جوتا ہے کوئی چپل پہنے ہے، اور کوئی ننگے پاؤں کاندھے پر بندوق رکھے چل رہا ہے۔ کارتوس کی پیٹیاں کمر میں بندھی ہیں معلوم نہیں خالی ہیں یا بھری ہوئی مگر بندوقیں ٹوٹی ہوئی اور زنگ خوردہ ہیں۔ یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ ہندستان میں حیدرآباد، گوالیار، اندور کی فوجیں اس سلطانی لشکر سے زیادہ آراستہ پیراستہ ہیں۔ ایک مشین گن اس تمام فوج کو منتشر کرنے کے لیے کافی ہے، اور یہ سپاہی پانچ منٹ بھی کسی قواعد داں فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس پر طرہ یہ کہ کل رعایا سلطان سے بیزار ہے۔ ہر ایک شخص بھی ایسا نہ ملا جو نجدیوں کی بدگوئی اور ابن سعود کی مذمت نہ کرتا ہو۔ یہاں کے باشندے ترکوں کے شرمندۂ احسان تھے۔ شریف حسین نے ان سے دغا کی اور ترکوں کے بیرون پروپیگنڈا ظالم کہے، اس وجہ سے ترکوں سے نفرت کرنے لگے، اور شریف حسین کو

تبدیلی کی درپردہ اعانت بھی کی۔ شریف کو شکست دینے کے بعد نجدیوں نے طایف میں قتل عام کیا۔ جب سفایا روپوشی ہونے لگی تو امان کا اشتہار دیا۔ بہت سے بے گناہ اس دھوکے میں آکر بازار میں حاضر ہو گئے، مگر امان کا صدا ذرا خاموش ہو گیا اور بے دریغ تیغ زنی ہونے لگی۔ ہزاروں بیگناہوں کا خون طایف میں لیا گیا۔ اس سطوت و جبروت نے مکہ والوں کو دہلا دیا اور غربا اور امرا سب ہی نے خاموشی سے نجدی کی اطاعت قبول کر۔ آج ہر ایک مکی الا ماشاء اللہ نجدی کا دشمن ہے، اور اس جوے کو گردن سے اتارنے کے لیے وقت کا منتظر ہے۔ ستم یہ ہوا کہ نجدیوں نے وحشی بدووں کو بھی پست کر دیا۔ ہزاروں بدو بے قصور اور بے الزام قتل کر دیے۔ اس قہر و غضب سے امن قایم ہو گیا۔ رستے محفوظ ہو گئے، اور آج یہ حالت ہے کہ جدہ کے ساحل سے عمان تک کوئی شخص سونا اچھالتا چلا جائے تو کیا لوٹ مار کا اندیشا نہیں ہے، لیکن غور کرو کہ یہ امن کس قدر گراں قیمت پر خرید کیا گیا۔ حرمین شریفین کی حفاظت کے لیے جو سپاہی من جانب اللہ متعین کیے گئے تھے وہ قتل ہو گئے، اور اب اغیار کے حملے کے لیے میدان صاف ہے۔ اندیشہ ہے وقت سے پہلے [illegible]

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
(اقبال)

ترکی زمانے کے رؤسا اور فقرا سبھی کی خدمت کرتے تھے، بڑے بڑے وظیفے سادات و شرفا کے مقرر تھے۔ بیواؤں اور یتیموں کی تنخواہیں جاری تھیں، اصطلاحات سے وہ کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے۔ آج نجدی ہر ایک [illegible] [illegible] کرتے ہیں، اور یہ [illegible] وغیرہ [illegible] جاتی ہے۔ [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔ مطوف [illegible] [illegible] حجاز کی [illegible]

خاطر سے وصول ہوتے ہیں۔ موقات اور جدہ کے اونٹ والوں سے فی حاجی چند روپیہ لیے جاتے ہیں۔ تمام تفصیل میں نے سنی تھی، مگر ٹھیک یاد نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ دس پونڈ فی حاجی سلطان کو ملتے ہیں۔ اب حساب لگا لو کہ سالانہ کس قدر رقم نجدی سلطانی خزانے کو پہنچتی ہے۔ پہلے یہ روپیہ اہل مکہ کی پرورش میں صرف ہوتا تھا، اور اب حجاز میں اور نجد میں انگریزی فیشن کا سامان مہیا کرنے کے کام آتا ہے۔ مکہ کی رعایا تباہ حال ہے، افلاس غربت اور مفلسی ان سے وہ افعال سرزد کراتی ہے جو بے دین ہونے کا لازمی نتیجہ ہیں، لیکن نجدیوں کو اس کی کچھ پروا نہیں۔ وہ جانتے ہیں اور سمجھ گئے ہیں کہ مکہ پر ان کی حکومت عارضی ہے، اور چند سال سے زیادہ قایم نہیں رہ سکتی، اس لیے جس قدر دولت یہاں سے جمع کی جا سکے فراہم کر لینی چاہیے۔ سلطان ابن سعود کا [illegible] حجاز کا وایسرائے، مکہ میں مقیم ہے۔ ہر جمعہ کو حرم شریف میں حاضر ہوتا ہے، لیکن اس کو وقعت کی آنکھ سے کوئی نہیں دیکھتا۔ اس کو یہاں کی بالاستقلال حکومت نہیں ملی ہے۔ اور مکہ پر نجدیوں کا تسلط قایم رہ سکتا ہے یا نہیں اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ [illegible] ہے کہ مالک الملک اس متبرک خطے کو غیر مسلم حکومت سے آزاد رکھے، اور اس کے باشندوں کو [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] آزمائی

میں مطوف [illegible] کے [illegible] بیٹھا ہوا طواف کرنے والوں کا تماشا دیکھ رہا تھا، اور [illegible] [illegible] کعبہ کی سعادت [illegible] [illegible] تھا۔ ترکی، چینی، افغانی، [illegible] اور ہندی [illegible] [illegible] کا طواف کعبہ شریف کے گرد [illegible] [illegible] تھے اور ان کا [illegible] [illegible] سلطان ابن سعود [illegible]

سی مفید اصلاحیں کی ہیں، اور ان میں سب سے زیادہ قابلِ تعریف اصلاح یہ ہے کہ اب یہاں نماز کی جماعت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ سب ایک ساتھ ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ مالکی مذہب کے مقلد زیادہ تر سوڈانی اور حبشی ہیں۔ وہ ہاتھ کھول کر نماز ادا کرتے ہیں۔ جاوی امام شافعی کے مقلد ہیں، اور اس وقت حجاج میں انہیں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ وہ رفع یدین اور آمین بالجہر سے یرتج بہ المسجد کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ مختلف عقاید اور مختلف ممالک کے مسلمان سب ایک ساتھ خداوند وحدہ لا شریک کی حمد و ثنا کرتے ہیں تو اخوت اسلامی کا وہ نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، جسے کم عقل نے کئی صدیوں سے نہیں دیکھا تھا۔ خدا سعودیوں کو توفیق دے کہ وہ ایک ضروری اصلاح اور کر دیں تو تمام دنیائے اسلام پر احسان ہو، یعنی عورتوں کے طواف کے لیے وقت کی تعیین کر دی جائے اور بعد ازاں پر ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہے، اور سیکڑوں بیجا اور بیجا الزامات ان پر دیے گئے ہیں اس فہرست میں یہ اضافہ اور ہو جائے تو بہت سی لغزشوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ازمنۂ گزشتہ میں بھی عورتیں مردوں کے ساتھ طواف کرتی تھیں، لیکن اس وقت آزادی کی وہ ہوا نہ تھی جو آجکل تمام دنیا میں دوڑ رہی ہے۔ پہلے عورتیں اپنی زینت کو چھپاتی تھیں۔ مردوں سے حکم سے اپنا جسم دور رکھنے کی کوشش کرتی تھیں، اور بدن چرا کر طواف بجا لاتی تھیں۔ [illegible] یہ زمانہ عریب سا ہے، عورتیں دوش بدوش طواف کرتی ہیں، اور کم سے کم مصری اور جاوی عورتوں کے متعلق اس میں ایک نکتہ ہے کہ ان کے احرام مردوں کے بدن سے مس ہوں۔ افسوس کہ یہ حالت [illegible] کے قریب پہنچ گیا، جیسے سابق سلاطین [illegible] پر زر دوزی اور [illegible] آ پہنچے [illegible] [illegible]

ہیں کہ سارا چہرا بخوبی نظر آتا ہے۔ اس صورت میں نقاب ڈالنے سے کیا فائدہ۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

سلطان عبدالعزیز بن سعود ملک الحجاز والنجد نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے کل شب (سہ شنبہ ۷ مئی ۱۹۲۹ء) کے وقت مکہ کو سربلند کیا۔ اس وقت مدرسے کے لڑکے جھنڈیاں ہاتھوں میں لیکر اپنے استادوں کے گروہ در گروہ سلطان کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔ دوکانوں پر سبز جھنڈیاں لگائی گئی ہیں۔ پھاٹکوں اور محرابوں کی آراستگی میں ہزارہا روپیہ صرف کیا گیا ہے، لیکن ان میں سے کوئی فعل خلاف شریعت نہیں ہو سکتا، کیونکہ اہل نجد متبع سنت ہیں۔

عصر کے بعد آج پنجشنبہ ۹ مئی ۱۹۲۹ء سلطان ابن سعود طواف کے لیے حرم محترم میں حاضر ہوئے۔ میں بھی زیارت سے فیض یاب ہوا۔ طویل القامت ہیں، اور چہرا رعب دار ہے۔ مسجد شریف میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ آدمی کا مجمع تھا، اور ان کو دیکھنے کے لیے سب ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ آگے آگے نرغہ ہوتا تھا، اور خوجے رستا صاف کرتے تھے۔ تب سلطان طواف کے چکر لگاتے تھے۔ اپنے قد و قامت کی وجہ سے وہ سب مصاحبوں اور رفقا سے ممتاز تھے، اور ان کا سر سب سے بلند تھا۔ اللہ ان کے اقبال میں ترقی دے۔ حجاز میں جو امن ان کی بدولت نصیب ہوا، وہ کئی صدیوں سے یہاں عنقا تھا۔

آج دوشنبہ ۱۳ مئی ۱۹۲۹ء کو پہلی بار مجھ کو اس مقدس زمین کی زیارت نصیب ہوئی جو ایک متبرک دن ایک ساعت کے لیے خانۂ کعبہ سے بھی افضل ہوئی تھی، یعنی اس پر حضرت سرور دو عالم شہنشاہ کونین احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تھی اور باعث ایجاد عالم و عالمیان کی قدم کے شرف سے زمین کا [illegible] ہو گیا تھا۔ سلطان [illegible]

فخر کرتے ہیں کہ ان سے زیادہ محبت کسی امت نے اپنے نبی کے ساتھ نہیں کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت بھی روایات سے ثابت نہیں، لیکن جس مقام پر آپ کے مولد ہونے کا ظن غالب ہے، اس کی عزت تمام دنیا کے عیسائیوں کی نظر میں زمین و آسمان سے بہتر ہے، لیکن بقول خواجہ حالی مرحوم "مومنوں پر کفت وہ ہی راہیں" ان کو کوئی ضرورت نہیں کہ اس جگہ کو پاک و صاف رکھیں جہاں ان کی قومی تاریخ کا آغاز ہوا، اور وہ بزرگ ترین ہستی عالم وجود میں آئی، جس نے دنیا کی ہوا پلٹ دی ہے

دیا قول اس کے جو دو بول نے
تو کلہ کا طوطی لگا بولنے

آج اس مقدس اور متبرک جگہ پر پرانے برتن پرانے کپڑے بکتے ہیں، چیتھڑوں کا نیلام ہوتا ہے! مسلمانوں کی غیرت اور حمیت کا اقتضا یہی ہے۔ ان کے اسلاف نے بادشاہ دو عالم کی وفات سے پچاس ساٹھ سال کے اندر جگر گوشگان رسول کو بے آب و دانا شہید کیا تھا، اور مرقد نبی کے قریب گھوڑے باندھے تھے۔ اب تیرا سو برس کے بعد اگر آپ کے مولد پر غلاظت کا انبار لگایا تو کیا تعجب کی بات ہے شاباش! ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ؎

ہم طالب شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

میں نے اس متبرک مقام پر درود پڑھا آنکھوں سے آنسو بہائے، میرے ایک رفیق نے نیلام خانے کا طواف کیا، اور ہم لوگ بمشکل اپنی زبان کو ان وحشی درندوں کے حق میں دعائے بد سے روک سکے۔ جنہوں نے اس تاریخی مقام کی یہ درگت بنائی ہے۔ ترکوں کے عہد میں یہاں عالی شان عمارت تھی، جو کہ اعجاز تھا تو نسل شب کو روشن ہوتے تھے، اور سیکڑوں عود و عنبر روزانہ صرف ہوتا تھا اگرچہ ایسے عمارات کو ڈھا کر پھینک دینا اپنی کو بھارکیا اور آج اس جگہ پر سامان کا نیلام ہونے لگا۔ فاعتبرو یا اولی الابصار!

اے محمد گر قیامت را برآری سر ز خاک
سر برآور دیں قیامت در میان خلق بیں

ضیا ہانی

دولت علم

علم آرام و روح راحت ہے
علم گہوارۂ مسرت ہے
علم و فن سے ہوا جو مالا مال
اس کا اہل ہنر میں عظمت ہے
گوہر آبدار علم و فن
پاس جس کے ہے اسکی وقعت ہے
نام پروریں پہ آج کل ہر قوم
دہر میں علم کی بدولت ہے
آکے دنیا میں جو رہا ان پڑھ
زندگی اس کی ایک لعنت ہے
علم سے جس نے فیض پہنچایا
قابل قدر اس کی محنت ہے
تنگ دستوں کے بھرد ے کیسے
علم آفاق میں وہ دولت ہے
اے ضیا فکر کا تو نہ کر پروا
دولت علم ہے تو عزت ہے

ڈاکٹر جیتیانند راشٹروادی

فطری علاج میں پانی کی اہمیت

زور کی پیاس لگنے کی صورت میں پانی پینے کے معاملے میں سستی دکھانا یا بہت زیادہ پانی پی کر پیٹ پھلا لینا دونوں ہی عمل نقصان دہ ہیں۔

جب پیاس لگے تو چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر پانی پینا چاہیے۔ کم پانی پینے سے معدے اور انتڑیوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ قبض رہنے لگتا ہے یا پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔ سرد پانی جسم کی تپش کو کم کر دیتا ہے۔ خون کا دباؤ گھٹاتا ہے۔ جلد کے مسامات کو کھولتا ہے۔ رگوں اور پٹھوں کو پھیلاتا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکے پانی کافی مقدار میں استعمال کریں۔

صبح سویرے اٹھ کر تانبے کے برتن میں رکھا ہوا باسی پانی پینے سے تمام دن جسم میں توانائی رہتی ہے۔ قبض نہیں رہتا۔ بھوک کھل کر لگتی ہے۔ جسم ہلکا پھلکا رہتا ہے۔ ناک کے رستے پانی پینے سے بینائی تیز ہو جاتی ہے۔ سر کا درد نہیں ہوتا۔ دماغ ترو تازہ ہو جاتا ہے۔ گردے کے مریضوں کے لیے صبح کو پانی پینا گویا امرت پینا ہے۔ خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور [illegible] ہے۔ سارا [illegible] پیشاب کے ذریعے نکل جاتا ہے۔ [illegible]

تھوڑا پانی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد پیتے رہیں تو مرض حیرت انگیز حد تک کم ہو جاتا ہے۔

آنکھوں کی بیماریوں سے محفوظ رہنے کے لیے آنکھوں کا غسل ضروری ہے۔ پانی اتنا ٹھنڈا ہونا چاہیے کہ آنکھ اسے برداشت کر سکے بہت سرد پانی سے نقصان ہو سکتا ہے۔ آنکھوں کے غسل کے تین طریقے ہیں۔

۱۔ چینی کے کشادہ پیالے میں ۷۰ سے ۸۰ درجے حرارت تک کا پانی بھر کر اس میں پیشانی اور آنکھیں ڈبو دیں۔ پانی کے اندر چھ سے آٹھ مرتبہ آنکھوں کو کھولیں اور پھر بند کریں۔

۲۔ برتن میں پانی ۸۰ درجے حرارت کا بھر کر دونوں ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے منہ پر ماریں اور آنکھیں کھلی رکھیں۔

۳۔ شیشے یا المونیم کے آئی کپ کو کسی قدر دبا کر آنکھوں سے لگائیں۔ پھر سر کو پیچھے کر کے آنکھوں کو چند مرتبہ کھولیں اور بند کریں۔

سرد پانی پینے سے نبض کو قوت حاصل ہوتی ہے، اور رفتار ہلکی ہو جاتی ہے۔ گرم پانی نبض کو کمزور اور اس کی رفتار کو تیز کر دیتا ہے۔ گرم پانی کے استعمال سے پسینا زیادہ خارج ہوتا ہے اور سرد پانی سے پیشاب کھل کر آتا ہے۔ آبی علاج سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے [illegible]

پر سرد پانی کافی مقدار میں پہنچنا ضروری ہے، مثلاً بخار کے مریض کو ہر دو گھنٹے بعد سرد پانی کا ایک گلاس پلا دینا مفید ہے۔ اس سے مریض کو پیشاب کھل کر آئے گا، اور پسینا بھی زیادہ آئے گا۔

کھانا کھانے سے آدھ گھنٹہ یا ایک گھنٹہ پہلے آدھا کپ گرم پانی، جیسے چائے پھونک پھونک کر پی جاتی ہے۔ اسی طریقے سے پانی بھی آہستہ آہستہ گھونٹ گھونٹ استعمال کریں۔ اس سے معدہ صاف ہو جائے گا اور قوت ہاضمہ ہو جائے گا اور قوت ہاضمہ بڑھے گی۔

جسم کے اندر گرمی کا ابال اٹھ رہا ہو یا اندر غلیظ مواد اور زہر جمع ہو یا خون ایک ہی مقام پر اکٹھا ہو رہا ہو ایسی حالت میں گیلی پٹی باندھنے سے تپش جاتی رہتی ہے۔ خون کا دورہ ٹھیک ہو جاتا ہے، اور جلد کے مساموں کی راہ سے میل اور زہر باہر نکلنے لگتا ہے۔ مریض جب سرد پانی برداشت نہ کر سکتا ہو یا اس کے جسم کی گرمی گھٹ گئی ہو تو نیم گرم پانی کی پٹی کام میں آ سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے کپڑے کو پہلے خوب تہہ کر لیا جائے پھر اسے ہلکا سا نچوڑ لیں تاکہ باندھتے وقت پانی ادھر ادھر بہہ نہ جائے۔ پٹی باندھنے کی سب سے اچھی ترکیب یہ ہے کہ پہلے گیلا کپڑا لپیٹ لیں پھر اوپر سے موٹے خشک کپڑے (مثلاً فلالین یا کمبل) کی چوڑی پٹیوں کی تہیں لپیٹ لیں کہ گیلے کپڑے سے خشک پٹی کی چوڑائی ایک انچ زیادہ رہے۔ اس خشک پٹی کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس سے گرمی [illegible] رہتی ہے، اور یہ گیلی پٹی کو جسم کی گرمی سے خوب گرم ہو جانے دیتی ہے اس طرح جسم سے [illegible] کی رفتار خون کی گردش تیز ہو گی۔ کھال کے مساموں [illegible] کے اندر غلاظت اور زہر باہر نکل [illegible]

[illegible] پٹیاں جسم کے [illegible] کرنے [illegible] کی

جاتی ہے۔ گردن کے لیے چار انچ چوڑے باریک کپڑے کی اتنی لمبی گدی بنا لیں کہ پوری گردن پر دائیں کان کی لو سے بائیں کان کی لو تک پہنچ سکے۔ اس پٹی کو ۶۰ ڈگری گرم پانی میں تر کر کے نچوڑ لیں۔ اور گردن پر رکھ دیں۔ اس کے اوپر سے آٹھ انچ چوڑی اور چوبیس انچ لمبی خشک فلالین کی پٹی بنا کر گردن پر لپیٹ کر سر پر باندھ لیں۔ فلالین کی پٹی میں دونوں کانوں کو کھلا رکھنے کے لیے سوراخ کیے جائیں تاکہ مریض کو تکلیف نہ ہو۔

سینے پر پٹی باندھنے کا طریقہ یہ ہے کہ باریک کپڑے کی تین تہوں کے دو جیکٹ اتنے لمبے تیار کریں کہ وہ پورے سینے کے گرد گردن سے کمر تک لپٹ سکیں۔ جیکٹوں میں بغلوں کے دونوں جانب اتنے بڑے سوراخ کر دیں کہ مریض کے بازو باہر نکل سکیں۔ دبیز فلالین کے دو ٹکڑے بھی لیں جو اسی شکل کے ہوں۔ اس جیکٹ کو ۶۰ ڈگری گرم پانی میں تر کر کے نچوڑ لیں اور فلالین کے ٹکڑے پر پھیلا کر دونوں کو آدھی لمبائی تک لپیٹ دیں، مریض کو کروٹ کے بل لٹا کر اس کی پیٹھ کی جانب بغیر لپٹے ہوئے حصے کو بچھا دیں۔ اس کے بعد مریض سے کروٹ بدلنے کو کہیں اور پٹی کے لپٹے ہوئے حصے اس کے سینے اور پیٹھ پر سے گزار کر دونوں کناروں پر سیفٹی پن لگا دیں جب پانی سے تر کی ہوئی پٹی خشک ہو جائے تو اسی طریقے سے دوسری پٹی باندھ دیں۔

جسم کے کسی حصے میں درد ہو تو اس کے سینکنے یا تر کرنے کا آسان تر طریقہ یہ ہے کہ دبیز فلالین کے ٹکڑے کی دو تین تہیں کر کے ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیں۔ اسے خوب اچھی طرح نچوڑ کر مقام درد پر ذرا سی ویسلین لگانے کے بعد فوراً رکھ دیں اوپر سے کمبل ڈال دیں۔ دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے بعد پٹی تبدیل کرتے رہیں۔ [illegible] ہو جانے کے بعد پٹی ہٹا دیں [illegible] پانی سے آہستہ آہستہ [illegible] جسم [illegible]

کے اس حصے کو تولیے سے خشک کرلیں۔ جوڑوں اور عضلات کے درد میں یہ طریقہ خاص طور سے مفید ہے۔ پیٹ اور آنتوں کی صفائی کے لیے پانی بڑی کارگر شے ہے۔ کسی چھوٹے ٹب میں صاف پانی بھر کر اس ٹب میں ایسے بیٹھ جائیں کہ پاؤں باہر رہیں۔ پھر پیٹ کا نچلا حصہ (پیڑو وغیرہ) کافی دیر تک رگڑتے رہیں۔ اسے کٹ کا غسل کہتے ہیں۔ ٹب نہ ملے تو تسلہ، کڑاہی، پتیلی یا اور کسی چیز کا بڑا سا برتن لیا جا سکتا ہے۔ برتن کی ساخت اس طرح کی ہونی چاہیے کہ اس میں ناف اور ناف کے نیچے کا حصہ ران تک پانی کے اندر ہو جائے، اور پاؤں اور ناف کے اوپر کا حصہ پانی سے باہر رہے۔ دو زانو پیروں کے نیچے چھوٹی سی چوکی یا دو تین اینٹیں رکھ لیں تاکہ برتن پر دباؤ نہ پڑے، اور خون کی گردش میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ "ہپ باتھ" کے لیے بیٹھنے سے پہلے جسم کا جو حصہ پانی سے باہر ہے (سر اور چہرے کے علاوہ) اسے کسی چادر یا کمبل سے اچھی طرح ڈھک لینا چاہیے۔ ہپ باتھ لیتے وقت سردی سے ... جائے تو ناف تک جسم کے تمام حصوں کو کسی کپڑے یا تولیے سے تیزی سے لگاتار خوب رگڑتے رہنا چاہیے۔ یہ بات یاد رکھیں کہ دائیں سے بائیں طرف اور بائیں سے دائیں طرف رگڑنا ہے۔ "ہپ باتھ" کے دوران ہمیشہ چت ٹیک کر بیٹھنا چاہیے۔ کمر کو جھکا کر یا ڈھیلا کر کے نہ بیٹھیں۔ اس کے علاوہ پہلے دن ہی ٹب میں زیادہ پانی نہ بھریں۔ پہلے دن صرف دو انچ پانی میں بیٹھنا چاہیے۔ پھر رفتہ رفتہ پانی کی مقدار بڑھائی جائے۔ ٹب میں بیٹھ کر ٹھنڈے پانی سے پیڑو کو ناف ... رگڑ کر ... کرنا چاہیے۔ شروع شروع میں ایسا پانی استعمال کرنا چاہیے جو زیادہ ٹھنڈا نہ ہو۔ ابتدا میں دو ... منٹ تک ہپ باتھ لے سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ... وقت ... منٹ کیا جا سکتا ہے ... اور کرنے

اور پاخانے کی بڑی آنت کو صاف کرنے کے لیے بے مثال نسخہ ہے۔ حاملہ عورتوں کے لیے بھی "ہپ باتھ" بہت فائدہ مند ہے۔ جو چھوٹے بچے رات میں بستر پر پیشاب کر دیتے ہیں۔ ان کو ہپ باتھ کرانے سے ان کی یہ عادت ترک ہو جاتی ہے۔ حافظے کی طاقت اور دماغ کی طاقت بڑھانے کے لیے ہپ باتھ بہت فائدہ مند ہے، لیکن دل کی بیماری شدید حالت کو پہنچ گئی ہو، مثانے میں سوزش ہو، بڑی آنت، پیڑو یا پوشیدہ اعضا میں سوزش ہو یا خون آیا ہو تو ہپ باتھ ہرگز نہیں لینا چاہیے۔

راز لائلپوری

غزل

دل میں کسی کی حسرت دیدار بھی نہیں
صد شکر مجھ کو عشق کا آزار بھی نہیں

دل کے چمن میں پہلی سی وہ تازگی کہاں
اب دشت بھی نہیں ہے یہ گلزار بھی نہیں

اللہ جانے کیوں ہے پریشان و مضطرب
جب دل اسیر گیسوئے خمدار بھی نہیں

وہ کیف سرمدی ہے کہ مست الست ہوں
یہ اور بات مے کا پرستار بھی نہیں

جوش جنوں میں سر کو جو پھوڑیں تو کس طرح
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

اے رازؔ اپنی ساماں ہوں بازار دہر میں
ہر شے کو دیکھتا ہوں خریدار بھی نہیں

مشتاق احمد، ایم۔ اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا

محمد مجیب صاحب

دہرادون کے کیمبرج اسکول میں میرا داخلہ جنوری ۱۹۱۶ء میں ہوا، اور ہمارے بورڈنگ ہاؤس کی کشادہ اور شاندار عمارت ہی کے ایک حصے میں تعلیمی کام بھی ہوا کرتا تھا۔ تو اس ۱۹۱۵ء کے غالباً وسط میں ایک ایسے وقت، جبکہ کلاس ہو رہی تھی اسکول کے پرنسپل آر۔ ٹی۔ ڈابی صاحب ایک دن دو نئے لڑکوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک چودھری محمد اسحاق صاحب اور دوسرے محمد مجیب صاحب تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ دونوں قریبی رشتے دار ہیں۔ مجیب صاحب قد میں اتنے چھوٹے تھے کہ کسی معمولی سے ڈیسک پر کام کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی، اسلیے انہوں نے کھڑے ہو کر اپنا سبق کیا۔ ڈابی صاحب نے کسی انگریزی کتاب میں سے ایک کہانی ان دونوں کو پڑھ کر سنائی اور ہدایت کی کہ اپنے الفاظ میں لکھ کر اس کو پیش کریں، بعد تشریف لے گئے۔ اس کے بعد شام کو کسی وقت انہوں نے ہم لڑکوں سے ذکر کیا کہ یوں تو دونوں نے لڑکوں نے اچھا کام کیا ہے، مگر مجیب صاحب کی عبارت بہت ہی اچھی ہے، اور اس میں شک بھی نہیں کہ ... طلبا میں سب سے اچھی انگریزی مجیب صاحب ... اور پھر بعد میں ... کا امتحان

دینے جانا پڑتا تھا۔ مجیب صاحب کے لیے ایک چھوٹا ڈیسک بطور خاص مہیا کیے جانے کے واسطے پرنسپل صاحب نے پہلے ہی سے خط لکھ کر انتظام کروا لیا تھا۔

انگریزی ادب کا جو چسکا مجھے پڑا وہ مجیب صاحب کی اور ان کی لائی ہوئی خوب صورت جلدوں والی کتابوں کے پڑھنے کا نتیجہ تھا، چنانچہ کتاب AESOP'S FABLES میں نے پہلی بار مجیب صاحب ہی سے لے کر پڑھی تھی اور اچھی اچھی کتابیں جمع کرنے اور پڑھنے کا شوق مجیب صاحب کو شروع دن سے رہا ہے۔

اسحاق صاحب تو ہم لڑکوں میں اس لیے زیادہ گھل مل گئے تھے کہ وہ میدانی کھیلوں میں ہمارے ساتھ شریک رہتے تھے اور ہاکی اور فٹبال کھیلتے تھے، فارورڈ لائن میں بہت ہی اچھی کھیلتے تھے، فارورڈ لائن میں رائیٹ ان کھیلا کرتے تھے، جبکہ احمد الصارف ان ہوتے تھے، اور ہر میچ میں ان دونوں کا ادا ایک گول کر آنا ان کے لیے کوئی بات ہی نہ تھی۔ فضل الرحمان احمدی صاحب ہمارے بڑے قابل بھروسا گول کیپر تھے، اور محمد اخلاق حسین - احسن محمد فاروقی - آشد ونیز سو صاحبان وغیرا بہت اچھا ہاکی کھیلتے تھے۔ ہماری ٹیم کی جان حسن خان صاحب تھے جو سنٹر ہاف کھیلا کرتے تھے ... سا تنا کہا جا سکتا ہے کہ ضلع ...

دہ کنار اس زمانے میں دو سب اضلاع میں کا دور دور تک ان کی ٹکر کا شاید ہی کوئی کھلاڑی رہا ہو۔ اگر آج ہوتے تو آل انڈیا الیون کے بہترین کھلاڑی مانے جاتے، لیکن مجیب صاحب تو بس کتاب کے کیڑے تھے۔ ان مارے باندھے کو ایک آدھ بار ایک آدھ اسٹک پکڑ لینا کسی شمار میں نہیں آتا۔ وہ کھیل دیکھنے کو تو برابر آیا جایا کرتے تھے اور میچوں کے بیچ دیکھنے کو بھی ساتھ رہا کرتے تھے، مگر کسی میچ میں کھلاڑی کی حیثیت سے ان کی شرکت کم سے کم مجھے تو یاد نہیں، البتہ پکنک وغیرہ پر بڑے شوق سے جایا کرتے تھے، اور کبھی کوئی سفر ایسا نہیں ہوا جس میں مجیب صاحب ساتھ نہ گئے ہوں۔ حد یہ ہے کہ منصوری کا پہاڑ پر جانے سے بھی کبھی نہیں ہچکچائے، حالانکہ راج پور سے منصوری تک کی یہ چڑھائی ہم طلبا پیدل طے کیا کرتے تھے، اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب بس اور موٹر کار وغیرہ کی موجودگی بھی حاصل نہ تھی۔ اس سلسلے میں وہ دن مجھے کبھی نہ بھولے گا جب ہم سب لڑکے خوش خوش دہرہ دون تک تو بس سے تانگوں میں لد کر راج پور پہنچے، اور وہاں سے کھیلتے کودتے منصوری کا پورا رستہ باتوں باتوں میں پیدل طے کر گئے، اور دن بھر منصوری میں مارے مارے پھرنے کے بعد اپنی حالت دیکھ کر گاڑی کے ساتھ پیدل ہی مغرب کے قریب راج پور واپس آئے، مگر یہاں آن کر جب پتا چلا کہ کوئی سواری دہرہ دون لے جانے کے لیے موجود نہیں ہے تو سب کو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، لیکن اب سیدھے سڑک کی تمام میل کا یہ رستہ پیدل طے کرنے کے سوا چارا ہی کیا تھا۔ پھر یہ آخری مرحلہ جس طرح ہم سب کو کھلا ہے، اس کا اظہار [illegible] ناممکن ہے، اور جب واپس گھر کو [illegible] نصیب ہوئی ہے، اس [illegible] لڑکوں کے [illegible] یادوں میں [illegible] معلوم کس کا [illegible] دیکھ کر ہم لوگ [illegible] سفر کرنے سے اٹھ گئے۔

واپسی گو دیر میں ہوئی تھی، مگر ڈابلی صاحب حیران و پریشان کھڑے ہوئے نظر پڑے۔ انتہائی شفقت و محبت سے کھانا کھلوایا، اور دوسرے دن ہم سب کو جماعت کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا، مجیب صاحب کی استعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ نئی نئی زبانیں سیکھنے کا ان کو اسی زمانے سے خاص شوق تھا۔ اپنے ساتھیوں میں اکیلا میں ہی ایسا جونیر طالب علم تھا جو گلستان، بوستان، انوار سہیلی جیسی کتابیں گھر پر پڑھ کر مدرسے میں شریک ہوا تھا، اور مجیب صاحب نے شاید وہیں آن کر فارسی شروع کی تھی، لیکن جب کیمبرج برلا سینیر امتحان کا نتیجہ نکلا کہ جس کے لیے ہم کو الہ آباد جانا پڑا تھا تو جہاں دوسرے لوگ صرف کامیاب ہوئے تھے وہاں مجیب صاحب کو آنرز ملے تھے اور کئی مضامین میں ڈسٹنکشن آئی تھی، اور خاص بات یہ ہے کہ فارسی میں ان کے مارکس مجھ سے زیادہ تھے۔ ہمارے پرنسپل ڈابلی صاحب لاطینی زبان پر جان دیتے تھے، اور انہوں نے اپنی پوری کلاس پر اس زبان کو حکماً لاد دیا تھا۔ خیر اور سب تو زبردستی کی لاطینی پڑھتے تھے، مگر مجیب صاحب کو اس زبان سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی، اور انہوں نے یہ عقلمندی کی کہ نو سیکھی تعطیلات میں جب گھر گئے تو لاطینی گرامر کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لیتے گئے، اور وہاں پورا [illegible] کو چاٹ ڈالا، نتیجہ یہ ہوا کہ چونکہ عربی کی طرح لاطینی زبان میں بھی قواعد ہی پر بہت کچھ منحصر ہے، مجیب صاحب اس زبان پر [illegible] ہو گئے۔ مادری زبان اردو کو خاطر [illegible] ہو گیا۔ پھر مجیب صاحب نے آگے چل کر رفتہ رفتہ جرمن اور روسی زبانوں پر [illegible] حاصل کر لیا، اور آج تو وہ [illegible] سے بھی آگے نکل گئے ہیں [illegible]

زبان کا چل رہا تھا۔ جب ڈالی صاحب کی کوئی
منطق میری سمجھ میں نہیں آتی تھی تو میں یہ مل
مجیب صاحب سے اپنی مشکل حل کر لیا کرتا تھا،
اور بسا اوقات ڈالی صاحب کے مقابلے پر
مجیب صاحب کا بتلایا ہوا ترجمہ مجھے زیادہ بامحاورہ
اور چست معلوم ہوتا تھا، اسی لاطینی گرامر کے
سلسلے میں یاد آیا کہ ایک دفعہ لفظ TUTRIAL
مجھے یاد نہیں رہا اور اس کی بجائے ——
TERRITORIAL GRAMMER
کے الفاظ میرے منھ سے نکلے تو مجیب صاحب
نے مسکرا کر اس غلطی کی اصلاح کر دی تھی۔
ایک دن کلاس میں ALLITERATION
کا ذکر آ گیا، اور پرنسپل صاحب نے تفصیل
کے ساتھ بہت سی مثالیں دے کر اس پر روشنی
ڈالی تو مجیب صاحب نے اسی دن سہ پہر میں
جب کہ وہ آرچرڈ کے ایک درخت پر چڑھے
کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے آرچرڈ توڑتے
ہوئے دیکھا تو ایک کڑک دار آواز لگائی کہ۔
I SAY MUSHTAQ. DON'
YOU BE PLUCKING PLUM
PLEASE۔ مجیب صاحب میں ایک
خاص بات میں نے یہ پائی کہ وہ کسی سے زیادہ
گھلنے ملنے اور بے تکلف ہونے میں پس و پیش
کرتے ہیں، اور بہت ہی بیے دیے رہنے کے
عادی ہیں، مگر اس کے ساتھ قدرت نے ان کو
بڑا پرمذاق رنگین قسم کا مزاج عطا فرمایا ہے۔
ہم لوگ بیرونی اسکول میں کم و بیش چار سال
تک ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں مقیم رہے
اس دوران میں ہر قسم کے واقعات پیش آئے،
[illegible] صاحب کو ایک دفعہ بھی غصہ
میں [illegible] نہیں دیکھا۔ ہم لوگ اکثر
[illegible] تھے اور بعض دفعہ تو مار
[illegible] کی نوبت پہنچ جاتی تھی، چاہئے تھا کہ
[illegible] صاحب سے تو تقریباً
[illegible] رہتی

تھا، لیکن مجیب صاحب اس بکھیڑے سے ہمیشہ آزاد
رہے۔ جب شروع شروع میں وہ اسکول میں
داخل ہوئے ہیں تو کھانے کی لمبی میز پر اگر ان کو
کسی بات پر ہنسی آ جاتی تھی تو سامنے کی رکابی
کھینچ لیتے تھے اور اس پر نہایت اطمینان سے
منھ رکھ کر آہستہ آہستہ دیر تک دل کھول کر
ہنستے رہتے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد بیرا
غریب پلیٹ بدلنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔
مولوی محمد احمد خان صاحب (علیگ) ہمارے
اسکول کے آنریری سکریٹری تھے، اور اس کام کے
سلسلے میں تقریباً ہر مہینے سہارنپور سے آن کر
چند روز کے لیے بورڈنگ میں قیام فرمایا کرتے
تھے۔ ایک دن عبدالرحمان صدیقی صاحب مرحوم
اور شعیب قریشی صاحب مرحوم ان کے پاس ڈیرہ
دون تشریف لائے، اور بورڈنگ ہی میں
ٹھہرے۔ اس دن رات میں ڈنر کے بعد جو سب
ساتھ مل کر کھایا کرتے تھے، طلبا کو تقریر کرنے
کی ترغیب دی گئی۔ ہم سب جونیئر طلبا کی عمر میں
تقریر کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ مجیب صاحب نے بھی
تقریر کی، موضوع غالباً فٹ بال کا کھیل تھا۔
انہوں نے رائے دی کہ فٹ بال بہت بڑی ہوتی
ہے، اس لیے اس کا سائز گھٹا دینا چاہیے۔
ظاہر ہے کہ مجیب صاحب بھلا فٹ بال کیا کھیلتے؟
مگر شاید انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر
میں کبھی اس کھیل میں شرکت کروں تو فٹ بال
کے چھوٹا ہوئے بغیر ایسا کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔
ویسے ہی ایک دوسرے موقع پر شاید ہندستانی
اور انگریزی پر مباحثہ ہو رہا تھا تو مجیب صاحب
نے ایک انگریزی شعر جس میں DROP BY DROP
کے الفاظ تک مجھے نہیں بھولے [illegible]
اور انداز سے سنایا تھا کہ سارا مجمع پھڑک گیا اور
بے اختیار تالیاں بجانے لگا تھا۔ مجیب صاحب
[illegible] سے چھپتے ہیں۔ میرے کوئی [illegible]
تھے، اور بے اختیار جی چاہتا تھا کہ کوئی [illegible]
[illegible] کہہ کر مخاطب کرے۔ اس لیے ایک

نے مجیب سے کہا کہ تم مجھے اپنا بنا لو تو اس وقت
سے اپنے دوسرے بڑے بھائیوں کی طرح انہوں
نے مجھ کو بھی بھائی جان کہہ کر مخاطب کرنا شروع
کر دیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی پروفیسر حبیب
صاحب کا انگریزی خط ایک خاص شان دل
آویزی رکھتا ہے، اور مجیب صاحب نے اسکول
کے ابتدائی دنوں میں اس طرز تحریر کی ہو بہو نقل
کرنی شروع کر دی تھی اور اس میں اتنی شباہت
پیدا کر لی تھی کہ دیکھنے والے کو بہ مشکل
یہ تمیز ہو سکتی تھی کہ اس میں حبیب صاحب کی
تحریر کون سی ہے اور مجیب صاحب کی کون سی،
مگر جہاں حبیب صاحب اپنی ابتدائی روش
تحریر پر آخر وقت تک قائم رہے۔ وہاں مجیب
صاحب نے "ہفت سر ہفتاد قالب دیدہ ام"
کے مصداق اپنے خط کو بار بار بدلا ہے، اور
وہ حبیب صاحب کی روش تحریر کو آج بالکل
فراموش کر چکے ہیں۔

میری بد قسمتی سے سینیئر کیمبرج کے امتحان
میں جغرافیا کا مضمون لازمی تھا۔ بمبئی میں منعقدہ
اس امتحان کے موقع پر جغرافیا کا پرچہ میرے
سامنے ہے، اور اس میں MADAGASCAR
پر ایک سوال دیا گیا ہے۔ مجھے اس مضمون سے
عمر بھر کا بیر ہے اور بندہ اس میں ہمیشہ کورا ہی رہا
برابر میں مجیب صاحب بیٹھے ہوئے تھے میں نے
چپکے سے دریافت کیا کہ MADAGASCAR
کیا بلا ہے تو مجیب صاحب نے بلا کسی جھجک کے پوری
متانت اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا
A TRIBUTARY OF THE RIVER NILE
اور میں وہی جواب لکھ آیا۔ جس طرح کا یہ
جواب تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ
اس امتحان کی جو رپورٹ کیمبرج سے شائع ہوئی
ہے، اس میں اس جواب کا حوالہ موجود ہے۔
ایک دوسرے موقع پر مجیب صاحب کے والد
بزرگوار جناب مولوی محمد نسیم صاحب مرحوم جو
لکھنؤ کے مشہور ایڈووکیٹ مانے جاتے تھے

لکھنؤ میں ڈالی باغ والے اپنے دولت کدے میں
تشریف فرما ہیں، اور مجیب صاحب کے ساتھ اس
وقت میں بھی حاضر ہوں۔ ممدوح مجھ سے دریافت
فرماتے ہیں کہ دہرادون کے بعد تمہارا کیا ارادہ
ہے۔ میں جواب میں عرض کرتا ہوں کہ صنعت
و حرفت کے لیے جاپان جانے کا خیال ہے، اس
پر سوال ہوتا ہے کہ WHAT ARE YOUR
PROSPECTS IN
THAT SUBJECT. جواب ملاحظہ
ہو I HAVEN'T
SEEN ANY PROSECTUS AS YET.
خیر وہ مرحوم و مغفور تو یہ جواب سن کر لاجواب
ہو گئے، مگر مجیب صاحب کے لبوں پر جو مسکراہٹ
نمودار ہوئی اس سے مجھے اپنی غلطی کا احساس
ہوا۔ مجیب صاحب کے ساتھ ان کے ایک سن
رسیدہ ملازم بھی دہرادون بھیجے گئے تھے۔ نام
رمضان تھا، اور پوربی بولی بولا کرتے تھے، جو
ان کے منہ سے بڑی بھلی لگتی تھی، بھلا اب کاہے
کو زندہ ہوں گے۔

طلبا کے لیے ایک دوسرے کی کوئی چیز چھیٹ
لینا کوئی بات ہی نہیں ہے، پھر جب زندگی بورڈنگ
ہاؤس میں گزر رہی ہو تب تو اس عادت میں بڑی
صفائی آ جاتی ہے، اور بہت سے واقعات اس
سلسلے میں سنائے جا سکتے ہیں، جو دلچسپی سے
خالی نہ ہوں گے، مگر یہاں صرف ایک واقعہ سامنے
لانا کافی ہوگا۔ مجیب صاحب ہماری کھینچا تانی
اور مار دھاڑ میں کبھی شریک نہیں رہتے، مگر
اس کے باوجود بورڈنگ کے احاطے میں لیچی کے
درختوں کا جو سرسبز و شاداب باغ تھا، اس
کی لیچیوں پر مجیب صاحب کی نظر بھی پڑ جاتی
تھی، اور مالی کی نظر بچا کر ان کو توڑنے اور کھا
لینے میں مجیب صاحب کسی سے پیچھے نہیں رہتے
تھے، یہی نہیں، بلکہ جب دوسرے لڑکے رات
کو لیچیاں توڑ کر اپنے تکیوں کے غلافوں میں
بھر لیا کرتے تھے اس وقت مجیب صاحب

...ٹ میں بھی اپنا حصہ بہت احتیاط کے ساتھ
...نے پاس سے چکا لیا کرتے تھے۔ ہم طلبا میں سے
...ع بھی اپنے کانوں کو از خود جنبش دینے پر
...ر نہ تھا، مگر مجیب صاحب جب چاہتے تھے
...دو لمحے خاموش ہو کر اپنے دونوں کان ہلا لیا
...تے تھے۔ پتا نہیں کان اب بھی ان کے قابو
...ں میں یا نہیں، مگر جہاں مجیب صاحب اپنے
...نوں سے ہم کو ہرا دیا کرتے تھے وہاں میں بھی
...سب کو ہرا دیا کرتا تھا سوائے ایک تک
...کشتی ایک سال تیں میں الٹی ہو کر تیرا اور
...ب صاحب کا ساتھ دہرادون کے بعد
...سفورڈ یونیورسٹی میں بھی تین سال تک رہا،
...ا لیے وہاں کا بھی کچھ حال سنتے چلیے۔
مجیب صاحب سینیئر کیمبرج امتحان میں آنرز
...ساتھ شاندار طریقے پر کامیاب ہوئے تھے،
...ر میں ناکام رہا تھا، لیکن جب آکسفورڈ پہنچے
...پتا چلا کہ سینیئر کیمبرج کے صرف وہ طلبا وہاں
...ا ابتدائی امتحان RESPONSIONS
...کا سے مستثنیٰ قرار پاتے ہیں، جنہوں نے
...لاطینی زبان کے ساتھ یونانی زبان بھی لی ہو،
...ینکہ مجیب صاحب نے لاطینی کے علاوہ فارسی لی
...تھی، اس لیے ہم دونوں کو یہ ابتدائی امتحان
...دینا پڑا، اور دونوں نے فارسی کے ساتھ امتحان
...دیا، اور صرف اس موقع پر فارسی زبان میں
...ب صاحب کے مارکس مجھ سے کم آئے تھے۔
...ن یونیورسٹی کے ہندستانی طلبا نے مدتوں
...اپنی ایک مجلس مباحثہ آکسفورڈ مجلس کے
...م سے الگ قایم کر رکھی ہے، چنانچہ اس کا
...ایک دستور ہے اور عہدوں کے انتخابات
...سب آنریری ہوتے ہیں ہر سال ہوا کرتے
...۔ میں اس مجلس کا آنریری ٹریژرر منتخب
...تھا مگر جب مجیب صاحب کا انتخاب
...ٹری سکریٹری کی حیثیت سے عمل میں آیا تو
...ہر مجلس کے جلسوں کی روئیداد لکھنی پڑی،
[illegible] کر کے روئیداد

مجیب صاحب نے پڑھ کر سنائی تو اس پر بڑی
لے دے شروع ہو گئی، اور ہر طرف سے اعتراضات
کی بھرمار ہونے لگی۔ بات اصل میں یہ تھی کہ
سابق میں اس مجلس کی روئیداد ایک بڑی
روکھی پھیکی اور بے جان سی چیز ہوا کرتی تھی،
جس میں سوائے اس کے فلاں مضمون پر فلاں
صاحب نے اتنی دیر تک تقریر کی اور مباحثے
کا یہ نتیجا نکلا اور شکریے کے بعد جلسہ برخاست
ہوا، اور کچھ نہیں ہوتا تھا، اس لیے شاید مجیب
صاحب نے خیال کیا ہوگا کہ موقع اچھا ہے کہ
معمولی ڈگر سے ہٹ کر اپنا مقام پیدا کرنا چاہیے
مگر وہاں تو اے روشنی طبع تو بر من بلا شدی کا
والا مضمون ہو گیا، اور جو پہلی روئیداد انہوں
نے لکھی اس میں اپنے مخصوص اور چلبلے انداز
میں ہر ہر تقریر اور مقرر پر دل کھول کر تبصرا کیا،
اور روئیداد کے صفحات پر رنگ رنگ
کے پھول کھلا دیے، مگر اعتراض یہ تھا کہ
اس قسم کی رنگین روئیداد مجلس کی سابقہ
روایات کے بالکل خلاف ہے۔ مجیب صاحب
نے آئی بلا کو یہ کہہ کر ٹالا کہ آیندہ سے ایسے
کسی اعتراض کا موقع نہیں دیا جائے گا، سابق
میں میرا یہ خیال تھا کہ جو بات مجیب صاحب کی
تحریر میں ہے وہ ان کی تقریر میں نہیں ہے، اور
اپنے اس خیال میں کسی ترمیم کی ضرورت مجھے
آج بھی محسوس نہیں ہوتی۔

اگر مجیب صاحب کی نظر سے یہ سطور گذریں
تو ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اسکول کے
بچے کچھے چند ساتھیوں کو دہرادون میں جمع کرنے
کی کوشش کریں اور ایک REUNION
کی سی صورت نکالیں، تاکہ ڈاکٹر صاحب
مرحوم کی روح خوش ہو، اور ہم لوگ بھی ایک
بار پھر اس خوبصورت مقام کی زیارت کر لیں،
جہاں زندگی کا سب سے اچھا اور خوشگوار زمانہ
گذار آئے تھے۔ جن چند حضرات کا اسکول سے تعلق
کا ذکر اوپر کی ابتدائی سطور میں آ چکا ہے [illegible]

جب ان کو پتا چلا کہ میں نے مجیب صاحب کے اسکول پر ایک مضمون لکھا ہے تو انہوں نے اس میں جو اضافہ کیا وہ ایک گروپ فوٹوگراف کے تعلق سے شروع ہوتا ہے جو ان دنوں میرے پاس محفوظ ہے۔ اور جس کو دیکھ کر اسحاق صاحب نے بھی اپنی یاد تازہ کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان خاتون کا نام جو مس اسمتھ کے برابر بیٹھی ہیں اور سال ہا سال سے [illegible] میں ہماری ابتدائی جماعت کی ٹیچر تھیں مسز ڈکنسن ہے۔

"اس گروپ میں ایک نہایت ہی نیک نام اور بلند اخلاق اور ہر دلعزیز شخصیت ہمارے پرنسپل آر۔ ای۔ ڈابی صاحب کی تھی جو کہ ہمارے ضروریات کے ہمہ وقت ساتھی اور انتہائی محبت اور خلوص سے ہم کو پڑھایا کرتے تھے، اور طلبا کی ہر شرارت کو سراہتے تھے، چنانچہ جب ایک میمن سیٹھ کے صاحبزادے پیر بھائی نے خلاف وضعداری اسکول برادران ملت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے گھر سے لائے ہوئے حلوے و بادام و اخروٹ و چلغوزہ جات بقدر مد شیخ کلاں تصرف خاص میں رکھ لیے۔ خود ہی تکلف اندوز ہو کر استفادہ اٹھاتے، اور یاران طریقت کے اصرار پر ان کو سمجھا دیتے کہ [illegible] کا مال نہیں ہے، ان لیے ایک اتوار کی صبح جب پیر بھائی سویرے کی تازگی میں چہل قدمی فرما رہے تھے، اور ایک شخص نے ان کے کان میں چپکے سے کہا کہ باغ کے فلاں گوشے میں تمہارا فلاں [illegible] کو زنگ سے توڑ کر مال غنیمت تمام برادری میں تقسیم ہو رہا ہے، تو پیر بھائی وہاں سے اڑے اور اڑ کر انہوں نے [illegible] کر دی دونوں شیخ کلاں پر اپنے تکلفات سے بھرے [illegible] نہیں سماتے تھے، وہ آج اندر [illegible] اسکول [illegible] غیر معمولی متحرک ہیں، [illegible] جذبات [illegible] اور [illegible] جناب پرنسپل

آر۔ ای۔ ڈابی کی خدمت میں لپک کر حاضر ہوئے اور قصہ بیان کر ڈالا۔ طلبی ہوئی معاملہ پوچھا گیا، سب خاموش کھڑے رہے، پھر مجیب سے اور مجھ سے پوچھا گیا، مجیب نے کہا۔ "

SIR, IF YOUDON GET ANGY, WE WILL TELL YOU EVERY THNG.

پرنسپل صاحب نے سنا اور خوش ہوئے، اور مجیب کی اور ہم سب کی پیٹھ ٹھونکی، اور پیر بھائی کو ان کی [illegible] پر سخت ملامت کی۔

یہ تو مشتاق احمد صاحب نے اپنے مضمون میں ظاہر کر دیا ہوگا کہ ہمارے اس اسکول کی ابتدا مسعود عباسی اور محمد احمد صاحبان نے کی تھی۔ مسعود عباسی صاحب انجینیئر تھے، اور بعد کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے علی گڑھ میں شعبۂ تعمیرات کے خاص آدمی رہے، اور محمد احمد صاحب بھوپال میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہو گئے تھے۔ ان دونوں اور ڈابی صاحب سے بنتی نہیں، اور ڈابی صاحب نے جب استعفا کی دھمکی دی تو یہ دونوں وہاں سے ۱۹۱۶ء میں علیحدہ ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں طلبا کی تعداد بارہ تھی جو کہ پھر چودہ ہو گئی، اور ۱۹۱۸ء میں جس وقت کہ ہم ماہ دسمبر میں سینئر کیمبرج کا امتحان دینے بیٹھ گئے تو کل تعداد تیئس ہو گئی، اس سال [illegible] کو سینئر بھیجا تھا۔

اگرچہ ہمارے اسکول میں اساتذہ کی کمی تھی، اور سینئر کیمبرج کی تیاری کے لیے اول و آخر زیادہ تر ڈابی صاحب ہی تھے، جیسے ابتدائی کلاس کے لیے مس اسمتھ اور مسز ڈکنسن اور ایک مسٹر جان بھی تھے۔ یہ مسٹر جان ایک غیر معمولی شخص تھے، اور کلاس ختم ہوتے ہی ان کا بیشتر وقت تتلیاں پکڑنے میں صرف ہوتا تھا، [illegible] کی ترکیبیں درست کر کے اور [illegible] میں سے کر اسکول کیا [illegible] اور باغ [illegible] اور بہت جاں فشانی اور محنت سے [illegible] پکڑتے، اور ایک خاص [illegible]

آرائش کے لحاظ سے قطار در قطار بے چاروں
کو پن کر دیتے، پھر ہم لوگوں کے سامنے بکس کھول کر
رکھ دیتے، اور ہم حیرت سے ان سے پوچھتے
SIR, THIS BLUE ONE HERE WITH THE
THIS IS EGGY اور وہ بتلاتے IS POTS
اور یہ دیکھیں کتنا چھوٹا خوبصورت ہے —
THIS IS LADY'S FANCY اور
یہ دیکھو اور یہ بلکل OAK کی پتی کا مالک
اور پر کھولتا ہے تو کتنا اچھا سنہرا رنگ
MAGNIFICENT THIS IS BIG OAK
LEAF اور اسکے پیچھے ——
UNDER THAT BIG CAMPHER TREE
میں تین دن مستی رہا تب کہیں یہ ہاتھ آئی
THE SWIFTEST BUTTERFLY BLUE BOT
وغیرہ وغیرہ۔ ان کا COLECTION نہایت
حسین اور دلفریب تھا، اور وہ تتلی نواز تھے، اور
فن تتلی بازی کے ماہر۔ مسٹر جان نے تتلی بازی کی
وبا لڑکوں میں بھی پھیلا دی تھی، اور کئی لڑکوں کے
پاس خود اپنا DODGER تھا، اور اکثر دوپہر
کی چھٹی میں وہ بھی اس فلاں نا کھیل میں مبتلا
رہتے تھے۔

مسٹر جان کے علاوہ ہمارے اسکول میں ایک
ڈرائنگ ماسٹر صاحب بمبئی سے بلائے گئے تھے،
جہاں تک خیال ہے ان کا نام عبدالقادر صاحب
تھا۔ یہ تصویر کشی میں اس وقت کے اسکولی معیار
کے لحاظ سے کافی اچھے تھے، اور وہ بمبئی سے ایک
خاص پنسل بیڑی کا منگوا لیتے تھے جو ایک یا دو
ماہ کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ
یہاں میں پنسل کے نام سے بھی واقف نہ تھے جس
طرح جان صاحب کا انگریزی مشغلہ تتلیات تھیں،
اسی طرح عبدالقادر صاحب کا بیشتر وقت —
PENCIL SKETCHING میں
گزرتا تھا۔ تصویروں کا مخصوص سائز، اور وغیرہ
[illegible] اور [illegible] کے متعلق [illegible] بات
[illegible] اصلاح [illegible] کیا کرتے

کرتے۔ ان کا ایک چھوٹا ہوا سا ALBUM تیار
ہو گیا تھا، اس البم کو وہ کھولتے اور اپنے شاہکار
کا حسین مرغی اور ایک انداز سے کھڑے مرغ
کی طرف اشارا کرتے ہوئے ہم لوگوں کو اپنا
آرٹ تفصیل سے سمجھاتے، اور داد طلب ہوتے
اور ہم لوگ اس فراخ دلی سے انکی تعریفیں کرتے
کہ وہ فوراً اپنی پرانی بیڑی پھینک کر ایک نئی
بیڑی سلگا لیتے۔ سینئر اسٹاف میں ان
دنوں شعیب قریشی صاحب نے تاریخ پڑھائی،
جو بعد کو سفیر روس پاکستان کے ہو گئے تھے
اور فارسی اور دینیات کے ایک دیوبند کے
عمر مولوی صاحب تھے، لیکن ان کو غصہ زیادہ
آتا تھا، چنانچہ جب لڑکوں نے ایک بار ان سے
پوچھا کہ جناب اسلام میں سود لینا کیوں ناجائز
ہے تو مولوی صاحب کو تاؤ آ گیا اور ڈنڈے پر
ہاتھ رکھ کر بولے کہ وہ نالائق تم کو یہ نہیں
معلوم کہ سود لینا نہایت زبردست گناہ ہے۔ وہ
یہ چند ماہ رہے اور ان کی جگہ ایک مرہٹے مسٹر
PANIKAR شاید IN PERSIAN
کچھ زمانے تک فارسی تدریس کرتے رہے، مجھ کو
اکثر خیال آیا کہ بعد کو یہ PANIKAR
ہیں جو انڈیا گورنمنٹ کی طرف سے سفیر ایران
اور مصر مقرر ہوئے تھے، اور LINGUIST مشہور
تھے، مگر انکے متعلق پروفیسر مجیب زیادہ بہتر جانتے ہیں۔
ہمارے پرنسپل صاحب کافی سخت تھے، اور
اسکول کا انتظام اچھا تھا، اور تعلیم ایک خاص
اور ڈھنگ سے ہوتی تھی، اور کلاس ورک اور
ہوم ورک میں بڑی مستعدی سے کام لیا جاتا تھا
تعلیم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ [illegible]
جو پہلا امتحان دینے گیا وہ چھ لڑکوں پر مشتمل
تھا ان میں ہم پانچ پاس ہوئے، اور [illegible]
ہونے والوں میں ایک بزرگ ہیں جنکو [illegible]
[illegible] DISTINCTION ملی
[illegible] کوئی شک نہیں کہ پرنسپل صاحب [illegible]
[illegible] تھے، مسٹر [illegible]

پہ بہت زور دیتے اسی طرح SPORTS کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔ اسپورٹس میں فٹ بال - کرکٹ - ٹینس اور ہنگ بانگ سب ہی کھیلے جاتے تھے، اور اتوار کو ران سواری کے لیے گھوڑے کرایے پر راج پور سے آجاتے تھے، اور ایک کورٹ بھی آتا تھا، اور ٹینس میں ایک سینیر اور جونیر ٹورنمنٹ بھی ہوا، لیکن دہرادون میں ہمارے اسکول نے ہاکی میں ایک خاص شہرت حاصل کر لی تھی، اور باوجود قلیل تعداد کے ہم نے ایک ٹیم بنائی تھی۔ جس نے بعد کو کافی نام پیدا کیا - پرنسپل صاحب کی رہنمائی سے دہرادون کے وسیع میدان میں گرجے کے سامنے ہم کو ایک ہاکی کی فیلڈ مل گئی - کچھ دنوں کی پریکٹس کے بعد دہرادون کے اے - پی - مشن اسکول کی ہاکی الیون کو ہم نے چیلنج کیا - یہ دہرادون کی سب سے مضبوط ٹیم تھی، اور ہم نے ۸ - ۰ سے شکست کھائی - دوسرے ہفتے کرسچین - اے - وی کالج سے میچ ہوا، اور ہم نے ۲ - ۰ سے شکست کھائی، لیکن جب تیسرا RETURN میچ مشن اسکول سے ہوا تو ہمارے اسکول نے ۰ - ۲ سے فتح پائی - پرنسپل صاحب کو ہمارے اسکول کا اتنا خیال رہتا تھا کہ ان کو جب خبر ملی کہ ہماری ٹیم کامیابی سے کھیل رہی ہے تو وہ ہاف ٹائم ختم ہونے سے پہلے ہی فیلڈ پر پہنچ گئے، اور اپنے اسکول کی جیت سے اس قدر خوش ہوئے کہ ایک دن کی چھٹی ملی، اور ایک تہیٹر آیا ہوا تھا، اس میں جانے کی اجازت ملی، اس کے بعد ہماری ٹیم کا ریکارڈ ہے کہ کسی اسکول، کالج یا پرائیویٹ ٹیم سے نہیں ہارے - فریدالحق انصاری (ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بھانجے) اس کے کپتان تھے اور وہ A.P. MISSION SCHOOL کے اولڈ بوائے بھی تھے -

چنانچہ دسمبر ۱۹۱۱ء کی چھٹیوں میں ان کے وسیلے سے ہمارے اسکول کی ہاکی الیون دلی گئی اور ہشت موری گیٹ میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر ٹھیری - ڈاکٹر صاحب ہمارے اسکول کے PATRON بھی تھے، اور ان کے علاوہ عبدالرحمان صاحب سندھی اور ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب بجنوری بھی ہمارے اسکول کے PATRONS تھے اور کبھی کبھی اسکول میں آکر ٹھیرتے بھی تھے -

۱۹۱۱ء میں دلی میں اسپورٹ کا چرچا کم تھا، اور اے، پی - مشن اسکول کی الیون دلی کی بہترین ٹیموں میں تھی - میچ بہت زوروں پر ہوا - مشن اسکول کی طرف سے نذیر محمد بہت اچھا کھیلے، لیکن ہماری الیون کا ہیرو ہمارا اسینٹر ہاف منصب دین شہر نرسنگ پور صوبے کا رہنے والا تھا، اور ہم کو ۰ - ۲ سے کامیابی حاصل ہوئی، لیکن دوسرے دن جب اے - پی - مشن کالج سے کھیل ہوا، اور کالج کی ٹیم بہ نسبت اسکول کمزور تھی تو REFEREE کی اشد بے ایمانی کی وجہ سے کھیل ختم ہونے سے پہلے ہی رک گیا، اور ٹیمیں واپس ہوگئیں -

بورڈنگ یعنی کھانے پینے کا انتظام محمد حسین صاحب WARDEN کیا کرتے تھے - محمد احمد صاحب کی طرح یہ بھی جالندھر کے رہنے والے تھے - جالندھر نے ایک سے ایک نامی CRICKETER پیدا کیے ہیں - محمد حسین صاحب نہایت فاسٹ بولر تھے اور اب جیسے ہیں ٹسٹ کرکٹ سے بخوبی واقف ہوں میرا اندازہ ہے کہ اگر وہ ۱۹۳۳ء یا اس کے بعد ہوتے تو یقیناً وہ ٹسٹ ٹیم میں لیے جاتے، لیکن اس وقت ان کی کوئی پوچھ نہ تھی - محمد حسین صاحب کا انتظام اچھا نہ تھا، اور لڑکوں کے احتجاج پر پرنسپل صاحب نے KITCHEN اور DINING HALL کا انتظام لڑکوں کے ہاتھ میں دے دیا - ان میں مشتاق احمد صاحب نے بڑا کمال کیا، بلکہ ایک انقلاب ہوا کہ پھر جو غذا ہم کو ملی اس سے بہتر غذا

میں قطعاً ممکن نہیں۔ ناشتے میں دلیا، دودھ، انڈے، توس، مکھن، چائے۔ لنچ میں سالن، کباب، خشکا یا کھچڑی، ترکاری، دال، چپاتی، چائے میں توس، مکھن، جام، جیلی کبھی پیسٹری، ڈنر میں قورما کبھی مرغ کے ساتھ، کباب کبھی کٹلس، خشکا یا پلاؤ، ارہر یا دھوئی کی دال، چپاتی اور پڈنگ اور یہ سب اصلی گھی میں اور چاول وغیرا۔

نوٹ :- یہ خط مضمون نہیں ہے، بلکہ مشتاق صاحب کا ہمارے کیمبرج اسکول کے بارے میں ایک مضمون کسی رسالے میں نکلنے والا ہے، اس لیے بطور یادداشت میں نے چند باتیں لکھ دیں کہ شاید ان کی یاد سے رہ گئی ہوں، اور کام آ جائیں۔ رہا یہ کہ لڑکوں کی پڑھائی سوشل لائف — SCHOOL ACTIVITIES EXCURSIONS وغیرا وغیرا تو مشتاق صاحب نے یہ کمال خوبی اپنے مضمون میں ضرور پیش کیے ہوں گے۔

خلیفہ عبدالحکیم

اک حسرت دل میں

گو لاکھ انسان کو دنیا میں راحت عیش اور آرام ملے
یا ہستی کے میخانے سے تلخا ہر غم کا جام ملے
بے لطف شفقت میں گزرے یا من بھاتا کچھ کام ملے
گم نامی میں آسودہ ہو یا شہرت پا کر نام ملے
اک درد سا دل میں رہتا ہے جو دورِ غم ایام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں
شاہوں پہ بھی وہ وقت آتا ہے جب دولت سے بیزاری ہو
گو ان کا سات اقلیموں میں فرمان اور سکہ جاری ہو
جب لذت اور غم دونوں سے انساں کی طبیعت عاری ہو
[illegible] دیکھے اور یاس سی دل پر طاری ہو
[illegible] کچھ غم دوراں کچھ رنج نہیں آلام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں
[illegible] میں [illegible] اور انسان کب کمال کرے
[illegible] سے کچھ دولت سے [illegible] حال کرے

دنیا میں پیدا مال کرے یا فکر کمال و مال کرے
پر دل خاموش سا رہتا ہے جب دل سے کوئی سوال کرے
جس وقت طبیعت پر طاری کوئی بھی خیال خام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں
جیسے برسات میں دور کہیں کوئل کی کوکو ہوتی ہے
سے جاتی ہے اور اک عالم میں آواز یہ جادو ہوتی ہے
جس طرح ضبط سے چشم دل روتے ہوئے آنسو ہوتی ہے
جیسے گم کردہ یوسف کی پیرہن میں بو ہوتی ہے
چھلکا ہے اس صہبا کا دل اور کوئی شیشہ و جام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں
خوشبو جیسے بھینی بھینی کلیوں کی قبائے تنگ میں ہے
خوابیدہ ہے یہ دل میں رہتی جس طرح شرارہ سنگ میں ہے
گم ہے یہ سکوت شام میں ہے گم ہے یہ شفق کے رنگ میں ہے
اور گم ہے اس حسرت کی جھلک سے اور نالۂ چنگ میں ہے
یہ رنگ ہے دل کی دنیا کا یہ کفر نہیں اسلام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں
بازاروں کی رونق میں بھی بیگانہ سا رہتا ہے جس
جس طرح ساز کے دل میں چٹکی لیتی ہے یاد وطن
جس طرح سے پت جھڑ کی رت میں بیم امید بہار چمن
جیسے حسرت اور عبرت کا نقشہ ہو کوئی تعمیر کہن
اس حسرت کا معلوم نہیں آغاز نہیں انجام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں
پردیس میں جیسے کوئی سنے چھوٹے ہوئے دیس کا گیت کوئی
ساون کی پھوار میں یاد آئے بچھڑا ہوا من کا میت کوئی
حیران سی اور سہمی جب کوئی مسکرا جاتا ہے بیت کوئی
اس طرح کی اک مٹھی سی کسک اسے من ہے ترا ریت کوئی
یہ ہستی کا انداز ہے یہ نقد و طلب دشنام نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں
سنسار کے دھندوں میں پھنس کر کچھ اس کا سراغ نہیں
آفات جہاں کی آندھی میں روشن من کا چراغ نہیں
ہے بیہودہ دل میں اس کا اثر آ [illegible] کچھ اس سے داغ نہیں
کیا اپنی چمن کو دکھلا میں یہ [illegible] کا داغ نہیں
چھپ کر بیٹھا ہے بستر میں کر لو ذوق [illegible] نہیں
اک حسرت دل میں رہتی ہے جس حسرت کا کچھ نام نہیں

مجید بیدار

غبار خاطر، ابوالکلام اور خودداریت

غبار خاطر میں ابوالکلام آزاد نے نفسیات انسانی کے اسی پہلو کو خودداریت دی ہے جو خودداری میں اور مستقل مزاجی کی نمایاں مثال ہے۔ ابوالکلام ہندستان کے ان اولین مفکروں میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے سہل نگاری کی مبنی جو لانی بنیادوں پر مکتوب نگاری کی عمارت تعمیر کی۔ یہ اعتبار اسلوب آزاد کا حسن رقم ان حدود اور پابندیوں کو مسمار کرتا ہے جو سہل پسندی کا خاصا بنی ہوئی تھی۔

تخلیق، اور تسخیر کا ممیّات کی بنا پر ہر فنکار کی یہ خواہش ہوتی ہے اس کا مرتبہ بلند ہو اور زمانے کی نبضوں پر اس کی حکمرانی رہے۔ یہ ایک ایسی خواہش ہے جو ہر فنکار اپنے سینے میں پوشیدہ رکھے ہوئے زمانے کی رفتار اور نشیب و فراز کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ قدرت نے مقتضائے فطرت انسانی کے باعث فنکار کے دل و دماغ کو ہمیشہ منور اور حساس رکھا ہے، چنانچہ وہ کسی بھی حالت میں ہو اس کا دل شہرت کے بام عروج پر پہنچنے کے لیے مضطرب رہتا ہے، بقول جوش ملیح آبادی

ہر مقام کو دمن ہے شیشہ مضطرب تکمیل ہو گئے
ہر سنگ کو سینے جب سے پارس میں مل ہو گئے

مولانا آزاد بھی غبار خاطر میں اپنی شخصیت کو مستقل مزاجی اور خودداری کے زیور سے آراستہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ خودداری کا جامہ زیب تن کیے ہوئے اپنی شخصیت کی انفرادیت کو معنوی حیثیت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ایک ہمہ گیر عالمی شہرت یافتہ اپنی انفرادیت کا اظہار کرے تو یہ عین فطرت ہے، اور یہ فعل اس کی شخصیت کو زیب بھی دیتا ہے۔ آزاد کی منفرد طرز تحریر اور اسلوب بیان خود ان کی شخصیت کو انفرادیت بخشتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد کے خطوط میں جہاں انانیت کا شائبہ ہوتا ہے وہیں خودداریت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ رات میں جلد استراحت کرنا اور سحر خیزی کو عادت ثانیہ بنا لینا، یہ ایسے افعال ہیں جن سے ان کی شخصیت میں انفرادیت نمودار ہوتی ہے، لیکن سحر میں بذات خود چائے تیار کرنا اور ملازم کو صبح اٹھنے کی زحمت سے بچانے کی کوشش کرنا ان کی خودداریت کی جانب واضح اشارے ہیں، چونکہ ایک خوددار فرد ہی اپنی خواہش اطلب کی تکمیل کے لیے دوسروں پر بار ڈالنا مناسب نہیں سمجھتا۔

ڈاکٹر محمد حسین کے قلم نے ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے متعلق جن کلمات کو قرطاس پر بکھیرا ہے ان کے مطابق " آزاد کی بلند و بالا شخصیت آسمان کی طرح آسمانوں سے نیچے نہیں اترتی - وہ ایک عظیم عظمت سے بولتے ہیں" ان کی خودداری اور انانیت

کے پیچھے رومانی ادیب کی انفرادیت پرستی ہے جسے حقیقت سے زیادہ تخیل سے محبت ہوتی ہے "آزاد"، حال کا تصور کرتے ہیں تو محرومی، پستی اور افسردگی کے جذبات کے ساتھ، کیونکہ ماضی اور مستقبل ایک رومانی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں، اور حال ایک تکلیف دہ سچائی کی طرح سامنے ہے۔ ان کے آدرش بلند اور تخیل بے پایاں ہے، وہ کسی حقیقت سے سمجھوتا پسند نہیں کرتے اسلئے حقیقتوں کو اپنی شخصیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، شکست ہونے کی صورت میں افسردگی کو اپنا مزاج بنا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن کے بیان سے ابوالکلام کی خودداریت کو تقویت پہنچتی ہے کیونکہ ایک خوددار فرد ہی زمانے "حال کی دشواریوں کا تذکرہ افسردگی سے کرتا ہے، لیکن وہ مستقبل سے مایوس نہیں ہوتا ہے۔ وہ ماضی پر طائرانہ نظر ڈالتا ہوا حال کی پیچیدگیوں پر افسردا سا، تابناک مستقبل کے خیالات کو ذہن نارسا میں پوشیدہ رکھتا ہے" اس کے علاوہ حال کی غم خواری کرتے ہوئے مستقبل کی رعنائیوں میں اپنے متعقد حیات کا متلاشی ہوتا ہے۔ ایک خوددار شخص ہی ماحول کی گہرائی اور زمانے کی رفتار کو پابہ جولاں کرسکتا ہے، اور حقیقت سے سمجھوتا نہیں کرتا ایک شخصیت گردانتے ہوئے حقیقتوں کو اپنی خودداریت میں حل کرنے کے لیے متجسس رہتا ہے، جس میں انفرادیت کا عنصر بھی شریک رہتا ہے اس بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابوالکلام کی شخصیت ایسے حسن کی ناظر ہے جو جسم تو انفرادیت کا رکھتی ہے، لیکن خودداریت کا محمل اس حسن کو چھپاتا ہے۔

مولانا آزاد اپنی سحر خیزی سے متعلق سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں "اس سحر خیزی کی عادت کے لیے والد محترم کا منت گذار ہوں۔ ان کا معمول تھا کہ رات کی پچھلی پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے تھے۔ بیماری کی حالت بھی اس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی" اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سحر خیزی انہیں ورثے میں ملی تھی اور ان کو اس ورثے پر فخر تھا، جس کے سبب مولانا نے اسے اپنایا۔ اس بنا پر مولانا کی سحر خیزی کو انفرادیت پسندی سے تعبیر کرنا حقیقت سے انحراف کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ ان کی سحر خیزی ایک موروثی صفت تھی، جس پر انفرادیت کی مہر ثبت نہیں کی جا سکتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا خودداریت کا مجسمہ تھے، تب ہی تو انہوں نے موروثی صفات کو اپنا لیا، لیکن انہیں پامال ہونے نہ دیا۔

"کاروان خیال" اور "نقش آزاد" کے مقابلے میں "غبار خاطر" کے خطوط، شخصیت آزاد کی غیر معمولی خودداریت کے نمونے پیش کرتے ہیں۔ مکتوب ۱۵ راگست ۱۹۴۲ء میں ابوالکلام نے اپنی خودداریت کو اس طرح تسکین دی ہے۔ "جب عزیز اقرباسے بھی ملنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، جس کا حق مجرموں اور قاتلوں سے چھینا نہیں جاتا تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دے گی۔ ایسی حالت میں عزت نفس کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے نہ کوئی توقع رکھی جائے۔"

اس بیان میں ابوالکلام نے اپنی خودداریت کو حبیب پردے کے پیچھے رکھا ہے اور اس کو "عزت نفس" کے تقاضے سے تعبیر کیا ہے۔ وہ اتنے خوددار ہیں کہ اپنی آرزوں اور توقعات کو حکومت کے دست نگر رکھنا نہیں چاہتے۔ حکومتی کارندوں کی رضامندی کے باوجود وہ اپنے گھر سے سامان منگوانا نہیں چاہتے، کیونکہ حکومت خط و کتابت اور ملاقات پر پابندی عاید کر رکھی ہے وہ تکالیف برداشت کرنا بہتر سمجھتے ہیں لیکن اپنے مخالف کی جانب سے امداد کے لیے ہاتھ کھول دیے جانے پر بھی مدد طلب نہیں کرتے یہاں پر ابوالکلام کی سیرت اجاگر ہوتی ہے یعنی ان کی سیرت حضرت یوسف علیہ السلام کی مانند

اختیار کرتی ہے۔ حضرت یوسف نے جیل میں امداد
سے رستے مسدود ہونے کے باوجود مدت قید میں کمی
کرنے کی درخواست کی تھی، اور اسی سبب سیرت
یوسف پر خودداری کو نظر انداز کرنے کے الزام
میں دفعتہً قید میں توسیع کر دی گئی تھی، لیکن
ابوالکلام کی سیرت خودداری، مستقل مزاجی
اور خود اعتمادی کی ایسی مکمل مثال ہے کہ وہ مدد طلب
کرنا پسند نہیں کرتی۔ ان کے سیرت کی خود اعتمادی
اس بیان میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔

"بہرحال جو صورت حال پیش آئی ہے اس
سے جو کچھ بھی انقباض خاطر ہوا تھا، وہ صرف اس
لیے ہوا تھا کہ باہر کے ملاقی یک قلم قطع ہو گئے
اور ریڈیو سیٹ اور اخبار تک روک دیے گئے ورنہ
قید و بند کی تنہائی کا شکوہ نہ پہلے تھا، اور نہ اب ہے!"

قید و بند کی تنہائی کا شکوہ نہ کرنا ہی سیرت
آزاد کو افضلیت بخشتا ہے۔

"غبار خاطر" میں متعدد جگہوں پر ایسے جملے بکثرت
مستعمل ہوئے ہیں جس سے ابوالکلام آزاد کی شخصیت
کی خودداری اور سیرت کی خود اعتمادی ظاہر ہوتی ہے
نیچے کے جملے ان کی خودداری، مستقل مزاجی اور
خود اعتمادی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع
ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں
رہتا تھا۔"

"میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا
تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔"

"وہ جس نامراد ہستی کو چودہ برس کی عمر میں زمانے
کی آغوش سے اس طرح چھین لیا گیا ہو وہ اگر کچھ
عرصے کے لیے شاہراہ عام سے گم ہو کر آوارۂ
دشت و وحشت نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا۔ ایک
مدت تک طرح طرح کی سرگردانیوں میں نشان
راہ گم رہا، منزل مقصد کی خبر مل سکی نہ منزل کی۔"

[illegible] کہ قدم قدم پر ٹھوکروں سے دوچار ہونا
پڑا اور پیچ پیچ رکاوٹوں سے الجھنا پڑا، مگر
[illegible] آگے [illegible] کی طرف بڑھاتے گئے اور

جستجو نے کبھی گوارا نہیں کیا کہ درمیانی منزلوں میں رک کر
دم لے لے۔ بالآخر دم لیا تو اس وقت لیا جبکہ منزل
مقصود سامنے جلوہ گر تھی اور اس کی گرد راہ سے
اس کی چشم تمنائی روشن ہو رہی تھی۔"

"گویا اس معاملے میں بھی اپنی چال زمانے سے
الٹی ہی رہی۔ لوگ زندگی کے جس مرحلے میں کمر
باندھتے ہیں، میں کھول رہا تھا۔"

خوددار اور خود اعتماد شخصیت کی جھلکیاں کامل
طور پر اوپر کے جملوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان میں
بعض جملوں پر انانیت کا شائبہ ہوتا ہے، لیکن یہ
انانیت، خودداریت کے درد کو اپنے پہلو میں
چھپائے ہوئے ہے، اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ
شخصیت آزاد انانیت کا وہ مضبوط قلعہ ہے
جس پر خودداریت کے محافظ پوری طرح چوکسی
وجوہ نظر آتے ہیں۔

غبار خاطر کے مطالعے سے یہ بات روز روشن
کی طرح نمایاں ہوتی ہے کہ ابوالکلام کا طرز تحریر
خود ان کی شخصیت کو انفرادیت بخشتا ہے اس کے
علاوہ ابتدا ہی سے عربی، فارسی اور مذہبی ماحول
ملنے کی بنا پر ان کا طرز تحریر فارسی اور عربی آمیز رہا۔
اس بنا پر آزاد پر یہ بہتان تراشنا حقیقت سے
انحراف کے مترادف ہوگا کہ وہ ہندستانی کو
پھر اسی دور کی طرف لے جانا چاہتے تھے جس میں
دقیق الفاظ کو نثر اور نظم میں استعمال کرنا "شان فخر"
سمجھا جاتا تھا۔

علی سردار جعفری نے ابوالکلام کے خطوط کو خطوط
نہیں، بلکہ ادب پارے تسلیم کیا ہے، جس کی رو
سے ابوالکلام کی شخصیت کو یہ افضلیت حاصل ہوتی
ہے کہ انہوں نے خطوط میں جدت طبع سے کام لیا اور
اپنے فن سے خطوط کی ان قدیم روایات سے راہ
فرار اختیار کی، جس میں صرف اپنے حالات اور
کیفیات کو مکتوب الیہ تک پہنچایا جاتا تھا۔
غبار خاطر میں ابوالکلام نے اسلوب کو ایک نئی
چاشنی سے آگاہ کیا، اور اسلوب خطوط نگاری
میں منظر کشی اور اپنے حالات کو افسانوی انداز

میں بیان کرنے کو رواج دیا۔ گو کہ مکتوب۔ دلی کیفیات کے اظہار کے لیے لکھے جاتے ہیں، لیکن مولانا آزاد نے خطوط میں واقعات کو رنگین کا جامہ پہنا کر اور دلی کیفیات کو موزوں الفاظ کا گہوارا بنا کر بے مثال بنا دیا ہے۔

کسی بھی فرد کی شخصیت کے مطالعے کے لیے اس کا اسلوب اور تصور کا تعینات کو پرکھا جاتا ہے۔ "غبار خاطر" میں ابو الکلام کا اسلوب منفرد اور تصور کا تعینات جمالیاتی حسن و روحانی جدت سے مرکب ہیں جس کی عمدہ اشال "قصے زاغ و بلبل" ہے۔ درحقیقت شخصیت کا اظہار اور خودداریت کی بنا پر ہی کسی شخص کی فطرت اور اسلوب کو جانچا جاتا ہے۔ نقادوں کی نگاہیں فنکار کی ان صلاحیتوں کو اجاگر کرنا چاہتی ہیں جو ان کی شخصیت کا خاصا نہیں ہے، چنانچہ یہ کہنا کہ اسلوب کا دارومدار شخصیت پر نہیں ہوتا، کسی حد تک نامناسب ہے؛ کیونکہ ایک منفرد شخص ہی اپنی انفرادیت کو اس وقت ظاہر کرتا ہے، جبکہ اس کے اسلوب میں خود نمائی نہ ہو بلکہ رنگینی و دلفریبی ہو۔ اس سبب سے آزاد کی طبع کا انفرادیت پسند ہونا عین فطرت ہے، کیونکہ "غبار خاطر" رنگین بیانی کی پابند ہے۔

رومن رولاں نے بہت کہا ہے "بڑے فنکار وہ بھی ہوتے ہیں، جو صرف اپنی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن سب سے بڑے وہ ہیں جن کے دل سب انسانوں کے لیے دھڑکتے ہیں"۔ اس بیان کی رو سے اگر خطوط نگاری کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ہم اسی کی ترجمانی کرتے ہیں، اور اس میں دوسروں کی ترجمانی ناممکن ہے۔ اس بنا پر آزاد کی شخصیت و سیرت پر خطوط کی روشنی میں انانیت کا الزام لگانا قطعی بے بنیاد ہے۔

اگر کوئی سائنسدان خود کو سائنسدان کہے تو یہ حقیقت پسندی کی دلیل سمجھی جاتی ہے، اسی طرح اگر کوئی ماہر علم اپنی ذات سے "عالم" کے لفظ کو منسلک کرے تو اسے بھی حق گردانا جائے گا، لیکن

تعجب اس بات پر ہے کہ غبار خاطر میں ابو الکلام اپنی شخصیت کے ارتقا اور علوم سے دلچسپی کا تذکرہ کریں تو انہیں انانیت پسند اور انانیتی ادب کا امام کہا جاتا ہے یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔

انسان کا وجود، خود اس بات کی دلیل ہے کہ خدا بھی انانیت پسند ہے، اور انسان، خدا کا نور ہونے کے سبب انانیت پسندی کا حق رکھتا ہے۔ خدا کی اکثر صفات انسان میں بھی موجود ہیں، خدا سمیع اور بصیر ہے تو انسان بھی دیکھ اور سن سکتا ہے۔ خدا کی صفات انسان میں پائے جانے کے سبب انانیت کا اظہار بھی ضروری ہے، قدرت اپنی انانیت کی تشہیر کے لیے انسان کو عالم وجود میں لائی اور اس کو اپنی یاد کی ترغیب دی۔ اس لحاظ سے نقادوں کی ابو الکلام کے انانیتی کردار پر تنقید بے معنی ہے اور جو نقاد ابو الکلام کی شخصیت اور سیرت پر انانیت پسندی کا الزام لگاتے ہیں اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ خطوط میں سوائے اپنی ذات و منفرد خیالات کے کسی اور کا تذکرہ نہیں کیا جا سکتا۔

ابو الکلام آزاد نے خطوط میں تاریخ، ادب، فلسفہ اور مذہب کے امتزاج سے ایک نئی جدت پیدا کی، اور اسلوب میں رنگین بیانی، منظر نگاری اور واقعات نگاری کو پیش کر کے خطوط نگاری کے محدود تصور کو وسعت دی۔ ادب کے فن خطوط نگاری سے ایک جدید طرز اور اس کے اسلوب سے ایک جدید طرز تحریر کی۔ اس بنا پر ابو الکلام آزاد کی شخصیت ہندستانی ادب کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گی۔

ادیب حسن ادیب قطعہ

وقت کی آنکھ میں نمی سی ہے
دل کی دنیا لٹی لٹی سی ہے
یاد کس کی ستا رہی ہے مجھے
کیوں طبیعت بجھی بجھی سی ہے

صفدر آہ

میر انیس کی شاگردی اور وراثت

انیس کے جشن صد سالہ کے موقع پر پاکستان میں ڈاکٹر مقام حسین جعفری نے شاگردان انیس پر ایک گراں قدر کام کیا ہے جس کا اجمالی تعارف میں نے جون ۱۹۷۵ء کے "کتاب نما" میں پیش کیا تھا۔ میرے اس تعارف کے متعلق مرزا جعفر حسین کا ایک مراسلہ اگست ۱۹۷۵ء کے "کتاب نما" میں نکلا ہے۔

آج تک تمام استادان شاعری اور استادان مرثیہ گوئی کا فیض عام رہا ہے۔ ان بزرگوں نے کبھی اپنے فن کو خاندان یا اولاد کے لیے مختص نہیں کیا۔ بیشتر یہی ہوا ہے کہ ان اساتذۂ کرام سے خاندان اور اولاد سے زیادہ استفادہ ان کے شاگردوں نے کیا ہے، لیکن مراسلہ نگار مرزا جعفر حسین نے انیس کے انتقال کے ایک سو ایک سال بعد آج کے لکھنؤ میں ایسی "جلیل القدر" ہستیوں کا پتا لگایا ہے جو سو سال قبل اور ڈیڑھ سو سال کے اندر ہونے والے واقعات کی شہادت دے سکتی ہیں۔ ایسے جلیل القدروں کے بیے دروغ بات سے علاوہ اور کوئی دوسرا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا صاحب کے ارشاد کے مطابق یہ معزز و جلیل القدر بتاتے ہیں کہ میر انیس نے ساری دنیا کی استادی کے خلاف اپنے خاندان اور اولاد کے علاوہ کسی کو اپنا شاگرد نہیں کیا۔ مرزا صاحب کو کیا معلوم کہ انہوں نے ایسی کوتاہ اندیشی سے انیس کی سربہ فلک شخصیت کو ایک خاندان پرست ہاشیہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر جعفری نے مستند تذکروں کے حوالوں سے انیس کے ۶۲ قابل شاگردوں کی نشان دہی کی ہے، جن میں فارغ نمایاں ترین ہے۔ ایک صدی کے ان لکھے پڑھے حقائق کے سامنے بھلا مرزا جعفر حسین یا ان کے جلیل القدروں کی کون سنے گا۔ واضح رہے یہ ۶۲ شاگرد ان درجنوں شاگردوں کے علاوہ ہیں جو انیس سے صرف خانگی سیکھتے تھے۔

فارغ اور انیس کی شاگردی

(۱) فارغ ان کا تاریخی تخلص جس سے ۱۲۸۱ھ کا استخراج ہوتا ہے۔ یہی وہ سال ہے جب فارغ انیس کے شاگرد ہوئے تھے۔

(۲) برسوں استاد کی خدمت کر کے پہلے فارغ نے خانگی اور رموز مرثیہ گوئی انیس سے سیکھے۔ اس کے بعد جب خود استاد نے مرثیہ کہنے کا حکم دیا تو فارغ نے پہلا مرثیہ کہا، جس کا مطلع ہے:

میں بلبل حدیقۂ تعلیم انیس ہوں

(۳) تقریباً سوا بند یعنی (۱۱) بند کے اس مرثیے پر انیس نے بڑی شفقت اور مسرت سے

خود فارغ کے رنگ میں اصلاح دی اور شاگرد کی بے پناہ ذہانت کو دیکھ کر دہ رموز تعلیم فرمائے جن سے فارغ کی رزم نگاری کی صلاحیتیں نکھر کر اوج ثریا سے باتیں کرنے لگیں۔

(۳) فارغ نے ادب مرثیا کے سب سے بڑے مرثیے کہے ہیں۔ ان کے مرثیے اتنے اتنے بڑے ہیں جو نفیس کے تقریباً آٹھ مرثیوں کے برابر ہیں۔ نفیس کی پوری مطبوعہ جلد سے فارغ کا صرف ایک مرثیہ تقریباً ڈیوڑھا ہے۔

(۴) فارغ کے انتقال کے بعد حال فارغ کے نام سے ۱۹۱۰ء/۱۳۲۸ھ میں حکیم نہال حسین کی لکھی ہوئی فارغ کی سوانح عمری بڑے دیدہ زیب انداز میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں فارغ پر انیس کے کرم خصوصی اور انیس کی شاگردی کا ذکر اور تفصیل موجود ہے۔

(۵) بڑی سائز کے تقریباً ایک ہزار صفحات پر فارغ کے مراثی کی جلد "کوکبۂ فارغ" کے تاریخی نام سے ۱۹۱۶ء/۱۳۳۴ھ میں بڑے اہتمام سے شائع ہوئی اور صرف دو سال میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔ ان مراثی میں بھی جابجا انیس کی شاگردی کا ذکر ہے۔

(۶) فارغ کی شاعری اور شخصیت پر میری کتاب "فردوس ہند" ۱۹۵۶ء میں نکلی، جسے سرکاری اور غیر سرکاری انعامات بھی ملے، اور ایم۔ اے کے نصاب میں بھی شامل رہی۔

(۷) فارغ کا ادب اردو کا سب سے بڑا مرثیہ میرے مقدمے کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

(۸) ۱۹۲۰ء سے ۱۹۷۵ء تک ایک درجن سے زیادہ مختلف اہل قلم کے اور خود میرے مضمون فارغ پر شائع ہوئے۔ غالب انیس دبیر کے علاوہ فارغ پر ہر مرثیہ گو سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود بھی مرزا جعفر حسین کو میرے اور فارغ کے نام کی جستجو کرنا پڑی۔ ایسے صاحب مطالعہ اور واقف کار ناقد مرثیہ اب کہاں ملیں گے!

وراثت انیس

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہادی صاحب اور عباس صاحب جو مرثیہ گوئی تو درکنار شاعر اور ادیب بھی نہیں ہیں۔ انیس کی وراثت کا دعوا کرتے ہیں۔ میرے علم میں آج تک نہ تو ان دونوں حضرات کا کوئی مجموعۂ کلام شائع ہوا ہے، نہ ادبی رسائل ہی میں ان کا ذکر نظر سے گزرا۔ خاندان انیس کے افراد کا احترام تو کیا جا سکتا ہے، لیکن ان سب کو وارث انیس کسی طرح نہیں مانا جا سکتا۔

انیس کی وراثت کی سند یہ ہے کہ ۲۵ رجب کو وہ مجلس کون پڑھتا ہے، جسے انیس پڑھتے تھے۔ انیس کے بعد یہ مجلس ان کے فرزند اکبر میر نفیس نے پڑھی، پھر ان کے پوتے دولہا صاحب نے پڑھی۔ اس کے بعد ان کے پرپوتے لڈن صاحب پڑھتے رہے، یہ سارے حضرات مرثیہ گو تھے، اپنی اس خاندانی مجلس کے لیے ہر سال نئے مرثیے کہتے تھے۔

لڈن صاحب کے لاولد فوت ہونے کے بعد چونکہ خاندان انیس میں کوئی اہل باقی نہیں رہا اس لیے یہ مجلس خاندان عشق کے چشم و چراغ رشید کی طرف منتقل ہو گئی، اور اب ہر پچیس رجب کو وہی رونق افروز منبر ہوتے ہیں۔

مجھے ہادی صاحب یا عباس صاحب کا ذکر کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، لیکن انھوں نے فارد [illegible] صاحب کو ایسا لا یعنی اور لغو بیان دیا جس کے بعد ان کی غلط گوئی کی تردید میرے لیے ناگزیر ہو گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ دونوں حضرات عارف صاحب کے بھتیجے اور بابر صاحب کے چچا زاد بھائی ہیں جن سے مجھے شرف نیاز مندی حاصل تھا۔

خاندان انیس

خاندان انیس میں انیس کے بعد [illegible]

ان کے بیٹے میر وحید تھے، لیکن انیس اور دبیر والا انیس کی کشیدگی نے اس بے عدیل شاعر کو اس طرح شاکی کر کے اب جا کر (لکھنؤ سے نہیں) شایع جو چھپے سے ان کے مرثیے شایع ہوتے ہیں، لیکن یہ دور وہ ہے جب ادب مرثیا سے دلچسپی قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔

میر نفیس عالم تھے، استاد تھے، صاحب فن تھے، ماہر زبان تھے، انیس کے جانشین اور وارث تھے، لیکن ان کے مراثی میں شہرت، ان کے مرتبے سے کم تھی۔ لوگ کہتے ہیں۔ نفیس کی شہرت ان کی علمیت کے نیچے دب گئی۔ میں اس تنقید کو درست نہیں سمجھتا۔ نفیس ہی کے عہد میں پیارے صاحب رشید بھی بڑے ذی علم بزرگ تھے، لیکن ان کے مرثیوں کے لفظ لفظ میں قند و شیرینی گھلی ہوئی ہے۔ نفیس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ خاندان انیس کے وہ آخری مرثیا گو ہیں جس کے یہاں حدود مرثیا برقرار ہیں۔ ان کے بعد تو مرثیا صرف مسدس نگاری بن گیا جس میں شاعرانہ خوبیوں کے باوجود مرثیے کا معیار و اقتدار غائب ہیں۔

دولہا صاحب نے بے شک رنگ انیس سے الگ مرزا دبیر کا ایک ایسا رنگ پیدا کیا جس میں پیچ در پیچ نگاری کی جگہ چشم و ابرو کا تکلف کام کرتا تھا، لیکن وہ اپنے رنگ کے خود ہی موجد اور خود ہی خاتم تھے۔

عہد حال میں مسدس نگاری کے ساتھ خاندانی کمال صرف راجا صاحب محمود آباد میں نظر آیا، لیکن ستم گر موت نے انھیں ہم سے چھین لیا۔

فارغ کی رزم نگاری

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انیس کے بعد ہندستان میں رزم نگار آج تک پیدا نہیں ہوا۔ فردوسی کا [illegible] ہندستان میں سمٹا ہوا فارغ کو ملا۔ [illegible] کلام فارغ کی

چند جھلکیوں سے آپ کے سامنے ابھی واضح ہو جائے گی۔

فردوسی نے رستم کی بلند قامتی کے لیے کہا ہے ؎

از آن کس کہ بر پائے پیشش براست
نشستہ بہ یک سر از و برتر است

(سامنے کھڑے ہوئے آدمی سے بیٹھے ہوئے بھی اس کا سر نکلتا ہوا ہے)

اب فارغ کے ایک دیو قامت پہلوان کو دیکھیے جو علی اکبر سے مقابلے کے لیے آ رہا ہے ؎

سب سے آگے ہے نئی شکل کا اک دیو مہیب
کوہ تن رخش کی سی صورت دہشت ہے عجیب
تند و پر شور شرارت میں شیاطین کا ادیب
موت بھی آئے تو ڈرتی ہوئی سرکش کے قریب
مڑ کے تکتا ہے تو سب فوج لعین دبتی ہے
تن کا سنگ ہے کہ سائے سے زمیں دبتی ہے

طول قامت کو نہ دیکھے رہے تاب شکیب
پاؤں تک جا میں زمین پر جو نہ روکے ہو رکیب
وہ فرس اور وہ تن ظالم و پر مکر و فریب
قد بڑھائے ہوئے بیٹھا ہے شجر پر آسیب
لاکھ اڑے گرد قدم خاک نہ سر تک پہنچے
اٹھ کے پہنچے جو بگولا تو کمر تک پہنچے

مڑ کے اس دیو نے دیکھا جو ادھر اور ادھر
بھاگے وحشت میں درختوں کے پرندے اڑ کر
بن گیا دشت بلا خوف و دہشت کا گھر
دور تک گرد چلی آگ سی تھی ناری کی نظر
اس غضنفر کی طرف رخش کو پھیرا، دوڑا
دھوپ پر ٹہنہ کی سیاہی سے اندھیرا دوڑا

ایسا ڈراونا پہلوان سارے رزمیا ادب میں بمشکل ہی مل سکے گا۔ فارغ گھوڑے کی تیز روی کے لیے کہتے ہیں ؎

پھیرے گر تو عدو خاک سنبھلنے پائے
وقت جوہر اک وہ نہ کلمے سے نکلنے پائے

مضمون انتہا کو پہنچ گیا ہے، اس پر بیت لکھ کر فارغ نے قوت تخلیق کا اعجاز دکھایا ہے ؎

اس جگہ عالم تصویر کا ہنگام رہے
صبح ہو صبح رہے شام جو ہو شام رہے

گھوڑے کی تیز روی کا مضمون شاید اس سے آگے کہیں نہیں نظر آئے گا - امام حسین کی تلوار کھینچی ہے تلوار کھینچنے میں نیام سے جو زرا سے کی آواز آئی اس کی ترجمانی دیکھیے ؎

کھینے پہ ہاتھ ڈالا جو شاہ امام نے
کھینچی ہے الحذر کی صدا کہ نیام نے

خانہ نگی میں خطا کشیدہ الحذر کی رٹ کر کانی کھینچ کر پڑھیے - آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ تلوار نہیں قیامت جھنکارتی ہوئی نیام سے نکل آئی ہے -

دشمن کی زخمی فوج ؎
چراۓ بہتے زخموں سے شرارۓ خون کے

خلاق مضامین کے ساتھ فردوسی کا یہ لب ولہجہ اور جھبہ فارغ کے علاوہ ہندستانی میں کہیں نہیں مل سکتا اس مضمون میں تفصیلات کی گنجائش نہیں، مرثیے کے فن اور فارغ کو سمجھنے کے لیے میری کتاب "فردوسی ہند" پڑھیے -

مرزا جعفر حسین صاحب یہ بھی سن لیں کہ میں ایک آزاد نقاد ہوں بزرگوں کا نقارچی نہیں - فارغ کے لیے میں نے اظہار حقیقت کی ہے - اوپر کی سطور سے جس کی پوری تائید ہو سکتی ہے -

میں ایک معروف، بیمار اور بوڑھا آدمی ہوں، مجھے افسوس ہے کہ مرزا جعفر حسین کی خدمت کرنے کا وقت اب مجھے نہ مل سکے گا -

محبوب راہی

برسات کا موسم

گھم گھم گرج رہے ہیں بادل
پانی برس رہا ہے چھل چھل
کوکو کوک رہی ہے کوئل
مہک رہا ہے سارا جنگل

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم
یہ رت ہے کس قدر سہانی
سبھی رتوں کی جیسے رانی
پودوں کو مل رہا ہے پانی
کھیتوں پر آئی ہے جوانی

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم
پودے، پیڑ، حیوان اور انسان
سب ہیں شاداں، سب ہیں فرحاں
کوئی نہیں ہے آج ہراساں
کوئی نہیں ہے آج پریشاں

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم
دیکھ کے بادل کالے کالے
خوش ہیں کھیتی باڑی والے
خوش ہیں سارے لڑکے بالے
خوش ہیں گنگا جمن ہمالے

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم
ہوائیں بھی چل رہی ہیں جھکڑ
دروازے کرتے ہیں کھڑ کھڑ
بوندیں جو پڑتی ہیں سڑ سڑ
شور ہے گڑ گڑ، پڑ پڑ تڑ تڑ

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم
جب سے پروائی چل رہی ہے
خوب طبیعت مچل رہی ہے
دھرتی صورت بدل رہی ہے
مٹی سونا اگل رہی ہے

آیا ہے برسات کا موسم
چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم چھم

رلیا رام شرما

ہندستان کی جنگ آزادی اور اکبر الہ آبادی

اکبر کے دل میں جذبۂ حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کے تحت انہوں نے ہندستان کو مغرب پرستی سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ وہ فرنگی دبدبہ اور فرنگی شاطرانہ چالوں میں ہندستان کو جکڑا دیکھ کر درد سے چیخ اٹھتے تھے۔ وہ پکار پکار کر کہتے تھے۔ کہ آپس کا نفاق بند کرو۔ اور ہندو مسلم اتحاد قایم کرو۔ ورنہ ہندستان ہمیشہ غار میں جا گرے گا۔

اکبر کا جذبۂ آزادی اتنا شدید تھا کہ انگریز سرکار کی ملازمت میں رہ کر ان کی مخالفت کرتے۔ ان کی چالوں کے خلاف آواز بلند کرتے اور ان کی پول کھول دیتے تھے، اور اپنے برادرانِ وطن کو مستقبل کے خطرے سے آگاہ کرتے تھے۔

لطف یہ کہ ہر بات اسٹیج پر کھڑے ہو کر کہتے تھے، اور دشمن اسے چٹکلا سمجھ کر ہنستے تھے گویا شکر میں لپیٹ کر تلخ دوا پلاتے تھے، چونکہ سرکاری ملازمت میں تھے۔ اس لیے انگریزی کو دوسرے لوگوں سے کچھ زیادہ سمجھتے تھے، لیکن وہ ہمت کبھی ان کی ہاں میں ہاں نہ ملاتے تھے۔ جہاں کہیں خطرناک بات تجربے میں آتی بغیر کہے رک نہ سکے۔ خود کہتے ہیں ؎

شاگردوں نے تو خدا نے کر دیا
اکبر نہیں ہے مدرسی کے ہاتھ میں

[illegible] کی دلی آرزو تھی کہ کسی نہ کسی طرح ملک آزاد ہو جائے۔ لوگوں میں جذبۂ حب الوطنی پیدا ہو، اور انگریز کے پنجے سے ہندستان آزاد ہو جائے۔ اسی لیے جب ملک میں سیاسی تحریک نے زور پکڑا۔ گاندھی جی اور ان کے رفقا نے پیشقدمی کی تو اکبر کو بڑی مسرت ہوئی۔ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

ایشیا نے تو کمر تو باندھی ہے
کوئی شوکت ہے کوئی گاندھی ہے

یہ چند گرد مضطر ہے اک جوش تو ہے اس کے اندر
اک رقص تو ہے اک وجد تو ہے بے چینی ہی برباد سہی

دہقاں تیری دانست میں یہ کام ہے پن میں
دہنیا مجھے گا قوت سنجر ملک کے بن میں
تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں

ساتھ ہی وہ انگریز کو چیلنج بھی کرتے ہیں ؎

آپ نے طاقت کی تو جولانیاں دیکھیں بہت
ضعف کے ہیجان کا بھی اب تماشا دیکھیے

یہاں تک کہ وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار کرکے گاندھی جی اور اس تحریک میں حصہ لینے والے دوسرے لوگوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ کاش! وہ خود بھی اس جنگ آزادی میں شرکت کر سکتے ؎

نہ خوار گورنمنٹ ہوتا اگر نہ اکبر
اس کو بھی آپ پاتے [illegible] میں

نہ صرف یہ بلکہ ان کو اپنی ضعیفی اور کمزوری کا خیال ہے، ورنہ وہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں ؎

مل نہ سکتی ممبری تو جیل ہی کو جھیلتے
ناتواں ہیں ورنہ کوئی کھیل ہم بھی کھیلتے

اب ان کی نظر ہم وطنوں کی پست ہمتی۔ آپس کی نا چاقی اور خود غرضی پر بھی پڑتی ہے، اور وہ کس قدر صحیح تصور کھینچتے ہیں ؎

کمر باندھی بھی یاروں نے جو راہ حب قومی میں
وہ لوے تو نہیں چلتا وہ لوے تو نہیں رکتا
ہمارے ملک میں یہ دور اقبال فرنگی ہے
کوتن کو اپریشن میں بھی باہم خانہ جنگی ہے

ہمارے لیڈروں کی خود غرضیاں اور بدنیتی بھی ان کی نظروں سے مخفی نہیں۔ فرمایا ہے۔ "ہمارے لیڈر حکومت سے بیزاری اور قوم سے ہمدردی کا اعلان کرتے ہیں، لیکن ان کے دل کو ٹٹولتا ہوں تو وہی یورپ زدہ پاتا ہوں۔ کام میں خلوص نیت اور پاس مذہب بہت کم ہے۔ ان لوگوں کو نہ خدا یاد ہے اور نہ اپنی خبر" ؎

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی سے
محل میں لیٹ کر اب عشق قومی میں تڑپتے ہیں

اکبر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ تقریریں، یہ جلسے کانفرنس سب بیکار ہیں۔ مردانگی دکھاؤ اور آزادی حاصل کرو ؎

ہیں وفد اور اپیلیں فریاد اور دلیلیں
اور کج مزاجی کے ارماں نکل رہے ہیں
زور بازو نہیں تو کیا اسپیچ
ہاتھ بھی دے ذرا زباں کے ساتھ
یہ لطیفہ ہے تیغ کا یا ہے سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے سب عنکبوت کا

آزادی حاصل کرنے کے لیے اس سے زیادہ موثر تعلیم عمل اور کیا ہو سکتی ہے اور یہ باتیں اس شخص کی ہیں جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہے۔

جب اس سے بھی لوگوں کی سرد بازاری دور ہوتی نہیں دیکھتے تو مختلف طریقے سے قومی اور [illegible] جتاتے ہیں اور غیروں کے جبرا

ذکر کر کے دلوں میں گرمی پیدا کرنا چاہتے ہیں ؎

سوچو آگے چل کر قسمت میں کیا لکھا ہے
دیکھو گھروں میں کیا تھا اور آج کیا رہا ہے

اس محتاجی کی بھی کوئی حد ہے۔ ؎

پاٹک کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ
اب بھاگنا ضرور ہوا عذر کیا کریں
کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ
آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کب تک
موقع بحث نہیں صاحب اقبال ہیں آپ
میری ہر بات بری آپ کی ہر بات اچھی

اپنی قوم کی پستی اور گراوٹ کو کس ڈھنگ سے اجاگر کرتے ہیں ؎

معاذ اللہ کیا مجبوری تقدیر بسمل ہے
تڑپنا سامنے قاتل کے گستاخی میں شامل ہے

قوم کی بے حالی کا رونا رونے کے بعد اب انگریزوں کی جابرانہ پالیسی اور ان کی سیاسی چالوں کا ذکر کس دیدہ دلیری کے ساتھ کرتے ہیں ؎

اغیار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف
اور ہم ہیں کہ پاتے نہیں اس بت کی کمر بھی
یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر
تم کیا ہو خدا کے بھی تین ٹکڑے کر دیں
جج بنا کر اچھے اچھوں کا یہ مزہ لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں
آپ اکبر لاکھ مشق خوش کلامی کیجئے
کتنا ہی اظہار اعزاز دعا ہی کیجئے
دوستی کی آپ سے فرصت نہیں اس شوخ کو
یا کھسکئے سامنے سے یا غلامی کیجئے
بوز نے کو رقص پر کس بات کا ہیں داددان
ہاں یہ جانتر ہے مداری کو مبارک ہو دوراں

اب ان کی نظر ایک نہایت اہم پہلو پر پڑتی ہے یعنی طریقۂ تعلیم ؎

قوم ان کے ہاتھ میں
تعلیم ان کے ہاتھ میں

موجودہ طریقۂ تعلیم میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ اس نے ہم کو نکما، بزدل اور پست ذہنیت بنا دیا اس تعلیم کو حاصل کرتے ہمیں ایک صدی ہو گئی ہے، لیکن اپنے اکبر اب تک ایک سرائی بنا ہوا نہیں آہ - آئی زخشاں اور ضمیر فروشی سے

خدا پسند بنائے گا کیا وہ لٹریچر
کرے جو طبع کو بے قید اور گناہ پسند

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

طفلِ دل کو طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

مذہب چھوڑو، ملت چھوڑو، صورت بدلو، عمر گنواؤ
صرف کلرکی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

اب تعلیم کا اثر لڑکیوں پر ملاحظہ فرمایئے

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں ہیں ان کی میری اماں کا بچے کر رہی ہیں

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر
شوہر پرست بیوی پبلک پسند لیڈی

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

نور سمجھے سے کی آنکھ تری خواتین کی شرم
ساز مغرب سے خراب ہو گئی کالج کی دھن

اور وہ یہ تعلیمی ماحول دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں کہ

پراگندہ بہت ہے دل میرا دنیا کے دھندوں سے
چھڑا دے مجھ کو یارب زر کی کے سخت پھندوں سے
غلامانہ طریقوں پر مجھے مجبور کرتے ہیں
خدایا بے نیازی دے مجھے ان خود پسندوں سے

آخر میں وہ اس لعنت سے چھٹکارا پانے کے لیے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے سب سے بڑی ترکیب یعنی ہندو مسلم اتحاد کا سبق دیتے ہیں کہ

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں
طاقت حاکموں سے ہے ترقی گورنمنٹ کی

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

خواہش ہے اگر تمہیں غنی بننے کی
دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر بندے
کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

ہندو مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن و ہم زبان و ہم قسمت
کیوں نہ کہہ دوں کہ بھائی بھائی ہیں

غرض کہ اکبر الہ آبادی کا نام بلا پس و پیش آزادی کے علمبرداروں میں آتا ہے۔ بھلے ہی وہ تحریک آزادی میں عملی طور پر شامل نہ ہوئے ہوں۔

شمیم نصرتی

غزل

جینے کے سامان ہوئے ہیں
نظروں کے نذرانے آئے ہیں

فرزانوں کو ناز بہت تھا
کام مگر دیوانے آئے ہیں

آج بھی ہیں وہ الجھے الجھے
زلفیں جو سلجھانے آئے ہیں

ایک تری چاہت کے بدلے
آنکھیں سب دکھلانے آئے

بات چلی جب دار و رسن کی
یاد بہت دیوانے آئے ہیں

اللہ اللہ عشق کے جلوے
جل مرنے پروانے آئے ہیں

لے کے شمیم اب چشمِ پُرنم
دل کا حال سنانے آئے

ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری پروفیسر فارسی، ٹی۔ان۔بی۔کالج

ہندستان کی فارسی شاعری میں مقامی عناصر

علامہ شبلی کا یہ اعتراض کہ "عرب کی شاعری سے ملک کا تمدن، معاشرت، خانگی حالات، رہنے سہنے کے طریقے، اسباب خانہ داری اور اس قسم کی دوسری باتیں اس تفصیل سے معلوم ہو سکتی ہیں کہ تاریخ یعنی ہسٹری سے بھی نہیں معلوم ہو سکتیں، لیکن فارسی شاعری میں یہ باتیں ناپید ہیں"۔ ہندستان کی فارسی شاعری کے سلسلے میں کچھ حد تک ضرور صحیح ہے، لیکن کلی طور پر اسے صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ ہندستان کے فارسی شعرا پر یہ الزام کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اس ملک کے تمدن، ماحول اور معاشرت کا ذکر نہیں کیا، بلکہ وہی گل و بلبل شیراز اور شیرین و فرہاد کے راگ الاپتے رہے یا لیلیٰ مجنوں کی داستان سرائی کرتے رہے۔ امیر خسرو اور فیضی کے کلام کی روشنی میں غلط ثابت ہوتا ہے۔ خود علامہ شبلی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ فارسی شاعری نے چھ سو برسوں کی طویل مدت میں ہندستان میں صرف دو اشخاص پیدا کیے جنہیں اہل زبان، یعنی ایران کو بھی چار و ناچار ماننا پڑا۔

ہندوی ادب و شاعری کے پرستار امیر خسرو کی شخصیت اور شاعری سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جن کی ذات میں بیک وقت بہت سارے علوم و فنون جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ہندستان کی اکثر علاقائی زبانوں میں [illegible] یہاں کے ماحول اور فضا کی تصویر کشی کی۔ یہاں کے مختلف پیشے کے لوگوں کی خصوصیتیں بیان کیں اور اس بات کا ثبوت دیا کہ شاعر چاہے فارسی زبان کا ہو یا کسی اور زبان کا ہو یا کسی اور زبان کا، وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے غافل و بے خبر نہیں رہ سکتا، بلکہ ماحول کی ایک ایک چیز پر اس کی گہری نظر رہتی ہے۔ وہ لوگوں کی زبان، گفتار اور طور طریقے جاننے اور سیکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور ان چیزوں کو اختیار کر کے خود اپنی زبان اور شاعری میں سمو دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امیر خسرو کی چند غزلیں جن کے اشعار اور مصرعوں میں فارسی اور ہندوی زبانوں کی بہترین آمیزش ملتی ہے۔ نہایت دلچسپ اور معنی خیز ہیں ؎

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

تعجب کی بات یہ ہے کہ امیر خسرو کے ایسے اشعار کو ملتے ہیں جن میں فارسی اور میتھلی زبان کی حسین رنگ آمیزی پائی جاتی ہے ؎

ہندو بچہ ای بین کہ عجب حسن دھرت ہے
بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرت ہے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ارے رام تُرک کاہے کرت ہے

سب لوگ جانتے ہیں کہ امیر خسرو فن موسیقی میں

نہ صرف استاد تھے، بلکہ بہت سے آلاتِ موسیقی کے موجد بھی تھے۔ ستار کے متعلق شبہہ ہے کہ یہ انہیں کی اختراعات میں سے ہے۔ فنِ موسیقی میں ان کی مہارت ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں، میں یہاں صرف ایک شعر نقل کردوں گا جس سے اندازا ہوگا کہ اس شاعر کو ساز سے صوتی ہم آہنگی کا کتنا پختہ شعور حاصل تھا ؎

دہلہ زر دہل زد بقسین او
کہ دین دین او دین او دین او

مصرعِ دوم کی پیہم تکرار طبل نقارے کی آواز کی ترجمانی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ خسرو کی مادری زبان دہلوی ہندوی تھی جو انہیں فارسی سے زیادہ عزیز تھی۔ اس زبان میں انہوں نے لاکھوں شعر، گیت، پہیلیاں وغیرہ کہی ہیں۔ ان میں بیشتر ضائع ہوچکی ہیں، لیکن اس کا جو حصا نمونتاً از خود باقی ہے وہ ہمارے ادب کا قابلِ فخر سرمایا اور ہمارے ملک کی بے بہا دولت ہے۔ خسرو سے ایسا ہمہ رنگ جینیس ہندستان آج تک نہیں پیدا کرسکا آج ہم جو زبان بولتے ہیں وہ خسرو ہی کی زبان ہے۔

مغلوں کا زمانا ہندستان میں فارسی شعر و ادب کا سنہرا زمانا تھا۔ یہ وہ زمانا تھا جبکہ شعرا ایران سے ہجرت کرکے ہندستان آتے تھے اور گوہرِ مقصود حاصل کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر نے اپنے دربار کو ایک ایسا گلدستا بنا رکھا تھا جس میں مختلف علوم و فنون کے پھول اچھا نظر آتے تھے۔ اس کے نورتنوں میں جہاں ایک ابوالفضل، فیضی اور عبدالرحیم خانخاناں جیسے باکمال لوگ تھے، وہیں دوسری طرف راجا مان سنگھ، ٹوڈرمل اور بیربل جیسے قابل و باصلاحیت لوگ بھی موجود تھے۔ اکبر نے اپنے دربار میں "ملک الشعرا" کا عہدا مقرر کر رکھا تھا۔ شیخ مبارک کے دونوں بیٹے ابوالفضل اور فیضی جو شروع میں اکبر کے عتاب سے بچنے کے لیے چھپتے پھرتے رہے، بعد میں دربارِ اکبری کے اہم ارکان مقرر ہوئے۔ فیضی نے اکبر کے اصرار پر سنہ ۱۰۰۳ھ میں "نل دمن" کا قصا منظوم کرنا شروع کیا، اور چار مہینوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا کر اکبر کے سامنے پیش کیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے فیضی سے بدظن رہنے کے باوجود لکھا ہے کہ تین سو برس سے ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی پھر لکھتا ہے "الحق مثنویست کہ درین صد سال بعد از امیر خسرو شاید کسی گفتہ باشد"۔ سنہ ۹۹۰ھ میں اکبر نے حکم دیا تھا کہ "مہابھارت" کا ترجما کیا جائے۔ بڑے بڑے گنوان پنڈت جمع ہوئے، اکبر خود نقیب خاں کو عبارت کا مطلب سمجھاتا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں ترجما کرتا تھا۔ پھر عبدالقادر بدایونی اور ملا شیری وغیرہ کو مہابھارت کے الگ الگ ٹکڑے سپرد ہوئے، چنانچہ اس کا ایک حصا فیضی کو بھی ترجما کرنے کے لیے ملا۔ یجروید کا ترجما بھی فیضی کی طرف منسوب ہے۔ بھاون نام کا ایک شخص جو دکن کا رہنے والا تھا، پڑھ کر مطلب سمجھاتا جاتا تھا، اور فیضی فارسی میں لکھتا جاتا تھا۔ "لیلاوتی" کا ترجما فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں کیا۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اس نے بہت سارے اشعار ملک کے مختلف خطوں کی تعریف اور وہاں کے حسن و زیبائش کے بارے میں لکھے۔ احمد آباد کی تعریف اور گجرات و دہلی کے لوگوں کے حسن و جمال کی توصیف مندرجہ ذیل اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

چو رشکِ گلشنِ فردوس احمد آباد است
از او بسیار برونم کشند چون آدم
بحسنِ مردمِ گجرات یاد نیست دلی
نمی روند جوانانِ دہلی از یادم

طالب آملی جو جہانگیر بادشاہ کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔ اس کے دل میں شروع سے ہندستان آنے کی خواہش

جب ماژندران سے ہندستان آیا تو ایک رباعی کہی ؎

طالب گل این چمن بہ بستان بگذار
بگذار کہ شوی پشیمان بگذار
ہندو نبرد تحفہ کسی جانب ہند
بخت سیہ خویش بایران بگذار

مطلب یہ کہ ہندستان میں کالی چیز کا تحفہ لے کر نہیں جاتے، اس لیے سیاہ قسمت کو یہیں چھوڑ کر چلنا چاہیے۔

طالب نے ہندستان سے جب قندھار کا سفر کیا تو یہ اشعار لکھے ؎

نگاران لاہور و خوبان دہلی
بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکی چہرہ سودی بچشم رکابم
یکی بوسہ دادی بزلف عنانم
فشاندی یکی در بغل یاسمینم
نہادی یکی در دہان برگ پانم

یعنی جب میں قندھار کے لیے روانا ہونے لگا تو میری محبت اور ہمدردی میں دہلی اور لاہور کے نوجوانوں کی عجیب کیفیت تھی کوئی میرے رکاب سے اپنا چہرا ملتا تھا تو کوئی میرے عنان کی زلفوں کو بوسا دیتا تھا۔ ایک میرے پہلو میں یاسمین چھڑکتا تھا تو دوسرا میرے منہ میں پان کا بیڑا ڈالتا تھا۔ آخری شعر میں "برگ پانم" کی ترکیب نہایت برجستا ہے۔ طالب آملی نے پان کا ذکر کر کے ہندستان کی مہمان نوازی کی رسم کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔ مہمانوں کو کھانے کے بعد اور رخصت کرتے وقت پان پیش کرنا ہمارے ملک کی قدیم رسم ہے۔

ابوطالب کلیم ہمدانی شاہ جہاں کے دربار کا ملک الشعرا تھا وہ جہانگیر کے دور حکومت میں ہندستان آیا اور ۱۰۲۸ھ میں وطن واپس گیا، مگر ہندستان کی محبت دل میں ایسی تھی کہ مسرت سے اختیار کھینچے جاتا تھا۔ اسی حالت میں [illegible] جس کے چند اشعار قابل ذکر ہیں ؎

ز شوق ہند زان سان چشم حسرت بر قفا دارم
کہ رو ہم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

یعنی ہندستان کے شوق میں میری آنکھیں اس طرح پیچھے کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ سامنے کے رخ پر نظر بھی ڈالتا ہوں تو سامنے کا آدمی نظر نہیں آتا، آگے کہتا ہے ؎

اسیر ہندم و زین رفتن بیجا پشیمانم
کجا خواہد رسیدن پر فشانی مرغ بسمل را

مطلب یہ کہ میں ہندستان کی محبت کا قیدی ہوں اور بے اس بے موقع سفر سے پشیماں ہو رہا ہوں پتا نہیں ہندستان کی محبت کا یہ بیقرار پنچھی کہاں پہنچا دیا جائے گا۔

علامہ شبلی کہتے ہیں کہ اس حالت کے ساتھ ابوطالب کلیم کا وطن میں کیا جی لگتا دو برس بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ پھر ہندستان واپس آ گیا، پھر جب شاہجہاں کے ساتھ کشمیر گیا تو وہاں کی رنگینی اور آب و ہوا کی دلآویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھکو یہیں رہنے کی اجازت دی جائے، یہاں بیٹھکر اطمینان سے فتوحات شاہی نظم کروں چنانچہ یہ درخواست منظور ہوئی، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کلیم ہندستان کا مداح اور دلدادہ تھا ایک قصیدے کی پوری تمہید ہندستان کی تعریف میں ہے جس کا یہ شعر درج کرنے کے قابل ہے ؎

توان بہشت دوم گفتنش باین معنی
کہ ہر کہ رفت ازین بوستان پشیمان شد

یعنی بیشک ہندستان دوسری جنت کا نام ہے کیونکہ جو بھی اس چمن سے باہر گیا بہت پچھتایا۔

کلیم نہایت حاضر جواب اور ذہین تھا قیصر روم نے شاہ جہاں کو خط لکھا کہ آپ صرف ہندستان کے بادشاہ ہیں "شاہ جہاں" لقب کیوں اختیار کیا؟ شاہ جہاں کو بھی خیال ہوا کہ یہ غلط بیانی ہے۔ اپنے وزیر یمین الدولہ سے کہا کہ کوئی اور لقب اختیار کرنا چاہیے

کیم کو خبر ہوئی اسی وقت قصیدا کہہ کر پیش کیا، جس میں لقب کی یہ دلیل دی ہے

"ہند" و "جہان" ز روی عدد ہر دو چونکہ یکست
شہ را خطاب شاہجہان ہم برس ہست

مطلب یہ کہ "ہند" اور "جہان" دونوں لفظ کے عدد ایک ہیں (۵۹) اس لیے "شاہجہان" اور "شاہ ہند" دونوں کہہ سکتے ہیں۔

ہندستان کے بہت سے پیشوں، پھلوں اور پھولوں کے نام اس نے اپنی شاعری میں لکھ دیے ہیں جن کا نام بھی زبان قلم پر لانا قابل اعتراض تھا مثلاً ہے

منہ بر د عدہ تنبولیان دل
کہ جز خون خوردن از وی نیست حاصل
ز حسن شستہ دھوبی چہ گویم
ازان بی پردہ مجبوری چہ گویم
غرور حسن با جہل چھپانی
چو گردد جمع نتوان زندگانی
گل گڑھل نہ تنہا بید ست موسم
شگفتہ چون رخ یارانست دایم
نہال خیش از بس خوش نسیم است
دل طوبی ز رشک آن دو نیم است

درویش حسین والا ہروی تیس برس کی عمر میں ہرات سے ہندستان آیا، اور اپنی پوری زندگی ہندستان کے مختلف حصوں میں گذارنے کے بعد بنگال میں پیوست خاک ہوا۔ اس ملک کی تعریف میں اس نے بہت سارے اشعار لکھے۔ یہاں کی مختلف جگہوں کی آب و ہوا دریاؤں کی کثرت اور پہاڑی رستوں کے نشیب و فراز کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آسام کے متعلق کہتا ہے

عالمی دیگر و خلق دگر و رسمی دگر
نہ زمینش چو زمین و نہ سما ہمچو سما
آسمان بی سبب ابر فرستد باران
وز زمین بی مدد خاک شود سبزگیا
پستی راہ و بلندیش نمارہ مشکل
در تعاریف بہ از مرتبۂ شاہ و گدا
بجز آبی عدہ اندازہ چو فکر دانا

یعنی آسام کی سرزمین عجیب، یہاں کے لوگ عجیب اور لوگوں کے طور طریقے جدا گانہ ہیں۔ نہ تو یہاں کی زمین عام زمین کی طرح ہے اور نہ ہی آسمان عام آسمان کی طرح ہے۔ فضا کا عالم یہ ہے کہ بغیر ابر کے یہاں پانی برستا ہے اور زمین و پتھر یلی بغیر خاک کے سبزہ اگاتی ہے۔ یہاں کے رستوں کے نشیب و فراز کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی جو فرق ایک بادشاہ اور فقیر میں ہوا کرتا ہے وہی فرق یہاں کے رستوں کی اونچائی میں ہے۔ یہاں کے دریا فلسفیوں کے افکار و خیالات کی طرح بے انتہا اور وسیع ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اڑیسا اور بنگال کے مچھروں نے ہمارے شاعر کو بہت تنگ کیا تھا اڑیسے کے مچھروں کا ذکر اس طرح کرتا ہے

در راہ اڑیسہ از غم کرشیا
وز راحت و عافیت فراموشیہا
سرگوشی یک پشہ بمزدور چہ کرد
سکین من و پشہ ہا و سرگوشیہا

مطلب یہ کہ اڑیسا کے رستے میں رنج و تکلیف کا کیا بیان کیا جائے، تمام عیش و آرام بھول گئے، ایک مچھر کی سرگوشی نے مزدور کا کیا حال کر دیا یعنی اس کا کام ہی تمام کر دیا اس راہ میں بھی بیچارا میں تھا، مچھر تھے اور ان کی سرگوشیاں تھیں، خدا نہ کرے کہیں میرا حال بھی مزدور جیسا ہو بنگال کے مچھروں کے بارے میں کہتا ہے

بنگال و پشۂ چپیل انگن او
دارند دم عقرب کا شغل بدہان

بنارس کی سرزمین اور وہاں کے حسن کی تعریف ذیل کے شعر میں اس طرح کرتا ہے

چون صفوۂ آئینہ نما ہمہ جا ری
عکس نگری از فرق سرش تا کف پائی

اوپر کے شاعروں کی طرح قدوم [illegible] ہاری نے بھی اپنے کلام میں [illegible]

توصیف کی ہے - سید قاسم حاجی پوری دسویں صدی ہجری میں صوبۂ بہار کے حاجی پور (موجودہ ضلع ویشالی) کے علاقے میں گذرے ہیں - ان کا زمانہ ہمایوں اور اکبر بادشاہ کا زمانہ تھا - انہوں نے ایک پوری غزل میں اس ملک کے حسینوں کی تعریف اور ان کے ناز و غمزے کا ذکر کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ جو دل ان حسینوں کی زلف میں گرفتار ہو گیا وہ جلوۂ حق کا مظہر بن گیا - یہ مہ جبینیاں سر سے پاؤں تک دعوتِ نظارہ ہیں، اور مشہد اور بغداد کے حسینوں کی طرح جاذب نظر اور دلکش ہیں - اپنے استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرکے یہ دن رات حسن و ناز کا سبق پڑھتے ہیں اور اپنے ناز و انداز سے اہل خرد کے دل و جان لے بیٹھے ہیں - لوگ ان کی دلربائی میں پڑکر اپنی ساری زندگی تباہ کر ڈالتے ہیں - اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بین نگاران ہند حسن معاد
ہمچو خوبان مشہد و بغداد
علم خوبی و ناز می خوانند
شاہدان ہوشان بہ پیش استاد
جان اہل خرد بغمزہ برند
این چنین شیوہ کردہ اند نفاد
بہر شان عمر خلق صرف کنند
گشت این باب سطر دل بنیاد
ہست امید وار جلوۂ حق
دل کہ در زلف شان گرفت ملاد

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

جادوی ہندیست ملک روم تماشا گرفت
آن سیہ خال کہ بر رخسار گلگون بستہ اند

ملک روم کا جادوئی حسن دنیا بھر میں مشہور ہے - قاسم کہتے ہیں کہ اب تک حسن کی یہ شہرت صرف ملک روم کے لیے مخصوص تھی، مگر جب سے ہم نے حسینانِ ہند کے پھول جیسے رخسار پر سیاہ تل کا حسین منظر دیکھا ہے تب سے حسنِ ہندستان اس عالم میں بڑا اونچا آگیا ہے

لکھتے ہیں ؎

چون نگارم کشور ہندی کند خوی ظہور
رو نق خوبان ملک روم و کابل بشکند

یعنی جب ہندستان کے پری چہرہ لوگ اپنے حسن کا جلوہ دکھانے پر آمادہ ہوجاتے ہیں تو روم اور کابل کے حسینوں کے رنگ ماند پڑجاتے ہیں۔

فیضی، طالب آملی اور ابو طالب کلیم کی طرح سید قاسم حاجی پوری کہیں باہر سے ہجرت کرکے یہاں نہیں بسے تھے، بلکہ ان کے آبا و اجداد پشتہا پشت سے اس ملک میں رہتے چلے آتے تھے یہی وجہ ہے کہ جو خلوص اور زور بیان ہندستان کی چیزوں کی تعریف اور توصیف میں ان کے یہاں موجود ہے وہ اور دوسرے شعرا کو میسر نہیں - اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ شبلی کا یہ الزام کہ فارسی شاعری میں ہندستانی ماحول کی باتیں نہیں ملتیں، جزوی طور پر صحیح ہو تو ہو، مگر کلی طور پر درست نہیں -

ہندوستاں ہمارا

[illegible]

تاروں کی انجمن ہے ہندوستاں ہمارا
صد ناز سش چمن ہے ہندوستاں ہمارا
روشن رہِ طلب کا ہے ایک ایک ذرہ
مہتاب کی کرن ہے ہندوستاں ہمارا
ہیں جان و دل سے قربان کشمیر کی بہاریں
نسرین و یاسمن ہے ہندوستاں ہمارا
دامانِ گل پہ شبنم موتی بکھیرتی ہے
جیسے درِ عدن ہے ہندوستاں ہمارا
ہر رنگ میں نمایاں ہے اس کا حسن کامل
پھولوں کا پیرہن ہے ہندوستاں ہمارا
تہذیب کی ہیں سے پھوٹیں جہاں میں کرنیں
خوش خو ہے خوش چلن ہے ہندوستاں ہمارا
نعرے فضا میں اٹھے ہم کہہ اٹھے پکاریں
جب اے فدا وطن ہے ہندوستاں ہمارا

غلام ربانی

عظیم انسان

دنیا میں بہت سی خوفناک چیزیں ہیں۔ ایک ہے ایک ڈراؤنی اور ایک سے ایک خطرناک، مگر ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی چیز سے نہیں ڈرتے، موقع پڑے تو شیر سے بھی بھڑ جاتے ہیں۔ لڑائی کے میدان میں جہاں گولیوں کا مینہ برس رہا ہو یا گولے پھٹ رہے ہوں، وہاں بھی چلے جاتے ہیں غرض کیسی ہی خطرناک چیز ہو اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں، مگر یہ بہادر ایک چیز سے ڈر جاتے ہیں، اور وہ ہے استقلال! بڑے سے بڑا سورما اکثر اوقات استقلال کے سامنے ہمت ہار جاتا ہے۔

جو حضرات دنیا میں کوئی بڑا کام کرتے ہیں یا قومی خدمت انجام دے کر نام پیدا کرتے ہیں تو ہم ان کی شہرت اور ناموری کو دیکھنے لگتے ہیں مگر یہ نہیں دیکھتے کہ ان بزرگوں نے اس کامیابی کو کتنی بڑی قیمت میں خریدا ہے۔ انہوں نے دن دن بھر محنت کی ہے۔ راتوں کی نیند میں حرام کی ہیں۔ کیسی کیسی مشکلات ہوں گی جن پر قابو پایا ہے۔ کتنی مخالفتوں کو دبایا ہوگا۔ رستے کے کتنے روڑوں کو ہٹانا پڑا ہوگا۔ بعض وقت تو ایسی حائل ہوئی ہوگی جس کو سر کرنے میں نہ معلوم کیا کیا جتن کرنے پڑے ہوں گے۔ غرض کہ ایک ... نقصان کے بعد وہ اس مقام پر پہنچے

ہیں، جہاں ان کو دیکھ کر لوگ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ زندگی جدوجہد کا نام ہے یا یوں کہیے کہ جدوجہد ہی زندگی ہے۔ یہی جدوجہد اور استقلال ہے جس نے ایک مقدس ہستی کو "بابائے اردو" بنا دیا۔ نوعیت کے لحاظ سے یہ خطاب جتنا حسین ہے اتنا ہی موزوں بھی ہے۔ اس میں ایک عمر کی محنت جھلک رہی ہے۔

انجمن کو پالنے میں بابائے اردو نے جو مشقت کی ہے اس کو کچھ انہی کا جی جانتا ہے۔ بچوں کی پرورش دودھ سے ہوتی ہے۔ آپ نے انجمن کو اپنا خون پلایا ہے۔ تن من سے کام کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں مگر جب دھن کا سوال آتا ہے تو سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ آپ نے جان کے ساتھ مال کی بازی بھی لگا دی۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے انجمن ترقی اردو کو دس لاکھ روپیہ دیا ہے تو قارئین کرام کو تعجب ہوگا اور خود جناب مولوی صاحب کو بھی حیرت ہوگی کہ اتنی بڑی رقم وہ کس طرح سے دے سکتے تھے؛ مگر راقم الحروف وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ آپ نے دس لاکھ سے زیادہ انجمن کو دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام نے ریاست حیدرآباد میں تعلیم کا شوق پیدا کر دیا تھا جس سے مدارس

کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہونے لگا
اس زمانے میں محکمہ تعلیمات نے آپ سے فرمائش
کی کہ میٹرک تک کی جماعتوں کے لیے اردو
ریڈریں تیار کریں۔ اس وقت تک انجمن
کی ساکھ نہیں بندھی تھی۔ اس لیے محکمے نے
یہ معاملا آپ کی ذات سے کیا، انجمن سے
اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ آپ نے بڑی محنت
اور مشقت سے دس جماعتوں کے لیے درسیا
عثمانیا کے نام سے ریڈریں تیار کیں جو ریاست
حیدر اباد کے تمام ابتدائی وسطانیا اور
فوقانیا مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان
ریڈروں کے علاوا آپ کی قواعد اردو بھی
میٹرک کے نصاب میں شامل تھی۔ یہ کیا را
کتابیں بیس پچیس برس، اس وسیع ریاست
کے تمام مدرسوں میں رائج رہیں جن کی فروخت
کی آمدنی دس لاکھ سے زیادا تھی۔ یہ سالانا
آمدنی انجمن کے حساب میں جمع ہوتی رہی۔ آپ
نے اس میں سے کبھی ایک پیسا نہیں لیا۔ سچ
پوچھیے تو ان مطبوعات کی فروخت میں وہ
کیمیا تھی جس سے انجمن کا خزانا ہر سال بڑھتا
چلا گیا اور وہ چندوں یا عطیوں سے بے نیاز
ہو گئی۔

سفر کتنا ہی آرام دہ ہو مگر پھر سفر ہے۔
ملک کو انجمن سے روشناس کرانے اور اردو
کا شوق دلانے کے لیے آپ نے دورے شروع
کیے۔ ہندستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔
ایک برِّ صغیر ہے۔ اس وسیع ملک کا کوئی
بڑا شہر ایسا نہیں رہا جہاں آپ نے اردو
کا ڈنکا نہ بجایا ہو۔ ملک کے کونے کونے
میں اتنے پھرے کہ زمین کا گز بن گئے۔
انجمن کی سالانا رپورٹوں میں ان دوروں کی تفصیل
موجود ہے۔ ہم نے ایک دفعا صرف (۲۵)
سال کی رپورٹوں سے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ
آپ کے سفر کی لمبائی تین لاکھ میل کے لگ
[illegible] آپ کا ملازم سفر و حضر ہمیشا

آپ کے ساتھ رہتا تھا۔ آپ فرسٹ کلاس یا سکنڈ
کلاس میں سفر کرتے تھے۔ اب اگر تین لاکھ میل کے
ایک سکنڈ کلاس اور ایک تھرڈ کلاس کے کرایے
کا حساب لگایا جائے تو یہ اخراجات بھی کچھ کم نہیں،
مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندستان کی ریلیں کمپنیوں
کی نہیں، بلکے انجمن کی ملک تھیں اور آپ جہاں
چاہتے بے تکلف ان میں بیٹھ کر چلے جاتے تھے۔
شاید یہ بات بہت کم حضرات کو معلوم ہے کہ آپ
نے سفر کے اخراجات کی ایک پائی کبھی انجمن سے
نہیں لی۔

اورنگ اباد کو آپ کی ذات سے خاص
نسبت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انجمن نے
ہوش سنبھالا اور مدتوں آپ کی سرگرمیوں کا
مرکز بنا رہا۔ یہ شہر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے
ایک خوبصورت ندی فصیل کے ساتھ ساتھ بل
کھاتی ہوئی نکل گئی ہے۔ یہاں باغوں کی کثرت
ہے۔ گھر گھر حوض، فوارے اور چمن ہیں جن
میں اردگرد کی پہاڑیوں سے کاریز کے ذریعہ
پانی آتا ہے۔ زمین دوز نہروں کا یہ انتظام
ملک عنبر کا ہے۔ شہر میں بے شمار حوض، چہرے
اور فوارے ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں جن سے
معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر اپنے زمانے میں الف
لیلا کا بغداد تھا، مگر یہاں کا سب سے خوبصورت
مقام مقبرہ رابعہ دورانی جو دکن کا تاج کہلاتا ہے
اس حسین عمارت کی پشت پر پہاڑیاں مربع
دائرے کی شکل میں دور تک چلی گئی ہیں اور
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ مقبرا تعمیر ہو چکا
تو قدرت نے اس کا پس منظر سجانے کے لیے
پہاڑیوں کی یہ قوس کہیں سے لا کر رکھ دی۔
اس کی چار دیواری سے ملا ہوا آپ کا بنگلا تھا
جس میں ایک طرف آپ رہتے تھے اور دوسری
طرف انجمن تھی۔

بنگلے کی شمالی پہاڑیوں میں بدھ مت کے
قدیم غار نظر آتے ہیں۔ مغرب میں دولت اباد
کا قلعا دکھائی دیتا ہے۔ [illegible]

چاندنی رات میں مقبرے کی حسین عمارت میں جان پڑ جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ رابعہ دورانی نورانی پوشاک پہنے کھڑی ہے۔ غرض کہ قدرت کی کاریگری اور انسان کی صنعت نے مل کر اس جنگل کی خاموش فضا نے آپ کی طبیعت کو ضرور متاثر کیا ہے۔ یہ مقام اپنے آنے والے کی خاطرداری کرتا ہے۔ افسردہ دلوں کو فرحت بخشتا ہے۔ اہل دل کو غور و فکر کے لمحات دیتا ہے۔ انشا پردازوں کو تشبیہ اور استعارے دیتا ہے۔ نقاش کو دلکش مناظر پیش کرتا ہے، اور شاعر کو تخیل دیتا ہے۔ یہاں نباتات کو نمو، کلیوں کو مسکراہٹ، پرندوں کو چہچہے اور آواز کو گونج ملتی ہے۔ یہاں کی فضا صبح کو تازگی شام کو اداسی اور رات کو ہیبت بخشتی ہے۔ آپ یہاں تنہا نہیں تھے۔ قدرت نے کہانیوں کی ایک [illegible] آپ کے سامنے کھول رکھی تھی۔

علی الصباح نہانا آپ کی عادت میں داخل ہے، بلکہ یہ عادت شوق بن گئی ہے۔ نہانے کا ذکر یہاں اس لیے کیا گیا کہ راقم ان لوگوں میں ہے جو نہانے کے لیے دن اور ستارے دیکھا کرتے ہیں اور کبھی دن سورج [illegible] کے بعد نہانے کی جرأت کرتے ہیں۔ آپ کے شوق کا یہ عالم ہے کہ کیسی ہی سخت سردی ہو بے تکلف ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی سرد لہر رستا بھول کر یہاں آ جاتی تھی تو یہ بھی آپ کے معمول میں فرق نہیں پیدا کر سکتی تھی۔ دوروں کے دوران میں اگر آپ شب گزاری کسی ندی کے کنارے ہوتا تو نظر بچا کر اسی میں ہی اشنان ہو جاتا تھا۔

صبح شام کی چہل قدمی آپ کا معمول رہا ہے، اگر یہ چہل قدمی کسی سڑک پر نہیں ہوتی تھی تو کبھی سامنے کی ندی کے کنارے کنارے دور تک چلے جاتے تھے، کبھی نالوں اور کھڈوں [illegible] تے ہوئے پہاڑیوں پر چڑھ جاتے تھے۔ آپ کے خیال میں سیر کرنے پر [illegible] ٹہلنا نہیں، اگر چلنا ہی ہے تو اپنی زمین پر چلنا چاہیے جہاں درخت ہوں، جگہ جگہ ٹیلے یا گڑھے ہوں، جھاڑ جھنکاڑ ہوں، چنانچہ اکثر پہاڑیوں کے دامن میں یا چٹانوں پر گھوما کرتے تھے۔ ان پہاڑیوں میں تیندوے تھے۔ کبھی کبھی کوئی شیر بھی آ جاتا تھا۔ جھٹ پٹے کے بعد جب واپس آتے تو کپڑوں میں جابجا جھاڑیوں کے کانٹے الجھے ہوئے ہوتے تھے اور اگرچہ کبھی ذکر تو نہیں کیا، مگر شاید اندھیرے میں کبھی چٹانوں پر سے پھسل بھی جاتے ہوں گے۔

صبح کو اپنے کمرے میں یا شام کو کسی چٹان پر، یوگا بھیاس بھی کرتے تھے جس میں ہاتھ پاؤں کی مختلف حرکتیں ہوتی تھیں۔ جسم کو جھکا کر دوہرا کرنا، دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر آہستہ آہستہ پاؤں تک لیجانا اور اسی قسم کی مشقیں شامل تھیں۔

شکار کا شوق بھی رہا ہے۔ نشانہ اچھا تھا۔ مرغابی کے لیے بڑے اچھے نشانہ کی ضرورت ہے۔ آپ اکثر اس کا شکار کرتے تھے۔ بڑے شکار کے لیے خاص اہتمام ہوتا تھا اور شکاریوں کی طرح باقاعدہ بنڈی (بیل گاڑی) میں بیٹھ کر جاتے تھے۔ آپ نے کالے بھی مارے ہیں۔

یوں تو دکن میں رہے مگر باورچی دلی کا ہی رکھا۔ آپ کا دسترخوان بڑا پرتکلف ہوتا تھا اور جب تک کوئی مہمان یا دو چار آدمی دسترخوان پر نہ ہوں آپ کو کھانے میں مزا نہیں آتا تھا۔ خود کم کھاتے تھے، دوسروں کو کھاتے دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ دسترخوان پر میٹھا ضرور ہوتا تھا، مگر اسے شاید سونگھتے ہی ہوں گے۔ کھانے کے بعد فواکہ کی باری آتی تھی۔ اورنگ آباد میووں کا گھر ہے۔ سنترے آپ کو بہت بھاتے ہیں اور اورنگ آباد کے سنترے ہوتے بھی بہت لطیف اور خوش ذائقہ ہیں۔ بنگلے کے پاس ہی سنتروں کا باغ تھا، چنانچہ آپ کے لیے سنتروں سے لدے ہوئے کچھ درختوں کا سودا کر لیا جاتا تھا۔ کلو کے سیب، ناشپاتی اور [illegible] وغیرہ کے پارسل بھی آتے تھے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر قیلولہ کرتے تھے۔

کتاب ہاتھ میں ہوتی اور سو جایا کرتے تھے۔

کھانے کے بعد اور کام کرتے وقت حقہ پیتے ہی یہاں تک رہے، تمباکو اکثر بھیسہ اور جاورہ سے آتا تھا۔ مالوہ میں جو مقامات تمباکو کے لیے مشہور ہیں، وہ سب آپ کو معلوم ہیں، چنانچہ بعض وقت خاص کھیتوں کی نشاندہی کرکے تمباکو منگوایا کرتے تھے۔

باغبانی سے آپ کو بہت دلچسپی ہے۔ یہ شوق بھی یہاں پورا ہوا۔ مقبرا رابعہ دورانی کا باغ بہت خوبصورت ہے اور مغلیہ باغوں کی تاریخ میں خاص مقام رکھتا ہے۔ آپ حکومت کی طرف سے اس باغ کے اعزازی نگراں کار تھے، چنانچہ پھول پودوں کے انتخاب، چمن بندی اور ان کی دیکھ بھال میں آپ کا خاصا وقت گزرتا تھا۔ بعض وقت سرسبز اور شاداب تختوں کو اس طرح دیکھا کرتے تھے جیسے کسان اپنے لہلہاتے کھیت کو دیکھ کر نہال ہو جاتا ہے۔ اپنے بنگلے پر بھی ایک چمن لگوایا تھا۔ شاید گلاب آپ کو بہت پسند ہے۔ آپ کے چمن میں گلاب کی بہت قسمیں تھیں۔ نام دلو، اسی باغ کا مالی تھا۔

آدمی علم کا سمندر ہو یا روشنی کا مینار، اگر خوش اخلاق نہیں ہے تو اس کا علم و فضل بے معنی ہو جاتا ہے۔ لوگ اس سے مل کر خوش نہیں ہوتے۔ اچھے اخلاق، انسان کا زیور ہوتے ہیں۔ جناب مولوی صاحب اس زیور سے بھی آراستہ ہیں۔ آپ کے مزاج میں ہمدردی، مروت اور ملنساری بہت ہے۔ آپ کا بنگلا آبادی سے دور جنگل میں تھا مگر ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ ان میں چھوٹے بڑے ہر قسم کے آدمی ہوتے تھے۔ سب سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ کسی رئیس یا بڑے عہدہ دار کی موجودگی میں کوئی معمولی آدمی آپ کے پاس بیٹھا ہوتا تو اس سے زیادہ ملتفت ہوتے اور ایسے اخلاق سے پیش آتے کہ وہ اپنے احساس کمتری کو بھول جاتا تھا۔ اور خوش ہو کر جاتا تھا۔

آپ دوسروں کو باتیں کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ خود کم بولتے ہیں، لیکن جب بولتے ہیں تو آپ کی بات کوئی حکیمانہ نکتہ ہوتی ہے یا پھر کوئی لطیفہ۔ ملاقاتیوں میں بعض ایسے جم کر بیٹھتے کہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ان کی بے کار باتوں سے آپ کے اوقات میں خلل بھی ہوتا تھا، مگر آپ کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے معلوم ہو کہ آپ اکتا کر بے زار ہو گئے ہیں۔ البتہ اس کے چلے جانے کے بعد ایک لمبا سا سانس ضرور لیتے تھے۔ جب کام میں زیادہ حرج ہونے لگا تو آپ نے بنگلے سے چند گز کے فاصلے پر پھوس کی ایک جھونپڑی ڈلوائی، دن کو اس میں کام کرتے تھے۔ ان دنوں اتوار کی بجائے جمعہ کو تعطیل ہوتی تھی۔ آپ جمعرات کی شام کو "موسالا" چلے جاتے تھے۔ موسالا چھوٹا سا ایک کھیڑا ہے جو اورنگ آباد سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہاں حوض قتلق کے نام سے ایک قدیم تالاب ہے۔ دوسری طرف پہاڑیوں سے گھری ہوئی ایک خوبصورت جھیل ہے جس کو درے آبپاشی کہتے ہیں۔ یہ مقام مناظر کے لحاظ سے آرٹسٹ کی جنت ہے۔ آپ تعطیلات کے دن اکثر یہیں گزارتے تھے، چنانچہ آپ کے بہت سے ادبی پارے اسی مقام کی پیداوار ہیں۔

افسری اور ماتحتی کا معاملہ بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ افسر کتنا ہی شریف اور نیک ہو، ماتحت کے سامنے اس میں کچھ نہ کچھ ترفع آ ہی جاتا ہے۔ جناب مولوی صاحب اپنے ماتحتوں سے بے تکلف ہو جاتے تھے، بلکہ ان سے مذاق بھی کرتے تھے، مدرسے کے لوگ آپ کو اپنا بزرگ اور سرپرست سمجھتے تھے۔ اپنے ماتحتوں کے حقوق کے لیے آپ حکام مدرسہ سے جھگڑا بھی مول لیتے تھے۔

مدرس کی بڑی عزت اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ نانڈیڑ ضلع میں بھینسا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں اس زمانے میں ایک چھوٹا سا مڈل اسکول تھا۔ آپ نے صدر مہتمم تعلیمات کی حیثیت سے اس کا معائنہ کیا اور وہاں کے صدر مدرس

کے طریقے تعلیم کو بہت پسند کیا، چنانچہ مدرسے کی کتاب الرائے میں لکھا ہے "مجھے فخر ہوتا اگر میں ان کی ماتحتی کرتا۔" کسی ڈویژنل انسپکٹر نے اپنے تحت کے مدرس کے لیے ایسا جملہ شاید ہی لکھا ہو۔

کوئی شخص کتنا ہی کم درجے کا ہو، آپ سے ملنے آتا تو بغیر ملے واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس موقع پر ایک واقعہ بیان کرنے کے قابل ہے۔ حکومت آصفیہ کے صدر اعظم مہاراجا سرکشن پرشاد بہادر، ایک دفعہ اورنگ آباد کے دورے پر آئے۔ آنجہانی کے دل میں آپ کی بڑی قدر تھی، چنانچہ آپ سے ملنے بنگلے پر آئے اور کوئی دو تین گھنٹے وہاں ٹھیرے رہے۔ اس وقت مقبرے کے چاروں طرف پولیس کا پہرا تھا۔ ایک آدمی بچتے بچاتے مقبرے کی پشت کی جانب آپ سے ملنے بنگلے کی طرف آ رہا تھا جب قریب پہنچا تو پولیس کے جوان نے اسے روک دیا، مگر وہ چیخنے لگا "میں صاحب سے ملنے آیا ہوں ایک ضروری کام ہے" آپ کمرے میں مہاراجا بہادر سے گفتگو میں مشغول تھے۔ شاید کسی کھڑکی یا دروازے میں سے آپ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ آپ نے آدمی سے کہا اس شخص سے پوچھو کیا چاہتا ہے؟ دریافت پر معلوم ہوا کسی تحتانیہ مدرسے کا چوکیدار ہے۔ آپ کے پاس ایک درخواست پیش کرنی چاہتا ہے۔ آپ نے کہا اس کو درخواست لے آؤ اور کہو اس وقت میں مصروف ہوں، کل آ کر مجھ سے ملے۔ مہاراجا بہادر کے چلے جانے کے بعد درخواست کو پڑھا۔ اس میں درخواست گزار نے لکھا تھا۔ صدر مدرس صاحب نے مجھے مارا اور جس چپل سے مارا ہے وہ منسلک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ درخواست کے ساتھ ایک چپل منسلک تھی۔ دوسرے دن صبح کو دیکھا گیا کہ وہ چوکیدار آپ کے سامنے میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ آپ نے اس سے کہا "اچھا یہ بتاؤ تم اس مدرسے میں رہنا چاہتے ہو یا صدر مدرس کا تبادلہ کر دیا جائے۔" چوکیدار نے کہا "صاحب! میں اس گاؤں کا رہنے والا ہوں اپنے گاؤں میں رہنا چاہتا ہوں۔" آپ نے مسکرا کر کہا اچھا جاؤ صدر مدرس کا تبادلہ کر دیا جائے گا۔ ان کی دوستی کی ایسی مثال مشکل سے ملتی ہے کہ کل جس جگہ حکومت آصفیہ کے نامور صدر اعظم رونق افروز تھے وہیں آج ایک چوکیدار آپ کے ساتھ ناشتے میں شریک تھا۔

بڑے لوگوں کو ٹوکنے والے کم ہوتے ہیں اس لیے بعض اوقات ان کے منہ سے ایسی بات نکل جاتی ہے جس سے دوسروں کی دل آزاری اور توہین ہوتی ہے، مگر کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ایسے موقعوں پر آپ خاموش نہیں رہتے تھے اور کھری بات کہہ دیتے تھے۔ چاہے مخالفت ہی کیوں نہ سر پڑ جائے، آپ سے دوسروں کی توہین نہیں دیکھی جاتی۔

بہت دن کا ذکر ہے۔ حیدرآباد کے ایک امیر کبیر یہاں کے محکمے تعلیمات کے صدرالمہام تھے دورے کی تقریب میں ناندیڑ پہنچے۔ آپ اس زمانے میں صدر مہتمم تعلیمات صوبے اورنگ آباد تھے۔ ناندیڑ چونکہ آپ کے علاقے میں تھا اس لیے آپ بھی اس موقع پر وہاں موجود تھے۔ صدرالمہام بہادر امیر ابن امیر تھے۔ انہوں نے اسکول کے معائنے کے لیے شہر تک جانے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ ریلوے اسٹیشن پر سیلون ہی میں رہے۔ پلیٹ فارم پر ضلع کے عہدے داروں کے ساتھ آپ بھی موجود تھے۔ صدرالمہام کے اسٹاف کے کسی شخص نے آپ سے کہا "صدرالمہام بہادر نے فرمایا ہے، اسکول کے لڑکوں کو اسٹیشن پر بھجوا دیا جائے۔ ان کو مٹھائی تقسیم ہوگی۔" اس وقت وہاں عہدے داروں کا خاصا مجمع تھا۔ آپ نے بگڑ کر کہا "میرے لڑکے بھکاری نہیں ہیں جو مٹھائی لینے آئیں، وہ نہیں آ سکتے۔" اس کے بعد بہ تبسم

تعلیمات ضلع (مولوی غلام ربانی صاحب) سے کہا "آؤ میاں چلیں" اور ان کو لے کر فوراً وہاں سے چل دیے -

اخلاقی جرأت، انسانی کردار کے امتحان کا وہ پرچا ہے جس میں اچھے اچھے فیل ہوجاتے ہیں۔ اس پرچے کے حل کرنے میں آپ نے بڑی بڑی مخالفتیں مول لیں، مگر نمبر پورے حاصل کیے -

بڑے لوگوں میں بھی سب ایک سے نہیں ہوتے - ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو حق گوئی کی قدر کرتے ہیں، چنانچہ ایک موقع پر یہاں کے ایک نامور صدر المہام نے بڑے مجمع کے سامنے آپ سے معافی مانگی - ہوا یہ کہ جب انجمن کا کام بڑھنے لگا اور اس کا پریس قایم ہوا تو آپ نے انجمن کے دفتر اور پریس کے لیے ایک مکان لیا اور اس کا نام "اردو باغ" رکھا۔ اس نئے مکان کی خوشی بڑی دھوم سے منائی اور اس تقریب میں ایک نہایت پر تکلف عصرانا ترتیب دیا جس میں مقامی عہدے داروں، وکلا، تاجر سیٹھ اور ساہوکار، کالج کے اساتذا اور دوسرے لوگوں کو مدعو کیا۔ غالباً کوئی سو آدمی ہوں گے - پریس کا افتتاح سر اکبر حیدری (مرحوم) کرنے والے تھے - دعوتی رقعوں میں جو وقت دیا گیا تھا، وہ پورا ہوگیا یعنی ۵ ½ بج گئے اور حیدری صاحب اس وقت تک نہیں پہنچے - معلوم ہوا کہ وہ اس وقت خلد اباد میں ہیں اور بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں - آپ نے مہمانوں کو کھانے کی میزوں پر بلایا اور کہا "شروع کیجیے" ان کو تامل ہوا کہ صدر المہام بہادر ابھی نہیں آئے ہیں کچھ دیر ان کا انتظار کرنا چاہیے! آپ نے بگڑ کر کہا " صاحب! میں نے آپ کو بلایا ہے یا صدر المہام بہادر نے! آپ نے اورنگ اباد کے مشہور وکیل چودھری ڈنگر داس آنجہانی سے افتتاح کرا دیا اور سب نے کھانا پینا شروع کر دیا۔ چاے سے فارغ ہوتے ہی تھے کہ موٹر کے آنے کی آواز آئی - معلوم ہوا کہ موٹر تھب

کے داخلے دروازے پر رکی، یہاں سے اردو باغ کوئی دو سو گز کے فاصلے پر تھا - آپ سے کہا گیا کہ حیدری صاحب کے استقبال کے لیے تو چلیے - آپ نے انکار دیا، اور کسی کو بھی نہیں جانے دیا - تھوڑی دیر میں دیکھا کہ حیدری صاحب چلے آرہے ہیں - مرحوم آپ کے مزاج سے واقف تھے - ان کو یقین تھا کہ آپ درگذر کرنے والے نہیں، چنانچہ حیدری صاحب نے دور ہی سے کہا :-

آپ نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا اور طنز یا لہجہ میں کہا "جی نہیں، وقت تو آپ کا ہے - ہمارے وقت کی کوئی قیمت نہیں - لیڈی حیدری (مرحومہ) نے بھی معذرت چاہی اور بڑی مشکل سے آپ کی برہمی دور ہوئی - حیدری صاحب نے لوگوں سے ہات ملانا شروع کر دیا - اس پر آپ ایک ایک کا تعارف کراے - جب سب سے ہات ملا چکے تو حیدری صاحب نے کہا -

" نیفی صاحب! آپ ہی چاے دیدیجیے، مولوی صاحب تو مجھے کچھ نہیں دیں گے، اور ایک میز پر بیٹھ گئے - ع

ناز بر آں کن کہ خریدار تست

امیر آدمی کی فضول خرچی بجھ سکتی ہے، بلکہ بعض اوقات اس کا اسراف، امارت کی شان سمجھا جاتا ہے، لیکن اگر غریب آدمی فضول خرچی پر اتر آئے تو اس کا ٹھکانا نہیں! وقت بہت بڑی دولت ہے - اکثر دیکھا جاتا ہے کہ لوگ اس دولت کو بڑی بے دردی سے خرچ کرتے ہیں - جناب مولوی صاحب وقت کی بڑی قدر کرتے ہیں اور اس دولت کا معاوضا کام کی صورت میں وصول کر کے دن رات کام کرتے ہیں - کام میں ان کو لطف آتا ہے - ان کے انہماک کو دیکھ کر دوسرے کے دل میں کام کرنے کا جوش پیدا ہوتا ہے - میں نے ایک دفعا آپ سے سوال کیا کہ "آپ

لاکھوں میل کا سفر کیا ہے۔ سفر کے دوران میں آپ کا بہت وقت ضایع ہوا ہوگا۔ آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں ریل کے سفر میں برابر کام کرتا رہا ہوں۔ طویل سفر کے سکنڈ کلاس مسافر عموماً ڈاک گاڑی یا دوسری تیز رفتار گاڑی میں سفر کرتے ہیں۔ وہاں سکنڈ کلاس کے ڈبے میں بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ میں اکثر پسنجر ٹرین میں سفر کرتا تھا کیونکہ مسافر گاڑی میں سکنڈ کلاس کا ڈبا خالی ہوتا تھا اور مجھے سکون سے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ اس طرح سفر کی مدت میں تو ایک دو دن بڑھ جاتے تھے، مگر میں کام بہت کر لیتا تھا۔

دنیا میں ایسا کوئی خوش نصیب انسان نہیں ہے جسے کامل خوش نصیب ہو۔ زمانہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا۔ رنج و غم، تفکرات اور پریشانیاں سب کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ بعض لوگ اپنے احباب یا دوسروں سے ملتے ہیں تو ان سے اپنی پریشانیاں بیان کیا کرتے ہیں۔ جناب ورما صاحب کسی سے اپنی پریشانی یا تکلیف بیان نہیں کرتے۔ شاید تکلیف ظاہر کرنے کو اپنی خفت سمجھتے ہیں، لیکن تکلیف جب اپنا ہٹ پر اتر آتی ہے تو ظاہر ہو کر ہی رہتی ہے۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کے قابل ہے۔

آپ کو درد قولنج کی بہت پرانی شکایت تھی۔ اس درد کی تکلیف سے خدا بچائے، مگر آپ اس کو بھی چھپاتے رہتے۔ بہت اتفاقیہ ہلکا دورہ پڑا، مگر آپ نے کسی کو معلوم نہیں ہونے دیا۔ دوروں کے دوران میں سفر سے بہت دور ایسے مقامات پر بھی اس درد کے دورے پڑے ہیں جہاں نہ کوئی ڈاکٹر تھا نہ کوئی حکیم۔ ایک دفعہ آپ ضلع بیڑ کے دورے پر روانہ ہوئے اور پہلا مقام شاہ گڑھ میں کیا۔ ریاست حیدرآباد کے ڈاک بنگلے اچھے پرفضا مقامات پر بنائے گئے ہیں کہ جنہیں انگریزوں کے انتخاب کی داد دینی چاہیے۔ شاہ گڑھ کا بنگلا بھی بہت ہی خوبصورت [illegible]

پہاڑی پر بنی ہوئی ہے۔ آپ کا معمول تھا کہ پرفضا مقام پر کئی دن قیام کرتے تھے۔ یہاں آپ کے ساتھ بیڑ کے مہتمم تعلیمات (نرمل راو صاحب) اور اورنگ آباد کے مہتمم تعلیمات ڈی۔ پی کاٹ (آنجہانی) تھے، یہ دونوں آپ کے پجاریوں میں تھے۔

دوپہر کے کھانے پر آپ کے ساتھ دونوں مہتمم اور عملے کے لوگ تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں، پھر آپ کمرے میں چلے گئے۔ سب نے سمجھا کہ قیلولہ کرنے گئے ہیں۔ تین چار گھنٹے گذر گئے، مگر آپ باہر نہیں نکلے۔ کسی نے دروازے پر جا کر دیکھا تو دروازہ اندر سے بند پایا۔ دوسرا دروازہ دیکھا، وہ بھی اندر سے بند تھا۔ کمرے کا ایک دروازہ غسل خانے میں کھلتا تھا۔ اس کو دیکھا تو وہ بھی اندر سے بند تھا۔ اب سب کو تشویش ہوئی، چنانچہ دروازے کو کھٹکھٹایا گیا، مگر نہ دروازہ کھلا اور نہ اندر سے کوئی آواز آئی۔ پھر تو دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹایا گیا اور توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اتنے میں بنگلے کے خانساماں کا ایک لڑکا وہاں آ گیا۔ اسکو کسی طرح کمرے کی چھت چڑھایا گیا۔ اس نے اندر اتر کر دروازہ کھولا۔ سب گھبرا کر اندر گئے۔ دیکھا تو آپ پلنگ پر بے ہوش پڑے ہیں۔ کاٹ صاحب فوراً ڈاکٹر کو لانے بیڑ روانہ ہوئے۔ یہ مقام پندرہ بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ کوئی مغرب کے قریب ڈاکٹر آیا۔ اس نے بڑی محنت کی۔ خدا خدا کر کے آپ نے آنکھیں کھولیں اور جب ذرا ہوش آیا تو پہلا جملہ جو آپ کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا۔ "میں نے دروازے اچھی طرح اندر سے بند کر دیے تھے۔ آپ لوگ کمرے کے اندر کس طرح آ گئے؟"

اصل میں یہ قولنج کا دورہ تھا اور اتنا شدید تھا کہ آپ کراہتے تھے۔ اس تکلیف کو چھپانے کے لیے آپ نے دروازے بند کر دیے تھے۔

مضمون طویل ہو گیا ہے ورنہ بھی [illegible] اس قسم کے اور واقعات بیان کیے جا سکتے [illegible]

حدیث دلکش وافسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصہ زلف پریشاں را

درد قولنج کی تکلیف کو آپ نے بارہا اس طرح برداشت کیا کہ کسی نے آپ کے مونھ سے اف تک نہیں سنی، مگر پچھلے دنوں، کراچی میں انجمن جس درد میں مبتلا ہوئی اُسے برداشت نہیں کرسکے بلکہ بلبلا اٹھے اور آپ کے مونھ سے اس زور سے "آہ" نکلی کہ اس کی آواز ہم نے یہاں حیدرآباد میں سنی، مگر انجمن خوش قسمت ہے کہ صدر پاکستان نے عین موقع پر اعجاز مسیحائی دکھایا اور انجمن کے مفلوج جسم میں تازہ روح پھونک دی۔

جن لوگوں کو بہت کام کرنا ہوتا ہے، اور وہ محنت کرنا ہی چاہتے ہیں، ان کو زیادہ سے زیادہ وقت ملتا ہے، ہرکس وناکس کو زیادہ موقع نہیں ملتا۔ زندگی آدمی کو اتنا ہی دیتی ہے جتنا وہ اس کو دیتا ہے۔ جو لوگ نیکی کرتے ہیں، اور اپنی زندگی، دوسروں کی بھلائی میں گزارتے ہیں وہ انسان کی شکل میں خدا کی رحمت ہوتے ہیں۔ بہت مبارک ہے وہ قوم جس میں ایسی برگزیدہ ہستیاں موجود ہوں۔ جناب مرلوی صاحب بھی ایسے ہی عظیم انسان ہیں۔ آج سے تقریباً بیس برس پہلے ہم نے تنہا آپ کی متعدد انجمن کی سلور جوبلی منائی تھی۔ اور دعا مانگی تھی کہ خدا وہ دن لائے کہ ہم ان کی گولڈن جوبلی اور ڈائمنڈ جوبلی منائیں۔ شکر ہے کہ وہ خوشی کی گھڑی آگئی ہے۔

ڈاکٹر ایس۔ پی۔ نفقتہ

رباعی

آنکھوں میں اشک خوں تابندہ ہیں
سینے میں داغ غم درخشندہ ہیں
اس دور میں یاد پوچھو ہمارے حالات
اے نفقتہ شکر ہے کہ ہم زندہ ہیں

اندرجیت گاندھی صدر سنٹرل مجلس ادب

دختر نہرو وقار ہند ہے

سب کے دل پہ حکمراں ہے اندرا
حریت کی پاسباں ہے اندرا
حامیٔ امن زماں ہے اندرا
خیرخواہ بیکساں ہے اندرا
نقش ہے سب کے دلوں پر آج جو
وہ محبت کا نشاں ہے اندرا
سامنے باطل کے جو جھکتی نہیں
وہ صداقت کی زباں ہے اندرا
دیش کی تعمیر کی حامل ہے جو
وہ امیر کارواں ہے اندرا
شاہراہ حق پرستی پر مدام
جوش و قوت سے رواں ہے اندرا
بزدلی سے واسطہ جس کو نہیں
عزم و ہمت کا نشاں ہے اندرا
اوج پر ہے جس کی قسمت دیکھئے
ہر طرح اب کامراں ہے اندرا
خدمت قوم و وطن کے واسطے
حامی عزم جواں ہے اندرا
آفتاب نور ساماں کی طرح
دیکھ لو وہ ضوفشاں ہے اندرا
بالیقیں مل جائے گی منزل ہمیں
کامیابی کا نشاں ہے اندرا
عظمت قوم و وطن کی راہ میں
حامیٔ تیغ راستاں ہے اندرا
دختر نہرو وقار ہند ہے
عظمت ہندوستاں ہے اندرا
آج یہ دنیا پہ روشن ہوگیا
اس زمیں پہ آسماں ہے اندرا
دیش کی تقدیر گاندھی ہے وہی
ترجمان اک جہاں ہے اندرا

ڈاکٹر عنوان چشتی

گیت کی زبان

یوں تو ہر قسم کی اعلیٰ شاعری کی زبان شعری تجربے کے بطن سے نمودار ہوتی ہے، لیکن غنائی شاعری کی زبان خاص طور پر شعری تجربے کا لازمی حصہ ہوتی ہے، اس لیے گیتوں کی زبان میں دو قسم کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو تمام غنائی شاعری میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، دوسری وہ جو محض گیتوں کی اپنی انفرادی خصوصیات ہیں۔ پہلی خصوصیات کو گیت کی روایتی اور دوسری کو انفرادی کہا جا سکتا ہے، اگرچہ گیتوں کی زبان کی روایتی اور انفرادی خصوصیات کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے، پھر بھی کسی نہ کسی حد تک ان کی شناخت کی جا سکتی ہے۔

غنائی شاعری میں خارجیت پر داخلیت کو، روایت پر انفرادیت کو، تخیل پر جذبے کو، معاملات پر ذات کو "کل اظہاریت" پر فرد اظہاریت کو، اور مصنوعی آہنگ پر فطری ترنم کو فوقیت حاصل ہے۔ اسی رجحان کا اثر غنائی شاعری کی تمام صنفوں اور ان کی زبان پر بھی ہوتا ہے، چونکہ گیت غنائی شاعری کی ایک مخصوص صنف ہے، اس لیے گیتوں میں ایسی زبان ہوتی ہے جو خارجی واقعات سے زیادہ داخلی کوائف کی ترجمان ہوتی ہے، جو تخیل کی گلکاریوں سے زیادہ جذبے کی صداقت کی مظہر ہوتی ہے جو بلاواسطہ ترسیل خیال سے زیادہ راست جذبے کی شدت کی عکاس ہوتی ہے، اس میں جگ بیتی سے زیادہ آپ بیتی بیان کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بسا اوقات زندگی سے زیادہ زندگی کے درد و داغ اور کرب و کیفیت کی ترجمانی کی اہلیت ہوتی ہے۔ غرض اس میں ترسیل اور تخلیقی زبان کی جملہ خصوصیات ہوتی ہیں، اس لیے مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ گیتوں کی زبان غنائی شاعری کے عناصر کے تابع ہوتی ہے۔ غنائی شاعری کی انہیں خصوصیات کو میں نے روایتی خصوصیات کہا ہے۔ گیتوں کی زبان کی انفرادی خصوصیات کو اجاگر کرنے کے لیے غنائی شاعری کے عناصر کے علاوہ بعض دوسرے اہم اور ناگزیر عوامل و عناصر پر توجہ کرنی ہوگی جن میں لوک گیتوں کی روایت اور فوری اظہار کی خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ انہیں سے گیتوں کی زبان میں وہ خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جنہیں میں نے گیتوں کی زبان کے

انفرادی خصوصیات کیا ہے۔

ہندستانی گیتوں کی تخلیق کے بہت سے محرکات ہیں۔ ان میں بنگال غنائی شاعری خصوصاً ٹیگور کی شاعری کے رومانی تحریک، ہندی اصناف و سالیت کی طرف مراجعت کا رجحان کسی حد تک خارجی محرکات ہیں، اور جذبے کا راست اور بے تکلف اظہار کی خواہش داخلی محرک ہے، لیکن سب سے زیادہ طاقتور اور بنیادی محرک لوک گیتوں کی روایت ہے، جن سے متاثر ہو کر ہر زبان میں ادبی گیتوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ لوک گیت محرک بھی ہے اور نمونہ بھی، لیکن ہندستانی شاعری کو لوک گیتوں سے تحریک تو ملی، مگر وہ انہیں اپنے لیے نمونہ نہ بنا سکے۔ (یہ بحث مناسب موقع پر اگلی سطور میں آئے گی) دنیا میں سب سے پہلا غنائی اظہار لوک گیت کی صورت میں ہوا ہوگا۔

ہندستان میں بھی لوک گیتوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ یہ انسانی ذہن کی پہلی شعوری اپج اور جذبے کا اولین لسانیاتی اظہار ہے۔ لوک گیتوں کی روایت سے بنگال کی "ریکل شاعری" "چریہ گیت کتک" اور "ساہتک گیت" سے لے کر جدید ترین فلمی گیتوں تک ہر قسم کی غنائی شاعری متاثر ہے۔ اب تو لوک گیتوں کا اثر اتنا پڑ رہا ہے کہ بعض فلمی گیتوں کی دھنیں لوک گیتوں کی دھنوں پر بن رہی ہیں۔

لوک گیت بول چال کی زبان میں ہوتے ہیں۔ اس زبان کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس میں بازار - دفتر - جلسے - جلوس - گلیوں - کاروبار اور راز و نیاز کی زبان کی تمام شکلیں شامل ہیں۔ اس کی زیادہ ٹھیٹ صورت دیہات میں ملتی ہے۔ لوک گیتوں میں بول چال کی زبان کی یہی دیہی ٹھیٹ صورت ہوتی ہے۔ اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ دیہاتیوں کی زبان پر جو لفظ جس طرح چڑھ جاتے ہیں۔ انہیں اس سے سروکار نہیں ہوتا کہ لفظ فصیح ہے یا غیر فصیح - اس کا تلفظ درست ہے یا نادرست۔ وہ جس لفظ کو اپنے مفید مطلب پاتے ہیں، اسی طرح بولتے ہیں۔ زبان کا یہی ٹھیٹ روپ لوک گیتوں میں نظر آتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دیہی بول چال کی زبان پر مقامی آب و رنگ کا گہرا اثر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے ایک ہی خطے کے مختلف جگہوں کے لوک گیتوں کی زبان میں بول چال اور لب و لہجے کے نازک امتیازات ہوتے ہیں۔ یہ امتیازات لوک گیتوں کی زبان کے دائرے کو وسیع کرتے ہیں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ لوک گیتوں کی زبان پر اس علاقے کے مخصوص پیشوں کا اثر بھی ہوتا ہے، چونکہ ایک پیشے کے لوگوں کی زبان دوسرے پیشے کے لوگوں کی زبان سے کسی قدر مختلف ہوتی ہے، اس لیے گڈریوں، ہیروں، گوجروں اور دھوبیوں کے لوک گیتوں کی زبان میں لب و لہجے کے امتیازات کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ، الفاظ کے تلفظ اور ان کی وضعوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ساجن - سجنا - سجنوا وغیرہ الفاظ کی تشکیل ایسے ہی اسباب و محرکات کے تحت ہوتی ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ لوک گیتوں کی زبان میں صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس زبان کے الفاظ کی بہت سی ابتدائی اور قدیم شکلیں موجود ہیں یا ادنا تغیرات کے بعد ابھی تک باقی ہیں۔ یہ خصوصیت ان علاقوں کے لوک گیتوں میں زیادہ نظر آتی ہے، جہاں نئی روشنی نہیں پہنچی یا کم پہنچی ہے۔ یہ سب خصوصیات مل کر زبان کو سادہ - فطری - بے تکلف اور اکہرا بنا دیتی ہیں۔ بول چال کے عمل میں ہر لفظ ترسیل کی ضرورت کی زد پر آکر ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے یا کم سے کم اپنی دھار دار سطح کو سڈول بنا لیتا ہے۔ دیہی لب و لہجے کی خراد پر چڑھ کر اپنی نئی ہیئت تراش لیتا ہے۔ اس عمل سے الفاظ میں اشتراک باہمی اور ایک دوسرے میں تحلیل ہونے کی صلاحیت پڑ جاتی ہے، جس کی وجہ سے لوک گیتوں کی زبان میں گھلاوٹ - دل سوزی - مٹھاس - سڈول

اور ایک خاص قسم کی فطری معصومی پیدا ہو جاتی ہے۔

نسوانی اظہار کی خصوصیت میں لہجے کا لوچ اور جذبے کا بے ساختہ اظہار شامل ہے بات اور بے ساختہ اظہار میں رنگا رنگی سے زیادہ یک رنگی۔ تصنع سے زیادہ سادگی ہوتی ہے۔ صنف نازک بات کو گھما پھرا کر کہنے سے زیادہ راست کہنے میں یقین رکھتی ہے۔ زبان کی آرایش۔ الفاظ کی صحت اور بیان کے تکلف سے زیادہ اپنی بات مخاطب کے دل میں اتارنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنی کہانی کو الفاظ کی بندشوں میں نہیں جکڑتی، بلکہ اس کے دل پر جو بیچ گزری ہے اس کو اپنی زبان میں ہو بہو ادا کر دیتی ہے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اس سے لفظوں کے تانے بانے نہیں بناتی، بلکہ اس کی جزئیات بیان کر دیتی ہے۔ اس کو تخیل کے پروں پر اڑنے سے زیادہ جذبات کی لہروں پر بہنا پسند ہے، اس لیے تخیلی زبان سے زیادہ جذباتی زبان میں گفتگو کرتی ہے۔ اس کے مزاج کا صبر و تحمل کا جوہر غیض و غضب پر حاوی رہتا ہے، اس لیے وہ الم انگیز لمحوں میں چیخوں پر سسکیوں کو ترجیح دیتی ہے۔ اس کے مزاج کی یہی خصوصیات اس کی زبان میں نظر آتی ہیں۔ وہ پرشور تکلم سے زیادہ لطافت نزاکت۔ سادگی سرگوشیوں میں بات کرنا پسند کرتی ہے، سرگوشیوں کے لہجے میں الفاظ کے طمطراق سے زیادہ لطافت۔ نزاکت سادگی اور معصومی کی ضرورت ہوتی ہے، گیتوں کی زبان میں نسوانی اظہار کی بے ساختگی کی یہی خصوصیات ہونی چاہیں۔

نسوانی اظہار کی دوسری خصوصیت لہجے کا لوچ ہے، اس میں کرختگی پر خوش آہنگی کو، تلخی پر شیرینی کو، سختی پر نرمی کو اور کھردرے پن پر سبکی و ملائمت کو فضیلت ہوتی ہے۔ نسوانی اظہار کے لہجے کا یہی سریلا پن کا ہوتا ہے۔ گیتوں میں یہی سریلا پن موسیقیت کے عنصر کے نام سے مشہور ہے۔ موسیقیت کے دو قسم کے عناصر ہوتے ہیں۔ داخلی اور خارجی عناصر داخلی عناصر میں جذبے کا آہنگ۔ لحن کی موسیقی۔ لہجے کا لوچ اور ایک ایسی لے شامل ہے جو اگرچہ باقاعدہ اوزان و بحور کی تابع نہیں ہوتی لیکن ان سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ خارجی عنصر میں موسیقی کے راگ راگنیوں کی دھنیں۔ دوہت وِلمبت اور مدھیا لے۔ بلند آوازوں کی نغمگی اور بحر و قوافی کا آہنگ شامل ہے۔ لوک گیتوں کو خارجی عناصر سے زیادہ سروکار نہیں ہوتا، ان کا انحصار داخلی عناصر پر ہوتا ہے۔ داخلی عناصر نسوانی اظہار کی وہ خصوصیت ہے، جس کو لہجے کا لوچ اور گلے کے سروں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گیتوں نے موسیقیت کی خارجی اور داخلی دونوں قسم کے عناصر سے فیض اٹھایا ہے، اس لیے گیتوں کی زبان میں حروف کی نغمگی لفظوں اور مصرعوں کی موسیقیت داخلی آہنگ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ گیتوں کی زبان میں آواز کی اشاریت اور لہجے کے زیر و بم بنیادی خیال کی ترسیل اور جذبے کی تجسیم کرتے ہیں، اس لیے گیتوں کی زبان میں نرمی۔ گھلاوٹ۔ رسیلا پن۔ رعنائی۔ تازگی اور شادابی ہوتی ہے اور ان سے ترنم کی کرنیں پھوٹتی ہیں، اور گیتوں کی زبان رس رنگ اور نغمے کا آبشار ہو جاتی ہے۔

لوک گیتوں کے موضوعات زندگی کی طرح وسیع ہیں، اگرچہ یہ موضوعات عورت کے نقطۂ نظر یا کم سے کم نسوانی تناظر PERSPECTIVE میں پیش کیے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں گیتوں کے موضوعات پر بھی نسوانیت کی مہر ہوتی ہے، اس لیے مہد سے لحد تک ہر موضوع گیتوں کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔ بچے کی پیدائش کے گیت۔ شادی بیاہ کے گیت۔ جنیو کے گیت۔ ختنے کے گیت۔ چکی کے گیت۔ چرخے کے گیت۔ ساون

گیت (ساون کے مہینے میں جھولے کے گیت) بجاریاں کے گیت - اریاں - جھگڑے (پوربی اضلاع میں مردوں کے گیت) وبرہا تھا اور غزالی گیت وغیرا سیکڑوں قسم کے گیت ہوتے ہیں - گیتوں کے موضوعات کے تکثر اور تنوع نے ان کی زبان کے دائرے کو کافی وسیع کر دیا ہے - یہ دائرا اتنا وسیع ہے کہ اس میں ہر جذبے اور ہر رنگ کے لیے موزوں ترین لفظ موجود ہے، چونکہ گیتوں کے موضوعات صنف نازک کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں، اس لیے ان میں صنف نازک کے جذبات اور اس کی مخصوص زبان کی زیادا خصوصیات ہوتی ہیں۔ جب ہم اس پس منظر میں ہندستانی گیتوں کی زبان کا مطالعا کرتے ہیں تو ان کے کثیر حصے میں گیتوں کی زبان کی بیشتر خصوصیات کا فقدان نظر آتا ہے - اس کی دو وجوہ ہیں، ایک فارسیت کا رجحان اور دوسرا ہندستانی سے غیر ٹکسالی عناصر کو پاک کرنے کا رجحان - یہ دونوں رجحان ایک دوسرے کا لازمی نتیجا ہیں - فارسیت کے رجحان نے ہندی الفاظ اسالیب اور روایات پر فارسی الفاظ اسالیب اور اصناف کو ترجیح دی، ہندستانی سے غیر ٹکسالی عناصر کو پاک کرنے کے رجحان نے شاعری سے ہندستانیت کے بعض مفید عناصر کو نکال دیا - انہیں دونوں رجحانوں کی زد میں لوک گیتوں کا عظیم سرمایا بھی آ گیا، اور ہندستانی شاعروں نے اس کی طرف سے آنکھ بند کر لی - اس میں شک نہیں کہ لوک گیتوں کا بیشتر سرمایا منظر عام پر نہیں آیا لیکن جتنا آ چکا ہے اس سے استفادا نہیں کیا گیا۔ ہندستانی شاعر لوک گیتوں کے بار آزمودا رستے لیے اور موسیقیت میں ڈوبے ہوئے لفظوں سے محروم رہے، جن سے گیتوں کی عظیم روایت وابستا ہے۔ ہندستانی شاعر بول چال کی زبان پر شاعری کی روایتی زبان کو ترجیح دے کر ترسیلی خصوصیات سے دست بردار ہو گئے۔ زبان کی ترسیلی خصوصیات تخلیقی خصوصیات میں تحلیل ہو کر گیتوں میں وہ حسن پیدا کرتی ہیں جس کو سحر حلال کہا جا سکتا ہے - جین شاعروں نے شعری زبان سے انحراف کر کے زبان کی سادگی کی طرف توجہ کی ہے وہ بھی تصیح ہی - سادا ترین نیز نرم الفاظ کے روایتی انتخاب کا شکار ہو گئے ہیں - ایسے الفاظ شعری زبان کے نسبتاً ہلکے اور نرم عناصر پر مشتمل ہیں - ان میں بول چال کی زبان کی خصوصیات بہت کم ہیں - بول چال کی زبان کے ساتھ ایک ستم یہ بھی ہوا کہ اس کو سوقیوں کی زبان قرار دے کر اور اس سے اچھوت کی طرح برتاو کیا گیا اس کا لازمی نتیجا یہ نکلا کہ ہندستانی گیتوں میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو بول چال کی زبان میں گیت لکھنے سے پیدا ہوتی ہے - مثلاً

آنچل جو ڈھلکتا ہے آنچل کو ڈھلکنے دو
بے شور سلاسل جب گلشن میں بہار آئے
برسوں کا شناسا جب ملتے ہوئے کترائے
ہر شیشۂ دل چمن سے جب توڑ دیا جائے
تب دل سے دھواں بن کر آہوں کو نکلنے دو
(زبیر رضوی)

رات دن سلسلۂ عمر رواں کی کڑیاں
کل جہاں مدح محفل جاتی تھی
اپنے سائے سے بھاگ آتی تھی
آج اس دشت پہ ساون کی گھٹا گھر آئی
ہر طرف سلسلۂ عمر رواں کی کڑیاں
(احمد ندیم قاسمی)

ان دونوں ٹکڑوں میں شور سلاسل - شناسا شیشۂ دل - سلسلے عمر رواں - مدحت اعداشت وغیرا الفاظ گیت کی زبان کے عناصر نہیں ہیں، اس لیے ان میں زبان کی حد تک گیت پن سے زیادا نظمیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے ہندستانی شاعری اپنے ابتدائی دور میں ہندی اور فارسی روایات کا گہوارا تھی، لیکن

جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ بعض اثرات اور رجحانات کے تحت ہندی سے دور اور فارسی سے قریب ہوتی گئی۔ اس دور قبول میں ہندستانی شاعری کو فارسیت کے بعض مثبت عناصر حاصل ہو گئے، مگر ہندستانیت کے بعض زندہ عناصر سے محروم ہو گئی۔ یہ زندہ عناصر دو قسم کے ہیں۔ ہندی الفاظ و اصناف اور ہندی شاعری کی بعض روایات مثلاً عورت کی طرف سے اظہار عشق اور بارہ ماسہ کی روایات وغیرہ۔ یہ ٹھیک ہے ہندستانی شاعری میں یہ دونوں چیزیں بھی موجود ہیں، مگر اتنی کم کہ انہیں ہندستانی شاعری کی واضح خصوصیات یا نمایاں رجحان قرار نہیں دیا جاسکتا، اگرچہ ہندستانی اور ہندی دونوں کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں، مگر دونوں میں کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات کے تناسب میں فرق ہے۔ یہ خصوصیت ہندستانی میں زیادہ اور ہندی میں کم ہیں۔ کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات میں ٹھیٹھ پن۔ منفرد صوت۔ بلند بانگ الفاظ اور نکھار، نیز کھرا لب و لہجہ شامل ہے۔ ہندستانی نے ان خصوصیات میں فارسی شعر و زبان کی نفاست اور دلکشی کا اضافہ کیا، مگر ہندستانی میں کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات اور مردانہ پن بڑی حد تک باقی رہا۔ ہندی نے کھڑی بولی کی بنیادی خصوصیات میں سنسکرت کی نفاست اور دیسی بولیوں مثلاً اودھی۔ برج۔ قنوجی۔ بندیلی وغیرہ کے نسائی عناصر اور الفاظ کو سمو لیا، اور اس کے لب و لہجے کے ٹھیٹھ پن اور تیزی SHARPNESS کو بڑی حد تک کم کر لیا، جس سے اس میں نسوانی اظہار کی خصوصیت پیدا ہو گئی۔ ہندستانی نے ہندی الفاظ اور اسالیب سے کنارہ کشی کر کے نہ صرف ہندی، بلکہ اس کے توسل سے آنے والے دوسری بولیوں کے ایسے ذخیرے الفاظ اور ہندی کے مثبت عناصر سے ہاتھ دھو لیا جو گیتوں کی تخلیق کی ضمانت ہو سکتے تھے۔

مجھے اپنی اس رائے کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ ہندستانی سے زیادہ ہندی میں اور ہندی سے زیادہ اودھی میں گیتوں کی زبان بننے کی صلاحیت ہے۔ ہندی شاعری کی دوسری روایت یعنی عورت کی طرف سے اظہار عشق اور بارہ ماسہ وغیرہ سے اجتناب کی وجہ سے ہندستانی میں گیتوں کی روایت کے فروغ کو نقصان پہنچا۔ گیت نسوانیت کا شعری اظہار ہے جس میں عورتوں کے جذبات خصوصاً عشقیہ جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس حیثیت کو عورت کی طرف سے اظہار محبت کی روایت سے جو فروغ مل سکتا تھا وہ اس کے فقدان سے نہیں مل سکا، یہی حال بارہ ماسہ کا ہے۔ بارہ ماسہ میں عورت موسموں کی کیفیات کے لحاظ سے اپنے پریمی یا شوہر کو یاد کرتی ہے۔ یہ انداز بھی گیتوں کے مزاج کے عین مطابق ہے، مگر اردو شاعروں نے بارہ ماسوں کی تخلیق سے اجتناب کر کے دہرا نقصان اٹھایا۔ ایک یہ کہ بارہ ماسہ جیسی دلکش طرز اظہار سے ہاتھ دھویا، دوسرے یہ کہ اسکی کے معنوی اثرات سے گیتوں کی روایت کو جو ترقی مل سکتی تھی وہ بھی نہیں ملی، اور موسم و ہجور کے باہمی ربط کے بیان سے جو جمالیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے بھی ہندستانی شاعری خصوصاً گیتوں کو محروم کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ مجموعی طور پر گیتوں کی زبان اپنے معیار کو نہیں چھو سکی، اور اس میں وہ تخلیقی شان اور رچاؤ پیدا نہیں ہوا جو گیتوں کی زبان کا جوہر ہے، لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ ہندستانی گیتوں کی زبان قطعاً مصنوعی اور غیر تخلیقی ہے یا اس میں گیت کی زبان کے زندہ عناصر ناپید ہیں۔ عناصر کمیاب سہی، مگر نایاب نہیں۔ گیتوں کی زبان کی خصوصیات کے نقطۂ نظر سے ہندستانی گیتوں میں زبان کے تین رجحان خاص طور پر نظر آتے ہیں یعنی (۱) ہندستانی کی کھڑی بولی

ہندستانی - ہندی ملی جلی زبان کا رجحان (۳) لوک گیتوں - اودھی ہندی اور بول چال کی زبان کا استعمال - ان تینوں رجحانوں میں پہلے دو رجحان حاوی ہیں - تیسرا کسی قدر کمزور اور جدید ہے - اصل میں یہ تینوں رجحان تاریخی تسلسل کے اعتبار سے ایک دوسرے کا لازمی اور فطری نتیجہ ہیں - ہندستانی زبان میں فارسی اصناف اور اسالیب کی تکمیل ۱۸۵۷ء تک مکمل ہو چکی تھی - اس کے رد عمل نے مغربی تہذیب و تعلیم کے اثرات مل کر ہندستانی میں ہندی اصناف اور اسالیب کا رجحان پیدا کیا، چونکہ ہندستانی زبان میں فارسیت کا غلبہ ہو چکا تھا، اور ہندستانی سے غیر ٹکسالی عناصر کو پاک کرنے کی مہم بھی کامیاب ہو چکی تھی، اس لیے اپنے ابتدائی دور میں گیت بھی ہندستانی کی ٹکسالی زبان میں لکھے گئے۔

اس رجحان کی بھی دو شکلیں نظر آتی ہیں - ایک فارسی الفاظ و تراکیب کا رجحان اور دوسرا سیدھا سادا اور سلیس ہندستانی الفاظ کا استعمال - یہ رجحان عظمت اللہ خان - حفیظ جالندھری سے شروع ہو کر تا حال نظر آتا ہے -

جاگ سوز عشق جاگ
آتشِ شباب - جاگ خواب ناز سے
دل شکستہ ہے رباب - عرصۂ دراز سے
گئے قدیم راگ
جاگ - سوز عشق جاگ -

(حفیظ جالندھری)

اس گیت میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی کثرت ہے، اور روایتی شاعرانہ زبان کی بھرمار ہو گئی ہے - "آتشِ شباب" "خواب ناز" "دل شکستہ رباب" "عرصۂ دراز" اور "سوز عشق" جیسی ترکیبیں اپنی جگہ پر بہت پر آہنگ ہیں مگر یہ زبان اور آہنگ گیتوں کی بنیادی زبان کا آہنگ نہیں، لیکن [illegible]

ہم آہنگ ہے، اسی لیے اس میں تخلیقی فن کی جھلک اور غنائیت کا حسن دونوں عنصر موجود ہیں، اور یہ گیت -

یاد کی لہروں پر تم آؤ
سوچ میں آنکھ ہے سوچ میں ہے من
من کی موج بنے جب الجھن
اس دم ان آنکھوں میں چھپ کر
تم آنسو بن کر شرماؤ
یاد کی لہروں پر تم آؤ
یاد کی لہروں پر تم آؤ
جب یہ دل حیران پڑا ہو
گم سم اور سنسان پڑا ہو
ادھروں پر ہنسی کو دھر کر
ایک چلتی تان اڑاؤ
یاد کی لہروں پر تم آؤ

(ڈاکٹر مسعود حسین خان)

اس گیت میں سوچ - من - الجھن - حیران - شرماؤ آنکھ وغیرہ الفاظ سادہ اور لوچدار انداز رکھتے ہیں، جن میں ہندی کے دو لفظ "ادھروں" (ہونٹوں) اور "دھر" اجنبی معلوم ہوتے ہیں - اصل میں اس گیت کی زبان بنیادی طور پر اردو کی ٹکسالی زبان کا کسی قدر سادہ اور صاف روپ ہے، اور گیت کی زبان سے بہت قریب ہے -

ہندستانی اور ہندی کی ملی جلی زبان کا رجحان بھی کافی نمایاں ہے - یہ عظمت اللہ خان - اختر شیرانی تاثیر - میرا جی - مقبول حسین احمد پوری - وقار انبالوی - تیاگے شرما - اندر جیت شرما - قیوم نظر - جمیل الدین عالی وغیرہ سے ہوتا ہوا حال کے نئے شاعروں کے گیتوں تک مسلسل نظر آتا ہے - اس رجحان کے بھی دو رنگ نمایاں ہیں، ایک میں ہندستانی الفاظ کی زیادتی اور دوسرے میں ہندی الفاظ کی بہتات ہے، یہ گیت بعنوان "آج کی رات"

پریتم رہ جا آج کی رات
آج کی رات جیارا دھڑکے آج کی رات انکھیاں برسیں
چھوڑ دی ہوں ات - پریتم رہ جا آج کی رات -

بجلی کڑکے بادل برسے - آج کی رات نکل نہیں گھر سے
آج بھی برسات - پریتم رہ جا آج کی رات
آج کی رات جیا گھبرائے - آج کی رات گئی کب آئے
سن جا من کی بات - پریتم سن جا من کی بات
(وقار انبالوی)

اور اب یہ گیت پڑھیے -

سرکا گیان کہاں سے پاؤں - کھو گئے میرے راگ
جس مورت کا نام پکاروں - سہتے من کو لاگ
سرکا گیان کہاں سے پاؤں - کھو گئے میرے راگ
پڑ جاتے سرگیان کے پڑدے اپنے آپ کو پاؤں
اپنے آپ کو پاؤں تو سنگیت کا مان گھٹاؤں
یہ کیسا بیراگ
سرکا گیان کہاں سے پاؤں کھو گئے میرے راگ
رات کا جنگل - ریت کا سندر بن باتی کا دیپ
بن لہروں کا ساگر جیون بن موتی کا سیپ
بن جوتی کی آگ
سرکا گیان کہاں سے پاؤں کھو گئے میرے راگ
(شہاب جعفری)

پہلے گیت میں پریتم جیارا - انکھیاں - جیا اور من اور دوسرے گیت میں - سر - گیان - مورت پکاری - پرجا سنگیت - بیراگ - سندر - دیپ ساگر جیون وغیرہ الفاظ ہندی کے ہیں - پہلے میں ہندی الفاظ کم اور ہندستانی الفاظ زیادہ ہیں، جبکہ دوسرے میں اس کے برعکس ہندی الفاظ کا پلا بھاری ہے، دونوں قسم کے الفاظ دونوں گیتوں میں شیر و شکر ہیں، یہ زبان گیتوں کی زبان سے قریب ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے -

تیسرا رجحان ہندی اور لوک گیتوں کی زبان کو اپنانے کا رجحان ہے - اس طرح کے گیت کمیاب ہیں، مگر نایاب نہیں - اس رجحان کو ۱۹۵۷ء کے بعد فروغ ملا - جمیل الدین عالی - شکیل بدایونی - قتیل شفائی - شہاب جعفری - ندا فاضلی اور دوسرے بہت سے ملی اور غیر فلمی شاعروں کے یہاں ایسی زبان نظر آتی ہے - یہ گیت

دیپ جلے بن باتی راما
نیا تو نیند کی باتی راما

دیپ جلے بن باتی راما
کو میرو من کا بسیا راما - کو میرو جانی رام
سدھ بسرائی بوجھو نہ پاتی میں دکھ پاتی رام
بیت گنوائی رام
لکھ بجھ پھاڑوں پاتی راما
دیپ جلے بن باتی (شہاب جعفری)

یہ اس رجحان کی ابتدائی شکل ہے - اس میں تمام الفاظ ہندی زبان کے ہیں یا ہندی تلفظ میں نظم ہوے ہیں - اس کی زبان پر کسی حد تک دیہات کی ٹھیٹ زبان کا اثر بھی ہے - اس گیت کی زبان میں گیت کی زبان کی کئی خصوصیات مجتمع ہو گئی ہیں جن سے اس میں گیت کی فضا کی خنک تابی اور آہنگ کی نرمی پیدا ہو گئی ہے، اور یہ گیت -

موہے بھول گئے سانوریا بھول گئے سانوریا
اون کہہ گئے اجہوں نہ آئے لینی نہ موری کھبریا
موہے بھول گئے سانوریا
دل کو دئے کیوں دکھ برہا کے - توڑ دیا کیوں محل بنا کے
آس دلا کے او بے دردی پھیری کاہے نجریا
موہے بھول گئے سانوریا
نین کہیں رو رو کے سجنا - دیکھ چکے ہم پیار کا سپنا
پریت ہے جھوٹی پریتم جھوٹا - جھوٹی ہے ساری نگریا
موہے بھول گئے سانوریا
(شکیل بدایونی)

اس گیت میں نظرے نجریا - خبر سے کھبریا اور نگر سے نگریا کی طرف مراجعت نے بول چال اور ٹھیٹ زبان کی خصوصیات پیدا کی ہیں، علاوہ دوسرے الفاظ بھی ہندی اور بول چال کی زبان کے ہیں - اس طرح اس گیت میں لوک گیتوں کی زبان سے مشابہت پیدا ہو گئی ہے یہی مشابہت اس میں گیت کی زبان کی خصوصیات پیدا کرتی ہے -

جدید تر گیتوں میں گیت کی زبان کے بیشتر عناصر نظر آنے لگے ہیں جس سے ایک طرف ہندستانی شاعری کو نیا ذخیرہ الفاظ مل رہا ہے، اور دوسری طرف گیت زبان کے نقطۂ نظر سے اپنے معیار کی طرف بڑھ رہا ہے جس سے امید کی جاتی ہے کہ گیت بہت جلد ہندستانی شاعری کی مقبول اور ممتاز ہیئت سمجھی جانے لگے گی -

مہر محمد خان شہاب

پچھلے پہر

جاں نثار اختر ہماری زبان کے مشہور و معروف چوٹی کے شاعر و ادیب ہیں۔ "پچھلے پہر" آپ ہی کے تازہ کلام کا ۹۵ صفحے کا گلدستہ ہے، جس میں آپ کی ۲۳ غزلیں حسن کتابت اور زیبائش طباعت سے جگمگا رہی ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی غزل دو شعروں یا چار مصرعوں کی ہے اور بڑی سے بڑی غزل ۱۲ شعروں یا ۲۴ مصرعوں کی وسعتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، اور ہر مصرع چاہے چار یا پانچ ہی لفظ کا ہو، اسے ایک سطر دی گئی ہے۔ ترتیب کلام میں کوئی عام اصول مدنظر نہیں رکھا گیا، اس لیے اگر کسی شعر یا غزل کی "تلاش" ہو تو پوری کتاب کی ورق گردانی ضروری ہے۔ اسی طرح کتاب کے نام "پچھلے پہر" کی حکمت اس کے سوا اور کوئی خیال میں نہیں آتی کہ اختر نے بھی امیر خسرو کی طرح اپنے کلام کی عمروں کے تین چار دور مقرر کر دیے ہیں، اور شاید [illegible] کے کلام کو "پچھلے پہر" سے موسوم کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور مصلحت ہو تو [illegible] جانتے ہوں گے۔

[illegible] سے شروع کی گئی ہے۔ کتاب [illegible] ایک ہے، اور اول [illegible] سے [illegible] باہر [illegible]

کتاب کا ہر صفحہ گویا آب دار موتیوں کی چھوٹی بڑی لڑیوں سے آراستگی کی وجہ سے طابع و ناشر کے حسن ذوق اور نفاست مزاج کا غماز ہے۔ کتاب کے ۹۵ صفحوں میں تین فاضل پروفیسروں کی ۱۴ صفحوں کی تقریظیں بھی داخل ہیں۔ پہلی تقریظ پروفیسر آل احمد سرور کی ہے۔ دوسری پروفیسر محمد حسن کی اور تیسری ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی۔ تینوں فاضل پروفیسروں نے اپنے نقطۂ نظر سے جاں نثار کے فن اور ان کی مہارت فن کو سراہا ہے۔ میرا ناقص [illegible] ہے یہ تینوں تقریظیں، اگر کتاب کے تعارف کے طور پر شامل کتاب کیے جانے کے بجائے الگ سے شائع ہوتیں تو بہت مناسب ہوتا، اس لیے کہ ایسی تقریظیں غیر معروف انجانے فنکاروں کے لیے سند کا کام دے سکتی ہیں، اور جاں نثار اختر اپنے علم و فضل اور کمال فن کے لحاظ سے بہت بلند ہیں۔ ان کے کلام کے لیے سند کی تلاش [illegible]۔

جاں نثار اختر ایک باکمال شاعر ہونے کے [illegible] مشہور ہیں، بلکہ اپنے علمی [illegible] کے لحاظ سے [illegible] ادبی دنیا کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ [illegible] ذاتی [illegible] کے علاوہ [illegible] [illegible]

قیام رہتے تھے کراچی میں مجسٹریٹ تھے۔ ان کے متعلق
مشہور ہے کہ شعر کہتے ہیں ان کی شعر گوئی کا یہ عالم تھا
کہ مطالعے کی اکثر کے بیان سنتے جاتے اور نظم
کی صورت میں انہیں قلم بند کرتے چلے جاتے۔ حضرت
مکرم کا قیام تھا سن [illegible] مکان [illegible] مشرق کے
آپ [illegible] مولانا [illegible]
[illegible] مولانا عبد الحق رحمۃ اللہ
پر [illegible] غالب [illegible]
[illegible] نظر آتے انہیں [illegible] کتاب
ہے ایک [illegible] ہے

علی پہ [illegible] بار بار انہیں
[illegible] کیا کون ہیں

[illegible] کمال کے ساتھ بہت سے اہل کمال
[illegible] مسلم یونی ورسٹی کی طالب علمی
کے زمانے میں اختر [illegible] کے مشہور فاضل
مولانا سید سلیمان اشرف [illegible]
[illegible] اور ان کو معلوم ہوا کہ اختر کون
ہیں تو [illegible] کر دے اور [illegible]

میں نے اختر کے کلام دیکھے اور ان سے
لطف لیا اور [illegible] خیال کیا ہے۔ اس
کتاب کے [illegible] میں آپ سے [illegible]
چاہتا ہوں کہ مختصر لفظوں میں اپنے تاثرات کتاب
کے [illegible] آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔
[illegible] اختر کا کلام پڑھتے ہوئے پڑھنے والے
[illegible] حقیقت آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ
[illegible] کے مقابلے میں خالص اردو یا
[illegible] ہندستانی [illegible] آپ کے کلام میں
[illegible] فارسی [illegible] آتے [illegible]
[illegible]
[illegible] استادوں سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہندستانی
[illegible]
[illegible]

مطلق ادب سے اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کو [illegible]
[illegible] ترجیح دیتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اختر خیالات کی [illegible]
[illegible] زندگی کے
[illegible] دنیا کو
کو دلکش [illegible] بیان سے پیش کرتے ہیں
چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اختر کا [illegible]
[illegible] ہوتا ہے۔ اختر
[illegible] بات، [illegible]
[illegible] ہے وہ [illegible]
[illegible] کرتے ہیں۔ لیکن [illegible] عام طور پر
[illegible] COMRADE [illegible]
[illegible] اس کی بجائے اختر نے
[illegible] بات یہ ہے کہ سب کو
معلوم ہے کہ فارسی میں [illegible] ہندستانی [illegible]
میں تذکیر و تانیث کی تمیز نہیں۔ ہمارے ہندستانی غزل گویوں
نے فارسی غزل گویوں کی تقلید کی۔ میں ہندستانی کے قدیم و
جدید شعرائے غزل میں اختر کو پہلا شاعر خیال کرتا ہوں جس
نے اپنی غزل میں محبوب کو [illegible] ظاہر کیا ہے اور [illegible]
کر [illegible] کہہ کر خطاب کیا ہے۔ مثلاً

[illegible]
[illegible]

اور دوسری جگہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] سیاست [illegible] آخر کو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
سے احساس ہے

کوئی آسودہ نہیں اہلِ سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر ہے

[illegible] اہلِ سیاست [illegible]
[illegible] سیاست [illegible]
[illegible] سیاست [illegible] سیاست [illegible]
[illegible] سب اس میں آجاتی ہیں - آخر
کا تجربہ [illegible] ہے

زندگی تنہا سفر کی رات ہے
اپنے اپنے حوصلے کی بات ہے
کس عقیدے کی دہائی دیجیے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

اس میں بات [illegible] آخر نے
ایک [illegible] بیان کیا ہے
[illegible] سیاست پر [illegible]
[illegible]

[illegible] دنیائے سیاست ہو کہ دنیائے ادب ہو
[illegible] رہے ہیں
[illegible]
[illegible] ایک بات ہے [illegible]
[illegible]
[illegible] کا پیغام ہے

شہر آشوب [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] سیاست [illegible]
[illegible]

[illegible]

اور اختر کہتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں ایک لغزش
اکثر پچھے عالم کا دھارا بدل دیا کرتی ہے ؂

اے بےخبر ملک کو یک لغزش پا سے بھی کبھی
ساری تاریخ کی رفتار پلٹ جاتی ہے

اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں نے حضرت اختر ہی
سے ایک بار برسبیل تذکرہ پوچھا تھا کہ فلمی شاعری
کا ہمارے شاعروں پر کیا اثر پڑا ہے۔ مجھے خیال ہے کہ انہوں
نے جواب نہیں دیا تھا۔ " برا عالم شاید اسی احساس
نے ان سے یہ شعر کہلوایا ہے ؂

کیا پتا ہو بھی سکے اس کی تلافی کہ نہیں
شاعری تم کو گنوایا ہے بہت دن ہم نے

اور شاعری کو گنوا کر کیا پایا ہے ؂

اور مجھ کو ملا کیا مری محنت کا صلہ
چند سکے ہیں مرے ہاتھ میں چھالوں کی طرح

غزلوں کی ترتیب میں قدیم اصول ترتیب کو نظر انداز کر دیا
گیا ہے، نہ غزل کہنے کی تاریخ ہے نہ ابجد کا لحاظ
کسی شعر یا غزل کو تلاش کرنے کے لیے پوری کتاب کی
ورق گردانی کی جائے تو مطلب ہاتھ آتا ہے۔
یوں تو ساری کتاب بہترین اشعار سے بھری ہوئی ہے،
لیکن پڑھتے وقت خصوصیت سے جو شعر پسند آئے ان میں
سے کچھ ناظرین کی خدمت میں حاضر ہیں ؂

فرصت کار فقط چار گھڑی ہے یارو
یہ نہ سوچو کہ ابھی عمر پڑی ہے یارو

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے

ہم نے انسان کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

دل کو چھو جاتی ہے یوں رات کی آواز کبھی
چونک اٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا ہی نہ ہو

[illegible] قدر کرو اے سخن کے متوالو
غزل کو [illegible] نہ ملیں گے [illegible] ہم سے

[illegible] کی ملن کو [illegible]
[illegible] کو دیکھ لیں

[illegible] شاعری کے اعتراف اور ترقی پسند [illegible]
[illegible] انعام ملا ہے ؂

ہر غلطی سے فن کو چھڑاتے چلے ہیں ہم
وہ [illegible] گئی وہ چیخ [illegible] گیا

شعر کی حقیقت ؂

وہ میر کی غزل ہو کہ غالب کی شاعری
نغمے تمام ساز رگ جاں سے آئے ہیں

اشکوں کا پیار مجھ سے سنبھالا نہ جائے گا
[illegible] پیارے ذرے نگاہوں میں

کھو گیا آج کہاں رزق کا دینے والا
کوئی روٹی جو کھڑا مانگ رہا ہے مجھ سے

پیٹ پہ پتھر باندھ نہ لے ہاتھ میں سجے ہیں پتھر
دشمن سے عشق غریبی سے پیراہن سے پیار

سبھی نے اوڑھ رکھے ہیں نقاب جتنے ہیں
سمجھ سکے تو سمجھ زندگی کی الجھن کو
سوال اتنے نہیں ہیں جواب جتنے ہیں

ہر چند نیا ذہن دیا ہم نے غزل کو
پر آج بھی دل پاس روایات کرے ہے

یہ ٹھیک ہے ستاروں پر گھوم آئے ہیں
مگر کسے ہے سلیقہ زمیں پہ چلنے کا

میں سوچتا تھا وطن جا کے پڑ رہوں گا کبھی
مگر فساد میں وہ گھر بھی جل گیا ہے میاں

عمر بھر قتل ہوا ہوں میں تمہاری خاطر
آخری وقت تو سولی نہ چڑھاؤ یارو

یہ ایک ہے زمیں تو سمت کیا حدود کیا
روشنی جہاں بھی ہو روشنی کا ساتھ دو

سوچتا تھا جو پیاس بجھے زہر ہی پی لیں
پر زہر ملے تب تو کوئی زہر پیے گا

[illegible] آتا نہیں [illegible]
[illegible] اتنا ہے کہ زنجیر [illegible]

یہ دور کس طرح سے کٹے گا [illegible]
یارو! [illegible]

[illegible]
[illegible]

ہر ایک سمت سے اک آفتاب ابھرے گا
چراغ دیر و حرم تو بجھا کے [illegible]

[illegible]

بڑے آدمیوں کے خطوط ایڈیٹر ہندستانی ادب کے نام

ایڈیٹروں کے خطوط

افقر موہانی وارثی، ایڈیٹر "جام جہاں نما" لکھنؤ

(دو خط)

(۱) ۱۱ لاٹ کلن - لکھنؤ - ۲۶ - ۸ - ۱۹۶۶ء

عزیز محترم خان صاحب دعا و سلام - اپریل تا جون کا شمارہ موصول ہوا - بیحد شکریہ - اللہ آپ کی مساعی کو ہمیشہ اسی طرح کامیاب فرماتا رہے - دل سے یہی دعا نکلتی ہے - خدا کرے حالات ہوں اور آپ بخیریت - میری سالگرہ ہو گئی کاش افقر نمبر کے دیرینہ مضامین جو آپ نے فراہم کئے آپ زحمت گوارا فرما کر بھیجدیے تو حال کے مضامین کے ساتھ وہ بھی کتابی صورت میں شایع ہو جائے توجہ فرمائی جائے منتظر رہونگا - مجھے خیال ہے کافی تعداد میں آپ نے مسالا و مسودات افقر نمبر کے جمع کر لیے تھے، مگر دل سے ناکامی کہ وہ نمبر نہ شایع ہوسکا - تاہم اسکے اگر وہ مسودات مل جائیں تو ضرور بھیجدیجیے گا - کام ہی آجائیں گے اور سب خیریت ہے - خیریت نامے کا پھر انتظار رہے گا - والسلام - دعاگو ناچیز افقر موہانی وارثی

(۲) ۱۲ - وٹ کلن - لکھنؤ - ۱۳ - ۷ - ۱۹۶۶ء - عزیزم خان صاحب دعا و سلام -

آپ کا عنایت نامہ آیا - بڑا اور افسوس کے ساتھ دل کو مسوس کر رہ گیا - آپ اور آپ کے بچے کے آزار دو نظام پر بجز اشک بہانے کے کر ہی کیا سکتا ہوں - خدا رحم فرمائے اور ایک مرتبہ پھر آپ کو تبادلہ منظور سے یہی اپنی دعا ہے - اپنی حالت کیا عرض کروں - وقت کا انتظار کر رہا ہوں آپ کا [illegible] "جتنی نظر تھی صرف ہوئی انتظار میں" جو کچھ حالات [illegible] ہے [illegible] شعر

[illegible] آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

[illegible] اٹھا بیٹھا بھی نہیں جا رہا ہے - افسوس [illegible] ہے جو ۳۱ جولائی کی شب [illegible] جلسے کی صورت میں منائی جائے گی - تقریریں [illegible] انشاء اللہ [illegible] باہر کے لوگوں کے مہمانات [illegible]

خدا جانے دنیا اور اہلِ دنیا مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ خدا آپ کے حال پر کرم فرمائے۔ والسلام
دعا گو ناچیز اصغر مہدوی داریؔ صفی ...

ایڈیٹر "بانو" نئی دلی

(دو خط)

(۱) مکرمی تسلیم۔ "بانو" کا سالنامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا گیا تھا۔ براہ کرم اس پر اپنے قیمتی کلمات میں تبصرہ فرمائیں اور اس کی ایک کٹنگ ہمیں ارسال فرما دیں تاکہ اسے "بانو" کی آئندہ اشاعت میں آپ کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جا سکے۔ مخلص ادریس مدیر

(۲) محترمی تسلیم و نیاز ـ
گرامی نامہ ملا ـ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ "بانو" "ہندستانی ادب" کے تبادلے میں پابندی سے ارسال [illegible] کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جولائی کا شمارہ ۳۰ جون کو روانہ کیا جا چکا ہے۔ اور اسی ایڈریس پر بھیجا جا رہا ہے جو آپ نے دفتر اول نوٹ کرایا تھا۔ مہربانی فرما کر اپنے مقامی پوسٹ آفس میں دریافت کریں۔ نیاز مند اطہر ـ ۱۲ ـ ۴ ـ ۷۲ء

ایڈیٹر "شان ہند" دلی

(دو خط)

(۱) مکرمی زاد عنایتہ ـ ۱۵ ـ ۱۲ ـ ۱۹۷۰ء
تسلیم۔ "شان ہند" کا دفتر اب اپنے ذاتی فلیٹ ۵ ـ انصاری مارکیٹ دریا گنج ـ میں منتقل ہو گیا ہے لیکن اب کاروبار ہیں پہ کیا جا رہا ہے۔ صرف شان ہند پرنٹنگ پریس دہلی ۶ میں چھپتا ہے۔ براہ کرم "ہندستانی ادب" اب آپ نئے پتے پر بھجوایا کیجئے۔ نہ معلوم آپ نے اپنا معزز رسالہ تبادلے شان ہند میں بھجوانا بند کیوں کر دیا ہے۔ ایڈیٹر واپسی ڈاک تازہ شمارہ بھجوا کر ممنون احسان فرمائیے۔ شان ہند کا تازہ شمارہ پریس سے آتے ہی روانہ خدمت کر دوں گا۔ امید ہے کہ [illegible] فرمائیں، اور خط کا جواب جلد از جلد دیجئے۔ نیاز مند سرور زنسوی ایڈیٹر شان ہند

(۲) ۲۸ ـ ۱ ـ ۷۳ء ـ محترم زاد عنایتہ ـ تسلیم
گرامی نامہ ملا کہ کیا تھا جواب میں دیری ہوئی معافی چاہتا ہوں، کیونکہ شان ہند کے [illegible] [illegible] خدا خدا کر کے ۲۲ جنوری کو شان ہند کے پانچ شمارے روانہ خدمت [illegible] کر دئیے گئے۔ رسید سے جلد اطلاع دیں۔ اب شان ہند ہر ماہ [illegible] [illegible] ہے۔ آپ کا رسالہ ہندستانی ادب کا رازدار [illegible] [illegible] [illegible] تبصرہ کروں گا۔ اسے پڑھ رہا ہوں ـ پڑھنے کے بعد تبصرہ کروں گا۔ آپ [illegible] [illegible] [illegible] بیان کر دیا جائے۔
[illegible] یاد فرماتے رہا کریں۔
نیاز مند
سرور زنسوی ایڈیٹر

ایڈیٹر "مصیبی پنچ" علی گڑھ

(دو خط)

(۱) ۲۹ / ۳ / ۱۹۴۲ء - مکرمی تسلیم - امید ہے مزاج بخیر ہو گے ا عنایت نامہ وصول ہوا شکریہ - کہ فرماتیں آپ کا پرچہ ہمیں موصول ہوا تھا - تیاری ہے اپنا رسالہ بھی آپ کو ملتا رہے گا مطلع رہے - براہ مہربانی ہماری اشاعت میں ہمارا اشتہار شائع فرما کر ممنون فرمائیں شکر عنایت کریں [illegible] نہیں کر پھر [illegible] آپ پرچے کا مضمون نقل کر کے [illegible] کوئی صفحہ لکھا نہیں - زحمت دہی معاف فرمائیں گے - تم سے بہت ہی جلد رسالے کی فہرست میں نام و پتا اور سال خدمت کیا جائے گا - امید ہے کہ خریدار کوئی خدمت ہو تو حکم - ایڈیٹر جامعہ

(۲) محترم کرم تسلیم ! خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں ! "[illegible]" کا تازہ شمارہ ارسال خدمت کیا گیا تھا - زحمت ہے موصول ہوا ہو گا - بعد مطالعہ اپنی بیش قیمت آراء سے نوازیں - خط کے ہمراہ چھ روانہ کیا جا رہا ہے براہ کرم اردو کی خاطر اور اخباری رشتے کے مدنظر اپنے جریدے کی قریبی اشاعت میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع دیں - باہمی تعاون ہی ادب و زبان کی ترقی کا ضامن ہے - کار لائق سے نوازیں - مخلص

ایڈیٹر "زیور" پٹنہ

(دو خط)

(۱) ۱۰ / جنوری ۱۹۴۳ء - مکرمی - تسلیم - جان کر حیرت ہے کہ "زیور" کئی ماہ سے آپ کو نہیں ملا افسوس [illegible] ہر ماہ باقاعدہ آپ کے پتے پر ارسال کیا جاتا ہے [illegible] کی کرم فرمائی ہے - "ہندستانی ادب" ہمیں برابر مل رہا ہے جس کے لیے ہم آپ کے ممنون و مشکور ہیں - [illegible] کے [illegible] شمارے کے ساتھ سابقہ شمارے بھی بھجوانے کی سعی کریں گے - [illegible] [illegible] کر زیور سے کوئی چیز آپ نے اخذ کیوں نہیں کی لیکن جب [illegible] آپ کے [illegible] اظہار [illegible] کا سوال - خدا کرے آپ بعافیت - مخلص

(۲) [illegible] - تسلیمات - آپ کا نوازش نامہ ملا - شکریہ - [illegible] "زیور" تاخیر سے شائع ہوا [illegible] حالات نہ سدھرے تو شاید بند کرنا [illegible] نقصان ہو رہا ہے - اب یہ نقصان ناقابل برداشت ہو رہا ہے [illegible] جب شائع ہوا [illegible] ارسال [illegible] [illegible] نظموں سے آپ [illegible] زیادہ واقفیت رکھتے ہیں [illegible] سے شائع [illegible] [illegible] جب الحکم [illegible] شمارہ [illegible] ارسال [illegible] "[illegible] ادب" کا ایک شمارہ [illegible] [illegible] آپ کو اطلاع [illegible] [illegible] ہوں - والسلام

ایڈیٹر "آذر" بھوپال

(دو خط)

(۱) ۱۸ مارچ ۱۹۶۶ء - محترم خان صاحب - تسلیم و نیاز -

تازہ "رہنمائے تعلیم" دلی میں "ہندستانی ادب" کے سلور جوبلی نمبر پر تبصرہ دیکھکر اسے دیکھنے کے بے حد اشتیاق ہو گئی ہے - براہ کرم سلور جوبلی نمبر کی ایک کاپی سے نواز کر ممنون فرمایئے - میں "آذر" میں اس پر تبصرہ بھی کر دونگا - مجھے "ہندستانی ادب" کا کوئی پتا نہیں معلوم تھا، اسلیے "آذر" نہیں بھیجا جا سکا لیکن اب انشاء اللہ آپ کو "آذر" پابندی سے ملے گا - فی الحال دسمبر جنوری کا شمارہ ارسال خدمت کر رہا ہوں - تازہ شمارہ پریس میں ہے - آتے ہی ارسال خدمت کروں گا - امید ہے آپ بھی "ہندستانی ادب" خصوصی سلور جوبلی نمبر سے ناچیز کو محروم نہیں رکھیں گے -

ادیبوں تحریر کردوں احباب کی طرف سے سلام قبول فرمایئے - خدا کرے آپ مع الخیر ہوں -

نیاز کیفی

(۲) ۱۸ مارچ ۱۹۶۶ء - محترمی ! تسلیم و نیاز

"ہندستانی ادب" کا سلور جوبلی نمبر اور تازہ شمارہ ملا، نوازش خاص کا بہت بہت شکریہ میں انشاء اللہ سلور جوبلی نمبر پر جلد ہی تبصرہ کرنے کی کوشش کرونگا - "آذر" کا تازہ شمارہ عنقریب ارسال خدمت کرونگا - فی الحال گذشتہ شمارہ اسی خط کے ساتھ پوسٹ کر رہا ہوں - سلور جوبلی نمبر صوری لحاظ سے تو خیر کوئی خاص نہیں لیکن معنوی لحاظ سے بہت حسین ہے - تقریباً تمام تخلیقات خوبصورت و معیاری ہیں - میری طرف سے اس یادگار نمبر کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمایئے احباب سے سلام کہیے - خدا کرے آپ مع الخیر ہوں - نیاز کیش

ایڈیٹر "حریم" لکھنؤ

مکرمی سلام مسنون - مزاج گرامی -

اطلاع عرض ہے کہ حریم سے مضامین لیکر شایع کرنے کے سلسلے میں آپ کو لیکر یا ماہنامہ کا نام مضمون کے آخر میں لکھنا ضروری ہے - اسکے بغیر افسوس کہ میں اقتباس کی اجازت نہ دے سکونگا -

ایڈیٹر "سوز" کلکتہ

[illegible] ۱۹۶۶ء - محترمی - تسلیم - امید ہے کہ ماہنامہ "سوز" کا آزادی نمبر آپ کی خدمت میں [illegible] - چند ناگفتہ بہ وجوہات کی بنا پر ماہنامہ سوز فروری ۱۹۶۶ء سے [illegible] ۱۹۶۶ء تک [illegible] - جسکا [illegible] سلسلے تازہ پابندی کے ساتھ آپکے یہاں بھیجا نہیں بھیجا جا سکا [illegible] یاد فرمائیں - نیاز مند ول صدیقی

ایڈیٹر "صبح نو" پٹنہ

[illegible] دسمبر ۱۹۶۵ء

مکرمی - تسلیم - [illegible] کا شمارہ [illegible] زیر پیش نظر ہے - معاف کیجیے [illegible]

شکایت پسند نہیں۔ کسی کی نیت پر حملا کرنا اور حقایق کو نظر انداز کر دینا کم از کم ایک جریدے کے مدیر کو زیب نہیں دیتا۔ آپ کو یہ شبہ ہے کہ ہم آپ کو خاص نمبر نہیں بھیجتے ہیں لہذا ہم نے یہ عادت سی بنالی ہے! اگر یہ خیال آپ کا صحیح ہے تو پھر دوبارہ بھیجنا ہمارے لیے کیا ضروری ہے۔ ہم نے آپ کا خط پانے کے بعد دوبارہ الحاج عباس حسینی نمبر" آپ کو بھیجا تھا۔ اب آزادی ہند نمبر بھجوا رہے ہیں۔

برادرم! کیا یہی ہماری اخلاقی کمزوری کا ثبوت ہے؟ ہم حیران ہیں کہ دوسروں کو اصول صحافت اور درس اخلاق بتانے والا خود سلیقے' گفتگو سے واقف نہیں، اگر آپ کو یہ بدگمانی ہے کہ "خاص نمبروں" کے سلسلے میں ہم جان بوجھ کر آپ کو محروم رکھتے ہیں تو ہم ایسی بدگمانی کو گناہ سمجھتے ہیں، اگر آئندہ بھی آپ کا یہی انداز تخاطب رہا تو مجبوراً ہمیں تبادلا بند کر دینا ہوگا۔ فی الحال ہم آزادی نمبر اور اکتوبر کا شمارہ دوبارہ آپ کو بھجوا رہے ہیں، اگر اصول صحافت میں اسکا رسید سے مطلع کرنا ضروری ہو تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کیجیے۔ اور یاد رکھیے کہ پرچے ڈاک سے بھی غائب ہوتے ہیں۔ شاید آپ کو اس کا تجربا نہیں ہے۔ زیادا والسلام۔

ایڈیٹر دیش سیوک" دہرادون

۱۶/۱۲/۱۹۷۲ء — ایڈیٹر "ہندستانی ادب" حیدر اباد — شریمان جی۔ کئی مہینوں سے آپ کا رسالا "ہندستانی ادب" نہیں ملا۔ کیا وجہ ہے؟ پرچا نہیں نکلا یا تبادلا بند کر دیا گیا ہے۔ جو بھی وجہ ہو صاف صاف لکھیں۔ نیازمند پنڈت خوشدل

شخصیات

جواہر نگر۔ سرینگر۔ کشمیر۔ ۱۴-۱۰-۶۳ - مکرمی خاطر صاحب - آپ کا گذشتہ ہی کی محبت نامہ ۱۲ ادر مورد رسالے عنایت ہوئے۔ رسالے کو پڑھنے کے بعد اندازا ہوا کہ پہلے کے مقابلے میں اس میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے اور معیار اونچا ہو گیا ہے۔ مضامین میں تنوع بھی ہے اور افادیت بھی خدا آپ کی مساعی کو کامیاب کرے۔ آپ نے لکھا ہے کہ رسالے کو یہاں کے اسکولوں کے لیے جاری کرواؤں۔ مجھے عام طور پر محکمہ تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ تاہم آپ اپنے خط کے ساتھ رسالے کی ایک کاپی ڈائرکٹر ایجوکیشن سرینگر اور منسٹر ایجوکیشن سرینگر کے نام روانہ کریں اور خط کی ایک نقل مجھے یہاں بھی روانہ فرمائیں۔ میں ممکنہ کوشش کروں گا۔ ایک کاپی لا ئبریری ... کے ... سرینگر کے نام روانا کرکے ... رسالا لائبریری کے لیے خرید ... اشتراک ہو جائے گا۔ آپ کی خیر و عافیت کا متمنی مخلص عبدالاحد

... ۲۵ — ۲۳/۲/۷۱ — مکرمی السلام علیکم

... بہت خوشی ہوئی کہ میرا ... آپ کی نظر سے گزرا اور آپ نے ... ان باتوں کا خیال رکھوں گا۔ اصل میں یہ ... سلسلا درمیان میں ... رہا اور ناظرین کو ...

کرنا پڑا ہے - میں نے مضامین کا سلسلہ اسی غرض سے شروع کیا تھا کہ اہل بصیرت احباب کو نئی معلومات اور مفید مشورے حاصل ہوں - امید ہے آئندہ بھی اپنے نیک مشوروں سے فیضیاب کرتے رہیں گے - درخواست ہے جن شماروں میں آپ نے میرے مضامین شائع کیے ہیں - بھجوا دیجیے مشکور ہوں گا - پروفیسر [illegible] کی کتاب کا سوال تو یہ کتاب عام کتب خانوں میں مل جاتی ہے - کتاب کا نام اور پتہ درج کر رہا ہوں -

Storia Do Mogor or Mogul India 1653-1708 By Niccolao Manucci Vol III Translated by William Irvine (London 1907)

یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور لندن سے ہی چھپی تھی اور چاروں جلدوں کا انگریزی ترجمہ ولیم ارون نے ہی کیا تھا - میرا خیال ہے کہ حیدرآباد یونیورسٹی کی لائبریری میں یہ کتاب ہوگی ورنہ شعبۂ تاریخ تو ضرور ہوگی - یہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب سابق ناظم شعبۂ تاریخ، یونیورسٹی [illegible] کرکے جلد ہی تحریر کروں گا کہ حیدرآباد میں یہ کتاب کہاں مل سکے گی - بہرحال آپ کی ذرہ نوازی کا شکرگزار ہوں - امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے - نیاز مند محمد عمر

سلطان شاہی حیدرآباد - ۱۹ مارچ ۱۹۵۵ء برادر عزیزم! تسلیم!

تقریر کا انتظام کر لیا ہے - یہ تقریر آپ کے منظور کردہ موضوع "اردو لسانیات" پر ہوگی یا پھر اگر آپ پسند فرمائیں تو "اردو رسم الخط" پر ایک تقریر پندرہ منٹ کے دوران کی تحریر فرما کر بھیجئے، انشاء اللہ آپ لکھ کر بھیجئے اور میں حاضر ہوکر تفصیلات سنا دوں گا - [illegible] کر رہا ہوں کہ آپ تقریر لکھنا شروع کر دیں - اور میں جب آپ پاس آؤں تو [illegible] غالب اس میرے اقدام سے تا حال [illegible] اتنا حق آپ پر ضرور ہے کہ آپ سے متعلق ریڈیو والوں سے گفتگو کر سکوں - [illegible] براہ کرم تازہ پتہ حسب ذیل ہے [illegible] "الامین" [illegible] - پروگرام اسسٹنٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد دکن - تمکین کاظمی

۱۹ اکتوبر ۱۹۶۷ء - محترمی - تسلیم -

مولانا کا شکریہ ادا کیا ہے کہ پریس کی بدانتظامی سے اس وقت تک [illegible] اب اپریل، جولائی، ستمبر ساتھ شائع ہو رہے ہیں، اگر ضرورت ہو تو آپ [illegible] خود رسالہ خدمت کر دیا جائے گا - آپ کی اور ہندستانی ادب کی میرے [illegible] ہے - نیاز مند

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی - ۲۷ نومبر [illegible]

محترم صاحب آداب - گزشتہ کئی ماہ سے [illegible] امید ہے کہ آپ باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے رہیں گے - شکریہ

[illegible] - محترمی - آداب -

[illegible] بہت افسوس ہے کہ چند وجوہ کی بنا پر [illegible] ادب [illegible] سے شائع کیا جائے - میں آپ کے [illegible]

[illegible]

[illegible] امید ہے کہ آپ باقاعدگی کے ساتھ بھیجتے رہیں گے ۔ شکریہ

[illegible]

ترسیل [illegible] ایم - اے ایل ایل بی رضا نیاز مرحوم سابق ڈپٹی ڈائرکٹر انفورمیشن اینڈ پبلک ریلیشن
[illegible] آندھرا پردیش جو مسلسل ۶ سال تک کالج میں لیکچرر رہے تھے - ہم نے ملازمت اختیار نہیں کی تھی
علمی ادبی صحافت کو اپنا پیشہ بنایا تھا اس لیے روز [illegible] کے اجلاس پر ہماری جھلک رہا کرتی تھی - ان کے تینوں
[illegible] اس وجہ سے تعلقات کا [illegible] ہیں - ایڈیٹر ہندستانی ادب

بھائی جان !

رضا علی صاحب ٹیلیفون کیے کہ آج رات وہ تاج محل نہیں آسکیں گے کیونکہ رات بجرن میں ۸ ۱/۲ بجے ہندستانی ترکی
[illegible] کانفرنس جا رہے ہیں - انہوں نے یہ بھی کہا کہ آج رات کار پوریشن کی جانب سے نمائش کلب میں
[illegible] ریڈی صاحب کے اعزاز میں ڈنر ہے - اس لیے رحمت علی صاحب بھی نہیں آسکیں گے - اس لیے میں
[illegible] رحمت علی صاحب کے گھر کو ٹیلیفون کر کے ان سے ایسا کہہ دیا ہے کہ آج رات تاج محل پر جو
[illegible] ڈنر ہونے والا تھا وہ ملتوی کر دیا گیا - ان کی اہلیہ نے کہا کہ وہ مکان کب آتے ہیں نہیں معلوم - اگر وہ
[illegible] بجے سے پیشتر آئے تو ان کو اطلاع ملے گی ورنہ مشکل ہے اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ
احتیاطاً ۷ ۱/۲ بجے تاج محل جا کر ان کا انتظار کریں اگر رحمت علی صاحب آجائیں تو آپ اور
[illegible] ڈنر کھائیں اور وہ نہ آئیں تو آپ اکیلے کھا کر گھر جائے - میں تاج محل نہیں آرہا ہوں [illegible]
[illegible] ان سکیں گے کھا لیجئے - آپ کا [illegible]

[illegible] ۳ / ۶۶ ء بھائی صاحب - جب ارشاد [illegible] شری جگ جیون پرشاد صاحب کی خدمت
[illegible] ہو کر عرض کرتا تھا عرض کیا وہ شال نکلوا کر پیش کرا دیجیے گا - میں نے کہا کہ آپ کی طبیعت
[illegible] سے چلنے پھرنے سے مجبور ہیں اس لیے خود وہ شال منگوا کر منظوری دینے کے
وعدہ کیے ہیں مجھے بھروسا نہیں - سیاسی لوگوں کے وعدے کبھی پورے نہیں ہوتے تاہم بکر [illegible]
[illegible] کرنا ہے وہ گزر رہے ہیں دیکھے کیا ہوگا - طبیعت کی فکر کیجیے اور دعا دیجیے - باقی خیریت آپ کا [illegible]

[illegible] - ۸ / ۳ / ۱۹۶۲ ء
[illegible] صاحب - آپ کا عنایت نامہ آج وصول ہوا میں کل دس بجے [illegible] سے واپس آیا -
[illegible] کا شکریہ - وہ ان کی چیک مل گئے [illegible] لیے [illegible] چیزوں کی فرصت نہیں - آپ
[illegible] - جب ارشاد میں شری [illegible] جیون پرشاد صاحب سے [illegible]
[illegible] تو ٹھیک ہے - [illegible] گزر کر [illegible]
[illegible] - باقی خیریت - آپ کا [illegible]

[illegible] ۸ / اکتوبر [illegible]

[illegible] ہندستانی ادب [illegible] سے وصول نہیں ہوا - [illegible]
[illegible] - اس کے بعد [illegible] کوئی شمارہ نہیں آیا - میں نے [illegible]
[illegible] منسلک کی [illegible] لیکن [illegible]
[illegible] خیال تھا کہ [illegible]
[illegible] آپ [illegible]
[illegible] نہیں کیا - [illegible] اب رسالہ برابر [illegible]
[illegible]

عنایت کریں گے - میں اپنے نا چیز مضامین ارسال خدمت کرنے اب بھی تیار ہوں - رسالہ کا پرچہ جاری ہونے پر کوئی دوسرا مضمون بھیجوں گا - امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا -
میرا پتا ہے - طالب کاشمیری - دھرم ارتھ روڈ - سرینگر - " یا پروفیسر طالب کاشمیری ایڈیٹر گورنمنٹ میڈیکل اکیڈمی - سرینگر - نیاز مند طالب کاشمیری

(۲) - دھرم ارتھ روڈ - سرینگر - ۲۷ جون ۶۷ء
مجی و مکرمی - تسلیم - مارچ کے بعد " ہندستانی ادب " کا کوئی شمارہ موصول نہیں ہوا - آپ نے نومبر یا دسمبر ۶۶ء میں وعدہ فرمایا تھا کہ ماہنامہ برابر بھیجا جائیگا - براہ کرم اپریل مئی اور جون کے شمارے عنایت کیجئے تاکہ فائل مکمل رکھا جائے - حسب ارشاد آپ کے یہاں بھی اس سے پہلے " ہندستانی ادب " کے لیے ارسال خدمت کر چکا ہوں - امید ہے موصول ہوئی ہوں گے - پسند ہوں تو ماہنامے کی آیندہ اشاعتوں میں انہیں جگہ دیجئے - ان کے شائع ہونے کے بعد دوسرے مضامین یا نظمیں بھیجنے کی کوشش کروں گا - امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا -
نیاز مند طالب کاشمیری

مکرمی و محترم جی - ام خان - السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ -
امید کہ آپ بفضلہ تعالیٰ خیریت و عافیت سے ہوں گے - گرامی پوسٹ کارڈ محررہ ۶۶ء ملا ہوا تھا - اس سے قبل سلور جوبلی نمبر " ہندستانی ادب " ذریعے رجسٹرڈ ڈاک بھی ملا تھا - اور اس پر " روشنی " میں تبصرہ بھی شائع کر دیا گیا ہے - " ہندستانی ادب " جنوری - مارچ ملا جلا نمبر مل گیا ہے - " روشنی " یہاں سے التزام کے ساتھ آپ کے نام ارسال ہو رہا ہے - لیکن تعجب ہے کہ آپ کو باقاعدہ کیوں نہیں ملتا ہے ؟ غالباً ڈاک کے چھوڑے جاتے ہیں ' اور یہ شکایت اپنی قسم کی کوئی انوکھی نہیں - کار لائقہ سے یاد فرماتے رہیں - مخلص
دھرم ارتھ روڈ - سری نگر - ۲۳ جون ۶۹ء
مکرمی - تسلیم -
" ہندستانی ادب " کا مشترکہ نمبر بابت اپریل - مئی - جون ۶۹ء موصول ہوا - شکریہ - ایک بات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں - اپنے سابقہ ریکارڈ یعنی " ہندستانی ادب " کا فائل بابت ۱۹۶۷ء ملاحظہ فرمانے کی زحمت گوارا کیجئے - اس کے مشترکہ نمبر بابت ماہ اپریل - مئی - جون میں میری ارسال کردہ ایک نظم بعنوان " رشوت خور سے خطاب " شائع ہوئی ہے - تعجب ہے کہ یہی نظم " ہندستانی ادب " کے موجودہ مشترکہ نمبر بابت ماہ اپریل - مئی - جون میں حضرت آدم نصرت کے نام سے شائع ہوئی ہے - آپ کے رسالے میں چھپ جانے کے بعد یہ نظم کئی اور رسالوں میں بھی شائع ہو چکی ہے چنانچہ ماہنامے " صبح امید " بابت ماہ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں بھی اس کی اشاعت ہو چکی ہے - کیا یہ سرقہ ہے یا کسی سہو کا نتیجہ ؟ براہ کرم " ہندستانی ادب " کے آیندہ شمارے میں اس کی تصریح یا تصحیح فرمائیے - میں کسی کے سرقے یا سہو کو بلا تشخیص یا بلا وضاحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں - دعا ہے کہ قدرت کرم کرے اور " ہندستانی ادب " کو ترقی عطا کرے کیونکہ رسالے کی مالی حالت کمزور ہے لیکن امید ہے کہ آپ کی جد و جہد " ہندستانی ادب " کے لیے بھی سعادت کا باعث ثابت ہوگا -
امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا -
نیاز مند - طالب کاشمیری

مکرم فرمائے من – سلام مسنون –
مجھے محترمی سید صاحب قبلہ سے "ہندستانی ادب" بھی ملا اور آپ کا خط بھی۔ میں نے بعض
ان ہی کی وجہ سے ادارتی لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ کسی کا مطالبہ بھی نہیں۔ اس لیے آپ کے حکم کی تعمیل سے
معذور ہوں۔ آپ کی تجویز سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے۔ خدا کرے کہ ایسا ہو جائے –
مخلص محمد اکبر الدین صدیقی

۱۴ – ۷/ ۱۹۷۲ء
محترمی جناب مدیر "ہندستانی ادب" حیدر آباد۔ تسلیم۔ آج کی ڈاک سے دو شمارے "ہندستانی ادب" کے موصول ہوئے۔ اردو زبان کے متعلق ادارتی بہت ہی حیرت انگیز ہے۔ اس کے متعلق صرف یہی کافی ہے کہ "ہر کس از دست غیر می نالد" (سعدی شیرازی)
سعدی از دست خویشتن فریاد
ماشاء اللہ "ہندستانی ادب" کا معیار بہت بلند ہے۔ آج اردو زبان میں ایسے جرائد کی سخت ضرورت ہے۔ ماہ جولائی کے "بنت حوا" میں "عظمت نسواں" راقم الحروف کی تخلیق شائع ہوئی ہے۔ یاد آوری کا شکریہ۔ کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔ مخلص حمید قیصر

۹/ ۸/ ۱۹۷۲ء
مکرمی جناب جی ام۔ خان صاحب – مدیر ہندستانی ادب حیدر آباد
آپ کا طویل خط ملا۔ پڑھ کر حالات معلوم ہوئے مگر مدیرۂ بنت حوا نے آپ کی نظر میں مجھے جھوٹا ٹھہرانے کی کوشش کی۔ میری نظم عظمت نسواں بنت حوا کے صفحہ ۵۲ پر موجود ہے میں نے بنت حوا کی یہ کاپی البنیز سے حاصل کی ہے، اکبرپور کے البنیز (ضلع جلگاؤں) میں میرے صدارت میں ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ وہاں خلیل البنیزی سے یہ کاپی میں نے حاصل کی۔ مدیرہ موصوفہ نے مجھے بہ پریشان کر رکھا ہے اور بار بار خط لکھنے پر بنت حوا کی کاپی کیوں نہیں روانہ کر رہی ہیں۔ یہ بات آپ کے طویل خط آنے کے بعد معلوم ہوئی، لیکن شاید ان مدیرہ کا خیال ہو کہ یہ معلوم نہیں کہ وہ اگر ہے رسالہ نہ بھی بھیجیں تو میرے چاہنے والے فوراً میرے پاس رسالہ بھیج دیتے ہیں، اور اس طرح میرے پاس بنت حوا کی جولائی ۱۹۷۲ء کی ایک کاپی موجود ہے، اگر دوسری مل گئی تو ان شاء اللہ آپ کے لیے میں روانہ کر دوں گا۔ بمبئی کے رسالے اور اخبار ماشاء اللہ بہت کمال کر رہے ہیں۔ خیر ۱۹۶۱ء میں راقم الحروف نے ایک تاریخ ابواب ادب (منظوم) شائع کر رسالوں کے [illegible] روانہ کر دوں کا خط میں جگہ نہیں ہے۔ عکس حیات نکلا ہے۔ اس کی کچھ کاپیاں کچھ معروف لوگوں کے پاس موجود ہے، مگر سید پیرزادہ حسین صاحب نے میری کتاب کے شمار تین برس کے انقلاب سے ہفت رنگ میں چھپوا دیجیے۔ مدیر صاحب نے اب تک [illegible] جواب شائع نہیں کیا ہے۔ جناب یہ کیا کم اندھیر ہے۔ آپ کو عکس حیات کی ایک [illegible] روانہ کر رہا ہوں [illegible] ادب اور شاعری کے لیے جو قابل فخر ہے اسے آپ ضرور پسند کریں گے [illegible] فقط آپ کا مخلص حمید قیصر

[illegible]
[illegible] خان صاحب – تسلیمات – آج کی ڈاک سے [illegible] بابت [illegible]
[illegible] ماشاء اللہ آپ نے بہت خوبصورت اور معیاری نکالا ہے۔ آپ کو [illegible]
[illegible] ڈائجسٹ [illegible] ۱۵۰۲ [illegible]

میری ۲۲ صفحے پر نظم شعور فن شایع کی ہے نیز مذکورہ اڈا بجٹ نے راقم الحروف کا فوٹو بھی شایع کیا ہے - رہنمائے تعلیم دلی نے بھی تصویر شایع کی ہے - یہ سب آپ کی دعاؤں کا اثر ہے ورنہ من آنم کہ من دانم - مجھ نالائق سے یاد کرتے رہا کریں - سال نو ۱۳۴۲ ش مبارک ہو نیز عید (عید الاضحیٰ) بھی مبارک ہو - مخلص حمید قیصر

منشوۃ - اکرا — ۱۲ ار فروری ۱۳۴۳ ش

کرم فرمائے من - تسلیم نیاز - ۱۰ ار فروری کا عنایت نامہ موصول ہوا - ممنون کرم ہوا - میرا اب تک آپ سے ملنا نہیں ہوا ہے۔ میں ہوں اس خلوص کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہے - ٹائمز دیکلی میں مضمون شایع ہونے کے بعد سے اکثر کرم فرماؤں کے خطوط آئے ہیں جس طرح آپ نے یاد فرمایا ہے - آپ نے مجھ کو آخری سطر میں کہ ہندستانی ادب کا ایک اچھا نمبر بھجوانا ہے تو بھجوانا ہے ! آپ کی نوازش و لطف زائد کا مکرر شکرگزار - خدا کرے آپ مع الخیر ہوں

والسلام - لطیف الدین احمد

منشوۃ - آگرا - ۹ مارچ ۱۳۴۳ م - کرم بندہ - تسلیم نیاز

آپ کا ہندستانی ادب کا گورنر میکر نمبر موصول ہوا - ممنون کرم ہوں - اسکے مطالعے سے مستفیض ہونگا - نیاز آگیں - لطیف الدین احمد

شاخسار، کٹک نمبرا مورخہ ۱۵ ار جولائی ۱۳۴۲ ش

مکرمی - تسلیم - آپ کا عنایت مورخہ ۴ ار جولائی باعث نواز ہوا - اطلاع عرض ہے کہ آپ کو مدد شاخسار تک کے جو رسالے ملے ہیں، ان کے بعد دوسرا کوئی پرچہ شایع نہیں ہوا اس وقت پریس میں چند کتابت شدہ کاپیاں اڑ گئیں - دوبارہ کتابت کرانی پڑی - اس شمارے کے بعد پریس کی تبدیلی کے سلسلے میں ہم لوگ کوشش کر رہے ہیں اس لیے پرچے کے نکلنے میں تاخیر ہو رہی ہے - بہرحال ہندستانی ادب " کے تبادلے میں " شاخسار " پابندی سے پہنچتا رہے گا - خاطر جمع رہیے - امید کہ آپ اچھے ہوں گے - مخلص - کرامت علی

کرمی ! تسلیم - عرصے کے بعد مخاطب ہوں - یاد فرمائی کا بہرحال از حد ممنون ہوں - رسالہ جناب آپ بلاشبہ بڑی سخت محنت کرکے کاوش اور سلیقے کے ساتھ ترتیب دیتے ہیں - اگرچہ خامیاں کتابت کے ہاتھوں آپ کو خاصی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے - یہ جناب کی ذاتی دلچسپی زبان سے ہمدردی و خلوص نیز لگن کی بات ہے - کہ جناب نے اس بار غالب نمبر نکالا - نمبر واقعی اپنی حیثیت قدر رکھتا ہے - جو بات میں [illegible] نے دیکھا - ہو وہ اس قابل کہ اسکو کہہ سکے - کیونکہ یہ تو آپ کا ہی حق [illegible] اور تحقیق کے میدان میں ایک نیا قدم وہ ناسخ غالب ہے جو اس رسالے کو [illegible] [illegible] غالب کا انداز تحریر ایک خاص انداز سے ملا ہے [illegible] کی [illegible] اس [illegible] کو سمجھا ہے کہ اس قدر ضخیم عمدہ رسالہ نکل آیا - [illegible] واقعی اس قابل [illegible] باوجود فکر کی اپنی پیرانہ سالی کے دور میں [illegible] [illegible] سے [illegible] کا [illegible] ہے ایک [illegible] اس مقصد کو پانے [illegible] اور قابل قدر [illegible] اور ایک نظر تو ہے جو امید کہ جناب [illegible] [illegible] فرمائیں - [illegible] ہوگی - والسلام رضا احمد ایم - اے

[illegible] ۱۹۷۸ [illegible] - جناب مکرم - السلام علیکم و نیاز -

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے - ہندا تفسیر - سال گذشتہ رسالے "تعلیم" سے آپ نے میری غزل اپنے موقر جریدے [illegible] Digest [illegible] تھی لکھ کر راقم نے آپ سے پرچہ طلب کیا تھا اور شکریہ ادا کیا تھا شاید میرا خط آپ تک پہنچا تھا۔ مجھے ز [illegible] پرچے [illegible] راقم کو [illegible] تھا اور نہ ہی آپ کی جانب سے کوئی جواب ہی موصول ہوا تھا - راقم انگریزی [illegible] اپنے تحقیقی کام میں مشغول تھا بنا بریں دوبارہ خط لکھ کر یاد دہانی کی نوبت نہ آئی - سال رواں میں [illegible] آپ نے گذشتہ چند ماہ قبل راقم کی ایک غزل "شانِ ہند" کے حوالے سے آپ نے [illegible] غزل Digest [illegible] کی ہے۔ [illegible] کو کوئی علم نہیں ہو سکا ہے - اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں اردو [illegible] کے شماروں کے لیے [illegible] بجلی کے [illegible] کے ریسرچ کی لائبریریوں میں "ہندستانی ادب" نظر سے گزرتا رہا ہے - حال ہی میں انگریزی کے دو نئے اضافہ آپ جو انگریزی زبان کو دے رہے ہیں وہ آپ کی ذہانت اور فطانت پر دال ہیں " اللہ کرے زورِ رسا اور ہو بلند " چونکہ اس وقت آپ کا پرچہ ہی ایک [illegible] سے محروم ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کر آپ راقم کے نام متعدد پرچے [illegible] کا پی [illegible] سے روانہ فرما دیجیے اس اور اس طرح زیرِ بار منت فرمائیں - راقم کے نام چند ملک کے بیشتر علمی ادبی رسائل اعزازی طور پر آتے ہیں آپ کے معیاری پرچے کی کمی شدید کھٹکتی ہے - کیا میں توقع رکھوں کہ آپ قابلِ اعتنا تصور فرماتے ہوئے ممنون کرم کریں گے ؟ حال ہی میں "شانِ ہند" سے لی گئی غزل سے متعلق پرچہ ہی اس خط کی رسید کے طور پر مرحمت فرمائیں - آپ سے اچھے جواب کی توقع ہے۔ آئندہ بالتفصیل اپنا تعارف کرانے میں مسرت ہوگی

[illegible] - لکھنؤ -

محترم جناب بی ام خان صاحب ام - اے (علیگ) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" [illegible]

آداب و نیاز - ایک ادیب شہیر کی حیثیت سے آپ کا نام ہمارے صحافت میں روز روشن کی طرح عیاں ہے - اور ہر [illegible] میں آپ نے "[illegible]" [illegible] کر [illegible] اپنی [illegible] جاری ہے - پھر آپ [illegible] "[illegible]" نکلا - واہ وا - سبحان اللہ [illegible] آپ [illegible] صاحب آپ کا کمال ہے کہ آپ نے [illegible] جاہل ترین اور احمق [illegible] [illegible] سے گزر [illegible] - لیکن آپ نے [illegible] کے سر پر ایک [illegible] [illegible] مجھے [illegible] ہے کہ اس سے [illegible] دوستوں میں [illegible] [illegible] اب [illegible] آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے [illegible] کہ [illegible] اس [illegible] آپ کو [illegible] - اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی معاف نہ کرے [illegible] [illegible] اس [illegible] ہندستانی [illegible] [illegible] ہے - فقط

آپ کا [illegible] اندیش

[illegible] الدین احمد [illegible]

(۱) از ادارۂ جامِ جہاں نما لکھنؤ ــ ۲۵ جون ۱۹۴۶ء

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

فصاحت جنگ حضرت جلیل مرحوم کا جلیل القدر نمبر "ہندستانی ادب" نے پوری آب و تاب اور تکمیل تام کے ساتھ بالآخر جون ۱۹۴۶ء میں شایع ہی کر دیا ۔ ایسی ناقابل فراموش ہستی کا ایسا ہی مستحکم اور جامع و استوار یادگار ہونا چاہیے ۔ کس کس مضمون اور مقالے کی ستایش کی جائے جس نے اس کو باستعاب آخر پڑھا اور پڑھنے کا لگا جھنا ہونے کے محل پر رویا لکھنے والوں نے خوب کی خلوصیت سے لکھا ہے جس میں حقایق و معارف بھی ہیں اور کیفیاتی تاثرات بھی ۔ الغرض ؎

جہاں طلعِ زلیخا منتظر تھا ان مضامین کا — تماشا ہے وہ یوسف بکتے ہیں بازار میں آئے

سب سے زیادہ دلکش چیز حضرت مرحوم کا فوٹو ہے جو بہت ہی صحیح اور جاذبِ نظر معلوم ہوتا ہے ۔ لکھنے والوں میں جناب مولانا شہرت ندوی اور صاحبزادۂ علی احمد خلف حضرت جلیل کے فوٹو خوب آئے ہیں ۔ کاغذ ، لکھائی ، چھپائی سب ہی کچھ بہتر و برتر ہے ۔ حجم بھی بہت کافی ہے جو ذوقِ نظارے کو آسودگی بخشتا ہے ۔ کلامِ جلیل کا انتخاب خوب کیا گیا ہے ۔ رسالے کی تدوین اور ترتیب لائق مدیر کی صلاحیت و سلیقے کا اعلان کرتی ہے ۔ "ہندستانی ادب" کے سر اس عظیم و اعلیٰ غیر معمولی کامیابی کا سہرا مبارک ہو ۔ ع "اے وقت تو خوش باش کہ خوش ما کردی"

ناچیز احقر مرزا فدا ارتی عفا عنہ

(۲) عزیزی جی ۔ ایم ۔ خان زاد شرفکم ۔ دعا و سلام ۔

امیر مینائی کا شعر ہے ؎

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے — پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

مرزا غالب ؎ ـ رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے

تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

بلبل شیراز حضرت سعدی ۔ نہ دعویٰ دلیل محبتی بود — کہ بسیار دوری ضروری بود

مطلب یہ کہ فرط شوق اور وفور محبت میں ایسا ہوتا رہتا ہے اس کو نہ بھول جانا کہتے ہیں نہ قطع تعلق ۔ میں نہ آپ پر الزام فراموشی عاید کر سکتا ہوں نہ آپ مجھے [illegible] تغافل بتائیں اور آپ جہاں پہلے تھے بحمد اللہ آج بھی اور جیتے جی تمام مدت وہیں رہیں گے ۔ وما توفیقی الا باللہ ۔ حوادث اور انقلابات ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ زندگی نام ہی ہے انقلابی سوانح اور وقایع کا ۔ تعجب کس بات کا ؟ شکر اس کا کہ جوں ہی خبر آصف پر بے ساختہ آپ مجھے یاد آ گئے اور میرے عریضہ لکھنے پر آپ کو [illegible] یاد آ گیا ۔ فہو المراد ۔ چلیے پھر دیرینہ مراسلات قایم ہو گئیں بلکہ پہلے سے زیادہ قبول شرف [illegible] کا مزہ اس طالب کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر "

یہاں تو جنگ بھی نہ ہوئی تھی ۔ پھر کیا کہنا ایسے لطف کا ۔ یہ تو [illegible] [illegible] [illegible] ۔ آپ کو افسوس بھی ہوگا اور [illegible] بھی ۔ افسوس میری مصیبت کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]) میں زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے آفت زدہ کو تسکین ہو جاتی ہے ۔ وہ یہ تھا ۔ [illegible] [illegible] واپس آیا تو شریک حیات کو جان بلب [illegible] [illegible] [illegible] میں ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں ۔ انا للہ [illegible] [illegible] ۔ گو گو گرچے قدر دراز [illegible] [illegible]

[illegible]

کسی طرح یاد ماضی دل سے نہ مٹ سکی تو مجبوراً مکان تبدیل کر دیا گیا کہ شاید نئی فضا کچھ غم غلط کر سکے، مگر آہ ؎ صباح الخیر زد بلبل کجائی ساقیا برخیز کہ غوغا می کند در سر خمار خمر دوشینم - (حافظ شیرازی)
مرزا غالب کے ؎ پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو -
اس شعر پر مجبور ہو جانا پڑا - اب میں ہوں اور نئے در و دیوار جو ہنوز مانوس بھی نہیں ہوئے کہ کوشش پہلے ہی ڈالا گھر ہوتا تو کچھ انست تو قائم رہتی - زندگی ہے اور میں زندہ بھی ہوں مگر کس طرح - ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

پان بھی کھاؤں تو خود کتھے چونے کا ڈبی - تمباکو کا انتظام کر کے کھاؤں کیسے کھاؤں تو مزید مصیبت کا مقابلہ کروں - الغرض الامان والحفیظ، عمر کا تقاضا اپنی جگہ پر - تندرستی علیحدہ ستایا کرتی ہے ۸۳ میں چل رہا ہوں - بازار اور اغیار پر زندگی ٹھہری ہوئی ہے - سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ ایسی زندگی اور صحت کا کیا مرتبہ ہوگا - نگاہ چوتھائی سے کم رہ گئی - بدن نصف سے زاید تحلیل ہو چکا ہے دو قدم چلنے میں سانس پھولنے لگتا ہے - سر میں چکر، دل و دماغ میں ہیجان الغرض لکھنے سے بالاتر کیفیات کا نمود ہونے لگتا ہے - کوئی پرسان حال نہیں اگر کبھی آ بھی گیا تو میں اس کو ملک الموت سمجھنے لگتا ہوں - مگر ایسی قسمت کہاں جو وہ میری مصیبت میں کام آ کر اجل کا ہاتھ بٹائے - ان کوائف میں مبتلا ہو کر آپ کو کیا جواب دوں کہ میں شاعرہ بازی کا کہاں تک اہل رہا ہوں، اور استادی کی خدمات کس قدر انجام دے سکتا ہوں - سچ ہے ؎ درد اپنے حال سے تجھے آگاہ کیا کرے جو سانس بھی نہ لے سکے وہ آہ کیا کرے -
میں یہاں ہوں آپ وہاں مجھ سے کوسوں دور - فیصلہ عالم الغیب پر ہے کہ کون کس سے زیادہ مجبور اور معذور ہے واللہ اعلم، مگر جبر اور عذر سے بھرپور دونوں ہی ہیں کوئی کم کوئی زیادہ -

آفریں آپ پر اور صد آفریں آپ کی ہمت پر کہ اس بے حالی میں اپنی وضعداری کو نباہ رہے ہیں مجلہ "ہندستانی ادب" انہیں تیوروں سے آج بھی جاری ہے جو ۲۶ سال پیشتر تھے - "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" زمانہ اور اہل زمانہ کا شکوہ ہی کیا اس نے آپ کو پہچانا نہ آپ نے اس کو جانا دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز رہے، اور آج تک وہی عالم ہے نہ وہ آپ کو جھکا سکا نہ آپ اس کو سرکر سکے - جہاں یہ عالم ہو وہاں سکون - امن - اطمینان، اور قرار کیسا ؟ ایک بار جیسا تھا آپ کا ساتھ پھر میار کیا دپیش کرنے کو جی چاہتا ہے - ایسے سخت جان ، مرد حق سے کچھ اب کا ہے کو پیدا ہوں گے - میں نے یا اپنے برادر بزرگ حضرت رہائی کو دیکھا یا ان کے بعد آپ کو پایا -

مرزا مظہر جان جاناں نے اپنی داد سن لیجیے ؎
بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن   خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

معصیت اور عصیاں کے مہلک امراض تو تھے ہی مگر اب جسمانی عوارض نے بھی آ دبایا ہے - کبھی عرق النسا کے درد کا حملہ، کبھی تو تپخ کی شدت، کبھی چیک گئی، کبھی آنت اتر آئی - الغرض
(اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر ما خلق -)

خوش نصیب ہوں کہ آپ کو برسوں کے بعد اس قدر لکھ کیا گیا ارادہ تھا ؎
احباب سے کہتے ہیں حال دل آساں ہے   آغاز یہ کہتے ہیں خیریت جان معلوم

چونکہ نیت بخیر ہے اسلیے مجھے لکھنے میں تکلف بھی نہیں کہ آپ کے نام پر خود ہی کچھ آئندہ بھی لکھتا ہوں اور یہ سلسلہ پھر برابر قائم رہے گا - آپ سے بھی استدعا ہے کہ ؎
[illegible] جو رشم ورہ ہو   [illegible] ہو تو کیا گناہ ہو (غالب)
[illegible] سینکڑوں عبد اللہ [illegible]

اب دوستی جیسی کے بھی دیکھنے کو ترستا ہوں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

کہاں کی اصلاح - کیسی رشد و ہدایت   اپنی رہنمائی کے لالے پڑے ہیں۔

ایک عمدہ خاتم ہو گیا - پھر کوئی ہمائی آشیانہ میں دل آویز روشنی کہاں - اب ہم ایسے سوختہ جانوں کو کون [illegible] ہے اور ہم جیسوں کو کیا جب کوئی بات ہی ہو ؟ ہم دنیا کی طرف دوڑ دوڑ بھی تو وہ کب بات [illegible] ہے ؟ اپنا آپ اپنے بات ہے - ترک دنیا کا دعویٰ نہیں، مگر دنیا اب میرے کام کی نہ میں دنیا کے کام کا - مدت ہر با شغل یار کر گفت ؎

عاشقان مادرند ادراہ عد طلاق   آنکہ عاشق شد بر و او کرد عاق   (مولانائے روم)

آپ بھی ایسا ہی کچھ کریں، اور اسی رستے میں گامزن رہیں - جو ہوا ہو گیا ؏

خواب تھا جو کچھ دیکھا جو سنا افسانہ تھا   (درد)

غریب خانہ کا پتا ہے چینی سے پھر انتظار کرونگا، اور ممنون ہونگا - وہاں جیسا شناسا اب کا ہے کم کون ہو گا جس کو سلام شوق اور پیام تحیت لکھوں تاہم سب کو سلام مع الاکرام ہندستانی ادب کا بھی انتظار ہے - بفور تیک -

دیر کسی رسانند ازاں نزامی پیام وصلت بہ جانب ما - ؏

آپ اپنی حالت لکھی یا میں اپنی کیفیت، لکھوں جتنا دونوں کا ایک ہی نکلتا ہے یعنی ؎

؟ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکاریں چلاؤں ہائے دل -

چنانچہ وقت اسی قدر کافی ہے -   والسلام دعاگو ناچیز ابو الفقر نو ہانی وارثی عفا عنہ

لکھنؤ - ۱۴ لاٹ کل - یو - پی -

۲۳ - ۱ - ۱۹۶۶ء مخدومی - کرنیا خان صاحب زاد شرفکم - سلام مسنون و دعائے خیر - خفا ہوں، مگر در گزر - آپ کی زندگی کا انداز "ہندستانی ادب" سے واہ بیاہ ہوتا رہتا ہے، خدا خلوص رکھے اور فائز المرام فرمائے - سلور جوبلی نمبر کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہی نہیں تو کاز کہا دوں - آپ کے استقلال مزاج اور استقامت طبع کی داد دیتا ہوں، بلکے قسم کھانا چاہیے - اس نازک زمانے میں آپ کے ایسے سخت جان مقابل پھر کہاں - خدا کرے آپ بعافیت ہوں اور حالات موافق - کبھی کبھی تو دو کلمے عافیت سے یاد و شاد فرمایا کیجیے - انتظار رہتا ہے ، مگر حیف ؎   ہمت دریں امید کہ نسیم صبحگاہی   بہ پیام آشنائی جنزاز و آشنا ما -

مرزا غالب کا مطلع ہے ؎   تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو   مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو - ؟

میں بھی تو آپ سے اسکا قدر کا خواہاں ہوں اور رہونگا - حالات و کوائف سے آگاہ فرمایئے انتظار رہے گا - ماہی "عید مبارک" ہے - والسلام

دعاگو فقیر ابو الفقر مو لانی وارثی عفا اللہ عنہما

۲۰۲ - چھتوا پور روڈ - لکھنؤ -   ۱۳ / مارچ ۱۹۶۶ء

مکرمی - سلام مسنون - گزشتہ ارچ کو ہندستانی ادب موصول ہوا - آج تک زیر [illegible] ڈاکٹر عبدالحق صاحب (واقعی اردو کی خدمت کر رہے ہیں) لیکن اب یہ خیال [illegible] ہے [illegible] کو پڑھتا ہوں تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اقرالمات عرت [illegible] ان [illegible] خدمت اپنے انعام میں حق بجانب ہے - [illegible] اور اردو [illegible] کہ ڈاکٹر عبدالحق ترقی اردو کو [illegible] [illegible] آپ [illegible] کی قدر کرتا ہوں اور ہر طرح سے آپ [illegible] ں -

[illegible] ہندستانی ادب [illegible] نمبر [illegible]

ہندستانی ہی ہندستان کی قومی زبان ہے۔ ایک افسانہ بھی روانہ ہے اسے دوسری اشاعت میں شریک کر لیجئے۔ آپ "ہندستانی ادب" میں اگلے پرچے کی جھلک کا عنوان بڑا دیجئے تاکہ مضمون نگاروں کو معلوم ہوتا رہے کہ ان کا مضمون کب چھپ رہا ہے تاکہ فضول خط وکتابت کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ جواب کا منتظر رہونگا۔ نیازمند اختر ملیح آبادی

نئی دلی۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۶ء

مکرمی۔ ایڈیٹر صاحب۔ آداب عرض ہے۔ بہت شکریہ جناب کا جو جناب نے "[illegible]" کی [illegible] میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں آپ کے رسالے کے لیے ایک افسانہ ضرور لکھونگا، مگر مصروفیت کی وجہ سے جلدی لکھنے کا وعدہ نہیں کرسکتا۔ فی الحال میں آپ کی خدمت میں یہ ایک تجویز پیش کرسکتا ہوں۔ میں چند مہینے پہلے "شاہکار" لاہور کے لیے ایک افسانہ لکھا تھا، مگر وہ افسانہ چھپا آٹھ صفحوں میں سے چار غلط ملط ہو رہے تھے نہ کہیں سر کا پتا لگتا تھا نہ پیر کا۔ پھر عنوان بھی اسکا نہ معلوم کیسے غلط چھپا گیا تھا۔ یقین مانیے کہ میں بھی ان چھپے ہوئے صفحوں کا ربط نہ سمجھ سکا تو اوروں کے پلے کیا پڑا ہوگا۔ [illegible] جنسی نفسیات کا بہت اچھا مطالعہ ہے، اگر آپ حکم دیں تو میں اس افسانے کو ازسرنو لکھکر بھی پیرا [illegible] بلکہ بہتر پیرایے میں نئے عنوان وغیرہ کے ساتھ بھیجدونگا۔ اس میری بات پر یقین ضرور کیجئے کہ اس افسانے کو سوائے کاتب شاہکار کے کسی نے اب تک نہیں پڑھا، اور یہ افسانہ میرے خیال میں کم سے کہیں بہتر تھا۔ والسلام۔ پریم ناتھ

سلطنت دیکلی۔ حیدرآباد۔ ۲۸ امرداد [illegible]

محترمی خان صاحب! تسلیم!! آپ نے اس دن کہا تھا۔ مضمون بھجوا رہا ہوں، اگر شمارہ [illegible] مکمل ہو گیا ہو یا کسی وجہ سے اس ماہ کے پرچے میں یہ مضمون نہ شایع ہو سکتا ہو تو بہتر ہے کہ آپ اسے لوٹا دیجئے۔ جب آئندہ اکتیت شروع ہوگی میں پھر بھجوا دونگا۔ اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے پاس سے تلف ہو جائے۔ میرا مضمون یا افسانہ، آپ مطالعے کے بعد محسوس کریں کہ ترقی پسند رجحانات کا حامل ہے، اور میں پرانی ڈگر پر چلنا بھی نہیں چاہتا۔ زیادہ۔ خیر فروری۔ فقط نیاز آگیں [illegible]

۱۹ جنوری ۱۹۶۶ء

بخدمت شریف جناب ایڈیٹر صاحب! ماہنامہ "ہندستانی ادب"

امید ہے کہ جناب والا بخیریت ہونگے۔ میں شیخ چاند ساجد ایک مضمون موسوم بہ "ہندستان [illegible] و معاد صوفیوں کا گھر" آپ کے پرچے "ہندستانی ادب" کے لیے روانہ کر رہا ہوں۔ میرے اکثر مضامین "رہنمائے دکن" میں بھی شایع ہوتے رہتے ہیں۔ میرے مضامین "بزم رفیق ادب" "شاہ علی [illegible]" کی جانب سے شایع ہونے والی کتاب "پنکھڑیاں" کے زیر اہتمام ایک کتب خانے اور دارالمطالعہ ہے۔ میں اسی بزم کا رکن ہوں۔ میں آپ کا خدمت گذار رسالہ اسی دارالمطالعے میں پڑھتا ہوں۔ [illegible] پرچے شایع ہوتے ہیں وہ بھی میں نے پڑھے۔ اس لیے میں ایک [illegible] [illegible] روانہ کر رہا ہوں۔ یہ تو خاص طور پر "ہمارے پرچم جمہوریہ ہند" لکھی گئی ہے۔ امید [illegible] اس مضمون کی اشاعت کی کوشش کریں گے۔ اور میرا حوصلہ افزائی کریں گے [illegible] تو بہت شکریہ ہوگا۔ دعا کر [illegible] [illegible] [illegible] کسی دوسرے میں شایع کرکے ممنون فرمائیں گے۔

امید [illegible] اندازگی

واقع یکم بہن ۱۳۵۶ف م یکم دسمبر ۱۹۴۶ء

بخدمت شریف جناب ایڈیٹر صاحب - رسالہ "ہندستانی ادب" تسلیم !

حال حال انجمن اساتذہ (حیدر آباد ٹیچرس کانفرنس) بلدا حیدر آباد دکن کی پندرویں کانفرنس اجلاس ۱۳۵۶ف بمقام ند آل سنٹیس (؟) اسکول "۲۲،۲۵ اردے ۱۳۵۶ف کو ہوئی - اس کانفرنس میں مَیں نے جو مقالہ پڑھا اس کو نقل جناب والا کی خدمت میں بھیج رہا ہوں، چونکہ یہ مضمون حالات حاضرہ کے خاطر لکھا گیا ہے اور ممکن ہے کہ اس سے ہمارے گمراہ بھائی کچھ راہ راست پر آجائیں - اس لیے اگر جناب والا اس کو اپنے رسالے میں جگہ دیں تو ہمارے بدنصیب وطن کی یہ بھی ایک مفید خدمت ہوگی فقط

بال ریڈی - بی - اے - ڈب - ایڈ (عثمانیہ)

۱۹ر جولائی ۱۹۵۱ء

محترمی جی - ام خان صاحب ! آداب عرض ہے - غیر معمولی مصروفیت کی بنا پر میں حسب دعا وقت پر مضمون نہ دے سکا - اب چونکہ کالج بالکل کھل گیا ہے اس لیے مضامین پابندی سے روانا کیا کروں گا کوئی خیال نہ فرمایئے - تبصرے کے لیے ایک پمفلٹ روانا کر رہا ہوں براہ کرم تبصرا فرمایئے - جب بھی مضمون اور تبصرات چھپ جائیں براہ کرم حسب ذیل پتے پر وہ رسالا روانا فرماکر ممنون فرمایئے - محمد مصلح الدین صدیقی لکچرر سیاسیات جامعہ عثمانیہ

امید کہ آپ کا مزاج اب اچھا ہوگا - باقی خیریت - خادم مصلح الدین -

۱۰ر ستمبر ۱۹۵۳ء

محترم ! سلام مسنون - میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ مضمون "امریکی انتخابات" بے وقت کا ہوگیا ہے - لہذا اس کے عدم اشاعت پر مجھے کوئی اعتراض نہیں - چونکہ تمام سرکاری مدارس کے لیے آپ کے رسالے کو منظور کیا ہے اس لیے میرا یہ خیال درست ہے کہ تعلیمی عنوانات اور تعلیمات میں آپ کے رسالے ... آپ کے مضمون ہر وقت جگہ پا سکتے ہیں اور انکی تشنگی دور کر سکتے ہیں جو ہمیشہ اسکے طالب و متلاشی رہتے ہیں - مختلف ممالک کے نظام تعلیم کی اسٹڈی اپنے نظام تعلیم کے جانچنے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے - ساتھ میں ایک مضمون "امریکی نظام تعلیم - ایک خاکا" مرسل ہے - مجھے امید ہے کہ آپکو پسند آئیگا - اگر ایک شمارے میں اس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکے تو جناب اقساط میں شایع فرمایئے - امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے فقط نیاز مند محمد مصلح الدین احمد

- مکرر آپ کا مضمون کی واپسی کے لیے ٹکٹ مرسل ہیں -

۸ر جولائی ۱۹۵۳ء

محترمی ! سلام مسنون - غالباً جناب والا مجھ سے واقف ہوں - میرے مضامین ماہنامہ "آجکل" نئی دلی "نیا دور" الہ آباد، "پیام مشرق" کراچی، الجمعیت دلی - انگریزی پرچوں میں "دی فری پریس جرنل" "دی دکن کرانیکل" اور بمبئی کے اردو پرچوں میں "خلافت" "جمہوریت" "انقلاب" ماہنامہ "کمال" اور حیدر آباد کے پرچوں میں "رہنمائے دکن" "سیاست" "ملاپ" "سب رس" "شباب" "خطیب" "آواز" وغیرہ ملاحظہ فرمائے ہوں - میری یہ خواہش تھی کہ آپ کے پرچے کے لیے مضمون ارسال کروں لیکن کام کی کثرت کے باعث ایسا نہ ہوسکا - اب ایک ترجمہ مضمون بعنوان "امریکی انتخابات پر ایک نظر" بھیج رہا ہے - اس مضمون کو آپ اپنی سہولت کے لحاظ سے قسط وار شایع کرسکتے ہے - یہ ایک اہم کتاب کا ترجمہ ہے جو میں نے ایک طویل عرصے میں کیا تھا - جواب کے لیے ٹکٹ ارسال ہے - مضمون کی تاریخ اشاعت سے مطلع فرمائیں تو باعث تشکر ہوگا فقط

مخلص محمد مصلح الدین احمد

REGD. NO. H. 16.

HINDUSTANI-ADAB

SADATH VILLA, 16-11-17, SALEEM NAGAR COLONY-1, MALAKPET,

HYDERABAD-36 (A.P.)

INDIA.

EDITOR,

G.M.KHAN,

M.A. (OSMAN.)

انجمن ترقیٔ ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۶)　　جلد (۳۶) نمبر (۷-۸-۹)

اسفندار - فروردی - اردی بہشت ۱۳۸۵ ف　　جنوری - فروری - مارچ ۱۹۷۶ء

چندا سالانا　　سولا روپے

ہندستانی ادب

سعادت ولا ۱۷-۱۱-۱۶ - سلیم نگر کالونی - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ - آندھرا پردیش - انڈیا -

ایڈیٹر

جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

اشاریہ - فہرستی - اردو ماہنامہ [illegible] ہندستانی ادب جنوری - فروری - مارچ سنہ ۱۹۷۹ء

۲	بیدل دہلوی	مرزا جعفر حسین	۹	آندھرا پردیش
۳	کوئی گلاب تو ہو	اکبر بجے پوری	۱۴	مرکزی اطلاعات
۴	دیوان غالب کا عروضی جائزہ	اقبال کرشن	۱۵	برہان
۵	گرتی دیواریں	عطیا پروین	۱۷	حریم
۶	عزیزان وطن بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکو!	جگنات آزاد	۲۱	مرکزی اطلاعات
۷	روزنامچا	مصدر فطرت خاجا حسن نظامی	۲۲	منادی
۸	غزل	قمر سنبھلی	۲۶	شاخسار
۹	امجد نجمی کے خطوط	کرامت علی کرامت	۲۷	شاخسار
۱۰	جشن آزادیٔ جمہوریۂ ہند	کیف احمد صدیقی، ام - اے، بی - ایڈ	۳۴	پیام تعلیم
۱۱	صاحبزادا محمد علی خان میکش	اشفاق حسین، ام - اے (غانیا)	۳۵	سب رس
۱۲	انتظار	ظفر مراد ابادی	۳۷	بانو
۱۳	انڈونیشیائی عورتیں	نزہت قمر	۳۸	بانو
۱۴	بے زا منودر کو آقا بنا سکتا ہے کون	ساغر نظامی	۴۱	آجکل
۱۵	پاکستان میں چار مہینے	سید صباح الدین ندوی، ایڈیٹر "معارف"	۴۲	معارف
۱۶	طوطیٔ ہند	شہباز صدیقی امروہوی	۵۴	منادی
۱۷	حضرت امیر خسرو	محمد عتیق، بی - ایس سی، ام - اے (عثمانیا) اسسٹنٹ ایجوکیشن گورنمنٹ آف انڈیا	۵۶	مرکزی اطلاعات
۱۸	اتاترک غازی مصطفا کمال پاشا	بشیر احمد طاہر، آئی اے ایس (ریٹائرڈ)	۵۹	سب رس
۱۹	مفتی صدر الدین خان آزردہ	عبد الرحمان پرواز اصلاحی	۶۲	کتاب نما
۲۰	بڑے آدمیوں کے خطوط ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے نام	بڑے آدمی	۶۸	

جی - ام - خان نے وائیرا پریس - چھتا بازار - حیدر اباد ۲ میں چھپوا کر
سعادت ولا - ۱۷-۱۱-۱۵ سلیم نگر کالونی - ا - ملک پیٹ - حیدر اباد ۳۶ سے شایع کیا -

سفند - فروردی - اردی بہشت سنہ ۱۳۸۵ ف   ہندستانی ادب   جنوری - فروری - مارچ سنہ ۱۹۷۶ء

ہمارے خیالات

لنگوا فرانکا آف انڈیا
یعنی
ہندستان کی قومی زبان ہندستانی

اس وقت ہندستان کی قومی زبان "ہندستانی" پر قلم چلانے اور یہ ثابت کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حقیقت میں کشمیر سے لے کر کنیا کماری اور آسام سے لے کر راجستان تک ہندستان کے (۲۰) بیس اسٹیٹس کے لیے ایک ملی جلی یا قومی زبان نہایت ضروری ہے، اور وہ زبان نہ ہندی ہو سکتی اور نہ اردو، بلکہ صرف "ہندستانی" ہے! ہندی ملک کی قومی زبان اس لیے نہیں ہو سکتی کہ اس کا رسم خط یا لکھاوٹ ناگری ہے، اور اس زبان کو ناگری کے علاوہ فارسی رسم خط میں بھی لکھیں تو وہ اصل ہندی باقی نہیں رہتی، اس لیے اس کی اصلیت کو باقی رکھنے کے لیے صرف اور صرف ناگری رسم خط میں لکھنا نہایت ضروری ہے، اور یہی اٹل فیصلہ بانیانِ دستور ہندستان نے سنہ ۱۹۵۲ء میں کیا تھا، یعنی دستور ہند کی ایک دفعہ میں یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ ہندستان کی قومی زبان ہندی ہوگی جو حروف ناگری رسم خط میں لکھی جائے گی، چنانچہ اس وقت سے آج تک اس پر برابر عمل ہو رہا ہے، اور حکومت ہندستان کی ساری مراسلت اسی زبان میں کی جاتی ہے۔ ہندی، ہماچل پردیش - ہریانا - راجستان - اتر پردیش - بہار اور مدھیہ پردیش کے باشندے کئی کروڑ آدمیوں کی مادری زبان ہے - اس کے علاوہ ہندستان کی باقی ریاستوں کی زبان ہندی نہیں ہے، بلکہ وہاں کی اپنی زبان ہے۔ مثال کے طور پر کشمیر کی زبان کشمیری ہے سکم کی زبان سکمی اور نیپالی ہے - آسام کی زبان آسامی ہے - منی پور کی زبان منی پوری - بنگال کی زبان بنگالی ہے - پنجاب کی زبان پنجابی ہے - گجرات کی زبان گجراتی ہے - (ریاست گجرات کے ایک چھوٹے علاقے کچھ CUTCH کی زبان کچھی ہے، مگر چونکہ اس کا اپنا کوئی رسم خط نہیں ہے، اس لیے یہ زبان صرف بولی جاتی ہے، اور کچھی جاتی کے لوگوں کی آپس میں بات چیت تو اپنی مادری زبان کچھی میں کرتے ہیں، لیکن وہ لکھنے پڑھنے میں گجراتی ہی کا استعمال [illegible] ہر کچھی ہندو دونوں زبانوں سے واقف ہوتا ہے) مہاراشٹرا کی زبان مرہٹی ہے، اڑیسہ کی زبان اڑیا ہے، آندھرا پردیش کی زبان تلگو ہے - تامل ناڈو کی زبان تامل ہے - کرناٹک کی زبان کنڑا ہے، اور ہندستان کے آخری اسٹیٹ کیرالا کی زبان کیرل ملیالم ہے - دیکھ لیا آپ نے ہندستان کے جنوبی اسٹیٹس میں صرف [illegible] اسٹیٹس کی [illegible] ریاستوں کی زبان ہرگز ہرگز [illegible]

ہندی کی حیثیت قومی یا NATIONAL زبان کے چاہے نہ چاہے اور زبردستی ہی لادی گئی ہے، زبان کے سلسلے میں زبردستی یا جبر و استبداد کے مرتکب ڈاکٹر راجندر پرشاد، جواہر لال نہرو - سردار پٹیل - پنڈت گووند ولبھ پنت - پرشوتم داس ٹنڈن، اور سیٹھ گووند داس مرارجی دیسائی، ایس - کے پاٹل، اور اسی طرح سے ہندی کے دیوانے اور علمبردار ہوئے تھے - سنہ ۱۹۵۲ء جب پارلیمنٹ میں ہندستان کے نئے دستور کی منظوری ہوئی اور ساتھ ہی ہندی کو ناگری رسم خط کے ساتھ قومی زبان قرار دیا گیا تو ہم نے "ہندستانی ادب" میں اس کے فوراً بعد کے نمبر میں، ان سب کے خلاف سخت ترین الفاظ میں اداریہ لکھا تھا، اور جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہندستان کی بری طرح سے خبر لی تھی - ہم نے صاف اور کھلے طور پر یہ لکھا تھا کہ یہ وہی جواہر لال نہرو ہیں جو گاندھی جی کی زندگی میں ہندستان کی قومی زبان کے لیے "ہندستانی" کے راگ الاپا کرتے تھے، اور موقع محل سے اپنی تقریروں میں "ہندستانی" کو قومی زبان بنانے پر زور دیا کرتے تھے، اور یہ وہی مرارجی دیسائی اور ایس - کے - پاٹل ہیں، جب یہ دونوں ایک کے بعد ایک صوبۂ بمبئی کے چیف منسٹر تھے، موقع موقع سے اپنی تقریروں میں "ہندستانی" کو قومی زبان بنانے پر زور دیا کرتے تھے - ان کے اس قسم کے خیالات اور بیانات سے "ہندستانی ادب" کے کئی نمبران کے ترقی اداریوں میں بھرے پڑے ہیں - اس وجہ سے نہرو کے ساتھ ہم نے ان دونوں کی بھی خوب خوب ہی درگت بنائی تھی، اور صاف طور پر یہ لکھ دیا تھا کہ ان سبھوں نے اپنے غلط فیصلے سے قوم کو دھوکا دیا!

گاندھی جی حقیقت میں ہندستان کے بڑے اور سچے لیڈر تھے - قومی زبان کے بارے میں ان کا نظریہ نہایت ہی اعلا اور قابل عمل تھا - ہماری طرح گاندھی جی کا بھی یہی کہنا تھا کہ ہندی ہندستان کے تمام آدمیوں کی مادری زبان نہیں ہے، اور وہ صرف چھ اسٹیٹس کی مادری زبان ہے، اور باقی ہر اسٹیٹ کے باشندوں کی اپنی اپنی مادری زبان الگ الگ ہے، چنانچہ ان کا یہ کہنا تھا کہ چونکہ ان کا تعلق گجرات سے تھا، اس لیے ان کی مادری زبان گجراتی ہے، اس لیے انہوں نے اپنی سوانح عمری گجراتی زبان میں لکھی تھی، جس کا ترجمہ آگے چل کر ہندستان کی اور باہر کی کئی زبانوں میں ہوا - گاندھی جی نے لندن میں قانون کی تعلیم پائی تھی، اور انر ٹمپل لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا تھا - پہلے انہوں نے لندن میں پریکٹس کی، اس کے بعد کیپ ٹاؤن CAPETOWN جنوبی افریقہ گئے، اور وہاں ایک طویل عرصے تک انگریزی زبان میں وکالت یا پریکٹس کی - اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی زبان پر ان کو پوری پوری قدرت حاصل تھی، اگر وہ چاہتے تو اپنی سوانح حیات انگریزی میں بھی بہتر طریقے پر لکھ سکتے تھے، مگر انہوں نے اپنی مادری زبان گجراتی کو ترجیح دی، اور اسی زبان میں اپنی سوانح لکھی -

ہندستان بہت بڑا ملک ہے، جس میں کئی ریاستیں ہیں، اور ہر ریاست یا دیس کی زبان مختلف ہے، اور ان تمام دیسوں میں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جاتی اور لکھی بھی جاتی ہیں، اس لیے دیس پتا گاندھی جی یہ چاہتے تھے کہ ان مختلف دیسوں کی مختلف بولیوں یا زبانوں کے علاوہ، سارے دیس کی ایک ملی جلی بولی یا زبان بھی ہو، اور وہ قومی زبان ان کی رائے میں صرف "ہندستانی" ہے، اور اسی "ہندستانی" سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہندی سے سنسکرت کے کٹھن شبد نکال دیے جائیں، اور اردو سے عربی اور فارسی کے سخت الفاظ دور کر دیے جائیں، اس کے بعد ان دونوں باقی زبانوں کا جو سنگم ہوگا، وہ آسان "ہندستانی" زبان ہوگی، جس کو ہندستان کا ہر فرد بول اور سمجھ سکتا ہے - ان کی رائے میں یہ قومی زبان "ہندستانی" ناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں ایک ساتھ لکھی جانی چاہیے - مثال کے طور پر، ایک جملہ ہے، "میں جا رہا ہوں" تو یہ جملہ اس طرح فارسی رسم خط میں لکھا جائیگا، اور اس کے برابر میں یا اوپر ناگری لکھاوٹ میں بھی لکھا جائے گا، تاکہ ناگری رسم خط سے واقف لوگ بھی اس کو آسانی پڑھ سکیں - ایک جملے سے آگے اس طرح سے کئی ایک جملے بھی بالکل اسی طرح دونوں رسم خط میں ساتھ ساتھ رکھے جائیں، اور اس سے [illegible] صفحے، اور پوری کتاب بھی اسی طریقے پر لکھی جائے تو ہم ایسی کتاب کو قومی زبان "ہندستانی" میں لکھی ہوئی کتاب کہہ سکتے - گاندھی جی صرف زبان یا کہنے کی حد تک "ہندستانی" کے قائل نہیں تھے بلکہ اپنے آشرم وردھا سے "ہریجن" [illegible] ایک ہفتہ وار بھی عملی طور پر نکالا کرتے تھے - یہ اخبار ان کے مرنے تک برابر جاری تھا، جو "ہندستانی" زبان اور دو رسم خط ناگری اور فارسی دونوں میں ساتھ ساتھ برابر چھپتا تھا - گاندھی جی کے مرنے کے بعد گاندھی جی کے چیلے اور [illegible] پنڈت سندر لال، ایم اے، نے جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہندستان کو توجہ دلائی کہ گاندھی جی کے [illegible] زبان کو جاری اور باقی رکھنا نہایت ضروری ہے تو نہرو حکومت نے مشترکہ اردو ہندی [illegible] ہندستان کی

خودی کے سلسلے میں ایک کثیر اور بھاری رقم سے ان کی مدد کی، اور سالانہ کئی ہزار کی امداد بھی منظور کی تھی۔ سندر لال نے "ہندستانی" نامی ماہوار رسالہ الہ آباد سے نکالا تھا۔ سندر لال اس کے اعزازی ایڈیٹر تھے، اور ان کے تحت کئی ایک ملازم سب ایڈیٹرس اور دوسرے قابل لکھنے والے ملازم تھے۔ اس کا باقاعدہ دفتر تھا، اور اس دفتر میں بھی کئی ایک ملازم تھے۔ اس رسالے کی چھپائی کے سلسلے میں ایک بھاری نئی مشین جرمنی سے منگوائی گئی تھی۔ یہ رسالہ ٹائپ میں چھپتا تھا۔ یہ رسالہ تقریباً ایک سو صفحے کا ہوتا تھا، اور اس کے پورے مضامین آسان "ہندستانی" زبان میں ہوتے تھے، یعنی ایک کالم میں ناگری ٹائپ ہے تو برابر کے یا دوسرے کالم میں فارسی رسم خط کا ٹائپ ہوتا تھا۔ ان دونوں کی زبان ایک ہی "ہندستانی" ہوتی تھی، یعنی مثال کے طور پر ہم یہاں اس جملے کو پھر سے دہراتے ہیں، "میں جا رہا ہوں۔" یہ جملہ اس طرح فارسی رسم خط ٹائپ میں ہوتا تو اس جملے کو دوسرے کالم میں اس کے مقابل یا برابر ناگری رسم خط کے ٹائپ میں بٹھایا جاتا تھا، اسی طرح پورا مضمون، اور اس سے آگے پورا رسالہ اسی طرح "ہندستانی" زبان میں چھپتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ بارہ روپے تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس رسالے کے تھوڑے بہت خریدار بھی ہوں، مگر اتنے زیادہ نہیں تھے کہ اس کی آمدنی سے پورے اخراجات کی پابجائی ہو سکے۔ مضمون نگاروں کو معاوضہ دے کر مضامین لکھوائے جاتے تھے، اس لیے بھی اس رسالے کا خرچ زیادہ تھا۔ مضامین بہت اچھے اور اعلا پائے کے ہوتے تھے مگر چونکہ دل چسپی لیے ہوئے نہیں ہوتے تھے، اس لیے یہ رسالہ عام پسند اور مقبول نہیں تھا۔ نہرو حکومت نے پنڈت سندر لال کو رسالے کے مسلسل خسارے کے بارے میں کبھی بھی توجہ نہیں دلائی تھی، مگر چونکہ خود سندر لال نے یہ محسوس کیا کہ ان کا رسالہ "ہندستانی" "مرکزی حکومت کے حق میں" "سفید ہاتی" ثابت ہو رہا ہے، اور چونکہ حکومت ہندستان مسلسل کئی سال سے سا بھاری خسارے اور مالی نقصان کو برداشت کرتی چلی آ رہی ہے، اس لیے خود انہوں نے اس رسالے کے بند کرنے کا اعلان کیا، اور پھر سے وہ رسالہ "ہندستانی" آج تک بھی جاری نہ ہو سکا۔

ہم نے ماہوار رسالے "ہندستانی" سے متعلق اتنی تفصیلات جو لکھی ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ رسالہ ہمارے ماہوار رسالے "ہندستانی ادب" کے تبادلے میں آیا کرتا تھا۔ ہر مہینا ہم بھی اپنا رسالہ پنڈت سندر لال کے نام الہ آباد بھجوایا کرتے تھے۔ چونکہ یہ رسالہ "ہندستانی" زبان کے لیے وقف تھا، اس لیے ہر مہینا ہم اپنے رسالے میں "ہندستانی" زبان سے متعلق ایک مضمون ضرور نقل کیا کرتے تھے۔

آپ ہم سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم دو رسم خط ناگری اور فارسی میں "ہندستانی" زبان کے قایل ہیں تو پھر "ہندستانی ادب" ایک ہی رسم خط یعنی فارسی میں کیوں نکالا جاتا ہے، اور ساتھ ساتھ ناگری رسم خط میں بھی کیوں نہیں لکھوایا جاتا ـــ؟ آپ کا یہ اعتراض بالکل بجا اور واجبی ہے، ہم خود بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں، اور ساتھ ہی آپ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ہمیں گورنمنٹ یا مرکزی حکومت ہندستان سے سالانہ ایک معقول رقم منظور کرا دیجیے تو ہم تھوڑے ہی عرصے میں پنڈت سندر لال کے ماہوار مرحوم رسالے "ہندستانی" کی طرح دو رسم خط میں "ہندستانی ادب" بھی نکال کر دکھا دیں یہ ثابت کر دیجیے کہ ہم صرف باتوں کی حد تک "ہندستانی" کے قایل نہیں ہیں، بلکہ عملی طور پر ناگری اور فارسی رسم خط میں "ہندستانی ادب" شائع کر کے ہم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارا قول و فعل ایک ہے، اس میں ذرا برابر فرق نہیں ہو سکتا! مگر ہم کیا کریں، ہم مجبور محض ہیں، ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ ریاستی حکومت کو لکھا اور کئی بار مرکزی حکومت کو یہ تفصیل لکھ بھیجی کہ ہم گاندھی جی کے وچاروں کا پالن کرنا چاہتے ہیں، ہم گاندھی جی کے ہندستانی اور پنڈت سندر لال کے "ہندستانی" کی طرح دو رسم خط فارسی اور ناگری میں ساتھ ساتھ "ہندستانی ادب" بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ضروری مشنری اور ٹائپ کی ضرورت ہے، اور یہ ماہوار رسالہ چلانے کے لیے سالانہ کئی ہزار روپے کی مستقل امداد کی بھی ضرورت ہے، اگر حکومت ... اس سلسلے میں ہماری

ساتھ ساتھ شایع کرکے ہم ساری دنیا پر ہم یہ ثابت کر دینگے کہ ہم صرف باتوں کے آدمی نہیں ہیں، بلکہ عملی طور پر یہ ثبوت پیش کریں گے کہ واقعی ہم کام کے آدمی ہیں - آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اسٹیٹ گورنمنٹ اور مرکزی حکومت دونوں نے ہمارے متعدد خطوط یا ریڈرس کا ایک بار بھی جواب تک نہیں دیا - اب آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ "ہندستانی ادب" کو دو رسم خط میں شایع کرکے ہم اپنے باعمل ہونے کا ثبوت کس طرح سے دے سکتے ہیں - ؟ اس رسالے کا نام "ہندستانی ادب" خود "ہندستانی" زبان سے ہماری دل چسپی اور لگاؤ کا بین ثبوت ہے - "ہندستانی ادب" کا پہلا نمبر جون سنہ ۱۹۴۱ء میں شایع ہوا تھا - سنہ ۱۹۴۱ء سے پہلے اور سنہ ۱۹۴۱ء کے بعد آج یعنی جنوری - فروری - مارچ سنہ ۱۹۷۶ء تک بھی کسی بھی ایڈیٹر نے اپنے اخبار یا رسالے کا نام "ہندستانی ادب" نہیں رکھا، اور نہ آیندہ ایسی کوئی توقع ہے! "ہندستانی ادب" کے جاری کرنے سے پہلے ہمیں "ہندستانی" زبان سے دل چسپی تھی، اس لیے ہم نے اس رسالے کا نام "ہندستانی ادب" رکھا تھا، جس کی منظوری، صدر آفس حکومت حیدرآباد سے حاصل کی تھی - جون سنہ ۱۹۴۱ء کے پہلے نمبر میں "ہمارے خیالات" کے بعد پہلا مضمون ہم نے "ہندستانی" دیا تھا - یہ مضمون پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم، سابق صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد اور سابق صدر شعبۂ اردو، میسور یونیورسٹی، میسور، اور سابق صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، کشمیر نے لکھا تھا - پروفیسر سروری ظاہر ہے کہ اردو زبان کے پروفیسر تھے، لیکن زمانے کا لحاظ کرتے انہوں نے تو "ہندستانی" زبان کی ضرورت محسوس کی تھی، اور یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس زبان کا اصل نام ابتدا میں "ہندستانی" تھا - پروفیسر سروری کے مضمون کے بعد تو ہم نے موقع بہ موقع "ہندستانی" زبان سے متعلق اس رسالے میں متعدد مضامین شایع کیے تھے، اور نہ ہمارا موقع کا آنا، اور معنی خیز بھی ہیں، ہمارے ادارے "ہندستانی" سے متعلق "ہندستانی ادب" کے مختلف نمبروں میں بھرے پڑے ہیں، اور "گاہے گاہے باز خواں این قصۂ پارینہ را" کے زریں قول پر عمل کرتے ہوئے آج بھی ہم نے اس اہم موضوع پر قلم چلایا ہے، اور جب تک "ہندستانی ادب" باقی ہے تو حسب ضرورت آیندہ بھی اس ضروری اور اہم موضوع پر لکھ کر یہ ثابت کر دینگے کہ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک اور آسام سے لے کر راجستھان تک سارے ہندستان کو بقول گاندھی جی، ایک ملی جلی اور عام زبان کی سخت ترین ضرورت ہے، اور انہیں کے قول سے وہ زبان صرف اور صرف "ہندستانی" ہے!

سنہ ۱۹۴۱ء میں "ہندستانی ادب" کے جاری ہونے سے پہلے "ہندستانی" زبان سے متعلق گاندھی جی اور ڈاکٹر مولوی عبدالحق، بابائے اردو میں اچھی خاصی جنگ چل رہی تھی - گاندھی جی چاہتے تھے ہندستان کی زبان ہندستانی ہو، اور مولوی عبدالحق چاہتے تھے، ہندستان کی زبان اردو ہو - ان دونوں سے ہٹ کر ڈاکٹر راجندر پرشاد، صدر ہندی ساہتیہ سمیلن اور سابق صدر ہندستان چاہتے تھے ہندستان کی زبان ہندی ہو! ان تینوں کی بے ڈھب جنگ کا ہم نے بھی خاکہ نیچے کی سطروں میں کھینچ دیتے ہیں -

گاندھی جی صحیح معنی میں ایک بڑے اور مانے ہوئے لیڈر تھے، اس لیے زبان سے وہ جو کچھ کہتے تھے، اس پر پورا پورا عمل بھی کرتے تھے - وہ ہندستانیوں کو ایک قوم سمجھتے تھے، اس لیے ان کروڑوں ہندستانیوں کا ہر جگہ اور ہر طرح سے فلاح و بہبود اور بھلائی بہتر کرنا چاہتے تھے - بالکل اسی طرح صرف ہندستانیوں کی بھلائی چاہنے کی خاطر کشمیر سے لے کر کنیا کماری اور آسام سے لے کر راجستھان تک تمام ہندستانیوں کے لیے صرف ایک ہی قومی زبان چاہتے تھے، اور وہ زبان ان کی رائے میں "ہندستانی" تھی جو ناگری اور فارسی دو رسم خطوں میں ساتھ ساتھ لکھی جانی چاہیے - ان کے خیال میں ہندستان جیسے وسیع و عریض اور کروڑوں کی آبادی کے بڑے ملک کی ملی جلی ایک زبان کا مسئلہ حل ہو سکتا تھا - انہوں نے ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اپنا ہم خیال کرنے کی بھرپور کوشش کی، مگر اس کا انہیں کامیابی نہیں ہوئی - راجندر پرشاد [illegible]

چونکہ ہندستان کے چھ اسٹیٹس کی مادری زبان ہے، جس کو کروڑوں آدمی بولتے ہیں، اس لیے ہندی ناگری رسم خط کے ساتھ قومی زبان ہونی چاہیے، اور اردو کے سلسلے میں مولوی عبدالحق بابائے اردو کا یہ کہنا تھا کہ اردو اگرچہ کسی بھی اسٹیٹ کی پورے طور پر مادری زبان نہیں ہے، مگر کشمیر سے لے کر کنیا کماری، اور آسام سے لے کر راجستان تک ہر اسٹیٹ میں اردو کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں، اس لیے اردو کو قومی زبان کا مرتبہ دینا چاہیے، مگر گاندھی جی نے عبدالحق کو ایک سے زیادہ مرتبہ باور کرایا کہ وہ کھلے طور پر یا دلی پر ہی اور ان کے اس استدلال میں کوئی زور اور وزن نہیں ہے، اس لیے ان کو چاہیے کہ قومی زبان کے مسئلے میں وہ گاندھی جی سے ہاتھ ملائیں، اور ان کے نظریے کی تائید کرتے ہوئے "ہندستانی" کو دو رسم خط میں قومی زبان تسلیم کرلیں — گاندھی جی کی اسی دعوت عمل کے بعد عبدالحق نے یہ دیکھا کہ راجندرا پرشاد ایک ضدی آدمی ہے، اور وہ ہندی کو قومی زبان بنانے کے لیے اپنے فیصلے پر اٹل ہیں، اس لیے وہ کسی طرح بھی گاندھی جی سے "ہندستانی" کے سلسلے میں ہاتھ نہیں ملاسکتے، اسی خیال سے انہوں نے ہاں کہدی، اور گاندھی جی کو لکھ بھیجا کہ اگر راجندرا پرشاد "ہندستانی" کو قومی زبان بنانے کے حق میں ہیں تو پھر میں بھی "ہندستانی" کو قومی زبان بنانے کے لیے تیار ہوں۔ عبدالحق کے اس فیصلے سے گاندھی جی باغ باغ ہوگئے، اور ان کا دلی شکریہ بھی ادا کیا۔ اب گاندھی جی راجندرا پرشاد سے کہا کہ چونکہ مولوی عبدالحق نے "ہندستانی" زبان کو قومی زبان بنانے پر اپنی رضامندی ظاہر کردی ہے، آپ بھی میرے قومی زبان "ہندستانی" والے نظریے کو قبول کرلو۔ یہ سن کر راجندرا پرشاد نے گاندھی جی کو صاف اور ٹکا سا جواب دیدیا کہ عبدالحق کے علاوہ اگر سارا ہندستان بھی آپ کے قومی زبان کے نظریے کو قبول کرلے تو اس کے بعد بھی میں اپنے فیصلے پر اٹل ہوں، اور میری وہی ایک آواز ہے کہ صرف ہندی ناگری رسم خط کے ساتھ قومی زبان ہونا چاہیے۔ ان کے اس سخت اور تند جواب کے بعد گاندھی جی ان سے خفا اور ناراض ہوگئے، اور کانگریس کی [illegible] کی ممبری، اور ہندی ساہتیہ سمیلن کی ممبرشپ سے استعفا دیدیا۔ گاندھی جی کے استعفا اور ان کی خفگی سے نہرو - پنڈت گووند ولبھ پنت - سردار پٹیل - مرار جی دیسائی - مولانا آزاد، اور ایس. کے. پاٹل وغیرا وغیرا سب ہی لیڈر بری طرح سے متاثر ہوئے، اور ان سبھوں نے راجندرا پرشاد کو سمجھایا کہ گاندھی جی کا شمار نہ صرف ہندستان، بلکہ دنیا کی بڑی شخصیتوں میں ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، قوم کی بھلائی کے لیے کہہ رہے ہیں، اس میں ان کا ذاتی فائدہ کچھ بھی نہیں ہے، اس لیے اس نوبت پہ قوم کی بھلائی بہتری کی خاطر تمہیں گاندھی جی کی بات کو مانتے ہوئے "ہندستانی" کو دو رسم خط کے ساتھ قومی زبان تسلیم کرلینا چاہیے۔ ہندستان کے تمام چوٹی کے اور بڑے ہی مشہور اور نامور لیڈروں نے راجندرا پرشاد پر مسلسل اتنا دباؤ ڈالا کہ آخر راجندرا پرشاد نے ہاں کہدی، اور گاندھی جی کو لکھ بھیجا کہ میں آپ کے "ہندستانی" کے دو رسم خط کے ساتھ قومی زبان کے نظریے کو تسلیم کرتا ہوں، اور ہندی کو قومی زبان بنانے کے نظریے سے باز آتا ہوں۔ ڈاکٹر راجندرا پرشاد، صدر ہندی ساہتیہ سمیلن کا یہ تحریری جواب پاکر گاندھی جی بے حد خوش ہوئے، اور اپنے جواب میں ان کا شکریہ ادا کیا!

اس کے بعد گاندھی جی نے مولوی عبدالحق کو لکھا کہ مولوی صاحب، آپ نے "ہندستانی" قومی زبان دو رسم خط کے سلسلے میں مجھ سے ہاتھ ملایا ہے، اس لیے کہ راجندرا پرشاد، صدر ہندی ساہتیہ سمیلن نے مجھ کو تحریری طور پر لکھ بھیجا ہے کہ وہ میرے نظریے اور اصول کے تحت "ہندستانی" زبان کو قومی زبان تسلیم کرتے ہیں، اور ہندی کو قومی زبان بنانے کے اپنے نظریے سے باز آگئے ہیں۔ ان کا یہ قلمی تحریر میرے پاس بطور سند موجود ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ جلد ہی اپنی فرصت اور سہولت کا لحاظ کرتے ہوئے [illegible] کوئی بھی تاریخ لکھ بھیجیں تو ہم آپ کی [illegible]

[illegible]

ہندستان کے تمام اسٹیٹس کے نمائندے شریک ہونگے، جن میں قابلِ ذکر چند ایک نام یہ ہیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ مولانا ابوالکلام آزاد - جواہر لال نہرو - سردار ولبھ بھائی پٹیل - گوبند ولبھ پنت - پرشوتم داس ٹنڈن - سیٹھ گووند داس - مرار جی دیسائی، اور ایس - کے - پاٹل وغیرہ وغیرہ بھی اس اہم قومی زبان کے سلسلے میں بلائی گئی کانفرنس میں مدعو ہونگے - بلکہ یقین کامل ہے کہ اب آپ انکار نہیں کر سکیں گے، اور جیسا کہ خود آپ نے اپنے قلم سے لکھ کر بھیجا ہے کہ خود آپ بھی ساری قوم کی فلاح و بہبود، اور بھلائی بہتری کی خاطر سارے ہندستان کے لیے ایک قومی زبان "ہندستانی" در رسم خط ناگری اور فارسی کے نظریے اور اصول کو تسلیم کرتے ہیں، اس لیے اب آپ سے میری درخواست ہے کہ آپ بعجلت ممکنہ میرے اس خط کا جواب دیں، تاکہ میں کانفرنس کی تاریخیں مقرر کر کے سارے ہندستان کے بڑے لیڈروں کے نام بشمول آپ دعوت نامے ارسال کر سکوں میں ہوں آپ کا خیر طلب -

موہن داس کرم چند گاندھی!

گاندھی جی کا یہ غیر متوقع جواب پاتے ہی، مولوی عبدالحق بغلیں جھانکنے لگے، اور سخت حیران اور پریشان ہو گئے کہ اب کیا کیا جائے کہ گاندھی نے انہیں اپنے پھندے میں پھانس لیا ہے - کوئی جواب بن نہیں پڑا، اس لیے عبدالحق نے گاندھی جی کو گول مول جواب دیدیا، اور کانفرنس میں خود شرکت کرنے سے صاف انکار کر دیا - عبدالحق نے اس نوبت پر ایک مکارانہ چال چلی، اور "ذو معنی" پن کے ساتھ گاندھی جی کو یہ جواب دیا، "گاندھی جی، آپ تو بڑے ہی بھولے بھالے آدمی معلوم ہوتے ہیں - آپ نہیں جانتے کہ راجندر پرشاد نہایت ہی مکار اور جھوٹا آدمی ہے، اس کے قول و فعل میں کوئی وزن نہیں، اس وقت نہرو، آزاد وغیرہ کے منانے سمجھانے سے اس نے اوپری طور پر ہاں کہدی ہے، اور بعد میں وہ کانفرنس میں شرکت سے صاف انکار کر دے گا، اس لیے میں خود بھی کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکتا! عبدالحق کا یہ "مکارانہ" اور "دو غلا" جواب پاکر گاندھی جی اور ہندستان کے تمام بڑے لیڈر حیران اور ششدر ہو گئے" اور ہم نے سنہ ۱۹۴۲ء کے "ہندستانی ادب" کے ایک نمبر میں یہ ساری تفصیل گناتے ہوئے اداریہ لکھا تھا، جس میں عبدالحق کو ہاری ہوئی "بھگی بلبل" قرار دیا تھا! جب دو بلبلیں لڑتی ہیں تو ایک بلبل کی جیت ہوتی ہے، اور وہ بلبل فاخرانہ انداز میں اچھلتی اور کودتی پھاندتی رہتی ہے، اور دوسری ہاری ہوئی بلبل "پٹ پٹ" کرتے ہوئے بھاگ گئی ہے - اس قلمی جنگ اور تحریری لڑائی کے بعد نتیجے کے طور پر گاندھی جی جیتی ہوئی فاخرانہ بلبل قرار پائے، اور مولوی عبدالحق ہاری ہوئی "پٹ پٹ" کرنے والی "بھگی بلبل" ثابت ہوئے؟

بابائے اردو مولوی عبدالحق بھگی بلبل تھے!

جی - ام - ہوترا زور قلم اور زیادا!

"ہندستانی" زبان پائندہ باد!

مرزا جعفر حسین

بیدل دہلوی

پنڈت کیلاس ناتھ کول بیدل مرحوم سے ملاقات کی عزت مجھے کبھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن پھر بھی میرے اور ان کے درمیان کئی خصوصیات مشترک تھیں۔ اول تو وہ ہم پیشہ تھے۔ وہ مظفر نگر میں وکیل تھے اور میں لکھنؤ میں وکالت کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ میرے بعض مخلص ترین دوست جانسٹھ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے۔ اس طرح مجھے بھی مظفر نگر سے قلبی لگاؤ تھا، لیکن جو تیسری نسبت مجھے ان سے حاصل ہوئی وہ ان کے کلام کے ساتھ میری گرویدگی ہے۔ حقیقت امر تو یہ ہے کہ میں نے ان کو انہیں کے کلام میں دیکھا اور اسی وسیلے سے جانا اور پہچانا۔ ان کے کلام کا مطالعہ ان کی شخصیت کے تمام جوہر ہماری بصیرت کے آگے روشن کر دیتا ہے۔ "تصورات بیدل" کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب ہمارے پاس ہے، اور یہی انتخاب ان کی شاعری کی چالیس سالہ زندگی کا مرقع ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ رنگ قدیم میں جدیدیت کی جھلک اور جدیدیت میں قدیم کا حسن ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان دونوں کا حسین امتزاج ان کے اشعار میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کو خود بھی اس کا احساس تھا فرماتے ہیں ؎

رنگ [illegible] کی جھلک

یعنی پیری میں بھی جوانی دیکھیں

یہ شعر ایک رباعی کے تیسرے اور چوتھے مصرع پر مشتمل ہے۔ یہ رباعی غالباً آخر عمر میں کہی تھی جب رنگ سخن پوری طرح مستحکم ہو چکا تھا، لیکن اس کے باوصف ان کے دل میں جدیدیت کی طرف اور زیادہ راغب ہونے کی تمنا تھی، یعنی یہ کہ ان کے ذہن و فکر میں لکیر کا فقیر بنے رہنے کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ وہ قدیم سے ہمہ گیری، بلندیٔ تخیل، حسن ادا اور جدیدیت سے رعنائیٔ فکر اور برنائیٔ بیان اخذ کرنے کے قائل تھے۔ اس مقام پر صرف ایک قطعہ مثالاً پیش کر دینا کافی ہوگا۔

اہل گوکل کا کبھی نغموں سے دل شاد کیا
اور کبھی طور پہ موسیٰ سے کچھ ارشاد کیا
تم اسی رنگ میں پھر اس کو نظر آتے ہو
جس نے جس رنگ عقیدت سے تمہیں یاد کیا

انہیں قوافی اور ردیف میں ان کی ایک غزل بھی "تصورات بیدل" میں موجود ہے۔ ارشاد بخیال زمانے میں اور اسی طرح میں ہمارے شہر لکھنؤ میں بھی جب ایک گراں قدر مشاعرہ پنڈت برج نرائن چکبست نے پنڈت [illegible] کے [illegible] گذرے واقع محلے گولا گنج میں منعقد کیا تھا جس میں تمام مشاہیر لکھنؤ نے شرکت کی تھی، اس [illegible]

[illegible]

غزلیں پڑی تھیں۔ راقم حروف کو بھی اس مشاعرے میں شرکت کرنے اور اپنی غزل پڑھنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اسی میں جوشؔ ملیح آبادی کی غزل نے مشاعرا لوٹ لیا تھا، جس کا مطلع یہ تھا ؎

سوز غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکش زیست سے آزاد کیا

بیدل دہلوی کی غزل دیکھ کر وہ مشاعرہ اب سامنے یاد آ گیا، اور دل تڑپ اٹھا کہ کاش وہ بھی اس مشاعرے میں موجود ہوتے، اور ہم ان کی غزل خود انہیں کی زبانی سنتے، بہر حال اس مقام پر ان کا مطلع اور دو اشعار درج ہیں ؎

مجھ حیرت کدۂ عالم ایجاد کیا
مجھ کو بے پردگیٔ حسن نے برباد کیا
میرا ممنون ہوا ہے خانۂ زنجیر جنوں
خود کو برباد کیا اور تجھے آباد کیا
بن گئے دشت و جبل باغ وطن کی تصویر
جب مسافر نے کبھی راہ میں گھر یاد کیا

"بے پردگیٔ حسن" اور "خانۂ زنجیر جنوں" کی ترکیبیں بے لطف آفریں نہیں ہیں، ان کی معنویت اور گہرائی بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ تیسرے شعر میں دشت و جبل کی بادیہ پیمائی کے دوران گھر کا یاد آ جانا فطری جذبات کا حال ہے، لیکن طرز ادا اور انداز بیان ایک دکھی مسافر کی داستان غربت کا ایک درد انگیز مرثیہ ہے، جو دلوں کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دشت و جبل میں صحرا نوردی کے وقت وطن کی یاد گھر کی تباہی کو بھی باغ و بہار بنا کر پیش کرتی ہے، اس منظر کا تصور بھی بے حد دردناک ہے۔

یہ سچ ہے کہ دور حاضر کے تقاضے ان قدروں سے بہت مختلف ہیں، جو نصف صدی قبل رائج تھیں، تاہم انسان اپنے خیالات و رجحانات میں اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا۔ زمانہ [illegible] کر لیا جا ہے بدل ڈالے، لیکن انسانیت، شرافت، نیکی اور تقدس اب بھی پوری طرح [illegible]

ان جوہروں کی جہاں بھی چمک دمک مل جاتی ہے، ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اگر خیالات میں بلندی، گہرائی اور ہمہ گیری ہو اور ساتھ ہی ساتھ طرز ادا میں توانائی بھی ہو تو ایسے شاعر کو ہم فنی حیثیت سے صف اول میں جگہ دینے کے لیے مجبور ہیں۔ بیدل کا کلام ان تمام خوبیوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس کا مطالعہ ہر سنجیدہ قاری کی روح کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا، خصوصی ان مقامات پر جہاں انہوں نے زندگی اور زندگی کی قدروں کا جائزہ لیا ہے، یا جہاں انہوں نے انسان کی بلند خصلتوں کو اپنی چشم بصیرت سے پرکھ کر پیش کیا ہے، ایک مختصر مضمون میں اشعار کی بہتات کے ساتھ مثالیں پیش کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، اس لیے صرف چند اشعار درج ذیل ہیں ؎

شکستہ بادباں، طوفاں بپا، گرداب میں کشتی
نہ دھوکے دے مجھے تو اے تمنا قرب ساحل کے
عشق کیا ہے، وہ بادۂ صافی
حسن جس کا سرور ہوتا ہے
برق یقیں جو چمکی تو اے ذوق بے خودی
ہم نے قبا جلے ہوش و خرد تار تار کی
حسن پروانے میں ہے شمع شبستاں میں نہیں
عشق کی آنکھ میں ہے جلوۂ عریاں میں نہیں
مجھ کو سکوں نہ مل سکا محکمۂ حیات میں
اور یہ جانتے ہوئے اس کی کوئی کمی نہیں
گلشن دہر میں وہ طائر پر بستہ ہوں
قید خانے میں نہیں، قید سے آزاد نہیں
فنا آمادہ ہر نقش و نگار بزم امکاں تھا
تعجب ہے رہا دنیا پہ ہستی کا گماں پھر بھی

ان اشعار میں فکر و خیال کی بہترین مثالیں ہیں، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چشم حقیقت بیں نے جو کچھ دیکھا اس کو بہترین اسلوب سخن کے ساتھ پیش کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی حساس قاری ان اشعار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا [illegible]

زندگی کی تلخیوں کو صاف صاف پیش کردینا سہل ہے، لیکن حسن وعشق کو ان کے اصلی رنگ روپ اور موثر الفاظ کا جامہ پہنانا یا حیات ناپائیدار کی تلخیوں میں لذت کی چاشنی پیدا کرنا دشوار کام ہے۔ انہیں وادیوں سے جو فنکار کامیابی کے ساتھ گزر جائے اسی کو ہم حقیقی اور دقیقہ سنج شاعر کہیں گے۔ بیدل کے یہاں قنوطیت کے مواقع پر بھی زندہ رہنے اور زندگی کو خوشگوار بنانے کی خواہش ہے۔ وہ قید سے آزاد نہ ہونے کو بھی یہی سمجھتے ہیں کہ "قید خانے میں نہیں" ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ "بادبان شکستہ" "طوفان بپا" اور "گرداب میں کشتی" ہونے کے بعد بھی "خود تمنا" ان کو قرب ساحل کے دھوکے نہیں دے سکتی۔ وہ جذبات کا احترام کرتے ہوئے بھی تفکر وتعقل کی منزل میں سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

بیدل کی غزلیات کا سرسری مطالعہ بھی واضح کردیتا ہے کہ ان کے کلام میں بے ثباتی دنیا کے پرکیف تذکرے، حسن وعشق کی بلند پایہ داستانیں، زندگی اور ماجرائے زندگی کی حلاوتیں اور تلخیاں، غم کے نوحے، اور شادی کے نغمے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اتنے حسن اعتدال کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں کہ ہمارے خوابیدہ احساسات متحرک ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ایک ٹھہری ہوئی طبیعت کے حامل اور فطرتاً اعتدال پسند تھے، اور یہ خصوصیت ان کے کردار سے کبھی جدا نہیں ہوسکی۔

انگریزی تعلیم سے پوری طرح اثر قبول کیا، لیکن اس طرح نہیں کہ اسلاف سے گنجینۂ معنی کا جو طلسم ان کو ورثے میں ملا تھا، اسے کم حقیقت سمجھ کر خیرباد کہہ دیتے۔ جدیدیت سے بھی بقدر ذوق لطف اندوز ہوئے مگر اپنے مذاق سلیم کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ خیالات و مطالب کی نزاکت میں بھی الفاظ کے انتخاب [illegible] رکھتے تھے۔

خرد کی رہنمائی ہو یا جنون کی کارفرمائی، ہر مقام پر متناسب اور متوازن انداز بیان نمونہ رہتا تھا، اور یہی شاعری کا طریقۂ امتیاز ہے۔ یہ مقصد پیش نظر نہ ہو تو ایک ادیب قلم گو ہوسکتا ہے، لیکن اچھا شاعر کہلانے کا حقدار نہ ہوگا۔ بیدل کو اس فن میں اتنا کمال حاصل تھا کہ کبھی وہ حقیقت منتظر اور صداقت جمال کے پروانہ وار معترف نظر آتے ہیں، اور جو کچھ ان کے دل پر گزرتی ہے، اسی کیفیت کو اس صفائی اور بے ساختگی اور برجستگی سے کہہ جاتے ہیں کہ سننے والا مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی قبیل کے اشعار ان کے کلام میں فراوانی کے ساتھ ملتے ہیں۔ مثالیں چند درج ذیل ہیں جو فن شعر کے ہر جوہری کو مالا مال کردیں گے ؎

ارمان اور حسرت دل میں کہاں ٹھہرتے
ویرانیوں سے ایسا برباد ہو گیا تھا

تیری غفلت شعاریوں کی قسم
بھولتا ہی نہیں عتاب ترا

عشق کی ابتدا دل بیدل
حسن کی ابتدا شباب ترا

محبت کے سمندر کو بنا دے بے کنارا اے دل
نہ ہو ساحل تو پھر طوفاں بھی طوفاں نہیں ہوتا

چلے رہے ہیں اپنے مقصد کے ساتھ ساتھ
بیگانہ ہو چکے ہیں سزا و جزا سے ہم

دل میں آتا ہے جب ان مست نگاہوں کا خیال
تو ہو جاتا ہے عالم مرے پیمانے میں

دیوانگی کا قصہ دیوانے کی زبانی
کچھ کہہ گئی یہاں سے کچھ کہہ گئی وہاں سے

کہاں سجدے کی ہمت ہر کسی کے آستانے پر
مگر جب یاد آتے ہیں جھکا لیتا ہوں گردن کو

خبر کچھ قافلے کو ہے نہ کچھ پروا ہے منزل کی
خدا جانے کہاں لے جائیں گی بیتابیاں دل کی

ہندستانی شاعروں نے اپنا رنگ روپ الگ نکھارا اور سارا نکھار فارسی شاعروں سے حاصل کیا [illegible]

اضافتیں یہاں تک کہ اسلوب سخن بھی ہندستانی والوں نے فارسی سے لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ رنگ تصوف بھی ہندستانی شاعری میں ثبات کے ساتھ موجود ہے۔ خواجہ میر درد اور میر تقی میر صوفیائے کرام میں سے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے طرز فکر و بیان نے اس رنگ کو اور چوکھا کر دیا۔ دوسرے شعرا کے یہاں بھی تصوف کے شاہکار موجود ہیں، لیکن کہنا پڑتا ہے کہ ان میں روایت زیادہ ہے، اور انفرادیت کم ہے۔ یہ انفرادیت آخری دور کے شعرا میں بیدل کے یہاں ملتی ہے، جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ ویدانتی فلسفے سے بھی بخوبی آگاہ تھے اور اس سے متاثر بھی تھے۔ ایرانی رنگ تصوف کے ساتھ ویدانتی طرز فکر کی آمیزش بیدل کی شاعری میں سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ ان کے یہاں تخلیق عالم، تخلیق آدم، غایت خلقت انسان، دنیا میں آدمی کی حیثیت، حسن حقیقی کی جلوہ فرمائی، بصیرت کی کار فرمائی، عبد و معبود میں واسطہ ان تمام حالات و معاملات کی وضاحت اور ترجمانی اسی انداز میں ہے جو حقیقی صوفی شعرا کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ انھوں نے بھی قید تعینات کے طلسم کو سے ہی حسن حقیقی کا مشاہدہ کرنے کی تلاش کی ہے۔ اس ناپائیدار ہستی کو سیماب ایزدی قرار دیتے ہوئے اپنے قطرۂ وجود کو بحر ناپیدا کنار سے ہم کنار ہونے کی تمنا کی ہے۔ اپنی اس تلاش، تجسس اور تمنا میں انھوں نے تصور کے مدارج طے کیے ہیں، دیدۂ بصیرت سے مشاہدے کی کوشش کی ہے، اور اپنے دل کی اس تڑپ کو جو صوفیائے کرام کی شان ہے بڑی حد تک آسودگی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ بیدل نے تصوف کے مدارج کامیابی کے ساتھ طے کیے تھے، ورنہ ان کے دل میں وہ گداز اور زبان میں وہ بے ساختگی نہ ہوتی جو ان کے اشعار میں نمایاں ہے۔ ان کا یہ طرز بیان رسمی ہوتا تو ان کے اشعار میں وہ جوش نہ ہوتا جس کو قاری اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے۔ چند اشعار مثال درج

نغمہ سنج کن نے چھیڑا راگ خلق دہر کا
انس آیا وجد میں اور شکل انساں ہو گیا

پہلے سب بے کیف تھا گو تھی فضا معمور حسن
عشق جب پیدا ہوا تزئین محفل ہو گئی

تنگ تھی وحشی کو تیرے وسعت وہم و خیال
گو ابھی وہ معرفت کی اولیں منزل میں تھا

حسن شیریں تو ہر اک سنگ میں ہے جلوہ فروز
باہ سے دیکھنے والا کوئی فرہاد نہیں

موت سمجھے اسے افسوس یہ دنیا والے
روح کو قید علائق سے جو آزاد کیا

زندگی کو قید سمجھا موت کو سمجھا حیات
تیرے دیوانے کو اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

مجھ سے چھپنا چھپنے والے کا خیال خام تھا
میری بینائی کی وسعت کا تصور نام تھا

ہوتا جاتا ہے اور دل سے قریب
جتنا آنکھوں سے دور ہوتا ہے

یہ اشعار صرف "مشتے نمونہ از خروارے" ہیں۔ بیدل کے مطبوعہ انتخاب میں بہ کثرت ایسے اشعار موجود ہیں، جن میں "وحدت واجب الوجود"، الوہیت، عبدیت اور تصوف سے متعلق مراحل کے انتہائی لطیف مضامین نظم کیے گئے ہیں، جو ان کو عرفان کے اعلا مدارج تک پہنچا دیتے ہیں۔

بیدل اس دار فانی میں زندگی بسر کرنے کے لیے محبت کا پیغام لے کر آئے تھے۔ یہ پیغام ان کے روحانی مشن اور مادی طرز زندگی دونوں کے لیے افضلیت کا درجہ رکھتا ہے۔ تصوف کے منازل میں یہی محبت عبد اور معبود کے مابین رابطہ ہے، اور اسی مادی دنیا میں بنی نوع انسان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مفکر، ہر ہادی، ہر رہنما اور ہر صوفی نے محبت کا درس دیا ہے۔ انسان پھر بھی اتنا گمراہ ہے کہ وہ "محبت" کو اب تک اپنا نہیں سکا، اگر ہم ایک دوسرے سے بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل محبت کرنے

خاتمہ ہو سکتا ہے اور ہماری زندگی امن و آسودگی سے ہمکنار ہو سکتی ہے، اسی لیے ضرورت ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں کچھ ایسے مصلح پیدا ہوتے رہیں جو خدا کے بندوں کو شد و مد کے ساتھ محبت کا درس دیتے رہیں، چنانچہ ایسا برابر ہوتا رہا ہے۔ بظاہر یہ پیش پا افتادہ سبق ہر ادیب اور ہر شاعر دہراتا رہا ہے، البتہ طرز بیان میں فرق ہوتا رہا ہے اور یہ فرق اب بھی پایا جاتا ہے۔ کہنا پڑتا ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، اور خلوص سے کہی جاتی ہے، وہ دل میں اتر جاتی ہے۔ بیدل کے ہم عصر دوسرے مشہور ادیبوں اور شاعروں سے مناسبت کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی، اگر یہ کہا جائے کہ بیدل کے کلام میں بہت اثر ہے، اس اثر کو ہر قاری محسوس کر سکتا ہے، بشرطیکہ پہلو میں ایک گداز دل ہو۔ انہوں نے ترغیب کر مذہب کی ظاہری تصدیق کو مٹانے کی کوشش کی ہے، اور وحدت کا سبق دیا ہے، وحدت کے تخیل میں الوہیت کے ساتھ ہی نوع انسان کی واحد برادری کا تصور بھی شامل رکھا ہے، ملاحظہ ہو ؎

تھا وہیں کعبہ، وہیں مسجد، وہیں بت خانہ تھا
بندگی کے جوش میں، میں نے جہاں سجدہ کیا
حدوں سے دین کے باہر محبت کا شوالہ ہے
پرستار محبت تابع زنداں نہیں رہتا
رام اور رحیم کو تو ہم مانتے ہیں واحد
جھگڑا ہے خوب لیکن ناقوس کا اذاں سے
اندھیرے کو چھپا لیتا ہے جیسے نور کا دامن
محبت میں چھپا لیتا ہوں میں تحقیر دشمن کو
دیر ہندو کے لیے کعبہ مسلماں کے لیے
آؤ رندو! ہم چلیں جس جا ملائے جاتے ہیں

انہیں اشعار میں درس عرفاں بھی ہے، اور درس حیات و آدمیت بھی، انسانیت کے آگے سر بسجود بھی ہیں اور انسان کا بول بالا کر رہے ہیں۔ صوفیائے متقدمین کی مقدس شاہراہوں پر متانت قدم بڑھاتے ہوئے انہوں نے ناقوس و اذان کے جھگڑوں کو کم حقیقت قرار دیا ہے تو دوسری طرف آبائی ہندو دھرم کا پابند ہوتے ہوئے دوسرے مذاہب کی برگزیدہ شخصیتوں کا احترام بھی کیا ہے۔ انہوں نے کعبے اور بت خانے میں امتیاز نہیں کیا ناقوس و اذان میں ایک ہی آواز سنی اور وجود حقیقی کا جلوہ ہر جگہ یکساں طور پر دیکھا۔ ان کے کلام میں بھجن بھی ہیں، سری کرشن بھگوان کی شان میں ترانا بھی ہے، اور اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کربلا میں ایک عظیم قربانی پیش کرنے والے ہیرو سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ "تصورات بیدل" میں ایک ترجیع بند "یادگار حسینی" عنوان سے موجود ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ کربلا کا جس زمانے میں "سیزدہ صد سالہ یادگار" منائی گئی تھی، اسی موقع پر یہ نظم بھی کہی گئی تھی، کیونکہ پہلا ہی شعر یہ ہے ؎

آج گلشن کی خوشی میں رنج کا عالم بھی ہے
چشم نرگس وا تو ہے لیکن ذرا پُرنم بھی ہے

یہ ترجیع بند پانچ بندوں پر مشتمل ہے، جو انہوں نے محسوس کر کے کہے تھے، مثالاً دو بند پیش کیے جاتے ہیں ؎

آج ہم افسانۂ مہر و وفا کہنے کو ہیں
ایک خونیں واقعے کا ماجرا کہنے کو ہیں
حال سکینہ و تسلیم و رضا کہنے کو ہیں
ضبط اور پھر ضبط کی بھی انتہا کہنے کو ہیں
جہد آزادی کا ایک قصہ نیا کہنے کو ہیں
خود کو کھو کر بے خودی کا مدعا کہنے کو ہیں
پیاس سے مر جاتے ہیں تو بھی حمیت کے لیے
سر کٹا دیتے ہیں عزت اور عظمت کے لیے

آدمیت بھولنا کیا مذہبی فرمان ہے
جسم مذہب ہے تو جب قوم اس کی جان ہے
دین کیا رسمی ہدایت زیست آسان ہے
کبر و نخوت کو مٹانا آدمی کی شان ہے

ہند والے ایک ہو جائیں یہی ارمان ہے
حریت بیدلؔ ہمارا دین ہے ایمان ہے
دیکھیے تو فخر کو اپنا بناتے ہیں حسینؓ
کربلا میں پیاس دشمن کی بجھاتے ہیں حسینؓ

ایک مختصر نظم میں انسانیت، شرافت، صداقت اور حریت کا درس بھی ہے اور ہندوستانیوں کو متحد و متفق ہونے کی تلقین بھی ہے۔ امام حسین کی قربانی کو سراہ کر ایسا سبق دینا یقیناً مناسب اور برمحل تھا۔ خصوصاً جب ہم یہ بھی یاد کر لیں کہ یہ نظم اس وقت کہی گئی تھی، جب ہندستان شدید ترین کرب میں مبتلا تھا، ہماری جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی، اور انگریز انتہائی بے رحمانہ ظلم و تشدد کے پہاڑ ہم پر توڑ رہے تھے۔ یورپ میں دوسری جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ ان دنوں بربریت کو شرما دینے والے مظالم ہو رہے تھے۔ اس وقت ہمارا سب سے بڑا دین یہی تھا کہ ہم ایک جسم و جان ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں اور اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں۔ بیدل نے اس نظم میں روحانی اور مادی دونوں اقدار ملحوظ رکھے ہیں۔

اوپر کی نظم کے علاوہ "تصورات بیدل" میں اور دوسری نظمیں بھی متعدد عنوانات کے تحت موجود ہیں، جن میں بعض سیاسی نوعیت کی ہیں، لیکن بیدل کی روح اور ان کے کردار کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے ان کی غزلیات ہی کا مطالعہ غائر مطالعہ اور بار بار مطالعہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ ان کے پیش نظر جو پیغام تھا، وہ انہوں نے غزلوں ہی کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے اور اپنے کردار کو واضح کرنے کے لیے خود انہوں نے بھی اسی صنف کلام کو وسیلہ بنایا ہے۔ وہ ایک اچھے اور بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مالک بھی تھے۔ خستہ حالی اور مالی اعتبار سے فارغ البال ہوتے ہوئے درویش صفت انسان تھے، اور قناعت کوشی ان کے نفس کا بے مثال جوہر تھی۔ بستر مرگ پر اپنے ہونہار فرزندوں کو یاد کر کے ایک قطعہ اور رباعی لکھ کر بھیج دیا تھا، یہی دو اشعار ان کی شرافت نفس اور قناعت پرستی کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، فرماتے ہیں۔

آنا ہے تو آؤ پھر کچھ کہ نہ پاؤ گے ہمیں
ہم چلے جائیں گے تب دیکھنے آؤ گے ہمیں
فقر و فاقہ سے ہے پر بیدل درویش کا گھر
لے ہی جاؤ گے کچھ دے کے نہ جاؤ گے ہمیں

لیکن جب ان کے مایۂ ناز فرزند پی۔ این۔ کول (آئی۔ اے۔ ایس) وہاں تک پہنچے تو ان کا طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا۔ بیدل کے اٹھ جانے کے بعد ہندستانی کلاسیکل شاعری کی انجمن سونی ہو گئی، آخری چراغ گل ہو گیا۔

اکبر جے پوری

کوئی گلاب تو ہو

خوشی ہے گرچہ بڑی چیز اس زمانے میں
بڑھے نہ اتنی کہ آنکھوں میں اشک آجائیں
چراغ گرچہ اندھیرے کو دور کرتے ہیں
جلیں نہ اتنے کہ محفل کو بھی جلا جائیں
چمن میں بزم میں دامان حسن خوباں میں
ہزار رنگ میں لیکن کوئی گلاب تو ہو
نظر فریب ہو کتنا ہی اک فریب نظر
سراب چھانئے امکان موج آب تو ہو
قبول ایک ہی ذرہ جو روشنی بخشے
فضول وسعت صحرا جو قہر بن جائے
قبول ایک ہی قطرہ جو پیاس دور کرے
فضول ایسا سمندر جو زہر بن جائے
وہ جس سے دانش و علم و ہنر کے باب کھلیں
وہ ایک لفظ فسانے کی جان ہوتا ہے
وہ جس سے گردش شام و سحر حسین ہو
وہ ایک لمحہ زمانہ کی آن ہوتا ہے

اقبال کرشن

دیوان غالب کا عروضی جائزہ

غالب نے سودا، ناسخ یا ذوق کی طرح مشکل اور بنجر زمینوں پر طبع آزمائی نہیں کی - ان کے دیوان میں بھی صرف اسمٰعہ بحریں ملتی ہیں - ان اسمٰعہ بحروں کی متعدد مزاحف صورتیں ہیں، اور پھر ہر ایک مزاحف صورت میں بیسیوں زمینیں ہیں -

الف - بحر ہزج - اس بحر کی چھ صورتیں غالب کے یہاں ملتی ہیں -

۱ - بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف - اس میں صرف ایک زمین ہے -

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

۲ - بحر ہزج محذوف یا مقصور - اس میں دو زمینیں ہیں -

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

ہوا بزمِ طرب میں رقص ناہید

۳ - بحر ہزج مثمن اخرب - اس میں صرف ایک زمین ہے -

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے -

۴ - بحر ہزج مثمن اشتر - اس میں چار زمینیں ہیں -

سمجھے ہو نہ رہیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

نکارخانہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے

۵ - بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف مقصور - اس بحر میں غالب نے سترہ زمینیں نکالی ہیں -

۶ - بحر ہزج مثمن سالم - اس بحر میں غالب کے یہاں (۳۵) زمینیں ہیں -

ب - بحر مجتث - غالب نے اس بحر کی دو مزاحف صورتیں استعمال کی ہیں -

۱ - بحر مجتث مثمن مخبون مقصور - اس میں (۲۶) زمینیں ہیں -

۲ - بحر مجتث مثمن مخبون - اس میں دو زمینیں ہیں -

حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے

پ - بحر منسرح - اس کی ایک ہی مزاحف صورت ملتی ہے -

۱ - بحر منسرح مثمن مطوی مجدوع - اس میں ایک ہی زمین ہے -

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے

ت - بحر رجز - اس کی ایک ہی مزاحف صورت استعمال کی گئی ہے -

۱ - بحر رجز مثمن مطوی مخبون - دو زمینیں ہیں اس میں -

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

ث - بحر متقارب - اس کی ایک ہی سالم صورت ملتی ہے

۱ - بحر متقارب مثمن - سالم - اس میں تین زمینیں ہیں ؎ لب خشک در تشنگی مردگاں کا

زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

(؎) سلام حرکرو تا قیامت سلامت

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں

ث - بحر خفیف - اس کی صرف ایک ہی مزاحف صورت استعمال کی گئی ہے -

۱ - بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مقصور - اس میں ۱۲ زمینیں ہیں -

ج - بحر مضارع - اس کی دو مزاحف صورتیں ملتی ہیں -

۱ - بحر مضارع مثمن اخرب - اس میں دو زمینیں ہیں ؎ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی

۲ - بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف مقصور - اس میں ۱٦ زمینیں ہیں - غالب کے یہاں سب سے زرخیز بحر یہی ہے -

ح - بحر رمل - اس کی پانچ صورتیں ہیں -

۱ - بحر رمل مثمن مشکول - اس میں دو زمینیں ہیں -

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا

کبھی کوئی دکھ میں جس نے نہ سنی مری کہانی

۲ - بحر رمل مسدس محذوف - اس میں پانچ زمینیں ہیں -

۳ - بحر رمل مسدس مخبون مشعث مقصور - اس میں چھ زمینیں ہیں -

۴ - بحر رمل مثمن محذوف - اس میں چالیس زمینیں ہیں -

۵ - بحر رمل مثمن مخبون مشعث مقصور - اس میں ۲۹ زمینیں ہیں -

یہاں تک غزلیات، قصائد اور قطعات کا جائزہ لیا گیا - اب دو ... مثنوی رثیا: یہ بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں ہے -

در صفت انبہ - یہ بحر خفیف مسدس مشعث مقصور میں ہے -

رباعیات - دیوان غالب میں کل ۱۵ رباعیاں ملتی ہیں - رباعیوں میں جو جو بحریں غالب نے استعمال کی ہیں وہ یہ ہیں -

۱ - مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع

۲ - مفعول مفاعیل مفاعیل فعل

۳ - مفعول مفاعلن مفاعیلن فع

۴ - مفعول مفاعیل مفاعیلن فع

۵ - مفعول مفاعیلن مفعول فعل

٦ - مفعول مفاعیل مفاعیل فعول

۷ - مفعول مفاعلن مفاعیل فعول

۸ - مفعول مفاعلن مفاعیل فعل

۹ - مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

۱۰ - مفعولن فاعلن مفاعیل فعل

۱۱ - مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

۱۲ - مفعولن فاعلن مفاعیل فعول

اب ایک ایک رباعی کے اوزان اوپر کی بحروں کے نمبروں کے ذریعے درج کیے جاتے ہیں -

رباعی ۱ (۹، ٦، ۸، ۱) رباعی ۲ (۴، ۳، ۸، ۳)

رباعی ۳ (۹، ٦، ۳، ۷) رباعی ۴ (۸، ۸، ۱، ۸)

رباعی ۵ (۸، ۸، ۱۲، ۸) رباعی ٦ (۳، ۳، ۸، ۱۱)

رباعی ۷ (۳، ۱۱، ۵، ۱۱) رباعی ۸ (۳، ۳، ۱۱، ۱۱)

رباعی ۹ (٦، ٦، ۷، ۷) رباعی ۱۰ (۳، ۳، ۱۱، ۱۱)

رباعی ۱۱ (۸، ۸، ۸، ۲) رباعی ۱۲ (۸، ۸، ۱۲، ۸)

رباعی ۱۳ (۸، ۲، ۳، ۱۰) رباعی ۱۴ (۳، ۳، ۱، ۳)

رباعی ۱۵ (۴، ۴، ۴، ۴)

رباعیوں کی ترتیب بیان غالب از باقر کے مطابق ہیں -

اشتعار - فروری - اردو کہانیاں ۱۹۴۷ء ہندستانی ادب جنوری - فروری - مارچ ۱۹۶۶ء

عطیہ پروین

گرتی دیواریں

رات کی بارش میں بیگم صاحب کی حویلی کی داہنی طرف کی دیوار بھی گر گئی!

وہ زور کا دھماکا ہوا کہ محلے کے لوگ سوتے سے جاگ اٹھے۔ بہو رانی پلنگ پر سے اچھل پڑیں۔ چند لمحوں تک تو کچھ سمجھ ہی میں نہ آیا، آنکھیں کھولے کمرے کی چھت کو دیکھتی رہیں۔ اس چھت کو جس کی دھنیوں میں جگہ جگہ دیمک لگ چکی تھی۔ دو ایک میں تو بال بھی پڑ گیا تھا۔ بہو رانی ڈر کے مارے چھت کی طرف نظر بھی نہ اٹھا سکیں، ان کو لگتا تھا دوں کی گرمی برداشت نہ کر کے یہ دیمک زدہ چھت اڑا اڑا دھم کر کے ان کے اوپر آ گرے گی۔

آخر انہوں نے اپنے ہوش و حواس اکٹھا کیے اور پاس کے بستر پر سوتے چھوٹے میاں کا شانہ ہلا کر پکاریں۔

"اٹھیے ذرا سنیے تو۔"

"میں جاگ رہا ہوں" چھوٹے میاں بولے

"یہ دھماکا۔" بہو رانی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"شاید! چھوٹے میاں ذرا رک کر بولے۔ شاید داہنی طرف کی دیوار بھی گر گئی ہے"

"ہاں ایک موسم پہلے ہی کمزور تھی۔ بہو رانی نے [illegible] سے کہا۔ اب کیا ہوگا؟"

"[illegible] کیا [illegible] پھر قنات منگا کر [illegible]

"پتا نہیں اماں جان کو کیا ہوا ہے۔ اس آن بان اور پرانی چیزوں کی محبت میں وہ ہم کو بھی بھولی جا رہی ہیں ذرا اٹھیے دیکھیے وہ گھبرا نہ رہی ہوں۔"

بیوی کے کہنے پر چھوٹے میاں اٹھے لیمپ کی بتی اونچی کی سرہانے سے ٹارچ اٹھائی اور بہت آہستہ آہستہ زینے پر سے اترنے لگے!

بیگم صاحب اس ناکافی روشنی میں اسی طرح اور طویل سہ دری میں اپنا چپتل کے منقش پایوں والی مسہری پر کسی سایے کی طرح بیٹھی تھیں۔

"کون؟ چھوٹے میاں؟ انہوں نے گونجدار آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں — اماں جان — وہ دیوار"

"ہاں گر گئی — بیگم صاحب نے ایک سرد آہ بھری۔ اس دیوار سے کتنی یادیں وابستہ ہیں۔ بچے تم کیا جانو۔ کل بازار سے ایک قنات منگوا کر گھروا دو۔"

"بارہ روپے روز پر" چھوٹے میاں نے بہت کوشش کی پھر بھی لہجے کی تلخی پر قابو حاصل نہ کر سکے۔

"بیگم صاحب نے اس تلخی کو محسوس کیا بڑے کڑوے لہجے میں بولیں۔

"جب تک یہ سنتا ہوں تب تک تمہیں نوکری کی فرصت نہیں ہے۔ ۱۲ نہیں ۲۴ ہفتے روز چکانے آئے گی اور ضرور بلوا کر [illegible] کی طرح سنبھال کر رکھ لی جائیگی۔"

چھوٹے میاں نے بے حد [illegible] کہا "لیکن [illegible]

[illegible]

ب تک پھیل پھیل کر رکھا تھا، وہ ناگ کے پھن کے مانند فراخ ہوگیا۔

"اماں جان۔ گستاخی معاف۔ یہ بے جان چیزیں ہمیں کیا دیں گی۔ پوری حویلی مخدوش ہوگئی ہے، میں ڈرتا ہوں اگلے سال کی بارش میں ہم سب اسی کے اندر دفن نہ ہو جائیں، اور لوگ یہ عجیب و نادر مقبرا دیکھنے کے لیے دور دور سے آنے لگیں۔"

تب "بیگم صاحب فرمائیں! بات میں پکڑی تسبیح انہوں نے مسہری کے پائے پر ٹانک دی، اور چھوٹے میاں کی طرف دیکھا۔ وہ ان کے سامنے کھڑے تھے، لیکن ان کا رخ آنگن کی طرف تھا، لمبے تڑنگے چھوٹے میاں! ہو بہو اپنے باپ میر صادق حسین کی صورت تھے۔ ان کو دیکھ کر بیگم صاحب کو کیا کیا نہ یاد آجاتا تھا۔

اللہ! کیا رعب و دبدبہ تھا صادق حسین کا! کیا آن اور شان تھی اس حویلی کی۔ جانے کتنوں کے گھر بن گئے، اسی در سے جانے کتنوں کی شادیاں ہوگئیں صادق حسین کے کرم سے! اب یہ تو شان ہی تھی جاگیرداروں اور تعلقداروں کی کہ پندرہ بیس مصاحب جمع رہتے، کبھی کبھار راگ و رنگ کی محفلیں سج جاتیں، رقاصہ کے کسی اچھے شعر پر یا کسی جان لیوا ادا پر کتنا کمن روپے برس جائیں۔ دروازے پر ہاتھی اور گھوڑے کے بندھنے بغیر شان نہ معلوم ہو۔ دسترخوان پر جب تک پچاس باون حضرتے نہ ہوں نوالہ حلق سے نیچے نہ اترے۔

ارے اس حویلی کے ایک ایک ذرے سے ہزاروں یادیں وابستہ تھیں۔ بیگم صاحب ان چیزوں میں [illegible] کس طرح وہ [illegible] سر پیٹ کر رہ گئیں کلیجا پھٹ جاتا [illegible] یہ نیا [illegible] کیا جانے ان چیزوں کی قدر۔ اب [illegible] چھوٹے میاں کو [illegible] پرانی چیزیں [illegible] اللہ واسطے کا بیر ہے۔ [illegible] وقت سے [illegible] تاکہ ان پرانی [illegible]! اف یہ [illegible] شیش محل کی طرح [illegible] آہ آج! زبان حال سے [illegible] وہ [illegible] رہے ہیں

وہ شان نہ رہی، نئے وارث یادوں کے اس خزانے کو لٹا دینا چاہتے ہیں۔ یہ پرانا صوفا جو آج جگہ جگہ سے کھیس کاڑھے نظر آتا ہے کبھی اس کا حسن دیکھنے والا تھا۔ بڑے بڑے لوگ اس پر بیٹھ چکے ہیں، چھوٹے کہتا ہے "اماں جان اس صوفے کو کباڑیے کو دے ڈالیے، ہم نیا صوفا لے آئیں گے۔" یہ مسہری میرے جہیز کی ہے، کیا ہوا جو اس کی پالش چھوٹ چکی ہے، سرہانا چٹخ گیا ہے۔ ذرا بوسیدہ ہو چکی ہے۔ کبھی اس کا بھی زمانہ تھا، لوگ اس کو دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے، چھوٹے کہتا ہے۔

"اماں جان اس پرانی مسہری کی جگہ نئے ڈیزائن کی مسہری لگا دی جائے تو شان ہی اور ہو جائے۔"

کس کس چیز کا ماتم کروں۔ آرائش کے یہ سامان یہ تخت، یہ چوکیاں، یہ پیڑھیاں، یہ صندوق۔ ارے کیا ہوا اگر اپنی آب و تاب کھو چکے ہیں۔ پہلانے دنوں کی یادگار ہیں، انہیں تو آنکھوں سے لگا رکھنا چاہیے حویلی کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی ہیں، فرش کا پلستر بالشت بالشت بھر کے فاصلے سے اکھڑ چکا ہے، یوں لگتا ہے جیسے کسی برص کے مریض کا جسم! فرش کے قالین سڑ گل گئے ہیں، تختوں کی چاندنیاں تار تار ہو چکی ہیں۔ گاؤ تکیے مرے ہوئے بکروں کی طرح بدہیئت ہیں، مگر۔ مگر وہی "نا!"۔

آج یہ دیوار ہی گر گئی۔ اب کیا ہوگا؟ اونھ! ہوگا کیا قنات گھروا دوں گی، مگر قنات ۱۲ روپے بعد پر آئے گی کیا میں دے سکوں گی؟

پچھلی قنات کا کرایہ ہی کتنا چڑھ گیا ہے! چھوٹے سے تو کہہ دیا میرے جیتے جی فکر نہ کر۔ اپنی آن اور حویلی کی شان برقرار رکھنے کے لیے اپنی آخری سانس تک جدوجہد کروں گی۔ پر قنات کا کرایا؟ سارے صندوق خالی ہو گئے۔!

وہ قیمتی جوڑے، وہ زیورات سب اس آن کے اوپر قربان ہو گئے۔ اب کون سا صندوق کھولوں۔ کہاں پھر روپیہ نکالوں، اور غرور سے سر اونچا کرکے چھوٹے کے سامنے پھینک دوں!

اگر اس [illegible]

کری ہوتی تو !

تین سو روپلی میں آج کل کیا ہوتا ہے ؟ تین سو روپے تو بس ہمارا باورچی لے جایا کرتا تھا، مگر ایمان کی بات یہ کہ چھوٹے نے نسخے کا یہ سہارا ڈھونڈ نہ لیا ہوتا تو — تو ؟

آہ ! اس چھوٹے کی ولادت پر حویلی میں کیا کیا نہ ہنگامے ہوئے تھے ؟ رت جگے ! خدا رات ! چھٹی کے موقع پر بستی بھر کا کھانا گویا دعوت عام - پرجاوں کے بھاری بھاری جوڑے، سونے کے کنگن لدے چاندی کی پازیبیں دائیوں کو تو نہال کر دیا گیا تھا - اس ایک اکیلے پر ہم - ہم کھلا ئیاں کی گئی تھیں ! کل جو میرا پوتا پیدا ہوگا تو اس کی ولادت کے موقع پر کیا ہوگا ؟

سارے صندوق خالی ہو گئے ! الماریاں بھائیں بھائیں کرنے لگیں !

چھوٹے کہتا ہے !

" اماں جان ! اب یہ سارے صندوق باہر والے گودام میں مقفل کروا دیجیے یا لا دیجیے میں چیر چیر کر ایندھن نکال لوں ہفتے عشرے تک ایندھن کی فکر سے نجات مل جائے گی "

ارے ! کوئی دل چیز ڈالتا !

یہ صندوق نہ شادوں ! ساری یادوں کو آگ لگا دوں پھر کس کے سہارے جیوں -

چھوٹے کہتا ہے -

" اماں جان ! آپ کو ہم لوگوں سے زیادہ یہ چیزیں پیاری ہیں - ہمارے احساسات اور جذبات کی قدر نہیں ہے آپ کو - اماں جان میں اپنے ملنے والوں کو اس گھر میں بلا نہیں سکتا - مقبرے میں پہنچ کر صدما ہی ہوتا ہے، خوشی نہیں ہوتی - کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں کسی کو بٹھا دوں صوفے کے پرخچے اڑے ہیں تو کرسیوں کے پائے ہلتے ہیں !"

یہ صوفا ! یہ قالین ! یہ صندلی !

ارے اس کو کیا قدر ان چیزوں کی ! ہاں لاکھ لٹے سوا لاکھ کا ہوتا ہے - کل بھری بارش آنگن میں کرسی تھی اچانک ایک پرنالا ٹوٹ کر نیچے گرا - بال بال بچ گئی لڑکی ! پھر بھی بیٹے نے قدر سے اف نہ کیا - اب یہ پرنالا جو گرا ہے ایک ہفتے دن کی مزدوری کے بعد ٹھیک ہوگا -

[illegible]

" اماں جان اگر اجازت دے دیں تو اس حویلی کا پچھلا حصہ کٹ کے کرائے پر اٹھ جائے - اس کرائے میں سال چھ مہینے میں پوری حویلی کی مرمت کروالی جائے، کچھ چیزیں جو مخدوش ہیں، گروا کر پھر سے بنوالی جائیں -

لو اور سنو !

ارے باپ دادا کی روحیں نہ بے قرار ہو جائیں گی' بھلا میر صادق حسین کی حویلی اور کرائے پر !

اف نوہ !

کس غضب کا اندھیرا ہے، سامنے کے صدیق مستری نے اپنے گھر میں بجلی لگوائی ہے، رات بھر دھکا دھک جلاتا ہے - نئے گاؤں اورنٹ آیا، مگر روشنی بڑی بابھی ہوتی ہے یہ ماننا پڑے گا - ایک بلب اگر اسی سے دری میں جلا دو تو پوری کی پوری جگمگا اٹھے -

رات میں جو میں جگہ جگہ دھکے کھاتی پھرتی ہوں، نہ کھاؤں ہوا بھی کتنی تیز ہے - سائیں ! سائیں ! جیسے ہزاروں بھوت اڑتے پھر رہے ہوں - دیوار گرنے سے ذرا سی روک بھی نہیں رہ گئی - محلے کے آوارہ کتے اور بلیاں گھس کر آتے ہیں، اور میرا ننھا منا پوتا ! ارے اگر گھٹنیوں چلتا ہوا کو نے کمرے سے باہر نکل گیا تو ؟ سڑک پر موٹریں کا کیسا زناٹے چلا کرتی ہیں، میرا پھول سا بچہ !

نہیں ! نہیں !

ان کے ہاتھ بے اختیار کانوں پر چلے گئے، اور بدن میں جھرجھری آ گئی -

چھوٹے میاں نے پلٹ کر بیگم صاحب کی طرف دیکھا -

" اماں جان ! آپ کو معلوم ہے ؟ مٹی کا تیل اب بلیک میں بھی نہیں مل رہا ہے -"

" تو پھر " بیگم صاحب نے لہجے کو سخت بنانا چاہا -

" تو پھر یہ کہ لیمپ کیسے جلیں گے "

" اللہ مالک ہے ! "

" ہوں ! " چھوٹے میاں نے جبڑے بھینچ لیے، چند لمحوں تک نظریں جھکائے کھڑے رہے، پھر سر اٹھا کر بولے -

" اماں جان ! گستاخی معاف ہو، میں پوچھتا ہوں آپ کو بچے سے پیارا ہے یا اپنا [illegible]

" — آج تم کھونا [illegible]

"اماں جان! اب مجھ سے اس مقبرے میں اور یادوں کے اس انبار کے اوپر نہیں رہا جاتا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کی بہو کو لے کر کسی چھوٹے سے مکان میں چلا جاؤں۔ جو چھوٹا ہو کم حیثیت ہو، لیکن جس کی فضا میں دم نہ گھٹتا ہو۔ آپ کو اتنا بھی خیال نہیں آتا ہے اماں جان کہ آپ کی بہو کا پاؤں بھاری ہے، اور اس حالت میں وہ اس مخدوش زینے سے اترتی اور چڑھتی ہیں، اگر کسی روز خدا نہ کرے کوئی سیڑھی دھنس جائے، لوہے کی زنگ آلود ریلنگ ان پر آگرے۔ تو اماں جان۔ آپ شاید ان پر نہیں اپنے زینے کے ٹوٹ جانے پر ماتم کریں گی، کیونکہ اس زینے سے سینکڑوں یادیں وابستہ ہیں۔"

چھوٹے میاں نے اتنا کہہ کر ایک آہ بھری۔

بیگم صاحب ایک سناٹے کے عالم میں ان کو دیکھے جا رہی تھیں۔

چھوٹے میاں نے ان کے جواب کا انتظار کیا، مگر جب وہ ایک لفظ بھی نہ بولیں تو انہوں نے دوبارہ آہ بھری اور تھکے تھکے قدم سنبھل سنبھل کر سیڑھی کی سیڑھیاں اترنے لگے چپ چپ! ان کے پاؤں آہستگی سے سیڑھیوں میں دھنسے جا رہے تھے۔

چپ چپ! بیگم صاحب کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں بڑھتی جا رہی تھی، بیگم صاحب نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ انہوں نے اپنی یادوں کو یکجا کر کے ان کے انبار میں گم ہو جانا چاہا، مگر نہیں، اور تب ہی۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے لیمپ گل کر دیا۔

دروازوں پر گرے جگہ جگہ سے پھٹے لٹکتے پردے مردوں کے کفن کی طرح پھڑپھڑانے لگے۔ ان پردوں [illegible] یادیں بھی منسلک ہوئی تھیں، لیکن اس وقت ان یادوں کی میٹھی کسک نے بھی [illegible] دیا۔ مخدوش زینہ، بوسیدہ دیواریں [illegible]، [illegible] دروازے۔

"[illegible] چھوٹے میاں! چھوٹے میاں!" انہوں نے [illegible] ہچکیاں [illegible] کرتے کرتے

اور وہ ساری رات انہوں نے مسہری کے پچھلے پائے سے ٹیک لگا کر بیٹھے بیٹھے گزار دی۔

صبح کی روشنی میں حویلی کسی کھنڈر کی طرح ویران اور بدصورت معلوم ہو رہی تھی، ایک مقبرے کے مانند اداس بھی!

وہ اٹھ کر ادھر ادھر کھٹ پٹ کرنے لگیں، کبھی ایک چیز اٹھائیں، کبھی دوسری۔ حسب معمول پہلے بہو رانی زینے پر سے سنبھل سنبھل کر ڈر ڈر کر اتریں، پھر چھوٹے میاں آئے۔ دونوں ہی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

بیگم صاحب نے ان کو پکارا۔

بہو رانی! ایک بالکل نئے لہجے میں شفقت اور نرمی سے بھرپور لہجہ۔ وہ کھوکھلا لہجہ جس میں زبردستی گرج اور رعب پیدا کیا جاتا تھا، جانے کہاں کھو گیا تھا۔

" بہو رانی نے چونک کر ان کو دیکھا۔

" یہاں آؤ بیٹی!" انہوں نے پھر اسی شفقت سے کہا۔

بہو رانی ان کے قریب آئیں تو انہوں نے گلے سے لگا لیا۔

تم اس حالت میں نہیں بیٹی کہ چولہے کے سامنے بیٹھ سکو۔ اس مسہری پر بیٹھے بیٹھے اور یادوں کے جال میں اپنے آپ کو گرفتار کیے کیے میں تھک گئی ہوں اب کھلی فضا میں گھومنے پھرنے کو میرا بھی جی چاہتا ہے، سمجھیں بیٹی! انہوں نے بہو رانی کے بالوں میں انگلیاں پھنسا دیں، کوئی نوکر یا نوکرانی رکھنے کو ہماری آمدنی اجازت نہ دے گی، اس لیے آج سے ہم تم دونوں مل کر کام کریں گے۔

" مگر اماں جان" چھوٹے میاں نے بولنا چاہا پر بیگم صاحب نے مسکرا کر ان کی بات کاٹ دی۔

" نہیں اب تم کسی سواری کا انتظام نہیں کرو گے تم اس حویلی کی مرمت کا انتظام کرو گے انشاءاللہ رکھے [illegible] زچہ خانہ اب نئے کمرے میں ہوگا، تاکہ میرا پوتا یا پوتی پرانی چیزوں اور پرانی دیواروں کی گھٹن سیلن اور حبس میں گھٹ کر نہ رہ جائے۔ ایسا کرو میاں پچھلا حصہ گرا کے برابر کرا دو، آخر خالی پڑا ہوا ہے، اور ان یہ پرانا کاٹ کباڑ باہر والے گودام میں ڈال دو۔"

" اماں جان" خوشی [illegible]

میاں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"ہاں بیٹا، ان گرتی دیواروں تلے ہی کب تک بیٹھی رہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دیوار خود مجھ پر ہی گر پڑے، تب تو میری زندگی ہی ختم ہو جائے گی، اس لیے خود میں نے یہ طے کیا ہے کہ اس یادگار حویلی کی تمام دیواروں کو گرا کر ان کی جگہ نئی دیواریں کھڑی کر دی جائیں۔" یہ سنتے ہی چھوٹے میاں "اماں جان اماں جان" کہتے ہوئے اپنی ماں کو لپٹ گئے اور ماں اور بیٹے اور بہو رانی بھی، تینوں خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے!

فارم نمبر (۴) ملکیت کے بارے میں

۱- نام اخبار - "ہندستانی ادب"
۲- مقام اشاعت - سعادت ولا - 17-11-16 سلیم نگر کالونی - ع۱ - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶
۳- اشاعت کا وقفہ - ماہوار
۴- نام طابع - محمد عبدالرحیم - ہندستانی - چھتہ بازار - حیدرآباد ۲
۵- پبلشر کا نام - جی - ام - خان - ہندستانی - سعادت ولا - 17-11-16 - سلیم نگر کالونی ع۱ - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶
۶- ایڈیٹر کا نام - جی - ام - خان - ہندستانی - سعادت ولا - 17-11-16 سلیم نگر کالونی ع۱ - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶
۷- حصے داروں کے نام - اس کاروبار میں ہمارا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔
۸- میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ اوپر جو معلومات بیان کیے گئے ہیں بالکل صحیح ہیں۔

دستخط جی - ام - خان

جگن ناتھ آزاد

عزیزانِ وطن بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکو!

ہماری داستاں اک داستانِ کامرانی ہے
یہ ہے ایسی حقیقت جو زمانے بھر نے مانی ہے
ہمارے جو ہیں منصوبے یہ خوشحالی کے ضامن ہیں
وطن کے خشک صحراؤں میں ہریالی کے ضامن ہیں
انہیں نے ہم کو فردا کے نئے نقشے دکھائے ہیں
ہماری صنعتوں میں یہ مشینی دور لائے ہیں
کہاں سے چل کے پہنچا ہے کہاں تعلیم کا دریا
زمیں تھی اور اب ہے آسماں تعلیم کی دنیا
جنہوں نے ان کو کہیں توڑا انہیں دریاؤں کو موڑا
ضرورت آئی ہے جب تو سمندر بھی نہیں چھوڑا
پہاڑوں کی بلندی تک کبھی عقلِ رسا پہنچی
خود اپنی کہکشاں قمر زمیں سے دور جا پہنچی
مگر یہ کارنامے خاک میں مل کر نہ رہ جائیں
ہم آبادی کے سیلِ بیکراں ہی میں نہ بہہ جائیں
خبر بھی ہے اضافہ اپنی آبادی میں کتنا
تو ہے اک سال میں پورا کروڑ اور تیس لاکھ اتنا
کہیں ایسا نہ ہو برباد ہوں سب کام کاج اک دن
ترقی کے وسائل کھو نہ بیٹھے یہ سماج اک دن
یہ بجلی جگمگانے آئی ہے گھر گھر کر جو جیسی
کہیں ایسا نہ ہو رستے ہی میں رک جائے بے دلی
یہ بچے کل بنیں گے ملک کا جو آسرا یارو
نہ رہ جائیں کہیں تعلیم سے ناآشنا یارو
کہیں معیار سے گرنے نہ پائے دیکھ بھال ان کی
کوئی منزل ہی ہو قسمت نہ ہو جائے زوال ان کی
عزیزانِ وطن بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکو!
[illegible]

مصور فطرت خاجا حسن نظامی

روزناچا

۲۰ ربیع المحبوب سنہ ۱۳۵۰ھ مطابق ۷ اگست سنہ ۱۹۳۱ء دوشنبہ دلی۔

مشیت الٰہی کا روزناچا

زندگی کی روح حساب ہے۔ تیرے داہنے ہات کی قسم جو تیری مرضی سے قلم چلاتا ہے، اس دنیا میں زندا وہی ہے جو حساب جانتا ہے، مگر وہ زندا نہیں ہے، جو صرف حساب جانتا ہے، اور حساب پر عمل نہیں جانتا، بلکے زندگی اس کی ہے جو زندگی کے ہر عمل کو حساب کے ماتحت رکھتا ہے۔

دیکھ! ریلوں کو اور دل کے بہت سے پلیٹ فارموں کو کہ وہاں رات دن ہر طرف ریلیں دوڑ دوڑ کر آتی ہیں، اور دھڑ دھڑ کر جاتی ہیں، مگر انسان نے ایسا حساب رکھا ہے کہ کبھی کوئی حادثا نہیں ہوتا۔ لکھ! اپنی کتاب میں لکھ! حساب سے انتظام پیدا ہوتا ہے، اور انتظام سے دولت اور حکومت اور زندگی کی راحت پیدا ہوتی ہے۔

رسول اللہ کا روزناچا

حضور کی خوش طبعی۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور اقدس میرے چھوٹے بھائی سے بطور خوش طبعی فرماتے۔ یا ابا عمیر ما فعل نغیر۔

اے ابو عمیر کیا ہوا نغیر۔ (نغیر کا ترجما بعض لوگوں نے لال کیا ہے، اور بعض نے بلبل) اس بچے نے ایک جانور پال رکھا تھا اور اس جانور کے مر جانے سے وہ بچا رنجیدا رہتا تھا، اس لیے حضرت بچے کو خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی یہ الفاظ فرماتے تھے۔

حضرت انس سے ایک روایت ہے کہ کسی شخص نے حضرت سے ایک سواری مانگی۔ فرمایا ہم تم کو اونٹنی کا ایک بچا دیں گے، مانگنے والے نے عرض کی۔ حضور! مجھے سواری کے لیے اونٹ چاہیے۔ میں بچے کو کیا کروں گا۔ حضور نے فرمایا، ہر اونٹ کسی اونٹنی کا بچا ہی ہوتا ہے۔

حضرت انس سے ایک اور روایت آئی ہے کہ زاہر بن حرام ایک بدوی مسلمان تھے جو حضور کے لیے جنگل کی ترکاریاں لایا کرتے تھے، اور حضور بھی ان کو تحفے دیا کرتے تھے۔ زاہر کی شکل اچھی نہیں تھی ایک دن وہ کھڑے تھے کہ حضرت نے پیچھے سے جا کر ان کو کولی میں پکڑ لیا۔ زاہر نے کہا کون ہے؟ چھوڑ دو مجھے چھوڑ دیجے، مگر حضرت کو پہچان لیا تھا اس واسطے اپنے جسم کو حضرت کے جسم مبارک سے خوب ملا دیا، تا کے برکت حاصل ہو۔ حضرت نے خوش طبعی سے فرمایا۔ کون ہے؟ جو اس غلام کو خریدے۔ زاہر نے عرض کی مجھ بد شکل کو کون خریدے گا۔ میں تو نہایت نکما اور کم قیمت ہوں، فرمایا نہیں، تم اللہ کے نزدیک بیش قیمت ہو۔

حضرت خواجہ حسن بصری سے روایت ہے کہ ایک بڈھی عورت حضور کے پاس آئی، اور اس نے کہا دعا کیجیے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے۔ حضور نے خوش طبعی سے فرمایا۔ بڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائینگی وہ عورت یہ سن کر رونے لگی۔ حضور نے فرمایا جنت میں سب چھوٹے بڑے جوان ہو کر داخل ہونگے۔ اس واسطے میں نے کہا کہ بڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائینگی، کیونکہ جنت میں نہ کوئی بچہ ہوگا نہ بڈھا ہوگا، بلکہ خدا سب کو جوان بنا کر داخل کرے گا۔

روٹی کا روزنامچا

چپاتی کا لیکچر۔ میں روٹی ہوں۔ گول گول چپاتی انسان کی دو ہتھیلیوں سے طمانچے کھا کر بڑی ہوئی ہوں، ذرا دیکھو کہ جب میں توے پر جاتی ہوں تو کیسی پھولی اور کیسی گول ہوتی ہوں۔ پس جس طرح انسان کی ہتھیلیاں آٹے کو چپاتی بنا دیتی ہیں اسی طرح اگر انسان اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے آمد و خرچ کو روزانہ لکھا کرے تو بہت جلد مفلسی دور ہو جائے، اور غیبی روٹیاں آسمان سے اترنے لگیں۔

اخوان کا روزنامچا

کشمیر کا دن۔ (۱) محمد صدیق نظامی نے سیالکوٹ سے اطلاع دی ہے۔ جلوس نکالا گیا۔ بہت بڑا جلوس تھا۔ جلسہ بھی بہت شاندار تھا۔

(۲) محمد احمد نظامی بمبئی سے لکھتے ہیں، یہاں اتنا بڑا جلوس نکلا کہ آج تک کوئی ایسا جلوس نہ دیکھا گیا تھا۔ ایک ہزار رضاکار شریک تھے۔ مولانا شوکت علی صاحب نے بھی جلسے اور جلوس میں حصہ لیا۔ جلسہ بھی بہت شاندار تھا۔

(۳) مولانا نسیم الحسن صاحب کلکتہ سے لکھتے ہیں کہ کلکتہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے، اور یہاں یوم کشمیر کا جلوس اور جلسہ بھی ایسا بڑا ہوا جو تمام ایشیا

(۴) غلام فرید قریشی نظامی لاہور سے لکھتے ہیں یہاں بہت بڑا جلسہ ہوا جلوس بھی بہت شاندار تھا جوش و خروش کی انتہا نہ تھی۔

(۵) مولانا غلام رسول صاحب بہاری فارس گنج ضلع پورنیہ سے لکھتے ہیں کہ جمعہ کی نماز کے بعد مولانا سید وحی احمد صاحب نے کشمیری مسلمانوں کی نسبت ایک بہت عمدہ تقریر کی اور دعا پر جلسہ ختم کیا گیا۔ آپ کے محضر نامے پر دستخط کرائے جا رہے ہیں (جو کشمیر سے متعلق ہے)

(۶) غلام نبی نظامی بمبئی سے لکھتے ہیں، بزنس ہوم کمپنی لمیٹڈ کے دفتر میں یوم کشمیر کے لیے تعطیل کر دی گئی، اور سب دفتر والوں کو جلسے میں شریک ہونے کی اجازت دی گئی۔ دفتر میں ایک ہزار پچاس روپے ماہوار کی تنخواہوں کا عملہ ہے۔

(۷) محمد اسرائیل خان نظامی آرا صوبۂ بہار سے لکھتے ہیں، جمعہ کے دن کشمیر کے متعلق جلسہ کیا گیا محضر نامے پر دستخط ہو رہے ہیں، اور چندا بھی کیا جا رہا ہے، جو مسلم بینک کو بھیجا جائے گا۔ مولانا محی الدین صاحب منگلی، فاضل اور منشی خیر الدین صاحب نے بہت کوشش کی۔

(۸) صوفی غلام محمد نظامی جالندھر سے لکھتے ہیں، کہ محضر نامے پر دستخط کرا رہا ہوں، مگر لوگوں کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر کے عقاید پر اعتراض ہے۔

(۹) جمعیت الاسلام بالا سند نے بذریعہ تار اطلاع دی ہے کہ کئی ہزار مسلمان کشمیری مسلمانوں پر ظلم و ستم کے خلاف اظہار بیزاری کرتے ہیں اور ریاست میں مسلم حقوق کی مدافعت کرتے ہیں۔

(۱۰) صوفی غلام محمد نظامی کا دوسرا خط آیا ہے کہ ۱۴ اگست کو جامع مسجد میں کشمیر کے مسلمانوں کے لیے دعا کی گئی۔

(۱۱) مرزا فریدون بیگ صاحب بشنر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جالندھر چھاؤنی سے مطلع کرتے ہیں کہ جامع مسجد میں ایک ہزار مسلمانوں نے کشمیری مسلمانوں کے لیے دعا مانگی۔ چندا ہو رہا ہے۔ محضر نامے پر دستخط ہو رہے ہیں۔ [illegible]

پھر ہوگا -

خاکی بت کا روزنامچا

اوپر مٹی - نیچے مٹی - دائیں مٹی - بائیں مٹی - میں سراپا پیکر خاک ہوں اور خاکستان کائنات میں آج مجھ پر جو گزری اس کو لکھتا ہوں -

• ساڑھے سات بجے صبح دلی پہنچا - عظیم بخش نظامی موٹر لیے ہوئے موجود تھے' ان کے ساتھ واحدی صاحب کے ہاں گیا' اور کچھ دیر وہاں کام کر کے گھر میں آیا -

خاکسار صاحب کا عرس ہو رہا تھا - ان کے صاحبزادے حکیم محمد دین ملنسار نظامی اور ان کے داماد منشی عبدالغفور صاحب اور سب نواسے اور خان بہادر کپتان حبیب الرحمان خاں صاحب سی - آئی - ای وغیرہ بہت سے مہمان تھے - نیاز ہوئی اور برف کا شربت سب لوگوں کو پلایا گیا' اور حلوا زردہ تقسیم ہوئی -

یہ عرس رات بھر ہوا تھا - مستری عشق نظامی نے مولود شریف پڑھا تھا - رات کے دو بجے تک مجلس رہی - خدا کا شکر ہے کہ ملنسار نظامی اپنے باپ کی یادگار کو پوری طرح نبھاتے ہیں - اب دنیا میں ایسے بہت ہی کم لوگ نظر آتے ہیں جن کو خوردی و بزرگی اور دوستی اور تعلقات کا لحاظ ہو -

مستری عشق نظامی نے جمعہ کو ایک بہت بڑے جلسے میں کشمیر کی نسبت تقریر کی' اور ان کے بیان کا مسلمانوں پر بہت اچھا اثر ہوا -

نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھایا' پھر دفتر میں آن کر کام شروع کیا' اور ایک بجے تک کام کرتا رہا - ایک بجے خواجہ باقر اور خواجہ باز اور حسینی کے ساتھ وہاں گیا - خان صاحب حاجی غلام حسن صاحب ٹھیکیدار کی اہلیہ کے ناگہانی انتقال کی خبر آئی ہے - مرحومہ کے بچے بشیر الحسن' عزیز الحسن وغیرہ بہت اسکول میں پڑھتے ہیں - مرحومہ خواجہ باز سے آن ملا کرتی تھیں' بڑی نیک اور کنبہ پرور تھیں [illegible] انتقال ہو گیا - [illegible]

میں شریک ہو کر چار بجے گھر میں واپس آیا -

عاشق علی صاحب میرے ایک دوست کے والد کا جنازا دلی لے آیا - میں نے اپنے بھائی مرحوم کی قبر کے قریب جگہ دی' کیونکہ مرحوم بڑے بزرگ آدمی تھے - نوے سال کی عمر تھی - درگاہ شریف میں ہمیشہ حاضر ہوتے تھے - بہت خاموش اللہ والے نیک صفت مسلمان تھے - مجھے حاجی صاحب کی اہلیہ اور عاشق علی صاحب کے والد کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا - اللہ تعالیٰ ان دونوں کی مغفرت کرے -

مرحومہ کے بچے بہت ہی خرد سال ہیں - ایک لڑکی چھ روز کی ہے' اور دوسری دو سال کی - حاجی صاحب کی خانہ ویرانی کا ہر شخص کو افسوس تھا' مگر افسوس کرنے سے مرنے والا واپس نہیں آ سکتا -

مغرب کی نماز میں نے پڑائی ہے کو ٹھری جماعت میں شریک ہوتی ہے' اور مجھے اس کی نماز سے بڑا لطف آتا ہے - بعد مغرب نجیبالا کے ایک دوست ملنے آئے اور رات کے نو بجے واپس گئے - میں ساڑھے نو بجے سو رہا' چونکہ شام کو ایک آم کھا لیا تھا' اس واسطے ڈیڑھ بجے آنکھ کھل گئی' کیونکہ آم کھانے سے نیند اڑ جاتی ہے - میں نے اسی وقت غسل کر کے تحریری کام شروع کر دیا' اور صبح تک بہت سا کام ہو گیا -

آج رائے بہادر لالہ پارس داس صاحب کے چند عزیز اور قرابت دار ملنے آئے تھے - انہوں نے کہا مولانا وحشی صاحب سے رائے بہادر صاحب کے خاص تعلقات تھے' اور رائے بہادر مولانا کے ساتھ ہمیشہ سلوک کرتے رہتے تھے' مگر مولانا ان کی بیماری میں کسی دن عیادت کے لیے گئے نہ انتقال کے بعد تعزیت کے لیے آئے - میں نے یہ بات سنی تو مجھے بہت ہی صدمہ ہوا' کیونکہ رائے بہادر صاحب سے مولانا وحشی صاحب کا تعارف میں نے کرایا تھا' اور میرے ذریعے مولانا وہاں پہنچے تھے - اس کے برعکس شاہ لالہ جیتی لال کی ہے کہ ان کی بھی رائے بہادر صاحب سے دوستی تھی اور وہ ان کے ہم عمر اور ہم اسکول تھے [illegible]
تعلقات و تعلیم [illegible]

عیش و آرام کو اور کھانے پینے کو اور نیند کو کبھی بیٹے تک چھوڑ رکھا ۔ میں نے کہا ایسے درست دو سو برس پہلے پیدا ہوا کرتے تھے، اور اب تو ہندوستان بانجھ ہو گیا ہے، ایسے درست پیدا نہیں کرتا ۔

۳ ربیع المحبوب ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۸ اگست ۱۹۳۱ء سہ شنبہ دلی ۔

تنظیم کا روزنامچا

رسول کا جمال ہر امتی میں ۔ مومن ہو تو ایمان لاؤ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم زندا ہیں، اور قیامت تک اور قیامت کے بعد تک زندا رہیں گے ۔ ان کی زندگی کا جلوا اور جمال ہر امتی عورت مرد کو نظر آ سکتا ہے، اگر وہ اپنے دین اور دنیا کے ہر عمل کو پوری طرح سیرت رسول کا پیرو بنا دے ۔ میں نے پہلے بھی یہ بات لکھی تھی مگر صرف ایک آدمی نے اس طرف توجہ کی باقی سب خاموش رہ گئے ۔

اگر امتی اپنی تنظیم چاہتے ہیں اور مضبوط تنظیم چاہتے ہیں تو میرے ہاتوں میں آ جائیں ۔ میں ان کو آئینے کی طرح گھس گھس کر ایسا صاف شفاف بنا دوں گا کہ وہ اپنے اندر جمال محمدی کو جب چاہیں گے دیکھ لیں گے، اور خود ہی نہیں، بلکے ساری دنیا والے جب سیرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور صورت محمد کو دیکھنے کے آرزومند ہوں گے تو تم میں سے کسی کو دیکھ کر سمجھ لیں گے کہ اس سرمطلہ وہ جمال کی ایسی صورت تھی ایسا لباس تھا ایسی غذا تھی، ایسی رفتار تھی ایسی گفتار تھی ایسی عادت تھی ایسی خصلت تھی ۔

لیکن یاد رکھو تم جلدی سے کہہ دو کہ ہم اس مشکل امتحان میں پڑنا نہیں چاہتے ۔ ہمارا نام مریدوں کی جماعت سے خارج کر دو، اور ہم کو چھوڑ دو، اور میرے حوالے ہو جاؤ تا کہ میں تم کو ٹھیک بنا لوں

جلدی فیصلا کرو ؟

صورت نہیں تمہاری صورتوں کا ایک آئینہ بنا دونگا، تا کے ہماری شکلیں شباہت رسول مقبول کا آئینا بن جائیں ۔ تمہارے سر کے بال تمہاری مونچھیں تمہاری داڑیاں بلکل سنت رسول کے موافق ہوں ۔

لباس ! تمہارا لباس بھی سنت رسول کے موافق ایک ہوگا ۔ سر کا لباس اور پورے جسم کا لباس یہاں تک کہ جوتیاں بھی، اور تم سب پابند ہو گے کہ ہمیشا وہی مقررا لباس پہنو ۔ یہ آسانی دی جائے گی کہ رات دن کے کسی حصے میں سنت کا لباس استعمال کرو اور باقی اوقات میں کوئی اور لباس جس کی تم کو ضرورت ہو ۔

غذا ! یہ بھی تمہارے لیے ضروری ہوگا کہ رات دن میں ایک دفعا تم ان غذاوں میں سے ایک غذا ضرور کھاؤ جو رسول اللہ نوش فرماتے تھے اور ممکن ہو تو مسنون غذاوں کے سوا اور سب غذائیں ترک کر دو ۔

رفتار ! تم اگر بڑے ہو گئے ہو تو اپنی رفتار کو تبدیل نہیں کر سکتے یا مشکل سے تبدیل کر سکتے ہو اس لیے اپنے بچوں کو سکھاؤ کہ رسول اللہ کیونکر رستہ چلتے تھے، تا کے وہ بھی اسی طریقے سے رستا چلا کریں ۔

گفتار ! یعنی بات چیت میں بھی تم کو رسول اللہ کے طرز کلام کو اختیار کرنا ہوگا، اور تم کو بڑا ہو جانے کے سبب اس میں دشواری معلوم ہو تو اپنے بچوں کو سکھاؤ اور میرے آئین سنت کو غور سے پڑھو

برتاو ! رسول، عورتوں سے، بچوں سے، ملک سے، قرابت داروں سے، دشمنوں سے کیونکر اور کیسا برتاو کرتے تھے ۔ اس کو حدیثوں سے الگ اپنی برتاو کی شکل میں مرتب کیا جائیگا، اور تم پر فرض ہوگا کہ اس برتاو کے خلاف کوئی برتاو نہ کرو ۔

آرام ! رسول اللہ رات دن میں کتنی دیر سوتے تھے ۔ کتنی دیر آرام کرتے تھے، یہ سب حدیثوں سے ایک جگہ قلم بند کر لیا جائیگا، اور تم کو بھی اپنے آرام کی حد بندی کرنی ہوگی ۔

تھے۔ اور وقت کی تقسیم کس طرح کی تھی۔ تم کو بھی اسی کی مطابق اپنی زندگی کے اوقات مقرر کرنے ہوں گے یا اپنی فرصت و فراغت کے اوقات کو سنت کی موافق کام میں لگانا ہوگا، کیونکہ تم میں سے اکثر اپنے وقت کو نوکری وغیرا کاموں کے ذریعے دوسروں کے حوالے کر چکے۔

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا

قرآن مجید میں ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت اور حالت سے زیادہ تکلیف دینی نہیں چاہتا، پس میں بھی اس آئین سنت میں ایک دم سب باتوں کا بوجھ نہیں ڈالوں گا، بلکہ صورت و لباس و غذا و رفتار و گفتار و برتاو اور آرام وغیرا امور میں ایک ایک کر آہستہ آہستہ پیش کرونگا، اور طاقت اور حالت کی موافق عمل کراوں گا، مگر آئین پہلے ہر چیز کا بنا دوں گا، تاکہ اگر میں جلدی مر جاوں تو میرے جانشین اس آئین کی موافق تم کو آہستہ جمال محمدی بنائیں، مگر آئین بنانے سے پہلے میں تمہاری طاقتوں اور حالتوں اور خیالوں اور ارادوں سے سوال کرنا چاہتا ہوں کہ تم اس راحت بخش اور نجات دہندا تحریک میں شریک ہونا چاہتے ہو یا نہیں، جو چاہے وہ بھی لکھے جو نہ چاہے وہ بھی لکھے، لیکن اچھی طرح سوچ کر اگر تم نے ارادا کر لیا تو جو چیز ظاہر میں مشکل معلوم ہوتی ہے آسان ہو جائے گی، اور جس کو تم بظاہر بہت دشوار سمجھ رہے ہو نہایت راحت بخش اور سہل نظر آنے لگے گی۔

ذاتی روزنامچا

صبح سے شام تک تحریری کام میں مشغول رہا۔ بعد مغرب دلی گیا، کیونکہ آج خرشید احمد اور نظامی اصلان کی بہن امتیاز بانو نظامی لاہور جانے والے ہیں، امتیاز بانو نظامی کو اب آرام ہے۔

قاضی برکت علی نظامی الیگزنڈر ازبقا سے واپس آ رہے ہیں۔ آج بہو سے طے کیا تھا کہ ان کو اہل و عیال سمیت دلی پہنچوں گا۔ میں نے ہی منزل میں قیام کا انتظام کیا۔ دلی اسٹیشن پر جا کر معلوم ہوا بمبئی سے آنے والی گاڑی تین گھنٹے لیٹ ہے، اس لیے خرشید احمد نظامی کو لاہور کی گاڑی میں سوار کر کے ایک دوست کو مقرر کر دیا کہ رات کو گیارا بجے بمبئی کی گاڑی آجائے تو قاضی صاحب کو درگاہ میں بھیج دینا۔ گھر میں واپس آ کر بھی۔ حمید۔ بھوا غلام رسول کو سڑک پر بٹھا دیا، مگر قاضی صاحب نہیں آئے۔ رات ایک بجے رات تک منتظر رہے۔ شاید میرے دوست کو قاضی صاحب ملے نہیں۔ پنجاب چلے گئے۔

قمر سنبھلی

غزل

جب اہل دل خرد کی حدوں سے نکل گئے
شعلے سدا بہار گلوں میں بدل گئے
ٹکڑے وہ چند لفظ ہی حاصل حیات کا
دیوانگی میں جو مرے منہ سے نکل گئے
جس کا خیال خنکیٔ شبنم ہے سربسر
اس کا بدن چھوا تو مرے ہاتھ جل گئے
دنیا پہ ہو چلا تھا عیاں راز دل مگر
پلکوں تک آ کے اشک کسی کے سنبھل گئے
لفظوں کے آئینہ میں آتا راز جا سکا
وہ اس طرح خیال کے پیکر میں ڈھل گئے
آیا جو میرا ہاتھ کبھی نبض حال پر
ارباب حل و عقد کے تیور بدل گئے
سورج چڑھا ہی تھا کہ ہوئی زندگی کی شام
پل بھر میں کتنے وقت کے تودے پگھل گئے
آیا فرشتہ زن سفر موجِ حیات تھا
معیار زندگی کے یہ ہاتا بدل گئے

کرامت علی کرامت

امجد نجمی کے خطوط

عبداللطیف عارف — کے نام

بقول اقبال شاعر کے لٹریری اور پرائیوٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے، اور عالا درجے کے شعرا کے خطوط شایع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔ اس لیے ہم قارئین "شاخسار" کی دلچسپی کے لیے عبداللطیف عارف ہیڈ مولوی سعید سیریزی، کٹک کے نام حضرت امجد نجمی کے خطوط قسط وار شایع کر رہے ہیں۔ یہ خطوط نجی نہیں، بلکہ خالص ادبی ہیں، اور اپنے اندر معلومات کا بیش بہا خزانہ رکھتے ہیں۔ ان کی تحریر کا زمانہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۶۶ء تک کے عرصے کو محیط ہے۔ میری رائے میں، ان خطوط کو ہمارے ادب کے بہترین انشائیہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ یہ خطوط "شاخسار" میں قسط وار شایع ہونے کے بعد انہیں کتابی شکل دی جائے، تاکہ خطوط نگاری کے فن کو مزید استحکام حاصل ہو۔ ہم مولوی عبداللطیف کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ان خطوط کو اتنے عرصے تک محفوظ رکھا اور ضایع ہونے نہ دیا۔

کرامت علی کرامت

۹ جولائی ۱۹۲۴ء

عزیزم عارف صاحب!

السلام علیکم۔ شکر ہے کہ آپ نے لفظ "گسل" کی اطمینان بخش تحقیق کر لی اور اس طرح بعد بسیار رد وکد، لاو نعم اور امتحان و آزمائش آپ آخر کار میرے "عمیق مطالعے" کے قایل ہو گئے ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کل دیوان ذوق دیکھ رہا تھا کہ ایک شعر نظر سے گذرا جو دل "سل" متصل وغیرہ قوافی کی ایک غزل میں مل گیا، آپ کے لیے لکھتا ہوں۔ ؎

کرکے وعدہ رات کو جو راہ سے تو پھر گیا

وہم کیا دل میں یہ اے پیمان گسل پیدا ہوا

اور مرزا غالب کا یہ مصرع

غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

کرامت علی نے سند اسی رات کو پیش کیا تھا۔ یہاں ہر دو جگہ گسل شکن کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ خیر!

شکر کہ کا ازالا اس طرح کی چھان بین سے اچھا ہو ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند

جوانان سعادت مند پند پیر دانا را!

اقبال کے اس شعر میں ؎

جہاں سے بیدار انساں میں گہری نیند سوتا ہے

شجر میں پھل میں حیواں میں پتھر میں ستارے میں

"شعور" مستتر ہے اور یہ شعور یا درک یا فہم و ذکا یا بصیرت یا جوہر عقل انسان کے لیے خدائے تعالیٰ کی ایک مخصوص دین ہے جو دوسری مخلوقات کو نہیں دیا گیا۔ یہ شعور انسان میں جاگ رہا ہے، اور نباتات، حیوانات، جمادات اور فلکیات میں گہری نیند سوتا ہے - یعنی بالکل مفقود ہے - شعور ہی کی وجہ سے انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے - اسی شعور نے اس کی ذمے داریاں بڑھا دیں، اور اسی شعور کے بل بوتے پر شاید انسان نے وہ بار امانت اپنے کمزور کندھوں پر اٹھالیا - جس کو آسمان، زمین اور پہاڑوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا - سورۂ احزاب کی یہ آیت کریمہ انا عرضنا الامانت علی السماء والارض والجبال ملاحظہ ہو جس کی طرف مرشد شیراز نے اشارہ کیا ہے ؎

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

انہ کان ظلوما جھولا - شعور کا مادا ہی انسان میں سب کچھ ہے اور اقبال کا اشارا اسی طرف ہے - زیادا آپ کا مخلص نجمی

۲۷ر جولائی ۱۹۶۴ء

عارف صاحب!

سلام علیکم - آپ نے کل شب کرشاعرے کے بعد لفظ "ذوالنون" پر اپنے شک کا اظہار فرمایا تھا، لیکن آپ کا یہ شک بیجا تھا - ذوالنون حضرت یونس علیہ السلام کا لقب ہے - سورۂ انبیاء میں "ذوالنون" کا لفظ آپ کے لیے آیا ہے، چونکہ آپ سات دن مچھلی کے پیٹ میں بند رہے تھے اس لیے کصاحب الحوت بھی آپ کی شان میں آیا ہے - ملاحظہ ہو سورۂ القلم - ذوالنون کا لفظ میں نے بھی استعمال کیا ہے - یہ قرآنی تلمیح ہے - آپ اس سے واقف ہیں، زیادا وضاحت کی ضرورت نہیں -

[illegible]

ذہن منتقل ہوا، یہ زمانے مابعد کے ایک صوفی منش اور فقیر کامل گذرے ہیں، انکو بھی اسلیے ذوالنون کہا جاتا ہے کہ یہ ایک دن کشتی پر سوار تھے - کسی کا موتی کھو گیا - لوگوں نے آپ پر چوری کا گمان کیا - آپ کی دعا سے مچھلیاں پانی پر ابھر آئیں، اور ہر ایک کے مونھ میں ایک موتی تھا - آپ نے شخص مذکور کا موتی پہچنوا کر اسی کو دیدیا اور اس طرح آپ کا صاحب کرامت ہونا اہل کشتی پر ظاہر ہو گیا - ع

ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا؟

امید کہ آپ کا شک اب دور ہو گیا ہو - اعتراض سے ہم بھی بات کی تحقیق کر سکتے ہیں -

آپ کا خیر اندیش - نجمی

۱۰ر اگست ۱۹۶۴ء

ڈیر عارف صاحب!

سلام مسنون - جی چاہا کہ آپ سے نصف ملاقات کا شرف حاصل کروں گو موضوع سخن کچھ نہیں ہے، لیکن ع

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

سنیے - نور العین واقف پنجاب (بٹالا) کے اچھے فارسی گو شاعر گذرے ہیں - یہ وہ زمانا تھا جب شیخ علی حزیں قزوین (ایران) سے ہندستان کے دورے پر تشریف لائے تھے، اور بنارس میں بود و باش اختیار کر لی تھی - واقف ان کا نام سن کر بنارس پہنچے - ان کا فارسی کلام اس وقت سارے ہندستان میں قبول عام پا چکا تھا - حزیں نے پوچھا "از ما واقف وا قفی؟" مسکرا کر جواب دیا - "واقفم" علی حزیں سمجھ گئے کہ یہی واقف ہیں - اٹھ کر گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے - پھر اشعار سنانے کی فرمائش کی - واقف اپنے مختلف اشعار سناتے رہے، اور حزیں ہر ہر شعر پر حبذا اور مرحبا کہتے رہے جب واقف نے یہ شعر سنایا ؎

سیہ چو بدست آں نگار نازنیں دیدم
بشاخ صندلیں پیچیدہ اژدر ہے دیدم

[illegible]

سیہ چوری بدست آں نگارے
بشاخ صندلیں پیچیدہ مارے

واقف نے اس تک والی اصلاح کو پسند، بلکہ تسلیم کر لیا۔ غور فرمایئے۔ حزیں کے تصرف نے شعر کے حسن کو کتنا بڑھا دیا۔ نگار کے بعد نازنیں اور مار کے بعد عنبریں بالکل حشو اور زوائد سے تھا۔ اس کے علاوہ مار عنبریں سے واقف نے کیا مراد لی تھی؟ عنبریں عنبر سارا سیاہ ہوتا ہے؟ شاید نہیں تو حزیں کی اصلاح بالکل بجا ہے، کیونکہ مصرع اولیٰ میں "سیہ چوری" کالے ناگ کی صفت ہے۔ میرے خیال میں واقف اگر "مار عنبریں" کی جگہ "مار آستیں" کہہ دیتے تو ایک طرح کی محاورہ بندی ہو جاتی، کیونکہ چوڑیاں اکثر آستین میں ڈھکی ہوتی ہیں، گویا یہ سانپ آستینوں میں چھپ کر عشاق کو ڈستے ہیں۔

فرمایئے آپ کا کیا خیال ہے؟

آپ کا نجمی

۱۸ اگست سنہ ۱۹۶۴ء ۔

محبی و مشفقی عارف صاحب!

سلام علیک ۔

ایک شعر ملاحظہ ہو ملا ترابی قمی کا ہے ؎

بہ سنگ رخنہ شد از بس گریستم بے تو
ز سنگ سخت ترم من کہ زیستم بے تو

مرزا داغ کہتے ہیں ؎

موم ہوتا ہے مری آہ سے پتھر لیکن
سنگدل! ایک ترا دل کہ پگھلتا ہی نہیں

دیکھیے وہاں جوشش گریہ سے پتھر میں سوراخ ہو گیا اور یہاں وفور آہ سے پتھر موم ہو کر پگھل گیا۔ دونوں کا شکوہ اپنا اپنا اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن پھر بھی ایک ہجراں نصیب عاشق کی سخت جانی کو جس طرح ترابی نے "ز سنگ سخت ترم" کہہ کے واضح کیا ہے وہ قابل صد تحسین ہے۔ پانی کے متواتر بہاؤ سے پتھر کا شق ہو جانا عین مشاہدہ ہے جیسے کہ ایسی کہاوت ہے ؎
اسی طرح داغ کے شعر میں پگھل [illegible]

جانا بالکل ممکنات میں سے ہے، اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں۔ شعر کے لیے بقول ملٹن سادگی، اصلیت اور جوشش کا ہونا ضروری ہے، اور یہ تینوں باتیں فارسی اور ہندستانی کے اوپر کے شعروں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ پھر نہ جانے ہماری مشرقی شاعری "گل و بلبل" کے نام سے متہم ہو کر مورد الزام کیوں ہے؟ یہ صرف مغرب کی کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے۔

بہرحال فارسی شاعر آتشی قندھاری کا ایک شعر اور سنیے کہتا ہے ؎

سرشکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن
بیا در کشتیٔ چشمم نشین و سیر دریا کن

کیا معنی آفرینی کی ہے واللہ! سن کر روح میں ایک تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ سرشک کا رفتہ رفتہ دریا ہو جانا اور پھر اس دریا میں محبوب کو سیر کی خاطر دعوت دے کر آنکھوں کی کشتی مہیا کر دینا یہ شاعر کا کمال ہے۔ شعر پڑھتے جایئے اور سر دھنتے جایئے اور معترضین کو انہیں کی سخن ناشناسی کی آگ میں بھُنے دیجیے۔ — نجمی

۲۴ اگست سنہ ۱۹۶۴ء

عارف رنگیں بیاں!

سلام از من دیوانہ بستاں!

مشاعرے کی شاندار کامیابی پر دلی مبارکباد۔ یہ ہفتخوان گویا آپ ہی کی کوشش سے بآسانی طے ہوا، ورنہ شعر مرا بمدرسہ کہ برد کا سامان تھا۔

"روداد" میں آپ نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے کیا روانی ہے، اور کیا خوب نظم ہے! اس کی ایک نقل مجھے بھجوا دیجیے، تاکہ بزم کی فائل میں یادگار کے بطور محفوظ رہے۔ البتہ دوسرا "راہی" والا لفظ کا نیا نکال دیجیے، قدرے تکرار ہے آپ اس کی اصلاح خود کر سکتے ہیں۔

میری غزل ملاحظہ فرمائی آپ نے؟ بہت پرانی، یعنی بیس پچیس سال پیشتر کی [illegible] کہیں شائع کسی [illegible] میں اس کا شمار ہوا۔ [illegible]

خاص بات نہیں، البتہ عوام کے مذاق کی چیز تھی۔
اس کے مقطع پر بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈالیے
کیا شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ ظاہراً اگرچہ
بھولا بھالا ہے، لیکن باطن آتش کا پرکالا ہے؟
شاید ایسا ہی ہو، جیسا کہ داغ نے بھی کہا ہے ؎

پوچھو جناب داغ کی ہم سے شرارتیں
کیا سر جھکائے بیٹھے ہیں حضرت غریب سے

دوسرا مفہوم اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر
نے اپنے باطن کی صفائی کا دعویٰ کیا ہے، اس لیے
نکتہ چینیوں اور عیب جویوں کو دعوت دی ہے کہ
اس کے باطن کے متعلق کوئی رائے قائم کریں۔
بہرکیف معصومیت کا اظہار ہرگز مقصود نہیں، اور
ہو بھی کس برتے پر؟ یہاں تو یہ حال ہے بقول
بزرگے "موئے من سفید گشت و دل ہنوز سیاہ،
ظاہر من آراستہ و باطن من تباہ۔ رب اغفر
وارحم۔" ناسخ نے کیا خوب کہا ہے ؎

دل سیہ ہے بال سب اپنے ہیں پیری میں سفید
گھر کے اندر ہے اندھیرا اور باہر چاندنی

حامی و خاطی ۔ نجمی

۷ اگست ۱۹۶۴ء

قدرداں من دلگیر عارف صاحب!
سلامے از من بپذیر۔ زمانے کے اتفاقات
بھی عجیب ہیں، قبیلوں اور قوموں کی طرح افراد کو بھی
بسا اوقات ایک ہی قسم کے حالات اور واقعات
سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ علما اور شعرا کی زندگیوں
میں تو ایسے توارد اکثر پائے جاتے ہیں۔ ان
عظیم ہستیوں کی اولوالعزمی، عالی حوصلگی اور بلند
ہمتی کے افسانے تاریخ کے صفحات میں پڑھے گونج
رہے ہیں اور ہم کو ان کے نقش قدم پر چلنے کے لیے
دعوت عمل دے رہے ہیں۔
خواجہ حافظ شیرازی کو سلطان محمود شاہ
بہمنی والیٔ دکن نے زاد راہ کے لیے ایک خطیر رقم
روانہ کر کے دکن بلایا تھا کہ ان دنوں دکن میں شعر و
ادب و علم کا ایک بحر ذخیر جمع ہو گیا تھا، اور شعر و
سخن کا چرچا اپنے عروج پر تھا۔ خواجہ صاحب تیار
ہو کر بندرگاہ ہرمز پر پہنچے اور کشتی میں سوار ہو گئے،
کشتی کھلنے ہی کو تھی کہ یکایک باد مخالف کی
وجہ سے دریا میں طغیانی شروع ہو گئی۔ خواجہ صاحب
ارادۂ سفر سے متنفر ہو کر کشتی سے اتر پڑے۔
فوراً ایک غزل لکھ کر جانے والوں کے ہاتھ سلطان
کے پاس بھجوادی۔ غزل کے چند شعر یہ ہیں ؎

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد
بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہ دلکش است اما بترک سر نمی ارزد
بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوئے زر
غلط کردم کہ یک موجش بصد گوہر نمی ارزد
برو گنج قناعت جو بکنج عافیت حافظ
کہ یکدم تنگدل بودن بہ بحر و بر نمی ارزد

اسی طرح نواب آصف جاہ آصف جب کشور دکن
کے تخت و تاج پر پوری طرح مسلط و قابض ہو گئے
تو انہوں نے مرزا عبد القادر بیدل عظیم آبادی کو
جن سے وہ بذریعہ خط کتابت مشورۂ سخن
کرتے تھے، ایک نیاز مندانہ مراسلہ لکھ کر دکن
طلب فرمایا، لیکن ع اگر کوہ ٹلتا نہ ٹلتا فقیر۔
کی طرح بیدل دارالخلافہ شاہجہان آباد سے نہ
ٹلے پر نہ ٹلے، اور جواب میں یہ شعر فی البدیہہ لکھ کر
بھیج دیا ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

اور سنیے دیوان چندو لعل مدار المہام دربار حیدرآباد
دکن نے کئی ہزار روپے بھیج کر استاد ذوق کو دلی
سے حیدرآباد طلب فرمایا تھا، لیکن ذوق پتھر کی
طرح اپنی جگہ بھاری تھے ٹس سے مس نہ ہوئے۔
روپیہ واپس کر دیا اور ایک دو غزل لکھ کر عذر اور
معذرت کے ساتھ دیوان صاحب کی خدمت میں
بھیج دیا۔ دوسری غزل کا مشہور مقطع ہے ؎

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

دیکھا آپ نے واقعات کا کیسا عجب توارد ہے؟

تینوں کو ایک ہی قسم کے حالات پیش آئے۔ تینوں نے جانے سے انکار کر دیا، تینوں کے تینوں دنیا کی عریاں حقیقت سے کس قدر واقف اور اس کی کثافتوں سے کس قدر دور تھے! ع

خدا رحمت کند ایں پاکبازان محبت را

حافظ میں توکل کے ساتھ بے نیازی کا جذبہ بدرجۂ اتم کارفرما ہے۔ بیدل میں قناعت کے ساتھ ایک طرح کی قلندرانہ خودداری نمایاں ہے، اور ذوق میں حب وطنی کے ساتھ وفاداری بشرط استواری اصل ایماں کا جذبہ بشدت کے ساتھ پایا جاتا ہے، اب ذرا یہ ہمارے لیے کیا رہ گیا ؎

براہ او چہ دربازیم نے دینے نہ دنیائے
دے داریم داند دے ہے سرے داریم و سودائے

نجمی

۳۱ اگست سنہ ۱۹۶۴ء۔

عارف معروف کو نجمی ظلوم و جہول کی طرف سے سلام پہنچے۔ ہمارے شعر و ادب میں واعظوں، زاہدوں پیروں اور شیخوں پر جو طنز اور دبے تنقیدی اشارے کثرت سے پائے جاتے ہیں، اس کا ذمے دار مذہبی گروہ زہاد و شیوخ ہے۔ اپنی تقدس مآبی پر ان حضرات کو اس قدر غرّہ ہوتا ہے کہ عوام تو عوام یہ خواص کو بھی بسا اوقات ایک شتم سمجھنے لگتے ہیں۔ انکے یہی حقارت آمیز اور کم بینی کے جذبے متعزنے انکو رفتہ رفتہ اقرامات کا نشانا بنا کر ع

چوں بخلوت میروند آں کار دیگر میکنند

کا فتویٰ انہی پر چسپاں کر دیا۔ تنگ نظری، مذہبی یا بندگان خدا کو چشم حقارت سے دیکھنے کا جذبہ صرف ہمارے ہی نہیں، بلکہ دوسرے مذاہب کے بھی یکسر منافی ہے۔ سچ تو یہ ہے بقول ذوق ؎

اے ذوق کسی کو چشم حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

مولانا ابوالقاسم گرگانی نے فردوسی طوسی کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، ان کا اعتراض تھا کہ فردوسی [illegible]

ش ہناسے سے ہے) اسی شب کو انہوں نے خواب دیکھا کہ فردوسی کو فردوس عالا میں ایک مقام عطا ہوا ہے دریافت کیا یہ درجا تم نے کیسے پایا؟ فردوسی نے جواب دیا۔ صرف اس توحیدی شعر پر ؎

جہاں را بلندی و پستی توئی
ندانم چۂ ہر چہ ہستی توئی

نفحات الانس میں حضرت مولانا عبدالرحمان جامی لکھتے ہیں کہ مشائخ میں سے ایک بزرگ سعدی کے منکر تھے۔ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھول دیے گئے ہیں، اور ملائکہ نور کے طبق لیکر زمین پر نازل ہو رہے ہیں پوچھا یہ کیا ہے؟ فرشتوں نے کہا یہ سعدی شیرازی کے لیے تحفے ہیں کہ انہوں نے ایک شعر کہا ہے جو خدائے بزرگ و برتر کی درگاہ میں مقبول ہو گیا ہے، اور وہ مشہور شعر یہ ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں ؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اسی طرح حافظ شیرازی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو متعصب ملّا نے انکے جنازے کی نماز پڑھانے سے انکار کیا۔ شاہ منصور بھی جنازے میں شریک تھا۔ اس نے سبب دریافت کیا۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ حافظ کا کلام ملحدانہ ہے، اس لیے انکے جنازے کی نماز جائز نہیں۔ بادشاہ نے کہا اس کا ثبوت کیا ہے؟ انہوں نے کہا کلام منگایا جائے تو ہم الحاد ثابت کر سکتے ہیں، اسی وقت ان کی غزلوں کے مسودے طلب کیے گئے پہلا ہی ورق جو اٹھایا تو اس میں یہ شعر نکلا ؎

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ
کہ گرچہ غرق گناہ است میرود بہشت

اس تائید غیبی کو دیکھ کر سب دم بخود ہو گئے اور بلا چوں و چرا جنازے کی نماز ادا کی۔ اسی دن سے خواجہ کا نام "لسان الغیب" رکھا گیا۔ دیکھا آپ نے اسی لیے کہتے ہیں ؎

خاک داں جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ درو گرد سوارے باشد

اس سلسلے میں دو باتیں بھی یادداشت کے قابل ہیں جو حضرت سعدی کو انکے مرشد حضرت شہاب الدین سہروردی نے نصیحت کے بطور بتائی تھیں وہ کیا ؟ ؎

یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش
دوم آنکہ بر غیر بد بیں مباش

تمہارا نجمی

۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء -

مولوی عارف صاحب سلامت -

آج "گرو دیوس" ہے، اس لیے خیال ہوا کہ میں بھی آپ کو لکھنے بیٹھ جاوں، اس لیے یہ خامہ فرسائی ہے -

"گرو دیوس" کا ہماری زبان میں ترجمہ ہوا یوم استادان یا یوم استادان یا یوم معلمان یا یوم معلمان یا یوم آموزگاران جو چاہے یا جیسے چاہے کہیے - انکی تجویز ہمارے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن ہیں اور اس تجویز کو روبکار لانے سے انکا مقصد یہ ہے کہ ابھی تک گذرے زمانے میں طلبا کے دلوں میں اپنے استادوں کی عظمت و جلالت کا نقش جم جائے اور وہ یہ سمجھنے کے قابل ہو جائیں کہ حقیقت میں استادوں کا درجا کتنا بلند ہوتا ہے - ہندو دھرم میں استادوں کو دیوتا سمجھا جاتا ہے، اور اس سے متعلق بہت سارے قصے ہیں - ہمارے مذہب میں بھی استادوں کا مقام بہت ارفع و اعلا ہے -

امام ابو حنیفہ کے بارے میں مشہور ہے کہ جدھر آپ کے استاد کا گھر تھا، ادھر آپ کبھی پاؤں پھیلاتے نہ تھے - امام شافعی دوران درس میں وقتاً فوقتاً کھڑے ہو جایا کرتے تھے، حاضرین نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے ؟ جواب دیا کہ سامنے کی گلی میں میرا استاد زادہ کھیل رہا ہے، اور جب کبھی وہ ادھر سے ادھر دوڑتا ہوا آن نکلتا ہے، اور میری نظر اس پر پڑ جاتی ہے تو میں تعظیماً کھڑا ہو جاتا ہوں -

دیکھا آپ نے استاد کا درجا ہمارے اسلاف کے نزدیک کتنا بلند و بالا تھا - علامہ اقبال کو جب "سر" کا خطاب ملنے والا تھا تو آپ نے یہ شرط گورنمنٹ برطانیہ کے سامنے پیش کی تھی کہ ان کے سامنے ان کے استاد حضرت میر حسن کو بھی "شمس العلما" کا خطاب دیا جائے -

حکومت پنجاب نے اس شرط کو مان لیا، اور اس طرح استاد اور شاگرد دونوں بیک وقت "شمس العلما" اور "سر" ہو جاتے ہیں -

عصر حاضر ایسی مثالیں پیش کر سکتا ہے ؟ ؎

تو کے بدولت ایشاں رسی کہ نتوانی
جز این دو رکعت و آں ہم بصد پریشانی

لگے ہاتھوں ایک لطیفا بھی سن لیجے جب علامہ اقبال کو "سر" کے خطاب سے سرکار انگلشیہ نے نوازا تو سالک بٹالوی نے، جو یہ لکھی تھی ؎

لو مدرسۂ علم ہوا قصر حکومت
افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو سر ملت بیضا کے وہ تھے تاج
اب اور سنو تاج کے سر ہو گئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبال

آپ کا اپنا - نجمی

ایک واقعا اور سنیے جو "صدق جدید" لکھنؤ میں چھپا تھا - مولانا شبلی اپنی شہرت کے زمانے میں ایک بار کانپور گئے تو اور شہر میں بڑے اہتمام کے ساتھ انکا لکچر ہوا - اتفاق سے عین اسی زمانے میں مولانا کے پرانے استاد مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی بھی کانپور کے ایک مدرسے میں مدرس تھے اور لکچر کے سامعین میں سے تھے - لکچر کے اختتام پر نامور شاگرد اپنے غیر معروف استاد کے پاس آ بیٹھے اور استاد تھے کہ بے تکلفی سے پیر پھیلا کر لیٹ گئے اور مولانا سے بکمال سادگی سب کے سامنے بولے کہ شبلی ذرا پیر تو داب دینا - پیر دکھ گئے ہیں - وہاں کیا دیر تھی شاگرد اس سادگی اسی بے تکلفی اور اسی سعادت مندی سے فرمائش کی تکمیل پر آمادہ ہو گئے اور بغیر کسی شرم اور جھجک کے سب کے سامنے استاد کے پیر دابنے لگے ؎

استاد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اسنے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

دیکھا آپ نے یہ سعادت مندی بھی "بزور بازو نیست"۔
نجمی

۱۰ ستمبر ۱۹۶۴ء۔

ہمدم دہمنوا عارف صاحب!
سلام مسنون! آپ نے سنا، بلکہ پڑھا بھی ہوگا کہ ایک دفعہ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا اپنے ایک ہاتھ میں آگ کی مشعل اور دوسرے میں پانی کا مٹکا لیے جلدی جلدی راستے پر چلی جا رہی تھیں۔ حسن بصری نے ان سے دریافت کیا۔ فرمایہ کیا حال ہے؟ آپ کہاں جا رہی ہیں؟ اور کیا کرنا چاہتی ہیں؟ جواب دیا کہ میں چاہتی ہوں کہ یہ آگ لیکر بہشت میں ڈال آؤں، تاکہ وہ جل کر خاک ہوجائے اور یہ پانی دوزخ میں انڈیل دوں، تاکہ دوزخ کی آگ بجھ کر راکھ ہوجائے، اور لوگ خدا کی عبادت خالصۃً للہ کریں نہ کہ بخوف دوزخ اور باُمید بہشت۔
عجب نہیں، بلکہ گمان غالب ہے کہ غالب نے اسی روایت کے مدنظر یہ شعر کہا ہو ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یعنی عباداتِ الٰہی میں نعماے جنت کے لالچ کی شرکت نفس میں باقی نہ رہے۔ ایسی جنت جو نفس کو نفس عبادت سے اس طرف متوجہ کرے دوزخ میں جھونک دینے کے لائق ہے، تاکہ عبادات میں صرف خلوص اور محض للہیت باقی رہ جائے۔ عربی میں یہ مقولا کتنا اچھا اور صداقت سے لبریز ہے۔

"طالب الدنیا مخنث و طالب العقبیٰ مونث و طالب المولیٰ مذکر۔"

عارف سنائی کا شعر ہے ؎

یا دو قبلہ در رہ توحید نتواں رفت راست
یا رضاے دوست باید یا ہواے خویشتن

رومی بھی خوب کہتے ہیں ؎

نفس سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
[illegible]

مرقوم بالا عربی مقولے کی موزونی الفاظ ملاحظہ ہو پہلے کو مخنث اس لیے کہا گیا کہ دنیا کو چاہنے والا دنیا حاصل کرنے کے لیے چاہے جس قدر بھی زمین و آسمان کے قلابے ملا دے، مگر دنیا اس کو بقدر ضرورت ہی حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ اس انہماک میں عاقبت ایک قلم بھول جاتا ہے گویا اس کے پاؤں دو ناؤ میں ہیں، اور اس کا نتیجا معلوم ؎

دین ہم خواہی و ہم دنیاے دوں
ایں خیالست و محالست و جنوں

اس لیے وہ مخنث ہوا نہ ادھر کا ہوا نہ ادھر کا۔ خسر الدنیا و الآخرہ۔ دوسرے کو مونث اس معنی میں کہا گیا کہ صرف "مے و انگبیں" یا محض حور و قصور اس کی منتہاے نظر ہوتی ہے، اور اسمیں ایک طرح کی نسوانیت پوشیدہ ہے کہ عورتیں بہ نسبت مردوں کے زیادہ لذت پسند اور آرام طلب ہوتی ہیں۔
دوسرے میں ایک جذبۂ ایثار اور خوے تسلیم پنہاں ہے جو "رضاے دوست" یا "قد رضا بھی خواہش" کے لیے دنیا و عقبیٰ سب کو بیچ دیتا ہے، اور یہ مردانہ پن نہیں تو اور کیا ہے؟ نجمی

۸ ستمبر ۱۹۶۴ء۔

عزیز من عارف صاحب!
سلام علیکم۔ عنایت نامہ مورخہ ۱۶ ستمبر ملا، شکریہ۔ نظم بہ عنوان "نونہالوں سے خطاب" بہت اچھی اور موقع کی چیز ہے، طلبا کے حق میں شادیانہ بھی اور تازیانہ بھی۔ مقطع کا بند توحقیقت سے لبریز ہے! کیا کہنے آپ کی طبیعت بہت ہی رواں دواں ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے یہ نظم آپ نے بہت عجلت میں لکھی ہے۔ نظر ثانی نہیں کی اور نقاد صاحب کی نظر ناقدانہ بھی اس پر نہیں پڑی اس لیے چند خامیاں رہ گئی ہیں جن کی طرف آپ کی اجازت سے اشارہ کرتا ہوں ؎

کسے کہ عیب مرا میکند نہاں صاحب
اگرچہ چشم عزیزست دشمن ست مرا
[illegible]

اور کھیلنے کو قافیا کیا ہے، جو محل نظر ہے اس کے علاوہ دلنا ہندستانی میں مسلنے یا پامال کرنے کے معنی میں مستعمل نہیں ہوتا یہ تو ہماری زبان ہے۔ البتہ مونگ دلنا محاورا ہے۔

اسی طرح پانچویں بند میں، نمونا، کرنا، چلنا اور ڈرنا بھی ردیف قافیا نہیں، آپ نے شاید الف کو ردیف قافیا کیا ہے جو غلط ہے۔

چھٹے بند کے ٹیپ کے شعر میں "دم آس"، آپ سہو کر گئے ہیں۔ آس ہندی لفظ ہے۔ اس کے ساتھ فارسی اضافت نہیں ہونی چاہیے۔

ساتویں بند میں جیتے یا ہارے، میں یا گری ہے اسے جیتے کر ہارے کر دیجے۔ قصا ختم۔

آٹھویں بند میں "نوجوانوں" کی تکرار پہلے اور چوتھے مصرع میں ہوئی ہے جو جایز نہیں۔

مقطع کے بند میں "اے عارف" کے حرف ندا کی "ے" گرتی ہے، اسکو یوں کہیے تو ٹھیک ہے۔

کہاں عارف اب علم و دانش کی دنیا؟

ان اسقام کو دور کر دینے کے بعد نظم سائکلوسٹائل کر کے طلبا میں تقسیم کی جا سکتی ہے، کیونکے یہ انہیں کے کام کی چیز ہے۔ زیادا حد ناچیز۔ شناسلامت۔

نجمی

کیف احمد صدیقی

ام-اے، بی-ایڈ

جشن آزادی جمہوریۂ ہند

جشن آزادی مناؤ دوستو
خوب ناچو خوب گاؤ دوستو

آج آزادی کا دن ہے غم کی باتیں چھوڑ دو
داستان زندگی کو ایک تازہ موڑ دو
گیت خوشیوں کے سناؤ دوستو
جشن آزادی مناؤ دوستو

کتنی مشکل سے ملی ہے ہم کو یہ جمہوریت
اپنی جاں بھی زیادہ ہے کچھ اس کی اہمیت
اپنی جاں اس پہ لٹاؤ دوستو
جشن آزادی مناؤ دوستو

آج ہر جانب مسرت ہے کہیں پر غم نہیں
یہ مبارک دن کسی تیوہار سے بھی کم نہیں
خود ہنسو سب کو ہنساؤ دوستو
جشن آزادی مناؤ دوستو

آج کا دن ہے شہیدان وطن کی یادگار
جن کے خون سرخ سے آئی ہے یہ رنگیں بہار
آج انہیں کے گیت گاؤ دوستو
جشن آزادی مناؤ دوستو

آؤ چھیڑیں آج ان کی داستان زندگی
جن شہیدوں کی بدولت ہم کو آزادی ملی
ان کے قصے لب پہ لاؤ دوستو!
جشن آزادی مناؤ دوستو

آؤ چھیڑیں جاں نثاران وطن کا تذکرہ
عالم ارواح میں بھیجیں ہم ان کو شکریہ
ان کے نغمے لب پہ لاؤ دوستو
جشن آزادی مناؤ دوستو

صرف اک کپڑا نہیں یہ پرچم ہندستاں
اس کے دھاگوں میں ہے سارے جنگ آزادی نہاں
اس کے آگے سر جھکاؤ دوستو
جشن آزادی مناؤ دوستو

کیف اپنے ملک سے ہر بے ایمانی دور ہو
چور بازاری مٹے رشوت ستانی دور ہو
ان کو بھارت سے بھگاؤ دوستو
جشن آزادی مناؤ دوستو

اسفندار - فوروی - اردی بہشت ۱۳۸۵ف ہندستانی ادب جنوری - فروری - مارچ ۱۹۷۶ء

اشفاق حسین، ام۔ اے (عثمانیا)

صاحبزادا محمد علی خان میکش

جامعا عثمانیا کے قیام نے حیدرآباد کی ذہنی سطح کو اوپر اٹھانے کے لیے علم و فضل کی جو مشعل جلائی تھی اس نے جہل و پس ماندگی کی تاریک راہوں کو روشن کر دیا تھا، اور نئے عزم و حوصلے دولوے شوق سے دلوں کو تب و تاب اور دماغوں کو نئے خیال اور نئے زاد بہیا کر دیے تھے۔ اس نئے ذہنی افق اور زندگی کی نئی جہتوں کی سمت جامعہ عثمانیا کی نئی پود کا جو کارواں سرگرم سفر ہوا تھا، اس کا رواں کے سب سے کم عمر سا ز صاجزادا محمد علی خاں میکش تھے۔

میکش اس عہد کی پیداوار تھے جو اپنے باطن میں اضطراب اور بے چینی کو چھپائے بیٹھا تھا، مگر ظاہری، سطح پر امن و عافیت اور آسودگی و فراغت کی لہریں ماحول کو سکون بخش شب و روز کا احساس دلاتی تھیں، مگر وقت کا سیل رواں جن تغیرات سے عبارت تھا اس کی عدم آگہی نے زندگی کے تسلسل میں رکاوٹیں ڈال دی تھیں۔ تہذیبی اور سماجی زندگی کا معیار وقت کے نئے ایقانوں سے نامانوس تھا۔ اس ماحول میں جامعۂ عثمانیا ایک مینارۂ نور کی طرح ظاہر ہوئی، مگر وہ بھی زندگی کے اس طرز کو پوری طرح بدل نہ سکی۔ ذہنوں میں ایک ہلچل پیدا ہو چلی تھی مگر اس سے بھی گرد و پیش کا ماحول متحرک نہ ہو سکا۔ زندگی کا غلط آہنگ انداز مستقبل کے حادثوں کی

پیش بینی سے محروم رہا۔ جامعے عثمانیا کی نوجوان نسل کے ہاتوں ذہنی سطح پر جو تبدیلی آ رہی تھی اس نے ماحول میں کچھ جنبش تو پیدا کر دی تھی، مگر اس کی حیثیت بھی ایک زیریں لہر کی سی تھی۔ صاجزادا محمد علی خاں میکش کا بچپن اس ماحول میں گذرا، ان کو اس کا بھی احساس تھا کہ وہ صاجزادوں کے خاندان سے ہیں، مگر رفتا رفتا جب وہ ہوش کی منزل میں پہنچے اور ان کی دل کی دنیا ماحول سے ہم آہنگ نہ ہو سکی تو یہ احساس تلخی میں بدل گیا، جو عمر کے ساتھ ساتھ تلخ تر ہوتا گیا۔ بچپن ہی سے ایک شاعر ان کے نرم و نازک جسم میں چھپا بیٹھا تھا، جو باہر آنے کے لیے بے چین تھا۔ شاعری کا جوہر انہیں ودیعت ہوا تھا وہ عنفوان شباب کے ساتھ ابھر آیا۔ ایک نو عمر شاعر کی شعری صلاحیتوں نے ماحول کو چونکا دیا۔ وہ عنفوان شباب کے ولولے اور جوش کے ساتھ زندگی کے سفر پر چل پڑے، مگر جلد ہی ان کو پتا چل گیا کہ جس دور میں وہ سانس لے رہے تھے وہ بے حس اور زندگی کے [illegible] کے جذبے سے عاری ہے۔ بچپن ہی سے وہ خاموش اور کم سخن تھے، ان کے دل میں جو لاوا سلگ رہا تھا وہ کا غذ پر اظہار کے نقش بنتا رہا، جو بسیار گوئی تک پہنچ گیا۔ ان کا قلم نظم و نثر دونوں میں صناعی کا عادی و مشغل تھا۔ کوئی موضوع ہو کاغذ پر الفاظ موجود

راہ کی طرح جیتے چلے جاتے تھے، جیسے پہلے ہی سے نکلنے کے لیے بے تاب ہوں۔ جبھی دکن کے بزرگ صوفی شاعر حضرت امجد نے میکش کی شاعری کے بارے میں کہا تھا "کہنے والا کوئی اور ہے" اور یہ میکش کے الہامی انداز سخن کی طرف اشارا تھا۔ ان کی شاعری کے موضوع زندگی کے وسیع پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کے تجربوں کا اظہار پیچیدہ نہیں، بلکہ سادا ہے، جو اس عہد کا مزاج تھا۔ ایک بات جو اکثر میکش کے بارے میں کہی جاتی رہی ہے کہ وہ ان کی تاثر پذیری ہے۔ نوعمر شاعر اپنے پیش روؤں اور بزرگ شاعروں سے ہمیشہ متاثر ہوتے رہے ہیں۔ میکش کی ابتدائی شاعری میں یہ انداز زیادا نمایاں ہے۔ خاص طور پر اقبال اور جوش کے موضوع اور اسلوب سے وہ زیادا متاثر تھے۔ ویسے ان کے اکثر ہم عصر شاعروں کا رنگ بھی ان کی شاعری میں جھلکتا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "گریہ و تبسم" سنہ ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ جب وہ ۲۲ سال کے تھے۔ عمر کی منزلوں کے ساتھ ان کا شعور بھی پھیل کر وسیع ہوتا گیا، اور انہوں نے داخلی دنیا کی طرف رجوع ہوکر اپنے اندرونی تجربوں کا اظہار کیا تو تخلیقی سطح پر ان کی انفرادیت ابھر آئی اور ان کی دروں بینی نے ان پر زندگی کی آگہی اور عرفان کی نئی راہیں سجھائیں۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام "نوید" سنہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا، جس میں فکری سطح پر اپنے آپ کو پانے کی کوشش ملتی ہے اس کے ساتھ زندگی کے کرب اور الم ناکی کا ایک واضح تصور بھی ابھرتا ہے۔ میکش کی زندگی کا وہ حزنیا عنصر جو بچپن ہی سے ان کے دل کی گہرائیوں میں پاشیدہ تھا، شعور کی سطح پر نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ ان کی روح کا وہ الاؤ جو زندگی بھر دھیمے دھیمے سلگتا رہا ان کے گزرنے اور [illegible] ان جسم کو پگھلا کر موت سے قریب تر کر دیتا ہے اور یہ ہونہار شاعر (۳۱) سال کی عمر میں اپنے دور کی بے دردیوں کا شکار ہوکر اپنی متاع حیات موت کے حوالے کر دیتا ہے۔

میکش کی شاعری اپنے عہد کی آفریدہ ہے۔ ان کو ہم عصر میلانات اور زمانے کے تغیرات کا احساس و شعور تھا۔ ان کے یہاں وقت کا تصور بھی ملتا ہے جو متحرک لمحات کا ایک تسلسل ہے۔ یہی تسلسل جو زندگی کو معنی اور مفہوم دیتا اور دلوں میں نئی دنیا کی آرزو و تمنا کو جگاتا ہے۔ ان کی نظم "چند قدم" وقت کے ساتھ اس ذوق پرواز کی مثال ہے اور "سڑک" بھی ایسی ہی نظم ہے جو وقت کی علامت بنتی ہے۔ افقی خط کی علامت جو مسلسل گرم سفر ہونے کی نشاندہی کرتی ہے۔ انہوں نے ایک بہتر زندگی کے خواب دیکھے تھے، اور انسانیت کی آبرو کی تمنا کی تھی۔ عنفوان شباب میں زندگی انہیں بہار بے خزاں نظر آتی تھی، اور شباب کے متحرک لمحے عہد اضطراب میں بھی سکون زیست سے ہمکنار رکھتے۔ شاعری کا ابتدائی دور ایک بلند آہنگ انداز میں شروع ہوتا ہے کہتے ہیں ؎

قرار بے قراری کا نام ہے شباب میں
سکون زیست پا رہا ہوں عہد اضطراب میں
مرا شباب زندگی ہے کائنات کے لیے
عمل کا غیث ہوں منبع حیات کے لیے
مری حریم آرزو میں یاس کا گزر نہیں
بہار بے خزاں ہوں میں خزاں کا مجھکو ڈر نہیں

ابتدا میں شباب اور عمل کی یہ لے ان کے خیالوں کا مرکز بنی رہی، اور زندگی کی حیات بخش راہوں کی جستجو اور کٹھنائیوں پر غالب آنے کا عزم ان کے شعروں میں جھلکتا ہے ؎

ابھی تک امنگیں سو رہی تھیں دل کے گوشوں میں
صدائے زندگانی سے انہیں بیدار کرتا ہوں
مزہ ملتا ہے دشواری میں احساس تمنا کا
میں اس دھن میں ہر آسان کو بھی دشوار کرتا ہوں

میکش کے خوابوں کو وہ تعبیر نہ مل سکی جس کی وہ آرزو و تمنا کر رہے تھے، اور ماحول کے بے درد ہاتھوں ان کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔

زندگی کی آسودگی جب ناآسودگی سے بدل گئی تو ان کا آخری دور شاعری، یاس و حرماں سے بھر گیا، بلکہ آرزوؤں کی شکست کا ردعمل خدا اذیت کی حد تک پہنچ گیا اور آرزوئے موت ان کے آخری دنوں کا مقدر بن گئی ؎

خیال و وہم ہے امید کامرانی اب
ہے بار زیست سے شانوں پہ زندگانی اب
اتر رہا ہے خمار حیات فانی اب
ہے انتظار ترا مرگ ناگہانی اب

میکش کے یہاں زندگی کے کرب و الم نامی کا یہ احساس جو ان حالات کا نتیجا تھا، جن سے ان کی حساس شخصیت دو چار ہوئی - درد کی یہ کسک ان کی شعری تخلیق میں رچ بس گئی - شدت احساس کے ساتھ ان کی دروں بینی نے ذات کی تہوں کو الٹ کر ان کو ایسا ابھار دیا جو ان کا اپنا تھا، اور یہیں ان کی شاعری کا ایک نیا موڑ آگیا تھا، جو فنی بلندیوں کی نشان دہی کرتا تھا، مگر افسوس کہ عمر نے ان کا ساتھ نہیں دیا -

ان کو اس کا احساس تھا کہ وہ زیادہ دن جی نہ سکیں گے، اور اکثر نظموں میں، بلکہ نثری تحریروں میں اس کے اشارے ملتے ہیں -

آج میکش کو انتقال کیے (۲۷) سال ہو رہے ہیں - اب شاعری کا لہجا اور انداز بدل گیا ہے، مگر اس دور میں جب میکش نے اپنی شعری تخلیق کا آغاز کیا، اور بہت ہی مختصر عرصے میں اپنی خلاقی اور جودت طبع سے آسمان ادب پر ایک روشن ستارے کی طرح طلوع ہوئے تو ان کی دل کھول کر پذیرائی ہوئی، شہرت ملی، عزت ملی، یہ سب کچھ ہوا، مگر ان کی زندگی کو سکون میسر نہ آسکا جس کے وہ ہر طرح مستحق تھے، اور جس سرعت سے وہ طلوع ہوئے تھے اسی سرعت سے بے بسی اور بے چارگی کی چادر اوڑھے غروب بھی ہو گئے - میکش کا یہ جوانمرگی اس دور کا بڑا المیا ہے -

ظفر مرادابادی

انتظار

ہوش کی محفلوں سے اکتا کر
جوش کی سرزمیں پہ جائیں گے
اور مجھ سے لپٹ کے روئیں گے
تیرے جذبوں کے پھیلتے سائے
تو بھی حیران ہو کے دیکھے گی
زندگی کے حسین پیرائے
ہر اداسی کی تلملاہٹ کو
روح تشنہ ہمک کے پی لے گی
غم کا بوجھل حصار ٹوٹے گا
لوٹ خوشگوار آئے گا
دشت در دشت ابر برسیں گے
شہر در شہر رونقیں ہوں گی
جگمگائے گا رنگ تیرہ شبی
روشنی پیار کے ستاروں کی
اک شبستان تو سجائے گی
آس کی غم زدہ منڈیروں پر
عشق پیچاں کی بیل کی مانند
تو مرے بازو میں جھولے گی
رونق زندگی کو چھو لے گی
میں ترے گنگناتے پیکر کو
اپنے سینے میں جذب کر لوں گا
آرزو کی کشادہ پیشانی
بن کے چمکے گی آفتاب حیات
اے مرے خواب کی حسین تعبیر
تو کہاں ہے کہ ایک مدت سے
میں یہی خوشگوار مستقبل
خواب حسرت سجائے بیٹھا ہوں
اپنے پہلو میں انتشار لیے
اپنی آنکھوں میں انتظار لیے

سفندار - فروردی - اردی بہشت ۱۳۸۵ ان ہندستانی ادب جنوری - فروری - مارچ ۱۹۷۶ء

فرحت قمر

انڈونیشیائی عورتیں

انڈونیشیا اس اعتبار سے دنیا کا سب سے عجیب ملک ہے کہ اس کی سرزمین تیرہ ہزار سے زیادہ جزیروں کا مجموعہ ہے جس میں سے تقریباً ۴۵ فی صد جزیرے آباد ہیں۔ بڑے بڑے پانچ جزیروں میں سے جاوا میں سب سے زیادہ آبادی ہے اور یہاں ہی سب سے زیادہ تہذیبی و تمدنی رنگا رنگی اس چھوٹے سے ملک کا زمینی اور سمندری رقبہ اتنا بڑا ہے کہ لندن سے تہران تک پھیل جائے آبادی تقریباً بارہ کروڑ ہے جس میں مسلمان، عیسائی ہندو، بدھ اور چینی مذہب کے ماننے والوں کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے خاندان بھی مستقل طور پر آباد ہیں۔ آبادی اور عقاید میں رنگا رنگی کے باوجود رفاقت اور ہم آہنگی کے معاملے میں شاید یہ ملک اپنی مثال آپ ہے۔ یہ ملک تقریباً تین ہزار سال سے آباد ہے۔ جب منگول نسلیں چین سے یہاں پہنچیں یہاں ہندو مذہب اور اسلام ہندستان سے پہنچا، مگر آج وہاں مسلمان تقریباً چھ کروڑ ہیں۔ یہاں بعد میں یورپین اقوام بھی آئیں انہوں نے حکمرانی بھی کی اور رہائش بھی اختیار کی، یہاں نسلوں کا اختلاط بھی ہوا، لیکن آج جسم کی بناوٹ [illegible] کے شکل کے لحاظ سے یہاں کے لوگوں [illegible] ایشیائی چہرہ نمایاں ہے اور تہذیبی طور پر مغرب [illegible] مشرقی تہذیب [illegible] ملی جلی قدریں حاوی ہیں۔

انڈونیشیا میں موسم تقریباً ایک جیسا رہتا ہے۔ گرمی اور برسات کے موسم میں بھی ہمارے ملک کی طرح تپش اور حبس نہیں ہوتا۔ سمندر کی ہر جگہ موجودگی نے موسم کو معتدل بنایا ہے۔ قدرت پیڑ پودوں کے معاملے میں انڈونیشیا پر بہت فیاض نظر آتی ہے۔ گھنے بن۔ ہرے بھرے ساحل اور سبزہ زار زمین انتہائی زرخیز بارش کی افراط چاول کی فصلیں سال میں تین تک پیدا کرلی جاتی ہیں۔ ساری نعمتیں انڈونیشیا کو حاصل ہیں۔ انڈونیشیا کا چاول بہت اچھا ہوتا ہے، اور انڈونیشیائی عورت کے باورچی خانے میں اس کا اہم مقام ہوتا ہے۔ انڈونیشی عورتیں چاول کو نمکین اور میٹھا کھانے کے علاوہ اس کے آٹے اور لگدی سے طرح طرح کے پکوان بھی تیار کرتی ہیں چاول کے ساتھ گوشت اور مچھلی کے علاوہ پیداوار کی افراط کی وجہ سے انڈونیشیائی عورت اپنے گھر کے دسترخوان پر کیلے، کیلے کی سبزی اناناس کا اچار اور مربا اور آم جیسے پھل خوب سجا سکتی ہیں چائے اور کافی کی پیداوار کافی ہوتی ہے اور انڈونیشیائی عورت جہاں اناناس اور گڑ ملا کے پھلوں کا ٹھنڈا شربت مہمانوں کو پیش کرتی ہے وہاں اس کو بار بار چائے اور کافی بھی [illegible] کرتی ہے۔ ناریل کی مٹھائی مع بڑی نفاست

سے تیار کرتی ہے اور سیب کا جام بھی۔ چاول جہاں شہروں میں وہ گیس اسٹو اور کوئلے پر بناتی ہے وہاں پہاڑی علاقوں میں گرم چشموں کے پانی میں پوٹلی تھوڑی ہی دیر ڈال کر بھی چاول تیار کر لیتی ہے۔

انڈونیشائی مرد ہو یا عورت، زردی مائل صاف رنگ کے ہوتے ہیں۔ مردوں کی طرح عورتوں کا قد بھی چھوٹا ہوتا ہے اور جسم پر بال بہت کم ہوتے ہیں۔ جلد عموماً نرم اور چکنی ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو ذرا ترچھی ہوتی ہیں ان کو مغربی اور وسطی دنیا کی عورت سے نمایاں کرتی ہیں۔ جزیروں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے مختلف قسم کی بولیاں بولی جاتی ہیں لیکن اب جاوا جزیرے کی زبان کو سرکاری زبان بنا کر فروغ دیا جا رہا ہے۔ بہرحال جاوائی زبان ہو یا کوئی دوسری مقامی بولی، انڈونیشائی عورت بڑی نرمی شناس اور سلیقے کے ساتھ گفتگو کرتی ہے۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی سادہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے اگر انڈونیشائی عورت کا کوئی مقابلہ ہو سکتا ہے تو صرف جاپانی عورت سے ہو سکتا ہے۔

سارونگ (رنگین تہمد) انڈونیشائی عورت کا خاص لباس ہے۔ جکارتا جیسے بڑے شہروں میں اگرچہ امریکن طرز کی زندگی بھی عام ہے، مگر لباس کے معاملے میں بیشتر انڈونیشائی عورتیں پرانے دستور ہی پر قائم ہیں یعنی وہی رنگین، پھول دار اور اکثر ریشمی سارونگ اپنی کمر کے گرد لپیٹتی ہیں جو نیچے ٹخنوں تک کو ڈھک لیتا ہے۔ ٹخنوں پر اونچا سارونگ بھی باندھا جاتا ہے جو اسکرٹ کی طرح لگتا ہے۔ اوپر کا ایک بلاوز سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ لڑکیاں اور مزدور عورتیں سر پر بانس، تنکے، کاغذ اور کپڑے کے بڑے بڑے ٹوکری نما ہیٹ پہنتی ہیں، لیکن فیشن ایبل لڑکیاں یا تو ننگے سر رہتی ہیں یا رومال یا مغربی طرز کے ہیٹ استعمال کرتی ہیں۔ عورتیں رومال دھوپ سے بچنے کے لیے بھی استعمال کرتی ہیں اور پردے کے لیے بھی، روایتی پردہ بہت ہی دقیانوسی قسم کی مسلمان عورتوں میں پایا جاتا ہے اور وہ بھی صرف اس حد تک کہ ریشمی رومال کو چہرے پر ڈھکے ہوئے پن کے ذریعے گلے میں باندھ لیا جاتا۔ خوب صورت چھوٹی سی چھتری دھوپ سے بچنے کے لیے عام طور پر عورتوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

جہاں قدیم ہندو تہذیب کا اثر انڈونیشیا کی زندگی زبان اور ناموں پر پڑا ہے وہیں اسلامی رنگ بھی کافی گہرا ہے۔ مسلمان مذہب کے پابند ہیں۔ اکثر عورتیں بھی روزہ نماز کی پابندی کرتی ہیں اور رمضان کے مہینے میں خوش خوش مصروف رہ کر عید کی صبح کو ناریل کے حلوے سے گھر کے افراد اور مہمانوں کی تواضع کرتی ہے جو حج کو کرنا ہوتا ہے جوانی کی عمر میں ہی کر لیتے ہیں۔ اکثر میاں بیوی ایک ساتھ حج کو جاتے ہیں۔ گھروں کا رخ کعبے کی طرف ہوتا ہے۔ عورت نے ترقی کی ہے مگر وہ تعلیم و تہذیب سے سنور کر چراغ خانہ ہی بنی ہوئی ہے وہ بے پردہ باہر گھومتی ہے، ملازمت کرتی ہے کام کرتی ہے، مگر مغرب کی طرح عریانی اور بے حیائی کی شائق نہیں۔ ۱۹۵۵ء سے پہلے انڈونیشیا میں ایک بھی یونیورسٹی نہیں تھی۔ اب پانچ بڑی یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کی تعداد ۴۰ فی صد ہے جو لڑکوں کے ساتھ ہی پڑھتی ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں الگ بھی۔ بہرحال تعلیم اور ترقی کے میدان میں انڈونیشائی عورت خاصی آگے ہے۔ ووٹ کا حق بھی اس کو حاصل ہے اسمبلی میں حصہ لینے کا بھی۔ ہمارے ملک کی طرح انڈونیشیا میں بھی عورت زندگی کے ہر میدان میں نظر آتی ہے وہاں عورتوں میں آزادی کی تحریک بھی موجود ہے اور فیملی پلاننگ کا چرچا بھی۔ پچھلے سال وہاں کی ایک سماج سدھار کا کام کرنے والی خاتون ڈاکٹر [illegible] ماری اوز ہندوستان میں آئی تھیں تو انہوں نے بتایا تھا کہ فیملی پلاننگ کے سلسلے میں انڈونیشیا کی عورتیں بنیادی ذمے داری مرد کے سر ڈالتے

قابل ہیں۔

انڈونیشیا کے شہروں کی عورتیں ترقی کے میدان میں، باقی دنیا سے پیچھے نہیں تو گاؤں کی عورتیں اپنے الگ طریقے سے زندگی گذارتی ہیں۔ ہرے بھرے کھیتوں میں کام کرتی ہوئی عورتیں جھیلوں میں کشتی کھیتی ہوئی عورتیں، ندیوں میں نیم عریاں نہاتی ہوئی عورتیں، بازاروں میں پٹڑی پر یا پھیری میں پھل سبزی بیچتی ہیں۔ عورتیں، گھریلو ملازم، مزدور گرہستن انڈونیشیا کی دیہاتی عورتیں سب ہی کچھ ہیں، مگر ہر حال میں وہی ممتا کی ماری ماں اور شوہر سے کبھی کبھی الگ ہونے کے باوجود ہی شوہر کے زیر سایہ رہ کر اس سے محبت کرنے والی بیوی ہیں۔ شہروں میں عورتیں بڑے کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ گاؤں اور قصبوں میں عورتیں ریشمی کپڑا بننے اور ربر اور ساگودانا کے پیڑوں سے دودھ اکٹھا کرکے ربر اور ساگودانا تیار کرتے دیکھی جا سکتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مورتیاں بنانا (خصوصاً بالی جزیرے میں) سنگ پر نقاشی کرنا بانس سے مختلف آرائشی چیزیں بنانا اور لکڑی کی چھوٹی چھوٹی منقش اشیا تیار کرنا وہاں عورتوں کی گھریلو صنعتیں ہیں۔

کم ترقی یافتہ اور کم غیر آباد جزیروں میں صدیوں پرانی چلی آنے والی زندگی کے چکر میں الجھی ہوئی غیر تعلیم یافتہ عورتیں بھی انڈونیشیا میں پائی جاتی ہیں جو آج بھی جادو کرنے سے بیماریوں کا علاج کرتی ہیں اور طرح طرح کے وہموں میں مبتلا رہتی ہیں۔ ان کے کپڑے بھی عجیب سے ہوتے ہیں اور طور طریقے بھی۔

انڈونیشیا میں شادی ماں باپ کی مرضی سے بھی ہوتی ہے اور اپنی مرضی سے بھی۔ شہری زندگی اور تعلیم یافتہ لوگوں کی بات تو خیر الگ ہے ورنہ ویسے انڈونیشیا میں شادی کی رسمیں بھی عجیب ہیں۔ انڈونیشیا کی دیہی زندگی میں لڑکے کو سارے گاؤں والوں کی پانچ دن تک دعوتیں کرنا پڑتی ہیں اور پھر شادی کا سامان تیار کرکے ایک اندھیری رات میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ چپ چاپ لڑکی کے گھر میں گھس جاتا ہے اور لڑکی کو گھسیٹ لاتا ہے۔ لڑکی لڑکے کے گھر پہنچ جاتی ہے تو لڑکے کا باپ لڑکی کے باپ کے گھر جاکر لڑکی کی "قیمت" ادا کر دیتا ہے، اور پھر کوئی پروہت باقاعدہ شادی کی رسم ادا کر دیتا ہے۔ مسلمانوں میں وہی شرعی طور سے شادی ہوتی ہے۔ ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ کی مذہبی رسوم میں حکومت دخل اندازی نہیں کرتی۔ بالی میں آج بھی پرانے طرز پر چار ذاتوں کو مانا جاتا ہے اور شادی کے لیے سوئمبر کا قدیم ہندو طریقہ (لڑکی بہت سے لڑکوں کے اجتماع میں سے اپنا شوہر چننے) مروج ہے۔ مسلمان اسلامی شریعت کے مطابق طلاق اور جائیداد کے مسئلے طے کرتے ہیں، لیکن بالی کے ہندو کوئی جھگڑا ہونے پر بیوی کو طلاق دینے کی بات ہندستانی ہندوؤں کے مقابلے میں بہت جلد سوچ لیتے ہیں۔ پہلے تو پنچایت کوشش کرتی ہے کہ میاں بیوی کا جھگڑا ختم ہو جائے ورنہ پھر طلاق کا فیصلہ ہو جاتا ہے اور پھر دونوں دوسری شادی کر سکتے ہیں۔ جائیداد اس کو ملتی ہے جو بچوں کی ذمے داری سنبھالے۔ بچے نہ ہونے کی صورت میں میاں بیوی کی مشترکہ جائیداد دونوں میں برابر برابر تقسیم کر دی جاتی ہے۔

انڈونیشیائی زندگی کی تصویر نامکمل رہ جائے گی اگر وہاں کے رقص و موسیقی کا ذکر نہ کیا جائے۔ عورتیں ناچنے گانے کی بڑی شوقین ہوتی ہیں اور ساتھ ساتھ ماہر بھی۔ یہاں کے دیسی آرکسٹرا کا نام "گیملان" ہوتا ہے جس میں رباب اور بانسری "کلنگ" سے لے کر کئی قسم کے دھاتوں سے بنے ہوئے آلات موسیقی استعمال ہوتے ہیں (جن کے نام ہم کو بڑے عجیب لگیں گے۔ مثلاً "کونگ" "کمپنگ" "کیب جانگ" اور "کمپل" ان کے ساتھ بجتے ہیں۔ "بونانگ" اور "کیمپانگ" نام کے چھوٹے بڑے ڈھول۔ یہ موسیقی مغربی موسیقی سے یکسر مختلف ہے۔ ہاں جدید تہذیب کے اثرات سے اسکو تیز سروں میں ڈھال کر نئے دور کی ضرورتوں کو پورا کر لیا جاتا ہے۔ رقص [illegible] قدیم

سے چلے آتے ہیں جن میں عبادتی رقص ہیں اور موسمی بھی، رامائن، مہابھارت کی کہانیوں سے متعلق رقص بھی ہیں اور زندگی کے مختلف اوقات و تقریبات سے وابستہ رقص بھی۔ "پینڈیت"، رقص لڑکیاں مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے کرتی ہیں تو "سری وڈ جاجا" رقص لڑکوں کے ساتھ کسی رقص میں لمبے لمبے مصنوعی ناخون انگلیوں پر چڑھائے جاتے ہیں تو کسی میں نقلی سینگ لگائے جاتے ہیں۔ رقص کے ساتھ رقاصا کی خوبصورت بھڑک دار پوشاک تو لازمی ہوتی ہی ہے کبھی کبھی رقص میں ان کے چہرے اور ہاتوں کو بھی رنگا جاتا ہے۔ کتھک ڈانس کی طرح وہاں کے کچھ ناچوں میں بھی ہات آنکھ، ناک وغیرہ کی حرکات سے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے۔

ساغر نظامی

بے نوا مزدور کو آقا بنا سکتا ہے کون؟

(وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی وزارت عظمیٰ کے دس سال پورے ہونے پر خراج تحسین)

نیند کے ماتوں کو سوتے سے جگا سکتا ہے کون
صدیوں کے واماندہ بچارو کو اٹھا سکتا ہے کون
آنسوؤں کے تار کو بربط بنا سکتا ہے کون
خشک کہاروں کے دل میں گنگنا سکتا ہے کون
اندرا کے دست و بازو کے سوا طوفان میں
کشتیٔ بشکستہ کو ساحل پہ لا سکتا ہے کون
سوشلزم ساز اس کا اس کا نغمہ انقلاب
اے ندیم اس کے سوا نغمہ یہ گا سکتا ہے کون
اس کے اشک گرم کے سیلاب پیہم کے سوا
خاک کے سینے میں سو چشمے بہا سکتا ہے کون
کھیت مزدوروں کو شہر آبیاری کا اسیر
بے نوا مزدور کو آقا بنا سکتا ہے کون
اس کے اعجاز تخیل کی ادادت کے سوا
کوہ و صحرا میں دود پلا را اٹھا سکتا ہے کون
اس کے عزم نور افگن کی حرارت کے سوا
رات کا بے نور سینہ جگمگا سکتا ہے کون
فکر و عزم و محنت پیہم کی ضربوں کے سوا
صدیوں کی منحوس غربت کو مٹا سکتا ہے کون
مسکراتا ہے ہر اک کونپل میں عظمت کا درخت
اس نے جو پودے اگائے ہیں اگا سکتا ہے کون
لاکھ برسائے خزاں شعلے فضائے باغ پر
پھول جو اس نے کھلائے ہیں کھلا سکتا ہے کون
جستجو کیمیا گر خاک کے اس ڈھیر کو
اپنے لمس شوق سے کندن بنا سکتا ہے کون
اس کی معماریٔ فکر بے نہایت کے سوا
بے گھروں کو صاحب ایواں بنا سکتا ہے کون
اس کے سحر آبیاری کے سوا ہر کھیت میں
آنے والی فصل میں سونا اگا سکتا ہے کون
اس کی انگشت طلسمی کی اشارت کے سوا
برق کی فطرت میں سحر نو جگا سکتا ہے کون
گھاٹیاں امروز و فردا کی ہیں اس سے نور بیز
شمع جو اس نے جلائی ہے جلا سکتا ہے کون
اس طلسمات امارت کے حریم ظلم سے
پردے جو اس نے اٹھائے ہیں اٹھا سکتا ہے کون
اس کے اشک آلود ابرو کی سنہاوت کے سوا
بے نوا جھڑیوں کو شاہوں سے بھڑا سکتا ہے کون
سوشلزم کی طلسم انگیز کرنوں کے سوا
ذرۂ کم مایہ کو سورج بنا سکتا ہے کون
خود وہ دیوی پاسباں ہے مشترک تہذیب کی
مشترک تہذیب کا پرچم جھکا سکتا ہے کون
ہے اخوت کی علامت اک کنول اور اک گلاب
اس کے ہوتے اس علامت کو مٹا سکتا ہے کون
ہے محبت رہنما اپنی مودت راہبر
اب وفا کی رہ گزر میں ڈگمگا سکتا ہے کون
اس کے فکر دور رس کی بیقراری کے سوا
اک حقیقت ہر تصور کو بنا سکتا ہے کون
دست قدرت نے جسے روشن کیا ہے بزم میں
اس امر جوتی کو اے ساغر بجھا سکتا ہے کون

سید صباح الدین ندوی، ایڈیٹر "معارف"

پاکستان میں چار مہینے

یہ خاکسار پاکستان میں چار مہینے قیام کے بعد ۷ار دسمبر سنہ ۱۹۷۵ء کو اعظم گڑھ واپس آیا۔ میری لڑکی کی نسبت میرے خاندان ہی کے ایک قریبی عزیز ڈاکٹر راشد مصطفا ام۔ بی۔ بی۔ ایس سے طے تھی۔ وہ پہلے مشرقی پاکستان (اب بنگلا دیش) میں چاٹگام کے میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے۔ وہاں کے ہنگامے کے بعد ملتان میڈیکل کالج بھیج دیے گئے۔ یہاں سے پاس ہو کر کراچی میں تھے۔ پاکستان سے آمد و رفت کا رستا بند تھا، اس لیے شادی میں تاخیر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ جناب فخر الدین علی احمد صاحب جب حکومت ہندستان کے وزیر زراعت اور غذا تھے تو ان کی خدمت میں ایک عریضا روانا کیا کہ اگر لڑکی کی شادی کے لیے خصوصی اجازت مل سکتی ہو، اور میرے پاکستان جانے میں حکومت کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس اجازت کے لیے درخاست دوں۔ ان کو دار المصنفین سے بڑا تعلق ہے۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کی رحلت کے بعد اس ادارے کی رکنیت قبول فرما کر اس کا عزت بڑھائی ہے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی عنایت سے یہ لکھ کر نوازا کہ میں اس اجازت کے لیے باضابطا پاسپورٹ کی درخاست دوں، اگر اس کے ملنے میں کوئی دقت ہو تو میں ان کو اطلاع دوں۔ اس سے امید بندھی، اس کے بعد میں اعظم گڑھ کے کلکٹر شری لپھ کے چترویدی صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس شری ٹی ان مصرا سے ملا انہوں نے میری لڑکی کی شادی سے دلچسپی دکھائی، اور میرے اور میرے اہل و عیال کے پاسپورٹ کی درخاستوں کو اپنی سفارش کے ساتھ لکھنؤ بھیج دیا۔ وہاں کی کارروائی میں دیر ہوئی تو میں اتر پردیش کے وزیر مالا شری ہیم وتی نندن بہوگنا سے ملا، انہوں نے پوری ہمدردی کا اظہار کیا، یہ اجازت صوبے کے بجائے مرکز سے مل سکتی تھی، اس لیے انہوں نے دہلی سفارش کی، پھر بھی اجازت ملنے میں تاخیر ہوئی، اس وقت تک جناب فخر الدین علی احمد صاحب حکومت ہندستان کے راشٹرپتی کے عہدے پر فایز ہو چکے تھے، ان کی محبت سے فایدا اٹھا کر ان کی توجہ دلائی کہ لکھنؤ سے میری اور میرے خاندان کی درخاستیں محکمے امور خارجا میں بھیج دی گئی ہیں، وہاں سے اجازت نہیں ملی ہے، انہوں نے پھر اپنی عنایت سے سرفراز کیا، اور میرا خط امور خارجا کے دفتر میں بھیج دیا، وہاں سے لکھنؤ کے انٹرنیشنل پاسپورٹ آفس میں ٹیلیفون آیا کہ میرے اور میرے خاندان کو پاسپورٹ جاری کر دیے جائیں، میں لکھنؤ پہنچا تو پاسپورٹ افسر جناب اے، ال پوری صاحب نے بہت ہی اخلاق سے پیش آ کر بتایا کہ اب خصوصی اجازت کی ضرورت نہیں، انٹرنیشنل پاسپورٹ جاری کر کے اس میں پاکستان جانے کی اجازت دیدی جاتی ہے مجھ کو انٹرنیشنل پاسپورٹ لے لینے کی ہدایت دی۔ اب

پھر از سر نو فارم بھرے اور چھ آدمیوں کے پاسپورٹ کی فیس ادا کرنے کے بعد یہ حاصل ہو گئے۔ خوش تھا کہ مرحلہ سر ہو گیا۔ اب ویزا حاصل کرنے کی فکر ہوئی۔ سوئٹزر لینڈ کا سفارت خانہ پاکستان کی نیابت کرتا ہے، اس کے پاس فی آدمی کے لیے چار فارم بھر کر درخواستیں بھیجیں۔ خیر یہ درخواستیں اسلام آباد بھیجی گئیں وہاں سے ویزا جاری کرنے کی اجازت کافی دیر میں آئی، اجازت کی اطلاع آنے پر سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانے کی طرف سے پاسپورٹ طلب کیے گئے۔ میں نے رجسٹری سے چھ پاسپورٹ دہلی بھیجے، مگر میری پریشانی کی کوئی حد نہیں رہی جب ڈاک گھر سے یہ اطلاع ملی کہ یہ رجسٹری ڈاک گھر سے گم ہو گئی اور اس کا کہیں پتا نہیں چل رہا ہے۔ یہ اطلاع اس وقت آئی جب ہم لوگ سامان باندھے سفر کے لیے تیار تھے،

اعظم گڑھ کے ڈاک خانے کے سپرنٹنڈنٹ نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا، اور ان کا ایک سرٹیفکٹ لے کر لکھنؤ پاسپورٹ آفس پھر پہنچا، نوری صاحب نے بھی بڑا ہمدردانہ برتاؤ کیا، اور پھر سب کی طرف سے درخواستیں دینے کو کہا۔ درخواستوں کے ساتھ پھر فیس ادا کی تو پاسپورٹ ملے، اس کے بعد خود دلی جا کر ویزا حاصل کیے۔ یہ جوئے شیر نکال کر پاکستان کے لیے اہل و عیال کے ساتھ ۸ اگست ۱۹۷۵ء کو اعظم گڑھ سے روانہ ہوا۔ ۹ اگست کو اتر پردیش کی اردو اکاڈمی کا ایک جلسہ تھا، اس میں بھی شرکت کی۔

اردو اکاڈمی کے جلسے میں شرکت

اس کے جلسے میں پہلی دفعہ شریک ہوا۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ اس کی صدر ہیں، اس لیے انہوں نے جلسے کی صدارت کی جس کی کارروائی میں اپنے پورے وزن اور وقار کو ملحوظ رکھا۔ اس جلسے میں پارلیمانی اور جمہوری رنگ نظر آیا طرح طرح کے معترضانہ سوالات ہوئے بحثیں بھی ہوئیں، لیکن بیگم صاحبہ اور اس کے سکریٹری جناب صباح الدین عمر صاحب نے تمام اراکین کو ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ اس کے اراکین کو اپنے حقوق کو استعمال ضرور کرنا چاہیے، مگر ان کے استعمال کے وقت یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کا اکاڈمی کو مفید مشورے دے کر اس کے ذریعے سے اردو کے لیے زیادہ سے زیادہ تعمیری کام بھی انجام ہوتا رہے اس کا جلسہ صرف بحث و مباحثے کا اکھاڑا نہ ہو آخر میں اتر پردیش کے وزیر مالیات جناب ہیم وتی نندن بہوگنا نے بھی اس جلسے میں شرکت کر کے اس کو مخاطب کیا۔ اردو سے متعلق ان کی تقریر بہت ہی حوصلہ افزا تھی، اور وہ لکھنؤ ہی کی اردو میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے، انہوں نے اعلان کیا کہ آیندہ یو۔ پی کا گزٹ اردو میں بھی حکومت کی طرف سے بالالتزام شایع ہو گا، اور وہ اسکولوں کے آٹھویں درجے تک اردو تمام طلبا کے لیے لازمی قرار دینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جو افراد اردو نہیں جانتے ہیں وہ اگر اردو کا امتحان پاس ہو گئے تو ان کو انعامات دیے جائیں گے، آخر میں یہ بھی کہا کہ اگر اردو اس ریاست میں پنپ گئی تو پورے ملک میں باقی رہے گی ان تقریر سے حاضرین کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں، اور خراج تحسین میں تالیاں بجائی جا رہی تھیں، شام کو انہوں نے اپنے گھر پر ایک پر تکلف عصرانہ دیا جس میں وہ تمام مہمانوں سے بڑی بے تکلفی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے رہے ان سطروں کے لکھتے وقت ریڈیو سے یہ معلوم ہوا کہ وہ وزارت مالیات کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

سفر کا آغاز

۹ اگست کو ہم لوگ امرتسر ایکسپریس سے چار بجے سہ پہر کو لکھنؤ سے روانہ ہوئے، ۱۰ اگست کی صبح امرتسر پہنچے قلیوں نے توقع کے خلاف اپنی مقررہ شرح سے دس گنی رقم زیادہ وصول کی، مگر اخلاق سے پیش آئے، ہم لوگ امرتسر سے اٹاری کے لیے ایک ٹیکسی میں روانہ ہوئے فاصلہ (۱۹) میل کا ہو گا، ٹیکسی کا کرایہ ۳۰ روپے ادا کرنا پڑا، ڈرائیور ایک سردار جی تھے، راستے میں پوری ہمدردی کے ساتھ باتیں

بیتے رہے، لاہور پہنچے تو سامان کی دیکھ بھال شروع ہوئی سرکاری ملازمین زیادہ تر سکھ تھے خیال تھا کہ معلوم نہیں کیسے کیسے اعتراضات ہوں گے، مگر الحمد للہ کوئی چیز ایسی نہیں نکلی جس پر کسٹم والوں کے اعتراضات ہوتے قلیوں نے یہاں بھی کافی اجرت وصول کی اپنے ملک کی سرحد پار کرکے پاکستان پہنچے تو وہاں بہت سے اعزا ذو موٹریں لیے منتظر تھے۔ میرے دوست مولوی عزیز الرحمان کے لڑکے عتیق الرحمان فاروقی بھی جو پاکستان میں کسٹم انسپکٹر ہیں وہاں موجود تھے، انہوں نے ہر طرح کی خاطر تواضع کی، اور لاہور میں اپنے ایک عزیز عزیز الحق کے یہاں رات بھر قیام کیا وہ مسلم کمرشیل بینک میں منیجر ہیں، انہوں نے پہلے ہی سے ٹکٹ خرید لیے تھے، انہیں سے دوسرے دن علی الصباح میرے پھوپی زاد بھائی کمال احمد نے اپنی گاڑی پر لاہور اسٹیشن پہنچا دیا، وہ پاکستان کی ایک دوا ساز کمپنی کے [illegible] افسر ہیں، لاہور سے ہم لوگ سپر ایکسپریس نامی ایک ریل گاڑی میں کراچی پہنچے بڑی تیز رفتار گاڑی ہے، اور گاڑیاں ۲۲ گھنٹے میں کراچی پہنچتی ہیں، مگر یہ ۱۶ گھنٹے میں پہنچ جاتی ہے۔ بہت کم اسٹیشنوں پر ٹھہرتی ہے۔ مگر مسلسل (۱۶) گھنٹے بیٹھنے سے بڑی تکان محسوس ہوئی۔ راستے میں ریت اور گرد سے بھی سابقہ رہا، رات کو تقریباً دس بجے کراچی پہنچے بکثرت اعزا اسٹیشن پر موجود تھے، ان بچھڑوں سے مل کر انتہائی خوشی ہوئی، دیر تک ہم لوگ گلے ملتے رہے، بارہ بجے رات کو ہم لوگ اپنے سگے چچا سید صلاح الدین صاحب کے مکان ۹۴ [illegible] پہنچے تو عورتوں سے مل کر خوشی دوبالا ہوئی۔

تقریب کی تیاری

دوسرے دن ہی سے نکاح کی تقریب انجام دینے کی فکر ہوئی، میری اہلیہ کے سگے بھائی عزیزی ڈاکٹر محمد [illegible]

تھیں، وہ اس وقت لندن میں مقیم ہیں، میرے ساتھ اعظم گڑھ میں بچپن سے پرورش پائی، ان کو اپنی اولاد ہی کی طرح عزیز رکھا، ان کی سعادت مندی کی وجہ سے تمام اخراجات کا سامان ہو گیا، جس کے لیے بارگاہ ایزدی میں شکر ادا کیا۔

بیگم صاحبہ سے ملاقات

کراچی پہنچنے کے دو ہفتے بعد شادی خانہ آبادی کی تاریخ مقرر ہوئی اسی اثنا میں استاذی محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی بیگم صاحبہ سے ملنے کے لیے بے چین رہا۔ کراچی پہنچنے کے دو تین روز کے بعد ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اپنی منجھلی لڑکی کے ساتھ عزیز آباد میں رہتی ہیں، جن کے شوہر ڈاکٹر عطاء اللہ آج کل سعودی عرب میں ملازم ہیں۔ بیگم صاحبہ اب بہت بوڑھی ہو گئی ہیں، آنکھوں کی روشنی بھی بہت کچھ زائل ہو چکی ہے، بس اتنی اتنی بصارت ہے کہ گھر میں چل پھر لیتی ہیں، اب ان کی زبان پر زیادہ تر اللہ اور رسول کی باتیں رہتی ہیں، ان کی بڑی لڑکی اپنے شوہر عاصم صاحب کے ساتھ علیحدہ مکان میں رہتی ہیں جو کراچی کے ہائی کورٹ میں ایڈوکیٹ ہیں، اب وہ بھی داماد والے ہو گئے ہیں۔ سید صاحب کی منجھلی صاحبزادی تو ہندستان ہی میں ہیں، ان کے ایک صاحبزادے کراچی آ گئے ہیں جو یہاں پولی ٹکنکل [illegible] میں لکچرار ہیں۔ سید صاحب کے صاحبزادے ڈاکٹر ابو سلمان ندوی ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقا میں اسلامک اسٹڈیز کے صدر ہیں۔ سید صاحب کی چھوٹی لڑکی کو پریشانیوں میں پایا، وہ بیوہ ہو گئی تھیں، نکاح ثانی ہوا، لیکن یہ راس نہ آیا۔ دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے اچھے دن واپس لائے۔ سید صاحب کے پہلے محل سے عزیزی ابو سہیل بھی بنگلہ دیش سے لٹ پٹ کر کراچی پہنچ گئے ہیں، کسٹم آفیسر تھے - اب وہ بھی [illegible] والے ہو گئے ہیں، اچھے حال میں ہیں، پہلے محل سے سید صاحب کی ایک [illegible]

سید فیق اشرف اسٹیٹ بینک میں کلاس ون کے افسر ہیں۔ ایک روز ہم سب ایک ساتھ جمع ہوئے۔ دارالمصنفین اور سیلی منزل کی ساری گزشتہ باتیں مزے لے لے کر دہرائی گئیں، مگر اس کا بھی دکھ تھا کہ یہ ساری حقیقتیں اب افسانے کی حیثیت سے دہرائی جارہی تھیں۔ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ انہوں نے بھوپال اور کراچی میں سید صاحب کی بڑی تنخواہوں کے ساتھ زندگی بسر کی، مگر جو راحت اور آسودگی دارالمصنفین کے احاطے میں حاصل تھی وہ کہیں اور نہیں ملی، آمدنی کے ساتھ اخراجات بھی بڑھے اور بڑی تنخواہوں کے باوجود کوئی سرمایہ جمع نہ ہوسکا۔

سید حسام الدین راشدی صاحب اور دارالمصنفین

کراچی پہنچکر پاکستان کے مشہور اہل علم اور مصنف جناب سید حسام الدین راشدی سے ملنے کا مشتاق تھا۔ ان سے ۱۹۵۵ء سے ملاقات ہے۔ ۱۹۶۹ء میں کراچی آیا تھا تو انہوں نے ہر طرح کی خاطرمدارات کرکے نوازا تھا، اپنے دولت کدے پر کراچی کے تمام ارباب علم کو مدعو کرکے ان سے ملنے کا موقع دیا تھا، پھر ان ہی کی معیت میں ہر علمی حلقے میں پہنچا تھا، ان کے علم کے ساتھ ان کے حسن اخلاق اور تواضع سے متاثر تھا، وہ دارالمصنفین کے بڑے قدرداں ہیں یہاں پہنچنے سے پہلے میں نے ان کی خدمت میں ایک طویل خط لکھا تھا جس کا متن یہ تھا۔

پاکستان کے ناشروں کی سینہ زوری

"راشدی صاحب! دارالمصنفین اس وقت سخت مالی بحران سے گذر رہا ہے، ہم لوگوں کا خیال تھا کہ جب ہندستان اور پاکستان کے درمیان تجارت پھر سے شروع ہوجائے تو پاکستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات کی مانگ پہلے کی طرح پھر بڑھ جائے گی۔ اس سے بڑی مالی وسعت پیدا ہوجائے گی۔ ہم گزشتہ دس سال سے اس کا انتظار کررہے تھے، لیکن جب اس تجارت کے کھلنے کی امید ہوئی تو ہم کو پاکستان سے برابر یہ خبریں موصول ہورہی ہیں کہ ہماری مطبوعات وہاں چھاپ کر فروخت کی جارہی ہیں۔ ایسے ناشروں نے اخلاقی طور پر ہم کو اطلاع تک نہ دی، وہ خود تو ان مطبوعات کی آمدنی سے سرمایہ دار بن رہے ہیں لیکن ہمارے ادارے پر بڑی کاری ضرب لگادی ہے، جو شکل ہے کہ ناقابل تلافی ہو، اگر مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوکر یہ ادارا بند کردیا گیا تو اس کے خون ناحق کی ذمے داری پاکستان کے ناشروں پر ہوگی۔ اب جبکہ ہند و پاک کی تجارت شروع ہونے والی ہے، پاکستان کے ناشر ہم سے براہ راست کتابیں درآمد کرسکتے ہیں۔ اس طرح وہ فائدے اٹھاکر ہمارے ادارے کو بھی مالی تباہی سے بچا سکتے ہیں، یہ اپنے اخراجات زیادہ تر اپنی مطبوعات کی بکری سے پورا کرتا رہا ہے۔ ہندستان کی مرکزی حکومت کا رویہ اس کی طرف سے بڑا ہی خوشگوار اور ہمدردانہ ہے، اگر یہ خواہاں ہو تو اس کو مرکزی حکومت سالانہ امداد بھی دے سکتی ہے، مگر یہ اپنی پرانی روایت پر قایم رہنا چاہتا ہے۔ گزشتہ ساٹھ سال سے یہ اپنے ایثار پسند خدمت گذاروں کے سہارے چل رہا ہے جو اس سے قوت لایموت پر قناعت کرکے اپنی علمی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، ان کی جیسی قربانی اور ایثار پسندی کی مثال پورے برصغیر میں مشکل سے ملے گی۔ اس ادارے سے مذہبی، تاریخی، ادبی اور دوسرے موضوعات کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں، ان پر اردو زبان کو ناز ہوسکتا ہے۔ پاکستان کے لوگ ہم سے سیاسی طور پر ضرور جدا ہوچکے ہیں، مگر اس ادارے کے خدمت گذاروں نے اس کے لیے جو قربانیاں کی ہیں (قربانیاں دی ہیں بھی محاورا ہے، اور قربانیاں کی ہیں سو فیصد غلط محاورا ہے۔ ایڈیٹر "ہندستانی ادب") ان کی اہمیت کو وہ نظرانداز نہیں کرسکتے۔ وہ اپنے ملک کے ناشروں پر اخلاقی دباو ڈال کر اس کو نقصان سے بچا سکتے ہیں، اگر ان ناشروں کو اس کی کتابیں درآمد کرنے [illegible]

کی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں تو یہ اپنی مطبوعات کا حق طباعت وہاں کے ناشروں اور تاجروں کو فروخت کرنے کے لیے تیار ہے، مگر اس کے لیے معاہدہ سرکاری سطح پر ہو، تاکہ اس کو جو معاوضہ ملنے کی امید ہو وہ ہند و پاکستان کی حکومتوں کے ذریعے سے وصول ہو۔ شرائط کی تفصیلات باہمی گفتگو سے طے ہو سکتی ہیں، اگر یہ شرائط طے ہو جائیں تو صرف سیرۃ النبی کی فروخت سے پاکستان میں لاکھوں روپے پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ ہم پھر پاکستان کے لوگوں اور اس کی حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے یہاں کے ناشروں پر دباؤ ڈال کر ہمارے ادارے کو ختم ہونے سے بچائیں۔

راشدی صاحب! آپ مولانا کوثر نیازی کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں، کیونکہ وہ ہمارے ادارے کی اہمیت اور قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف ہیں۔

انگریزی اخبار ڈان کا اداریہ

راشدی صاحب نے اس خط کو پاکستان کے تمام اردو اخبارات کو بھیجا، میں اپنے ادارے کی طرف سے ان اخبارات کے ایڈیٹروں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کو نمایاں طور پر شایع کیا۔ راشدی صاحب نے اس خط کا انگریزی ترجمہ کر کے انگریزی اخبارات کو بھیجا، پاکستان کے مشہور اخبار ڈان نے اس خط کو ۸ار جولائی سنہ ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں چھاپ کر اس پر ایک اداریہ بھی لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"آج کی اشاعت میں ہم ایک خط کے اقتباسات شایع کر رہے ہیں جو دارالمصنفین اعظم گڑھ ہندستان کے ناظم نے پیر حسام الدین راشدی کو لکھا تھا جو پاکستان کے بڑے ہی معروف و مشہور اہل علم اور مصنف ہیں، یہ خط سب کچھ خود ہی بول رہا ہے۔ عرصے سے دارالمصنفین بہت ہی ممتاز اور نمایاں ادارہ رہا ہے جو تاریخ اور اسلامی علوم و فنون کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ تقسیم ہندستان سے پہلے ہندستان کے علم دوست اور ارباب علم اس بے مثال ادارے کے خدمت گزار رہے۔ یہاں کے اصحاب علم بہت ہی ایثار اور قناعت کے ساتھ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر علمی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔ وہ مادی راحتوں اور آسایشوں سے بے نیاز رہ کر اپنی ساری توجہ لکھنے پڑھنے، تحقیقات کرنے اور کتابیں لکھنے میں صرف کرتے رہے، حالانکہ ان سے کمتر درجے کے لوگ تعیشات کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو اپنا پیدایشی حق سمجھتے ہیں۔ اس ادارے کے خدمت گزار تھوڑی سی رقم اپنی خاص خاص ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قبول کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں، اس کے سرپرست متمول طبقے کے لوگ نہ تھے، لیکن یہاں کتابیں برابر لکھی جاتی اور شایع ہوتی رہیں۔ ایثار پسند، لیکن مشہور اصحاب قلم نے اس عظیم ادارے سے وابستہ ہو کر ایسی بیسیوں کتابیں لکھی ہیں جو پر از معلومات ہیں اور صبر آزما محنت و مشقت سے قلمبند ہوئی ہیں اور ان سے ہمارا لٹریچر بہت ہی متمول ہوا ہے ہم اس ادارے کے شکر گزار ہیں کہ اس کی بدولت اس وقت عربی زبان کے بعد اردو ہی کا مذہبی لٹریچر متمول ترین سمجھا رہا ہے۔

خط سے ظاہر ہوگا کہ تقسیم ہندستان کے بعد اس ادارے کو اپنے وجود کو قایم رکھنے میں جرات مندانہ حوصلے سے کام لینا پڑا اس کی مطبوعات کی فروخت بر صغیر کی تقسیم کے بعد بہت ہی کم ہو گئی۔ ہندستان اور پاکستان کی تجارت کے بند ہونے کی وجہ سے اعظم گڑھ کے اس ادارے کو پاکستان سے کوئی آمدنی نہیں ہو رہی ہے جو ناشر اس کی کتابیں چھاپ لیتے ہیں وہ اس کو رائلٹی بھی نہیں دیتے کچھ ناشر ایسے ہیں جو اس کی کتابیں چھاپ رہے ہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ اس کی مطبوعات پر ڈاکا مار کر (ڈاکا ڈالنا صحیح محاورا ہے۔) خود کثیر منافع حاصل کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ قانونی گرفت میں نہیں آ سکتے ہیں، لیکن وہ اخلاقاً اس کا حق نہیں رکھتے کہ دوسروں کی دماغی محنت مشقت کا پھل کھائیں اور اپنے لیے سرمایہ جمع کریں،

ور ایسے ادارے پر ضرب کاری لگائیں جو منافع کی خاطر اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے نہیں ہے اس کی اہم ضرورت ہے کہ یہ ناشر اپنی اس بداخلاقی کو محسوس کریں، اور عالا اخلاق سے کام لے کر ایسی طباعت واشاعت کو روک دیں یہ ممکن ہے کہ کچھ ناشر مل کر ایسی صورت پیدا کر لیں کہ وہ اس ادارے سے حق طباعت حاصل کرنے میں اس سے گفت و شنید کریں۔"

جناب شورش کشمیری مرحوم کا احتجاج

اس سے پہلے میں نے ایک خط جناب شورش مرحوم کاشمیری صاحب کو بھی (جن کو مرحوم لکھتے ہوے دکھ ہورہا ہے) لکھا تھا، جس کو انہوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار "چٹان" میں پاکستان کے ناشروں کی چوری اور سینا زوری کے نام سے شایع کیا، پھر اسی ہفتہ وار اخبار مورخہ ۱۶ ر جون ۱۹۷۵ء میں ایک بہت ہی پرزور اداریا لکھا جس کی سرخی یہ تھی - " بعض ناشروں کی چوری اور سینا زوری" سیرۃ النبی کراچی کے ایک ناشر نے کس برتے پر چھاپی ہے - اس کا متن یہ تھا۔

" علاما شبلی نعمانی اور علاما سید سلیمان ندوی کی واحد یادگار دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور معارف کے مدیر سید صباح الدین عبدالرحمان کا ایک نامۂ گرامی ہم نے "چٹان" کی ایک اشاعت میں شایع کیا تھا۔ اب ایک اور خط جو انہوں نے ۱۵ ر مئی ۱۹۷۵ء کو تحریر کیا ہے، ۸ ر جون کو اپنے دو ملکی سفر کے بعد ہم تک پہنچا، نذر قارئین ہے - سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب ایک بلند پایا مصنف ہونے کے علاوا برعظیم کے مسلمانوں کے علمی قرطبا کی یادگار شخصیت ہیں، آپ کا خط پڑھنے اور دل کا اندازا کیجیے۔

" پاکستان کو اس پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ علم و نظر اور دین و ادب کے کئی ایک دایرے ہندستان میں ہیں، ہماری نگاہیں قدرتی طور پر ان کی طرف اٹھتی ہیں - ہم کسی طرح بھی اپنی ملی تاریخ میں سے علی گڑھ، جامعۂ ملیہ، دیوبند، ندوہ، تحقیقات

ونشریات اسلام اور دارالمصنفین کو خارج نہیں کر سکتے۔

اب بھی ان اداروں سے علم و سیاست اور دین و ادب پر جامع رمانع عالا اور عمدا کتابیں شایع ہو رہی ہیں، ہم ان سے اس باب میں پیچھے ہیں لیکن کیا یہ ظلم نہیں کہ ان اداروں پر ستم توڑا جاے، ان کی سرپرست اسلامی ریاستیں تباہ ہو گئیں جن تجار پر انکا انحصار تھا ان کا بڑا حصا پاکستان اٹھ کے آ گیا، حتا کہ دو ملکی کتابوں کی آمد و رفت موقوف ہو گئی، اس صورت حال سے بعض ناشروں نے فائدا اٹھانا شروع کیا۔ علاما شبلی اور سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی کی چھ جلدیں کراچی کے ایک ناشر محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ کراچی نمبر پاکستان نے چھاپ لی ہیں، اس کی پانچ جلدیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں، ناشر نے سرورق کے صفحے ثانی پر لکھا ہے -

" جملا حقوق بہ حق ناشر حسب اجازت حکومت پاکستان — (16) N O P 6
PB-P3-73/D55 dated 21-4-73
تمام و کمال محفوظ ہیں - "

ہمارے نزدیک اس کا نام ہے چوری اور سینا زوری، ہم نہیں کہہ سکتے کہ ناشر نے حکومت پاکستان کے کس شعبے سے اجازت لی، اس شعبے نے کس استحقاق کی بنا پر اجازت دی، اور ادارے کو اجازت کیوں دی گئی - افسر مجاز کون تھا جہاں تہاں یہ کام ہوا ہر لحاظ سے غلط ہوا، اس سلسلے میں وزیر اعظم پاکستان کو متوجہ کرنا ہمارا فرض ہے، ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس چوری اور سینا زوری کے خلاف ایکشن لیں گے ان کے جن شعبے نے اجازت دی ہے، اور جس افسر نے ایسا کیا ہے ہمارے نزدیک وہ مخلص نہیں - ہم یہ شکایت کریں کہ اس کی سنہری اور روپہلی مصلحتوں نے گل کھلایا ہے تو غلط نہ ہوگا - ہم فی الحال کراچی کے ذمہ دار حلقوں سے متوقع ہیں کہ وہ ناشر سے متعلق تحقیق کریں کہ اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے - تا حکم

متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ان کی رحلت ہو گئی، ہم ان کے بیٹوں سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ انہوں نے اس طرح اپنے والد کے لیے توشۂ آخرت مہیا کیا ہے؟"

دارالمصنفین کی حمایت میں فضا

ان تحریروں سے پاکستان میں دارالمصنفین کی حمایت میں بڑی اچھی فضا پیدا ہو گئی۔ میں جس حلقے میں گیا ان تحریروں کا ذکر آیا اور پاکستان کے ناشروں کی اس بد اخلاقی کی مذمت کی گئی۔ معلوم ہوا کہ پاکستان کے اور ناشر بھی دارالمصنفین کی مطبوعات کو مال غنیمت سمجھ کر اس کی لوٹ میں ہر طرف سے مشغول ہیں۔ یہاں کی تاریخ اسلام، تاریخ سندھ، بزم، اسوۂ صحابہ، شعر الہند، شعر العجم، ارض القرآن وغیرہ سب ہی کو چھاپ لیا ہے۔

راشدی صاحب کی خدمت میں شکریہ

پاکستانی اخباروں کی تحریروں سے دارالمصنفین کے حق میں جو فضا پیدا ہوئی تھی اس کے شکریے کے مستحق زیادہ تر جناب سید حسام الدین راشدی صاحب ہیں، ایک رات جناب مولانا حسن مثنی ندوی ایڈیٹر "چراغ راہ"، سید ظفیر الحسن صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم سندھ، میرے دوست پروفیسر سید حسن (پٹنہ یونیورسٹی) کے صاحبزادے سید اصغر حسن (رکن ایڈیٹوریل اسٹاف انگریزی اخبار "ڈان") ملنے آئے، مولانا حسن مثنی ندوی پھلواری شریف پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ مولانا سلیمان پھلواروی کے پوتے ہیں، بڑی باغ و بہار طبیعت پائی ہے۔ خاص اداؤں سے ہر ایک کو کھینچنے لگاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ارد گرد نوجوانوں کی ایک جماعت جمع کر رکھی ہے، جن میں وہ علمی ذوق پیدا کرتے رہتے ہیں۔ بڑے

اچھے نثر نگار اور مقرر بھی ہیں۔ علمی حلقوں میں مقبول ہیں، ہر علمی جلسے میں شریک ہوتے ہیں، شادی نہیں کی ہے۔ عروس علم ہی سے ہم کنار رہتے ہیں خوشی اور لذت محسوس کرتے ہیں۔ سید ظفیر الحسن صاحب سرکاری ملازم ہیں، لیکن بڑا اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں۔ علمی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے ہیں، اصغر حسن سلمہ اپنی متانت کی وجہ سے زیادہ تر خاموش رہتے ہیں، ان تینوں قدر دانوں سے مل کر طبیعت خوش ہوئی، ان ہی کی معیت میں سید حسام الدین راشدی صاحب کے یہاں پہنچا، پہلے وہ جمشید روڈ پر رہتے تھے، اب الحمرا سوسائٹی میں رہتے ہیں، ایک بڑی کوٹھی خریدی ہے، جو جدید ساز و سامان سے آراستہ پیراستہ ہے، اسی میں اپنی علمی جنت آباد کر رکھی ہے، مجھکو دیکھنے کے ساتھ ہی بہت اخلاص و محبت سے گلے لگا لیا، ایسا معلوم ہوا کہ دو بچھڑوں کا ملاپ ہو رہا ہے۔ انہی سے معلوم ہوا کہ انہوں نے مولانا کوثر نیازی وزیر مذہبی امور حکومت پاکستان کو بھی خط لکھ کر دارالمصنفین کے ساتھ پاکستانی ناشروں کی زیادتی کی طرف توجہ دلائی ہے اور وہ مجھکو اسلام آباد بلا کر اس سلسلے میں گفتگو کریں گے۔ اور دارالمصنفین کی مدد میں ہر قسم کے اقدام کریں گے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، وہ سندھی ہیں، سندیوں کے یہاں خاطر مدارات اور تواضع کرنے کی بہت اچھی روایت ہے، اس موقع پر بھی راشدی صاحب نے اس روایت کو برقرار رکھا۔

ڈاکٹر معین الحق

جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے یہاں سے جناب ڈاکٹر معین الحق کے یہاں گیا جو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ہیں۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسٹاف میں رہ چکے ہیں۔ تقسیم ہندستان کے بعد کراچی چلے آئے، اور یہیں ایک علمی خدمت گذار [illegible] وقار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایک اچھی کوٹھی بنوائی ہے، اور جس سڑک پر ان کا مکان ہے

کا نام ڈاکٹر معین الحق روڈ رکھ دیا گیا ہے۔ انہوں
نے کئی کتابیں مثلاً "تذکرۃ الخواتین جلد اول (فارسی)
خلکان کی وفیات الاعیان کی چھ جلدوں
کے انگریزی ترجمے از ام۔ ڈی سلین، سرسید احمد
خان کی آثار الصنادید، اور سرکشی بجنور، شاہ عالم
اور اکبر شاہ ثانی دہلی کے حالات پر مشتمل اخبار
مین اڈٹ کی ہیں، انگریزی میں برنی کی تاریخ
ق، اورنگ زیب ایک شاہزادے کی حیثیت
سے ۱۸۵۷ء کا انقلاب عظیم لکھی ہیں، اردو میں
سلامی ہند و پاکستان کی معاشرتی و علمی تاریخ
سلامی عہد میں فن تعمیر، تاریخ ہند و پاکستان وغیرہ
نام سے کتابیں قلمبند کی ہیں۔ ہمایوں کے حالات
اس کے آفتابچی جوہر نے تذکرۃ الواقعات کے
سے جو تاریخ لکھی ہے اس کا ترجمہ بھی اردو میں کیا
ہے، اس وقت وہ جنرل آف دی پاکستان ہسٹاریکل
سائٹی کے ایڈیٹر ہیں، پاکستان میں ہسٹری آف
فریڈم موومنٹ کے نام سے جو کتاب کئی جلدوں میں
گئی ہے، اس کی ادارتی مجلس کے بھی سکریٹری
ہیں، اردو کا ایک رسالہ "البصار" بھی کچھ دنوں
اپنی ادارت میں شایع کرتے رہے۔ میرا اور
کا موضوع مشترک ہے، اس لیے ان سے مل کر بڑی
خوشی ہوئی، اثنائے گفتگو میں انہوں نے یہ کہکر مجھکو
ازا کہ میری کتابوں سے یہاں کے لوگ ____
[illegible] ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا میں
کتابوں کو تو اس لائق نہیں سمجھتا ہوں، مجھکو روک کر
زیادہ خاکساری کو راہ نہ دیجیے، یہ ایک حقیقت
ہے، جس کا اظہار کر رہا ہوں، مجھ سے پھر کہنے لگے
میں نے ملفوظات خواجگان چشت پر جو کچھ لکھا
اس کو انگریزی میں جلد از جلد منتقل ہونا چاہیے،
کے مستشرقین بھی ان ملفوظات کی اہمیت اور
ثیت سے واقف ہوں، یہ ان ملفوظات کے جو
اور فرضی قرار دینے کی مہم جاری ہے۔ اس کی
مستشرقین تک بھی پہنچنی چاہیے، انہوں نے کہا
اس کے ترجمے کا انتظام کرائیں گے۔

ڈاکٹر معین الحق صاحب کی خاطر تواضع کے بعد جناب
محمد مشفق صاحب کے پاس ہم لوگ پہنچے، وہ پہلے انجمن
ترقی اردو کے سکریٹری تھے، اب اس سے علیحدہ
ہو گئے ہیں، اور اپنے گھر پر اردو کے مخطوطات پر
کام کر رہے ہیں۔ ان کے گھر پر ان کا ذاتی کتب خانہ
بہت اچھا ہے، اردو کی تمام ضروری کتابوں پر
نظر پڑی، انگریزی اور فارسی کی بھی کتابیں تھیں،
ان کو بہت ہی دل نواز مصنف پایا، ان کو اپنے
کتب خانے میں بیٹھ کر شاید وہی سرور حاصل ہوتا
ہے جو کسی میخوار کو میخانہ پہنچ کر ہوتا ہے۔ ان
کے مضامین اخبارات میں برابر شایع ہوتے رہتے
ہیں جو شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

لڑکی کا نکاح

ان حضرات سے ملنے میں اچھا وقت گذر رہا تھا
مگر لڑکی کی شادی کی تقریب ابھی انجام دینی تھی اس
لیے کچھ ذہنی سکون حاصل نہ تھا، الحمد للہ ۲۷ اگست
کو یہ تقریب بخیر و خوبی انجام پا گئی، کراچی میں
کسی تقریب کے انجام دینے میں یہ سہولت ہوتی
ہے کہ ہر چیز کرایے پر مل جاتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ
خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس شہر میں میرے
اعزا، ہم وطن اور اعظم گڈھ کے دوست اور ملنے
والے بکثرت موجود تھے ان کو مدعو کرنا ضروری تھا،
کراچی اور دارالمصنفین کے قدر دانوں کو بھی مدعو
کیا۔ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب،
ڈاکٹر معین الحق، مشفق صاحب، پروفیسر ایوب
قادری، جناب اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر معزالدین
ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی، مولانا حسن مثنی ندوی
پروفیسر احسان رشید، ظہیر الحسن اور سید اختر
حسن وغیرہ نے بھی شرکت کر کے نوازا، اعزا و اقربا
بھی بکثرت شریک ہوئے اور الحمد للہ بڑی خوشی
کے ساتھ اس فرض سے سبکدوش ہو گیا۔

یکم ستمبر ۱۹۷۵ء کو جناب زاہد ملک صاحب جوائنٹ سکریٹری وزارت امور مذہبی حکومت پاکستان مولانا کوثر نیازی وزیر امور مذہبی کی طرف سے میری قیام گاہ پر ملنے آئے ان کو بہت ہی خلیق، متواضع، خاکسار، ذہین اور معاملہ فہم پایا، وہ مولانا کوثر نیازی کی طرف سے مجھ سے یہ دریافت کرنے آئے تھے کہ دارالمصنفین کی مطبوعات کو یہاں کے جو ناشر چھاپ کر اس کو نقصان پہنچا رہے ہیں اس کے انسداد کے لیے کیا اقدام کیے جاسکتے ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ یہاں کے ناشر کی روک تھام تو عارضی طور پر کر دی جاتی ہے، مگر وہ موقع پاتے ہی پھر چھاپنا شروع کر دیتے ہیں، جب جناب افضل اقبال صاحب ہندستان میں پاکستان کی طرف سے ڈپٹی ہائی کمشنر تھے تو ۱۹۶۵ء میں ان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تھی، انہوں نے ازراہ کرم حکومت پاکستان کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ دارالمصنفین کو اس نقصان سے بچائے، اس زمانے میں حکومت کی طرف سے ایک آرڈیننس جاری ہوا کہ بیرونی مصنفوں کی کتابیں حکومت کی اجازت کے بغیر نہیں چھاپی جا سکتی ہیں، کچھ دنوں اس کی وجہ سے دارالمصنفین کی مطبوعات کی طباعت یہاں رکی رہی، مگر کچھ ناشروں نے پھر کچھ کتابیں شائع کر دیں تو ۱۹۶۹ء میں جناب ممتاز حسن صاحب مرحوم کی صدارت میں ایک ایسی کمیٹی کی تشکیل کی گئی جو دارالمصنفین کی مطبوعات کی نگران اور محافظ بن کر اپنے ناشروں کے خلاف قانونی کارروائی کرتی رہے، جو اس کی اجازت کے بغیر کتابیں چھاپیں، یہ کمیٹی کچھ دنوں مفید رہی، مگر ۱۹۷۱ء کے ہنگاموں کے بعد یہ کچھ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی، میں نے جناب زاہد ملک صاحب سے عرض کیا کہ دارالمصنفین نے بس کی یہ بات نہیں کہ ناشروں کے خلاف مقدمہ بازی کرے اس لیے اب ہمارا اور تمام مطبوعات کو حکومت کے نذر کرنے کے لیے ہے وہ خود چھاپے اور اس کے بدلے میں یکمشت خاطر خواہ رقم دیدے، تاکہ اس سے یہ ادارہ پاکستان کے مارکٹ کے کھو جانے کی تلافی کر سکے، اسی کے ساتھ میں نے ان سے یہ واضح طور پر کہا کہ پاکستان سے رائلٹی اسی وقت قبول کی جاسکتی ہے ـ جب میری حکومت اس کو قبول کرنے کی باضابطہ اجازت دے گی، اور یہ رقم سرکاری سطح پر منتقل ہو کر دارالمصنفین پہنچے گی، اگر یہ ممکن نہ ہو سکا تو حق طباعت کی بات ختم ہو جائے گی ـ جناب زاہد ملک صاحب نے میری اس رائے سے اتفاق کیا، اور کہا کہ حکومت اس تجویز پر ضرور غور کرے گی، اور خود ہی بتایا کہ یہاں کا نیشنل بک فونڈیشن حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہا ہے، اس کو یہ حق طباعت دیا جاسکتا ہے ـ انہوں نے اس کے سکریٹری جناب یونس سعید صاحب سے ایک ملاقات کرانے کا وعدہ کیا ـ

نیشنل بک فونڈیشن

دوسرے دن محکمۂ امور مذہبی کے ایک افسر جناب افضل شیخ صاحب میری قیام گاہ پر گاڑی لے کر آئے اور نیشنل بک فونڈیشن ساتھ لے گئے ـ جناب یونس سعید صاحب سے مل کر خوشی ہوئی، ان سے حق طباعت پر گفتگو ہوئی وہ اس کام کو حکومت کی باضابطہ اجازت سے سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گئے ـ

وہ خود یہاں کے ناشروں کی بد معاملگی اور سینہ زوری کے شاکی تھے، پھر انہوں نے اپنی مطبوعات کی لائبریری دکھائی ـ اسکول کالج اور یونیورسٹی کے نصاب کی ساری کتابیں اسی کی طرف سے شائع ہوا کرتی ہیں، اور بہت ہی سستی قیمت پر طلبا کو دی جاتی ہیں میڈیکل انجنیرنگ اور سائنس کی نصابی کتابیں جو بیرونی مصنفوں کی ہوتی ہیں وہ بھی یہاں سے شائع کی جاتی ہیں، اور طلبا کو آسانی سے کم قیمت پر مل جاتی ہیں ـ ان نصابی کتابوں کے علاوہ اور بھی اہم کتابیں انگریزی اور اردو میں شائع ہوتی رہتی ہیں

جناب سید حسام الدین راشدی کی نوازش

۳۰ ستمبر کو جناب سید حسام الدین راشدی صاحب نے رات کو اپنی کوٹھی پر از راہ لطف و کرم کھانے پر مدعو کیا، وہاں اپنے خویش ڈاکٹر سید راشد مصطفٰے کے ساتھ پہنچا تو اور مہمانوں کے ساتھ جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید صاحب، جناب بشیر احمد ڈار اور ڈاکٹر ریاض الاسلام بھی موجود تھے۔

جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے شعبۂ تاریخ کے بہت ہی لائق اور مقبول پروفیسر رہ چکے ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب کے بعد وہی اس کے صدر رہے، تقسیم ہندستان کے بعد بھی وہیں تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد کراچی آکر مقیم ہوئے۔ وہ بڑی محبت سے ملے، جب ان کو معلوم ہوا کہ میں نے بھی علی گڑھ میں کچھ تعلیم پائی ہے تو پھر علی گڑھ ہی پر گفتگو شروع کر دی، ان کے ہر بن مو سے علی گڑھ کی صدا نکل رہی تھی، وہ وہاں کے تازہ ترین حالات سے باخبر تھے، اور ایسی باتوں کی اطلاع دے رہے تھے جس کی خود مجھکو خبر نہ تھی۔ علی گڑھ کا موضوع اتنا طویل ہو گیا کہ جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کو آخر کہنا پڑا کہ اب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا ہے۔ علی گڑھ والوں کی عجیب خصوصیت ہے کہ وہ جب ملتے ہیں تو علی گڑھ کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے۔ آخر اس موضوع کو روکنا پڑا، روانگی سے ایک روز پہلے شیخ صاحب سے ملنے گیا تو کہنے لگے کہ کاش وہ علی گڑھ ہی میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو جاتے، وہ کراچی یونیورسٹی میں کچھ کلاسز بھی لیتے رہتے ہیں اور پڑھاتے اور تقریر کرتے وقت پرانی یاد تازہ کر دیتے ہیں، ان کی طبیعت ابھی تک باغ و بہار ہے

جناب بشیر احمد ڈار صاحب

جناب بشیر احمد ڈار صاحب پہلے اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر تھے، [illegible] مشغول رہتے ہیں، انکو بہت ہی متین سنجیدہ، خاموش، باوقار خاکسار، علم دوست اور علم نواز پایا، بولتے کم ہیں مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے اس میں وزن ہوتا ہے وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جنمیں سے دو مجھکو نذر کیں ایک تو

انکا خاص موضوع فلسفہ رہا ہے، اسلیے ان کی تحریر میں فلسفیانہ رنگ غالب رہتا ہے، سرسید کے مذہبی خیالات کے عنوان سے جو کتاب لکھی ہے اس کو فارغ اوقات میں پڑھتا رہا اس میں بارہ ابواب ہیں شروع میں لائق مصنف نے بہت ہی مبصرانہ انداز میں یہ دکھایا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے عیسائیت کس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذہن پر اثر انداز ہو رہی تھی، اور جب اسکو انگریزوں کی حکومت کا سہارا ملا تو اس کے مبلغین ہندومت اور اسلام کے لیے خطرہ ہو گئے، اسکے جواب میں ہندو مصلحین میں راجا رام موہن رائے، کشب چندر سین، رام کرشن اور سوامی دیوا کانند وغیرہ نے پہلے تو مدافعانہ رنگ اختیار کیا مگر پھر تبلیغ کر کے دوسروں کو ہندو مذہب میں داخل ہونے کی دعوت دینے لگے۔ مصنف نے مسلمان مصلحین میں سے شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، حاجی شریعت اللہ، حاجی محمد محسن، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولوی کرامت علی، مولوی طفیل علی، مولانا قاسم نانوتوی، دلی کالج کے مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی ذکا و اللہ کی مذہبی سرگرمیوں پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس دور میں مسلمان ذہنی اور تعلیمی حیثیت سے ہندوؤں سے بہتر تھے (ص۶۲) لیکن ان کو دکھ تھا کہ ان سے حکومت چھینی جا رہی تھی اسلیے ان کی اصلاحی کوششیں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے دبی رہیں (ص۶۳) مسلمان اپنی حکومت کی وجہ سے اچھی اچھی ملازمتوں میں بھی تھے، مگر انگریزوں نے رفتہ رفتہ انکو ملازمتوں سے برطرف کرنا شروع کیا، ملازمتوں کی وجہ سے ہندوؤں نے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ مسلمانوں کو اپنی مشرقی [illegible]

تعلیم کا یہ پچھڑا رہا جس سے وہ ملازمتوں میں ہندوؤں کا مقابلہ کرنے میں پیچھے رہ گئے، اس کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کے سلسلے میں ہندوؤں نے ان سے تعاون کیا جس کی بدولت وہ اقتصادی حیثیت سے بہت اچھے رہے (ص ۱۷) یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کی شورش میں انگریزوں نے مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا مسلمانوں کی اقتصادی اور سیاسی زبوں حالی سے سید احمد خاں متاثر ہوئے، انہوں نے انگریزوں کی حکومت سے تعاون کیا، جس کو جمال الدین افغانی نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا، کیونکہ تمام اسلامی ممالک میں انگریز جبر کر رہے تھے، اس سے وہ بدظن تھے، فاضل مولف کا خیال ہے کہ سرسید نے اس وقت جو روش اختیار کی وہ ہندستان کے سیاسی حالات کی بنا پر درست تھی (ص ۱۸) اس دور میں مسلمانوں کا مقابلہ نہ صرف انگریزی حکومت سے رہا بلکہ وہ عیسائی مبلغین سے بھی برسرپیکار رہے، جہانگیر کے زمانے سے عیسائی مبلغین اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، عیسائی پادریوں نے آئینۂ حق نما اور میزان الحق لکھکر اسلام پر حملے کیے (ص ۸۴) اور جب ولیم میور کی لائف آف محمد شائع ہوئی تو سید احمد خاں کی غیرت اور حمیت بروئے کار آئی، انہوں نے خطبات احمدیہ میں اس کے اعتراضات کے مدلل جواب دیے، اسی کے ساتھ انہوں نے انجیل کی تفسیر لکھی جس میں وہی انداز بیان اختیار کیا جو ولیم میور نے کیا تھا، انہوں نے مدافعانہ رنگ کے ساتھ عیسائیوں کے عقاید پر جارحانہ حملے کیے، اور پرزور طریقے پر یہ ظاہر کیا کہ خود لوتھر نے اسلامی تعلیمات و عقاید سے متاثر ہو کر ریفارمیشن کی تحریک چلائی، اگر وہ اور زندہ رہتا تو عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث کا بھی منکر ہو جاتا (ص ۱۱۲) اس زمانے میں یہ بحث بھی چل نکلی تھی کہ مذہب کا عقل اور عقلی دلائل کے مطابق ہونا ضروری ہے، انگریزی تعلیم پانے والے نوجوان اس سے متاثر ہو رہے تھے۔ سرسید نے اس چیلنج کو بھی قبول کیا، اس سلسلے میں فاضل مولف نے نیچر اور عقل پر تفصیلاً بحث کرکے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سید احمد خاں نے محققانہ طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام عین نیچر ہے اور نیچر عین اسلام ہے۔ (ص ۱۵۲)

اس زمانے میں کچھ لوگوں کو بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ سرسید نیچری اور دہریہ ہو گئے تھے۔ مصنف نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سید احمد خاں نے نیچر کی بحث اٹھا کر صرف یہ یقین دلایا ہے کہ اسلام نیچر کا مذہب ہے، نیچر اسباب و علل کا نام ہے اور اسی کے تشکیل کرنے والے کو خدا کہا جاتا ہے (ص ۸۹) وہ کسی حال میں خدا کے منکر نہیں ہوئے۔ اس کتاب میں سرسید کے جو خیالات جنت، دوزخ، قرآن، حدیث، نبوت، عذاب و ثواب، نجات، وضو، حج، جہاد، وراثت، وصیت، سود، ربا، جبر و اختیار سے متعلق تھے۔ ان کا پورا تجزیہ کیا ہے، اس سے بعض ناظرین کا متفق ہونا ضروری نہیں، کیونکہ سرسید احمد خاں کے مذہبی خیالات سے بعض راسخ علما کو بھی اختلاف رہا، لیکن ان کے اخلاص میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا، انہوں نے اس زمانے کے لحاظ سے اسلام کی جو تعبیریں اور تاویلیں کیں ان میں ان کے حسن نیت کے علاوہ کوئی اور چیز درمیان میں نہ تھی۔ خود مصنف کو سرسید کے بعض خیالات و رجحانات سے اختلاف ہے، لیکن زیر نظر کتاب کے آخری باب سید احمد اور موڈرنزم میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سید احمد خاں اسلامی تعلیمات کی تعبیرات میں رواداری کو راہ دے کر ان کو جدید رنگ کے مطابق ترقی کے خواہاں ہوئے، انہوں نے جو جرأت مندانہ اقدام کیے وہ ان کے عہد میں تو کامیاب نہیں ہوئے، مگر اب جب مغربی تمدن کی وجہ سے مادی رجحانات پیدا ہو رہے ہیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سید احمد نے جو اسلام پیش کیا تھا اس کو سمجھ کر ایک موثر ذریعہ بنانے کی ضرورت ہے (ص ۱۷۱) لائق مصنف سرسید کے مذہبی خیالات کے اتنے معترف ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں جو تفسیر لکھی ہے اس میں وہی سب کچھ ہے جس کا بیج سرسید نے ڈالا تھا، بلکہ

قبال اپنے فلسفیانہ خیالات کے باوجود قرآن کے بعض
کات کے ادراک میں سید احمد خان سے آگے نہیں
سکے ہیں، عذاب، ثواب، جنت اور دوزخ سے
علق ان کے وہی خیالات ہیں جو سید احمد خان کے
ے (تمہید ص) لائق مصنف نے اس کتاب میں
ر سید احمد خان کے متناز عا فیار رجحانات سے
تعلق اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اس سے
ختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن ان کے انداز بیان
یں غور و فکر کیا تہ متانت اور سنجیدگی ہے جس کے
طالعے سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرے
سامنے ان کی اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے
جس سے ظاہر ہے کہ ان کا پہلا ایڈیشن دلچسپی سے
ڑ ا گیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور
ودُ سے شایع ہوئی ہے ضخامت (۲۹۷) صفحے
ہے۔ قیمت ساڑھے ستر ا روپے ہے، فاضل مولف
نے اقبال پر جو مذکورہ بالا کتاب دی، اس
کی مطالعہ اس سفر میں کرتا رہا، اس میں بھی ضمیر
ور عقل پر بحث ہے، ان مباحث کو پڑھتے وقت
سلم یونیورسٹی کا ایک سیمنار یاد آگیا جو کچھ سال
پہلے پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں سرسید
حمد خان پر ہوا تھا، اس میں حیدرآباد کے ایک
مقالہ نگار نے بڑے جوش کے ساتھ یہ پیش
لیا تھا کہ اگر وحی بھی عقل کے مطابق نہ ہو تو یہ قابل
قبول نہیں، اس قسم کی بحث تو پہلے بھی اٹھ چکی
ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنی تصنیف ابن الوقت
یں مذہب اور عقل کے عنوان سے اس پر پوری
بحث کی ہے، خود سرسید احمد بھی اس نتیجے پر پہنچے
تھے کہ ضمیر کو ایسا رہنما قرار نہیں دیا جا سکتا ہے
جس سے غلطی نہ ہو (ص ۱۶۹ لیجس تھاٹ آف
سید احمد خان) یہی بات عقل کے متعلق کہی جا سکتی
ہے، پھر مذہب خصوصاً وحی کو عقل کے ماتحت کرنے
کی کوشش کہاں تک صحیح قرار دی جا سکتی ہے،
جناب بشیر احمد ڈار نے اقبال پر جو کتاب لکھی ہے،
س میں اقبال نے کانٹ کا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ
انسانی عقل ... کو ... کرنے میں

ہماری تنہا رہنما نہیں ہو سکتی ہے، (ص ۲۹) اقبال نے
بھی اسی کی تلقین کی ہے، جیسا کہ بشیر احمد ڈار صاحب
نے ان کے اشعار کو نقل کر کے بتایا ہے ؎

خرد واقف نہیں نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ تو
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

استفسار - فرمدی - اردو بہشت ۱۳۸۵ از ہندستانی ادب جنوری - فروری - مارچ ۱۹۷۶ء

شہباز صدیقی امروہوی

طوطیٔ ہند

اے امیر نامور اے خسرو عالی وقار
علم و عرفاں کا ہے تو دریائے ناپید اکنار
تیرا ثانی کم ہی دیکھے گی یہ دنیا اب کہیں
گرم ہے تیرے نفس سے محفل شعر و سخن
زمزموں میں ہے ترے وہ طرفگی وہ بانکپن
چہکے بلبل کیا تری رنگیں بیانی دیکھ کر
جملہ اصناف سخن پر ہے ترا انعام عام
انوری کا تجھ کو حاصل ہے قصیدہ میں مقام
تیرا خمسہ جو نظامی کے ہے خمسہ کا جواب
ہر پہیلی ہے تری طبع رسا کا شاہکار
تیری انملیاں دکھاتی ہیں جدا اپنی بہار
کس قدر دلچسپ ہے بیکٹ یہ تیرا دو سخنی
مرثیہ تا آں کا تو نے لکھا وہ درد ناک
پھاڑ کر جیب و گریباں ڈالی زرق درخ ہلاک
واہ وا گفتار میں تیری اثر کا یہ کمال
شاعری پہ تیری کیوں نازاں نہ ہو ہندوستاں
مستند ہے فارسی اس درجہ تیری بے گماں
مرزا غالب جو کسی ہندی کا قائل ہی نہیں
تو نے ملک ہند میں اردو کی ڈالی داغ بیل
ابتدا میں شغل تیرا اگر نظر آتا تھا کھیل
ہندوی و ریختہ بنتی ہوئی اردو نئی
گا ئیکی کے فن میں اپنے عہد کا ہے تو امام
اللہ اللہ قصر موسیقی میں تیرا یہ مقام
جد جد بھی ترے آگے بار پا سکتا نہیں

ہمدم بزم عارفاں ملک سخن کے شہریار
حکمت و دانش کو تیری ذات پر ہے افتخار
"عمرہا باید کہ روزگار آید چنیں"
شاعروں کی محفلوں میں تو ہے صدر انجمن
دم بخود ہے جن کو سن کر طوطی شکر شکن
خوش نوائی کو، نغز گوئی کو، نغمہ خوانی دیکھ کر
مرثیہ، قطعہ، رباعی میں ہے نامی تیرا نام
عطر آگیں ہے غزل سے تیری سعدی کا مشام
آج تک ہے بے مثال و لا عدیل و لا جواب
تیرے دو سخنے ہیں یکسر زعفراں کے کشت زار
کہہ مکرنی کا تری کہہ کر مکرنا ہے شعار
جیسی باہم ہیں جتن سے چرخا، کتا، کھیر ڈھول
قلب بلبلین ہو گیا فرط الم سے چاک چاک
ہو گیا آخر جواں فرزند کے غم میں ہلاک
راست تر یہ ہے اسی کا نام ہے سحر حلال
ذات سامی ہے تری معروف و مشہور جہاں
لیتے ہیں اشعار سے تیرے سند اہل زباں
خاک پر گھستا ہے تیرے روبرو لوح جبیں
فارسی ہندی کا آپس میں کرایا خوب میل
لیکن آخر میں منڈھے چڑھ ہی گئی یہاں کی بیل
جو کرے ہر قلب کو تسخیر وہ جادو نئی
مطربان دہر لیتے ہیں ادب سے تیرا نام
راگنی وشنوی ہے تیری راگ ہے تیرا اعظم
تان کری تان سین اپنی لگا سکتا نہیں

مختلف آلات موسیقی ہیں تیری یادگار
آئی تیری سعی سے نغمہ نوازی میں بہار
سرنگوں تھے راگ کے طائر جو زش ناک پر
سینۂ شفاف تیرا مخزن اسرار ہے
قلب تیرا نور ایماں سے تجلی زار ہے
نور حق سے سربسر معمور ہے تیرا دماغ
گوناگوں اوصاف کا ہے ذات میں تیری قراں
مرحبا یہ عسرت و عشرت کا دو گونہ سماں
بارگاہوں میں کبھی شاہوں کا تو دمساز ہے
جب ہوئی صحبت نظام الدین کی تجھ کو نصیب
رفتہ رفتہ ہو گیا مرشد سے تو اتنا قریب
شیر و شکر بن گئے یوں مطلوب اور طالب ہوئے
جرأت و ہمت پہ تیری حبذا صل علےٰ
معرفت کی راہ میں ہر مرحلہ بھی طے کیا
کام لے کر آخر اپنے خسروی اعجاز سے
بزم اہل حال میں ہوتا ہے جب تو نغمہ زن
نشہ ہو جاتا ہے دنیا کی محبت کا ہرن
تیرا نغمہ اس لئے تاثیر سے خالی نہیں
الغرض پیر طریقت میں نہ تھا تیرا جواب
چل کے بنگال سے پہنچا شہر دہلی میں شتاب
خیمہ میں شور و شیون کر کے ساکت ہو گیا

تیری ہی ایجاد کا ثمرہ ہے طبلہ اور ستار
تیرے ممنون کرم ہیں مطربان روزگار
پر سے سم اور تال کے اڑنے لگے افلاک پر
روئے جاں افروز تیرا مطلع انوار ہے
چشم تیری بادۂ دیدار سے سرشار ہے
خانۂ عرفاں کا ہے اک تابندہ چراغ
فقر ہوتا ہے تیری شان امارت سے عیاں
دلق درویشی بھی ہے ملبوس شاہی میں نہاں
خانقاہوں میں کبھی دلیوں کا تو ہمراز ہے
جاگ اٹھے برکت سے ان کی تیرے خوابیدہ نصیب
تجھ کو محبوب الٰہی نے کہا اپنا حبیب
ساری دنیا کہہ اٹھی یکجاں دو قالب ہوئے
دین کی خدمت بھی کی دنیا سے مطلب بھی رکھا
شغل میں تصنیف کے بھی محو روز و شب رہا
لکھے ملفوظات مرشد دلربا انداز سے
وجد کے عالم میں آجاتی ہے ساری انجمن
دل کو لگ جاتی ہے معشوق حقیقی کی لگن
شرع کے حلقہ سے باہر تیری قوالی نہیں
مرگ مرشد کی خبر سنکر نہ آئی تجھ کو تاب
تربت محبوب پر گریاں رہا مثل سحاب
چادر خاکی میں اپنا منہ چھپا کر سو گیا

لایا ہے شہباز خدمت میں تیری جو ارمغاں
تحفۂ درویش برگ سبز کا ہے ترجماں
صرف اظہار عقیدت پر ہے مبنی یہ بیاں
مدح گوئی کا تری ورنہ اسے یارا کہاں

یہ حقیقت تجھ پہ خود روشن ہے اے غفراں مآب ذرہ کر سکتا ہے کوئی کیا ثنائے آفتاب

محمد عتیق بی۔ ایس سی، ام۔ اے (عثمانیا) بیوریو
اسسٹنٹ، انفورمیشن گورنمنٹ آف انڈیا

حضرت امیر خسرو

(یہ مضمون امیر خسرو کی سات سو سالا تقاریب کے سلسلے میں لکھا گیا تھا۔)

ایک خلاق اور ہمہ گیر شاعر کے لیے جس بصیرت اور آفاقی نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ حضرت امیر خسرو کی فطرت تھی، اور یہ فطرت قدرت کا لازوال عطیا تھی، یہ اسی عطیے کا غیر فانی پرتو ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد مختلف پست و بلند اور منفی اور مثبت رجحانات کے باوجود ہمارا ملک آج قومی اور اسکا یکجہتی اور اخوت انسانی کا گہوارا ہے، اور مسلک خسرو پر کہیں شعوری اور کہیں غیر شعوری طور پر عمل پیرا ہے۔ امیر خسرو یگانۂ روزگار شاعر اور فنکار رہا صوفیٔ باصفا، ماہل ہفت زبان کی تعلیم اس ملک کی مٹی میں رسی بسی ہوئی ہے۔ امیر خسرو نے صدیاں پہلے محبت اور انسانیت کے زرین اصولوں کی دولت بخشی، اور ہمدردی اور روا داری، سماجی مساوات، تہذیبی ہم آہنگی کا جو پیغام دیا وہ آج بھی زندۂ جاوید ہے، اور اس کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ وہ نہ صرف زندہ رہے گا، بلکے ہندستانیوں کے کردار کو قوت بخشتا رہے گا۔

حضرت امیر خسرو نسلاً لاچینی ترک تھے، باپ کا نام امیر سیف الدین محمود تھا، آپ سنہ ۶۵۱ھ مطابق سنہ ۱۲۵۲ء میں قصبۂ پٹیالی ضلع ایٹا میں پیدا ہوئے۔ اصل نام "یمین الدین" تھا لیکن آپ کو "ابوالحسن" بھی کہتے تھے۔ خسرو تخلص تھا۔ طوطیٔ ہند، امیر محمد کاسہ لیس اور ترک اللہ کے خطابات اپنے مرشد کی محبت اور عوام کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کی دین ہیں۔

شعر و شاعری کا آئینا خانا، نازک جوہر کا حامل ہے، اس میں کوئی فنکار اپنی باطنی کیفیات کو پوشیدا نہیں رکھ سکتا۔ یہ انہیں انکشافات کو گرفت کرتا ہے جو شاعر کے نہاں خانۂ دل میں جلوا گر ہوتے ہیں۔ اپنے عہد اور سماج کی طرف سے جو آگ شاعر کے سینے میں دہکتی ہے، اسی کے شعلوں سے اس کی تخلیقات کی نمود ہوتی ہے۔

امیر خسرو کی فطرت کا خمیر ہندستان کی مٹی سے اٹھا تھا۔ ان کی والدا عماد الملک کی بیٹی تھیں، اور ہندی نژاد تھیں۔ خسرو نے ہندستانی ماں کی گود میں پرورش پائی، خاندان متمول تھا، وہ ہندی روایات میں پروان چڑھے۔ ہندی تہذیب اور تمدن نے ان کی شخصیت کے خد و خال ابھارے۔ اس دھرتی کے رسم و رواج، زبان و بیان اور شعر و موسیقی نے ان کے مزاج اور فطرت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا۔ اس مٹی کی خشبو ان کے روح و دل و دماغ میں جذب ہوگئی، چنانچے امیر خسرو اپنے ہندی ہونے پر فخر کرتے ہیں، اور مصاحب ہو کر سرزمین ہند کے لیے کہہ اٹھتے [illegible]۔

"ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن"

ان کے دردمند دل میں حب وطنی کی شمع روشن تھی، دل میں اپنے وطن سے ایک والہانہ عشق تھا۔ صوفی منش انسان، انسان دوست، وسیع علم وآگہی کے حامل وہ اولین فنکار تھے، جس نے اپنی شاعری اور نثری تخلیقات کے ذریعے قومی ہم آہنگی، حب وطنی، رواداری، محبت اور مل جل کر رہنے کے شریف اور بلند تصور کو عبادت کا مرتبہ دیا۔

امیر خسرو کی ذات، جامع صفات تھی۔ جاہ اور حشمت، اور امارت و دولت کے باوجود جب یہ شاعر غربا، اور فقرا کی خدمت کی طرف رجوع ہوا تو غریبوں کی دنیا میں بھی ایکتائی کا نمونا بن گیا۔ خسرو نے اپنے مرشد حضرت خواجہ نظام الدین اولیا سے روحانیت اور انسانیت کی ماہ قدروں کا وہ عطیا پایا، جو اسی مرید حقیقی کو ملتا ہے، جس میں حق کی جستجو کا بیکراں جذبہ ہو۔ امیر خسرو نے اپنے اقوال اور اعمال سے نسلی دوری، سماجی امتیاز، اور امیر و گدا کے فرق کو مٹانے، اور لوگوں میں مساوات و اخوت کو پھیلانے میں زبردست حصہ لیا۔ فکر اور انسانی دوستی سے ہندستان کی گوناگوں تہذیبوں، مذہبوں، اور زبانوں کے باوجود ہم آہنگی اور وحدت کو فروغ حاصل ہوا۔ حضرت امیر خسرو کو ہندستان کے چپے چپے اور گوشے گوشے سے والہانہ محبت تھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ عقیدت تھی تو بے جا نہ ہوگا، گویا سرزمین ہندستان کی خوشبو ان کی روح میں سماگئی تھی، اور وہ روشنی ان کے پیکر خاکی میں سمیٹے نہ سمٹی تھی، اور ایک اجالا شاعری بنکر پھوٹ پڑی۔

امیر خسرو نے ہندستانی موسموں کے بدلتے ہوئے رنگ روپ، بہار و خزاں کی دھوپ چھاؤں، جیتی صبح اور سرمگیں شام کے چتر اپنی مثنویوں اور قصیدوں میں بنائے۔ یہاں کے انسانوں ہی کے ہنس، چرندوں اور پرندوں کے بھی گیت گائے۔ رقص طاؤس کو دلہن کی برنائی و رعنائی سے مثال دی۔ ہندستانی معماروں کے فن تعمیر اور ہندستانی سنگ تراشوں کی سنگتراشی کی دل کھول کر مدح کی۔ یہاں کی ہر زبان اور بولی کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا۔ یہاں کے نگروں اور گاؤں کی دلکشی اور سادگی پر وہ اپنا دل لٹا بیٹھے۔ دلی ہندستان کا پایۂ تخت تھی، لیکن اسے یہ شرف بھی حاصل رہا ہے کہ یہاں حضرت شیخ نظام الدین اولیا کی خانقاہ بھی ہے، یہاں تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی دھوم دھام رہتی ہے۔ دلی کا یہ حسن ان کے دل میں سما گیا تھا۔ اجودھیا کو انہوں نے باغ کی طرح پر بہار بتایا ہے۔ دیوگیر کی تازگی اور لطافت بقول ان کے قصر شداد سے بھی بازی لے گئی تھی۔ قلعوں کے پرشکوہ جمال تعمیر کو بھی انہوں نے بے مثل درجا دیا۔ ہندستانی عورتوں کی وفاداری کو خسرو نے بے مثال کہا ہے۔ ہندو مسلم رسم و رواج کے امتزاج کو خسرو نے، تہذیبی ایکجہتی کے سفر کی ایک منزل قرار دیا ہے۔

خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں ہندستان کی افضلیت کا بیان جس عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے، اس سے نہ صرف ہندستان کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، بلکہ یہاں کے علوم و فنون کی برتری بھی آشکار ہوتی ہے۔ امیر خسرو نے لکھا ہے کہ علاوہ فقہ کے اس ملک کے مختلف علوم کی کتابیں اس رتبے کی ہیں کہ وہ یونان کے ارسطو کی کتابوں کی ہمسری کر سکتی ہیں، اور علم نجوم، ریاضیات اور ہیئت اور منطق میں ہندستان کے ماہرین ترقی کی اعلا منزلیں طے کر چکے تھے۔

ہندستانی ماحول کا زمانۂ قدیم کا مروجہ تصور اس وقت کے مفکرین کے ذہن میں بھی تھا۔ امیر خسرو کے کلام پر گہرا اثر پڑا۔ وہ غالباً ہندستان کے پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے ملک میں اتحاد کے لیے ہندستانی شاعری کا [illegible]

بنایا- خسرو نے کہانیاں، پہیلیاں، انمل، کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے، گیت، سندھا اور دوسخنے لکھے جنہوں نے عوام اور خواص دونوں کو متاثر کیا- اس سلسلے میں کامیابی کی بنیاد یہ حقیقت تھی کہ خسرو کی مادری زبان ہندستانی تھی، اور وہ انہیں فارسی سے کم عزیز نہ تھی، وہ اس پر نازاں تھے۔

حضرت امیر خسرو کے ہندستانی کلام کے متعلق "تذکرۂ عرفات" میں اوحدی لکھتے ہیں کہ "ان کا ہندستانی کلام بھی اسی قدر تھا، جس قدر ان کا فارسی کلام"۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا فارسی کلام تین لاکھ ابیات سے زیادہ، اور ۴ لاکھ ابیات سے کم تھا- اسے ہندستانی ادب کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ امیر خسرو کے ہندستانی کے تین چار لاکھ اشعار میں سے صرف کوئی چار سو اشعار زبان زد ہوتے ہوئے چلے آرہے ہیں، جن میں "خالق باری" بھی شامل ہے، اگر ان اشعار پر تحقیق اور استناد کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم نہیں ایسے کتنے اشعار نکل سکیں گے جنہیں یقین کے ساتھ امیر خسرو کے نام سے منسوب کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہندستانی کلام زیادہ تر نسل بعد نسل اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے، اور اہل ذوق کی ریاضتوں کے ذریعے بہت کم دستیاب ہوا ہے۔

امیر خسرو کی شخصیت یقیناً ایک ذہین ترین شخصیت تھی- وہ ایک ہی وقت میں فارسی اور ہندستانی دونوں زبانوں میں عالی شاعری تخلیق کرنا، انہیں جیسے خلاق اور ذہین فن کار کا کمال ہو سکتا ہے۔

حضرت شیخ سعدی ایران کے عظیم غزل گو شاعر تھے- ان کا یہ شعر امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے:

خسرو سرست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ سعدی کہ در شیراز بود

[illegible] ہی کیا حافظ و جامی جیسے ممتاز اور [illegible] فارسی شعرا نے بھی ان کی تعریف اور توصیف کی ہے۔

حضرت امیر خسرو فن موسیقی میں بھی موجد کی حیثیت رکھتے ہیں- خسرو نے تال، سم، بحر اور اوزان کے قواعد مقرر کیے، اور پکھاوج کے بجائے ڈھولک اور طبلہ ایجاد کیا- اسی طرح بین کی بجائے ستار ایجاد کرنے کا سہرا بھی خسرو ہی کے سر ہے۔

بشیر احمد طاہر
آئی اے ایس (ریٹائرڈ)

اتاترک غازی مصطفا کمال پاشا

نیچے کی سطروں میں اتاترک کے مختصر حالات زندگی قلمبند کیے جاتے ہیں، جو بیرسٹر کے۔ اے۔ حمید کی کتاب "اتاترک مصطفا کمال پاشا" سے لیے گئے ہیں۔ یہ دلچسپ کتاب انھوں نے ترکی تاریخ سے متعلق (۳۷) مستند کتابوں اور انگریزی کے چوٹی کے جرائد و رسائل سے اخذ کر کے بڑی محنت سے ۱۴ - ۱۵ سال کی طویل مدت میں مکمل اور ۱۹۲۹ء میں شایع کی تھی جس کا مقدمہ سر عبدالقادر، ممبر کونسل وزیر ہندستان اور مدیر "مخزن" جیسی ممتاز ادبی شخصیت نے لکھا تھا، اور کتاب کی اہمیت اور دلچسپی بڑھا دیا تھا۔

مصطفا کمال پاشا ۱۲ر مارچ ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سالونیکا کے محکمۂ محصول کی ایک چھوٹی سی آسامی پر ملازم تھے۔ ان کی والدہ کا نام زبیدہ تھا، جو ایک سخت مذہبی خدا ترس خاتون تھیں۔ والدین نے بچے کا نام مصطفا رکھا، لیکن جب وہ چودہ سال کی عمر میں فوجی کالج میں شریک ہوئے تو کالج کے ایک معمر پروفیسر نے ان کی غیر معمولی ذہانت و قابلیت اور شریفانہ چال چلن کو دیکھ کر یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ لڑکا ایک دن دنیا میں کمال حاصل کرے گا۔ اسی دن سے وہ مصطفا کمال مشہور ہو گئے۔ وہ پانچ سال کے تھے کہ باپ کا سایا سر سے اٹھ گیا جس کے بعد وہ چند روز اپنے چچا کی کفالت میں سالونیکا میں رہے۔ جہاں چچا کے باغ کے پھلوں کے درختوں سے چڑیاں اور پرندے اڑانے کا کام ان کے تفویض تھا، یہاں سے کچھ مدت کے بعد وہ پھر اپنی ماں کے زیر تربیت آ گئے۔

مصطفا کمال نے اپنے بچپن کے حالات کی تحریر میں لکھا ہے کہ ان کے والد ان کو پہلے مغربی تعلیم دلانے پر مصر تھے۔ اس کے برخلاف ان کی والدہ دینی تعلیم دلانے پر مصر تھیں، چنانچہ پہلے قرآن کریم سے ان کی تعلیم شروع کی گئی۔ اپنی بسم اللہ کی رسم کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ مجھے خوب یاد ہے کہ بسم اللہ کی رسم کے دن مجھے بہت اچھے کپڑے پہنائے گئے۔ ہمارے یہاں عمدہ عمدہ کھانے پکے اور ایک حافظ صاحب اپنے شاگردوں کے ہمارے گھر تشریف لائے۔ نماز ظہر کے بعد رسم ادا کی گئی۔ رسم کے بعد بچوں کے ساتھ میرا جلوس نکالا گیا۔ وہ [illegible] شام کا وقت کیا عمدہ وقت تھا۔ جب [illegible]

والدہ نے سر بہ سجدہ ہو کر رب العزت سے گڑگڑا کر دعا مانگی، "اے مشرق و مغرب کے سچے بادشاہ میرے اکلوتے بچے کی عمر دراز کیجو اور اس سے اسلام کی وہ خدمت لیجو کہ تو بھی اس پر ناز کریں"۔ یہ کیسی مبارک گھڑی تھی، جب بارگاہ رب العزت میں ماں کی یہ دعا مقبول ہوئی!

مصطفیٰ کمال ایک سال تک ایک مسجد سے ملحقہ مدرسے میں تعلیم پاتے رہے، اس کے بعد وہ ایک یورپین طرز تعلیم کے مدرسے میں شریک ہو گئے۔ ان کے والد کا خیال اپنے لڑکے کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانے کا تھا، لیکن قدرت کو ان سے کچھ اور ہی کام لینا منظور تھا۔ وہ چودہ سال کے تھے کہ پڑوس کے ایک لڑکے کو فوجی وردی میں دیکھ دیکھ کر جو ایک ملٹری کالج میں زیر تعلیم تھا، ان کے دل کو بھی فوجی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بے چین کیے ہوئے رہتی تھی۔ جب انہوں نے فوجی تعلیم حاصل کرنے کا خیال اپنی ماں پر ظاہر کیا تو وہ خوف زدہ ہو گئیں، اور کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ میرا غریب بچہ فوج میں بھرتی ہو کر لڑائی میں جائے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ زندہ واپس آئے" مگر اس بیچاری کو کیا خبر تھی کہ ایک دن اس غریب بچے کا شمار سیزر اور نپولین کی طرح دنیا کے ماہر حرب فوجی جرنیلوں میں ہو کر رہیگا، اور وہ قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تباہی کے منجدھار سے صاف نکال لے گا۔

بہرحال مصطفیٰ کمال اپنی والدہ سے اپنے منصوبوں کو مخفی رکھ کر اپنے والد مرحوم کے ایک بے تکلف یا فوجی دوست کی سفارش سے ملٹری کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئے، جبکہ ان کی عمر چودہ سال تھی۔ جب والدہ کو اس کا علم ہوا تو وہ گھبرا گئیں، لیکن ان کی بیٹی نے ان کو سمجھا کر ٹھنڈا کیا۔ مصطفیٰ کمال اپنی ذہانت اور قابلیت کے سبب سترہ سال کی عمر میں اسٹوڈنٹ ٹیچر ہو گئے۔ ان کو جرمن، فرانسیسی، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں روسو اور والٹر کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا، ان کے دل میں قومی درد تھا، اور کم عمری سے ہی وہ ترکی کی وسیع سلطنت کی تباہی اور اس کے خلاف دول یورپ کے ناپاک عزائم کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے۔ وہ گھنٹوں تنہائی میں بیٹھے ان حالات پر غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ ان کے اس زمانے کے ایک ہم جماعت نے لکھا ہے کہ "مصطفیٰ ہمیشہ عام طلبا کی مجلس سے احتراز کرتے، ان کا کوئی دوست نہیں تھا، تاہم وہ بہت ہر دلعزیز تھے۔ وہ ایک سال تک ملٹری کالج میں عملی تربیت حاصل کرتے رہے۔ یہاں ان کا تعارف ایک عالی پایہ کے شاعر عمر ندسی سے ہو گیا، اور مصطفیٰ کمال کو بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، مگر ان کے ایک معمر پروفیسر نے یہ کہہ کر ان کو شعر کہنے سے منع کیا کہ "تم شعر کہنے میں وقت نہ گنواؤ، ورنہ تم اپنا شاندار مستقبل ضایع کر لوگے۔ قدرت نے تمہیں کارہائے نمایاں کے لیے پیدا کیا ہے"۔ انہوں نے اس مشورے پر عمل کر کے شعر کہنا چھوڑ دیا، البتہ فصاحت و بلاغت کا فن سیکھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس طرح ترکی کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت کو آیندہ اس کے لیے ایک نجات دہندہ پیدا کرنا منظور تھا۔ اگر مصطفیٰ کمال نہ ہوتے تو آج ترکی اور مشرق وسطیٰ کی تاریخ ہی دوسری ہوتی۔ وہ بیس سال کی عمر میں بحیثیت لفٹننٹ کے فوج میں بھرتی ہو گئے۔

فوج میں بھرتی کے ساتھ انہوں نے ملک کو تباہی سے بچانے اور دول یورپ کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے کی دل میں ٹھان لی، اور اس کے بعد منصوبے گانٹھنے لگے۔ وہ تحریروں میں سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین عبدالحمید ثانی کی حکومت کے نظم و نسق کی خرابیوں، کمزوریوں اور رشوت ستانیوں کو ظاہر کرتے اور آئینی حکومت کے قیام کا پرچار کرتے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک انجمن "وطن [illegible]" قائم کی

جس کے ایک سو سے زاید فوجی افسر ممبر ہوگئے۔ اس انجمن کی شاخیں اضلاع میں بھی قایم کی گئیں، اور اس کا ایک انقلابی پروگرام بنایا گیا۔ حکومت کے جاسوس اور خفیہ پولیس کی نظریں اس انجمن کی کارروائیوں اور اس کے ارکان پر لگی رہتی تھیں اور وقتاً فوقتاً اس کے ارکان کی گرفتاریاں عمل میں آتی رہتی تھیں۔

مصطفےٰ کمال انقلاب اور انجمن اتحاد و ترقی کے روح رواں تھے۔ وہ فوج میں ملازم ہونے کے باوجود انقلابی پارٹی کے سرگرم ممبر تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ جب ان کی والدہ کو معلوم ہوا کہ وہ حکومت کا تختہ الٹ دینے کی تجاویز میں مصروف ہیں تو ایک دن جب وہ اپنے مکان کی بالائی منزل سے اپنی خوابگاہ میں آئے تو ان کی والدہ منتظر بیٹھی تھیں، اور حیرت سے انہوں نے بیٹے سے دریافت کیا۔ "پیارے کمال، کیا یہ سچ ہے کہ تم امیرالمومنین کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ ہو؟" کمال نے دھیمی آواز سے کہا "امی، یہ درست ہے، آپ نہیں جانتیں کہ کس طرح بادشاہ ملک کو برباد کر رہے ہیں۔ وہ ہوس کے لیے ملک کے حصے بخرے کرنے کو تیار ہیں، اور میں آپ سے حلفاً کہتا ہوں کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں حب وطن کے جذبے سے متاثر ہو کر کر رہا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں اپنے ملک کی ایک انچ زمین غیر کے قبضے میں نہیں دیکھ سکتا۔ رب العزت سے میری دعا ہے کہ خود غرضی کا احساس آنے سے پہلے قادر مطلق مجھے اس دنیا سے اٹھا لے۔"

مصطفےٰ کمال لکھتے ہیں کہ "میری ماں زار زار رونے لگیں، اور کہا تم میرے لیے دنیا کا مال و متاع ہو۔ اگرچہ تم میرے اکلوتے بیٹے ہو، مگر میں آج اپنے دل کو تسلی دے کر کہتی ہوں کہ اگر تمہاری جان ملک و ملت کے لیے قربان ہو تو میں بارگاہ ایزدی میں سجدۂ شکر ادا کروں گی۔ بیٹا، برکت دے۔ بیٹا، ہوس اور خود غرضی کو کبھی پاس نہ آنے دینا، قوم و ملت کے لیے جو موت آئے اس سے مرعوب نہ ہونا۔"

سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین کی حکومت خفیہ سازباز، جبر و استبداد، توڑ جوڑ اور بیرونی حکومتوں سے ریشہ دوانیوں کے باوجود مقدونیا، ازمیر یا نوبل (ادرنا) اور تھریس میں حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکنے لگی۔ ۱۹۰۸ء میں باضابطہ طور پر انقلاب کا آغاز ہوا، بغاوت کی آگ مقدونیا سے شروع ہو کر ملک کے دوسرے علاقوں میں پھیلنے لگی۔ فوج کی بعض یونٹوں نے باغیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے سے انکار کر دیا، اور متعدد کمپنیاں سامان حرب کے ساتھ باغیوں سے جا ملیں۔ سلطان المعظم نے صورت حال نازک پا کر محل یلدیز میں وزیر اعظم اور سلطنت کے معزز امرا، اور فوجی افسروں اور جرنیلوں کو بغرض مشاورت طلب کر کے ۱۸۷۶ء کے ملتوی دستور کے نفاذ اور آئینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا، اور حکومت کی کرسیوں پر "انجمن اتحاد و ترقی" کے ترک نوجوان YOUNG TURKS فائز ہو گئے۔

اس اعلان کا ملک میں بہت جوش و خروش سے خیر مقدم کیا گیا، اور جا بجا جشن منائے گئے۔ وہ تمام انقلابی جو لندن، برلن، پیرس اور قاہرہ میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے جوق در جوق قسطنطنیہ پہنچ گئے، لیکن آئین کے نفاذ کے لیے جو کشمکش جاری تھی اس میں سیول افسران کا اقتدار بہت زیادہ تھا، اور انقلابی پس پشت ڈال دیے گئے تھے۔ حکومت میں غیر ذمے دار، نااہل، خود غرض اور بددیانت لوگ رہ گئے، جو سلطان عبدالحمید کی طرح مطلق العنان بن کر حکومت کرنا چاہتے تھے اور ترکی کی سلطنت کے اقتدار کو جاری رکھنے کے حامی تھے، ملک کی حالت سلطان المعظم کی حکومت سے بدتر ہو گئی اور انقلابی اس کو بچا نہ سکے

اس آئین کے نفاذ کے لیے ایک سنٹرل کمیٹی قائم کی گئی۔ ابھی اصلاحات پر غور ہو رہا تھا کہ سلطنت کے خارجی حالات خراب ہونے لگے، اور ترکی کی بلقان ریاستوں اور طرابلس الغرب میں دول یورپ کی ریشہ دوانیوں کے باعث ترکی کی حالت خطرناک ہوگئی۔ بادشاہ بغلیں بجانے لگے اور اس خرابی کی ساری ذمے داری پارلیمنٹ کے سر تھوپ دی۔ مصطفیٰ کمال نے محسوس کیا کہ انجمن اتحاد و ترقی حکومت کے ہاتھ بکی ہوئی ہے جس کی وجہ سے انقلاب کے مقاصد ناکام ہو رہے ہیں، اس لیے انہوں نے ایک علیحدہ لبرل پارٹی کے نام سے قائم کر لی، جس کے رکن اعلیٰ خود مصطفیٰ کمال تھے۔ اس پارٹی نے پارلیمنٹ کے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا، اور پارلیمنٹ کی عمارت کا فوج نے محاصرہ کر لیا۔ پارلیمنٹ کے ممبران زیادہ تر لبرل پارٹی کے ممبر تھے، انہوں نے حکومت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر دیا، حکومت کو شکست فاش ہوگئی، اور سابق گورنر جنرل مقدونیا حسین علی پاشا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ انجمن اتحاد و ترقی اور لبرل پارٹی کا پھر سے اتحاد ہو گیا۔

سلطان المعظم کی طرف سے انقلابی حکومت اور پارلیمنٹ کے خلاف ملک میں زبردست پروپیگنڈا ہونے لگا، اور مصطفیٰ کمال کو باغی اور بے دین اور اس انقلابی حکومت کو شریعت کے خلاف قرار دے کر فتوے جاری کرائے گئے اور ملک میں ایک زبردست بلوا کرایا گیا، جس کے پیچھے مشہور تھا کہ خلیفہ کا ہاتھ اور پیسا کام کر رہا تھا۔ بلوائیوں کی جیبوں میں سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں کے نوٹ تھے۔ بادشاہ نے باغیوں کے تمام مطالبات جن کے منجملہ ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ بموجب فہرست جان نثاران وطن کو باغیوں کے حوالے کیا جائے، تاکہ ان کو مجمع عام میں قتل کیا جائے، منظور کر لیے۔ باغیوں نے ایک رات استنبول کی گلیوں میں فتح و نصرت کا جشن منایا، اور دس لاکھ گولیاں چلا کر خوشیاں منائیں جو سیکڑوں مردوں، عورتوں اور بچوں کی ہلاکت کا باعث ہوئیں۔

انقلابی ترک خلیفہ کے اس خونیں کھیل کو سمجھ گئے، اور غم و غصے سے بیتاب ہوگئے۔ سالونیکا میں جہاں یہ تھے، مجلس مشاورت رات بھر ہوتی رہی، جس میں مصطفیٰ کمال بھی شریک تھے۔ انہوں نے فوج کے ایک دستے کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لی، اور پہلی بار قسطنطنیا میں سلطان کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا۔ جس کے سردار محمود شوکت پاشا تھے جنہیں مصطفیٰ کمال آزادی کا مجسمہ کہتے تھے۔ میدان کارزار گرم ہوا، باغیوں کو شکست فاش ہوئی، چونکہ ان کا کوئی باقاعدہ سردار نہیں تھا، ان کو پے در پے شکستیں ہوئیں، ان میں سے بہت سارے مارے گئے اور باقی بھاگ نکلے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کر کے سالونیکا میں قید کر دیا گیا، سنہ ۱۹۰۹ء اس طرح انقلاب پسند ترکی کی جدوجہد کے ڈرامے کا پہلا سین ختم ہوا۔

مصطفیٰ کمال پاشا کے جنگی اور قومی کارناموں کے بیان کرنے کے لیے بیسویں صدی کے اول چار دہے کی پوری ترکی تاریخ دہرانی ہوگی، جس کے لیے نہ یہاں گنجایش ہے، اور نہ راقم حروف اس کا اہل ہے، تاہم اس خاکے میں اس کے اہم جنگی کارناموں کا ذکر کرنا ضروری ہے، جن کی بدولت اس کا نام سیزر، سکندر اور نپولین کے ساتھ ماہران حرب کے جرنیلوں کی فہرست میں نظر آتا ہے، یہ خاکہ ترکی کی آزادی کی جدوجہد کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں عثمانی سلطنت کی کمزوریوں کے باعث دول یورپ، جن میں انگلستان، فرانس، اٹلی، آسٹریا، روس اور یونان شامل تھے، ترکی کو یورپ کا "مرد بیمار" بتا کر اس کی نیم جان لاش کو سپرد گور کرنے اور پھر اس کی یورپ اور ایشیا کی وسیع سلطنت کے علاقوں کو آپس میں ہڑپ کر جانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے، لیکن سلطان

عبدالحمید کی چالبازیوں اور توڑ جوڑ کی بدولت یورپ کی حکومتیں ایک دوسرے سے بدگمان رہ کر ترکی کے خلاف کوئی متحدہ محاذ قائم نہیں کر پائی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے ۱۹۱۱ء میں یہ دول یورپ ترکی کے مختلف علاقوں پر قبضہ جمانے کی تاک میں تھے۔ فرانس کی نظریں مراقش پر لگی ہوئی تھیں، اٹلی کی تیونس پر، انگلستان کی مصر پر اور روس کی ایران پر۔ جب اٹلی کو تیونس میں کامیابی نہیں ہوئی تو اس نے ترکی کو چوبیس گھنٹے کا الٹی میٹم دے کر طرابلس الغرب —— TRIPOL پر فوج کشی کر دی۔ ہرچند مصطفیٰ کمال نے اس جنگ میں بحیرے فلک شگاف نعروں میں شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھائے اور اٹلی کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیں۔ بیس ہزار اطالوی فوجی گرفتار اور دس ہزار قتل ہوئے، لیکن چونکہ اٹلی کے مقابل ترکی کی بحری طاقت کمزور تھی، طرابلس الغرب پر اٹلی کا قبضہ ہو گیا، صلح کے بعد طرابلس کے مجاہدین نے اٹلی کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔

دوسرے سال ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں نے ترکی حکومت کا جوا اپنی گردن سے اتارنے کی ٹھان لی۔ یونان نے حملے کی دھمکی دی۔ مانٹی نیگرو نے اعلان جنگ کر دیا۔ سرویا اور بلغاریا نے موقع سے فائدہ اٹھا کر چڑھائی کر دی اور البانیا نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں ان کی فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ وہ ایک شاطرانہ چال چل کر اپنی فوجوں کو اس طرح پیچھے ہٹاتے چلے گئے کہ دشمنوں کو ان کی پسپائی اور بھگدڑ کا دھوکا ہوا، لیکن کمال نے ایڈریانوپل پہنچ کر پہاڑوں کے دروں میں اپنی فوج کو چھپا دیا اور جب دشمن کی فوجیں وہاں پہنچیں تو ان کو گھیر کر ختم کر دیا۔ اگر انگلستان اور روس مداخلت کر کے جنگ بندی نہ کرا دیتے تو ترک ان باغی ریاستوں کی اچھی سرکوبی کر دیتے،
[illegible]

صلح نامۂ لندن کی رو سے ریاست ہائے بلقان ترکی کے اقتدار سے آزاد ہو گئیں۔ البانیا جس میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی، خود مختار سلطنت بن بیٹھا۔ انور بے اور مصطفیٰ کمال صلح نامے سے ناراض تھے، جس کی رو سے ترکی کا یورپ کا سارا علاقہ سوائے قسطنطنیہ اور آبنائے باسفورس کے اس کے قبضے سے نکل گیا تھا۔ جب یہ معاہدہ مجلس وزارت میں توثیق کے لیے پیش ہوا تو انور اور کمال چند سو ساتھیوں کے ساتھ ہاتھوں میں ریوالور لیے داخل ہوئے اور کمال نے خود سالار وزیر حرب فرید پاشا پر جو ریاست ہائے بلقان سے بھاری رشوت لے کر صلح نامے کی تائید میں تھے، گولی چلا دی، اور انور نے صلح نامے کو جس پر وزرا کے دستخط ہو چکے تھے، جھپٹ سے اٹھا کر اپنے جیب میں ڈال لیا۔

۱۹۱۴ء میں یورپ دولت اور ہوس کے نشے میں سرشار ہو کر ایک بڑے تصادم اور ہنگامۂ جنگ کے لیے پر تول رہا تھا، اور دول یورپ کے ایوانوں میں ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی۔ ترکی پر جرمنی کا زیادہ اثر تھا۔ اکثر ترک فوجی افسر جرمنی میں تعلیم پائے ہوئے تھے۔ ترکی فوج کی تنظیم جرمن افسروں نے کی تھی۔ قیصر ولیم کا ترکی میں بہت اثر و رسوخ تھا، چنانچہ جب وہ یروشلم کو آیا تو اس کا ایسا شاندار استقبال ہوا کہ یورپ کے بادشاہ اس پر رشک حسد کرنے لگے۔ قیصر ولیم سلطان غازی صلاح الدین ایوبی کی مزار پر عقیدت کے پھول چڑھانے کے لیے تین میل پیادہ پا پہنچا اور ایک ریشمی قیمتی غلاف چڑھایا جس پر سونے کے حرفوں سے لکھا ہوا تھا: "قیصر ولیم عظیم الشان جرمنی کا حکمراں دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ و تاجدار صلاح الدین ایوبی کی بارگاہ میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔"

مصطفیٰ کمال ترکی پر جرمنی کے اثرات کو سخت
[illegible]

میں کودنے کے خلاف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر جنگ میں جرمنی کو فتح ہوئی تو ترکی کو اس کا حلقہ بگوش ہو کر رہنا ہوگا، اور اگر شکست ہوئی تو پھر ترکی کہیں کا نہیں رہے گا۔ ان کا یہ خیال جنگ کے بعد کے حالات میں حرف بہ حرف صحیح نکلا۔ انور بے اس کے خلاف جرمنی کے زیر اثر تھے، وہ جرمنی میں پڑھے ہوئے تھے۔ قیصر ولیم کے مداح تھے۔ دلیر، ذہین، آزمودہ کار اور قومی جذبے سے سرشار تھے۔ مصطفیٰ کمال جتنے محتاط، کم گو اور معتدل مزاج تھے، انور اتنے ہی جوشیلے اور جلد باز تھے، حکومت میں وزیر حرب اور بادشاہ کے داماد ہونے سے بااثر تھے۔ ان میں اور مصطفیٰ کمال میں جنگی اور سیاسی معاملات میں سخت اختلاف رہتا تھا۔ مصطفیٰ کمال کو یقین تھا کہ انور ترکی کو جرمنی کے ساتھ جنگ میں جھونک دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، سیاسی رقابتوں کے باعث مصطفیٰ کمال کو میدان جنگ سے دور رکھا گیا۔

پھر جب ۳ر جنوری ۱۹۱۵ء کو جرمنی اور ترکی فوجوں کو اتحادیوں (انگلستان، فرانس، اٹلی اور روس) کے مقابل شکست فاش ہوئی تو مصطفیٰ کمال کو کمانڈر بنا کر محاذ جنگ پر بھیجا گیا۔ وہاں انہوں نے وہ کارنامے دکھائے کہ خود قیصر ولیم نے اپنے ہات سے مبارکباد کا خط لکھا۔ اتحادیوں نے درۂ دانیال کا رستا اپنے اور روس کے جہازوں کی آمدورفت کے لیے کھولنے اور اس پر قبضہ کرنے کی غرض سے جان توڑ کوشش کی، لیکن اس کوشش میں ان کے کئی جنگی جہاز غرق آب ہو گئے۔ مصطفیٰ کمال اس مہم کے انچارج تھے۔ اتحادیوں نے زبردست جنگی جہازوں کے ساتھ دوبارا کوشش کی لیکن یہاں کے قلعے اتنے مضبوط اور مستحکم بنائے گئے تھے کہ اتحادیوں کی یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ ان کے پچاس ہزار فوجی کام آئے، اور سیکڑوں جنگی جہاز غرق آب ہو گئے۔

جب اس اتحادیوں کو اس مہم میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے خشکی کے رستے سے حملہ کرنے کی غرض سے کروڑوں روپے کا سامان حرب مہیا کیا، اور کئی ملکوں کے بہترین جنگ آزمودہ سپاہی لڑائی میں جھونک دیے۔ ترکی فوج درۂ دانیال کے جزیرے گیلی پولی میں قلعہ بند تھی۔ اتحادیوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں اور ترکوں کی ایشیائے کوچک کی فوج اس جانبازی سے لڑی کہ اتحادی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ ترکوں نے مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں وہ شاندار فتح حاصل کی کہ گیلی پولی کا کارنامہ صرف ترکی کا، بلکے دنیا کا زبردست جنگی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔

تیسری دفعہ اتحادیوں نے سمندر کے رستے سے قسمت آزمائی کی اور نہایت خوفناک حملا کیا، جنگی جہاز "الزبتھ" سیکڑوں جہازوں کے ساتھ حملا آور ہوا۔ انگریز کمانڈر ان چیف جنرل ہملٹن لکھتے ہیں کہ "ہماری فتح میں صرف دو منٹ کی کسر باقی رہ گئی تھی کہ جنگی جہاز "الزبتھ" اور دیگر دو سو جہاز سمندر میں غرق ہو گئے۔ مصطفیٰ کمال چالاکی اور بہادری سے پہاڑیوں پر اپنی فوج کو ہدایتیں دیتے ہوئے لڑا رہے تھے۔ ایک دفعہ ترکوں نے اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں میں ہلا بول دیا، اور آخری پہاڑی کو بھی جس پر اتحادی قابض تھے فتح کر لیا۔ رات کے اندھیرے میں اتحادی جہاز لنگر اٹھائے ترکوں کو بھاگے اور غایب ہو گئے۔ مصطفیٰ کمال فاتح آری براون والفنترا (پہاڑیوں کے نام) مشہور ہوئے۔

جنگ عظیم کے دوران حکومت نے مصطفیٰ کمال کو ولی عہد شہزادا وحیدالدین کے ساتھ، جن کا سن ۵۰ - ۶۰ کے لگ بھگ تھا، اور جو سلطان عبدالحمید ثانی کے چھوٹے بھائی تھے، مغربی محاذ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے متعین کیا، جب وہ جرمن ہیڈ کوارٹر پہنچے جہاں ایک بڑے حملے کی تیاریوں پر غور ہو رہا تھا، قیصر ولیم اور جنرل ہنڈن برگ لنڈرآف اور دوسرے بڑے جرنیلوں نے ان کا استقبال کیا۔ مصطفیٰ کمال نے قیصر اور جنرل لنڈراف کی اس یقین دہانی کے باوجود کہ ان کا نرغہ اور جنگ [illegible] ہے بجا؟

لیا کہ حالات جنگ جرمنی اور ترکی کے لیے امید افزا نہیں ہیں، اور یہ کہ جنگ جلد ختم ہونے کو ہے۔

مصطفیٰ کمال درد گردہ کے علاج کے لیے وائنا کو گئے ہوئے تھے کہ ۳ جولائی سنہ ۱۹۱۸ء کو سلطان محمد خامس کے انتقال اور شہزادہ وحید الدین کی تخت نشینی کی خبر ملی۔ ملک کو تباہی سے بچانے کے لیے ان کو وحید الدین سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ سلطان سے دو ایک ملاقاتوں میں ختم ہو گئیں، جس کے بعد انہوں نے ملک کی حفاظت کے لیے سلطان المعظم کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

یہ دیکھ کر کہ جرمنی اور ترکی کا جنگی پوزیشن خراب اور نازک ہو رہا تھا، ترکی نے ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۹۱۸ء کو عارضی صلح کا تصفیہ کیا، لیکن صلح کی شرائط جو اتحادیوں نے پیش کیے وہ ترکی کے حق میں نہیں تھے، اس کے مطابق ترکی کی فوجیں توڑ دی گئیں۔ چند ہی دنوں کے بعد قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ہزاروں ترک پھانسی پر لٹکائے گئے۔ ہزاروں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اتحادیوں نے عرب ممالک میں ترکوں کے خلاف بغاوت پھیلا دی۔ دمشق، بغداد، یروشلم، بصرا، موصل اور حلب جیسے زرخیز ملک ترکوں کے قبضے سے نکل گئے۔ سرزمین عرب اور مصر میں علحدہ علحدہ حکومتیں قایم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ تھریس اور سمرنا یونان کے حوالے کرنے کا اور ترکی کا باقی ماندہ علاقہ امریکا کے زیر اثر رکھنے کا تصفیہ کیا گیا۔ خلیفۃ المسلمین بالکلیہ اتحادیوں کے پنجۂ اقتدار میں تھے، اور ان ہی کے اشاروں پر چل رہے تھے۔

ان حوصلہ شکن حالات میں مصطفیٰ کمال نے اپنے ملک کو بدبخت اتحادیوں کے پنجے سے چھڑانے کی ٹھان لی۔ تمام ملک کی نگاہیں کمال پر لگی ہوئی تھیں۔ روس، اشتراکی انقلاب کے بعد صلح سے قبل ہی جنگ سے علحدہ ہو چکا تھا مصطفیٰ کمال نے اس سے فایدہ اٹھا کر روس کو لگانے کی کوشش کی، چونکہ اتحادی حکومتیں روس کے انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے در پردہ سازشیں اور ریشہ دوانیاں کر رہی تھیں، روس نے بھی ان کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے ترکی کی مدد لاکھوں روپوں کے سامان حرب سے کرنے کو غنیمت جانا۔ روس کی یہ حکمت عملی خود اس کے حق میں مفید اور کارگر ثابت ہوئی۔

چونکہ خلیفہ اتحادیوں کے قبضے میں تھا، مصطفیٰ کمال نے قسطنطنیہ سے باہر اناطولیہ کو اپنی سرگرمیوں کا میدان بنانے کا تصفیہ کیا، اور اپنی تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لیے انتھک کوشش میں لگ گئے۔ اتحادیوں کو بھی مصطفیٰ کمال کا قسطنطنیہ میں رہنا خطرناک نظر آیا۔ ان کے کہنے سے سلطان نے کمال کو قسطنطنیہ سے باہر ایک فوجی آسامی پر بدل دیا۔ مصطفیٰ کمال بھی یہی چاہتے تھے اور وہ اناطولیہ میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے اب آزاد ہو گئے۔ ان سرگرمیوں کو باغیانہ قرار دے کر حکومت نے ان کے لیے پھانسی کی سزا تجویز کی اور ان کے سر کی قیمت تین لاکھ روپیہ مقرر کی گئی۔ یہ سن کر جب ان کی بوڑھی والدہ آدھی رات کے وقت بیٹے کے پاس پہنچیں، بیٹے کی پیشانی پر روتے ہوئے بوسا دیا، اور یوں مخاطب ہوئیں "بیٹا آج خوشی کا دن ہے کہ آقائے نامدار کی متابعت کا فخر تمہیں حاصل ہے، بیٹا میں خوش ہوں کہ حضور مقبول سرور دو عالم کے سر کی طرح تمہارے سر کی قیمت بھی تعین کی گئی ہے، ملک وملت کے لیے اگر تمہاری ہزار جانیں بھی ہوتیں تو میں بڑے شوق سے نثار کرتی۔ اسی وقت اناطولیہ کو جاؤ، لوگوں کو جمع کرو اور فوجوں کو ترتیب دو۔ قیامت کے دن یاد رکھنا مجھے تاجدار مدینہ سے شرمندہ نہ ہونا پڑے کہ میرے بیٹے نے بزدلی سے جان دی۔"

مصطفیٰ کمال نے اناطولیہ پہنچ کر فوجوں کا [illegible] کا منصوبہ بنایا۔ اعلان کیا کہ ترکی [illegible] زمین بھی آج سے غیر ملکیوں کے قبضے میں نہ [illegible]

تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے چالیس ہزار فوج اناطولیا اور ایشیائے کوچک کی حفاظت کے لیے تیار کرلی۔ آخر سنہ ۱۹۱۹ء میں انہوں نے ایک مجلس مشاہدت قایم کی جس میں قسطنطنیا کے تمام فدائیان قوم شریک ہوگئے۔ ان میں فواد پاشا، زرہ پاشا، فوزی پاشا اور خالدہ خانم بھی تھیں۔ مجلس نے متفقہ فیصلہ کیا کہ اناطولیا اور ایشیائے کوچک قسطنطنیا کی حکومت کے اقتدار سے آزاد رہیں گے، اور بدیں مضمون خلیفا کو اطلاع کردی۔

اس کے ساتھ کمال اناطولیا میں فوج، پولیس اور آزاد حکومت کے نظم ونسق اور دیگر شعبوں کی تنظیم کے کام میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ اتحادیوں کی محاذ آرائیوں، خلیفا کی دھمکیوں اور معترضین کے اعتراضات کے باوجود وہ اس خیال پر اڑے رہے کہ ملک کو اتحادیوں سے خالی کراکے تمام ملک میں قومی حکومت قایم کی جائے گی اور خلیفا کی حکومت کو ختم کردیا جائے گا۔ جیسے جیسے اتحادیوں کی چالوں، یونانیوں کے مظالم اور خلیفا کی دھمکیوں میں اضافہ ہوتا گیا، ویسے ویسے اناطولیا کے جانبازوں کا جوش وخروش بڑھتا گیا، اور قومی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ جب دھمکیوں سے کام نہ نکلا تو مصطفا کمال کو وزارت اور کروڑوں ترکی پاونڈ کا لالچ دیا گیا، جس کو کمال نے ٹھکرادیا۔ وہ ملک کی آزادی کی قیمت پر کسی قسم کا سودا کرنے کو تیار نہیں تھا۔ انہوں نے اناطولیا کی قومی حکومت کا دارالسلطنت انگورا (انقرا) کو منتقل کردیا جو فوجی اعتبار سے زیادہ محفوظ مقام تھا۔ قسطنطنیا اتحادیوں کے قبضے میں تھا اور وہاں کی حکومت اتحادیوں کی سازشوں کا کھلونا بنی ہوئی تھی۔ اتحادیوں کے وزرائے اعظم لائڈ جارج، کلیمنسو، وسنٹ اور زانگ بلالی مصطفا کمال اور اناطولیا کی حکومت کے خلاف گرج رہے تھے، اور ترکی کو مسمار کرنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ادھر روس گولیوں، بندوقوں اور دیگر سامان حرب سے ترکی کی [illegible] درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس کو اتحادیوں کے قبضے سے باہر رکھنا چاہتا تھا کہ اس کے ذریعے سے بحر اسود میں خود روس کے علاقوں کی حفاظت ہوتی تھی۔ اس امداد کے صلے میں لینن نے انتہائی کوشش کی کہ ترکی روس اور کمیونزم کا حلقہ بگوش ہوجائے، مگر ترکی ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں روس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔

حالات نے بھی ترکی کا ساتھ دیا، خود اتحادیوں میں پہلی سی یکجہتی ختم ہوتی گئی۔ وہ جنگ عظیم کے بعد کے مصائب اور مشکلات سے بیزار ہوچکے تھے، ترکی سے الگ الگ مفاہمت کی چالیں سوچنے لگے، لیکن انگریز یونان کی حمایت میں ترکی کو ایسا سبق سکھانا چاہتے تھے جو دوسروں کو بھی یاد رہتا۔ انہوں نے قسطنطنیا پر قبضہ کرلیا، یہ واقعہ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کا ہے۔ ہزاروں گرفتاریاں عمل میں آئیں، اور دارالسلطنت پر خوف ودہشت کی فضا طاری کردی گئی۔ ترکی کے قوم پرست لیڈروں، رؤف بے، فتحی بے، شہزادہ سعد سلیم، اور وزرا امرا پارلیمنٹ کے ممبران اور خواص وعوام جیلوں میں پہنچادیے گئے۔ قسطنطنیا میں مارشل لا نافذ کردیا گیا۔ اخبارات کی اشاعت بند کردی گئی۔ اس کے جواب میں مصطفا کمال نے اناطولیا میں مقیم سب انگریزوں کو گرفتار کرلیا، اور انگریزی فوجوں کو حراست میں لے لیا۔ وہ تمام ترک فوج اور پولیس کے افسر جو سالہا سال سے لندن، پیرس، برلن، روم میں مقیم تھے، اور وکیل، ایڈیٹر، پروفیسر فوراً انقرا پہنچ گئے، اور مصطفا کمال کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ عصمت پاشا جو قسطنطنیا سے بھاگ کر آئے تھے، جو کم عمری کے باوجود قابلیت اور جذبۂ حب وطنی میں بڑھے چڑھے تھے، چیف آف دی جنرل اسٹاف بنادیے گئے۔

مصطفا کمال، آزادی کا دیوانا، ایمان وخلوص کا بندا، اپنی دھن کا پکا انسان وہ تمام فوجی اور سیاسی چالیں سوچتا رہتا، جن کی بدولت اس کے ملک کی سرزمین اغیار کے نجس قدموں سے پاک ہوجاتی۔ اس کو کھانے کی سدھ ہوتی اور نہ پینے کی۔ اس کی خوراک دن تمام میں آدھ سیر دودھ اور

وہ توس روئی تھی - اس کے کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے - ان دنوں وہ درد گردہ سے تڑپتا رہتا، اور جب اس کے معالج اس کی زندگی سے مایوس ہو جاتے تو وہ کہتا " تاجدار مدینہ کے پاؤں کی خاک کی قسم ابھی میری زندگی کے دن باقی ہیں، میں گناہ گار ہوں، مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جس مقصد کے لیے مجھے مامور کیا گیا ہے، وہ ان شاء اللہ پورا ہو گا - میں دیکھتا ہوں کہ جس طرح حضور مقبول سرور عالم بابی انت و امی نے قیصر و کسریٰ کی سلطنت کے پرخچے اڑتے دیکھے تھے، میں دشمنان ترکی کو ذلیل و خوار کر کے رہوں گا "

ایک طرف قسطنطنیہ پر انگریز چھائے ہوئے تھے، اور ان کا جنگی بیڑا بحر روم میں جمع تھا، دوسری طرف یونانیوں کی جرار فوج سمرنا سے نکل کر تھریس میں داخل ہو گئی تھی ۲۲ جون سنہ ۱۹۲۰ء اس کے علاوہ انگریزوں کی حمایت و سرکردگی میں مشرقی ترکی کا علاقہ بحیرہ اسود سے خلیج فارس تک ارمینیوں کی مجوزہ سلطنت کا علاقہ قرار دیا گیا تھا - ترکی کی اس زمانے کی دو کروڑ اسی لاکھ کی آبادی میں دس لاکھ ارمنی ترکی کے پہلو کا کانٹا بنے ہوئے تھے، اور اتحادیوں کی حمایت اور اعانت سے اپنی ایک علیحدہ سلطنت بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے، لیکن کاظم قرہ بکر پاشا نے ارمینیوں پر فوج کشی کر کے ارمنی سلطنت کے خواب کو ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، جس سے ترکوں کے حوصلے بڑھ گئے، اور انقرہ کی حکومت کو ارمینیوں کی طرف سے جو خطرہ لاحق رہا کرتا تھا وہ دور ہو گیا - سلطان نے مصطفیٰ کمال سے صلح کی ایک اور کوشش کی جو ناکام ہو گئی - جب حالات اتحادیوں کے لیے ناساز گار ہونے لگے، اور وہ روس کے ساتھ ترکی کے تال میل سے خائف ہوئے تو لندن میں یونان اور ترکوں کو بلا کر ایک کانفرنس میں صلح کرانے کی کوشش کی، جس میں سلطان کی حکومت کی مخالفت کے باوجود قسطنطنیہ کے علاوہ انقرہ کی حکومت کے نمائندے بھی شریک ہوئے -

یونان نے سمرنا ترکوں کو واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا - کانفرنس ناکام ہوئی، یونانیوں نے الٹی میٹم کے بغیر حملہ کرنے سے ردعمل یورپ خصوصاً فرانس اور اٹلی یونانیوں سے سخت برہم ہو گئے، لڑائی کا پلا کبھی یونانیوں کی طرف ہوتا کبھی ترکوں کے، یونانیوں کے ہاتھ سے ترکی کے چند علاقے جن پر وہ قابض تھے، نکل گئے -

اتحادی جو پہلی جنگ عظیم کی کوفت سے تھکے ہوئے تھے، اس لڑائی کا تماشا دیکھتے رہے البتہ روپیہ اور سامان حرب سے یونانیوں کی خوب مدد کی - یونانی جیسے مذہبی جنون کے ساتھ ترکوں سے نبرد آزما تھے، اور اناطولیا اور مشرق کوچک کے علاقے فتح کر کے قسطنطنیہ میں پھر سے کانسٹن ٹائن کی حکومت کی یاد تازہ کرنا چاہتے تھے - انہوں نے انیو تا اور اسکیر پر قبضہ کر لیا تھا - ترکوں میں مایوسی اور پریشانی کی لہر دوڑی ہوئی تھی، اور پارلیمنٹ کے بعض ممبر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ یونانیوں کو کچھ علاقے دے کر ان سے صلح کر لی جائے، مگر وہ شیدائی وطن اپنے ملک کی ایک انچ زمین بھی اغیار کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، اور کہتا تھا " پہلے مجھے گولی کا نشانہ بنا لو اس کے بعد جن شرائط پر چاہے صلح کر لینا "

یہ ماہرین حرب جنگ کا نقشہ جانے نقشے پر فوج کو ہٹانے بڑھانے اور حملہ اور دفاع کی شاطرانہ چالوں کے بارے میں غور و خوض کرتا دن رات مستغرق رہتا تھا - ایک دن متواتر آٹھ گھنٹے مایوسی کی حالت میں خاموش بیٹھا سوچتا رہا پھر ایک دفعہ سر اٹھایا، اور تسبیح کو جو ہاتھ میں تھی نقشے پر پھینک کر چلا اٹھا، " خیر البشر کے پاؤں کی خاک کی قسم، میدان مار لیا، میدان مار لیا، میں چار ہفتے کے اندر یونانیوں کو خاک میں ملا دوں گا " اور ان ناپاک ہستیوں سے ترکی کو ہمیشہ کے لیے صاف کر دوں گا، تم دیکھو گے کوئی یونانی یا ارمنی ترکی میں نظر نہ آئے گا -

میں ان کو ان کے کیفرِ کردار کو پہنچا دوں گا۔" وہ دس منٹ تک یہی نعرا لگاتا رہا، لوگ سمجھے کہ ان کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔

دوسرے دن انہوں نے پارلیمنٹ میں اعلان کرکے جنگ کی سرکردگی اور سپاہ سالاری اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ میدانِ جنگ میں پہنچ کر نعرۂ تکبیر سے فوج کے حوصلے بڑھاتے رہے، اور یونانی فوج کو ایسی شکستیں دیں کہ جنگ کا نقشا بدل گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ایک پہاڑی پر چڑھ رہے تھے کہ گھوڑے کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گر پڑے، ان کی ایک پسلی ٹوٹ گئی۔ لوگوں نے انہیں انقرہ واپس جانے کے لیے اصرار کیا تو انہوں نے انکار کرکے کہا "رسولِ پاک کے پاؤں کی خاک کی قسم، میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتا ہوں، میرا گھوڑے سے گر کر پسلی کا ٹوٹ جانا منجانب اللہ ہے، مجھے بتلایا گیا ہے کہ جہاں میری پسلی ٹوٹی ہے، وہ مقام ہے جہاں یونانیوں کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی، اور ان کا کچومر نکل جائے گا۔"

۲۴ اگست سنہ ۱۹۲۱ء کو کراداغ پر پھر لڑائی شروع ہوئی۔ یونانی فوج کی تعداد ترکوں سے چار گنا زیادہ تھی۔ طرفین آپس میں گتھ گئے، اور جان توڑ لڑائی لڑنے لگے۔ توپوں کی آواز سے دل دہل جاتے تھے۔ مصطفےٰ کمال نے ایک بے مثال فوجی چال چلی۔ دریا کو کاٹ کر اس کا رخ یونانیوں کی طرف پھیر دیا جس کے سیلاب سے یونانیوں کو سخت نقصان ہوا، اور بہت سا سامان حرب لدا ہزاروں آدمی سیلاب میں بہ گئے اور دیگر لاک گرفتار ہوئے جس جگہ مصطفےٰ کمال گھوڑے سے گرے تھے، خدا کی قدرت اسی مقام پر یونانیوں کو شکست ہوئی۔ ان کا فی الواقع کچومر نکل گیا اور وہ ایسا بھاگے کہ یونان کو جا کر دم لیا۔ یورپ کا ترکی کو ہضم کرنے کا تین سو سالا پرانا خواب آنًا فانًا ختم ہو گیا۔ اس کا میابی پر قوم نے کمال کو "غازی" کا خطاب پیش کیا، جس کو انہوں نے فخر سے قبول کیا۔

اس لڑائی میں مصطفےٰ کمال کی شاندار فتح کے باوجود سمرنا اور تھریس پر ابھی یونانی قابض تھے، جن کو وہاں سے نکالنے کے لیے ترک جان کی بازی لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ خلیفا وحیدالدین ابھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے تھے، اور جاسوسوں کے ذریعے کمال اور ان کے رفقا میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یونانی انگلستان اور فرانس کی مدد سے ترکی پر ایک آخری وار کرنے کی فکر میں تھے، چنانچہ اس کے لیے انہوں نے ہر دو ملکوں سے اپیل کی۔ فرانس نے پھیکا سا جواب دے دیا، البتا انگلستان کی طرف سے لارڈ کرزن وزیرِ خارجا نے خفیا امداد کا وعدا کیا۔

اس طرف انقرا کی حکومت مصطفےٰ کمال کی قیادت میں یونانیوں سے مقابلے کی زبردست تیاریاں کر رہی تھی، مصطفےٰ کمال ڈکٹیٹر بنا دیے گئے تھے، اور فوج کے سپاہ سالار بھی۔ کمال دن رات جنگ کی تیاریوں کے منصوبے گانٹھتے رہتے، اور وزرا کے ساتھ ایک درخت کے نیچے زمین پر بیٹھ کر اجلاس کرتے۔ اس سپاہ سالار کی وردی میں کئی پیوند لگے ہوئے تھے، جو تاریخ کے سپاہ سالاروں کے لباس کی ایک ہی مثال ہے۔

انگلستان کے وزیرِ اعظم لائیڈ جارج نے دارالعلوم میں یونانیوں کی تائید میں ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ سمرنا کی حفاظت کے لیے یونانیوں نے قسطنطنیا پر قبضا کرنے کی غرض سے ایک لشکر جرار ایڈریا نوپل کے جنوب میں جمع کیا۔ فرانس اور اٹلی نے جن کی فوجیں قسطنطنیا میں مقیم تھیں، اس کی مخالفت کی، اور ترکی کی تائید کی۔ ترکوں نے یونانی فوج پر ۲۶ اگست سنہ ۱۹۲۲ء کو علی الصبح زبردست دھاوا بول دیا، جس سے یونانی فوج میں دہشت اور سراسیمگی پھیل گئی۔ نتیجے میں یونانی جہازوں میں بیٹھ کر جو جنوب کی سمت کھڑے ہوئے تھے، غایب ہو گئے اور جاتے ہوئے شہر کو آگ لگا دی، جس سے کروڑوں کا

نقصان ہوا اور رستے میں مسلمان ترکوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا، اور گاؤں کے گاؤں جلا دیے۔ ترکی فوجیں ۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو سمرنا میں داخل ہو گئیں۔ مصطفیٰ کمال یونانیوں کی اس بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر ان کا پیچھا کر کے ان کو تھریس سے بھی نکال دینا چاہتے تھے۔ اس غرض سے انہوں نے فوج کو سمرنا کے شمال کی طرف بڑھایا۔ درۂ دانیال پر گیلی پولی کے مقابل انگریزی فوج نے ان کے آگے بڑھنے میں مزاحمت کی، مگر یہ دھن کا پکا انسان اپنی فوج کی پیش قدمی پر اڑا رہا۔ صورت حال بہت نازک ہو رہی تھی۔ لائیڈ جارج نے فرانس سے مشورہ کیے بغیر جنگ کا نعرہ بلند کر دیا، فرانس نے ناراض ہو کر ترکی کے خلاف اعلان جنگ کرنے سے انکار کر دیا، اور اٹلی نے بھی نے بھی ترکی کے ایشیائی ساحل سے اپنی فوجیں واپس بلانے کا وعدہ کیا۔ انگلستان جنگ کے لیے تنہا رہ گیا۔ اس نے اپنا زبردست بحری بیڑا درۂ دانیال پر جمع کیا، لیکن ترکی فوج بھی پیش قدمی اور دھاوا بولنے کے لیے سپاہ سالار کے حکم کی منتظر تھی۔ عین وقت پر جبکہ کسی لمحے ایک خوفناک جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ تھا، انگریزوں کی طرف سے ترکی سپاہ سالار کو یہ پیام موصول ہوا کہ یونانی تھریس کو ایک ہفتے میں خالی کر دیں گے، اور تھریس ترکوں کے حوالے کر دیا جائے گا، مگر قسطنطنیہ پر سے قبضہ برخاست کرنے سے انگریزوں نے صاف انکار کر دیا۔ کمال نے جنگ روک دی اور قسطنطنیہ کے تصفیے کے لیے صلح کانفرنس کے انعقاد کی تجویز منظور کر لی۔

۲۰ نومبر ۱۹۲۲ء کو لوزان کانفرنس شروع ہوئی، جس میں بارہ سلطنتوں کے نمائندے شریک تھے، اور جس کا افتتاح کرزن اور مسولینی نے نہایت شاندار رسومات سے کیا۔ انگلستان میں لائیڈ جارج کا رسوخ جاتا رہا۔ انہوں نے استعفیٰ ... پیش کر دیا۔ نئے الیکشن

کے بعد بونر لا وزیر اعظم ہو گئے اور لارڈ کرزن بدستور وزیر خارجہ رہے۔ کانفرنس میں ترکوں کی طرف سے عصمت پاشا نے نمائندگی کی اور انگلستان کی طرف سے لارڈ کرزن نے ترکی کے مطالبات منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کانفرنس کے اجلاس تین مہینے تک ہوتے رہے تھے۔ آخر یہ کانفرنس کسی نتیجے کے بغیر فروری ۱۹۲۳ء میں برخاست ہو گئی۔ خلیفہ وحید الدین حالات کی نزاکت کو دیکھ کر ۱۷ نومبر ۱۹۲۲ء کو صبح سویرے اپنے بیٹے کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا اور انگریزی جہاز ملایا میں پناہ لی، وہ لاکھوں روپے کے جواہرات بھی ساتھ لے گئے۔ مالٹا میں چند سال قیام کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، اور ان کے چچیرے بھائی شہزادہ عبدالمجید، جو سلطان عبدالعزیز کے بیٹے تھے خلیفہ بنائے گئے۔

یہ دیکھ کر کہ ترک لڑنے مرنے کو تیار ہیں، اور فرانس اور اٹلی کے علاقے سے دستبردار ہونے اور قسطنطنیہ اور درۂ دانیال سے اپنی فوجیں واپس بلانے کو آمادہ ہیں، اور اس خوف سے کہ کہیں روس کی فوجیں ترکی کی مدد کو نہ آ دھمکیں، انگلستان نے بھی قسطنطنیہ کو خالی کرنے کا تصفیہ کر کے مصطفیٰ کمال کو اس کی اطلاع کر دی، اور ایک ہفتے کے بعد خالی کر دیا۔ قسطنطنیہ کی آزادی کا جشن بہت دھوم سے منایا گیا۔

۴ اپریل ۱۹۲۳ء کو لوزان میں دوبارہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس دفعہ لارڈ کرزن نے جو پہلی کانفرنس میں عصمت پاشا کے مطالبات پر اڑ جانے کی وجہ سے ناراض تھے۔ شرکت سے انکار کر دیا، اور ان کی جگہ قسطنطنیہ کے ہائی کمشنر نے انگلستان کی نمائندگی کی۔ ترکی کے تمام مطالبات مان لیے گئے اور اس کے سارے علاقے اس کو مل گئے۔ ... تاوان جنگ سے دستبردار ہو گئے۔ ...

CAPITULATION

جس کی رو سے ترکی میں مقیم غیر ملکی ... حکومت کے قوانین ...

درے تک مانیال ترکی کے قبضے میں رہا۔ ۲۴ر جولائی ۱۹۲۳ء کو صلح کا اعلان ہوا۔

اس اثنا میں ترکی کی وزارت میں اختلافات رونما ہو رہے تھے، جن سے ملک میں خلفشار پیدا ہو گیا۔ حالات بگڑنے لگے۔ رؤف بے نے جن کے تعلقات وزیر خارجا عصمت پاشا سے خراب ہو گئے تھے۔ وزارت سے استعفا دے دیا، اور ان کے ساتھ وزارت بھی مستعفی ہو گئی۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا، جس میں مصطفا کمال کی ذہانت اور حکمت عملی سے ترکی کو جمہوریت بنانے کا بل منظور ہوا۔ مصطفا کمال چار سال کے لیے صدر جمہوریا منتخب ہوئے، اور ان کو وزیر اعظم نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا۔

جمہوریت کے اعلان کے بعد خلافت کی منسوخی اور خلیفا کی معزولی کا اعلان بھی کیا گیا، اور خلیفا کے لیے ایک معقول پنشن مقرر کی گئی، لیکن خلیفا نے پھر خلافت کی بازیابی کے لیے بیرونی طاقتوں سے ساز باز شروع کر دی۔ نیشنل اسمبلی نے خلیفا اور ان کے خاندان کو ملک سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ ۳ر مارچ ۱۹۲۳ء کی رات کو یہ حکم ان کو سنایا گیا۔ اس کے دس دن بعد سلطان اپنے خاندان کے ساتھ عازم سوئٹزرلینڈ ہو گئے، جہاں وہ جلا وطنی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

ملک کو بیرونی طاقتوں سے چھٹکارا دلانے کے بعد غازی مصطفا کمال اصلی کام یعنی اندرون ملک اصلاحات کی جانب ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اور جدید ترکی کو ان روگوں سے پاک صاف کرنے کی کوشش میں لگ گئے جو صدیوں سے اس کو کھوکھلا بنائے ہوئے تھے۔ نیشنل اسمبلی اور بیرونی اسلامی ممالک کی طرف سے مسلسل خواہش اور اصرار کے باوجود انہوں نے خلافت کے احیا اور یہ عہدا خود سنبھالنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب آپ لوگ دوسرے بادشاہوں اور ریاستوں کے ماتحت ہیں۔ خلیفا کے حکم کی متابعت از روئے شریعت ضروری ہے، اس لیے اگر آپ کو میں وہ فتوے دوں جو آپ کی حکومت کے منافی ہوں، اور آپ ان کی تعمیل نہ کر سکیں تو کیا خلافت کا وجود ہنسی اور مذاق نہ ہو گا۔"

مصطفا کمال نے اپنی بقیا پندرا سال کی زندگی ملک اور قوم کی اصلاح کے لیے وقف کر دی، اور اس قلیل مدت میں ترکی کی ہیئت کذائی۔ نظم و نسق، زراعت، معدنیات، جنگلات، مراسلات، تجارت، صنعت و حرفت، تعلیم، حقوق نسواں، حفظان صحت، قانون، رسم خط، لباس، رہن سہن، غرض زندگی کا کوئی ایسا شعبا نہیں تھا جس میں انہوں نے تبدیلی نہیں کی۔ باہر کے صنعت کاروں کو مراعات دے کر ترکی کی صنعتی ترقی اور ملک کی خوش حالی میں دن دونی اضافا کیا، لیکن ان کارخانوں میں ترکی ملازم رکھنے کی شرط رکھی۔ خلفا کی حکومت میں اخبارات آزاد نہیں تھے، بلکہ خلیفا اور اتحاد کا پروپگنڈا کرنے کے پابند تھے۔ کمال نے اخبارات اور پریس کو بالکل آزاد کر دیا۔ اخبارات لاطینی حروف میں شایع ہونے لگے، اخبار نویسوں کے دیوانی اور فوجداری جھگڑے ان ہی کی پریس ایسوسی ایشن کرنے لگی۔ کمال نے گاؤں گاؤں پھر کر تعلیم حاصل کرنے اور لاطینی حروف سیکھنے کی ترغیب دی۔ عورتوں کو پولیس اور دوسرے سرکاری محکمہ جات میں مامور کیا گیا۔ ان کے لیے ایک علحدا یونیورسٹی بنائی گئی۔ کمال نے قوم کی جہالت اور ناخواندگی دور کرنے کے لیے تعلیم نسواں پر بہت زور دیا۔ ... میں کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمارے رسول مقبول سرور دو عالم علم کے سمندر تھے، اس لیے ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ زیور علم سے آراستا ہو۔"

لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "آج بیسویں صدی میں جب تم اپنے لڑکوں کو آکسفورڈ، کیمبرج، لندن، پیرس، برلن، روم اور نیو یارک تعلیم کے لیے بھیجتے ہو، ناممکن ہے کہ لڑکیوں کو اکثر ان پڑھ ناخواندا رکھ سکو، تمہارے لڑکے غیر ملکوں سے بیویاں تلاش کریں گے جن سے وہ اپنے وطن

بت زیادہ ہوتی ہے وہ اور فطری طور پر ان کے بچے
رکی قومیت سے غیر مانوس رہیں گے جس کے باعث
گلی نسل کے دلوں میں ترکی سے محبت نہیں ہوگی،
ور غلامی کا طوق تمہاری گردنوں میں نظر آئے گا"
س لیے یہ قانون بنایا گیا جس کی رو سے کوئی ترک
ورت یا مرد غیر ملکی سے شادی نہیں کرسکتا، ورنہ
س کی جائیداد ضبط کرلی جائے گی۔ سنہ ۱۹۳۶ء
یں قوم نے ان کو اتاترک کا لقب پیش کیا، جس
ے معنی ہیں "ترکوں کا باپ" جس کو انہوں نے
زسے قبول کیا۔

آخر میں مصطفیٰ کمال کے مذہبی عقاید کے
ارے میں بھی کچھ عرض کردینا ضروری ہے۔ مذہب
ے خلاف ان کے خیالات کا پروپگنڈا دنیا کے گوشے
شے میں کیا گیا، حالانکہ ان کے دل میں اسلام
ی سچی محبت تھی۔ غازی مصطفیٰ کمال پیغمبر عرب کو
ہ صرف آخری رسول، بلکہ دنیا کا سب سے بڑا
نسان سمجھتے تھے۔ ان کی رائے میں بنی آدم کے
یے خدا پر جو واجب الوجود ہے، ایمان لانا لازمۂ
بشریت ہے۔ ترکی کے پروفیسر آمین آفندی لکھتے
یں "غازی موصوف نے میرے ایک سوال کے جواب
یں فرمایا، ہم اسلام کے سچے پرستار ہیں، اور
ہمارے قلوب میں اسلامی تعلیم کا احترام جاگزیں
ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ ہم پر
اعتراض کرنے والے اسلام کی خاطر میدان میں
بھی نہیں نکلے۔ ہم نے اسلام کی عزت و حرمت
ے لیے مسلسل جہاد کیا۔ اب بھی اگر اسلام
ے لیے کوئی نازک وقت آئے گا تو یہ اعتراض
کرنے والے سب اپنے جبے اور دستار کے حجروں
یں جا چھپیں گے۔ ہماری جماعت اسلام پر فدا
ہے اور اسلام ہماری عزیز ترین متاع ہے، لیکن
وہ اسلام نہیں جو ملاؤں کے پاس ہے، بلکہ وہ
سلام جو قرآن میں موجود ہے۔"

اس مضمون کے اگلے حصوں میں خود ایک
ونوں پر غازی موصوف اور ان کی والدہ کی
پیغمبر اسلام سے والہانہ عقیدت کا ذکر آیا ہے کہ
وہ پیغمبر اسلام کے پاؤں کی خاک کی قسم لے کر کچھ
کہتے یا کرتے تھے۔ ڈاکٹر براون نے جنوری سنہ ۱۹۳۲ء
میں غازی ممدوح سے اپنی ملاقات کا ذکر "امریکن
فارٹ نایٹ لی ریویو" میں شایع کیا تھا، جس میں
لکھا ہے کہ "غازی موصوف کو پیغمبر اسلام سے خاص
عقیدت اور محبت ہے، اور وہ رسول کا نام لے کر
آبدیدہ ہو جاتا ہے وہ بارہا کہہ چکا ہے کہ دنیا
نے ایسا عظیم الشان انسان ابھی تک پیدا نہیں کیا
اور نہ کرسکے گی۔" ان کی آنکھیں پرنم تھیں، چائے
کی پیالی کو انہوں نے میز پر رکھ دیا، اور کہا کہ حضور
کی اصلی زندگی کے حالات آپ لوگوں تک نہیں
پہنچائے گئے، انہوں نے اپنا ہاتھ میرے کاندھوں
پر رکھ کر کہا۔ یورپ کو قطعی طور پر اس پروپگنڈے
سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ میں اسلام سے
بیزار ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے
دل میں اسلام کی محبت اچھل رہی ہے۔ میرا ایمان
ہے کہ اگر خدا کا زمین پر انسان کے لباس میں مبعوث
ہونا ممکن ہو سکتا ہے تو وہ صرف حضور کے لباس
میں ہو سکتا ہے۔ اسلام دنیا کا مذہب ہے۔ البتہ
ہم اس کی تفسیر اپنے نقطۂ نگاہ سے کرتے ہیں۔
میں نے جو اصلاحات اپنے ملک میں جاری کیے ہیں
وہ عین شریعت کے مطابق ہیں۔ یورپ جو چاہے
سمجھے، اہل بصیرت دیکھ چکے اور دیکھ رہے ہیں کہ
میں ہر قدم آقائے نامدار کی متابعت میں رکھ رہا ہوں۔"

آخر ۹ نومبر سنہ ۱۹۳۰ء کو یہ بطل حریت، شیدائے
وطن، پرستار اسلام، اپنا کام دنیا میں ختم کرکے
راہی ملک عدم ہوا۔

عبدالرحمان پرواز اصلاحی

مفتی صدرالدین خان آزردہ

دلی میں عام طور سے اہل کمال تین جگہ اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ ایک مولانا فضل حق خیر ابادی کے دولت کدے پر، دوسرے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی کوٹھی پر۔ تیسرے مفتی صدر الدین آزردہ کے دیوان خانے پر۔ شاہی دربار سے یہ دربار کسی طرح کم نہ تھے۔ بادشاہوں نے لاکھوں روپے صرف کرکے نورتن جمع کیے تھے۔ ان شاہان علم نے اپنے حسن اخلاق سے سینکڑوں با کمال کو درباری بنالیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے والد ماجد سے ان کا ذکر سن کر غلام رسول مہر سے کہا تھا۔ انہوں نے اپنی کتاب "غالب" میں اسے نقل کیا ہے۔

والد مرحوم (مولانا خیرالدین دہلوی) شب کی نشستوں میں جب کبھی اس عہد کا ذکر کرتے تو بار بار یہ شعر پڑھتے اور آبدیدہ ہو جاتے۔

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیۃ من عرار

فرماتے تھے کہ مفتی صاحب کا دیوان خانہ دلی کے تمام منتخب افراد کا مرکز تھا۔ جاڑا، گرمی، برسات ہر موسم ہو لیکن شب کی یہ مجلس کبھی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا، اگر کوئی نووارد دلی آتا اور چاہتا کہ دلی کے سارے اہل فضل و کمال کو بیک وقت اور بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا۔

اٹھارویں صدی میں پیرس اور لندن کے علم دوست امرا کے سیلون اور ڈرائنگ روم کے جو حالات ہم پڑھتے ہیں۔ بعینہ یہی حال دلی کے دیوان خانوں کی مجلسوں کا بھی تھا۔ ہر حلقے میں کسی نہ کسی امیر کا دیوان خانہ شب کے اجتماع کا مرکز بن جاتا تھا، اور اس حلقے کے لیے ٹھیک ٹھیک ایک علمی، ادبی اور تفریحی کلب کا کام دیتا تھا۔ والد مرحوم ان دیوان خانوں کی مجلس کے حوالے سنایا کرتے تھے کاش وہ قلم بند کیے جا سکتے۔ بجھنے والے چراغ کا یہ آخری اجالا تھا۔ دلی مرحوم کے ہفت سالہ زندگی کی انجمن طرازیوں کی یہ آخری بزم تھی۔ گو شان و شکوہ کے سارے پچھلے نقوش مٹ چکے تھے، لیکن ان بچے ہوئے رنگ و روغن میں بھی عہد ماضی کے رنگوں کی بہار دیکھی جا سکتی تھی!

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنی عجیب و غریب تصنیف "دلی کی آخری شمع" میں لکھتے ہیں۔ "ان چپلی قبر کے قریب مولوی عزیز اللہ کے سامنے مفتی صدرالدین صاحب کا مکان تھا۔ اس کے نزدیک نواب مصطفیٰ خان [illegible]

مکان کو بھی انگریزی اور ہندستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان ہے۔ اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ دالانوں سے ملا ہوا اونچا صحن اور چبوترا ہے۔ چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے۔ ان پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔"

مولوی بشیر الدین احمد بھی لکھتے ہیں۔

"منٹیا محل سے سیدھے ہاتھ پر مولوی صدر الدین خان کی حویلی ہے جو ان سے پہلے ہزار ابیگ کی حویلی کہلاتی تھی۔ مولوی صاحب نے اسے خرید کر نئے سرے سے بنوایا ہے۔ یہ حویلی بہت خوش قطع ہے اور اس میں خانہ باغ، نہر، فوارے سب کچھ تھا۔"

علمی و ادبی مجلسیں

مولانا عبدالحی نواب مصطفٰے خان شیفتہ کے تذکرے میں لکھتے ہیں۔ "دلی اس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر، مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خان علوی، مفتی صدر الدین خان آزردہ، مرزا اسداللہ خان غالب، نواب ضیاء الدین خان نیر درخشاں۔ شاہ نصیر الدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم مومن خان مومن، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمان خان احسان۔ میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخن وران باکمال کا جمگھٹا تھا۔ جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔ مفتی صدر الدین خان اور خود نواب صاحب کے ہاں ہر ہفتہ باری سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ اہل کمال اس میں جمع ہو کر لطف سخن اٹھاتے تھے۔"

دلی کی ان علمی و ادبی صحبتوں کی یاد جب سر سید احمد خان کو آتی ہے تو بڑی حسرت سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ "دل بہلانے کے لیے اپنے باغ میں گیا جو ایک بہت بڑا باغ تھا اور جہاں اور دلی کے زمانے میں میں نے اس کو اکثر خوب آراستہ کیا تھا، اور [illegible]

کا مجمع ہوتا تھا۔ غالب کی دل کش اور محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے، آزردہ کی دل چسپ و دل ربا فصاحت سے شیفتہ کی متین و نیم خنداں وضع سے، صہبائی جان نواز کے مے خانۂ محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا۔"

مولانا حالی "یادگار غالب" کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تیرھویں صدی ہجری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور ان کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے، حسن اتفاق دارالخلافہ دلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں عہد اکبری و شاہ جہانی کی صحبتوں اور مجلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں۔ ؎

ہند را خوش نفسا نند سخنور کہ بود
باد در خلوت شان مشک فشاں از دم شان
مومن و نیر و صہبائی و علوی، انگاہ
حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شان

اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے۔ اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھے ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے، بلکہ ہندستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا اور جس ہوا میں انہوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی۔ ؎

زمانہ دگر گونہ آئین نہاد
شد آلات رگ گابجفہ زرین نہاد

حلیہ اور لباس

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مفتی صدر الدین آزردہ کا اس وقت کا حلیہ لکھا ہے جبکہ ان کی عمر ۷۰ سال کی تھی لکھتے ہیں۔ "گداز جسم، سانولا رنگ، چہرہ پھولا، آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی، بھرا ہوا داڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی تھے [illegible]

ایک ہرکا انگرکھا، سفید پاجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی عمامہ تھا، (حاشیے میں لکھتے ہیں)

"پرانے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے، ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا تھا۔ عالم ہوتے درس کا حلقہ ہوتا شاعر ہوتے تو شعر کا چرچا ہوتا۔ غرض کوئی وقت بے کار نہ گزرتا۔ خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی، ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لیے دیے رہتے تھے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا تھا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دو زانو مودب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے۔ کوئی ہنسی کی بات ہوئی ذرا مسکرا دیے۔ کھل کھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔"

شعر پڑھنے انداز

مرزا فرحت اللہ بیگ دلی کی آخری شمع یعنی دلی کے آخری یادگار مشاعرے میں لکھتے ہیں۔

"مفتی صاحب کہنے کو خوب ہیں گر پڑھتے اس طرح کہ گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز ذرا نیچی ہے لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص شعروں پر اور بہت نیچی آوازیں۔ ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے۔" لیکن مولانا فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری جو آخری عمر میں مفتی آزردہ کے شاگرد رہے ہیں اور تیرا ماہ تک رہ کر ان کی خدمت میں علوم عقلی و نقلی کا استفادہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مولانا موصوف باوجودے کہ چوہتر سال کے تھے مگر ذوق شعر و سخن میں جوانان عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو نہایت عمدہ کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا۔ بمقتضائے اس کے ہمیشہ خواطر عشق اور دل لوائے محبت سے آزردہ خاطر، افسردہ طبع دیدۂ گریاں، سینۂ بریاں رہتے تھے۔ اور اشعار کے پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز اور لحن حزیں اور صوت درد انگیز رکھتے تھے جس نے آپ کی زبان سے سخن موزوں سنا ہے۔ وہی اس کیفیت کو جانتا ہے۔ کیا انشائے شعر تھا یا ایجاد سحر۔"

نواب صدیق حسن خان نے مفتی صاحب سے فراغت حاصل کی تو مفتی صاحب تقریباً ۷۶ سال کے تھے۔ لیکن نواب صاحب مفتی صاحب کے انداز شعر خوانی اور ترنم کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

"در خواندن شعر لحن دل شگاف و آواز حزیں و صوتی بس درد انگیز داشتند ہر کہ سخن موزوں از زبان ایشان شنیدہ است وی می داند کہ چہ نمک داشت۔ انشائے شعر بود یا ایجاد سحر۔"

شعر فہمی و نکتہ سنجی

مولانا آزردہ شعر کا بہت صحیح مذاق رکھتے تھے۔ شعر کے حسن و قبح کی پرکھ بڑی اعلا درجے کی تھی۔ ان کے عہد میں اردو غزل اپنے شباب پر تھی۔ نئے نئے خیالات اور معنی کی فکر عام تھی۔ ہر شاعر ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں تھا۔ جس شاعر کے کلام کو پسند کر لیا اور داد دی اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔ حالی لکھتے ہیں۔

"ایک مرتبہ ان کے روبرو کسی نے غالب کا یہ شعر پڑھا۔

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے اس لیے مرزا کا کلام سن کر وجد کرنے لگے اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے؟ کہا گیا کہ مرزا غالب کا۔ چونکہ وہ مرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہیں کرتے تھے اور اس وقت لاعلمی میں بے ساختہ ان کے منھ سے غالب کی تعریف نکل گئی تھی۔ غالب کا نام سن کر بطور مزاح کے جیسی کہ ان کی عادت تھی فرمایا "اس میاں مرزا کی کیا تعریف ہے۔ یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔"

ایک روز منشی بہاری لال مشتاق اپنے دوست لالہ رام چند، قریب ساتھ جناب مرزا کی خدمت میں

فر ہوے اور شعر و شاعری کا ذکر چلا۔ قمر نے غالب
نکتہ سنجی اور نازک خیالی کی بہت تعریف کی۔
نا نے چیں بہ جبیں ہو کر فرمایا کہ بنایت مشکل
نا ہے اور پھر زانو پر ہات مار کر شگفتہ جبیں
رے اور فرمایا کہ ہاے کہتا ہے تو ایسا کہتا ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

س زمانے میں میر نظام ممنون شاہ صاحب کے پرانے
رسے میں مشاعرا کرتے تھے۔ ایک مشاعرے میں مرزا نے
نا فارسی قصیدا "دریا گریستن اور تنہا گریستن"
جناب سید الشہدا کی منقبت میں انہوں نے لکھا تھا
ھا۔ سنا ہے کہ مجلس مشاعرا بزم عزا بن گئی تھی۔
ب تک قصیدا پڑا گیا لوگ برابر روتے رہے۔
تی صدر الدین خان مرحوم بھی موجود تھے۔ اتفاق
ے اسی حالت میں مینھ برسنے لگا۔ مفتی صاحب
کہا "آسمان ہم گریست۔

میر کے دیوان میں ایک غزل ہے "خاک میں،
ک میں، ہلاک میں،" مولانا آزردہ کے مکان
ان کے چند احباب جن میں مومن اور شیفتہ بھی
تے۔ ایک روز جمع تھے۔ میر کی اس غزل کا یہ
عر پڑھا گیا ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

تر کی بے انتہا تعریف ہوئی اور سب کو یہ خیال ہوا کہ
س قافیے کو ہر شخص اپنے سلیقے اور فکر کے
افق باندھ کر دکھاے۔ سب قلم اور کاغذ لے کر
۔ الگ بیٹھ گئے اور فکر کرنے لگے۔ اسی وقت
ے دوست وارد ہوے۔ مولانا سے پوچھا کہ حضرت
س فکر میں بیٹھے ہیں۔ مولانا نے کہا "قل ھو اللہ"
جواب لکھ رہا ہوں۔ اس پر آگے چل کر مولانا
ال لکھتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ جوش جنوں میں گریباں یا دامن یا
دونوں کو چاک کرنا ایک نہایت مبتذل اور پامال مضمون
ہے۔ جس کو قدیم زمانے سے لوگ بار بار باندھتے چلے
تے تھے۔ ایسے چچوڑے ہوے مضمون کو میر نے باوجود

غایت درجہ سادگی کے ایک ایسے اچھوتے، نرالے
اور دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے کہ اس سے
بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا۔ اس اسلوب میں
بڑی خوبی یہ ہے کہ سیدھا سادا ہے، نیچرل ہے، اور
باوجود اس کے بلکل اترکھا ہے۔

میر کی نسبت آزردہ کا یہ جملا ان کی شاعری
پر بڑا مکمل اور بھرپور تبصرا ہے۔
"پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند"

ادبی چھیڑ چھاڑ

دلی میں مشاعرا تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑی
مفتی صدر الدین خان صاحب اور مولوی امام بخش صہبائی
جلسے میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ
مصرع پڑا ؎

بہ وادیے کہ دراں خضر را عصا خفت است

مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ
"عصا خفت است" میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ
حضرت میں ہندی نژاد ہوں، میرا عصا پکڑ لیا اس
شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا۔ ع

وے بہ حلہ اول عصاے شیخ بخفت

انہوں نے کہا کہ "اصل محاورے میں کلام نہیں۔ کلام
اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں۔ ۱۸۴۷ء کا
وہ زمانا تھا کہ نواب صاحب (شیفتہ) مفتی صاحب
کے یہاں ہر ہفتا باری باری سے مشاعرا ہوا کرتا تھا۔
ایک روز نواب صاحب کے یہاں مشاعرا تھا۔ اس
میں مفتی صاحب نے اپنی وہ مشہور غزل پڑی جس کا
ایک شعر یہ ہے ؎

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا آ کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

نواب صاحب نے مزاحاً مفتی صاحب کے چھیڑنے کو
اسی طرح میں ایک غزل ایسے شخص کو لکھ کر دے دی
جس کا شمار سخن وران مشاہیر میں نہ تھا۔ مفتی صاحب
کے بعد جس وقت اس نے غزل کو پڑا مفتی صاحب کی
گھبراہٹ اور پریشانی قابل دید تھی۔ اس غزل
کے دو شعر یہ ہیں ؎

ہم بزمِ دشمن کا چھپانا ہی تھا قاصد
سچ ہے کہ کسے کرتی نا داں خبر ایسی
سمجھتے ہو علاج آپ کریں کچھ خفقان کا
دل کانپے کہ رہ رہ کے سنائی اگر ایسی

حالی لکھتے ہیں۔

"مولانا آزردہ بے شک مرزا کی طرزِ خاص کو جو انہوں نے ابتدا میں اختیار کی تھی نا پسند کرتے تھے۔ اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کی خاطر نشین ہو گیا تھا وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا۔ چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اُس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارا کیا ہے کہ مولانا ان کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے اس کے مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں ؎

با چنیں اندوہ کز برگفتیم در دل خالی نہ شد
خواجہ گر ازدرِ گہ دامن نہ پردے وائے من
آنکہ در یکتائی وے در فنِ فرزانگی
متفق گردیدہ رائے بو علی با رائے من
آنکہ چوں خواہد بنالش نامہ نامی ساختن
برنگارد عقلِ فعالش کرم زائے من
دل بدیں وصفم نیاساید سخن کوتہ کنید
آنکہ ننگِ اوست بودن در سخن ہمتائے من

یعنی بو علی سینا کا ممدوح کی یکتائی پر میرے ساتھ اتفاق رائے کرنا اور عقل فعال کا اس کو "کرم زائے من" لکھنا یہ سب باتیں اس کی مدح کے لیے کافی نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایسا شخص ہے کہ شعر میں مجھ جیسے شخص کا ہمسر و ہمتا ہونا بھی اس کے واسطے موجب ننگ و عار ہے۔ اس میں قطع نظر اس کے کہ ممدوح کی اور اس سے بھی زیادہ اپنی توصیف ایک نہایت پیرائے میں بیان کی ہے، اور اس بات کا بھی اشارا ہے کہ ممدوح میری شاعری کو پسند نہیں کرتا۔

مولانا کی وفات سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے کہ ایک روز نواب حسرتی کے مکان پر جیسے راقم بھی وہاں موجود تھا۔ آزردہ اور غالب اور بعض اور مہمان جمع تھے۔ کھانے میں دیر تھی۔ فارسی دیوان غالب کے کچھ اوراق پڑے ہوئے مرزا کی نظر پڑ گئے۔ ان میں ایک غزل تھی جس کے مقطع میں اپنے منکروں کی طرف خطاب کیا تھا، اور جس کا مطلع یہ ہے۔

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست
فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

مرزا نے وہ اوراق اٹھا لیے، اور مولانا آزردہ سے مزاح کے طور پر کہا "دیکھیے کسی ایرانی شاعر نے کیا زبردست غزل لکھی ہے۔ یہ غزل پڑھنی شروع کی۔ اول کے دو تین شعروں کی مولانا نے تعریف کی، مگر پھر بعض قرائن سے سمجھ گئے کہ مرزا ہی کا کلام ہے۔ مسکرا کر جیسی کہ ان کی عادت تھی کہنے لگے۔ "کلام مربوط ہے مگر نو آموز کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ سب حاضرین ہنس پڑے جب مقطع کی نوبت آئی۔ مرزا نے مولانا کی طرف خطاب کر کے دردناک آواز سے یہ مقطع پڑھا ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

اس وقت سب لوگ بہت متاثر ہوئے اور مولانا آزردہ شرما کر خاموش ہو رہے۔

کلب علی خان فائق رامپوری اپنی کتاب "مومن" میں لکھتے ہیں۔

"آزردہ نے غالب کو طرز بیدل سے ہٹا کر اردو شاعری میں بڑا احسان کیا۔ اس لیے کہ جدید اردو شاعری کی تحریک مومن نے چلائی اور آزردہ نے اس کی حمایت میں پوری مساعی حسنہ سے کام لے کر ایک نیا موڑ اردو شاعری میں پیدا کیا۔"

حالی کی رائے ہے کہ آزردہ سادہ روش کو پسند کرتے تھے، اور اسی لیے معاصرین نے آزردہ کی رائے کی منزلت کی۔

غالب اور آزردہ کی دوستی

باوجود اختلاف رائے اور ذوق کے غالب اور ایک دوسرے کے قلبی دوست اور قدردان تھے، ایک دوسرے کی عزت اور محبت کا دم بھرتے تھے۔ غالب

بدالرزاق شاکر کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔
"حسن اتفاق سے اصلاح مجھے اُستِ ودست
گسار، یار وفا شعار، ملاذِ روزگار، ختم العلما
لمتبحرین مولوی صدر الدین خان صاحب بہادر صدر
لصدور دلی بہ آزردہ دام بقائے وزاد علائہ کو
سے ملنے کو غم خانے پر تشریف لائے ہوئے موجود
تھے۔ غزل کو دیکھ کر پسند فرمایا۔ حضور کی بلاغت کی
سین غزل مصرعوں کے میرے ساتھ شریک غالب
وکر مزے لوٹے اور آپ کی شیرینیٔ گفتار کے وصف
یں تا دیر عذب البیان اور رطب اللسان رہے اور
سے بقدر میرے معلوم وبیان کے آپ کی صفات
یدہ سے واقف و آگاہ ہو کر بہت شاد و خرسند
سے۔ مبارک ہو نادیدہ غائبانہ یعنی محض مشتاقانہ
تمنائے ملاقات عجز و نیاز لکھنے کو ارشاد کر گئے
یں۔ لہٰذا میں لکھتا ہوں قبول فرمایئے گا۔"
"مولانا آزردہ نے "زر دور نہیں، حور نہیں"
س زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے
طلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں
سنا کر ان سے کہا کہ اگرچہ بحر دوسری ہے، مگر اسی
دیف و قافیے میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے جس کا
طلع یہ ہے ؎

عشق عصیان است اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زبان مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین
یں جس میں ہماری غزل ہے، اردو غزل لکھتا تو اس کا
طلع اس طرح ہوتا ؎

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں
کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ
قائل کا نام لیا جائے اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا
یہی اردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور
پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے، چونکہ نظیری کا
مطلع اردو ترجمے سے بہت پست ہو گیا تھا۔ سب
کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے
اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے، چنانچہ

مولانا اور نواب صاحب (شیفتہ) اور بعض اور احباب
مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات چیت کے بعد مولانا نے کہا
کہ اردو کے دو مطلع ہیں۔ ان میں آپ فرمائیے کہ
کون سا مطلع اچھا ہے اور بطور تمثیل کے اول نظیری
کے مطلع کا یہی اردو ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے
نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سن کر سر دھننے لگے اور
متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس
قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس
سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی، چنانچہ انہوں نے
اپنا مطلع نہیں پڑھا اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے
ہوئے وہاں سے اٹھے۔
آزردہ اور غالب میں اگر چند روز بھی ملاقات نہ
ہوتی تو بے چین رہتے۔ غالب آزاد مزاج، اور آزردہ
عالم دین اور بڑی حد تک مذہبی دایرے میں زندگی بسر
کرنے والے، لیکن رمضان کے مہینے میں بھی ملنے کے لیے غالب
کے مکان پر پہنچ جاتے۔ اس سلسلے میں ان کا لطیفہ مشہور
ہے۔ حالی لکھتے ہیں۔
"ایک دن جبکہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا۔
مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے۔
اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے
ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں
پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے
دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان
کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث
کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا "قبلہ!
حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں
شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔"
اردو کے خطوط میں کوئی خط غالب کا آزردہ کے
نام نہیں ملتا، لیکن پنج آہنگ میں فارسی میں چند خط آزردہ
کے نام بھی ہیں، اس کے علاوہ مرزا غالب نے آزردہ کی
شان میں ایک شاندار فارسی قصیدہ لکھا ہے جس میں
۵۴ اشعار ہیں۔ غالب بلاشبہ اپنے زمانے کے سب سے
بڑے شاعر تھے، اور اپنے تمام معاصرین پر فوقیت رکھتے،
لیکن ایک ذہین اور حسین آدمی کے لیے جگر لانے کا بھی
بالعموم رہتا ہے۔

بڑے آدمیوں کے خطوط ایڈیٹر "ہندستانی ادب" کے نام

جنید احمد

"گلستان"
گوکھلے نگر (پٹھان واڑی)
ملاڈ ایسٹ - بمبئی ۶۴

"قلم گفت کہ من شاہ جہانم"

"ہندستانی ادب" کے تبادلے میں کئی ایک میعاری ماہوار رسالے آتے ہیں - ہم ہر رسالے کا بغور مطالعہ کرتے ہیں - "صبح امید" بمبئی بھی ہمارے ہاں آتا ہے، اس رسالے میں جنید احمد کے مضامین اور خطوط ہم نے کئی بار دیکھے، مگر چونکہ نام کے ساتھ پتا نہیں ہوتا تھا، اس لیے ہم نے ان کے نام اپنا رسالا نہیں بھجوایا تھا، لیکن "صبح امید" کے تازا شمارے میں جنید احمد کا ایک خط چھپا تھا، چنانچہ نام کے ساتھ پورا پتا بھی موجود تھا، اس لیے ہم نے "ہندستانی ادب" کا جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۵ء کا ملا جلا نمبر ان کے نام بھجوا دیا - شروع ہی سے ہماری یہ عادت رہی ہے کہ اگر کسی نمبر کے کچھ پرچے بچ رہیں تو ہم ادیبوں اور شاعروں کے نام ضرور بھجوا دیتے ہیں، بشرطیکہ ان کے پتے مکمل اور پورے ہوں، ورنا اندیشا رہتا ہے کہ رسالا کسی کو نہ پہنچنے کی صورت میں ہمارا چار روپے کا نقصان ہوتا ہے، اور یہ نقصان کوئی بھی ایڈیٹر گوارا نہیں کر سکتا - ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ "ہندستانی ادب" کا چار روپے کا ایک نمبر پانچ پیسے پوسٹیج اسٹامپ کا خرچ برداشت کر کے کئی ایک حضرات کے نام بھجوایا تھا، مگر کسی نے بھی ملنے پندرا پیسے کے پوسٹ کارڈ کے ذریعے نہ رسالا پہنچنے کی اطلاع دی، اور نہ ہی ہمارا شکریا ادا کیا - ہمیں اگر یہ احساس ہوتا، اور اگر ہم کسی سے شکریے کی توقع رکھتے تو متعدد ناکامیوں کے بعد، ایک اور جانی پہچانی ناکامی کی طرف غلط قدم نہ اٹھاتے، یہی وہ ہمارا احساس برتری اور عالی ظرفی کا نیک اور مفید جذبا تھا، جس کے تحت ہم نے جنید احمد کو بھی اپنا رسالا بطور تحفا بھیجنے کی جرات کی تھی، اور دوسری طرف خود جنید احمد نے بھی پچیس پیسے خرچ کر کے دو صفحے کا خط ہمارے نام لکھ کر نہ صرف شکریا ادا کیا، بلکے اپنی شرافت و عالی ظرفی اور دریا دلی کا بھی ثبوت دیا، جس کے لیے ہم جنید احمد کے ممنون احسان ہیں -

تنقید بڑی ہی کڑی اور کھری کھری ہے، اور سراسر، بلکے سو فیصد ہمارے خلاف ہے، لیکن اس بیان کا ایک بھی لفظ کم کیے بغیر ہم نیچے پورے کا پورا خط شایع کیے دیتے ہیں -

اب آپ ہماری عالی ظرفی اور دریا دلی ملاحظا کیجیے کہ اس سے ناخوش ہو کر برا اثر لینے کی بجائے ہم بے حد خوش ہوئے، اور انہیں پوسٹ کارڈ کے ذریعے اطلاع دی کہ آپ کا خط پہنچا، شکریا، ہمیں T - B یا دق ہو گئی ہے، اس لیے (۲۴) گھنٹے سینے میں درد رہتا ہے، اس وقت بھی درد زیادا ہے - درد کم ہونے پر جواب دیں گے، تفصیلی خط کا انتظار کیجیے - ہمارے اس پوسٹ کارڈ کا انہوں نے ۷/ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ہمدرد الطاف پر ایک دوسرے خط کے ذریعے جواب دیا، یہ خط بھی جوں کا توں نیچے دیا جا رہا ہے - اس خط کے آخر میں بطور ذیل انہوں نے یہ لکھا کہ ہندستان کی جن شخصیات سے وہ متاثر ہوئے تھے، اس سلسلے میں ایک کتاب

…ایع کی تھی جس کو ہر شخص نے پسند کیا تھا۔ اب اس سلسلے کی دوسری کڑی شائع کرنا چاہتے ہیں۔ صاحب موصوف
…، بعض شخصیتوں کے نام گنائے ہیں، اور ہم سے بھی مطالبہ کیا ہے کہ ۲۵ - ۳۰ صفحے کا ایک مضمون ہم اپنے متعلق لکھ کر
…جوائیں، تاکہ وہ مضمون "شخصیات" کے دوسرے یعنی آنے والے ایڈیشن میں شائع کیا جائے۔ ان کے
…خط کا جواب ہم نے خط کے ذریعے تو نہیں دیا، بلکہ "ہندستانی ادب" کے پچھلے پانچ نمبر رجسٹرڈ بک
…سٹ کے ذریعے بھجوائے۔ ان میں جلد (۳۳) نمبر (۱-۲-۳) بابت اکتوبر- نومبر- دسمبر ۱۹۷۴ء کا
…از دار خان بزمی نمبر" بھی ہے۔ یہ نمبر ہم نے اپنے والد مرحوم راز دار خاں صاحب بزمیؔ کی یادگار کے طور پر
…کالا تھا۔ اس نمبر کے ابتدائی بیس صفحوں میں، ہم نے ناول "شہزادی کا رومان" کی پہلی قسط شائع
…تھی، اور اس معرکہ آرا ناول کو ہم نے راز دار خان بزمیؔ کے نام معنون یا DEDICATE کیا
…ا۔ اس نمبر میں ہم نے راز دار خاں صاحب کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ راز دار خاں صاحب کے
…۵ لڑکے تھے، جن میں، ہم یعنی جی۔ ام۔ خان، ایڈیٹر "ہندستانی ادب" چوتھے نمبر پر ہیں۔
…م سے بڑے تین بھائی تھے، اور ہم سے چھوٹے ایک بھائی تھے، جن کا وقفے وقفے سے انتقال ہوگیا،
…ور اب ہم صرف ایک باقی ہیں۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو اپنی عمر کے (۳۷) سال میں قدم رکھنے کے بعد
…ل چلا رہے ہیں۔ اس نمبر میں، ہم نے اپنے حالات تفصیلی طور پر تو نہیں، مگر مختصراً لکھے ہیں جو تقریباً
…۳۰) صفحے پر حاوی ہیں، اور جنید احمد قدیمی اتنے ہی صفحے کے حالات چاہتے تھے، اور اگر وہ اس سے بھی
…یادہ طویل اور تفصیلی حالات چاہتے ہیں تو ہم ان کی فرمائش وصول ہوتے ہی ایک سو سے بھی زیادہ صفحوں
…ر مشتمل اپنے حالات زندگی لکھ بھیجیں گے۔ یہ ان کی اپنی پسند کا سوال ہے، ہم ہر طرح سے ان کے حکم کی
…عمیل کرنے کے لیے تیار ہیں۔

ہمیں اپنے مرض کے بارے میں کوئی وہم وغیرہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ جنوری ۱۹۶۸ء
…یں پہلی بار ہمیں سینے میں درد زیادہ رہنے لگا تھا۔ حیدرآباد کے .T.B کے بڑے دواخانے میں X-RAY کروانے
…ر پتا چلا کہ بایاں شش خراب ہوگیا ہے، اس پر دھبے آگئے ہیں، اس لیے ہمیشہ سینے میں درد رہا کرتا ہے۔
…علاج باقاعدہ طور پر کروایا، اور روزانہ .T.B کے تین CAPSULES استعمال کرتے رہے، جب
…ک دوا لیتے رہے درد میں کمی رہی، اور جب دوا چھوڑ دی تو درد بڑھ گیا۔ اب تو ہم نے دوا بالکل ہی ترک
…ردی ہے۔ آجکل سینے کے درد کے علاوہ ہم ہارٹ ٹربل HEAT TROUBLE میں بھی مبتلا ہیں۔
…انچ ۷ دسمبر ۱۹۷۵ء کو تقریباً بارہ بجے دن ہم پر HERT ATTACK ہوگیا تھا، مرتے
…رتے بچ گئے، اس لیے اس مرض کا باقاعدہ علاج جاری ہے۔ ہمارے دل پر یہ دوسرا حملہ تھا، پہلا
…ملہ، عمر میں پہلی بار ۳۰ جنوری ۱۹۷۱ء کو سالار جنگ میوزیم لائبریری میں ہوا تھا۔ وقت تقریباً دو
…بجے کا ہوگا۔ ہم لائبریری میں بیٹھے انگریزی ناول ROMANCE OF A ZENANA کا ہندستانی
…زبان میں ترجمہ کر رہے تھے۔ پہلے ہمیں چکر سا آیا اور پھر ہمیں یہ محسوس ہوا کہ ہمارا دل بیٹھا جا رہا ہے، ہم
…نے چیخنا چلانا شروع کیا۔ فلاں صاحب آئیے، ہمارا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور فلاں صاحب دوڑیے ہم
…مرے جا رہے ہیں، ایسے میں ہم کرسی سے گر پڑے اور بے ہوش ہوگئے۔ لائبریرین نے ٹیکسی منگوائی اور
…وہاں کے دو ملازم حضرات کو ہمارے ساتھ دے کر عثمانیہ دواخانے بھجوایا۔ وہاں انجکشن دینے کے بعد ہمیں
…ہوش آیا، تو کچھ دیر بعد ہمارا CARDIOGRAM لیا گیا۔ اس کے بعد ہم سے کہا گیا کہ ہم دواخانے
…ہی میں رہیں، مگر ہم نے دواخانے میں شرکت سے انکار کر دیا، اور ان حضرات سے کہا کہ آپ ہمیں ہمارے
…گھر لے چلیے، ہم گھر پر رہتے ہوئے علاج کروائیں گے۔ وہ دونوں حضرات ہمیں اسی ٹیکسی میں اپنے گھر لے گئے۔
ہم نے انہیں ٹیکسی کا اور بازار سے خریدی ہوئی دواؤں کا پورا پورا خرچ دیا، اور دونوں حضرات کا

شکریہ ادا کیا۔ چند روز تک گھر ہی میں رہ کر ہم نے علاج کروایا تھا، صحت ہونے کے بعد پھر سے چلنے پھرنے لگے۔ اس دفعہ بھی دل کے دورے کی بالکل وہی شکل رہی تھی۔ چند روز تک گھر میں رہ کر علاج کروانے کے بعد ہم اپنے کام سے بس، رکشا یا آٹو میں باہر جایا آیا کرتے ہیں، لیکن پیدل چلتے وقت سینے میں شدید درد ہوتا ہے، اور صرف چند قدم چلنے کے بعد ہم مجبوراً رک جاتے ہیں، اور پھر سے چلتے اور پھر سے رک جاتے ہیں، یہ کوئی صحت کی علامت نہیں ہے، بلکہ جسم ناتواں میں مرض کی موجودگی، اور اس شدت کا بین ثبوت ہے۔ اس کا اصل سبب ہماری جسمانی کمزوری ہے۔ ہمارا قد صرف پانچ فٹ کا ہے، اور ہم اتنے دبلے پتلے ہیں کہ ہڈی چمڑی ایک ہے۔ جسم پر گوشت کی کمی کے سبب خون کی بھی کمی ہے، اور محض خون کی کمی ہی ان تمام امراض اور عوارض کا سبب بنی ہے۔ ایک طرف جنید احمد کا یہ کہنا ہے کہ ATOM اور SDACE کے ترقی یافتہ اور روشن دور میں T-B. کوئی خطرناک مرض نہیں، بلکہ اس مرض پر پورا پورا قابو پا لیا گیا ہے، اور دوسری طرف ہم نے ۴ دسمبر ۱۹۶۵ء کے انگریزی اخباروں میں یہ خبر پڑھی کہ ساری دنیا میں T-B. کے مرض سے سالانہ چار کروڑ آدمی مرتے ہیں، اور صرف ہندستان میں چالیس لاکھ آدمی اس مرض سے فوت ہوتے ہیں!

آیا اب بھی جنید احمد اپنی رائے پر قایم ہیں کہ T-B. کوئی خطرناک مرض نہیں، اور اس مرض پر قابو پا لیا گیا ہے؟ ہم موت سے ڈرتے نہیں، اور مرنے سے گھبراتے نہیں، اس لیے کہ ہم بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ ہر جاندار کا ایک نہ ایک روز بے جان ہونا لازمۂ فطرت ہے، چنانچہ شاعر نے اسی نظریے کو یوں بیان کیا ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

مگر ہمیں رہ رہ کر افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ بعض ہماری علمی تخلیقات اور بیش بہا مضامین منصۂ شہود پر نہیں آسکے ہیں، وہ ہمارے صندوق میں مخطوطات کی شکل میں دھرے کے دھرے رہ جائینگے، اور ہم T-B. کے موذی مرض سے یا ایک اور HEART TTACK کا شکار بن کر چل بسینگے۔ عرصۂ حیات کو لامتناہی سمجھنا آدمی کی فاش غلطی ہے، اور اس نادانی اور غلطی کو ایک اور شاعر نے یوں ظاہر کیا ہے ؎

کیا بھروسا ہے زندگانی کا آدمی بلبلا ہے پانی کا

یعنی بارش کے زمانے میں جب مسلسل بارش ہوتی ہے تو بلبلے مسلسل بنتے اور ساتھ ہی پھٹتے بھی ہیں، یعنی دیکھتے دیکھتے ہی بلبلا بنا بھی اور فوراً پھٹ بھی گیا، چنانچہ شاعر نے بلبلے کے عرصۂ حیات کو آدمی کی تنگیٔ حیات سے تعبیر کیا ہے، اور کہتا ہے کہ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اتنے سال جئیںگے اور ہمارا عرصۂ حیات اتنا طویل ہوگا، حقیقت میں وہ لوگ نادان ہیں، انہیں بہتر طریقے پر سمجھنا چاہیے کہ ان کی زندگی کا عرصۂ حیات بلبلے کی زندگی کے عرصۂ حیات سے کچھ زیادہ نہیں ہے، چنانچہ HEARTFAIL کی مثال اس پر پوری صادق آتی ہے، یعنی چلتے چلتے ہی آدمی گر پڑا اور مر گیا، کرسی پر بیٹھے ہی مر گیا، اور سوتے سوتے ہی مر گیا۔ اس کے بعد کیا جواب ہے ان لوگوں کا جو لا یعنی باتیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ہم سو سال جئیںگے، اور بعضوں کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم سو سال سے بھی زیادہ جئیںگے۔ اس مناسبت سے ہم اپنی زندگی سے بالکل ہی مایوس ہو گئے ہیں، اور بار بار ہمیں خیال آتا ہے کہ ہم نے قلم کے ذریعے اپنی دماغی صلاحیتوں کو مضامین، ڈراموں، اور انگریزی سے ہندستانی زبان میں بیش بہا پاروں کا جامہ پہنا دیا، مگر افسوس کہ ہماری قلمی کاوشیں کتابی شکل میں نہ آسکینگی۔ یوں تو ہمارے ترجمے پچاسوں ہی ہیں، مگر سب سے زیادہ شاہکار اور یادگار ترجمہ "شہزادی کا رومان" ہے۔ یہ ایک پانسو صفحے کے انگریزی ناول ROMANCE OF A ZENANA کا لاجواب، بے نظیر اور بے مثال ترجمہ ہے۔ یہ انگریزی ناول ایک انگریز جی-آرنلڈ فرنانڈز G. ARNOLD FERNANDIZ نے سنہ ۱۹۰۰ء میں لکھا تھا۔ اس ناول کو HOWE & CO. مدراس نے شایع کیا تھا۔ یہ ناول ہماری نظر سے گزرا اور ہم نے اس کو پڑھ ڈالا۔ ناول ہمیں بہت پسند آیا، چنانچہ پانسو صفحے کے اس پورے ناول کا ہم نے ہندستانی زبان

ی ترجما کر ڈالا، اور "ہندستانی ادب" میں مسلسل نو قسطوں میں یہ پورا ناول شایع کر دیا تھا - اس کے بعد اس
ہیے ہوے ناول کو پھر سے ہم نے کاتب سے لکھوایا - ⅛ کراون سائیز کے (۱۶۰) صفحے کا یہ لاجواب، بے مثال
رتاریخی یادگار ناول حال ہی میں چھپ چکا ہے - اس کی لکھائی چھپائی اچھی ہے، اور غلطیوں سے مبرا اور پاک
ماف ہے اس کا کاغذ چکنا یا GLAZED ہے - اس کا ٹائٹل ایک ہزار روپے ریم کا فارین
لا درجے کا دبیز یا موٹا آرٹ پیپر ہے - غالباً یہ شرف ناول "شہزادی کا رومان" ہی کو حاصل ہے کہ
یک کتاب کے ٹائٹل کے لیے اتنا بھاری اور قیمتی آرٹ پیپر استعمال کیا گیا ہے - ٹائٹل کے پہلے صفحے پر
صنف کے شاہکار کارناموں میں سے ایک حسین اور خوبصورت لڑکی کی تصویر دی گئی ہے - یہ تصویر بلیو کلر
یں بہت اچھی چھپی ہے - ٹائٹل کے پچھلے صفحے پر صرف انگریزی میں انگریزی ناول "رومانس آف اے
رنانا" کے مصنف جی - آر، لنڈ فرنانڈز کا نام ہے، اور اور اس کے بعد مترجم ناول، جی - ام -
خان، ام - اے - (عثمانیا) ایڈیٹر "ہندستانی ادب" اور سکریٹری انجمن ترقی ہندستانی کا
ام ہے - آخر میں ہمارے دفتر کا پتا سعادت ولا - 17 - 11 - 16 - سلیم نگر کالونی - ا - ملک پیٹ -
یدرآباد (۳۶) آندھرا پردیش - انڈیا ہے - بعض لوگوں نے ہم سے اعتراض کیا کہ عام طور پر پتے
ں انڈیا نہیں لکھا جاتا ہے، پھر آپ کیوں اپنے پتے میں غیر ضروری طور پر انڈیا کیوں لکھتے ہیں — ؟
ہم نے جواباً کہا کہ اعتراض کرنے والوں کے دماغ میں سمجھ اور سوجھ بوجھ کی کمی یا فقدان معلوم ہوتا ہے - ہمارا
رسالا "ہندستانی ادب" کبھی کبھار غیر ملکوں کو بھی جاتا ہے - اگر ہمارے پتے میں انڈیا نہ ہو تو وہ لوگ یہ بھی
ور کر سکتے ہیں کہ یہ رسالا حیدرآباد - سندھ (پاکستان) سے نکلتا ہے، اس لیے ہم اپنے پتے میں انڈیا
لکھ کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارا رسالا انڈیا، ہندستان کے حیدرآباد سے نکلتا ہے - اب آپ ہی انصاف سے
تایے کہ ہم اپنے پتے میں انڈیا لکھنے میں حق بجانب ہیں یا نہیں — ؟ اس ناول کے ٹائٹل پیج پر جو لاجواب
اور شاہکار تصویر ہے، وہی تصویر کتاب میں بھی موجود ہے، اور ہم نے وہ تصویر صفحات ۲۵ اور ۲۶ کے درمیان رکھوائی
ہے، اس لیے کہ صفحا ۲۵ پر اس ناول کا ہمارا مرکا آرا مقدما ختم ہوتا ہے، اور اس کے بعد صفحا (۲۶) سے
ناول "شہزادی کا رومان" کا قصا شروع ہوتا ہے، چنانچہ یہ جاذب نظر اور دلچسپ تصویر ناول کے بالکل مقابل
ہے ! — کتابیں عموماً (1/16) کراون سائیز پر لکھوائی جاتی ہیں، اگر ہم نے بھی یہ کتاب (1/16) سائیز پر لکھوائی
ہوتی تو یہ (۳۲۰) صفحے کی کتاب ہوتی، چونکے یہ ناول پہلے "ہندستانی ادب" میں چھپ چکا تھا، اور
اس رسالے کا سائیز (⅛) کراون ہے، اور چونکے جس کاتب نے "ہندستانی ادب" میں یہ ناول لکھا
تھا، اسی کاتب نے ناول "شہزادی کا رومان" بھی لکھا ہے، اس لیے ناول کے نقل کرنے میں آسانی اور
سہولت ہو گئی - (1/16) پر لکھوانے میں ہمیں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا - سب سے بڑھ کر دشواری
یہ مسطر کی تھی - یہ نیا مسطر کھنچوانا اور چھپوانا پڑتا - جب کبھی ہمیں مسطر کی ضرورت پڑتی ہے تو ہم اپنا
(۳۶) سطری مسطر کھنچوا کر آدھے ریم (۱۶) پونڈی پوسٹر پیپر پہ چھپواتے ہیں، اس لیے ہمیشا ہی چھپا ہوا
مسطر افراط سے پڑا رہتا ہے، چنانچے یہ ناول بھی "ہندستانی ادب" کے مسطر پر لکھا گیا، اور آیندا ہماری ہر کتاب
اسی مسطر پہ لکھوائی جا کر چھپا کرے گی -

اس کتاب کی قیمت پانچ روپے ہے، جو موجودا طوفانی بڑھتی گرانی کا لحاظ کرتے بہت کم ہے - ہم نے یہ
قیمت عمداً اور قصداً کم رکھی ہے، اس لیے کہ اس سے جلب منفعت یا فائدا مقصود نہیں ہے، مگر پوسٹ
کی شکل میں خریداروں کو چاہیے کہ سات روپے کا منی آرڈر کریں تا کے رجسٹرڈ بک پوسٹ کے ذریعے
بھجوائی جا سکے، اور یہ کتاب آرڈنری بک پوسٹ کے ذریعے ہرگز ہرگز نہیں بھجوائی جائے گی - پوسٹ کے
[illegible] اس لیے کہ [illegible]

ہمارا دوسرا لاجواب کارنامہ، ام-اے کا مقالا ہے۔ "خاجا میر درد دہلوی" پر یہ مقالا یا THESIS
ہم نے عثمانیا یونیورسٹی میں ام-اے کے امتحان کے لیے سنہ ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ مقالے کے سلسلے میں، ہر
طالب علم کے لیے ایک پروفیسر گائیڈ ہوتا تھا، اور ہمارے گائیڈ بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم)
صدر شعبۂ اردو، عثمانیا یونیورسٹی تھے۔ مولوی صاحب کی نگرانی میں، ہم نے خاجا میر درد سے متعلق بیچاسوں
ہی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ تذکرے بھی دیکھے اور تاریخیں بھی دیکھیں، اور ان کے حسب ہدایت نوٹس جمع کرنے
کے بعد خاجا میر درد کی حیات اور شاعری پر قلم چلایا۔ ہماری تحریریں، ہر وقت مولوی صاحب کی زیادتی
بھی کرتے تھے، اور اصلاحیں بھی دیتے تھے، اسی لیے ہمارا مقالا ایک لاجواب شکل اختیار کر گیا تھا، اور
مولوی صاحب ہی کے طفیل باہر کے دوسرے ممتحن نے بھی ہمارے مقالے کو بہت زیادا پسند کیا تھا، چنانچے
بحیثیت مجموعی اس مقالے میں بہت زیادا نمبر ملے تھے۔ اگر ہم کچھ اور عرصے تک زندا رہے تو شہزادی
کا رومان" کے فوراً بعد "خاجا میر درد دہلوی" کو بھی کتابی شکل دینگے۔ اس کے بعد ہماری دوسری کتابیں
سلسلے وار چھپینگی۔ ادب میں تنقید اور ڈراما ہمارے خاص موضوع ہیں۔ رسالوں اور کتابوں پر ہماری
معیاری تنقیدیں "ہندستانی ادب" کے پچھلے نمبروں میں بطور ثبوت دیکھی جا سکتی ہیں۔ ڈراما ہمارا
پسندیدا یا PET موضوع، جس سے ہمیں بچپن ہی سے دل چسپی رہی ہے۔ ہم نے مشہور انگریز
ڈراما نگار جی آرنلڈ بینٹ ARNOLD BENNET کے ایک ڈرامے کا آزاد
ترجما کر کے اپنایا تھا، اور اس کا نام ہم نے "مصور کا جنون" دیا تھا جس کو "ہندستانی ادب"
کے پچھلے نمبروں میں قسط وار چھپایا تھا۔ اس کے بعد ایک دوسرے انگریز ڈراما نگار جان گالسورذی
کے ایک ڈرامے کا آزاد ترجما کیا تھا۔ اس ڈرامے کا انگریزی نام STRIFE تھا جس
کو ہم نے موزوں ترین نام "محنت کا پھل" دیا ہے۔ یہ ڈراما چھپا نہیں، بلکے مخطوطے کی شکل میں
موجود ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس ڈرامے کی کتابی شکل اختیار کرنے تک ہم زندا اور باقی رہینگے۔
ہم نے تین اسکرین پلیز SCREENPLAYS بھی لکھے ہیں۔ ہمارا پہلا اسکرین پلے
"امیر علی ٹھگ" ہے۔ خدا آپ بھی بہتر طریقے پر جانتے ہونگے کہ انگریزی کتاب ———
EXPLIOTS OF A THUG - ایک انگریز کرنل میڈوز ———
COL. MEADOWS نے لکھی تھی، جس کا ترجما عبدالکریم نے کیا تھا۔ یہ کتاب ہمارے
کرم فرما نواب مہدی نواز جنگ بہادر مرحوم سابق گورنر گجرات نے پڑھنے کے لیے ہمیں دی تھی، پڑھنے کے بعد ہم
نے شکریے کے ساتھ واپس کرنی تو انہوں نے کہا کہ میرے گھر میں بےکار پڑی ہے، آپ ہی اپنے کتب خانے
میں رکھیے۔ ہم نے نواب صاحب کا کر شکریا ادا کیا، اور وہ کتاب اپنے پاس رکھ لی۔ ہم نے غور کیا کہ اس
کتاب کو تھوڑی سی کوشش میں ایک بہترین اسکرین پلے کی شکل میں بدلا جا سکتا ہے، چنانچے ہم نے اپنی
ڈرامائی دماغی صلاحیتوں سے کام لیا، اور پورے دسے کی بڑی کد و کاوش کے بعد ایک جاندار اور معنی خیز
اسکرین پلے کی شکل میں بدل دیا، یعنی اس کا منظر نامہ یا SCENARIOS بھی ہم نے لکھے، اور
ساتھ آسان اور مختصر مکالمے یا SHORTADSNEET DIALOGUES لکھے۔
اس کے بعد ہمارا دوسرا اسکرین پلے "امام جہالت" ہے۔ یہ خیال یا IDEA ہم نے عبدالحلیم شرر
کے ناول "ایام عرب" سے لیا ہے۔ اس کا بھی منظر نامہ اور مکالمے خود ہم نے لکھے ہیں۔ یہ ایک بڑی ہی
دل چسپ عشقیا داستان ہے، جو COMEDY پر ختم ہوتی ہے۔
ہمارا تیسرا اسکرین پلے "پرتھال" ہے۔ پرتھال ہیروئین کا نام ہے۔ یہ قصا ہم نے جنوبی ہندستان کی
قدیم تاریخ سے لیا ہے۔ اس کا بھی منظر نامہ اور مکالمے خود ہم نے لکھے ہیں۔ اس کا اختتام بھی COMEDY

پر ہوتا ہے۔ ان تینوں اسکرین پلیز سے متعلق ہم نے انگریزی میں ایک خط لکھ کر ۱۹۶۲ء میں چھپوایا تھا۔ ہندستان کے خصوصاً بمبئی کے تمام فلمی ڈایرکٹر اور پروڈیوسروں کے پاس بھجوایا تھا، اس کے بعد جیسے جیسے ہمیں نئے پتے ملتے گئے، ان سب کے پاس ہم نے یہ خط بھجوایا تھا، تقریباً چار سو خطوط ہم نے پوسٹ کے ذریعے بھجوائے تھے، مگر سخت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ چار سو میں سے ایک بھی ڈایرکٹر یا پروڈیوسر نے ہمارے خط کا جواب نہیں دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فلمی ڈایرکٹر اور پروڈیوسر بڑے ہی بدماغ ہوتے ہیں، جن جن میں خاجا احمد عباس بمبئی والا بھی شامل ہے۔ اس پرلے درجے کے بدماغ اور بدتمیز نے ہمارے شخصی خط کا تک جواب نہیں دیا۔ اس خرمغز سے اور گوز شتر سے ہمارے شخصی تعلقات اس طرح تھے کہ ہم ۳۵-۱۹۳۴ء میں ایم۔ اے فائنیل کے طالب علم اور صدر انجمن اتحاد طلباء جامعۂ عثمانیہ یعنی PRESIDENT OF THE STUDENTS UNION OSMANIA UNIVERSITY تھے۔ ہمارے دور صدارت میں یو۔ پی۔ ڈبیٹنگ ٹیم آئی تھی۔ ایک راو صاحب الہ باد یونیورسٹی کے نمایندے تھے، اور دوسرے راو صاحب لکھنو یونیورسٹی کے نمایندے تھے، اور یہ بدماغ اور نامرتبے "گوشت" عباس علی گڑھ یونیورسٹی کی نمایندگی کر رہا تھا۔ یہ ٹیم ایک ہفتے تک حیدرآباد میں رہی، اور صدر انجمن کی حیثیت سے اس ٹیم کی دیکھ بھال اور سارے انتظامات ہمارے سپرد تھے۔ ہمارے فراخدلانہ اور مخلصانہ انتظامات سے ٹیم کے تینوں ممبر خوش تھے، اور جاتے وقت نامپلی اسٹیشن پر ہمارا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دسمبر ۱۹۳۴ء ہم (۳۰) طلبا کے ساتھ شمالی ہندستان کے تعلیمی دورے پر روانا ہوے۔ ہم نے اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی سے کر دی تھی، اس وقت "مضغے گوشت" عباس بھی ایم۔ اے فائنیل کا طالب علم اور غالباً انجمن کا صدر بھی تھا۔ علی گڑھ میں ہم صرف ایک روز رہے۔ دن بھر وہ ہماری خدمت میں معروف رہا، اور ہماری جماعت کو رخصت کرنے اور طالب علموں کے ساتھ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن بھی آیا تھا۔ اس کے بعد سے پھر کبھی ہماری اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں ہم بمبئی گئے تھے حیدرآباد لاج میں سولا روز تک ٹھیرے تھے کئی ایک ڈایرکٹروں اور پروڈیوسروں سے ملنے کی کوشش کی، مگر کسی سے بھی ملاقات نہ ہوئی۔ اسی زمانے میں ہم بدماغ عباس کے گھر بھی گئے تھے۔ اس کے فلیٹ میں ایک بڑے حضرت بیٹھے ہوے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عباس لکھنو گیا ہے۔ ہم اپنا وزیٹنگ کارڈ ان کے ہات میں تھماتے ہوے واپس چلے آے۔ اس کے بعد ہم نے وقفے وقفے سے "ہندستانی ادب" کے کئی ایک نمبر عباس کے نام بھجوائے، مگر اس خردماغ نے ایک بار بھی ہمارا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اس کے باوجود آج سے چند سال پہلے ہم نے عباس کے نام ایک جوابی پوسٹ کارڈ بھجوایا تھا کہ ہم نے ایک فلمی رسالے سے آپ کا یہ پتا حاصل کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ بھی صحیح ہے، اور میرے مکان کا پتا یہ ہے لکھتے ہوے اس پر ربراسٹامپ کی چھاپ لگا دی تھی، چنانچے ہم نے ہندستانی زبان میں کئی صفحے کا ایک طویل خط لکھا تھا جس میں ہماری اس کی ملاقات کی وہ تمام داستان دہرائی تھی جو اوپر بیان کی گئی ہے، اور ہمارا چھپا ہوا انگریزی خط بھی اس کے ساتھ پوسٹ کے ذریعے روانا کر دیا تھا، جس کو آج کئی سال گزر گئے، مگر اس خرمغز نے آج تک بھی ہمارے خط کا جواب نہیں دیا۔ خدا آپ ہی انصاف سے کہیے کہ ہم، عباس کو بدماغ۔ بدتمیز۔ بدسلیقا اور خرمغز انیز مزے اور مضغے گوشت کہنے میں حق بجانب ہیں یا نہیں ——؟

ہم بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ عباس" کون ہے اور کیا ہے۔" آجکل اس کا طوطی بول رہا ہے، لیکن ایک مانے ہوے ادیب، شہیر اور سب سے بڑھکر "صاحب طرز انشا پرداز" کی حیثیت سے ہم اس سے کچھ کم نہیں ہیں!

اور سا۱۹۶۱ سے گئے تو اسکرین پلیز کے بعد ہم چوتھا اسکرین پلے "شہزادی کا ارمان" سے متعلق "لکھ

کے نام سے کہینگے، اس لیے کہ ۵ رحرم ہی کو شہزادی نے "لنگر" ہی میں افضل خان کو دیکھا تھا، اور اس کے حسن لاجواب سے متاثر ہوکر اس کو اپنا دل دے دیا تھا، گویا "لنگر" ہی سے رومان یا عشق شروع ہوا تھا اس لیے اس اسکرین پلے کا نام "لنگر" ہی زیادہ موزوں اور مناسب ہے - یہ اسکرپٹ انتہائی دل چسپ ہوگا، اس لیے کہ اس میں ہر ہر قدم پر رومان کوٹ کوٹ کر بھرا پڑا ہے، اور اس قصے یا کہانی میں شروع سے آخر تک دل چسپی باقی رہتی ہے - یہ ناول انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کی حیدرآبادی تہذیب اور کلچر کا بہترین نمونہ ہے - یہ تہذیب حیدرآباد میں قطب شاہی دور سے بنتی اور سنورتی چلی آرہی تھی، اور نظامان دکن کے دور میں اپنے عروج کو پہنچ گئی تھی - یہاں کے رہن سہن کے طریقے، کھانے پینے میں دستر خوان کا سلیقہ، اور دعوتوں میں شاہانہ ٹھاٹ سب نمونے زبان زد عام تھے - حیدرآباد کی شیروانی اور بریانی کے سارے غیر منقسم ہندستان میں ڈنکے بجتے تھے، اور چرچے ہوتے تھے -

ہمارا یہ دعوا بالکل صحیح اور سو فیصد حقیقت پر مبنی ہے کہ اس ناول میں ہم نے جان بھر دی ہے، اور کافی سے زیادہ دل چسپی پیدا کی ہے - مثال کے طور پر فرنانڈز نے صرف اس گرانڈ اٹ ہوم کا ذکر کیا ہے، جو آسمان جاہ نے اپنی لڑکی رحیم النسا کی صحت یابی پر دیا تھا، مگر ہم نے شادی کے بعد کی پر لطف اور شاندار دعوتوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو شادی کے بعد آسمان جاہ نے اور افضل خان کے باپ میر علی خان نے دی تھیں - فرنانڈز نے یہ لکھا ہے کہ جب کبھی کوئی بڑا آدمی آسمان جاہ سے ملنے آتا تو نواب صاحب اپنے ملازموں کو کافی لے آنے کا حکم دیتے تھے - آسمان جاہ کی شخصیت کا لحاظ کرتے ہوئے ہم نے اپنے طور پر یہ بیان کیا ہے کہ کافی ضروری لوازمات کے ساتھ اعلا درجے کی کشتیوں میں کس طرح سے لائی جاتی تھی، اور کس طریقے پر S E R V E کی جاتی تھی - فرنانڈز نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب آسمان جاہ کے گھر موتیوں کی مالا کی چوری ہوئی، اور چور پکڑا گیا تو کوتوال شہر اور دوسرے متعلقہ عہدے دار وقتے وقتے سے آسمان جاہ سے ملنے کے لیے دیوڑھی آیا کرتے تھے، مگر ہم نے اس کا صحیح صحیح خاکہ کھینچا ہے کہ جب کوتوال شہر اور دوسرے بڑے عہدے دار آسمان جاہ سے ملنے آتے تھے تو کس طرح ملتے تھے - آسمان جاہ کی اجازت سے جب ان کے سامنے آکر کھڑے ہوتے تو پہلے جھک کر آداب بجالاتے، اور آسمان جاہ کے کہنے سے صوفے یا کرسی پر بیٹھ جاتے، اور دست بستہ یا ہاتھ جوڑ کر واقعات بیان کرتے، اور کسی وقت بھی کرسی یا صوفے کو ٹیکا دے کر نہیں بیٹھتے تھے -

اس ناول کو جاندار اور رنگین، نیز دل چسپ بنانے میں ہمارا زبردست ہاتھ رہا ہے، وہ یہ کہ فرنانڈز نے شادی نہیں بیان کی تھی - افضل خان اور رحیم النسا کی شادی ہماری جدت دماغ اور زور قلم کا نتیجہ ہے - فرنانڈز نے صرف یہ بیان کیا ہے کہ رحیم النسا کی صحت یابی پر آسمان جاہ نے ایک گرانڈ اٹ ہوم دیا، جس میں حیدرآباد اور سکندرآباد کے بڑے عہدیدار اور مشہور لوگ شریک تھے، یہاں تک کہ ریذیڈنٹ حیدرآباد اور خود حضور نظام بھی موجود تھے - اٹ ہوم کے دوران آتش بازی ہو رہی تھی - اس آتش بازی کا ایک جلتا ہوا حصہ اڑ کر زنانہ محل میں جاگرا - وہاں پر ریشمی پردے اور دوسرے کپڑے وغیرہ موجود تھے، ان کو آگ لگ گئی، اور آگ تیزی سے پھیلتی گئی - زنانے میں چیخ پکار اور بھگدڑ سی مچ گئی - تمام عورتیں وہاں سے بھاگ نکلیں، مگر رحیم النسا اسی مقام پر بری طرح سے پھنس گئی تھی - یہ صورت حال دیکھ کر آسمان جاہ نے روتے ہوئے اور بلبلاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر مجمع سے کہا، ارے کوئی ہے میری لڑکی کو بچانے والا، یہ سنکر افضل خان سامنے آیا اور یہ کہا کہ ہاں میں آپ کی لڑکی کو بچا سکتا ہوں، یہ کہتے ہوئے بے تحاشا دوڑ کر [illegible] پر گیا، اور آگ کے شعلوں اور لپٹوں سے لڑتا ہوا اور مقابلہ کرتے ہوئے محل کے اس حصے میں پہنچا، جہاں رحیم النسا دھویں اور خوف سے بے ہوش ہو گئی تھی - افضل خان نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کو اٹھایا، اور پھر شعلوں کا مقابلہ کرتے

ے باہر آن کر آسمان جاہ کے سامنے کھڑا ہوگیا، اور یہ کہنے لگا، لیجیے یہ رہی آپ کی لڑکی، میں نے اس جان بچائی ہے۔ ایسے میں سکندرآباد کا آسمان جاہ کا فوجی کرنل دوست سامنے آکر انگریزی میں سمان جاہ سے کہتا ہے، ول نواب صاحب! افضل خان نے حقیقت میں آپ کی لڑکی کی جان بچائی ہے، س لیے یہ لڑکی اب افضل خان کی بیوی ہو گئی۔ ایسے میں رحیم النسا بے ہوشی کے عالم سے ہوش آتی ہے، اور آنکھیں کھول کر دیکھتی ہے کہ اس کا چہیتا افضل خان موجود ہے، تو مارے خوشی کے وہ چینی کے ساتھ ہزاروں کے مجمع کے سامنے افضل خان کا بوسا لیتی ہے، اس کے بعد خود افضل خان بار بار رحیم النسا کا بوسا لیتا ہے۔ اس کے بعد پھر سے کرنل آسمان جاہ سے کہتا ہے، ول نواب صاحب! اب یہ لڑکی افضل خان کی بیوی ہو گئی، اور نواب صاحب سن کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ خلاقی بد تمیزی کا یہ بدترین مظاہرا صرف ایک کثیر مجمع کے سامنے ہو رہا ہے، بلکہ اس میں رزیڈنٹ یدرآباد اور لڑکی کے سگے ماموں حضور نظام میر محبوب علی خان بھی کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں، چونکہ عمل ہندستانی تہذیب اور معاشرت کے سراسر منافی ہے، اس لیے ہم نے اٹ ہوم کے آگے کے قصے کو نظر انداز کر دیا۔ اٹ ہوم ہنسی خوشی کے ساتھ ختم ہوا۔ چونکہ آسمان جاہ اپنی لڑکی کے عشق داستان سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے، اور چونکہ افضل خان بے گناہ اور بے قصور آدمی ثابت ہوا تھا، اس لیے جیل سے رہا کر دیا گیا، اور چونکہ افضل خان کے باپ میر علی خان کے اور آسمان جاہ کے قدیمانا گہرے تعلقات تھے، اور یہ کہ میر علی خان خود بھی جاگیردار اور منصبدار اور پھر یہ کہ افضل خان ایک عالا تعلیم یافتا، لندن پلٹ خوبصورت اور حسین و جمیل نوجوان تھا، اس لیے میر علی خان نے یہ جرأت کی کہ نواب آسمان جاہ بہادر کے پاس خود ہی اپنے لائق اور قابل بیٹے کا پیام لے کر گئے، اور انہیں متعلقہ اسباب و علل کی بنا پر آسمان جاہ نے اس پیام کو قبول کیا، اور حضور نظام کی راضی مرضی کے بعد میر علی خان کو اثبات میں جواب دیا۔ اس کے بعد شادی کی تاریخ کو حضور نظام کے مشورے اور منظوری سے قرار پائی، اور یہ شادی خانہ آبادی دونوں طرف سے بڑے زور و شور اور دھوم دھام سے رچائی گئی۔ "ہندستانی ادب" کی نویں قسط میں ہم نے اس ناول کو یہ لکھ کر ختم کیا تھا کہ دونوں نے دھوم دھام کی شادی رچائی۔ اس رسالے سے پورا ناول نے کتابی شکل میں نقل کروایا اور یہ ناول کتاب کے صفحہ (۱۵۳) پر آکر ختم ہوگیا۔ ہم چاہتے تھے کتاب کم سے کم (۱۶۰) صفحے کی ہو، اور کاتب نے بھی ہم سے یہی فرمائش کی، چنانچہ انہیں کی فرمائش پر ہم نے پھر سے قلم چلایا، اور مزید سات صفحے کے لیے اپنے دماغ اور زور قلم سے بلکل نیا اور اچھوتا مضمون ذکر شادی کے روز آسمان جاہ کی طرف سے شاندار دعوت، دوسرے روز چوتھی کی تقریب، اور تیسرے روز میر علی خان کے گھر ولیمے کی شاندار دعوت، جس کے لاجواب اور قابل تعریف انتظامات کو دیکھ کر خود آسمان جاہ بول اٹھے کہ یہ انتظامات تو بڑے ہی شاندار ہیں۔ سات صفحے کا یہ [illegible] ور ہم نے اپنے زور قلم سے ملایا ہے۔ شادی کے پورے واقعے کو سلسلے وار بیان کرتے ہوئے کچھ ایسا ربط پیدا کیا ہے کہ حقیقت میں جوڑ، جوڑ نہیں معلوم ہوتا، حالانکہ واقعتاً اس ناول میں جوڑ موجود ہے۔ ہم نے اس جوڑ کا ذکر کتاب کے "پیش لفظ" میں عمداً اور قصداً نہیں کیا ہے، اور اس نوبت پر خاص طور پر اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو ہمارے زور قلم کا کچھ نہ کچھ بھی اندازا ہو جائے کہ یہ قلم چاہے تو سات سے آگے سات صفحے تک کا جوڑ لا سکتا ہے، جو حقیقت کے آئینے میں بجا طور پر تعریف و ستائش کا مستحق ہو سکتا ہے!

"لنگر" اسکرین پلے کے علاوہ ہم ایک رنگین تاریخی شخصیت "ابوالحسن تانا شا" پر بھی [illegible]

انداز میں اسکرین پلے لکھ سکتے ہیں۔ ابوالحسن قطب شاہی سلاطین میں، گولکنڈے کا آخری بادشاہ تھا۔ یہ بڑا ہی عیاش اور رنگین مزاج بادشاہ تھا۔ اس پر کئی ایک کتابیں لکھی گئی ہیں، ہم انہیں تاریخی کتابوں کے حوالے سے اور ان کی روشنی میں اپنا نیا اسکرین پلے لکھینگے۔

اس کے علاوہ، ہمارے ذہن میں ایک اور اسکرین پلے کا خاکا ہے، اور وہ اسکرین پلے ہے - "شاہ صاحب"، یہ بھی بڑا ہی دل چسپ اور سبق آموز قصہ ہے۔ یہ افسانا کسی اور صاحب کا ہے، جو ہم نے "ہندستانی ادب" کے کسی ایک نمبر میں شایع کیا تھا، اس کا تراشا ہمارے ہاں موجود ہے، اور اس کو سامنے رکھ کر یہ غیر معمولی طور پر دل چسپ اسکرین پلے بھی خود ہم ہی لکھینگے۔ اس قصے اور واقعے پر حافظ شیرازی کے نیچے کے دو شعر پورے اترتے ہیں ؎

واعظاں جلوہ بر محراب و منبر میکنند
چوں بہ خلوت میروند آں کار دیگر میکنند

دوسرا شعر یہ ہے ؎

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے
دام تزویر مکن چوں دیگراں قرآں را

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسکرین پلیز لکھیں تو کیوں لکھیں، ہمارے ان کارناموں کو دیکھے گا کون - ؟ ہندستان کے تمام پروڈیوسرس اور ڈائرکٹرس تو مانے ہوئے پرلے درجے کے بد دماغ ہیں، اور اس حقیقت کا خاکا ہم نے اوپر کھینچا ہے کہ اس سلسلے میں ہماری سب تدبیریں چوپٹ اور الٹی ہو کر رہ گئیں، اور آیندا بھی ہماری ان کوششوں کا یہی حشر ہو کر رہے گا:

ہماری صحت دن بدن گرتی چلی جا رہی ہے، دوسرے معنی میں ہماری صحت کا ناس ہو گیا ہے۔ ہمیں زیادا عرصے تک جینے اور زندا رہنے کی توقع اور آس قطعی نہیں ہے - اس وقت ہم اپنی عمر کے (۷۳) ویں سال میں ہیں۔ عمر اور بدترین صحت کا لحاظ کرتے غالب کا یہ شعر ہم پر پورا اترتا ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ہم نے اس شعر کو یوں اپنایا ہے ؎

مضمحل ہو گئے قویٰ تبا - ام
اب عناصر میں اعتدال کہاں

ہماری زندگی کی ٹمٹماتی شمع نہ معلوم کس آن اور کس گھڑی گل ہو جائے، اس لیے ہماری یہ دلی آرزو اور خواہش ہے کہ مسلسل (۳۶) سالا علمی ادبی خدمات کے نتیجے کے طور پر، دنیائے ادب میں، بطور دائمی یادگار کچھ چھوڑ جائیں - ہم نے پولیس ایکشن سے پہلے دو کتابیں لکھیں تھیں (۱) دمنی (۲) کرنل کے ناجدار، اب ہم نے اپنی تیسری کتاب بھی ساری دنیا کے سامنے پیش کر دی ہے، اور کتاب ہے نام "شہزادی کا رومان" ہمیں یقین ہے کہ ہمارا یہ ادبی شاہکار اور یادگار کارنامہ، ایک زمانے سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے گا۔ مرنے سے پہلے ہماری یہ دلی آرزو اور تمنا ہے کہ اپنے ام - اے کے لاجواب اور بے مثال مقالے "خواجہ میر درد دہلوی" کو کتابی شکل میں بطور یادگار چھپوا جائیں! اس کے بعد ہم اپنے اسٹیج کے ڈراموں اور اسکرین پلیز وغیرا کو کتابی شکل میں چھپوا ئینگے۔ اگر صحت اجازت دے اور زندگی ہمارے ساتھ دغا نہ کرے، بلکے وفا کرے تو آگے چل کر "انجمن ترقی ہندستانی" کی سرپرستی میں "ہندستانی ادب" کے (۳۶) سالا علمی ادبی یادگار کارناموں کا کتابی شکل میں چھپوائینگے اور اس کا یہ سلسلا شروع ہو گا - (۱) ہندستانی ادب کے اداریے -

(۲) "ہندستانی ادب" کے مضامین (۳) "ہندستانی ادب" کے افسانے (۴) "ہندستانی ادب"
کے ڈرامے (۵) "ہندستانی ادب" کی تنقیدات اور تبصرے (۶) "ہندستانی ادب" کی نظمیں (۷)
"ہندستانی ادب" کی غزلیں - رباعیات اور قطعات - یہ سودا ہمارے سر میں سمایا ہوا ہے، جس کو ہم
منصۂ شہود پر لانے کے لیے ماہی بے آب کی طرح بے چین ہیں، مگر دیکھیں یہ سب کام کرنے کے قابل
بنتے بھی ہیں یا نہیں، اس لیے کہ بقول غالب ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اور ہمیں ؎

ضعف نے جی - ام - نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

آپ نے اپنے ۷ر دسمبر ۱۹۷۵ء کے خط میں لکھا ہے کہ آپ سنہ ۱۹۵۸ء میں ہندستان کی جن شخصیتوں
سے متاثر ہوئے تھے، ان سے متعلق ایک کتاب شایع کی تھی جو بہت پسند کی گئی، اور اب آپ بوجود
شکل میں جن شخصیات سے متاثر ہوئے ہیں، ان میں حمید سلطان - میکش اکبرآبادی - ڈاکٹر
گیان چند جین - اعجاز یا کر بلائی - کے - ام - منشی، اور افقر موہانی وارثی ہیں، جن سے متعلق
مضامین وصول ہو چکے ہیں، اور ہم سے متاثر ہوئے بغیر آپ نے ہمارے شخصی حالات اور واقعات
کے بارے میں پچیس تیس صفحے کا مضمون مانگا ہے، مگر عرض خدمت یہ ہے کہ خود آپ کی شخصیت
نے ہمیں اس بری طرح سے متاثر کیا ہے کہ ہم نے آپ کے بھیجے دیے گئے یا بھیجوں خطوط کے جواب
میں پورے (۱۰۰) ایک سو صفحے کا سرکارا خط لکھ مارا ہے، جو آپ کو رجسٹرڈ پوسٹ کے
ذریعے عرصا پہلے روانا کیا جا چکا ہے، اور اب انہیں خطوط کا یہ دوسرا جواب بلکل دوسری شکل میں
ایک اچھوتے اور نرالے ڈھنگ پر ہے - یہ جواب بھی ہمارے ہات سے لکھے ہوئے (۳۱) ویں
پر پہنچ گیا ہے، ہم کہہ نہیں سکتے کہ کس صفحے پر جا کر ختم ہوگا - اب آپ ہی انصاف سے فرمایے کہ ہماری
شخصیت نے آپ کو متاثر کیا ہے یا آپ کی شخصیت نے ہمیں بھوت کی طرح متاثر کر دیا ہے، لایے اسی بات
پر دو ایک سو صفحے کا مضمون اپنے حالات اور واقعات کے بارے میں لکھ کر فوراً رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے
روانا کر دیجیے، تا کے آپ کی عظیم تر شخصیت کی لائیف اسکیچ "ہندستانی ادب" کے کسی آیندہ
نمبر میں شایع کیا جا سکے! آپ کے نام ہمارا ایک سو صفحے کا جواب کوئی ریکارڈ نہیں ہے، بلکے جو
سنہ ۱۹۷۰ء میں ہم نے اسداللہ سعید، ڈائرکٹر آف سٹیلمنٹس اینڈ لینڈ ریکارڈز، گورنمنٹ
آف آندھرا پردیش، حیدراباد کے نام پورے (۲۰۰) صفحے کا خط لکھا تھا، یہ خط طنزیا انداز
میں ہے - اس میں ہمارا لائیف اسکیچ بھی ہے، اور دو سروں پر طنز اور HIT بھی ہے - آپ
ہم سے صرف (۲۵ - ۳۰) صفحے کا مضمون چاہتے تھے، ہیجے آپ کو لکھا تھا، اور بلکل ہی تیار (۲۰۰)
صفحے کا ہمارا لائیف اسکیچ مل گیا، ڈائرکٹر سٹلمنٹ کو خط لکھ کر رجسٹرڈ پوسٹ کے ذریعے فوراً منگوالیے
اور اس کو یہ وصلۂ اول، یعنی اپنی پہلی فرصت میں کتابی شکل میں چھاپ دیجیے، اس لیے کہ ہم پر مقالہ
آج تک کوئی کتاب نہیں چھپی ہے - ہمارے علمی ادبی کارنامے اتنے ہیں کہ ان پر M.A. اور D.
مقالہ یا THESIS لکھا جا سکتا ہے - ہم اس وقت نام گنانا نہیں چاہتے تھے، اگر یہ ضرور لکھیے
ہندستانی ادبیات کی بعض شخصیتوں پر M.A. اور Ph.D. کے مقالے بار بار لکھوائے جا رہے
ہیں حالانکے ان میں سے بعض شخصیتیں ایسی ہیں کہ جن کے علمی ادبی کارنامے ایسے اور اس قابل
کہ ان پر M.A. اور Ph.D. کے مقالے یا THESIS لکھے جائیں - جب
ہم یہ سنتے ہیں یا اخبار وغیرہ میں یہ خبر دیکھتے ہیں کہ فلاں یونیورسٹی نے فلاں شخص کی شخصیت

M.A - یا - Ph.D کا مقالہ لکھنے کی فلاں شخص کو اجازت دی ہے یا اس شخص پر اس شخص نے مقالہ لکھا ہے، اور اس کے اس کارنامے پر فلاں یونیورسٹی نے فلاں شخص کو M.A - یا - Ph.D کی ڈگری عطا کی ہے۔ گویا ایک ہی شخصیت پر مختلف یونیورسٹیوں سے مختلف اشخاص سے بار بار مقالے لکھوانا اس شخصیت کے نام کو بطور "تبرک" استعمال کرنے کے مصداق ہے، اور ظاہر ہے کہ تبرک تو تبرک ہی ہوتا ہے، جس کی کوئی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں ہوتی، اس لیے "تبرک" لکھوائے گئے مقالے حقیقت میں کوئی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں رکھتے، چنانچہ ایسے ہی پروفیسروں اور طالب علموں پر سعدی کا یہ شعر بالکل اور سو فیصد پورا اترتا ہے ؎

گر ہمیں مکتب است ہمیں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

یہ تو آپ، ہم سب ہی جانتے ہیں کہ آجکل تعلیم کا معیار گرتا جا رہا ہے، اور ناقص سے ناقص تر ہوتا چلا جا رہا ہے، جس کی شکایت آئے دن اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں۔ اسٹیٹ پبلک سروس کمیشن اور یونین پبلک سروس کمیشن میں گریجویٹس طلبا جو غلط، ناقص، اور مضحکہ خیز جوابات دیتے ہیں، اس سے ان کی ناقص تعلیم کا صحیح صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ اس نوبت پر ہم اس کی تفصیل کیا گنائیں، اس سے ہر شخص ہی بہتر طریقے پر واقف ہے۔

آپ بھیلکے کر جی۔ ایم۔ خان تو "انانیت" کا شکار بن گیا ہے، اور بار بار "انا" کا نعرا لگا رہا ہے۔ جب دوسرے لوگ کسی کی شخصیت، ادبیت اور علمیت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں تو مجبوراً اپنی ذاتی اور حقیقی شخصیت اور اہمیت کو منوانے کے لیے "انا" کا نعرا لگانا اور "انانیت" کا اظہار کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہماری طرح کئی ایک شخصوں نے کھلے طور پر "انا" کا نعرا لگایا ہے، چنانچہ میر کہتا ہے ؎

نہ ہوا، پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
گرچہ اس رنگ میں یاروں نے بہت سر مارا

کیا کہتا ہے میر یعنی وہ کھلے طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ میر کا اپنا ایک خاص انداز ہے، اس خاص انداز اور رنگ میں دوسرے شاعروں نے لکھنے یا شعر کہنے کی کوشش کی، مگر اس میں انہیں کامیابی نہ ہوئی، اس لیے کہ میر کا وہ اپنا خاص رنگ ہے، جس کی تقلید کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکتا۔ آیا میر کے اس دعوے سے احساس برتری اور "انانیت" کا اظہار ہوتا ہے یا نہیں؟ برابر ہوتا ہے، اور میر نے اپنی شاعرانہ جداگانہ شخصیت اور اپنے خاص رنگ کا جو دعویٰ کیا ہے، وہ بالکل صحیح، بجا، اور درست ہے! غالب بھی "انانیت" کا شکار تھا، اور اپنے کلام میں موقع موقع سے اس نے اپنی جداگانہ شخصیت کا اظہار کیا ہے، مثال کے طور پر ہم غالب کا یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

جس کو دعوائے سخن ہو یہ سنا دو اس کو
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

ظفر کے بیٹے، جواں بخت کی شادی کے موقع پر متعدد شاعروں نے سہرے لکھے تھے، جن میں ذوق اور غالب دو بڑے شاعر تھے۔ ذوق ظفر کے استاد تھے، اس لیے ظفر ذوق کو چاہتے بھی تھے، اور ان کی قدر و منزلت بھی غالب سے کہیں زیادہ کرتے تھے۔ غالب اپنے کلام کے ذریعے بادشاہ کی نظروں میں ذوق کی سی طرح برابری کا مقام اور درجہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بادشاہ ظفر کے بیٹے، جواں بخت کی شادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے غالب نے واقعی ایک لاجواب، بے مثال، بے نظیر اور معرکۃ الآرا سہرا لکھا۔ عقد کے موقع پر جہاں متعدد شاعروں نے سہرے پڑھے، ذوق اور غالب نے بھی اپنا اپنا سہرا پڑھا، جس کو شہنشاہ ظفر اور دوسروں نے بھی بہت پسند کیا، مگر حقیقت میں غالب کا سہرا بقول شخصے "چیزے دیگر است" کے مصداق تھا، جس کا ایک معرکۃ الآرا شعر یہ ہے ؎

جن کو دعوائے سخن ہو یہ سنا دو ان کو
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

یہ راست چوٹ تھی ذوق پر۔ شادی کی تقاریب کے ختم ہونے بعد ایک روز ذوق نے تنہائی میں ظفر سے کہا کہ حضور والا، غور فرمایا آپ نے کہ غالب نے اپنے اس شعر میں بادشاہ عالم پناہ کے استاد ذوق پر راست چوٹ کی ہے، جو حقیقت میں حضور والا کے لیے غور طلب ہے؟ ظفر نے بھی اس شعر کی معنویت پر غور کیا، اور اس کو قابل اعتراض قرار دیتے ہوئے غالب پر اپنا عتاب نازل کیا، اور وہ عتاب یہ تھا کہ ڈیوڑھی میں غالب کا آنا بند کر دیا، اور دربار سے غالب کے نام پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر تھی، چنانچہ وہ تنخواہ بھی بند کر دی۔ اس وقت غالب کی آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ نہیں تھا، اس تنخواہ پر ان کی گذر بسر ہوتی تھی، اور اپنے شاگردوں کو بار بار خطوط لکھ کر کچھ پیسے منگوایا کرتے تھے۔ وہ جس کسی مکان میں رہتے، اس کا کرایا ادا نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا، اور پینے کے لیے شراب نہیں ملتی تھی۔ اس افلاس اور تنگدستی سے تنگ آکر وہ ہمیشہ ہی جوا بھی کھیلا کرتے تھے، تاکہ اس طرح کچھ آمدنی ہو جائے اور ٹھیک سے گذر بسر ہو! ایک بار جوا کھیلنے کی پاداش میں پکڑے گئے اور سب جواریوں کے ساتھ چھ مہینے کی قید سادا کی سزا بھی بھگتی تھی۔ غالب فطرتاً ایک خود دار آدمی تھے، مگر ظفر کی عتاب نازل ہوتے ہی انہوں نے خود داری کو ہات سے دیدیا، اور ایک لمبی چوڑی نظم میں ظفر کے حضور میں ایک "معافی نامہ" لکھ بھیجا، جس کے دو شعر ہمیں یاد ہیں، اور ہم نیچے نقل کیے دیتے ہیں:

سہرا لکھا گیا زرہ امتثال امر
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
استاد شہ ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

یہ معافی نامہ دوسرے معنی میں "دیکھی نامہ" تھا، اور کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ غالب جیسا عالا کردار اور خود دار شخص اس قدر نیچے گر جائے گا، لیکن غالب نیچے گرنے پر مجبور تھا، اس لیے کہ فاقوں کرتے کرتے اس وقت اس کی موت واقع ہو جاتی تھی۔ یہ معافی نامہ پڑھنے کے بعد ظفر نے غالب کے "انانیت" بھرے قصور کو معاف کر دیا، اور پھر سے ماہوار پچاس روپے تنخواہ جاری کر دی، اور ڈیوڑھی آنے جانے کی اجازت بھی دی۔ ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ غالب تنے افلاس اور تنگدستی، نیز روز روز فاقا کشی سے متاثر ہو کر خود ذوق نے بھی ظفر کو مشورہ دیا ہوگا کہ جہاں پناہ غالب کی "انانیت" کے جرم کو معاف کرتے ہوئے اپنا عتاب واپس لے لیں!

جس کسی نے جوش ملیح آبادی کی سوانح حیات "یادوں کی برات" پڑھی ہوگی تو یہ اندازا لگایا ہوگا کہ ہر قدم پر جوش نے "انا" کا نعرا لگایا ہے۔ انہوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ مجھ سے بڑا کوئی شاعر سارے ہندستان، پاکستان اور بنگلا دیش وغیرا میں نہیں ہے! اس کا دعوا بلکل صحیح ہے، حقیقت میں جوش کے جیسا عالا پایا شاعر پھر سے ہندستان اور پاکستان میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ پاکستان جانے سے پہلے جوش کی "انانیت" کی ہم یہاں پر دو مشہور اور زبان زد عام مثالیں پیش کیے دیتے ہیں۔

یہ تو ہر ہندستانی جانتا ہے کہ جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہندستان جوش کو بہتر چاہتے تھے، اور جوش کی دل سے قدر بھی کرتے تھے۔ حکومت ہندستان کی طرف سے ماہوار رسالے "آجکل" کا اجرا محض جوش ہی کی خاطر عمل میں آیا۔ جوش اس کے ایڈیٹر تھے اور ایک ہزار روپے ماہوار ان کی تنخواہ مقرر تھی۔ ایک ہزار روپے جوش چند روز میں خرچ کر کے بیٹھ جاتے تھے، نہرو دوسرے طریقوں سے

جوشؔ کی مالی مدد کیا کرتے تھے۔ ان واقعات سے ہم جوشؔ اور نہرو کے گہرے اور بے تکلفانہ تعلقات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اور اپنے انہیں تعلقات کی بنا پر جوشؔ بار بار نہرو کے گھر جاکر ملا کرتے تھے۔ ایک بار جوشؔ نے نہرو کے گھر فون کیا۔ نہرو کے P.A. نے فون RECEIVE کیا، اور دریافت کیا، آپ کون ہیں۔ جوشؔ نے کہا، میں جوشؔ ہوں، نہرو سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ P.A. نے کہا، تم کون جوشؔ ہو، اپنا نام تو بتاؤ۔ یہ سن کر جوشؔ کو غصہ آگیا، اور انہوں نے کرخت آواز میں کہا، اگر تم جوشؔ کو نہیں جانتے ہو تو تمہیں ہندستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، میں تم سے کہتا ہوں تم فوراً ہندستان سے باہر چلے جاؤ! اس کے بعد جب جوشؔ، نہرو سے ملے تو انہوں نے سارا قصہ نہرو کو کہہ سنایا، تو خود نہرو بھی ہنس پڑے۔ دیکھی جوشؔ کی "انانیت" آپ نے کہ وہ اپنے آپ کو ہندستان کا بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا، جس سے واقف ہونا ہر ہندستانی پر لازمی اور فرض تھا!

جوشؔ کی "انانیت" کی ایک دوسری مثال بھی سنائے دیتے ہیں۔ ہم نے اوپر لکھا ہے کہ جوشؔ اکثر و بیشتر نہرو سے گھر ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ایک بار جب جوشؔ نہرو کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے ہیں تو نہرو اور رفیع احمد قدوائی باتیں کرتے بیٹھے تھے۔ جوشؔ کے داخل ہوتے ہی نہرو اٹھ کھڑے ہوئے۔ جوشؔ نے آداب کیا تو نہرو نے آداب کا جواب دیا، مگر جوشؔ سے بات چیت کیے بغیر اندر چلے گئے۔ جوشؔ قدوائی کے بازو بیٹھ گئے، مگر مارے غصے کے ان کا چہرا سرخ ہو گیا تھا۔ جوشؔ کی یہ حالت دیکھ کر قدوائی نے دریافت کیا، کیا بات ہے جوشؔ صاحب، آپ غصے کی حالت میں بھرے نظر آتے ہیں؟ یہ سن کر جوشؔ نے کہا، ہاں سچ ہے قدوائی صاحب، نہرو کی حرکت پر مجھکو غصہ آگیا کہ وہ مجھ سے ملے اور بات کیے بغیر اندر چلے گئے۔ یہ سن کر قدوائی نے ہنستے ہوئے کہا، یہ بات ہے۔ مگر اس قدر جلد خفا نہیں ہونا چاہیے۔ آنے کے بعد معلوم ہوگا کہ آخر وہ اندر کیوں گئے تھے۔ ایسے میں نہرو واپس آگئے، اور خود نہرو نے دیکھا کہ جوشؔ غصے میں بھرے بیٹھے ہیں، اور ان کا چہرا سرخ ہو گیا ہے، تو خود نہرو نے دریافت کیا، کیا بات ہے جوشؔ صاحب! آپ غصے میں بھرے بیٹھے ہیں اور آپ کا چہرا سرخ ہو گیا ہے۔ یہ سن کر رفیع احمد نے کہا کہ انہیں یہ شکایت ہے کہ ان کے آتے ہی آپ بات چیت کیے بغیر اندر چلے گئے۔ یہ سن کر نہرو ہنس پڑے، اور کہنے لگے، جوشؔ صاحب! آپ جس وقت اندر داخل ہوئے ہیں، اس وقت مجھ کو اس قدر زور دار پیشاب آرہا تھا کہ اگر میں ایک منٹ بھی روکتا تو پیشاب پاجامے میں خطا ہو جاتا، اس لیے میں فوراً چلا گیا، اور میں نے خیال کیا کہ چونکہ قدوائی صاحب بیٹھے ہیں، آپ دونوں باتیں کرتے رہیں گے، اس کے بعد میرے واپس آنے کے بعد ہم تینوں بھی مصروف گفتگو ہو جائیں گے۔ اسی خیال سے اس وقت میں نے آپ سے بات چیت نہیں کی تھی۔ جوشؔ کا کہنا ہے کہ یہ سننے کے بعد تینوں بھی ہنس پڑے، اور پھر آپس میں باتوں میں مصروف ہو گئے۔ دیکھ لی آپ جوشؔ کی "انانیت" کہ نہرو جیسی شخصیت کو وہ خاطر میں نہ لاتا تھا۔

ایران کا مشہور زمانہ رباعی گو شاعر عمر خیام بھی "انانیت" کا بری طرح سے شکار تھا۔ اس کی "انانیت" کا یہ عالم تھا کہ وہ خدا کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ خیام مشہور شرابی تھا، اور ہر وقت شراب پی کر بدمست رہتا تھا۔ خیام کی مالی حالت اچھی تھی، اس لیے پینے پلانے کے وقت اس کے دوست احباب وغیرہ بھی موجود رہتے تھے۔ محفل کا رنگ جما ہوا تھا، جام و مینا سامنے رکھے ہوئے تھے، اور شراب کا دور پر دور چل رہا تھا۔ خیام صراحی سے خود ہی شراب پیالوں میں انڈیل رہا تھا، ایسے میں صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اور پاش پاش ہو گئی، ساری شراب فرش پر پھیل گئی۔ خیام کا چہرا غضب آلود ہو گیا، اور گورا گورا چہرا غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ صراحی

کس کے حکم سے ٹوٹی، وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچا کہ جونکہ بغیر خدا کے حکم کے ایک پتا تک ہل نہیں سکتا، اس لیے میری شراب کی صراحی بھی اسی کے حکم سے ٹوٹی ہے، چنانچہ اسی غضبناکی اور غصے کے عالم میں اس نے فی البدیہہ یہ رباعی کہہ ڈالی ؎

ابریق مئے مرا شکستی ربی
برمن در عیش را بہ بستی ربی
بر خاک فگندی مئے گلگون مرا
من مست نیم مگر تو مستی ربی

فارسی میں شراب کی صراحی کو مینا اور ابریق بھی کہتے ہیں، چنانچہ اس رباعی میں خیام نے ابریق کا لفظ استعمال کیا ہے، اور پہلے مصرع میں کہتا ہے کہ اے خدا تو نے میری شراب کی صراحی توڑ دی اور اپنی اس حرکت سے تو نے مجھ پر عیش کا دروازہ بند کر دیا، وہ اس طرح کہ اپنی شرارت سے صراحی توڑ کر تو نے میری گلگوں یا سرخ شراب خاک یا زمین پر پھیلا دی، جس کی وجہ سے میں شراب پینے اور عیش و عشرت کرنے سے محروم ہو گیا۔ اب تو ہی انصاف سے بتا کہ شرابی خیام مستی کی حالت میں ہے یا خود خدا مستی کی حالت میں ہے، اگر تو مست نہ ہوتا تو میری شان میں ایسی گستاخانہ حرکت نہ کرتا۔ ظاہر ہے کہ خدا کے خلاف اور خدا کی شان میں خیام کے یہ گستاخانہ الفاظ بغاوت کے برابر ہیں اور خیام کی اس علمبردارانہ بغاوت کو ہم نے خدا کے خلاف خیام کی "انانیت" کا نام دیا ہے!

کہا جاتا ہے کہ خدا کی شان میں اس گستاخانہ رباعی کے کہنے کے بعد، خدا نے اس پر اپنا عتاب نازل کیا، اور فوراً خیام کا گورا مونھ کالا ہو گیا۔ اس غیر معمولی اور فوری چہرے کی تبدیلی سے اس کے موجود احباب نے اس کو آگاہ کیا تو خیام نے اسی وقت آئینے میں اپنا چہرا دیکھا کہ واقعی کالا ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے احباب سے کہا، معلوم ہوتا ہے خدا میرے اس بیان سے ناراض ہو گیا ہے، خیر کوئی بات نہیں، میں اس کو ابھی منائے سمجھائے لیتا ہوں، چنانچہ نیچے کی دوسری رباعی اس نے فی البدیہہ یا اسی وقت کہہ ڈالی ؎

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آں کس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو؟

اے خدا تو ہی بتا کہ سارے جہاں یا دنیا میں، ایسا ایک بھی شخص نہیں ہے، جس نے گناہ نہ کیا ہو، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ نہ کرے تو وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا، اس لیے یہ فانی انسان کا گناہ کرنا لازمۂ فطرت ہے۔ تیسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں برائی کرتا ہوں، یعنی تیری شان میں گستاخی کرتا ہوں تو، تو اس کا بدلا برائی سے (یعنی میرا مونھ کالا کر کے) دیتا ہے، تو پھر تو ہی بتا میرے میں اور تیرے میں، یعنی انسان اور خدا یا بندے اور رب میں فرق کیا رہا۔؟ یعنی ہم دونوں برابر ہو گئے، حالانکہ حقیقت حال یہ نہیں ہے، بندا، بندا ہے، اور خدا، خدا ہے، اس لحاظ سے تیری بزرگی اور برتری کا تقاضا یہ ہے کہ بندے کا قصور معاف کر دے۔ کہتے ہیں کہ اس دوسری رباعی کے بعد خدا نے خیام کا قصور معاف کر دیا، اور اس کا چہرا کالے سے پھر سے گورا ہو گیا! اس کے احباب نے پھر سے اس تبدیلی سے اس کو آگاہ کیا تو خیام نے پھر سے اپنے چہرے کو آئینے میں دیکھنے کے بعد اپنا کالا پن دور ہونے پر خوش و خرم اور باغ باغ ہو گیا۔

غالب کی " انانیت " کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، مگر اسکی خدا سے بغاوت یا " انانیت " کا اس وقت ذکر نہیں کیا تھا۔ اب جبکہ خیام کی خدا سے بغاوت یا " انانیت " کا ہم نے ذکر کیا تو غالب کی بھی خدا سے کھلی بغاوت اور نری " انانیت " کے دو شعر یاد آ گئے، اور وہ شعر یہ ہیں ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا !

" ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن " کے صاف اور کھلے معنی یہ ہیں کہ جنت کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، اس لیے اے غالب جنت کا خیال یا تصور محض اور صرف دل بہلانے کی بات ہے، جب یہ دل بہلانے کی بات ٹھہری تو پھر جنت کے وجود ہی سے انکار کیا جا سکتا ہے، اور جب جنت کی حقیقت اور اس کے وجود سے صاف انکار ہے تو پھر لازمی طور پر دوزخ کی حقیقت اور اس کے وجود سے بھی کھلا انکار ہے، اور جب جنت اور دوزخ کی حقیقت اور اس کے وجود سے انکار ہے تو پھر اس کے بنانے والے یا خالق خدا کے وجود سے بھی صاف انکار ہے، اور جب جنت، دوزخ اور اس کے خالق خدا کے وجود سے بھی انکار ہے تو خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور پیغمبروں کے وجود سے بھی انکار ہے، اور غالب کی یہ جنت - دوزخ - خدا، اور پیغمبروں کے وجود سے یہ کھلی بغاوت، خدا کے خلاف اس کو " انانیت " کا علمبردار ثابت کرتی ہے، اور ان سب کے خلاف غالب کی " انانیت " اس کو دہریا، یا لامذہب یا " ATAEIST " قرار دیتی ہے !

دوسرے شعر میں بھی غالب نے کھلے طور پر خدا کا مذاق اڑایا ہے، اور کہتا ہے یا خدا کو کھلا چیلنج دیتا ہے کہ اے خدا یہ تیرا کونسا انصاف ہے کہ محض فرشتوں کے یہ کہنے پر کہ غالب شرابی ہے، جواری ہے، اور نماز نہیں پڑھتا ہے، اور روزہ بھی نہیں رکھتا ہے، یہ سب جھوٹی باتیں ہیں، فرشتے انسان کے خلاف جھوٹی رپورٹیں پیش کرنے کے عادی ہیں! ہاں اگر کوئی انسان بھی غالب کے خلاف شہادت دیتا، اور یہ بیان کرتا کہ واقعی غالب بڑا ہی گناہگار ہے، اور ہر وقت برے کاموں میں معروف رہتا ہے، اور فرشتوں نے اس کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل سچ ہے تو جو اس وقت غالب سزا کا مستحق قرار پاتا ! اب آپ ہی انصاف سے بتایئے کہ ان دونوں اشعار میں غالب کی خدا کے خلاف بغاوت اور " انانیت " ہے یا نہیں - ؟

خیام اور غالب سے بڑھ کر ؎

بشنو از نے چوں حکایت میکند
وز جدائی ہا شکایت میکند

پہلے شعر سے مثنوی شروع کرنے والے مولانا روم نے بھی " انانیت " کا نعرا لگایا ہے - ان کا یہ شعر " انانیت " کا منتہا ہے ؎

مثنوئ مولوئ معنوی
ہست قرآں در زبان پہلوی

مولانا روم پہلے مصرع میں فرماتے ہیں کہ مولوئ معنوی یعنی مولانا روم کی مثنوی، اور دوسرے مصرع میں ارشاد ہوتا ہے، پہلوی یا فارسی زبان میں قرآن ہے - غور فرمایا آپ نے مولانا روم کی " انانیت " کی حد اور انتہا کہ انہوں نے اپنی لاجواب اور بے نظیر مثنوی کو قرآن جیسی یا قرآن کے برابر یا قرآن کے ہم پلا نہیں کہا، بلکہ ڈنکے چوٹ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ عربی زبان میں اگر ایک قرآن ہے تو

پہلوی یا فارسی زبان میں ان کی مثنوی دوسرا قرآن ہے، ظاہر ہے کہ اس بیان سے ان کا مقصد قرآن کی اہمیت کو گرانا نہیں ہے، بلکہ اپنی بے نظیر اور معرکہ آرا مثنوی کی اہمیت کو بڑھانا اور اجاگر کرنا ہے، مگر اس کے باوجود، ان کی "انانیت" ساتویں آسمان کی بلندی سے بھی پرے نکل گئی ہے!

اوپر بیان کیے گئے ابوالانادوں کے مقابلے میں ہم ابن انا کی "انانیت" کا کچھ بھی اندازاً اور موازنہ کیجیے تو ان کے مقابل ہماری "انانیت" نہ ہونے کے برابر قرار پاتی ہے۔ ہمارا یہ دعوا بالکل صحیح اور سچ ہے کہ ہم ایک "صاحب طرز" انشا پرداز" ہیں، اور دوسرے سب ادیب محض انشا پرداز ہیں۔ ان ادیبوں کو صاحب طرز" انشا پرداز" لکھنا یا کہنا، انشا پردازی کی توہین ہے، اس لیے کہ ان کے عام ادیبانہ رنگ میں ہر ادیب قلم چلا سکتا ہے، مگر صاحب طرز "انشا پرداز" کی تقلید کوئی دوسرا انشا پرداز یا ادیب، ہرگز نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ اس کا خاص اپنا رنگ ڈھنگ یا انداز تحریر ہوتا ہے، جو کسی دوسرے ادیب یا انشا پرداز کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ ہندستان نے ہندستانی زبان میں صرف چند ایک صاحب طرز "انشا پرداز" پیدا کیے ہیں، مثال کے طور پر، محمد حسین آزاد۔ رتن ناتھ سرشار۔ خواجہ حسن نظامی۔ عظمت اللہ خاں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ، اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نام بطور صاحب طرز" انشا پرداز" گنائے جا سکتے ہیں۔ ان کی کتابیں اور مضامین وغیرہ پڑھیے تو تب کہیں آپ کو بھی اندازا ہوگا کہ واقعی ان میں ہر ایک اپنی خاص طرز نگارش کا مالک تھا، ان کے رنگ میں یا ان کی خاص طرز تحریر میں لکھنا یا ان کی تقلید کرنا سراسر ناممکن سا ہے۔ مثال کے طور پر مصور فطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے خاص انداز اور رنگ میں لکھنے کی کئی ادیبوں نے کوشش کی، مگر انہیں اپنی بھونڈی تقلید میں سراسر ناکامی رہی، ایسے ادیب نہیں کے نہ رہے، ان کا خود اپنا انداز تحریر جاتا رہا، اور حسن نظامی کی تقلید کرنے میں بھی وہ ناکام رہے۔ دور کیوں جائیں، خود ان کے بیٹے خواجہ حسن ثانی نظامی نے بھی باپ کے رنگ میں لکھنے کی سعی اور کوشش کی تھی، چنانچہ خود انہیں بھی ناکامی رہی۔ آپ حسن نظامی کا بھی روزنامچہ پڑھیے، اور اس کے بعد "منادی" نیم دل میں حسن ثانی نظامی کا بھی سفرنامہ پڑھیے تو آپ کو اندازا ہو جائے گا کہ اصل اصل ہے، اور نقل نقل۔ خواجہ حسن نظامی اتنے بڑے اور مشہور زمانہ ادیب ہونے کے باوجود ان میں تکبر یا غرور یا "انا" نام کو نہ تھا۔ ہمیں ایک بار ان سے ملنے اور ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء میں وہ حیدرآباد آئے تھے، اور علی گڑھ کلب میں ان کی تقریر تھی۔ چانکی پرشاد (مرحوم) سابق ناظم اطلاعات حیدرآباد کے ساتھ ان کی تقریر سننے کے لیے علی گڑھ کلب پہلی بار گئے تھے، اور اپنے اپنے روزنامہ اخبار "وطن" کے چند نمبر ساتھ لیتے گئے تھے۔ تقریر سننے کے لیے سینکڑوں ہی آدمی آئے تھے۔ ہم دونوں سامنے کی صف یا ROW میں بیٹھے تھے۔ تقریر سنی، نہایت دلچسپ تھی۔ ہمارا خیال غلط نکلا، ہم سمجھتے تھے کہ ان کی تحریر میں جو لوچ اور لچک ہے، وہ بات تقریر میں نہ ہوگی، مگر تقریر سننے کے بعد ہم حیران اور ششدر ہو گئے کہ انہیں اپنی تحریر پر جو قدرت حاصل تھی، وہی انداز ان کی تقریر میں بھی تھا، اور یہ بات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اس وقت ان کی صحت کچھ ٹھیک نہ تھی، اس کے باوجود انہوں نے نہایت ہی پر لطف اور دلچسپ انداز میں پورے ایک گھنٹے تک تقریر کی تھی ہمیں تو بڑا ہی لطف آیا، اس لیے کہ پہلے ہی سے ہم ان کی تحریر کے دلدادہ شیدا تھے، اور ان کی تحریری انداز کی تقریر نے ہم پر جادو کا سا اثر کیا۔ ہم نے چانکی پرشاد سے تعریف کی تو انہوں نے کہا کہ [illegible]

ہیں، اسی انداز میں تقریر بھی کرتے ہیں، اور یہ خوبی صرف ان کی اپنی ہے، جو کسی دوسرے ادیب اور مقرر کو نصیب نہیں ہو سکتی! جانکی پرشاد کو خاجا صاحب بہتر طریقے پر جانتے تھے، اور ان دونوں کے سابقہ مراسم اور تعلقات تھے۔ اس بنا پر تقریر کے ختم پر جانکی پرشاد نے خاجا صاحب سے ہمارا تعارف کرایا کہ آپ بی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا) ہیں، اور آپ نے حال ہی میں روزانا اخبار "وطن" نکالا ہے، جس کے یہ چند نمبر آپ کے ملاحظے کے لیے پیش ہیں، وہ سب نمبر ہم نے خاجا صاحب کو دیے تو پہلے تازا نمبر کا انہوں نے زکر ڈالی، اور یہ کہا کہ لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی اچھا ہے۔ یہ سن کر جانکی پرشاد نے کہا، مولانا اس نئے اخبار کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی لکھائی آوازی اصول پر ہے۔ یہ سن کر خاجا صاحب نے فرمایا، مجھکو یاد پڑتا ہے کہ حیدر آباد سے ایک ماہوار رسالا بھی نکلتا ہے، جس کی لکھائی بھی آوازی اصول پر ہے، اور وہ رسالا "منادی" کے تبادلے میں، میرے ہاں آتا ہے، اور میں اس کو پڑھتا بھی ہوں۔ جانکی پرشاد نے کہا، وہ رسالا بھی آپ ہی کا ہے، اور "وطن" کے ایڈیٹر ہی اس رسالے "ہندستانی ادب" کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے کہا، اچھا آپ ہی اس کے بھی ایڈیٹر ہیں، تب تو آپ بڑے ہی خاص آدمی ہیں۔ اس کے بعد خاجا صاحب نے ہر ملنے والے کو ملاقات کا موقع دیا، اور بعض خاص افراد سے پانچ دس منٹ تک بات چیت بھی کی۔

خاجا حسن نظامی کے بلکل برعکس مولانا ابوالکلام آزاد پرلے درجے کے بددماغ اور خود منزوی واقع ہوے تھے۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں نہرو کی پہلی کابینا میں وزیر ایجوکیشن منسٹر بننے کے بعد سے وہ کسی سے بھی نہیں ملتے تھے۔ ان کا چہیتا P. A اجمل خان سیاہ و سفید کا مالک تھا، وہ جس کو چاہتا، آزاد سے ملاتا، اور جس کو نہیں چاہتا، ہرگز نہیں ملاتا تھا۔ اور بددماغ آزاد خود بھی کسی سے ملنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ "انانیت" کا اظہار ہوتا ہے، اور اس "انانیت" کا ثبوت انہوں نے اہلِ غرض سے نہ مل کر بھی دیا۔ ان کی انگریزی کتاب یا سوانح عمری INDIA WINS FREEDOM خود انہوں نے ہندستانی زبان میں لکھی تھی۔ ہمایون کبیر (مرحوم) سابق یونین منسٹر نے اس کو انگریزی کا جاما پہنایا تھا، اور انگریزی CREDIT بھی خود آزاد ہی نے اپنا نام لکھ کر حاصل کر لیا۔ آزاد انگریزی بہتر طریقے پر نہیں جانتے تھے۔ کوشش کے بعد تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی تھی، مگر وہ اس قابل نہیں تھے کہ انگریزی زبان میں کوئی کتاب لکھ سکیں! یہ تو ہم اور سب ہی ہندستانی بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۰ء کے دہے میں جب مولانا آزاد کانگریس کے پریسیڈنٹ تھے، وائسرائے سے نئی دلی اور شملے میں بات چیت کرنے جایا کرتے تھے تو ایک انگریزی داں INTERPRETER یا ترجمان ان کے ساتھ ہوتا تھا، جو آزاد اور وائسرائے کی بات چیت کا فوری ترجما کر کے سنا دیتا تھا۔ اگر آزاد خود انگریزی سے واقف ہوتے تو پھر ترجمان کی کیا ضرورت تھی؟ جب وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کانگریس کی پہلی کابینا بنائی تو مولانا آزاد کو تعلیم کا قلمدان PORTFOLIO دیا، اور مرتے دم تک آزاد وزیر تعلیم رہے۔ بلاشبہا آزاد ایک مانے ہوے قابل ترین شخص اور مناصب وزارت پر رہے تھے، چنانچہ برسوں پہلے کلکتے سے انہوں نے اپنی ادارت میں ایک ہفتا وار "الہلال" نکالا تھا۔ "الہلال" پہلے تو خوب چلا، مگر کچھ عرصا بعد اس کی اشاعت برائے نام رہ گئی تھی۔ اس زمانے میں آزاد کی معاشی حالت بہت خراب تھی۔ کچھ عرصا پہلے ہم نے "ہندستانی ادب" کے ایک نمبر میں مولانا آزاد سے متعلق ایک مضمون نقل کیا تھا جس کی سرخی خود ہم نے لگائی تھی کہ "مولانا آزاد فاقوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔"

خط نمبر (۱) ۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء - گلستان - گوکھلے نگر - پٹھان واڑی - ملاد ائیٹ - بمبئی ۷۴

ایڈیٹر "ہندستانی ادب" حیدر آباد

مکرمی - تسلیم - "ہندستانی ادب" شمارا ۱، جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۵ء وصول ہوا - عنایت کے لیے شکر گزار ہوں - "گلستان" محض میرے مکان کا نام نہیں، بلکہ لائبریری بھی ہے - کئی ہزار کتابیں موجود ہیں - میگزینوں میں نگار، معارف، نقوش، فنون، سیپ، سویرا، نیا دور، ادب لطیف، فکر و نظر، شاعر، گفتگو، نگر، صبا، سوغات، شعر و حکمت، ہما، شبستان، محراب وغیرہ کے ساتھ انگریزی ریڈرز ڈائجسٹ کے فائل موجود ہیں - برسوں سے علم و ادب اور فنون لطیفہ کے موضوعات پر مقامی اور بیرونی دانشوروں سے خطبات کا بھی اہتمام کراتا رہا ہوں - لائبریری کو بعض کتابیں اور میگزین اعزازی طور پر بھی آتے ہیں - اگر گنجایش ہو تو "ہندستانی ادب" بھی "گلستان لائبریری" کے نام جاری فرمادیں -

زبان و ادب کی ترقی کے لیے نئے تجربات کرتے رہنا مستحسن ہے، لیکن مواد کا معیار بلند سے بلند تر ہونا چاہیے - حیدر آباد سے صبا اور شعر و حکمت اور بنگلور سے سوغات نے اچھے معیار قایم کیے ہیں - گفتگو بھی صوری و معنوی اعتبار سے دلکش ہے کوشش ہونی چاہیے کہ "ہندستانی ادب" ان سب سے زیادہ بلند پایہ ہو - دوسرے میگزینوں سے مضامین کا انتخاب کرنا ہے تو انگریزی ریڈرز ڈائجسٹ سے مضمون کیوں نہ ترجمے کے ذریعے پیش کیے جائیں؟ اور بنگلا، ملیالم، تامل، گجراتی، مرہٹی زبانوں کے مضامین کیوں نہ شایع کیے جائیں -

شمارا زیر نظر میں بیشتر مضامین پہلے کہیں نہ کہیں شایع ہو چکے ہیں اور بعض تو بار ہا چھپ چکے ہیں، جیسے سودیشی ریل یا حسن نظامی کا روزنامچا - ٹائیٹل پیج پر چھپے ہیں سادات والا لکھا ہوا ہے، دوسرے صفحے پر سعادت والا لکھا گیا ہے - خطوط نا طقی میں انہوں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ آپ نے جس شمارے میں میری غزل شایع ہونے کی اطلاع دی ہے، وہ شمارا تو ملا، لیکن وہ تبرکات "نا طق" نظر نہیں آے - ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹیلیویژن نے فاصلے کم کر دیے ہیں - دنیا ایک تہذیب اور آفاقی کلچر کی سمت رواں ہے - ناپ تول کلو، گرام، لیٹر، میٹر ہر ملک اپنا رہے ہیں - بعض چیزیں مقامی اور فرسودا ہو جاتی ہیں، ان کا استعمال ترک کر دیا جاتا ہے، اور ترقی پسند فعل ہوتا ہے - نظام حکومت ختم ہو چکی ہے، اس کی بعض اصطلاحات ختم ہو گئیں - اسی طرح شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۴ف معلوم ہوتا ہے ایران یا افغانستان کا سنہ اور تاریخ ہے - ہمارے ذہنوں کو روشنی اور وسعت کی ضرورت ہے - ہر قدیم چیز کے رواج پر اصرار بسا اوقات مضحکا خیز ہو جاتا ہے - میں کسی کتاب یا میگزین دیکھ کر اسکے حسن و قبح پر نظر ڈالتا ہوں اور خلوص کے ساتھ تعمیری تنقید کرتا ہوں - رسمی تعریف دوستی اور خلوص کا اظہار نہیں ہے - آپنے رسالا بھیجکر ممنون فرمایا ہے، اسے زیادا خوبصورت اور مفید بنانے کے لیے بعض چیزیں ذہن میں آئیں وہ عرض کر دیں - میرے سامنے جو شمارا ہے اس کی کتابت بھی اچھی نہیں اور ہندستانی میں ایڈیٹر کا نام مخفف ہیں، بجاے پورا نام ہی چھپا ہوا اچھا معلوم ہوتا ہے -

جی - ام - خان کو مکمل لکھیے - یہ ام - اے اور (عثمانیا) ایڈیٹر کے ساتھ ڈگری گراں گذرتی ہے - کسی کسی انگریزی اخبار نے ایڈیٹر نام کیساتھ ڈگری کا اظہار نہیں کیا ہے - اس طرح اظہار نمایش کا ایک پہلو ہوتا ہے - میگزین کے لیے اشتہارات ضرور حاصل کرنے چاہئیں - اخبار اور میگزین اشتہار سے ہی اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں - آپ بہتر کاغذ استعمال کر سکیں گے، چھپائی زیادا اچھی ہو سکیگی - صف اول کے دانشوروں سے مضامین کے حصول کے لیے معاوضا دے سکیں گے - میگزین

کے وقار کے لیے ضروری ہے کہ ہر شمارا پابندی سے اور وقت پر نکلے۔ ایسے مضامین جنہیں تخلیقی اور معیاری نہ سمجھا جا سکے انہیں ہرگز شامل نہ کیا جائے۔ حیدر اباد کی علمی ادبی، تہذیبی اور اہم سیاسی شخصیتوں پر ہر شمارے میں ایک مضمون شامل کیجیے۔ سالار جنگ، مہاراجا کشن پرشاد، وقار الملک، محسن الملک، عثمانیا یونیورسٹی کے اہم اساتذا۔ سالار جنگ میوزیم پر تفصیلی مضمون۔ اہم کتب خانوں کا تذکرا۔ میرے پتے میں گوکھلے نگر کے ساتھ پٹھان واڑی لکھنا بھی مناسب ہے کہ گوکھلے نگر کا نام ابھی لوگ کم جانتے ہیں، اور بمبئی کے ساتھ نمبر 64 بھی ضروری ہے۔ جنید احمد

خط نمبر (۲) ۷/ دسمبر ۱۹۷۵ء

محترم جی۔ ام۔ خان صاحب! سلام مسنون۔ خدا آپکو جلد صحت کلی عطا فرمائے۔ دق کا مرض اب مہلک نہیں رہا، ہر درجے پر اسے قابو میں کر لیا جاتا ہے۔ رہا دل کا مرض اصحاب ذوق، ذہن اور حساس لوگوں کی یہ پہچان ہے۔ MEATARIAN اور CANTEL کے خالق کی حیثیت سے انگریزی کے معماروں میں آپ شامل کیے جائیں گے، اور بہر طور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ الفاظ اور زبان کے تجربوں میں یہ بھی آپ کی دین اور اضافا ہے کہ ہندستان کے ادیب اور رسالے کے مدیر ہیں، اور اپنا نام مخفف انگریزی طرز پر جی۔ ام۔ خان تحریر فرماتے ہیں۔ بے شک جب دوسرے خاندانوں، دوسرے مذاہب اور اقوام میں شادی جائز ہے تو ہندستان کے ادیب کا اپنا نام ایڈیٹر ہندستانی رسالے کی حیثیت سے ج۔ م۔ خان کی جگہ جی۔ ام۔ خان اختیار کرنا نئے دستوں کو چھونا اور نئے افق کی سمت سفر کی نشاندہی ہے۔ آپ جو بھی شایع فرمائیں اول درجے کے مضامین پر مبنی ہو، بہترین کاغذ، اعلا کتابت کا نمونا خوبصورت ترین ٹائٹل کے ساتھ ہونا چاہیے۔ آپ نے اپنے تفصیلی خط کی بشارت دی ہے، میں اسکے لیے ہمہ تن اشتیاق ہوں۔ بک لٹ کے لیے شکریا۔ جنید احمد

۱۹۵۸ء میں "شخصیات اور واقعات جنہوں نے مجھے متاثر کیا" عنوان کے تحت مشاہیر سے استدعا کر کے مضامین مرتب کیے تھے۔ مجموعا بہت پسند کیا گیا تھا۔ حیدر اباد سے مخدوم مرحوم نے وعدا کیا تھا، لیکن مضمون دے نہ سکے۔ اب دوسری جلد کے لیے مضامین جمع کر رہا ہوں۔ حمیدا سلطان۔ میکش اکبرابادی۔ ڈاکٹر گیان چند جین۔ آچاریا کرپلانی، اور کے۔ ام۔ منشی، اختر موہانی کے مضامین آ چکے ہیں۔ وعدے اور تقاضے جاری ہیں۔ کیوں نہ آپ بھی اس بزم میں شامل ہوں؟ پچیس تیس صفحات۔ فروری ۱۹۷۶ء تک مضمون تیار کر لیجیے، اور حیدر اباد کے اہم دانشوروں کو بھی میری جانب سے دعوت دیدیجیے کہ اس موضوع پر اپنے اہم اور دلکش اور تلخ تجربات سپرد قلم فرمائیں۔ جنید

خط نمبر (۳) ۲۰/ دسمبر ۱۹۷۵ء۔ محترم خان صاحب۔ سلام مسنون۔

ہندستانی ادب کے پانچ خاص شمارے نظر نواز ہوئے۔ آپ کے مہر و محبت کے لیے ممنون ہوں۔ ان مندرجات سے یہی اندازا ہو سکا کہ کیسی پیغمبرانا جدوجہد کی زندگی آپنے بسر کی۔ کسی جماعت، ادارے کی ہمدردی یا مخالفت، مدح سرائی یا تضحیک بھی دامن دولت برسا دیا کرتی ہیں، لیکن شخصی کردار کا وقار تو اسی طرح جھیل جانے میں چمکتا ہے۔ کچھ وقت اور گزرے گا دنیا حیدر اباد کے نوابوں، راجاوں اور رئیسوں کو بھول جائے گی، لیکن جنہوں نے علمی، ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کے نقوش تاریخ کے اوراق میں جگمگائیں گے۔ حیدر اباد نے ایک نئی تہذیب ڈھالی تھی جو امتزاج تھی لکھنو، دلی اور انگریزی تہذیب کا۔ ان کی خوبیاں بعض اور نکھر آئی تھیں، بعض باتوں میں تصنع پیدا ہو گیا تھا۔ لباس، کھانا، مہمان نوازی، آرائش، رسوم اور پھر یہ کہ ایک حقیقی بھائی دوسرے سے ملنے جاتا تو وہ اس وقت تک [illegible] قدم بھی نہیں آتا تھا کہ شیروانی کے سارے بٹن بند نہ کر لے، اور ٹوپی قاعدے سے پہن لے۔

شیوں کے حرم - اس پر خوبصورت اور دلچسپ مضمون ہو سکتا ہے۔ ذوالقدر جنگ، حیدر یار جنگ
صفدر یار جنگ اور کتنے ہی رئیس علمی اور ادبی مذاق رکھتے تھے، شاعر تھے، انکی تحریرات سے انتخاب
ور انکے تذکرے ادبی سرمایہ ہوں گے۔ فانی اور جوش کی حیدرآبادی زندگی پر کسی نے تفصیلی روشنی
ہیں ڈالی۔ قاضی عبدالغفار - کے اداریے صحافت سے زیادہ ادبی محاسن کے حامل ہوتے تھے "پیام"
کے فائیل بعض کتب خانوں میں ہوں گے کوشش کر کے ان کا انتخاب مجموعے کی شکل میں مرتب کرتا!
: تو کاروبار دنیا یونہی چلتے ہی رہیں گے، آپ پہلی توجہ صحت کی طرف دیجیے۔ کیا حیدرآباد کے اصحاب
وقت یہ بھی نہیں کر سکتے کہ آندھرا حکومت سے آپ کے لیے تاحیات معقول وظیفہ مقرر کرا دیں؟
ہاں ایک فروری مضمون اور ہو سکتا ہے کہ حیدرآباد سے کتنے اہم اور معتبر اشخاص اور
خاندان کراچی منتقل ہو گئے، اور اب کتنے رہ گئے ہیں؟ اور جو باقی ہیں وہ کس حال میں ہیں؟
کسی نے ذکر کیا تھا کہ بیشتر پڑھے لکھے لڑکے چلے گئے۔ ہزاروں شادی کے قابل لڑکیاں بیٹھی ہوئی
ہیں، مناسب رشتے نہیں ملتے۔ اسکا بین ریاستی شادیوں سے حل نکالا جا سکتا ہے۔
خان صاحب! جن موضوعات پر مضامین کے لیے میں نے لکھا ہے، وہ سب اپنے طالبعلمانہ تجسس کے
ت ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ آپ جیسے پختہ کار ادیب، اور صحافی کو مشورہ دینا جسارت بیجا، اور بدمذاقی کا
ہار ہوگا۔ ایک خاص نمبر پروفیسر رشید احمد صدیقی پر نکالا جا سکتا ہے جو یقیناً باتوں بات لیا
ے گا اور ہر نقطہ نظر سے اور سطح کے اصحاب قلم مضمون دے سکیں گے۔ ان کی تصانیف میں طنزیات و
مضحکات، گنج ہائے گراں مایہ، مضامین رشید، خنداں، آشفتہ بیانی میری، اور مختلف مضامین جو
ر دنظر علی گڑھ میں شائع ہوتے رہے، ان کے علاوہ ایک اچھا مقالہ جو کتابی صورت میں ندوۃ
مصنفین، ندوہ لکھنؤ نے شائع کی تھا، یعنی "رشید احمد صدیقی" نمبر نقوش نے پطرس نمبر، منٹو نمبر
شوکت نمبر" اور صبا کے جوش نمبر، حفیظ" اور "فیض نمبر" سے بھی زیادہ وقیع اور دلکش
ا جا سکتا ہے۔ دیکھیں کون اور کب یہ اہم کام انجام دیتا ہے؟ خیر طلب جنید احمد

سلہ نمبر (۴) ۱۳ار جنوری ۱۹۷۶ء

محترم خان صاحب!
تسلیم۔ آپکا کارڈ ملا، اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر کا شمارہ "ہندستانی ادب" دو دن پہلے ہی آچکا ہے۔
ت بہت شکریہ! اچھے مضامین انتخاب میں شامل ہیں۔ عظیم انسان، محمد مجیب صاحب، مسعود صاحب،
برابر، وقیع مضمون ہیں۔ مولوی عبدالحق پر مقدمات عبدالحق، ۸۰۰ صفحات - عبدالحق نے تبصرے
بات عبدالحق، اور تنقیدات عبدالحق یہ سب میرے پاس ہیں۔ مولوی صاحب کی شخصیت میں انفرادیت
ساز اور دلکشی تھی، ان کی خوش سلیقگی اور نفاست کا ہمیشہ مداح رہا، اردو ادب اپنے رسالے
ذریعے ہی ان کی خدمات کیا کم ہیں۔ زبان و مسائل کی دقت ریزی کا کیا کہنا - تکلف اور تصنع نام کو
تھا - میں خیریت آباد کے بنگلے پر کئی بار حاضر ہونے کا شرف رکھتا ہوں۔
ہمارے خیالات کے تحت آپنے "ہندستانی ادب" اور اپنے متعلق S ATMENT OF ACTS
یش کیا ہے - کتنا آسان اور سہل ہے کہ آپنے جرأت وعظ اور ایثار پسندی سے "ہندستانی ادب" کی خدمت کی
، لیکن جن کٹھن مرحلوں سے آپ گذرے ہوں گے خون کے جو گھونٹ آپنے پیے ہوں گے ان کا اندازہ کرنا آسان
ہا ہے - مداوا کون کر سکتا ہے؟ تین چار سو برس سے ساتھ رہنے والی قوم کے افراد ایک قیدی کی قلم
تے نہیں - [illegible] جو غیر شاکی حالات سے [illegible] وہ ادبا نے خدمت گزاروں کو کیا دے
سکتا ہے؟ فانی بدایونی شاعر کے علاوہ بی - اے، ایل ایل بی بھی تھے - ہندستان سے بھاگ کر حیدرآباد میں

پناہ چاہی۔ مہاراجا پرلا تھے، پرنس منظم جاہ اپنا استاد کہتے تھے۔ ملا جی یں فورد پے ماہانا مکان کا کرایا تھا۔ مہینوں شکرایا ادا ہوتا تھا اور نہ شوفر کی تنخواہ ادا کر پاتے تھے۔ مہاراجا کے بعد تو فاقوں کی نوبت رہتی تھی، کبھی کبھی نواب یار جنگ روزہ کشائی کا سامان کردیتے تھے۔

اسّی فیصدی غیرمسلموں کی آبادی کا مسلمان حکمران، ریاستی آبادی کی اکثریت کی زبان تلنگی اور مرہٹی، ریاست اور غیرریاستی زبان ہندستانی، الفاظ زیاہے! یہ چلنے والی چیزیں تھیں؟ ریاستوں کا وجود ہی انگریزی حکومت کی مصلحتوں پر قایم تھا۔ سوشلزم، سیکولرزم، جمہوریت، انسانی مساوات اگر اعلا قدریں ہیں تو سوچیے آصفیہ نظام کی حکومت کو ایسے ہی کوئی ملاتا تھا؟ ہندستانی ہمیں کتنی ہی عزیز کیوں ہو، اسکا سرمایہ علم و ادب کتنا ہی وقیع سہی، لیکن جب کسی صوبے میں آبادی کی اکثریت کی وہ مادری زبان نہیں ہے تو کیونکر وہ دفتر اور کاروبار کی زبان بن سکتی ہے؟ پھر تقسیم وطن کے بعد جو تلخی اکثریت کے ذہنوں میں بڑی، اسکے پیش نظر جو مراعات آج دی جارہی ہیں یقیناً اسکے لیے اندرا گاندھی اور ترقی پسند روشن خیال ہندوؤں کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ادیبوں کے ایک جلسے میں جس میں پروفیسر آل احمد سرور موجود تھے، انہیں مخاطب کرتے ہوئے باقر مہدی خاں نے یہ سوال کیا کہ شہرت یافتہ ادیبوں اور شاعروں میں کون حکومت کے ہاں نوکر نہیں بکا؟ بڑے شہروں میں رہنے والے ہندستانی کے نامور ادبا، اور شعرا میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسکے بچے ہندستانی میں کارڈ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں؟ ہندستانی پڑھنے، اور لکھنے کا شعور اب عوام کے لیے ہے۔ حیدرآباد کی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس جس کی صدارت قاضی عبدالغفار نے فرمائی تھی، اس میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور نیاز پر ایک شاگرد نے رجعت پرستوں کی طرفداری کا الزام عاید کیا تھا، اور اس شدت سے کہ دونوں بزرگ پچیس ہزار کے مجمع سے احتجاج واک آوٹ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ادب میں بھی انقلاب زندہ باد، کسان اور مزدور تحریکیں زندہ باد کے نعرے شامل ہو رہے تھے۔ جواہر لال نے امریکا کا سفر کیا تو ان پر پھبتیاں کسی گئیں۔ ایک غزل گو نے انہیں یہ بھی ہے کہ کوئی ہٹلر کا چیلا کہکر مخاطب کیا اور اس غزل گو سے زیادہ تجربا کار ترقی پسند ادیب اور شاعر نے اپنی غزل کو جلسے میں پڑھنے کی تلقین کی۔ غریب غزل گو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ پاداش میں جیل جانا پڑے گا۔ آج وہی ترقی پسند تحریک کا امام ہر اعزاز اور ایوارڈ سے سجا ہوا ہے۔ بھوپال سے کانگریسی چیف منسٹر کی دعوت جسنے مسترد کردی تھی، آج لالا پردھراج اور مدھوسدن جیسے کروڑ پتی سرمایہ داروں کی اعانت کے بل پر تصوف بھگتی اور اخلاقیات پر نظمیں اور مضمون لکھ رہا ہے، اور حضرت محمد صلعم کے سر پر اسے سورج چمکتا ہوا نظر آرہا ہے۔ مارکس اور لینین اوراق پارینہ کی نذر ہو گئے۔ مزدوروں اور کسانوں کی زبوں حالی جسے خون تھکواتی تھی، آج کوئی شام ووڈکا، برانڈی اور وسکی کی بوتلوں کے سہارے بغیر نہیں گزرتی۔ علم و ادب کے ان تاجروں نے بمبئی میں کتنے ہی ہندستانی رسایل نکالے، خواص، عوام اور تاجروں نے چندے، عطیات اور اشتہارات کی شکل میں روپے کے ڈھیر لگا دیے۔ چند شماروں کے بعد رسالا بند ہوتا رہا۔ "اردو ہال" کی تعمیر کے نام پر برسوں کل ہند مشاعرے، فرحت اللہ بیگ کا یادگار مشاعرہ، ڈرامے اسٹیج ہوتے رہے، ٹکٹ، چندے، عطیات اور اشتہارات کے ذریعے لاکھوں روپیے سمیٹے گئے۔ برسوں گزر گئے۔ کتنی ہی بار اخبارات کے ذریعے حساب فہمی کا مطالبا کیا گیا۔ بمبئی میں مسلمان مزدوروں کے علاقے میں "اردو ہال" کی تعمیر کا منصوبا بنانے والے برسوں جسکا حلق انقلاب اور اسٹالین زندہ باد کے نعرے سے خشک تھا، اور جو برسوں کمیونسٹ پارٹی، مزدوروں کی تنظیم، پارٹی اخبار، رسالے کے نام پر رقمیں وصول کرکے ہضم بھی کرتے رہے تھے، "اردو ہال" کے لاکھوں سے کھیلنے لگے۔ پنڈت جواہر لال پر جنہوں نے طنزاً نظم لکھی تھی "جب جب طیاروں میں کہاں جاتے ہو تم، قوم کی خاطر بڑی تکلیف اٹھاتے ہو تم۔" [illegible] سیاست دیکھے جانے لگے۔ ترقی پسند مصنفین کے لقب جنہوں نے رشید احمد صدیقی اور

ز ہیں نہیں ٹیگور، اقبال، فیض، فراق اور اختر الایمان سب میں رجعت پرستی کے جراثیم دریافت کیے
، اور ہر سرکاری ملازم کو ڈوڈی اور بھی ملازمت نہ دینے والوں کو سرمایہ داروں کے زرخرید سرٹیفکٹ عطا فرمائے
ے، جو ہندستان میں ہندستانی کے خاتمے کے اندیشے سے جوش سے پہلے ترک وطن کا ارادہ ظاہر
چکے تھے۔ ہندستانی کے نام پر لاکھوں روپے کے غبن پر اپنے لغنٹنٹ کے خلاف ایک لفظ نہیں
ل سکے۔ بسا اوقات قدرت بھی خوب انتقام لیتی ہے۔ ان بدعنوانیوں کی قیمت یوں چکانی پڑی
اس مزدور علاقے سے جہاں بیس برس کمیونسٹ پارٹی اور ترقی پسند ادیبوں نے نعرے لگائے اور
ے تھے، اسمبلی کی سیٹ کے لیے سلطانا جعفری کھڑی ہوئیں۔ سردار جعفری نے الیکشن کی تقریروں میں
یہ کی تھا کہ اس حلقے کی اکثریت مسلمانوں کی ہے، اگر انہوں نے اپنی سیاسی بیداری کا ثبوت دیتے ہوئے
لطانا کو کامیاب نہ بنایا تو سرمایہ داروں اور فرقہ پرستوں کے ہاتھوں ان کا حشر اسپین کا سا ہوگا۔ اس اعتراف
تامل نہیں کہ سلطانا ہر لحاظ سے موزوں ترین امیدوار تھیں، انہوں نے پولیٹیکل سائنس میں ایم۔ اے
تھا۔ تعلیم بالغان کے ادارے کے ذریعے برسوں وہ اس علاقے میں خدمت کرتی رہی ہیں، لیکن ان کی
رتناک شکست کا سبب کمیونسٹ پارٹی کے وہ خود غرض مکار اور عیار ورکر تھے جنہوں نے چرب زبانی کے ذریعے اور
آپریٹو سوسائٹی، مزدوروں میں کھلے ہاتھوں لوٹ مچائی۔ شاید لائبریری کے نام پر پروگرام کے ذریعے ترقی پسند شاعروں
سرخ پھول ہزاروں روپے بغیر ڈکار کے ہضم کر گیا۔ جو ٹھٹے اور بلند ہوئے تو اسی علاقے میں اردو ہال کی تعمیر
پروگرام پیش کر دیا۔ آج سرخ پھول کو شراب سے باز رکھنے کے لیے ہندستان اور روسی ڈاکٹروں نے ایک
ہدایت کی ہے اگر کچھ دنوں اور زندہ رہنا ہے تو بات نہ لگانا۔ لیکن کب یہ کافر ان کی بیگم کے مر تھ
گئی ہے وہ بھی اس شان سے کہ یومیہ کم سے کم سو روپے کی شراب نکلتی ہیں، اور اس سے زائد رقم ہر روز رمی یا
تی ہیں۔ پرسوں جس شخص نے پارٹی مزدور، ادبی کاموں کے نام پر بھیک وصول کی تھی، ابھی کچھ دن ہوئے بمبئی کے
ل خانے کی آرائش پر اٹھارہ ہزار روپے صرف کیے۔ قوم کا غم اتنا تو ہو — !

اقر مہدی نے کیا غلط کہا کون نہیں بکا ؟

سردار جعفری نے گفتگو میں تحریر فرمایا ہے کہ پچھلے پچیس تیس برسوں میں ہندستانی زبان کے علم وادب
بیشتر اضافہ ترقی پسندوں نے کیا ہے۔ کیا اس دعوے کے ثبوت میں ایک بھی معیاری علمی تخلیقی کتاب کا نام لیا
سکتا ہے ؟ یا علم وادب کا سرمایہ محض افسانوں کے مجموعے ہیں ؟
ہمارا ہزار سالہ سماجی نظام بدل رہا ہے۔ سیاسی نظام اقتصادی ڈھانچا، نظام تعلیم سب بدل رہے ہیں۔
ہمی کوششیں نئے انسان ڈھالیں گی۔
آپ نے حصول علم اور خدمت ادب میں عمر بسر کی، ایثار کا نمونہ بنے رہے، آپ کا کارنامہ بڑا اعتبار سے
ل ستائش ہے۔ کاش "ہندستانی ادب" کی ذمے داریاں سنبھال لیں اور آپ اب آرام فرما سکیں۔
یدرآباد کی تاریخ مرزا داغ، جلیل، فانی، مخدوم، ڈاکٹر زور، مغنی تبسم اور جی۔ ام۔ خان کے تذکروں
ے جگمگائے گی۔ یہ یار جنگوں کی فہرست دیمک کی نذر ہوگی۔ جنید احمد

خط نمبر (۵) — ۱۵ر جنوری ۱۹۷۶ء

کریں۔ ناہموار معاشرے میں انفرادی طور پر کسی بھی کام کو شروع کرنے کے لیے اسکے استحکام اور اپنے وسائل
پہلے جائزہ لینا ضروری ہے۔ سمنٹ فیکٹری ہو یا موٹر کا کارخانہ۔ ڈاکٹر اور وکیل کے لیے بھی اگر آزادانہ پریکٹس
نی ہو تو موقع کی جگہ اچھا فرنیچر، کتابیں دیگر ساز و سامان کے ساتھ سال چھ مہینے نقصان برداشت کرنے کی
طاقت رکھنی پڑتی ہے۔ ادبی خدمت کا جذبہ یا کتنا ہی مبارک کیوں نہ ہو ایک میگزین نکالنے سے پہلے [illegible]
[illegible]

اہمیت پر مقالے لکھے جا سکیں۔ کم سے کم ایک سال کسی منافع کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ بہترین کتابت آفسٹ سے چھپا ہوا عمدہ ادبی رسالہ نکلا، بس ایک دو کاپی سرکولیشن کی طرف توجہ ہی نہیں دی جاتی۔ علی گڑھ سے میگزین رسالہ نکلتا و نظر ثانی ہوتا ہے۔ دلی، بمبئی، کلکتہ کے کسی بک ڈپو یا اسٹال پر وہ نہیں ملتا۔ کئی سال ہوئے میں بمبئی گیا تو وہاں کے سب سے بڑے بک ڈپو پر چند نسخے دیکھے گئے تھا۔ مولانا آزاد لائبریری کی اوپری منزل پر نکر و نظر اور علی گڑھ میگزین کے ڈھیر دیکھیے۔ جن دنوں قمر رئیس صاحب میگزین کے ایڈیٹر تھے، انہیں اور پروفیسر آل احمد سرور کو کئی بار تحریر کر متوجہ کیا کہ جامعہ لیا کر میگزین فروخت کے لیے بھیجے جایا کریں۔ جامعہ والوں سے درخواست کی کر دونوں میگزین نکالا کریں، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر محض ایک میگزین نکال کر اگر پانچ ہزار خریدار براہ راست بنائے جا سکیں تب ہی جلد فروخت ہونے والی ناولیں اور افسانوی مجموعے شایع کرتے رہنا چاہیے۔ سردار جعفری نے وہ رسالہ نکالنے کا خیال ظاہر کیا تو ڈکلریشن میرے نام سے لیا۔ میں نے مختلف احباب سے راضی کر کے پچیس ہزار روپے اسے شروع کرنے کا پلان بنایا تھا، اور تین ہزار براہ راست خریدار بنانے کا پروگرام تھا۔ میں نے شخصیات اور واقعات کی گیارہ سو جلدیں شایع کی تھیں تقریباً چھ سو براہ راست اور دو مہینے میں نکل گئیں۔ محض لکھنے کی صلاحیت ہونا میگزین کو کامیابی سے نکالنے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے، سرمایا اور کاروبار سوجھ بوجھ ضروری لازم ہیں۔ محمد ایاز نے سوغات نکالا تو وہ کبھی نقصان میں نہیں رہے۔ ہزار پانچ سو کے سہارے سے میگزین نکالنے کی کوشش گھپلا کر دھوت دینا اور گھر پھونک کر اپنے ذوق کی تسکین کرنا ہے۔

میرے ذہن میں بھی میگزین نکالنے کا سودا کبھی کبھی رنگ دکھا لیتا ہے، لیکن میں اسی وقت ہاتھ ڈال سکوں گا جب ایک لاکھ روپے بینک میں پہلے رکھ دوں۔ آرٹ پیپر پر، ہر اشاعت میں صاحب مضمون کی تصویر، کسی مصور کی تازہ تخلیق اور ہر مضمون کا معاوضہ دیکر۔ یہ ممکن نہیں تو جو اچھے رسایل اردو میں شایع ہوتے ہیں انہی سے استفادہ کیجیے۔

نیاز اور قاضی عبدالغفار نے فرضی رسایل بند کرنے کے بعد جرائد نکالے، اور کبھی میگزین یا اخبار میں رسایل کی کمی، خریدار نہ ملنے کا شکوا کیا، اور نہ اپنی ادبی خدمت کا اور زحمتوں کا ڈھنڈورا پیٹا۔

جو کام کیا جائے فرض اور عبادت سمجھ کر، پھر شکوا اور سود و زیاں کا اعلان کیسا؟ نمائش اور خودداری کی کسک سے بچنا ہی لازمی ہے۔

پھر خود آپ نے غالب کالج کی زندگی ہی میں وہاں سے نکلنے کے بعد ہر چہ بادا باد کہہ کر میگزین نکالنے کا قدم کیا، اور ساری زندگی اسے بنا رہے۔ بڑی خود اعتمادی اور کشاکش سے بزدآزمائی کا مقابلہ کرا کیا۔ یہاں تو ایسے بھی ہیں جو دو شمارے نکال کر جشن مناتے ہیں اور لاکھوں جمع کر لیتے ہیں پھر کیا کیا میگزین اور کیسی ادبی خدمت۔

آپ کو اب دو چار تعلیم یافتہ پرجوش نوجوانوں کا حلقہ قایم کرکے بار ان کے سپرد کر دیجیے، اور خدا پر تکیہ رکھیے بس! اپنی کوششیں صحت کو بہتر بنانے میں صرف کیجیے۔ موت کا وقت مقرر نہیں، لیکن جب تک وقت نہیں آتا کیوں نہ بہتر طور پر گزارا جائے۔ مخلص - جنید احمد

ہندستانی بولو ہندستانی سیکھو ہندستانی پڑھو	ہندستانی پایندہ باد!

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان
ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالہ
رجسٹرڈ نمبر اے پی (۱۶)
جلد (۳۶) نمبر (۷-۸-۹)
خرداد - تیر - امرداد ۱۳۸۵ف
اپریل - مئی - جون سنہ ۱۹۷۶ء
چندہ سالانہ
سولہ روپے

امیر خسرو نمبر

ہندستانی ادب

ایڈیٹر
جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)
سعادت ولا - ۱۷-۱۱-۱۶ اسلیم نگر کالونی نمبر ۱ - ملک پیٹ - حیدرآباد نمبر ۳۶ آندھرا پردیش - انڈیا -

۲	امیر خسرو دہلوی کی فارسی خدمات	ڈاکٹر نظام الدین، ایس گورکر	۹	سب رس
۳	گوری سووے سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس	امیر خسرو	۱۶	قومی راج
۴	خسرو	پنڈت گلزار زتشی دہلوی	۱۶	قومی راج
۵	ٹیپو سلطان کی فوج میں ہندستانی زبان کا رواج	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	۱۷	سب رس
۶	اقبال	محمد ایوب واقف	۲۴	پیام تعلیم
۷	شکیل بدایونی	مبشر علی صدیقی	۲۵	کتاب نما
۸	رباعی	بلدیو سنگھ ماجز	۲۷	رہنمائے تعلیم
۹	عورت خور	کرشن چندر	۲۸	سب ساتھ
۱۰	میری سنو	عطیا پروین	۳۳	حریم
۱۱	شاعر اعظم حضرت جوش ملسیانی	طالب چکوالی	۳۶	رہنمائے تعلیم
۱۲	پاکستان میں چار مہینے	سید صباح الدین عبدالرحمان، ایڈیٹر "معارف"	۳۷	معارف
۱۳	زبان یار من	خسرو	۴۳	قومی راج
۱۴	فراق	ضیا ہانی	۴۳	زیور
۱۵	مشاعرہ جشن جمہوریت لال قلعہ دلی	کریمی الاحسانی	۴۴	شان ہند
۱۶	غزل	وقار واثقی	۵۰	سبدگل
۱۷	پروین سلطانہ	سکندر علی وجد	۵۰	سب ساتھ
۱۸	امیر خسرو کی مادری زبان	صفدر آہ	۵۱	مرکزی اطلاعات
۱۹	روزنامچہ	مصور فطرت خواجہ حسن نظامی	۵۶	منادی
۲۰	چاندنی کے آبشار	شباب للت	۶۰	زیور
۲۱	میر انیس اور صبح عاشور	وزیر آغا	۶۱	سب ساتھ
۲۲	غزل	دوارکا داس شعلہ	۶۴	صبح امید
۲۳	خسرو نامہ	ظ - انصاری	۶۵	قومی راج
۲۴	طوطیٔ ہند	شہباز صدیقی امروہوی	۸۴	مرکزی اطلاعات
۲۵	حضرت امیر خسرو	محمد متین بی - ایس سی، ایم - اے (عثمانیہ) اسسٹنٹ، انفورمیشن گورنمنٹ آف انڈیا	۸۶	مرکزی اطلاعات
۲۶	نذر خسرو	گوپی ناتھ امن	۸۸	قومی راج
۲۷	حضرت امیر خسرو اور انکے افکار	ڈاکٹر صفدر علی بیگ	۸۹	سب رس
۲۸	دکن اور امیر خسرو	حسن عباس فطرت	۹۴	قومی راج

جی - ام - خان نے دائرہ پریس - چھتا بازار - حیدرآباد ۲ میں چھپواکر
سعادت ولا - 17 - 11 - 15 اسلیم نگر کالونی - ۱ - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ سے شایع کیا -

ہمارے خیالات

امیر خسرو نمبر

امیر خسرو نے سات سو سال پہلے ہندستانی زبان میں شعر کہے تھے

امیر خسرو کی سات سو سالہ تقاریب پچھلے سال منائی گئیں۔

ہندستان کے مختلف رسالوں نے "امیر خسرو نمبر" نکالے۔ "ہندستانی ادب" کا "امیر خسرو نمبر" کچھ دیر سے نکل رہا ہے، جس کا ہمیں افسوس ہے، لیکن "دیر آید درست آید" کے مصداق، مضامین کے اعتبار سے یہ خاص نمبر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلا مضمون "امیر خسرو دہلوی کی فارسی خدمات" ڈاکٹر گوریکر کا ہے۔ گوریکر نے خسرو کی نثر اور نظم میں فارسی دانی کا بہتر طریقے پر جائزہ لیا ہے، اور خود ان کے کلام سے اشعار کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ اس زمانے میں امیر خسرو سے بہتر اور بڑھ کر کوئی دوسرا شاعر نہیں تھا۔ خسرو کو خود اپنے کلام پر اور اپنے حسن پر ناز تھا، چنانچہ اپنے حسن کے بارے میں خود ان کا یہ شعر بطور ثبوت پیش ہے ؎

نے گلم، نے بلبلم، نے شمع نے پروانہ ام

عاشق حسن خودم بر حسن خود دیوانہ ام

خسرو کے مرشد نظام الدین اولیا، جو خود بھی شاعر تھے خسرو کے کلام کی قدر کرتے تھے۔ اس دور میں دلی سے مدورائی تک اور بنگال سے راجستان تک ہر شاعر اور ادیب خسرو کی شاعری کا لوہا مانتا تھا۔ خسرو کی عظمت کا صحیح صحیح اندازا اس بات سے ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں چار لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے۔ یہ لاکھوں اشعار ان کے چار دیوانوں پر مشتمل ہیں، جن میں سے ایک شعر کو بھی خارج نہیں کیا جا سکتا! خسرو نے اس کے علاوہ کئی ایک طویل مثنویاں بھی کہی ہیں۔ یہ مثنویاں بادشاہان وقت کے مدح و ستائش میں کہی گئی تھیں، جس کا انہیں کافی سے زیادہ صلا ملتا تھا۔

ہم نے اوپر دعوا کیا ہے کہ خسرو نے آج سے سات سو سال پہلے ہندستانی زبان میں پہلی بار شعر کہے تھے، اور اس سے پہلے کسی بھی شاعر نے ہندستانی زبان میں شعر نہیں کہا تھا۔ خسرو نے صرف چند سو شعر نہیں کہے تھے، بلکہ ہزاروں ہی اشعار کہے تھے، جو اسی زمانے میں بے حد مقبول اور زبان زد عام تھے۔ خسرو نے خود بھاری غلطی کی تھی، اس لیے کہ اپنے فارسی کلام کی طرح انہوں نے اپنے ہندستانی کلام کو دیوان کی شکل میں مرتب یا مدون نہیں کیا، بلکہ یہ ہزاروں اشعار عوام کی زبانوں پر تھے جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ گھٹتے گئے، اور اب شاید مشکل سے ایک سو اشعار کتابوں میں محفوظ ہیں۔

خسرو کے باپ (ترکی) نہیں، بلکہ ترکستان کے ترک تھے۔ یہ اپنے وطن سے اکیلے آئے تھے۔ آدمی [illegible]

اور قابل تھے، اس لیے بادشاہ وقت نے ان کی قدر کی اور اپنی حکومت میں بڑے عہدے سے سرفراز فرمایا، اس لیے وہ یہیں رہ بس گئے۔ جب مستقل طور پر رہ گئے تو ضلع ایٹا کے ایک موضع پٹیالی کے ایک امیر کبیر عمادالملک کی لڑکی سے انہوں نے شادی کی۔ خسرو کی ماں ہندو ہندستانی تھیں جو بعد میں مسلمان ہو گئی تھیں۔ ان کی ماں کی زبان ہندستانی تھی، اس لیے لازمی طور پر بیٹے امیر خسرو کی مادری زبان بھی ہندستانی تھی، اور یہ ایسی روز روشن کی طرح حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بھی قوت اور کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ خسرو ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے باپ کا انتقال ہو گیا، اس لیے ان کے نانا عمادالملک نے نواسے کی پرورش اپنے ذمے لے لی، اور ہر طرح سے ان کی تعلیم اور تربیت میں کوشاں رہے۔ خسرو فطرتاً ذہین اور طباع تھے، اس لیے بہت جلد علوم مروجہ سے فراغت حاصل کر لی، اور چونکہ شعر کہنے کا مادہ ان کی جبلت اور فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، اس لیے لڑکپن ہی سے انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا، اور اپنے لاجواب اشعار سے بڑے بڑے عالم فاضل لوگوں اور اس دور کے مانے ہوئے شاعروں کو حیران اور ششدر کر دیا۔ ان کی اس لاجواب اور بے مثال شہرت اور مقبولیت کے باعث ان کی ماں اور ان کے نانا بے حد خوش و خرم اور شاداں اور فرحاں تھے، ایسے میں ان کے نانا عمادالملک کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کے نانا عمادالملک ضلع ایٹا کے زمیندار اور مالدار آدمی تھے۔ عمادالملک ان کا خطاب تھا، اور اصل نام ہندو رانا کچھ دوسرا ہی تھا۔ ان کی ماں بھی ہندو تھیں، مگر ان کے باپ سے شادی کے پہلے وہ مسلمان ہو چکی تھیں۔ اپنے بیٹے خسرو کو وہ بہت چاہتی تھیں، اور خسرو بھی اپنی ماں سے حد سے زیادہ پیار اور محبت کرتے تھے۔ ماں نے اپنی زندگی میں ایک شریف خاندان حسین و جمیل مالدار لڑکی سے خسرو کی شادی کر دی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا، اس لیے خاندان میں صرف میاں بیوی باقی رہ گئے۔

اب خود ہی آپ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے اور انصاف سے فرمایے کہ خسرو اور ان کی بیوی کس زبان میں بات چیت کرتے ہوں گے، فارسی میں۔ نہیں، بلکہ ٹھیٹ ہندستانی میں جو اس وقت لاکھوں اور کروڑوں عوام کی عام زبان تھی۔ خسرو کے نانا کی زبان ہندستانی اور خسرو کی ماں کی زبان ہندستانی، اور خسرو کی بیوی کی زبان ہندستانی، اور خود خسرو کی زبان ہندستانی تھی، اس لیے لازمی طور پر خسرو بھی ہندستانی زبان میں بات چیت کرتے تھے، اور اسی زبان میں انہوں نے ہزاروں ہی اشعار کہہ ڈالے تھے، مگر افسوس کا مقام ہے کہ خود خسرو نے اپنے ہزاروں ہندستانی اشعار کی کوئی قدر نہیں کی۔ اپنے چار فارسی دیوانوں کی طرح اگر وہ باقاعدہ طور پر ہندستانی اشعار کا بھی ایک دیوان مرتب کر دیتے تو آج کی دنیا والوں پر یہ ثابت ہوتا کہ ہندستانی زبان آج سے سات سو سال پہلے بھی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

اس حقیقت کو خود ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر بادشاہ کے دور میں فارسی زبان سرکاری یا حکومت کی زبان رہی ہے، اور سرکاری پورا کام اور کاروبار فارسی زبان ہی میں ہوا کرتا تھا، مگر یہ کہنا غلط ہے کہ فارسی عام طور پر بولی بھی جاتی تھی، اور عوام میں مقبول تھی اور وہ لوگ فارسی میں بات چیت کرتے تھے۔ بات چیت تو صرف اور صرف ہندستانی زبان میں ہوا کرتی تھی، نہ صرف عوام میں، بلکہ درباروں میں بادشاہ، امرا، اور اعلا عہدے دار، نیز دوسرے تمام لوگ بھی آپس میں صرف ہندستانی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ جب پایۂ تخت دلی میں پہلی مسلم سلطنت قایم ہوئی اس وقت سے فارسی زبان حکومت کی سرکاری اور دفتری زبان بنی اور بول چال اور بات چیت کے لیے ہندستانی عوام اور خواص سب کی مقبول عام زبان بنی۔ اس وقت یہ ناممکن تھا کہ حکمراں طبقہ یا بادشاہ، امرا، اور عہدے دار وغیرہ ہندستانی باشندوں سے فارسی زبان میں ربط قایم کر سکیں، اس لیے کہ اس دور کے ہندستانی عوام فارسی سے سراسر نابلد اور ناواقف تھے۔ چونکہ فارسی حکمرانوں کی مادری زبان تھی، اس لیے حکومت کے ڈنڈے کے زور سے فارسی سرکاری اور دفتری زبان قرار دے دی گئی، جس کو مجبوراً اور چاہے نہ چاہے عوام اور رعایا نے بھی تسلیم کر لیا۔ فارسی مغلوں کی حکومت کے دور میں بھی سرکاری زبان رہی تھی، اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، ہندستانی زبان ترقی کے منازل طے کرتی گئی۔

ہمارے اس مدلل بیان کے بعد یہ ثابت ہوا کہ ہندستانی زبان ایک ہزار سال پرانی ہے، جبکہ دلی میں پہلی مسلم سلطنت قایم ہوئی تھی، اور یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ آج سے سات سو سال پہلے امیر خسرو نے پہلی بار ہندستانی زبان میں ہزاروں شعر کہے تھے۔

ہندستانی زبان کے ہمارے نئے نظریے کے بعد یہ کہنا غلط ہے کہ دکن میں ولی نے پہلی بار ہندستانی زبان میں شعر کہے تھے، اور اس کے بعد وہ شمالی ہندستان گیا، اور وہاں کے عوام پر اس نے یہ ثابت کیا کہ ہندستانی زبان میں بھی شعر کہنے کی صلاحیت ہے، اس لیے دکن والوں نے ولی کو ہندستانی زبان کا باوا آدم قرار دیا ہے، جو سراسر غلط ہے۔ "اردو سے قدیم" میں شمس اللہ قادری اور "دکن میں اردو" میں نصیر الدین ہاشمی نے اس بات پر زور دیا ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ ہندستانی زبان دکن میں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور ترقی کرتی گئی، اور دونوں کا یہ دعوا ہے کہ ولی دکنی ہندستانی زبان کا پہلا شاعر ہے۔ بالکل اسی طرح محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہندستانی زبان پنجاب ہی کی پیداوار ہے، جس کے ثبوت میں کئی ایک پنجابی شاعروں کا ہندستانی زبان میں کلام بھی بطور نمونہ پیش کیا ہے، مگر ہمارے مدلل استدلال کے بعد شیرانی کے دعوے پر بھی پانی پھر جاتا ہے، اس لیے کہ شیرانی کے ثبوت کی مدت دو چار سو سال سے زیادہ طویل نہیں ہے، حالانکہ ہماری جدید ترین تحقیقات کے مطابق ہندستانی زبان کی قدامت ایک ہزار سال کے لگ بھگ ہے۔

اس کے ہم اردو کے دیوانوں کی ایک اور بکواس بھی بیان کیے دیتے ہیں۔ اردو زبان کی تمام تاریخوں میں متفقہ طور پر یہ بیان درج ہے کہ اردو زبان کی مدت دو سو سال سے زیادہ نہیں ۔۔ اس سے ان لوگوں کی مراد اردو زبان کی نثری اور نظمی خدمات ہیں۔ اس تنگ نظری کا سبب وہی اندھی تقلید ہے، جس کے مرتکب ان کے آبا و اجداد ہوے تھے۔ چونکہ ان کے باپ دادا نے اس کوتاہ بینی کا نظریہ پیش کیا تھا، اس لیے یہ تنگ نظر لوگ خاموشی سے اس پر اندھا دھند عمل کرتے اور اپنے پیشروں کی تقلید بھی کرتے ہیں۔ اگر ہماری طرح وہ بھی وسیع نظری اور فراخدلی سے کام لے کر غور و فکر کرتے تو لازمی طور پر ہماری طرح وہ بھی اس نتیجے پر پہنچتے کہ ہندستانی زبان آج سے دو سو سال پہلے دکن یا پنجاب میں وجود میں نہیں آئی، بلکہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے دلی میں وجود میں آئی تھی، جہاں کا بادشاہ ایک مسلمان شخص تھا۔ اس کے بعد اسی پایۂ تخت دلی میں ہر مسلمان بادشاہ کے زمانے میں یہ زبان مختلف پہلوؤں کی حد تک ترقی کرتی گئی، اور اسی مقبول عوام زبان میں آج سے سات سو سال پہلے سب سے پہلے امیر خسرو نے شعر کہے تھے۔ ایک دو شعر نہیں، بلکہ ہزاروں اشعار کہے تھے۔ اس دور میں اور اس کے بعد بھی امیر خسرو کے سینکڑوں اشعار زبان زد عوام تھے، لیکن جیسے جیسے زمانا گذرتا گیا، عوام نے ان اشعار کو بھلا دیا۔ اب چند سو اشعار بطور خزینہ محفوظ ہیں۔ اب آپ ہی انصاف سے فرمایے کہ دکن والوں کا یہ کہنا کہ ہندستانی زبان کا باوا آدم ولی دکنی پہلا شاعر تھا، جس نے ہندستانی زبان میں شعر کہے تھے، اور اس کے بعد محمود شیرانی کا یہ دعوا کب صحیح ثابت ہو سکتا ہے کہ اردو زبان پہلے پنجاب میں پیدا ہوئی، اور کئی ایک پنجابی شاعروں نے اس زبان میں شعر کہے تھے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ امیر خسرو دہلوی کے پہلی بار ہندستانی زبان میں شعر کہنے کے بعد کسی دوسرے ہندستانی شاعر نے ہندستانی زبان میں شعر نہیں کہے، اس لیے امیر خسرو کے پہلی بار ہندستانی زبان میں شعر کہنے کے چند سو سال بعد یہ سہرا ولی دکنی کے سر آتا ہے کہ اس نے دکن یا سارے ہندستان کی بول چال کی زبان، یعنی ہندستانی میں شعر کہے۔ ولی دکنی نے گجرات اور شمالی ہندستان بھی گیا، اور ان کے شاعروں کے بعد اور میل جول پیدا کیا۔ مگر چونکہ مالی اعتبار سے ولی کا کہنا [illegible]

اس لیے وہ پھر سے دکن لوٹ گیا۔ اس ولی دکنی کا اثر تھا، جس کے باعث گجرات میں بھی ایک اور شخص ولی گجراتی نامی نے ہندستانی زبان میں شاعری کی۔ اسی نوبت پر تذکرا نگاروں اور ہندستانی ادبیات کے تاریخ نویسوں نے بڑی گڑبڑ کر دی۔ یہ لوگ اپنی نامکمل تحقیق اور تلاش کے باعث دونوں ولی الگ الگ شاعروں کو ایک ولی شاعر کہتے ہیں۔ جو لوگ ولی دکنی کی تائید میں ہیں، وہ کھلے طور پر لکھتے ہیں کہ گجراتی ولی کوئی شاعر ہی نہیں، بلکہ ولی دکنی ہی وہ شاعر ہے جو گجرات گیا تھا، اور ایک طویل عرصے تک وہاں رہنے کے بعد مایوس اور ناکام اپنے وطن دکن لوٹ گیا تھا، اور جو حضرات ولی گجراتی کی تائید میں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ولی دکنی کوئی شاعر نہیں تھا، بلکہ وہ صرف ولی گجراتی ہے جو گجرات سے دکن گیا تھا، مگر چونکہ اس کی سرپرستی نہیں ہوئی، اس لیے کچھ عرصا دکن میں رہنے کے بعد وہ مایوس اور ناکام اپنے وطن گجرات کو واپس آ گیا۔ ان دونوں طبقوں کا ایک طرفا فیصلا سراسر زیادتی اور ناانصافی پر مبنی ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں دکن اور گجرات میں دو ولی تخلص کے شاعر گزرے ہیں اور دونوں نے گجرات اور دکن کا سفر کیا تھا، اور دونوں ہی ناکامی کی صورت میں پھر سے اپنے اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔ ان دونوں ولی شاعروں کے بعد تو ہندستان کے ہر صوبے اور ہر شہر میں ہندستانی زبان میں شعر کہنے والے شاعر پیدا ہوئے، اور نثر نگاری میں بھی متعدد کتابیں شایع ہونے لگیں۔

چونکہ امیر خسرو نے آج سے سات سو سال پہلے ہندستانی زبان میں شاعری کی تھی، اور چونکہ "ہندستانی ادب" بھی (۳۶) سال سے ہندستانی زبان کا علمبردار اور پرچارک ہے، اس لیے ہم نے یہ یادگار "امیر خسرو نمبر" آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اس نمبر میں سو فیصد امیر خسرو سے متعلق مضامین اور نظمیں نہیں ہیں، بلکہ دو چار غیر متعلق مضامین اور نظمیں وغیرا بھی موجود ہیں، جو ہم نے ان مضامین کی اہمیت کے پیش نظر قصداً اور عمداً دی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اور ضروری بات کہنی ہے، اور وہ یہ کہ محمد عتیق کا مضمون "حضرت امیر خسرو" اور نظم "طوطیٔ ہند" اس نمبر سے پہلے، جنوری - فروری - مارچ ۱۹۷۶ء کے نمبر میں چھپ چکے تھے، مگر چونکہ یہ مضمون خاص اہمیت کا حامل ہے، اور نظم بھی لاجواب ہے، اس لیے ہم نے اپنے رسالے "ہندستانی ادب" سے اس خاص نمبر میں پھر سے نقل کیا ہے، اگر ہم یہ وضاحت نہ کرتے تو شاید یہ خیال کیا جاتا کہ ہم سے بھول ہو گئی تھی اور انجانے طور پر پھر سے ان دونوں چیزوں کو دہرایا گیا ہے! یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ سارے ہندستان میں صرف اور صرف "ہندستانی ادب" ہی ایک ایسا رسالا ہے جو ہندستانی زبان کا علمبردار بھی ہے اور پرچارک بھی کرتا ہے، ہم نے "ہندستانی ادب" کے پچھلے کئی نمبروں میں ایک سے زیادا مرتبا لکھا ہے کہ صرف ہم اکیلے ہی ہندستانی زبان کے علمبردار نہیں ہیں، ویسے پتا جہاتما گاندھی، ہم سے بہت عرصا پہلے ہندستانی زبان کے حامی اور زبردست علمبردار، اور مانے ہوئے پرچارک تھے۔ ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ گاندھی جی اپنے آشرم واردھا سے "ہریجن" نامی ایک ہفتا وار نکالتے تھے، جو ہندستانی زبان میں شایع ہوتا تھا، یعنی آسان زبان ہندستانی میں، وہ لکھا ہوا، ناگری اور فارسی میں ایک ساتھ چھپتا تھا، یعنی زبان ایک ہی ہندستانی ہوتی تھی، جو دو رسم خطوں میں ساتھ ساتھ لکھی جاتی تھی۔ یہ ہفتا وار گاندھی جی کے مرنے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک نکلتا تھا، مگر بعد میں بند کر دیا گیا۔ "ہریجن" کے بند ہونے کے بعد گاندھی جی کے خاص چیلے چانٹے

سندر لال، ام - اے نے نہرو حکومت کی مالی امداد کے ساتھ الہ باد سے "ہندستانی" نامی ماہوار رسالا نکالا تھا۔ اس رسالے کے دفتر کے قیام اور ضروری مشنری وغیرا کی خریدی کے سلسلے میں نہرو حکومت نے کئی لاک روپے کی امداد دی تی، اور رسالا کا مستقل امداد بھی منظور کی تی - یہ رسالا بھی کئی سال تک جاری رہا، لیکن مسلسل نقصان میں چلایا جا رہا تھا، جو حکومت ہندستان پر سفید ہاتی کے مصداق ثابت ہو رہا تھا، اس لیے خود پنڈت سندر لال نے اس رسالے کو بند کر دیا۔

یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے کہ "ہندستانی ادب" پنڈت سندر لال کے رسالے سے قدیم اور پرانا رسالا ہے - "ہندستانی" ہمارے رسالے "ہندستانی ادب" کے تبادلے میں آیا کرتا تھا، اور ہم ہندستانی زبان سے متعلق مضامین وغیرا "ہندستانی" سے "ہندستانی ادب" میں نقل کیا کرتے تھے - یہ سچ ہے کہ گاندھی جی کا "ہریجن" ہمارے رسالے "ہندستانی ادب" سے قدیم اور پرانا ہفتہ وار تھا - "ہندستانی ادب" جون سنہ ۱۹۳۱ء میں پہلی بار شایع ہوا، اور "ہریجن" اس سے پہلے سے جاری تھا، چونکہ گاندھی جی ہندستانی زبان سے متعلق نوٹ اور اداریے "ہریجن" میں لکھا کرتے تھے، اس لیے ہم نے اپنے رسالے میں ان کے خیالات کی ایک سے زیادا مرتبا تائید کی تی - جب گاندھی جی اور مولوی عبدالحق میں زبان سے متعلق قلمی جنگ چل رہی تی، یعنی گاندھی جی ہندستانی کی تائید میں تھے اور مولوی عبدالحق اردو کی تائید میں تھے تو ہم نے گاندھی جی کی تائید کی تی، اور اس سلسلے میں ایک سے زیادا مرتبا اداریے اور نوٹس بھی لکھے تھے - ہم نے آج سے پہلے انھیں سطور میں ایک سے زیادا مرتبا لکھا ہے کہ گاندھی جی کی مراد ہندستانی سے یہ تی کہ ہندی سے سنسکرت کے کٹھن شبد نکال دیے جائیں اور اردو سے عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ دور کرنے کے بعد دونوں آسان زبانوں کا جو سنگم ہوگا، وہی آسان اور عام فہم زبان ہندستانی ہوگی، اور یہ ہندستانی ناگری اور فارسی رسم خط یا لکھاوٹ میں ساتھ ساتھ لکھی جانی چاہیے، چنانچہ ہم (۳۶) سال سے اسی آسان ہندستانی میں اداریے اور نوٹس بھی لکھتے ہیں، اور دوسرے مضامین بھی پیش کرتے ہیں، مگر مجبوری یہ ہے کہ ہمارا رسالا "ہندستانی ادب" صرف ایک رسم خط فارسی میں لکھا جاتا، اور چھپتا ہے - یہ مجبوری ایسی ہے، جس کا حل ہمارے ہات میں نہیں ہے، بلکے حکومت آندھرا پردیش اور مرکزی حکومت ہندستان کے بس میں ہے، اگر آج بھی ان میں سے کوئی ایک حکومت ہماری ضروری مستقل مالی مدد کرے تو ہم کل ہی "ہندستانی ادب" کو ناگری اور فارسی دو رسم خط میں ساتھ ساتھ شایع کر کے حکومتوں اور عوام پر یہ ثابت کر دینگے کہ سارے دیس ہندستان میں صرف "ہندستانی ادب" ہی ایک ایسا رسالا ہے، جو صحی معنی میں دیس پتا گاندھی جی کے وچاروں کا پالن کر رہا ہے، ہم حیران ہیں کہ جب آج سے کئی سال پہلے نہرو حکومت نے پنڈت سندر لال کو گاندھی جی کا ہندستانی زبان کا مشن جاری رکھنے کے لیے لاکھوں روپے کا بے دریغ طریقے پر رقمی امداد دی تی تو پھر ہمیں یا ہمارے رسالے کو اسی طرح کی مالی امداد کیوں نہیں دیتی ؟ ہندستان میں جتنے بھی ماہوار رسالے ہیں وہ یا تو ہندی کی تائید میں ہیں یا اردو زبان کے حامی ہیں - سارے دیس میں ہزاروں ہی ماہوار، دو ماہی، سہ ماہی اور سالانا رسالوں میں صرف "ہندستانی ادب" ہی ایک ایسا ماہوار رسالا ہے جو ہندستانی زبان کا قایل ہے، اور اس کا پرچار بھی کر رہا ہے - اس رسالے کی ایک انجمن بھی ہے جس کا نام "انجمن ترقیِ ہندستانی" ہے، جس کے سکریٹری خود ہم ہیں - یہ رسالا "ہندستانی ادب" اس، انجمن کا مدگن ہے - یہ رسالا اصل میں ماہوار ہے، مگر لکھائی چھپائی کی دشواریوں کے باعث تین مہینے میں ایک بار شایع ہوتا ہے، اس لحاظ سے اس کو سہ ماہی رسالا قرار دینا سراسر غلط ہے، اگر حالات اجازت دیں تو ہم پھر سے ہر مہینا اس کا ایک نمبر شایع کر کے یہ ثابت کر دینگے کہ

حقیقت میں یہ رسالا ایک ماہوار رسالا ہے - اس ماہوار رسالے کا حجم صرف (۳۲) صفحے ہے، اس لحاظ سے تین مہینے کے ملے جلے نمبر حجم صرف (۹۶) صفحے ہونا چاہیے تھا، مگر اس رسالے کی (۳۱) ویں سالگرہ پر ہم نے چار صفحے کا اضافا کر کے ایک سو (۱۰۰) صفحے کا نمبر پیش کیا تھا، اس کے بعد سے وہ سو صفحے قایم ہو گئے، اور اب اس رسالے کا ہر سہ ماہی نمبر ایک سو صفحے کا ہوتا ہے، اور آیندا بھی اسی طرح پیش ہوتا رہے گا - سنہ ۱۹۷۵ء تک ہم نے اس رسالے کے نیوز پرنٹ کاغذ استعمال کیا تھا، مگر جنوری - فروری - مارچ سنہ ۱۹۷۶ء کے ملے جلے نمبر کے لیے عالا درجے کا چکنا کاغذ استعمال کیا تھا، اور اس نمبر کے لیے بھی وہی بڑھیا قسم کا کاغذ استعمال کیا ہے، اور آیندا ہر نمبر کے لیے اسی قسم کا سفید یا گلیزڈ پیپر استعمال کیا جاتا رہے گا -

یہ سب کچھ ہم ہندستانی زبان کی سیوا میں کر رہے ہیں، گاندھی جی بھی ہندستانی زبان کے شیدائی تھے، اور امیر خسرو نے ہندستانی زبان میں آج سے سات سو پہلے پہلی بار شعر کہہ کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ہندستان کی عام اور ملی جلی زبان صرف ہندستانی ہے۔

امیر خسرو سے بھی تین سو سال پرانی، ایک ہزار سال قدیم ہندستانی زبان کی خدمت کر رہے ہیں، اس لیے حکومت آندھرا پردیش اور مرکزی حکومت ہندستان پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ "ہندستانی ادب" کے نام ماہانا یا سالانا ایک بھاری رقم مستقل طور پر بطور امداد منظور کرے، ناگری اور فارسی دونوں رسم خط میں ساتھ ساتھ حقیقی ہندستانی زبان میں ماہوار رسالا شایع کرنے کے سلسلے میں ضروری مشنری اور دفتر سے متعلق تمام ضروریات کی خریدی کے سلسلے میں ایک معتد بہ رقم کی منظوری، چھپائی کے سلسلے میں ضروری مشنری کی خریدی کے بعد دفتری ضروریات کی بھی تکمیل کر سکیں - اس اہم کام کے سلسلے میں مرکزی مقام پر ایک بڑا اور وسیع کمپونڈ والا مکان کرایے پر حاصل کرنا ہوگا - اس کے بعد پریس اور دفتر کے سلسلے میں دو درجن سے زیادا مستقل فن داں ملازمین کا تقرر بھی ضروری ہوگا - ہمارے اس میٹھے خواب کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک دونوں میں سے کوئی ایک حکومت ہماری مالی مدد نہ کرے -

"ہندستانی زبان پایندا باد!"

ڈاکٹر نظام الدین ایس، گوریکر

امیر خسرو دہلوی کی فارسی خدمات

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اہل ہندستان اور [ای]ران ہم نژاد ہیں، اور ان کی قدیم زبانیں ویدک [او]ر اوستا ایک دوسرے سے رشتہ رکھتی ہیں۔ [ج]دید فارسی کا رواج ہندستان میں اشاعت [ا]سلام کے بعد اور بالخصوص دور غزنویاں میں ہوا ہے۔ [یہ] زبان فارسی تقریباً آٹھ سو سال تک ہندستان [م]یں برابر جاری رہی، اور اس عرصے میں وہ نہ صرف [دف]تری اور سرکاری، بلکہ ادبی اور ثقافتی زبان [بھی] رہی اور اس وقت مسعود سعد سلمان اور [ابو]الفرج رونی کی شاعری حکومت غزنی کی ادبی [سرگر]میوں کی عکاسی کرتی ہے، اور خواجہ نظام الدین [او]لیا اور امیر خسرو دہلوی کا کلام سلطنت دلی کا [تہذ]یبی زندگی کی آئینہ داری۔ اس خصوص میں [یہ ک]ہنا غیر ضروری نہ ہوگا کہ امیر خسرو اپنے عہد کے [اسا]تذۂ ایران کے معاصر ہونے کے باوجود ہندستان [او]ر ایران کے مابین ثقافتی سفیر کا درجہ رکھتے ہیں، [او]ر ان کی تالیفات ایک طرف ہندستان اور ایران [کے] تعلقات کو استوار اور مستحکم کرنے کا ذریعہ [ہیں او]ر دوسری جانب ان کی تخلیقات قوم اور ملک [کو ا]پنے شاندار ماضی کی یاد دلانے کا وسیلہ ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی اپنی تصنیف شعر العجم میں امیر خسرو کی جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم ادا کیے ہیں، لیکن ان کی حد حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتے، سعدی قصیدے کو ہات نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتے، حافظ، عرفی نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد، اور صنائع بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعوا نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ سے زیادہ کہا ہے، لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں ہے"۔

ابو الحسن یمین الدین خسرو معروف بہ امیر خسرو ۱۲۵۳ء میں پٹیالی ضلع ایٹہ (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ باپ کی طرف سے ترک النسل کے

جانب سے ہندستانی تھے، اور ہندستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ تینوں بھائیوں میں خسرو سب سے زیادہ ذہین اور فطین اور ہونہار تھے، بلکہ بچپن ہی سے غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت کا ثبوت دینے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب خسرو پیدا ہوئے تو ان کے والد بزرگوار امیر سیف الدین محمود جو سلطان شمس الدین التمش فرمانروائے دلی کے مقربین اور ندما میں سے تھے بچے کو ایک خرقے میں لپیٹ کر ایک صوفی منش بزرگ کے پاس لے گئے۔ بچے کو دیکھتے ہی بزرگ نے فرمایا۔ قیامت تک اس کا نام یاد رہے گا اور خاقانی سے دو قدم آگے بڑھ جائے گا۔

امیر خسرو اگرچہ ہندستانی نژاد تھے، تاہم شعرائے ایران بھی ان کی زباندانی اور شعر شاعری کے معترف تھے۔ مولانا جامی اپنی تالیف بہارستان میں رقم طراز ہیں کہ خمسے نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا، عرفی شیرازی خسرو کو "طوطی ہند" کے نام سے یاد کرتے ہیں ؎

بہ روح خسرو ازیں پارسی شکر دادم
کہ کام طوطی ہندوستان شود شیریں

اسی طرح حافظ شیرازی بھی ان کی شیریں کلامی کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

خسرو زمانۂ طفولیت ہی سے شعر موزوں کرلیتے تھے، کیونکہ شاعری کا مادہ ان میں پیدائشی تھا۔ بقول خسرو جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد ماجد نے انہیں مکتب میں بٹھایا اور خوش نویسی کی مشق کے لیے قاضی اسد الدین خطاط کے سپرد کیا۔ خسرو کو خطاطی سے زیادہ شاعری کی دھن تھی۔ انکی طبیعت کی روانی اور شاعری کا ملکہ دیکھکر قاضی اسد الدین خسرو کو اپنے ہمراہ خاجا عزالدین کے پاس لے گئے، اور کہا کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ شاعری میں بلند پروازی کرتا ہے۔ اس کا امتحان لیجیے۔ خاجا صاحب اپنے زمانے کی یگانۂ روزگار علمی شخصیت تھے۔ انہوں نے پہلے خسرو سے پڑھنے کے لیے کہا۔ خسرو نے خاجا صاحب سے بیاض لی اور اس میں سے چند شعر خوش الحانی سے پڑھے۔ خاجا صاحب بہت متاثر ہوئے، اور بعد میں کہا کہ مو، بیضا، تیر اور خربزا ان چار بے جوڑ چیزوں کو موزوں کرو۔ خسرو نے برجستہ کہا ؎

ہر موئی کہ در دو زلف آں صنم است
صد بیضۂ عنبریں براں موئی ضم است
چوں تیر مداں راست دلش را زیرا
چوں خربزہ دندانش میان شکم است

خاجا صاحب خسرو کی رباعی سن کر بے حد متحیر ہوئے اور خوب تعریف کی، گلے لگایا، اور کہا کہ "تمہارا تخلص سلطانی ہونا چاہیے۔ یہ تخلص تمہارے لیے فال نیک ہوگا، اور یہی وجہ ہے کہ پہلے دیوان "تحفۃ الصغر" کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خسرو نے رسمی طور پر شاعری میں کسی کی شاگردی قبول نہیں کی، کیونکہ یہ انہیں گوارا نہ تھا کہ وہ استادی شاگردی کے سلسلے میں پابند ہوکر اپنے ذوق اور رجحان پر بے جا پابندیاں عاید کریں۔ انہوں نے فن شعر میں کمال حاصل کرنے کے لیے مشہور اساتذا کا کلام پڑھنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ خود شعر بھی کہنے لگے۔ خسرو کے الفاظ میں "جو دیوان بھی مجھے مل سکا میں نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا، بلکہ اس کی نقل بھی اپنے کلام میں ضرور کی۔" دوسرے لفظوں میں خسرو کسی استاد کی بجائے اساتذا کے دیوان کو سامنے رکھکر ان کا تتبع کرتے تھے اور ایک عرصے تک بطور خود کہتے رہے۔ جس استاد کے کلام کا مطالعہ کرتے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے، لیکن آخر میں اپنا کلام اساتذا کو دکھلانے لگے۔ اس ضمن میں خسرو نے اپنی آخری مثنوی "ہشت بہشت" کے خاتمے میں صراحت کی ہے کہ "یہ تین سال کی مدت میں لکھا گیا، اور اس زمانے کے ایک عالم و فاضل قاضی شہاب الدین نے ان کا مطالعہ کرکے تصحیح کی ہے بقول خود ؎

یارب او چوں زہیچ نامۂ من
برد بیروں خطائی خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد
در قیامت خط امانش باد

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادا ہیں - یہ ایک حقیقت ہے کہ خسرو نرے مقلد نہ تھے - جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی، وہاں استاد کی رائے کو تسلیم نہیں کرتے تھے، مگر ادب کا پاس بھی ملحوظ رکھتے تھے - ع

عیب آن برمن است نہ بروی

معاصر اساتذہ کے علاوہ خسرو نے قدیم استادوں سے بھی فیض حاصل کیا ہے - ان کے کلام کو سامنے رکھکر خسرو شعر کہتے تھے، اور اس طرح فایدہ اٹھاتے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے سیکھتا ہے - خسرو اپنی "لیلا مجنوں" میں خدائے سخن نظامی گنجوی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں ؎

زندہ است بہ معنی استادم
در نیست منش حیات دادم

"غرۃ الکمال" کے دیباچے میں خسرو لکھتے ہیں کہ میں نظامی کا نہ صرف پیرو، بلکہ شاگرد ہوں ؎

نظم نظامی بہ لطافت چو در
وز در او سر بسر آفاق پر
پختہ از و شد چو معانی تمام
خام بود پختن سودای خام
بگذر ازین خانہ کہ جای تو نیست
وین رہ باریک بہ پای تو نیست
کالبدی داری و جان اندر ست
ہر چہ تو دانی بہ ازاں اندر ست
تا بود ایں سکہ بہ عالم درست
بر تن ترکی بود این شعر چست
مثنوی او راست ثنائی نجری
خشنو شش از دور دعای بگوی
ایں ہمہ زانصاف نگر زور نیست
گر تو نہ بینی دگر کو ر نیست

اسی طرح شیخ سعدی شیرازی سے استفادہ کرنے کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعدی شیرازی بھی خسرو کا احترام کرتے تھے، اور ان کی شاعری کے قدر دان تھے - شہزادہ محمد نے دو مرتبہ دعوت دی، لیکن سعدی بڑھاپے کا عذر پیش کرکے ہندستان نہیں آئے، تاہم انہوں نے خسرو کے بارے میں اسی خط میں لکھا کہ "در ہند خسرو بس است"۔ "در تحفۃ الصغر" میں انوری کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

خوش کہ در عہد تو سلطان سخن
خسرو لاچین سلطانی شدہ است
تا کشد گردوں بہ چشم انوری
خاک من کحل سپاہانی شدہ است

اس طرح سے ایک قصیدے میں خاقانی سے استدعا کرتے ہیں ؎

خاقانی ار ز خاک برآید بہ صد زباں
انصاف این قصیدہ عزہ برآورد

بہر کیف خسرو نے کبھی بھی استادوں کی استادی سے انکار نہیں کیا - وہ تمام اساتذہ کا احترام کرتے تھے - غرض یہ کہ خسرو اپنے کلام کے بارے میں فرماتے کہ میں سرقہ نہیں کرتا، اور نہ ہی میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر ہے، تاہم ان کی غزلیں سوز و گداز اور والہانہ محبت کا بحر ہیں، اور ان کی مثنویاں فطرت نگاری، اور منظر کشی کا مرقع، ان کے قصیدے پر شکوہ الفاظ اور نازک خیالی کا مخزن ہیں، اور ان کے مرثیے درد و الم اور غم و اندوہ کا البم - اس ضمن میں خسرو نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ غزل میں سعدی شیرازی، مثنوی میں گنجوی، قصیدے میں خاقانی شیروانی اور مواعظ و حکمت میں حکیم سنائی جیسے استاد شعرائے قدیم کے مقلد و پیرو ہیں -

خسرو نے اپنی بہتر سالا زندگی میں ہندستان کے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے، اور

پوچھو تو اپنے معاصرین میں انہیں ایک خاص حیثیت اور مرتبہ حاصل تھا۔ ایک طرف خسرو دربار شاہی سے متعلق تھے تو دوسری طرف خواجہ نظام الدین اولیا کے معتقد تھے۔ امارت اور ولایت کے غیر معمولی امتیاز کے باوجود خسرو کے کلام کی مسلّم خوبیوں نے ان کے کلام کے بیشتر اور قابل قدر حصے کو زمانے کی دستبرد سے بچا لیا۔ خسرو نے اپنے کلام کے بہت بڑے حصے کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا، اور اپنی تالیفات کے دیباچوں میں اشعار کی تعداد، سنہ تصنیف، موقع ترتیب اور تدوین جیسی بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں، اور اس طرح یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نظم میں پانچ دیوان، نو مثنویاں، اور غزلیات کے متفرق مجموعے موجود ہیں۔ نثر میں اعجاز خسروی، خزاین الفتوح اور افضل الفواید قابل قدر تصانیف ہیں۔

خسرو کے پہلے دیوان میں جوانی کا کلام شامل ہے، جو انہوں نے سنہ ۶۷۱ ہجری میں مرتب کیا، اور جو "تحفۃ الصغر" کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں تقریباً وہی کلام ہے جو انہوں نے سولہ سال سے انیس سال کی عمر تک لکھا ہے، آغاز جوانی میں خسرو نے خاقانی، انوری اور سنائی جیسے مانے ہوئے اساتذہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی، مگر انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ دیباچے میں خسرو نے اپنی ابتدائی زندگی کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ہر ایک قصیدے کے شروع میں شعر ہے جو قصیدے کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ ان تمام شعروں کو جمع کرنے سے ایک قصیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ خسرو کی ایجاد ہے، قصاید زیادہ تر سلطان غیاث الدین بلبن، اور اس کے بڑے بیٹے سلطان نصیر الدین کی مدح میں ہیں۔ ایک ترجیع بند میں خسرو نے اپنے نانا عماد الملک کا مرثیہ لکھا ہے، جو سلطان غیاث الدین بلبن کے مقربین میں سے تھے۔ اس دیوان میں خسرو اپنا تخلص سلطانی کرتے ہیں۔

دوسرا دیوان "وسط الحیات" ہے جو خسرو نے سنہ ۶۸۴ ہجری میں ترتیب دیا۔ اس میں بیس سے چوبیس اور تیس سے تینتیس سال کی عمر کا کلام ملتا ہے۔ اس میں خسرو اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں، اور دوسرے تین دیوان مرتب کرنے کی طرف اشارا کرتے ہیں۔ قصاید زیادہ تر سلطان نصرت الدین محمد شہید سنہ ۶۸۳ھ کی مدح میں ہیں اور ایک ان کا مرثیا ہے۔ تاریخی اور فنی اعتبار سے وسط الحیات کے قصاید زیادہ دلچسپ ہیں۔ اکثر قصیدوں میں خاقانی شروانی کی پیروی کی گئی ہے۔ کمال اصفہانی کے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔ "غرۃ الکمال" خسرو کا تیسرا دیوان ہے جو انہوں نے سنہ ۶۹۳ھ میں تمام کیا۔ اس میں چونتیس برس سے پینتالیس سال کی عمر تک کا کلام ملتا ہے۔ اس کے مقدمے میں خسرو نے ہندستان کی فارسی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے، اور عربی شاعری پر اس کی فوقیت کو واضح کیا ہے۔ یہ دیوان سب سے بڑا ہے۔ اس میں زیادہ تر قدیم استادوں کی پیروی کی گئی ہے۔ خسرو کے مشہور قصیدے "جنات النجات، مرات الصفا اور دریاے ابرار" اسی دیوان میں موجود ہیں، قصیدوں کے علاوہ اس میں ترجیع بند اور قطعے ہیں۔

خسرو کا چوتھا دیوان "بقیہ نقیہ" ہے، اسکو سنہ ۷۱۶ھ میں تالیف کیا۔ اس میں زیادہ تر بڑھاپے کا کلام ہے، اور اس کے قصاید بھی پرانے استادوں کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیا سلطان علاء الدین خلجی کا بھی ہے۔

"نہایت الکمال" خسرو کا پانچواں دیوان ہے جو انہوں نے سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال اور سلطان محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد اور اپنے انتقال سے کچھ پہلے تالیف کیا۔ یہ دیوان نادر ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی کا مرثیا اور اس کے وا

ح ہے۔ چند قصائد میں تصوف اور حقائق معارف
، مسائل بیان کیے ہیں۔ یہ خسرو کی زندگی کے آخری
ں کا کلام ہے۔

خسرو نے قرآن السعدین کے نام سے ایک تاریخی مثنوی
مہینے کی کاوش اور دماغ سوزی کے بعد ۶۸۸ھ
تکمل کی ہے

ساختہ گشت از روش خامہ
از پس شش ماہ چنین نامہ
در رمضان شد بہ سعادت تمام
یافت قران السعدین نام
آنچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت
بود سن ششصد و ہشتاد و ہشت

ضمن میں یہ لکھنا خالی از بحث نہ ہوگا کہ خسرو نے
ں مثنوی سے قبل باپ بیٹے کے اتحاد و مصالحت پر
ب قصیدہ لکھا تھا، جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ہے

زہے ملک خوش چوں دو سلطان یکی شد
زہی عہد خوش چو دو میان یکی شد
پسر بادشاہی پدر نیز سلطان
کنوں ملک بین چوں دو سلطان یکی شد

ہیں شہزادہ کیقباد اور سلطان بغرا خاں کے مراسلات
صلح اور ملاقات کا حال تفصیل سے درج ہے۔
ان کی پہلی مستقل تصنیف ہے جو خسرو نے اپنی
کے ۳۶ ویں سال میں تصنیف کی خسرو کی جدت
ند طبیعت نے اس میں نہ صرف ہر بات کا عنوان
ر میں دیا ہے، بلکہ مثنوی کی یکسانیت دور کرنے کی
ں سے غزلوں کا اضافہ کیا ہے جو سیاق و سباق سے
سبت رکھتا ہے۔ تاریخی حیثیت سے یہ مثنوی اتنی اہم
ہے، تاہم اس میں بہت سی دلچسپ اور اہم باتیں
ہیں، اگرچہ اس میں تکلف اور آورد بہت ہے،
یہ برجستہ اور رواں ہے۔ اس میں نظم اور لطائف
پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں سب ملحوظ رکھی گئی
- سچ ہے کہ اگر کوئی اس واقعے کو نثر میں لکھتا
بس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خسرو نے سلطان جلال الدین فیروز خلجی کی فتوحات
ذکر پر مبنی ایک "تاریخی مثنوی" بنام مفتاح الفتوح
۶۹۱ھ میں تالیف کی۔ اس مختصر مثنوی کی زبان
بہت ہی سادہ ہے، اور واقعات کو بلا مبالغہ اور بغیر
حشو و زوائد کے پیش کیا ہے۔" قرآن السعدین"
کی طرح اس میں بھی ابیات سلسلے سے موجود ہیں۔ اس
سلسلے میں یہ لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ سلطان جلال
الدین خلجی خسرو کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اور معقول
مشاہرہ مقرر کرکے انہیں خلعت خاص عنایت کیا تھا۔
تخت نشینی کے بعد ندیم خاص اور مصحف داری و
امارت کا عہدہ عطا کیا، اس وقت سے خسرو امیر
خسرو کے نام سے پکارے جانے لگے۔

عشقیہ کے نام سے ایک تاریخی مثنوی خسرو نے ۷۱۵ھ
میں تکمیل کی یہ مثنوی گجرات کے راجا کی صاحبزادی دیول
رانی اور سلطان علاء الدین کے بیٹے خضر خاں کے معاشقے
سے متعلق ہے۔ یہ مثنوی خضور شاہی کے نام سے بھی یاد کی
جاتی ہے۔

خسرو نے "نہ سپہر" کو ۷۱۸ھ میں مکمل کیا۔ یہ مثنوی
نہ صرف تاریخی حیثیت سے، بلکہ معاشرتی اعتبار سے بھی ایک
خاص اہمیت کی حامل ہے، اس میں نو باب ہیں اور ہر باب
جداگانہ بحر میں ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام "نہ سپہر"
رکھا ہے۔ مختلف بحروں کا ایک ہی مثنوی میں استعمال
خسرو کی جدت ہے۔ ایک باب ہندستان سے متعلق ہے۔
جس میں خسرو نے ہندستان کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کیا ہے،
اور ہندستان کی برتری اور فوقیت کو اس طرح ثابت کیا
ہے کہ ہندستان میں علم و فن نے تمام ملکوں سے زیادہ
وسعت حاصل کرلی ہے۔ ہندستان میں دنیا کے مختلف حصوں کے
لوگ تحصیل علم کے لیے آتے ہیں، ہندستان کے لوگ دنیا کی
ہر زبان پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ہندستان
نے اور ملکوں کے مقابلے میں فن موسیقی میں سب سے زیادہ
ترقی کی ہے۔ ہندستان کی ایجادوں میں شطرنج اور صفر بھی
ہیں، ہندستان میں وید جیسی قابل قدر تصنیف ملتی ہے،
جو مذہب، سیاست، معاشرت اور سنگیت کا مرقع ہے،
ہندستان کی تالیف "پنچ تنترا" ہے۔ جس کا ترجمہ
عربی، فارسی اور ترکی زبان کے علاوہ دنیا کی دوسری
زبانوں میں بھی ہوا ہے، اور ہندستان ہی میں خسرو
جیسے سحر البیان، اور جادو قلم پیدا ہوئے جن کی سلطان

قطب الدین مبارک نے اس مثنوی کی تکمیل پر ہاتی کے ہم وزن روپے انعام دیے، جس کے بارے میں خسرو کہتے ہیں ؎

چو میراث شد پیل زر دادنم
نہ زیباست زین سہل تر دادنم
شہا گنج بخشا کرم گسترا
جہاں معانی شناسا سخن داورا
چنیں بخششی کز تو جسم یافتم
در ایام پیشینہ کم یافتم

تاریخی مثنویوں کے سلسلے کی آخری مثنوی "تغلق نامہ" ہے جس کو خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے ترتیب دیا اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات کا ذکر درج ہے۔ یہ مثنوی تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہے، کیونکہ اس میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی بھی تاریخ میں درج نہیں ہیں۔ اصل میں تغلق نامہ۔ تغلق دور کی مفصل تاریخ ہے۔

خسرو کی ہمہ گیر طبیعت نے خدائے سخن نظامی گنجوی کے خمسے کا جواب لکھا، جو "خمسۂ خسرو" کے نام سے موسوم ہے، اور جو انہوں نے ۶۹۸ھ میں تالیف کیا، اور بقول خسرو ان پانچوں مثنویوں یعنی خمسے کی تالیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے جو در اصل خسرو کی قادر الکلامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔ اور "خمسۂ خسرو" کے متعلق جامی کے الفاظ ہیں "خمسۂ نظامی" را بہ از وی کسی در جواب نگفتہ"۔

"خمسۂ خسرو" کے سلسلے کی پہلی مثنوی "مطلع الانوار" ہے۔ یہ نظامی کے "مخزن الاسرار" کا جواب ہے۔ اس مثنوی کو صرف دو ہفتے میں لکھا ہے۔ ان کی دوسری مثنوی "شیریں و خسرو" ہے۔ جو نظامی کے "خسرو شیریں" کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۶۹۸ھ ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں انہوں نے اپنے صاحب زادے مسعود سے خطاب کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا، اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی۔ میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینا سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے ؎

شب تا سحر و ز صبح تا شام
در گوشۂ غم بگیرم آرام

اگرچہ خسرو نے اس مثنوی میں ہر قسم کی شاعری کے مواقع پیدا کیے اور کمال دکھلایا ہے، تاہم نظامی کے سامنے خاکساری سے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے ؎

می داد چو نظم نامہ را پیچ
باقی نگذاشت بہر ما ہیچ

"مجنوں و لیلا" تیسری مثنوی ہے جو نظامی کی "لیلا مجنوں" کے نمونے پر لکھی گئی ہے، اور اسے ۶۹۸ھ میں لکھا۔ اس مثنوی کا سب سے بڑا اثر حصہ وہ اشعار ہیں جس میں خسرو نے اپنی ماں اور بھائی کی وفات کا ماتم کیا ہے، شعر ملاحظہ ہو ؎

امسال دو نور ز اخترم رفت
ہم مادرم و ہم برادرم رفت

اس سلسلے کی چوتھی مثنوی "آئینۂ سکندری" ہے جو نظامی کے سکندر نامے کا جواب ہے، اور اسے بھی سنہ ۶۹۹ھ میں لکھا، اس میں خسرو نظامی کے دوش بدوش ہیں۔ آخری مثنوی اس سلسلے کی "ہشت بہشت" ہے جو نظامی کی ہفت پیکر کے طرز پر تالیف کی گئی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۷۰۱ھ ہے۔ خسرو کی شاعری اس مثنوی میں پختگی اور پرکاری کی آخر حد تک پہنچ گئی ہے۔ یہ تمام مثنویاں علاء الدین محمد شاہ کے نام سے معنون کی گئی ہیں۔

خسرو کی طبیعت کی جولانی کسی بھی صنف سخن میں کم نہیں، قصیدا، غزل، رباعی، سب میں اور یگانہ ہیں۔ ان کی فکر رسا نے اقسام شاعری میں وہ جوہر دکھائے ہیں کہ جن کا مقابلہ آج تک کوئی نہ کر سکا۔ نثر نگاری میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ "اعجاز خسروی" وہ نثری کارنامہ ہے جس میں خسرو نے اور بیان کے اصول منضبط کیے ہیں، اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں۔ اس سے پہلے کسی نے بھی نثر نگاری کے اصول و قواعد مرتب نہیں کیے تھے۔ یہ تین جلدوں میں ہے، اور اس کا سنہ تالیف ۷۱۹ھ ہے۔

"خزائن الفتوح" جو تاریخ علائی کے نام سے بھی موسوم ہے خسرو نے ۷۱۱ھ میں تالیف کی، اس میں سلطان علاء الدین کی فتوحات کا ذکر مندرج ہے۔ یہ تاریخی اعتبار سے بھی بڑی اہم ہے۔ سلطان علاء الدین نے خسرو کے لیے ایک ہزار ٹنکا سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ "افضل الفوائد" میں خسرو نے اپنے پیرو مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات درج کیے ہیں۔ اس کے ایک حصے کو خسرو نے اپنے مرشد کی خدمت میں ۷۱۹ھ میں پیش کیا تھا، جو انہوں نے بہت پسند کیا۔ اس ضمن میں اس امر کا انکشاف نامناسب نہ ہوگا کہ خسرو کی عقیدت و ارادت خواجہ نظام الدین اولیا سے عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی، اور خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا تو خسرو کو پیش کردوں گا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھ کر ہندوؤں کا پوجا استنان کا تماشا دیکھ رہے تھے کہ فرمایا ہے۔

"ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی"

خواجہ صاحب کی ٹوپی ٹیڑھی تھی۔ خسرو نے اس کی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا ع

من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہی

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں خسرو کو دفن کراتا۔ بہرکیف، انہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں میری قبر کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ خواجہ صاحب کی رحلت کے چھ مہینے بعد ہی ذی قعدہ ۷۲۵ھ میں خسرو نے انتقال کیا، اور خواجہ صاحب کے پائنتی دفن کیا گیا۔ خواجہ صاحب کو بھی خسرو سے بے پناہ محبت عقیدت تھی، جس کا اظہار نیچے کے شعروں سے ہوتا ہے۔ ؎

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیت ملک سخن آن خسرو راست
آن خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدای ناصر خسرو ماست

مہدی خواجہ جو شہنشاہ بابر کے امرا میں تھے، انہوں نے ان کا مقبرہ تعمیر کرایا، اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ لکھ کر لوح قبر پر کندہ کرائی ؎

شد "عدیم المثال" یک تاریخ او
۷۲۵ھ
واں دگر شد "طوطی شکر مقال"
۷۲۵ھ

تقی اوحدی اپنی عرفات العارفین میں لکھتے ہیں کہ خسرو نے جس قدر فارسی میں لکھا ہے، اسی قدر ہندستانی یا بھاشا میں بھی ہے، لیکن اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔ اگرچہ "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "جزوے چند از نظم ہندوی نیز نذر دوستان کردہ ام"۔

خسرو ترکی اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور عربی میں ادبائے عرب کے ہم پلا ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انہیں عربی علم و ادب میں عبور حاصل تھا، تاہم انہوں نے دعوا نہیں کیا۔ سنسکرت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ "نہ سپہر" میں سنسکرت دانی کی طرف اشارہ کیا ہے ع

"من قدر برسر ایں کار شدم"

موسیقی میں بھی کمال پیدا کیا تھا، اور "نایک" کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے کئی ایک راگ ایجاد کیے تھے۔ شعر و موسیقی میں ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں ع

"باسخن گفتم کہ من در ہر دو معنی کامل"

"سیر الاولیا" کے مولف امیر خورد لکھتے ہیں کہ خسرو نے ننانوے کتابیں تالیف کی ہیں، اور جامی نے "نفحات الانس" میں لکھا ہے کہ خسرو نے ننانوے کتابیں تصنیف کی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ خسرو کی تالیفات کا مطالعہ ہندستان کی تیرھویں اور چودھویں صدی کی وہ تصویر پیش کرتا ہے، جس میں ملک کی ملی جلی تہذیب و تمدن کے نقوش نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خسرو کی تصانیف ان کے اپنے عہد کا

خسرو

پنڈت گلزار زتشی دہلوی

فخرِ ہندوستان تھے خسرو
ہند کے ترجمان تھے خسرو

روحِ جمہوریت سمجھتے تھے
کل وطن کی زبان تھے خسرو

کاخ شاہوں کا، خانقاہوں کی
باعث عز و شان تھے خسرو

وقت کی ہولناک ظلمت میں
زندگی کا نشان تھے خسرو

شیر ہندی میں تھی شکر اردو
کتنے شیریں زبان تھے خسرو

کلہ گریوں کی شان تھی ان سے
فن آذری کی آن تھے خسرو

خواجۂ راستین کے عاشق
فقر کا امتحان تھے خسرو

روحِ گلزار دین و دنیا تھے
رونقِ دو جہان تھے خسرو

نہ صرف آئینہ دار ہیں، بلکہ ان کے عہد کے ہندستانی کے مزاج و ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ خسرو کی ذات ہندستان کے لیے "قرآن السعدین" تھی، جس میں دو ثقافتوں، دو تہذیبوں اور دو معاشرتوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ خسرو ہندستان کو دنیا کے تمام ملکوں پر ترجیح دیتے ہیں، اور حب وطن من الایمان، کے پیش نظر ہندستان سے اپنی گہری محبت کا اظہار کبھی یوں کرتے ہیں ؎

کشورِ ہند است بہشتی بہ زمیں
حجتش اینک بر رخ منزہ ببیں
بخت ثابت جو دراں نیست شکی
ہفت نجوم بہ نہ بہشتی ست نہ یکی

اور کبھی ہندستان جنت نشان کو اپنا وطن مالوف اس طرح کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ع

"بستِ مرا بیگ و ماوی و وطن"

غرض یہ کہ خسرو کی تالیفات ایک طرف اخلاقی اقدار کا کامل نقش نظر آتی ہیں تو دوسری طرف سیاسیات کا روشن مرقع، ایک طرف آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر کا نظارا پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف ناکامیوں کا المیا، بہرکیف، خسرو کی تصنیفات میں پند و نصیحت، حکمت و تدبیر اور تصوف و معرفت سب کچھ ہے۔ چھ سو سال کے بعد بھی خسرو کا پیغام ہمارے لیے وہ مشعل ہدایت ہے جو منزل مقصود کی طرف ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔

"گوری سووے سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دیس"

ڈاکٹر محمد حمیداللہ

ٹیپو سلطان کی فوج میں ہندستانی زبان کا رواج

کتب خانۂ دفتر ہند INDIA OFFICE
LIBAR میں ۲۷۳۸ تا ۲۷۵۹ ایک
ب سے اکتیس نسخے مکمل اور نامکمل دونوں قسم
ے ہیں جس کا نام "فتح المجاہدین" ہے اس
بعض نسخے ان کتب خانوں میں بھی محفوظ ہیں
یا کہ ان کی فہرستوں سے ظاہر ہے:-

BODLEIAN No. 193;
SUPPLEMENT P 260
W. PERTSCH BERLIN CAT.

اتفاق سے اس کا ایک نسخہ حیدرآباد میں دستیاب
اجکے تفصیلی معائنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب
جی اصول و قواعد پر مشتمل ہے۔ فوجی احکام فارسی
ا اور اشعار ہندستانی میں مندرج ہیں۔

مولف کتاب کا نام زین العابدین ہے۔ دفتر
مر کے نسخے میں "موسوی" کا لفظ بھی زاید ہے۔
وہ بہت عرصے تک مدراس اور بالاگھاٹ میں قیام
نے کے بعد ٹیپو سلطان کا مصاحب بنا۔ اس کتاب
ے دیباچے میں لکھتا ہے کہ ۱۱۷۰ھ میں تیموری
لطنت بعض نوکروں کی نمک حرامی کے باعث
لا قدر ضعیف ہو گئی تھی کہ اہل مغرب نے جو سواحل
ند کے کوٹھی دار اور تجارت کے بہانے سے ہمیشہ
ہتے ہیں ... ۱۲۰۰ ... ۱۱ ... اکر

ملک گیری، اور ملک ستانی شروع کی اور تمام مملکت بنگالا
اور کرناٹک کا کچھ حصا اور بندرگاہ سورت اپنے
قبضے میں کر لیا، اور حالت یہاں تک ناگفتہ بہ ہو گئی
کہ رعایا لوٹی جانے لگی اور مسلمان قیدی چین ماچین
میں غلام بنا کر فروخت کیے جانے لگے۔

اسکے بعد وہ ٹیپو سلطان کی تخت نشینی کو اس
ظلم و ستم اور خرابی کا علاج بتا کر بیان کرتا ہے کہ
یورپیوں کی جنگ میں برتری اور غلبا کا اصلی راز
ان کے توپ و تفنگ میں ہے اسلیئے بادشاہ نے
توپ خانے اور طریقۂ جنگ اور سپاہ آرائی میں
نظام قایم کیا جس کی وجہ سے انہیں فتح یابی حاصل
ہوتی رہی۔ پہلے یورپی فوج کی تعریف اور پھر اپنے
بادشاہ کے انتظام کی تعریف سے پتا چلتا ہے کہ
یورپی قواعد ہی کو مناسب ترمیم کے بعد رایج کر لیا
گیا تھا۔

دیباچے کے آخر میں کہتا ہے کہ ۱۱۹۷ھ میں
... شاہی حکم پہنچا کہ وہ سلطنت کے فوجی قواعد
کو ایک کتاب کی صورت میں مرتب کرے تا کہ یہ
"علم شریف و ہنر لطیف" جو ہندستان میں
نایاب و مفقود ہے رواج پا کر اسلامی فوجوں کی
فتح کا باعث ہو، اس کا آخری جملا اس سلسلے میں
یوں شروع ہوتا ہے "اولا" "پارہ از مسایل
... از ... در مقدمۂ کتاب

ذکر کردہ بہ تحریر قواعد دیگر پردازد "

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، مگر انڈیا آفس کے مکمل نسخے ۲۷۳۵ کے متعلق تبصرہ کی تشریح سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب مختصر اور غلط ہے، چنانچہ لندن کے نسخے میں پہلا باب " در بیان مسایل (مسایل R E A D) عقاید و نماز وغیرہ و مسایل (مسایل) متبع تمباکو و نمک حرامی و ترکہ جہاد وغیرہ ہے " مگر پیش نظر نسخے میں تمباکو کی ممانعت کا تذکرہ موجود نہیں ہے - اس کے سوا انڈیا آفس کا نسخہ ۲۷۵۹ جو صرف اقتباس ہے، اس میں پہلے دو صفحے ایک حساب میں ہیں جسے کرشمہ کہتے ہیں، اس کی عبارت یوں شروع ہوتی ہے - " چو تعداد حرف کلمات شہادتین بیست و چہاری شود لہذا مقدار بیست و چہار عرض - آخری بارہ ورق حسابی جدولوں پر مشتمل ہیں - اس باب میں اولاً اسلام و ایمان کی تعریف احادیث کے ذریعے کی گئی ہے - اس کے بعد اسلامی معتقدات یعنی خدا رسول فرشتے، قیامت، پیغمبران قضا و قدر وغیرہ کا تذکرہ ہے - پھر مسایل وضو اور مسایل نماز دو عنوانوں کے تحت ان امور کے متعلق ایک مجمل بیان تحریر کرتا ہے - مسایل جہاد اس باب کا آخری عنوان ہے - اس میں قرآنی آیتیں، احادیث نبوی اور (غالباً) ذاتی خیالات مقدس جنگ یعنی جہاد کے متعلق نقل کرتا ہے، ان کے مطالعے سے اس زمانے کی اسلامی ذہنیت کا پتا چلتا ہے جبکہ ان کے پاس حکومت تھی اور ان پر ایسا بادشاہ حکمرانی کرتا تھا جو توسیع مملکت کا شایق اور جنگ کا دھنی تھا - قرآن و حدیث شریف کو جیسا کہ ہر طبع عبارت میں ہوتا ہے، مرتب کتاب بھی تاویل و توجیہ کے ذریعے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا ہے - اس کے بعد چند سیاسی جرایم کا تذکرہ کرتا ہے کہ سازش اور خیانت وغیرہ اور فرار کی کیا سزا ہے - رشوت کے جرایم اور گناہوں کا اور آخر میں کسی بادشاہ کی اطاعت اور وفا داری سلطنت کے مسایل پر اس باب کو ختم کرتا ہے - (یہ ۵۰ صفحوں میں آیا ہے جبکہ

میں دس سطریں ہیں - خط بہت جلی ہے تقطیع چھوٹی ہے)

انڈیا آفس کے نسخے میں دوسرا باب " دربیان فالنامۂ از ن علی و اسمائے زمقرری براے تقسیم حساب و لفظ وزن و تعداد مقرری " ہے مگر پیش نظر نسخے میں یہ باب سرے سے غایب ہے -

باب سوم تدابیر حرب کے بیان میں ہے، اور باب اول کے بمقابل بہت مختصر ہے، چنانچہ صرف ۳ صفحوں میں آیا ہے، مگر اس سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہے، کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے اصول جنگ کیا تھے فوج کو کس طرح آراستہ کرنا چاہیے جنگل یا میدان یا پہاڑ یا چھما مقام جنگ ہوں تو آراستگی میں کیا تفاوت ہوتا ہے - توپ، بندوق سے کس طرح مناسب کام لیا جا سکتا ہے - " جنگ صعب " اور " جنگ قزاقی " کب اور کس طرح شروع کرنی چاہیے - شب خون دشمن کی فوج کے میدان میں خیما زن ہونے کے وقت کرنا کیوں مفید ہے، اور اس کا طریقہ کیا ہے - دشمن کی فوج زیادہ ہو تو کس طرح مقابلہ مقام کرنا چاہیے اور کم ہو تو کن باتوں سے خبردار رہنا ضروری ہے، سوار فوج کہاں رہے اور فوج کی کس طرح تقسیم ہو اس کا طریقہ اور اس کی ضروریات اور قابل لحاظ باتیں، افسر اعلا موقع و محل کا خود معائنہ کرتے اس علم سے جنگ میں کس طرح فوج کی رہنمائی کرے - ہوا کے رخ کا جنگ کے وقت لحاظ، افسر اعلا کے قتل پر اس کا فوری جانشین اور بلا تاخیر جنگ کا جاری رکھنا قلعہ بند ہونے کی صورت میں کیا کرنا چاہیے - پسپائی اور واپسی، سپاہ کی تعداد میں کمی و زیادتی اور دشمن کی تعداد کے لحاظ سے جنگ شروع کرنے کا وقت، جاسوسی یا جنگ کی ابتدا خود نہ کرنی چاہیے - قلعہ شکنی میں اولاً کن حصوں پر گولہ باری ہو وغیرہ -

باب چہارم، حکم نامہ بنام سرنجشی و متصدیان نقدا کچہری خضور میں ہے - انڈیا آفس کے پہلے نسخے میں " وغیرہا " زاید ہے اور ۲۷۲۶ میں " بنام سپہ دار وغیرہا " ہے - اس باب میں اولاً نمک حرامی کے اقسام تباکو ممانعت کی تفصیل کر

م ان سے باز رہیں اور اپنے ماتحتوں پر نگرانی کھیں، چنانچہ سپاہیوں کا "چہرا" یعنی حلیا نے اور ماہ بماہ تنخا تقسیم کرنے، پریڈ اور اعد کے ذریعے سپاہ کو مستعد رکھنے اور امان حرب وضرب کی نگہداشت اور اس کے چھپا کھنے پر زور دیا گیا ہے۔ سامان حرب وضرب ر گولا بارود کے علاوا بندوق اور "قطار و نک وغیرا" کی نگرانی ہو اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں کی مت سرکاری کارخانے میں فوراً کرائیں۔

فوجی اصلاحات میں فارسی الفاظ کے واج کا حکم، اور امر ونہی ایزدی واحکام حضرت سالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ترجما ربی سے کرایا گیا ہے، اس پر عمل درواج کا خیال یں اور خلاف ورزی پر فوراً سزا دیں۔

اس کے بعد سام (پریڈ یا قواعد) کا ذکر ہے س کے ابتدائی حصے کی نقل غیر دلچسپ ہوگی۔ ستا ودنگ، صفیں یک یک، راست پشت گرد، پ پشت گرد، دہ وپنج گام رو وغیرا وغیرا۔ بدستور، بزن، راست گرد، چپ گرد، صفیں ملحق، د راست پشت گرد، چپ پشت گرد، دہ وپنج م رو وغیرا وغیرا- بدستور، بزن، راست گرد پ گرد- صفیں ملحق، رو (یعنی متفرق ہو جاؤ) د قدم، آہستا قدم، قدم بزن، باش، برابر، ات ہیں اور اسی قسم کی چند اصطلاحات ہیں ر غالباً فرانسیسی یا انگریزی کا ترجما ہیں- ایک ت قابل ذکر یہ ہے کہ بعض ترکی الفاظ بھی مروج یا مثلاً قاشلق، جوق- بعض الفاظ مثلاً ک، قشون، تیپ، جان، کا مفہوم پوری عد کا گہرا مطالعا کرنے پر کوئی فوجی قواعد داں ع سکتا ہے۔

ہر قسم کی فوج کے لیے علاحدا علاحدا قواعد ہے- قواعد چلیپا رنگروٹوں کے لیے قواعد غیر لحقات لادی گردش یا گشت، جنگ دوبازد (جن کی تین یں ہیں) جنگ دوطرف، قواعد توپ (جس ا پر کن اور سر کن اچھے الفاظ ہیں) قواعد چہار توپ، قواعد نیزا، قواعد شمشیر اور باب قدم ہیں پورے احکام پریڈ موجود ہیں مگر ان سے اس وقت زیادا بحث غیر ضروری ہے۔

اس کے آگے یزک دار، دفعدار، جمعدار سرخیل، جوقدار، رسالا دار، سپاہ دار، بخشی ومتصدی لکھے گئے ہیں جن میں ان کے فرائض کی تشریح کر کے قصور اور سزا کی مقدار کا بھی تذکرا ہوا ہے سب سے چھوٹا عہدا یزک دار اور سب سے بڑا سپاہ دار ہے اور درجا بدرجا ترقی مل سکتی ہے، اور قاعدے تبدیل یزک (پہرا) اور قاعدے کیوان اول اور قاعدے تبدیل منقلا (گارڈ) اور قاعدے چاشت وشام (یعنی صبح وشام) کی پوری تفصیل ہے- پھر ایک دلچسپ عنوان ہے جو پورا پورا نقل کیا جاتا ہے یہ محافظا در رہگذروں سے متعلق ہے۔

"قاعدے سوال وجواب یزک دار ومردم رہگذر"۔ سوال: کیست؟- جواب- سرکار!- سوال کے سرکار؟ جواب- حیدری سرکار- سوال- کے جوق، جواب- فلاں جوق، (فلاں کی جگہ نام لینا چاہیے)

تفصیل اور جنگ کے وقت حفاظت ونگرانی اور رخصت کے احکام اور سزا کے بعد یہ باب ختم ہوتا ہے۔

۵ واں باب تفویض خدمات میں ہے یعنی ترقی و تقرر- اس سلسلے میں بیان ہوا ہے کہ جیشا ترقی ایک دم نہ دینی چاہیے، بلکے یزک دار کو دفعدار، پھر جمعدار، پھر سرخیل، پھر جوق دار، پھر رسالا دار، سپاہ دار، پھر سپاہ دار، پھر سپاہ سالار یعنی دو تین سپاہ داروں کا حاکم بنانا چاہیے- لائق سرخیلوں کو نیابتی اور نیابتی گری کے بعد جوقدار بنانا مناسب ہے، اور کوئی شخص چاہے کتنا ہی عمدا مدبر شجاع کیوں نہ ہو اس کو ایکدم بڑے عہدے پر ترقی نہ دینی چاہیے، بلکے درجا بدرجا لیکن جلد جلد ترقی دیجا سکتی ہے۔

رخصت (یعنی خادم) سلام، رخصت (اختتام)

کے بعد "سر کردن توپ ہاے خوشی" کا بیان ہے کہ عید رمضان، ذلحجہ اور اپنی جماعت کی فتح پر، گیارہ توپ، شاہی فتح پر ایک سو ایک دفعا غروب آفتاب کی دروازے بند ہونے کے وقت کی اور طلوع آفتاب اور دروازے کھولنے کی اطلاع میں ایک ایک توپ چلائی جاتی تھی۔ ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ اپنے سے صرف ایک درجا کم یا زاید کے عہدے دار کے ساتھ مل کر کھانا کھا سکتا تھا، اس سے زیادا پر تنبیہ کی جاتی تھی۔

اس کے بعد ایک انڈکس ہے جس میں انگریزی یا فرانسیسی فوج کے مروجا اصطلاحات کا ترجما جو سلطانی فوج میں بطور مرادف استعمال کیا جاتا تھا، مندرج ہے جس سے بہت مفید معلومات ہوتی ہیں۔ نستعلیق حروف جو ذیل میں ہیں اصل میں سیاہ ہیں اور نسخ یعنی عربی سرخی سے تحریر ہیں۔

اسماے صاحب خدمات وغیرا

قشون	لگری	کیوان	روزنڈ
سپاہ دار	سردار لگری	کیوان اول	گرا مُنڈ روزنڈ
رسالا دار	کمندان	کیوان دوم	رجیٹ روزنڈ
جوقدار	سر برار	کیوان سیوم	نیٹ روزنڈ
سرخیل	جا صدار	سام	کمان (کمانڈینی قواعد یا پرڈ)
جا صدار	حوالدار	ثریا	فیل (غالبؔ فایل)
وقعدار	نایک	کہکشاں	لام (غالبؔ لامیں)
یزک دار	سپاہی	نجم	کرت (کوارٹر گارڈ)
پیا قچی	ایجیٹن (مراد اجٹنٹ)	نواسوز	اشیٹ جن
سرپیا قچی	جنرل ایجیٹن	چاشت	(۵ گھڑی دن نکلا)
			وشان (دو گھڑی رہے شام)
نغشور	دروغا	معلم دفعدار	دلیل نایک
خستلا	سوات (مراد گاڑی)	معلم جاصدار	دلیل حوالدار
دیسالا	نیالا سردار نیالچین؟	طنبور	—
جرق	کھینچا	نے	—
یزک	پہرہ	سنج	جھانج
تقان	پردل (غنی دلیج منڈ)	طنبورچی	—
منقلائے پیش	میکاڈ (دین گارڈ)	نے نواز	—
منقلائے عقب	ریر گارڈ	سنجی	غالبؔ سنج چی

دارالشفا براے مجروح وبیمار

نان پرورشی (وظیفا معذوران جنگ)

انڈیا آفس کے نسخے میں ۶ اور ۸ ویں بابوں میں توپ خانا، سوارا فوج، اور پیادا فوج کے احکام درج ہیں، مگر ہمارے پیش نظر نسخے میں ان کے لیے مستقل باب تو نہیں، البتا ۵ ویں باب میں ضمناً ان کا تذکرا ادھر ادھر آ گیا ہے، ان کے سوا اس میں آخری دو صفحے (جو ۱۴۰ ویں ورق پر ختم ہوتے ہیں) سانپ کے زہر کا علاج لکھے ہیں۔ صرف ہوے ہیں۔ یہاں پر یہ نسخہ ختم ہو جاتا ہے۔ جو حقیقت میں اصلی نہیں، بلکے ایک نقل ہے جیسا کہ املا کی غلطیوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوا بہت سے اور بھی نسخے ہیں ان میں سے ۲۷۵۵ء اور ۲۷۵۹ء کے آخر میں ریختا غزلیں ہیں۔ ان کے متعلق فہرست میں جو انگریزی نوٹ ہے اس کا اقتباس درج اور ترجما کیا جاتا ہے

نسخا ۲۷۵۵ء نامکمل — No 2755 in complete

اسکے سوا یہ نسخی — Beyond this the copy is

محض ایک مجاہے کہ — merely a bygone on

ورق ۷۳ ب سے ۷۷ ب — fol 73B-77B PRT The

تک چند اردو غزلیں نظر — vari appears rare

آتی ہیں جو دن کے مختلف — tacf zal FRT The

اوقات سے ہیں اور ان — varigni STimes of

میں سپاہیوں کے زائض — The day with refre

کا بھی تذکرا ہے، اوراق — meen The sdaies

۷۸ سے ۹۰ تک ہیں اتیں — duties on FF 78-90

کے متعلق مختلف امور ملکی — miscellaneous

غیر واضح شکستا خط میں — maters scfeys

ہیں جو ایک نئے ہات — The same wse hn

کی تحریر ہے۔ — y other Hand

almost incgalsta

۱۲۵۷ - ناکمل No. 2756 incomplete
ورق ۵۹ ب پر چند on fol 59 ff 59 some
چند اردو اشعار ہیں' Rekhta verses the
اور ورق ۳۴ ب پر re is obviously a
بظاہر ایک بڑی جگہ سادا large lacuna on
ہے' جس کے بعد fol 34 where sudd
یک بیک ایک نیا خط enly a quite a new ha
شروع ہوتا ہے - nd writing commence

یہ اشعار ہمارے لیے نسخے انڈکس کے بعد ورق ۴۷ ب سے شروع ہوتے ہیں - ان کی نقل سے پہلے ایک بات بیان کرنی ضروری ہے' وہ یہ کہ یہ اشعار اصلی ہیں ؟ کیا درست نہیں ہے کہ یہ بعد میں اضافا کیے گئے - اس کے کئی وجوہ ہیں - اول تو یہ کہ انڈیا آفس کا مکمل نسخا اصلی نسخا ہے یہ ضروری نہیں کہ وہ اصلی نسخے میں بھی تھے - جن دو نسخوں میں اردو اشعار ہیں' ان کے دیکھنے کا اگرچہ موقع نہیں ملا' لیکن انڈیا آفس کی فہرست میں اڈیٹر نے جو عبارت لکھی ہے اور جو اوپر نقل کی گئی ہے' اس پر غور کرنا چاہیے - ۱۲۵۵ء میں یہ نہیں بیان ہوا ہے کہ ہندستانی اشعار الگ خط کے ہیں' بلکہ ان کے بعد کچھ اور باتیں جو اسی قسم کی ہیں دوسرے ہات کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں - دوسرے نسخے میں اگرچہ یہ بیان ہوا ہے کہ ۳۴ ویں سے خط بدل گیا ہے اور اسی طرح ضمنیً ہندستانی اشعار ۵۹ ویں ورق پر ہیں اور نیا خط ۳۴ ویں ورق سے شروع ہوتا ہے - اگر ہندستانی اشعار بعد کے سمجھے جائیں تو اس تمام حصے کو بھرتی کا سمجھنا چاہیے جو نئے خط کی ابتدا سے ہے' حالانکے ایسا نہیں ہے - بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کے کاتب کو اصل کتاب کا کچھ اور حصا ملا جو اس کے پاس کی کتاب میں نہ تھا تو اس نے احتیاطً تھوڑی سی جگہ سادا چھوڑ کر باقی حصا نقل کر لیا -

اس کے برخلاف ہمارا نسخا اصل شاہی نسخے کی نقل معلوم ہوتا ہے' کیونکہ پہلے صفحے پر بسم اللہ الرحمن الرحیم کے اوپر ایک مہر کی نقل ہے جو اس طرح ہے -

۲۱۲ [illegible]

اس مہر کے برابر ۱۲۱۵ لکھا ہوا ہے جن کا منشا معما ہے - اس کے سوا اصل کتاب کی تصنیف ۱۱۹۷ ہجری ہے اور ہمارا نسخا ۱۲۰۱ھ میں نقل کرایا گیا ہے - (جو اصل نسخے کی تصنیف شروع ہونے کے صرف چار برس بعد کا ہے) چنانچہ ابتدائی صفحے پر کتاب کے نیچے یہ عبارت ہے -
" در میلا پور معرفت دلیر جنگ بہادر تیاریخ ۷ ربیع الاول ۱۲۰۱ ہجری زیبا یندہ شد "

اس صفحے پر تین مہریں ہیں جو مٹی ہوئی ہیں مگر خوردبین سے واضح ہوتا ہے کہ ایک پر

بہادر ۱۲۰۶
کتاب عماد الدولہ

ہے جو ویسے بھی ذرا غور سے پڑا جاتا ہے - دوسری پر

عبدالوہاب خان

نظر آتا ہے سنہ میں کچھ ۶۶ سا پڑا جا سکتا ہے - اس کے سوا تیسری سب سے مدہم مہر جو سے پڑی نہ جا سکی - اندر بھی ٹیپو سلطان والی مہر کے بازو ایک اور اسی قسم کی مہر ہے جس کے پڑنے کے لیے ایک اچھی خردبین کی ضرورت ہے' مگر یہ بیرونی باتیں ہیں -

اندرونی ثبوت میں چند باتیں قابل ذکر ہیں -

اولً ہندستانی اشعار کی زبان سے پتا چلتا ہے کہ یہ ٹیپو سلطانی عہد سے زیادا بعد کی نہیں جیسا کہ ناظرین پر بھی جب اسی عہد کے ہندستانی اشعار کا مطالعا کریں گے تو واضح ہو جائے گا (ملاحظا ہو اردوے قدیم از سید شمس اللہ قادری) دوسرے یہ غزلیں اسی خط میں ہیں جس میں باقی کتاب تحریر ہوئی ہے -

تیسری بات یہ ہے کہ ہندستانی غزلوں کے آخر میں " نام ہائے دوازدہ ماہ " کی سرخی سے بارا مہینے ہیں - " احمدی - بہاری ' جعفری ' دراقی ' ہاشمی ' واصلی ' زبرجدی ' حیدری ' طلوعی ' یوسفی ' ایزدی ' باطنی - اسی عہد کی بعض کتابوں کے آخر میں جن کا تذکرا فہرست کتب خانے انڈیا آفس میں نظر سے گذرا ' ٹیپو سلطان کا نام اور اس کے بعد حکم کی تاریخ یہی مہینے لکھے ہوے ہیں ؛ اقتصادی ضروریات سے شمسی مہینوں کے رواج کی ضرورت تھی' اور سیمی مہینوں کی بجاے یہ مہینے منظور کیے گئے (اسی سلسلے میں حیدرآباد کے فصلی مہینوں کے متعلق اشارا کرنا نامناسب نہ ہوگا

حیدرآباد میں بھی ایسا ہی کیا گیا)

چونکہ یہ آخری باب ۵ انہیں اشعار کے بعد ہے اور اسی ورق پر ہے جس پر کئی ایک غزلیں ہیں اس لیے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جب یہ مہینے سلطانی سلطنت میں مروج تھے تو ان فوجی غزلوں کے رواج کو بعید از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا خصوصی نسخہ ٹیپو سلطان کی وفات سے کوئی پورا سال قبل نقل ہوا ہے۔ فارسی کی بجائے ہندستانی اشعار کی غالباً یہ وجہ ہے کہ اس زمانے میں سرکاری زبان فارسی تھی، لیکن ہندستانی ملک میں خوب مروج تھی، اور سپاہیوں میں سے اکثر کی مادری زبان تھی۔

فوجی گانوں میں جو بیتیں سب سے زیادہ مستعمل تھیں وہ یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

غزل - وقت آہستا قدم - پشتو

ملک ہندوستان میں دین کا دین سلطان ہے
غرق جس کے آب خنجر میں فرنگستان ہے
کیا ہے نسبت جاہ و حشمت میں سکندر میں تجھے
بارگاہ قدر کا دارا تیرا دربان ہے
ہے وہی انسان کامل جس میں ہو معنی کی بو
نقش دیبائی وگرنہ صورت انسان ہے

مذکورۂ بالا غزل غالباً آہستا روی کے وقت بجائی جاتی تھی اور مندرجۂ ذیل تیز روی کے وقت

غزل - وقت جلد قدم - ہندول

بجا ہے کہیے اسی کو شہ خواص و عام
کہ جس کے رعب سیں لرزاں ہے آفتاب مدام
لقب ہوا اسے سلطان دیں اسی خاطر
کہ ہے مروج شرع اور حامئ اسلام
ہوا زمان محمد تیں رائج کر عہد میں جس کے
[illegible] خواب میں بجا لاوئے تمام

غزل - وقت ضرب سنان - جنگلا

یا الٰہی رہے تا حشر وہ سلطان جہاں
جس کے ہے عدل سیں سرسبز گلستان جہاں
سرنوشت آیۂ فتح است علم کے جس کے
کیوں نہ دیں باج اسے جملہ شاہان جہاں
حیدری رسم کو احیا کرے عالم میں کوئی
ہے بجا کہیے اگر اس کے تئیں جان جہاں

صبح سویرے یہ غزل بجتی تھی۔

فرنگ و زنگ تری تیغ سے کیوں نہ لرزاں ہو
کہ جس خوف دم میں برق ہر دم پا یہ داماں ہو
دعا کرتا ہے ہر ایک مور جس وادی میں تو گذرے
کہ یارب یہ جہاں داور زمانہ کا سلیماں ہو
لب ہر ذرہ سیں یہ لفظ نکلے ہے بصد آمیں
فلک پہ مہر ہے جب تک زمیں پر ٹیپو سلطاں ہو

مذکورہ ذیل غزل فوج کے بدلنے کے موقع پر بجائی جاتی تھی۔

غزل وقت تبدیل منقلا پنج گھڑی روز بجانا - توڑی

بلبل ثنا کرے ہے جب گل سی گلستاں میں
میں خلق کا تیرے وصف کتنا بھروں جہاں میں
گر یاد خلق تیرا گذرے چمن کے دل پر
ہر خار بار لاوے صدرستہ گل خزاں میں
طاق بلند نسیاں ہے جای نام کسریٰ
شہرہ ہوا تیرا عدل از بسکہ اب جہاں میں

یہ رباعی صبح میں بجائی جاتی تھی۔

رباعی وقت نشان سہ پاس روز گذشتا - سارنگ

روشن ہے تیرے سیں اب چہ ماہیں وچہ زنگ اے مہر جمال
انگشت نما ہے تیغ تیری در شہر فرنگ مانند ہلال
اور ہے ترے عدل سیں یہ صورت کہ ہی بے رنگ گزاف
پائے ہے بغل میں اپنے آئینہ کو سنگ فرزند مثال

غزل وقت نشان یعنی دو گھڑی روز باقی ماندہ - کورہ

خلق تیرا کرے جو [illegible]
آرے یوسف ہے [illegible]

ہجر کی رات دیدۂ عاشق
بخت سیں ترے سب کی بیداری
اوٹھ گیا اب جہان سے نام خراب
ہے یہ تیرے عدل کی یہ معماری

غزل وقت توپ شب کہ یک پاس گذشتہ می زنند - کلیان

ازل سے ہو جو ستے لب خلل الٰہی
اسی سے سیکھے فریدوں رسم جمجاہی
رہے ذرّاں پر خورشید میں قبائی فلک
جو جیت ہے ترے جامہ پر خلعت شاہی
الٰہی جب تیں قائم ہے آسمان و زمین
مطیع حکم ہو اس کا زمانہ تا ماہی

خوشی اور مسرت کے وقت یہ اشعار بجائے جاتے تھے۔

غزل در وقت سرور و فرحت - پوربی

نہ کیجے خواب میں رہے زوال اے ظل سبحانی
اگر خورشید سیکھے تجھ سے آئین جہاں بانی
سیکھے تجھ سے
مجسم ہو ترا گر حسن خلق اے آیۂ رحمت
نکالے یک گریباں سے سر یا ماہ کنعانی
الٰہی یہ شہ انجم حشم گردش سیں گردوں کے
نہ ہو خورشید کے مانند گاہے جبیں پہ پیشانی

کسی کو بطور سزا تشہیر کرایا جاتا تو اس کے ساتھ یہ ڈھنڈورا پیٹتا -

غزل وقت تشہیر مرد گنہگار ، یمن

ذات سیں تیرے ہے قائم عدل اے جمجاہ و بس
حکم سیں تیرے ہے نکلا عدل کے دل کا ہوس
عدل کے خوف سے تیرے اے شہ بیدار بخت
خواب شیریں میں خوش کوہے خانہ چشم سن
کہ ملوے ملا تجھ تیغ سیں کاٹے ہے جب
[illegible]

غزل وقت تشہیر زن گنہگا - دہناسری

بہرام ہراساں آہے ترے خنجر سیں پر چرخ دو رنگ
چمکے ہے درخش ترے گرد و فرسیں آمفدر جنگ
تجھ تیغ کا آب گرچہ درکشور ہند ہے موج میں تنگ
ز نیزہ گذر گیا ہے پانی رسیں در ملک فرنگ

غزل در وقت طنبور اول کوچ - شام کلیان

ہے ترا بندۂ زمان نہ تنہا بہرام
حلقہ در گوش پا ہے چرخ مہ نو سے تمام
مشتری دام کرے اس سے سعادت دائم
کوکب بخت کا ترے جو ہو کیوان غلام
ابلق چرخ ترے حکم پہ کیوں نکر نہ پھرے
کہ ازل سے تیرے کف میں ہے زمانہ کا زمام

غزل در وقت طنبور دویم کوچ - للت

تاباں ہے برج اوج میں وہ آفتاب آج
خورشید جس کی شرم سیں ہے آب آب آج
ہو تشنہ آب آتش فردا اگر عدو
شمشیر سیں تیرے ہے یک قطرۂ آب آج
رائج ہے طبع سیں تیری از بسکہ راستی
زلف پری رخاں سیں اٹھا پیچ و تاب آج

تیسری آواز پر دو مخمس بجتے تھے ۔

ہے علم داروں میں تیرے چرخ اطلس نام ایک
نیزہ داروں کی تیرے سیں ہے بہرام ایک
بزم ہمت کا ترے ہے مہر زریں جام ایک
ہفت مہ سپہر ہے تیرا مد انعام ایک
الغرض عالم میں ہے تو داورا یام ایک
پھر وہ ہمت تیرا جب سیں سنی آشنا ہوا
سرو کے دامن سے سیں دامن آ نہ کا [illegible]
عدل کا شعبہ تیرا از جہاں تا [illegible]
[illegible]

کیا عجب گر بعد ازاں ہو جو صبح و شام ایک منتشر سپاہیوں کو جمع کرنے پر۔

غزل ۔ جہت اجتماع مردم متفرق ۔

کھماج

اے آفتاب جلوہ دہ آسمان عدل
شاداب ہے تیرے سے یہ گلستان عدل
بے ملنت دروغ کہے ہے یہ حرف راست
بہتر ہے تیرے سیں کون ہو شاہ جہان عدل
جز وصف تیری ذات کا ہرگز سنے نہ کوئی
گویا بیان قال سیں گر ہو زبان عدل

واضح رہے کہ بعض مصرع موزوں نہیں معلوم ہوتے اصل کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے، لیکن کسی اور نسخے کی غیر موجودگی کے باعث مقابلہ نہیں کیا جا سکا۔

[مشکل قدیم الفاظ بہت کم ہیں۔ "سیں" سے کی جگہ ہر مقام پر مستعمل ہوا ہے۔ مصرع دوم آخری غزل کے سوا جہاں "سے" ہی اصل میں بھی لکھا ہوا ہے۔ اس کے سوا "تجھ" "تیرے" کے معنی میں اور "تیں" "تجھ" کے لیے رائج ہے۔ "گ" پر مرکز اصل میں نہیں ہے، لیکن سہولت کے لیے اس عنوان میں لگا دیا گیا ہے، اور چار اعراب بھی بڑھا دیے گئے ہیں۔ آسانی کے لیے بعض الفاظ کے نیچے معنی کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہر غزل ایک خاص طرز میں بجائی جاتی جس کے نام بھی اصل میں لکھے ہوئے ہیں ان کی تشریح اس لیے ضروری ہے کہ اس کا دقت فارسی میں بازدہی موجود ہے]

یہ مختصر کیفیت ہے جو فتح المجاہدین کے مطالعے کے بعد مرتب کی گئی۔

ہندستانی بولو
ہندستانی سیکھو
ہندستانی پڑھو

محمد ایوب واقف

اقبال

دانا تھا راز دار تھا وہ اک حکیم تھا
اقبال جس کا نام ہے شاعر عظیم تھا
اس کے تخیلات سے عالم ہے فیضیاب
فضل و کمال کا وہ جہاں میں تھا آفتاب
مشرق کے کاروان ادب کا تھا وہ امیر
حب وطن کے گیت وہ گاتا تھا بے نظیر
اس نے کہا خودی کو سمجھ لے جو آدمی
ظلمت بدوش زیست میں اسکی ہو روشنی
تقدیر کا پابند نہ ہو آدمی کبھی
اس نے کہا تدبیر سے بنتی ہے زندگی
شر کی چھری سے جسم ہو انساں کا خوں سے تر
اس نے کہا کہ پھر بھی نہ ہو صدق سے مفر
خواہش ہے کہ مرانی ہستی کی گر تجھے
اس نے کہا کہ اس کے لیے درد سری لے
مذہب ہو چاہے جس کا بھی لازم ہے احترام
مذہب بقول اس کے ہے انسانیت کا نام
اعمال صالحہ کی ہو رفتار تیز تر
اس نے کہا کہ زیست کی مدت ہے مختصر

مبشر علی صدیقی

شکیل بدایونی

شکیل ۱۳ اگست ۱۹۱۶ء بروز جمعرات بدایوں میں پیدا ہوئے، ہندستانی اور فارسی کی تعلیم بدایون ہی میں مختلف اساتذہ سے حاصل کی، اور اسلامیہ ہائی اسکول بدایون سے ہائی اسکول کا امتحان ۱۹۳۶ء میں پاس کیا، اور ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ہوا اور ان کی پہلی غزل کا مقطع یہ ہے ؎

بھلا دو دل سے شکیل اب جواب خط کا خیال
امید واپسی نامہ بر نہیں آتی

شکیل خود اپنے شعر کہنے کے متعلق ایک انٹرویو میں نریش کمار شاد کو بتاتے ہیں۔ "شعر کی تخلیق کے لیے مجھے تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خیالوں میں ڈوب کر اپنے جذبات کی ادائیگی کے لیے پہلے کوئی حسین زمین اور ردیف قافیہ تلاش کرتا ہوں۔ اس کے بعد جو کہنا چاہتا ہوں شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہوں۔"

شکیل ۳ جون ۱۹۴۶ء سے فلمی دنیا میں شامل ہوئے۔ فلم ڈائرکٹر اے آر کاردار نے ان کو فلمی دنیا میں آنے کی پیش کش کی تھی۔ وہ میوزک ڈائرکٹر نوشاد سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندستان کے کئی نامور شعرا اس وقت تک فلمی دنیا میں داخل ہو چکے تھے۔ کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، جاں نثار اختر وغیرہ۔ ان کی فلمی شہرت سے قطع نظر ادبی اہمیت ہے۔ شکیل بھی اسی زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری کی ادبی اہمیت ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک ایسی کسک، سوز اور غنائی کیفیت ہے جو ہمارے دل و دماغ کو بجلی کی ایک ہلکی رو کی طرح متاثر کرتی ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے دنیائے رنگ و بو میں کھو جاتے ہیں۔ شکیل نے انگریزی اور ہندستان کے قدیم و جدید شعرا کے کلام کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ فارسی شعرا سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ انگریزی شعرا میں براؤننگ، کیٹس اور شیلے شکیل کو پسند تھے۔ فارسی میں حافظ اور سعدی، ہندستان میں کبیر داس اور سور داس اور مومن، غالب، اقبال، فانی، جگر اور اصغر نے ان کو متاثر کیا تھا۔ فلمی شاعروں میں ساحر اور راجندر کرشن کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ شکیل عروض سے زیادہ واقف نہ تھے، لیکن تھوڑا بہت عروض ضرور جانتے تھے۔ ان کے نزدیک مشاعرے ہندستانی کی ترویج و اشاعت کے لیے ضروری تھے۔ وہ سیاست کی دنیا سے دور تھے، اور ان کا نظریہ حب الوطنی ملک کی آزادی کو قائم رکھنے کا عزم، امن اور محبت ہے، وہ ادب میں افادیت اور مقصدیت کے قائل تھے۔ شکیل شراب نہیں پیتے تھے، لیکن انھوں نے خمریہ اشعار ضرور کہے ہیں۔ شکیل کی غزلیات میں

کیف و مستی کا نظریہ لا محدود تھا ان کا ایک شعر اس کی ترجمانی کرتا ہے ؎

سب کی ہے نگاہوں میں جدا مے کا تصور
میرا تو عقیدہ ہے کہ ہر شخص نے پی ہے

شکیل کے فلمی دنیا میں جانے سے ان کی ادبی شاعری کس حد تک متاثر ہوئی - اس سوال کا جواب فراق گورکھپوری سے سنیے۔ "آخر میں شکیل صاحب کو ایک مشورہ بھی دینا چاہوں گا، اور یہ اختیار بھی کہ وہ اس پر اعتنا کریں یا نہ کریں - یہ مشورہ اس لیے غالباً اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ شکیل اپنی زندگی اور شاعری کے اس موڑ پر آ گئے ہیں جہاں ان کے لیے خطرات زیادہ ہیں اور سنبھالنے والے عناصر بہت کم فلم میں کامیابی کے بعد پڑنے، سنجیدہ شاعری کے ذوق کو قایم رکھنے، ٹھوس اور وزنی باتوں میں دلچسپی قایم رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ پتا مارنے کی ضرورت ہوتی ہے - جو ہر شخص آسانی سے نہیں کر پاتا - ان کی شاعری کی وسعت یوں ہی ناکافی تھی، لیکن اگر انہوں نے بہت زیادہ اور بہت مخلصانہ کوششیں نہ کیں تو ان کی یہ پونجی بہت دن تک نہ کام آسکتی ہے اور نہ قایم رہ سکتی ہے، لیکن ہمیں یقین ہے کہ شکیل ایسا ہونے نہیں دیں گے۔" (صنم و حرم ۲۱ - ۲۰، ستمبر ۱۹۵۰ء) اب شکیل کی رائے اس کے متعلق ملاحظہ ہو -

"رعنائیاں اور نغمۂ فردوس کے بعد یہ تیسرا مجموعۂ کلام بنام صنم و حرم سیفی برادران، مالکان تاج آفس بمبئی کی جانب سے شایع کیا جا رہا ہے - اس مجموعے میں وہ غزلیات شامل ہیں جو میں نے ۱۹۴۴ء سے کر ۱۹۵۰ء کے آخر تک کہی ہیں - ہر چند کہ فلمی دنیا میں شامل ہونے اور ادبی ماحول سے دور ہونے کے بعد ایک عرصہ شاعری کا ذوق لطیف مجروح ہونا چاہیے - پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں نے حد امکان ملی فراست پر فلمی [illegible] ہونے دیا، اور اس تجربے میں ایک حد تک کامیاب رہا، حالانکہ ملک میں اب [illegible] ایمان مکمل [illegible]

ہیں نہ وہ شعر و شاعری کی محفلیں ہیں، لیکن دل و دماغ کی خلوتیں بیک نفس ان سب کو مہیا کر دیتی ہیں، اور اکثر جذبات میں وہی روانی پیدا ہو جاتی ہے جو آج سے چند سال پہلے تھی - زندگی شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور ایک ایک نغمے ابل پڑتے ہیں مگر "سننے والے سینکڑوں ہیں ہم نوا کوئی نہیں" کا مصداق بن کر رہ جاتے ہیں -" (صنم و حرم صفحہ ۲۴ - مطبوعہ ستمبر ۱۹۵۰ء)

میں نے شکیل کا کلام خود ان کی زبان سے ایک دو مرتبہ نہیں متعدد مرتبہ سنا ہے، اور لطف اندوز ہوا ہوں - جولائی ۱۹۴۸ء سے مارچ ۱۹۴۹ء تک میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے آفتاب ہوسٹل کے کمرا نمبر ۴۸ میں بحیثیت ام - اے طالب کی حیثیت سے مقیم تھا - شکیل غالباً انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے، اور شہر میں رہتے تھے، لیکن آفتاب ہوسٹل میں ان کا آنا جانا اکثر ہوتا تھا اور بغیر کلام سنائے آفتاب ہوسٹل کے طلبا ان کو جانے نہیں دیتے تھے، لیکن میں نے ان کا کلام ان کی زبان سے اس وقت بھی سنا ہے جب وہ فلمی دنیا میں داخل ہو چکے تھے - ان کی ایک غزل جو انہوں نے غالباً ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے سنائی تھی، ان کے آخری دور کے رنگ تغزل کو اچھی طرح واضح کرتی ہے، اور ان کی ایک نمائندہ غزل کہی جا سکتی ہے - ان کا فنی شعور بلوغ کو پہنچ چکا ہے، ملاحظہ فرمایئے ؎

ضبط کا خوگر ہے دل ان کی توجہ کم سہی
زندگی میں غم ہیں لاکھوں ایک یہ بھی غم سہی
غور سے سن لیں کہیں جنت آسودگاں
گر بھی جاتے ہیں مکاں بنیاد مستحکم سہی
آپ خون عشق کا الزام اپنے سر نہ لیں
آپ کا دامن سلامت اپنے قاتل ہم سہی
ہم نہیں اے ہم نشیں منت کش فصل بہار
اگر [illegible] موسم سہی
[illegible]
[illegible] ماتم سہی

اور اس کے دو برس بعد "غزلِ آخری" قافیہ ردیف والی غزل سنی - یہ ان کی آخری غزل تھی، کیونکہ وہ بلبل جو ریاضِ سخن میں چہک رہا تھا، اب ہمیشہ کے لیے خاموش تھا -

ان کو اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ نیچے کے خط سے ہوگا جو انہوں نے اپنے دوست حفیظ الدین صاحب کو بیماری کی حالت میں پنچ گنی (جو پونا سے ۶۵ میل ہے) سے لکھا تھا۔ نجی نوعیت کا ہونے ہوئے بھی یہ خط شکیل کے خلوص، احباب سے محبت اور دوستوں سے تعلقات پر گہری روشنی ڈالتا ہے، خط غیر مطبوعہ ہے اور میں حفیظ الدین کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کی اشاعت کی اجازت دی

عزیز گرامی بھائی حفیظ صاحب - تسلیم!

آپ کا خط ملا - بھولے بچھڑوں سے جب تجدید ملاقات ہوتی ہے خواہ وہ تحریری ہی سہی تو دل واقعی خوش ہوتا ہے - میں پنچ گنی میں ۱۵ر اپریل سے ۱۵ر اگست ۱۹۶۸ء تک رہا - پھر بمبئی چلا گیا - وہاں سے ۲۹ر ستمبر کو پھر پنچ گنی واپس آیا ہوں، اور ۱۵ر نومبر تک یہاں رہوں گا - پھر بمبئی چلا جاؤں گا - بمبئی کا پتا بھی آپ نوٹ کر لیجیے

اور وہاں کا فون نمبر 533955 ہے - بدایون صرف ۱۹۶۱ء میں گیا تھا - اس کے بعد جانا نہ ہو سکا - آپ تو جانتے ہوں گے - میں ۱۹۶۴ء سے علیل ہوں - ذیابطیس اور ٹی - بی - میں نے آدھا بمبئی میں علاج کرایا تو ٹھیک ہو گیا، اور پھر اگست ۱۹۶۶ء میں عراق (بغداد کربلا) چلا گیا - وہاں جاتے ہوئے اور وہاں سے آتے ہوئے کراچی میں کچھ دن قیام کیا - [illegible] سے بھی ملاقات ہوئی تھی - عراق سے واپس آ کر پھر انہیں دو بیماریوں میں مبتلا ہو گیا - اس لیے پہلی نومبر ۱۹۶۶ء کو پنچ [illegible]

گیا تندرست ہو کر اگست ۱۹۶۸ء سے پھر شدید علیل ہو گیا، اور بمبئی ہی میں رہا - فروری ۱۹۶۸ء میں اپنی دوسری لڑکی صفیا کی بمبئی میں شادی کر دی، لڑکا بہت اچھا ہے اور بزنس کرتا ہے، لوگ دولت مند ہیں - پہلی لڑکی رضیا کراچی ہی میں ہے - اس نے اس سال ایم - اے کیا - اب شاید کہیں ملازمت کر رہی ہے - تیسری لڑکی نجما ابھی دسویں کلاس میں اور اس کے بعد لڑکا جاوید ۱ سال کا اور پھر لڑکا طارق آٹھ سال کا ہے - یہ دونوں بچے بھی نویں اور تیسری کلاس میں ہیں - اور نجما کے ساتھ اسکول جاتے ہیں -

آپ کی گاڑیاں پونا تک آتی ہیں - پونا سے پنچ گنی ۶۵ میل ہے تین گھنٹے کا بس کا راستہ ہے - دو بسیں صبح اور دو بسیں شام کو تین بجے پنچ گنی کو روانہ ہو جاتی ہیں - میں ۱۵ر نومبر تک یہاں رہوں گا آپ کو وقت ملے تو ضرور آئیے میں یہاں تنہا ہوں - دو دو چار چار دن کے لیے دو ایک دوست بمبئی سے آ جاتے ہیں - آپ کی لڑکی رعنا کی شادی مولوی رحیم بخش مرحوم کے لڑکے کے ساتھ جنوری میں ہوگی - یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی - فقط آپ کا شکیل بدایونی

بلدیو سنگھ عاجز

رباعی

آئی ہے وطن کے باغ میں فصلِ بہار
ہوتی ہے نظر ہر گل و غنچہ پہ نثار
اب ہند میں رہنے کا اسی کو حق ہے
کرتا ہے جو اس دیش کے ہر ذرے سے پیار

کرشن چندر

عورت خور

گورونیر کے پرسٹ روم سے نکل کر میں نے ایک ٹیکسی لی۔ اسے کرلابا چلنے کو کہا۔ کولابا میں تاج محل ہوٹل کے عقب میں چند پراسرار گلیاں ہیں۔ ان میں ایک کا نام سسی راک روڈ ہے۔ میں اسی گلی کے ناکے پر اتر گیا اور ٹیکسی والے کو پیسے دے کر پیدل چلنے لگا دل ہی دل میں بلڈنگیں گنتا جاتا تھا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ۔ آخری بلڈنگ پر رک کر لفٹ لے کر چوتھی منزل پر چلا گیا اور فلیٹ کا دروازا کھٹکھٹایا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے جھری میں سے کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازا کھل گیا۔

دروازا اس پے کھل گیا کہ میں بہت عمدہ سوٹ ڈانٹے ہوئے تھا اور منہ میں سگار اور ہات پر سونے کی رسٹ واچ ایک عمدہ سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ بڑھیا صوفے، بڑھیا قالین بڑھیا ریڈیو گرام۔ اس کمرے کا حلیا ہی بدل گیا ہے، میں نے دل ہی دل میں سوچا پہلے تو یہ ایک کاروباری کمرا تھا، ایک صوفا چند کرسیاں، میز یا دیوار سے لگی ہوئی ایک [illegible] ایک کونے میں جیسے کسی میز کیس میں غلط جگہ پہ آ گیا ہے۔

اپنی غلط فہمی دور کرنے کے لیے میں نے دروازا کھولنے والے سے کہا۔

"بخشی کو بلاؤ —" دروازا کھولنے والا مرد چونکا، اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا۔ "صاحب۔ بخشی تو چھ ماہ سے جیل میں ہے۔"

"جیل میں؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"اس نے دو مہینے سے ہفتا نہیں بھرا تھا، اس لیے یہاں دھاڑ پڑی اور وہ پکڑا گیا۔ اب یہ جگہ نئے مینجمنٹ کے ہات میں ہے۔"

"مگر دھندا تو وہی ہے۔" میں نے پوچھا

"ہے ناں —؟"

"جی ہاں دھندا وہی ہے، مگر ہائی کلاس مال۔"

"کس طرح کا مال ملتا ہے؟"

"پنجابن ہے، گجراتن ہے، مدراسن ہے، اینگلو [illegible] ہے، کشمیرن ہے، بنگالن ہے، ایرانی ہے، [illegible] ہے، کالی ہے، گوری ہے، سانولی ہے، دبلی پتلی ہے، جاڑی ہے، لمبی ہے، چھوٹی ہے، گٹھی ہے بارا سال کی ہے، پندرا سال کی ہے، سولا سال ہے، اٹھارا سال کی ہے، بیس سال کی ہے۔"

وہ ایک لمبی سانس میں بولتا چلا گیا۔

میں نے اسے روک کر کہا۔ [illegible] ایک [illegible]

یک انگلو انڈین اور ایک کشمیرن ۔"

وہ آدمی کچھ جواب دیئے بغیر ایک پردے ے پیچھے غائب ہو گیا ۔

میں ایک صوفے پر بیٹھ کر سگار پینے لگا ۔ پھر میں نے اپنی ہپ پاکٹ سے چاندی کا ایک ینٹ نکالا ۔ اور اس کا کارک کھول کر اسے نہ سے لگا کر ایک لمبا گھونٹ لیا ۔

اتنے میں پردا ہلا اور تینوں لڑکیاں یکے بعد دیگرے اندر چلی آئیں ۔ انگلو انڈین لڑکی نے بے حد منی منی اسکرٹ پہن رکھا تھا ۔ اس کا نگ بھی بے حد صاف تھا ۔ یہودن نے سلیکی ن رکھی تھی جس میں اس کے جسم کے خم بالکل یٹ ہو گئے تھے، اس کا رنگ بھی بے حد اف تھا ۔ تیسری جو کشمیرن تھی اس کا رنگ ہواں سا تھا ۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی ۔

انگلو انڈین اور یہودن چند قدم میرے سامنے چلیں، تاکہ میں ان کو سر سے پاؤں تک کھ لوں، پھر ہیلو ہیلو کہتی ہوئی میرے دائیں ائیں بیٹھ گئیں ۔ کشمیری لڑکی چپ چاپ ایک ونے میں کھڑی رہی اس کی پلکیں جھک گئی تھیں ۔

مجھے فیصلا کرنے میں ایک منٹ سے زیادا نہ لگا ۔ یہودن اور انگلو انڈین بے حد کاروباری معلوم ہوتی تھیں ۔ ان کے مقابلے میں اس کشمیرن کی ناتجربا کاری اگر واقعی اصلی ہے تو بہت خوب ہے ۔ اگر بناوٹ ہے تو ۔ تو ۔ بہرحال اس کا بھی پتا چل جائے گا ۔ ایسی جگہوں پر چند گھنٹے یا رات بھر کے لیے جو ہم لوگ ایک فریب یا جذباتی سراب کی سی کیفیت پیدا کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے تجربا کار لڑکیاں بے حد ناموزوں ثابت ہوتی ہیں ۔ ایسے کھرے سپاٹ لہجے میں بات کرتی ہیں کہ ان کو چھوتے ہی سے سارا سراب پارا پارا ہو جاتا ہے، مگر ایک ناتجربا کار لڑکی کے ذہن سے آپ کھیل سکتے ہیں ۔

عام طور پر ایسی جگہوں پر ناتجربا کار لڑکیاں [illegible]

یا بے حد بدقسمت یعنی اگر اس کی ناتجربا کاری بھی محض اوپر کا میک اپ ثابت ہوئی تو پھر تھوڑی دیر میں پتا چل جائے گا ۔

مدھم مدھم گلابی روشنیوں والا بیڈروم تھا، فرش پر دبیز غالیچا، کھڑکیوں پر پردے کھنچے ہوئے تھے پانی کا کٹ گلاس تھا، اور دو خالی گلاس، ڈبل بیڈ پر زرد پھولوں والی شفاف چادر تھی، بخشش نے بعد سے انتظام بہت بہتر ہو گیا تھا ۔

میں نے بیڈ پر بیٹھ کر ہپ پاکٹ میں پڑا ہوا وسکی کا پائنٹ نکالا وہ لڑکی کچھ دیر تو بستر کے نزدیک کھڑی رہی پھر کھڑی کھڑی اپنی قمیص اتارنے لگی میں نے اسے منع کیا، تو بولی ۔

"کیوں ؟"

"ابھی نہیں ۔"

"کیوں نہیں ؟"

"پہلے باتیں کریں گے ۔"

"کیا باتیں ۔۔۔"

"مثلاً تمہارا نام کیا ہے ؟"

"میرا نام بملا ہے ۔"

"تو بملا تم کھڑی کیوں ہو، بستر پر آ کر بیٹھ جاؤ یا لیٹ جاؤ ۔"

وہ بیٹھ گئی ۔ میں نے پھر پوچھا ۔

"بملا تمہارا اصلی نام ہے ۔"

"تمہیں میرے اصلی نام سے کیا ؟"

"اچھا جانے دو" میں نے اس سے کہا، کچھ دیر توقف کیا، پھر بولا ۔

"مگر تم کشمیر دیلی کی تو معلوم نہیں ہوتیں ؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہے، میں کشمیر دیلی کی نہیں ہوں ؟"

"اس لیے کہ میں اس علاقے میں بہت گھوما ہوں ۔ وہاں کا رنگ قد خال ۔"

لڑکی کچھ دیر چپ رہی پھر بولی ۔

"تمہارا اندازا غلط نہیں ہے، میں دیلی کی نہیں ہوں ۔"

"تو پھر کہاں کی ہو ؟"

"پونچھ کے علاقے کی ۔"

" [illegible] تو کیا ؟" [illegible]

"کیوں اس میں اس قدر حیرت کی کیا بات ہے ؟"
"حیرت کی بات تو نہیں ہے، مگر اتفاق کی بات ضرور ہے کہ میں بھی پونچھ کا رہنے والا ہوں۔"
"پونچھ میں کہاں سے ؟"
"پہلے تم بتاؤ، تم کہاں کی ہو ؟"
"تحصیل راولاکوٹ کی۔"
"تمہارا باپ کیا کرتا ہے ؟"
"فارسٹر ہے۔"
میرے دماغ میں ایک گھنٹی سی بجی۔
"اس کا نام کیا ہے ؟"
"کیوں بتاؤں — ؟"
"اچھا مت بتاؤ۔ یہ بتاؤ دکھی ہوگی ؟"
"کیوں نہیں ہوں گی۔"
میں نے ایک گلاس میں پائینٹ سے ایک پیک انڈیلا۔ پانی ڈال کر اسے دیا۔
وہ دھیرے دھیرے پینے لگی۔
میں نے کہا۔ "تمہارے چہرے کو دیکھ کر نہیں لگتا کہ تم دکھی بھی ہوتی ہوگی۔"
"کیوں ؟" وہ بولی "میرا چہرا کیسا ہے ؟"
"اس چہرے پر دکھ نہیں لکھی ہوئی ہے۔"
ایکا ایک وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔
"جانے ہمارے چہروں پر کیوں نہیں لکھا ہوتا جن سے ہم کو گزرنا پڑتا ہے۔"
میں نے کہا "تم پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔"
وہ کسی قدر فخر سے بولی "میٹرک تک پڑھی ہوں۔"
"میٹرک پاس کیا کہ نہیں ؟"
"نہیں"
"کیوں نہیں ؟"
وہ بولی۔ "میں میٹرک میں پڑھ رہی تھی وہ رک گئی۔
"جب کیا۔ ؟" میں نے پوچھا۔
"تمہیں کیا۔ ؟" اس نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے مجھے کیا ؟" میں نے ایک چھوٹا سا گھونٹ لے کر کہا۔
"تم باتیں بہت کرتے ہو۔ سوؤ گے نہیں کیا ؟"
ایک دم وہ بول اٹھی۔

"ایسی بھی کیا جلدی ؟ ساری رات پڑی ہے۔"
"ساری رات باتیں کرتے رہو گے ؟"
"یہ بھی ممکن ہے۔"
وہ مسکرانے لگی، تھوڑا سا اور میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی، بولی۔
"تمہارا سوٹ اتار دوں۔ ؟"
میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے میرا کوٹ اتار دیا۔
"اور یہ ٹائی۔ ؟" وہ میری ٹائی کو ہلا کر بولی۔
"یہ بھی۔"
اس نے ٹائی اور کوٹ اتار کر وارڈروب میں رکھ دیے۔
پھر بولی۔ "تمہاری قمیص کے بٹن کھول دوں ؟"
"صرف اوپر کے دو بٹن۔"
اس نے میری قمیص کے اوپر کے دو بٹن کھول دیے اور میرے سینے کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی، میرے دماغ میں ایک عجیب الجھن تیر رہی تھی، مگر میں اسے اس پر واضح نہ کرنا چاہتا تھا، ممکن ہے بدک جائے تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔
"مگر راولاکوٹ میں تو کوئی ہائی اسکول نہیں ہے ؟"
"مجھے میرے باپ نے پونچھ بھیجا تھا، وہاں میں اپنے چچا کے گھر پر رہتی تھی، اور میٹرک میں پڑھتی تھی جب۔ جب۔" وہ رک گئی۔
"کہہ ڈالو نا" میں نے اسے مشورہ دیا۔
وہ ایک سانس میں پیگ ختم کر گئی غصے سے بولی۔ "وہ سور کا بچا حرامی میرے چچا کا بیٹا مجھے ورغلا کے بمبئی لے آیا کہنے لگا تم خوب صورت ہو تمہیں فلموں میں ہیروین کا کام مل جائے گا۔"
"پھر ملا نہیں کیا۔ ؟"
"نہیں، سب جھوٹ بولتے ہیں، لڑکی کی عزت لے لیتے ہیں، مگر اس کا کام نہیں کرتے۔ جھوٹے وعدے کیے گئے کانٹریکٹ جھوٹی تسلیاں" پکڑ یا پھر اس سے اگلا کچھ۔"
"تمہیں بمبئی میں رہتے کتنے سال ہو گئے ؟"
"تین سال۔"

میرے دماغ میں پھر سے ایک گھنٹی بجی۔

"دوسرا پیگ لوگی۔؟"

"کیوں نہیں لوں گی۔"

"اس دھندے میں کب سے آئی ہو؟"

میں نے اس کے لیے دوسرا پیگ بناتے ہوئے کہا۔

"آٹھ مہینے ہو گئے۔"

"اس سے پہلے کیا کرتی تھیں۔؟"

"فلموں میں کوشش کرتی تھی۔ سنا نہیں تم نے کیا؟"

"وہ تمہارا چچا کا کہاں گیا۔؟"

"آٹھ مہینے پہلے بمبئی سے فرار ہو گیا مجھے اکیلا چھوڑ گیا۔"

اب اس کے منھ سے تیز و تند اور تلخ گالیاں فراٹے سے نکلنے لگیں، اپنے چچا کے بیٹے کے لیے۔

میں نے جلدی سے اسے دوسرا پیگ دیا۔ خدا ایک سگار سلگایا اس کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"سگریٹ پیوگی؟"

"کیوں نہیں پیوں گی؟"

آٹھ مہینے میں تم نے یہ سب کچھ سیکھ لیا۔

"آٹھ مہینے بہت ہوتے ہیں مسٹر۔"

یہاں آٹھ مہینے رہ کر ایک لڑکی وہ سب کچھ سیکھ جاتی ہے جو ایک شریف عورت ساٹھ برس میں سیکھ نہیں سکتی۔

میں نے کہا۔ "تم کچھ اور بھی تو کام کر سکتی تھیں؟"

"تمہارا خیال ہے، میں نے کوشش نہیں کی ہوگی۔"

وہ بے حد تلخی سے بولی۔

"پھر کیا ہوا۔؟"

"ہر جگہ وہی فلموں والا چکر ہے۔"

خوبصورت لڑکی سے پہلے اس کا جسم مانگا جاتا ہے۔ پھر اس سے کام کا وعدہ کیا جاتا ہے، اگر کہیں پر اسے کام دیا جاتا ہے تو بعد میں اس کی محبت بھی وصول کر لی جاتی ہے۔ بات تو ایک ہی ہے، میں نے سوچا اگر مجھے اپنے آپ کو بیچنا ہی ہے تو دو سو ماہانہ کی نائب بن کر کیوں بکوں۔؟

اتنی رقم تو میں ایک رات میں یہاں وصول کر لیتی ہوں۔

"کچھ آگے کا بھی سوچا ہے۔؟"

"سب سوچ لیا ہے۔"

"کیا سوچا ہے؟"

چار چھ سال تو اچھی طرح گذر جائے گی۔ پھر شاید اس سے کوئی گھٹیا پراسٹل لے گا۔ پھر اس سے گھٹیا۔ پھر اس سے گھٹیا۔ پھر یہاں سے شفٹ کر کے مجھے ایک دن فارس روڈ جانا ہوگا۔ پھر ایک دن دو روپے فیس کا کمرے والی۔ سب کچھ سوچ لیا ہے۔

"انجام تو برا ہے۔"

"انجام تو سب کا برا ہوتا ہے۔ آخر میں سب ایک جگہ پہنچ جاتے ہیں۔" اس کی نگاہوں میں حقارت تھی۔ پھر وہ ذرا سا ہنس کر میرے بہت قریب آگئی اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر بولی۔

"اب سو جاؤ نا۔ کیسی باتیں کرتے ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "یہ پیگ ختم کر لوں۔"

"اچھا۔" کہہ کر اس نے سگریٹ کا دھواں میرے چہرے پر بکھیر دیا۔ اب اس کی آنکھوں میں نشہ تیرنے لگا تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کبھی گھر واپس جانے کا خیال نہیں آتا ہے۔؟"

وہ رک رک کر بولی۔ "آتا کیوں نہیں ہے، مگر مگر کیا منہ لے کر جاؤں گی۔ ماں تو رو دھو کر گلے لگا لے گی، مگر میرا باپ مجھے جان سے مار دے گا۔ وہ بڑا غیرت والا ہے تو وہ مجھے کبھی زندہ نہ چھوڑے گا۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ پھر ایکا ایک بھڑک کر بولی۔

"مگر تم کیوں مجھ سے یہ سب باتیں کرید کرید کر پوچھ رہے ہو۔ تم کو جو کام کرنا ہے سو کرو اور دفع ہو جاؤ۔"

وہ ایک دم چیخ پڑی۔ "تم کو یہ سب باتیں پوچھنے کا حق کیا ہے؟"

"اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میں تمہارا منگیتر تھا۔" ایکا ایک میرے منھ سے بے اختیار نکل گیا۔

وہ دھک سے رہ گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے

میری طرف دیکھنے لگی -

" تم میرے منگیتر --- ؟ "

" ہاں - میں نے تم کو کبھی نہیں دیکھا - تم نے مجھے کبھی نہیں دیکھا - مگر ہمارے ماں باپ نے بچپن ہی سے ہماری نسبت طے کر دی تھی " تم کو معلوم ہوگا -

میں بھی تمہارے متعلق معلوم کرتا رہتا تھا - مرادولا کوٹ جانے والوں سے یا پڑھ جانے والوں سے ، دیکھنے میں کیسی لگتی ہو - بات چیت کیسے کرتی ہو ، کون سی جماعت میں پڑھتی ہو ، اور پھر میں نے جو کچھ تمہارے متعلق سنا ، اس سے میرے دل میں امنگیں بڑھنے لگیں - اور میں انتظار کرنے لگا - اس دن کا جب - جب - "

میں رک گیا ، چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر بولا -

" پھر میں نے سنا تم اپنے چچا کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئیں ، تین سال پہلے سے جب سے یہ واقعہ ہوا ہے ، میں تمہاری تلاش میں تھا - پھر میں نے کسی سے سنا تم دونوں بمبئی میں ہو ، آج اتفاق سے ملا "

ایکایک میں چپ ہو گیا -

وہ دیر تک عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی - میں اپنی جگہ پشیمان تھا - جو کچھ مجھے نہ کہنا چاہیے تھا وہ میں نے کہہ دیا -

ارے یہ میں نے کیا کہہ دیا - جب میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی ، اس وقت میں نے طے کر لیا تھا کہ میں یہاں سے اجنبی بن کر اس سے الگ ہو جاؤں گا ، مگر ایک دم یہ کیا ہو گیا - ؟ "

وہ لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگی - ارے - تم - ملک صاحب کے بیٹے ہو ؟ " اور - اس کی آواز ہی نہیں اس کا جسم بھی کانپ رہا تھا -

" ہاں --- "

" جو حویلی تحصیل کے --- "

" ہاں --- "

ایکایک وہ بستر پر گر کر رونے لگی ، دیر تک روتی رہی ، اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا - اس کے پاس سننے کے لیے کچھ نہیں تھا - ہم دونوں اب حالات کے اس موڑ پر تھے جہاں سارے لفظ گونگے سارے جملے بے کار اور سارے جذبے مردہ ہو جاتے ہیں -

میں نے اٹھ کر قمیص کے بٹن بند کیے اپنی ٹائی پہنی کوٹ پہنا - ایش ٹرے میں سگار دبا کر بجھا دیا - ایک نظر سے اس روتی ہوئی لڑکی کو دیکھا جو بستر پر اوندھی پڑی تھی اور کمرے سے باہر نکل گیا -

رات کے دو بجے تھے ، مجھے سخت بھوک لگی تھی ، میرے ساتھ یوں ہی ہوتا ایسے حادثوں میں لوگوں کی بھوک جاتی رہتی ہے ، میری بھوک کھل جاتی ہے ' میں نے سوچا رات کے دو بجے ہیں - اس وقت سوائے حاجی کے ہوٹل کے اور کہیں کھانا نہیں مل سکتا -

میں ٹیکسی لے کر حاجی کے ہوٹل پہنچا -

" کھانے کو کیا ہے ؟ " میں نے بیرے سے پوچھا -

بیرا بولا - " سب کچھ ہے - "

" سب کچھ کیا ہے ؟ " میں نے اصرار کیا -

" قیمہ ہے ، قورمہ ہے ، پسندا ہے ، کلیجی ہے ، کباب ہے ، چانپ ہے ، خشکا ہے ، بریانی ہے ، روسٹ مٹن ہے ، رومالی ہے ، پایا ہے ، نان ہے ، کلیجا ہے ، شیرمال ہے ، پائے ہیں ، آملیٹ ہے ، بھیجا فرائی . . . . "

وہ ایک سانس میں بولتا گیا ، اور میرے دماغ میں آوازیں گونجنے لگیں اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہا ہے - " قیمہ ہے ، قورمہ ہے ، نیپالن ہے ، بنگالن ہے ، پسندا ہے ، کلیجی ہے ، کباب ہے ، پنجابن ہے ، مدراسن ہے ، کشمیرن ہے ، بریانی ہے ، نان ، کلیجا ، یہودن ، اینگلو انڈین - !

عطیہ پروین

میری سنو

پڑوس کے گھر میں ایک ہنگامہ سا مچا ہوا تھا۔ دونوں چھوٹے بچے بے تحاشا رو رہے تھے اور بڑا لڑکا چلا چلا کر انہیں چپ کر رہا تھا۔

نامرا بستر سے اٹھی اور کھڑکی میں کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ کتنا خوبصورت مکان تھا فرنیچر بھی سب بے حد نفیس اور قیمتی دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑے بھاری دیدا زیب پردے جب ہوا میں لہراتے تو گلزار سا کھل جاتا۔ اور وہ تھوڑا بہت دکھائی دینے والا کچن اسٹیل کے چم چماتے برتنوں سے سجا ہوا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس گھر میں ۳ پیارے پیارے بچے روپیا پیسا نوکر چاکر دونوں میاں بیوی سروس کرنے دونوں ہی کے پاس اسکوٹر تھے، لیکن نہیں تھا تو سکون! نہ ذہنی نہ جسمانی۔ صبح ایک افراتفری کا عالم ہوتا بیوی کو اپنی فکر کہ دیر نہ ہو جائے لباس اور میک اپ درست ہو میاں کو اپنی طرف جلدی کہ وقت پر آفس جائیں بچے اپنی سمت ادھم مچائے۔

"میرا بستا ممی؟"

"ممی میری فراک؟"

"ممی مجھے ناشتا دو۔"

ممی غریب کیا کرے اپنی خبر لے کہ میاں کی، بچوں کی فکر کرے کہ گھر کی۔ خانساماں بھی سر پر سوار ہیں۔

"بیگم صاحب سودا بتا دیجیے!"

ادھر سے کام والی بھی کھڑی ہے۔

"[illegible] شام کو کس وقت آؤں۔"

بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا لڑکا بھی موجود۔

"بابا لوگ بہت پریشان کرتے ہیں میم صاحب!"

نتیجا یہ ہوتا ہے میم صاحب گھبرا کر بولا کر آدھا پیٹ ناشتا اور دو گھونٹ چائے زہر مار کر کے بچوں کو دور سے چمکار کے بھاگ کھڑی ہوتی ہیں اور صاحب سخت ناراضگی کے عالم میں کبھی اپنی بے بٹن والی پینٹ کا معائنہ کرتے ہیں کبھی بے پریس کی ہوئی قمیص کو دیکھتے ہیں کبھی اپنی گھڑی اور رومال تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بچے ممی سے مایوس ہو کر پاپا کر بگڑتے ہیں۔ ان سے گھبرا کے پاپا ڈانٹتے ہیں دھاڑتے ہیں سارا گھر سر پر اٹھا لیتے ہیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک لفٹ رائٹ کرتے ہیں نوکر ایک دوسرے کو دیکھ کر چپکے چپکے ہنستے اور مسکراتے ہیں آخر کسی نہ کسی طرح وہ آفس سدھارتے ہیں ادھر بچوں کی اسکول بس آ جاتی ہے۔ پھول سے بچے جن کے والدین کو اللہ نے کیا کچھ نہیں دے رکھا جی بھر کر ناشتا کیے بغیر ماں باپ کی توجہ کو ترستے ہوئے روتے بسورتے بددلی سے بس میں گھس جاتے ہیں اب گھر پر نوکروں کا راج ہوتا ہے ہر کمرے کا پنکھا زنائے سے چلا کرتا ہے نل کھلے ہوئے دھائیں دھائیں پانی بہایا کرتے ہیں۔ ریڈیو پوری آواز سے بجا کرتا ہے فرج سے پھل اور آئس [illegible] نکال کر اڑائی جاتی ہے بیگم صاحب [illegible] کسی بچے کا نام لے دیا جاتا ہے [illegible] میاں بیوی واپس آتے ہیں تو بس [illegible]

سید اکھانا کھائیں اور بستر میں گھس جائیں۔ کیسا گھر اور کہاں کے بچے ! بچے جلدی آجاتے ہیں آپس میں لڑیں جھگڑیں روئیں چلائیں وقت پر کھانا ملے نہ ملے چائے نصیب ہو نہ نصیب ہو کسی کو کیا خبر نوکر بھی اپنی مرضی کے بچوں سے یوں بات کریں گے جیسے گھر کے مالک وہی ہوں۔ نوکر لڑکا دن بھر فحش قسم کے گیت گاتا ہے بیڑی بیتا ہے گالی بکتا ہے کبھی لڑکی کے مانند نرم کومل بچے بھی اس کے ساتھ گالیاں بکتے ہیں بیڑی پینے کی کوشش کرتے ہیں !

نا خدا کو کیا ترس آتا ہے ان بچوں پر، اس گھر پر اور ان دونوں میاں بیوی کی عقلوں پر۔ ارے بھئی عورتوں کی آزادی کا یہ مطلب تو نہیں گھر کو آگ لگا کے آفس کو رونق بخشی جائے تحریر کی آزادی ہے، تقریر کی آزادی ہے۔ پردے کے جنجال سے آزادی ہے تفریح کی آزادی ہے اب اور کیا چاہیے !

یہ عورت کی غلطی ہے، اگر وہ سمجھتی ہے مردوں کے دوش بدوش کام کرنے اور اونچے عہدوں پر فائز ہونے ہی سے آزادیٔ نسواں کا مقصد حل ہوتا ہے۔ بڑے اور اونچے عہدے تو آپ کو اپنے پیارے گھر میں بھی مل سکتے ہیں، اگر آپ نے اپنے بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دی اس کو ملک کا ایک ہونہار ڈاکٹر یا انجینئر بنایا تو سمجھیے وہ عہدہ آپ کو ملا آپ اپنی تخلیق پر کس قدر فخر محسوس کریں گی یہ نسبت اس کے ڈاکٹر یا انجینئر بن کر آپ اپنے گھر کو اور اپنے بچوں کو پوری توجہ نہ دے سکیں۔

گھر ایک خوبصورت جنت جیسا گھر تو ہر عورت کا خواب ہوتا ہے تمنا ہوتی ہے۔ باہر سڑکوں پر چپلیں گھس کر دفتروں میں سر کھپا کر آپ کا یہ خواب پورا نہیں ہوتا تب گھر جنت نہیں جنجال معلوم ہوتا ہے نہ شوہر مطمئن نہ بچے خوش اور نہ گھر والا کو سکون !

نیا [illegible] آپ دن بھر دفتر میں [illegible] تو آپ کے بچوں کا کیا ہو گا۔ اختر الافغان

اب پرانا فیشن بن گیا ہے اس لیے گھر کی، بچوں کی اور شوہر کی، یہ سب ذمے داریاں آپ کے کندھوں پر ہوتی ہیں اور ان فرائض کے ساتھ جب دفتر کی یا اسکول کی ذمے داریاں بھی آپ سنبھال لیتی ہیں تو یہ سمجھیے دوسرے بوجھ سے آپ کے کندھے چرچرا اٹھتے ہیں۔ آپ کا دماغ پریشان ہو جاتا ہے اور دماغی و جسمانی پریشانی آپ کی صحت کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ آپ چڑچڑی ہو جاتی ہیں، بے زار ہو جاتی ہیں۔

آپ ان دوہری بیڑیوں میں اپنے آپ کو جکڑ کر غیر محسوس طریقے پر اپنے کو اور پابند بنا رہی ہیں۔!

اگر آپ کے شوہر یا والد یا بھائی اتنی تنخواہ لیتے ہیں کہ گھر کا خرچ بخوبی چل سکتا ہے تو آپ کو نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے ہاں جن کو ضرورت ہے وہ ضرور نوکری کریں نوکری کو محض فیشن یا وقت گزاری کا ذریعہ نہ بنائیں ہو سکتا ہے آپ سے زیادہ اس جگہ کا کوئی اور ضرورت مند ہو آپ اس پر یہ ظلم کیوں کریں ! آپ دوہری زنجیریں کیوں پہنیں۔

اپنی تعلیم اور اپنی صلاحیتوں کو آپ دوسرے طور سے بھی استعمال کر سکتی ہیں خالی وقت میں نچلے طبقے کی بہنوں میں تعلیم کا شوق ابھار سکتی ہیں انہیں زندگی بہتر طریقے سے گزارنے کے نیک مشورے دے سکتی ہیں ان کو صفائی سے رہنے کا سبق پڑھا سکتی ہیں۔ بہت کچھ کر سکتی ہیں آپ کوشش ہمت اور صبر شرط ہے۔ گھر کی رانی بنی رہیے۔ شوہر کے دل کی ملکہ بنیے ایک اچھی اور قابل فخر ماں بنیے۔ کل آپ کے یہ ننھے منے پھول تناور درخت بن کر فخر و غرور سے جھومیں گے اور سوچیں گے میری ماں کتنی عظیم تھی جس نے ہم کو اس قابل بنایا۔

اپنے آپ کو ترقی کی زنجیروں میں نہ جکڑیے اپنے بچوں کو پورا پیار اور توجہ دیجیے آپ کی غفلت اور آپ کی عدیم الفرصتی ان کو غلط راستوں پر ڈال سکتی ہے بری صحبت میں بیٹھ کر کوئی بات کا [illegible] اور کوئی پیار نہ پا کر یہ معصوم کو [illegible] پہنچا ہے آپ نے ؟

آپ اپنے گھر کو جنت بنا کر بچوں کو بھرپور محبت دے کر شوہر کی رفیق و دمساز بن کر جو وقت بچائیں اس کو قوم کی فلاح و بہبود میں صرف کریں۔ ضروری نہیں کہ نوکری کر کے ہی آپ گھر کی آمدنی میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ بہت سے طریقے ہیں۔

گھر کا ایک حصہ لوہے کی جالی سے گھروا کر آپ اچھی نسل کی مرغیاں پال سکتی ہیں، ترکاریاں کاشت کر سکتی ہیں، خالی وقت میں سوئٹر بن سکتی ہیں، نئے کپڑوں کے ٹکڑے خرید کر خوبصورت بابا سوٹ تیار کر سکتی ہیں۔ چکن کی کڑھائی کر سکتی ہیں جو عورتیں یہ کام نہیں کر سکتیں وہ ماش، آلو اور مونگ کے پاپڑ، چاول کی بڑیاں اور آلو کے چپس بنا سکتی ہیں۔ ارے ایک دو نہیں ہزاروں کام ہیں۔ ان کاموں کو تفریح اور وقت گزاری سمجھ کر کیا جائے۔ دیکھیے آمدنی میں اضافہ بھی ہوگا آپ کو دن دن بھر گھر چھوڑنا بھی نہیں پڑے گا ماں کو محنت کرتے اور پھر بھی ہنستے دیکھ کر بچے بھی مشکل سے مشکل کام کو ہنس ہنس کر انجام دینے کے قابل بنتے جائیں گے! آج کل کوئی کام کرنا بے عزتی نہیں ہے وہ دن گئے جب اس طرح کے کاموں کو آن اور شان کے خلاف سمجھا جاتا تھا!

آپ دیکھیے گا آپ کے ہاتھوں بنائی ہوئی اس جنت میں کتنا سکون ہے کس قدر خوش حالی ہے۔ بچے بھی خوش آپ بھی مسرور اور شوہر صاحب بھی مطمئن ایسی شریک زندگی پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہیں۔

ہو سکتا ہے بہنوں کو اس رائے یا مشوروں سے اتفاق نہ ہو مگر ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

یہی سب خیالات تھے جو نامرا کے دل میں بھی آ رہے تھے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کھڑکی سے ہٹ آئی۔ بڑے لڑکے کی آواز اب بھی اس کے کانوں پر ہتھوڑے برسا رہی تھی وہ بڑے فراٹے سے گالیاں بک رہا تھا [illegible] اس [illegible] نصرالدین کا بیٹا [illegible] اس کے منہ سے [illegible] چھوڑنا چاہیے تھے، مگر اس غریب کا قصور نہیں ہے قصور تو والدین کا ہے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو نوکروں پر چھوڑ کر دن دن بھر صورت نہیں دکھاتے۔

نامرا کمرے سے نکل کر آنگن میں آگئی۔ بڑے سے آنگن میں ایک طرف جالی لگوا کر اس نے مرغیاں پال رکھی تھیں۔ وہ مرغیوں کی جالی کے پاس گئی۔ چھ سات انڈے پڑے تھے دروازہ کھول کر اس نے نکال لیے۔ ۴ انڈے صبح کے ناشتے کے لیے الگ کر کے اس نے باقی انڈے اس ٹین میں رکھ دیے جس میں وہ فروخت کرنے والے انڈے رکھتی تھی۔ ہر تیسرے روز انڈے والا آتا اور ۵ پیسے کے حساب سے سارے انڈے خرید لے جاتا۔ یہ رقم نامرا الگ رکھتی تھی دوسرے کاموں سے جو رقم اس نے اکٹھا کی ہے ملا کر ایک اچھی بھینس خریدے گی گھر کے استعمال کے بعد سارا دودھ ہاتوں ہات فروخت ہو جایا کرے گا!

مرغیوں کو پانی میں بھیگی باسی روٹی ڈال کر وہ آنگن کے اس حصے میں گئی جہاں اس نے ترکاریاں بو رکھی تھیں۔ گوبھی، ٹماٹر، ہری مرچ، دھنیا، میتھی، بھنڈی اور توری و کدو کی بیلیں اس نے بڑے پیار سے ایک ایک پھول ایک ایک پودے کو دیکھا روز تازہ سبزی کھاتے بھی اور نوکر کے ذریعے مارکٹ میں تھوڑے تھوڑے فروخت بھی کر دو۔ ادھر سے فارغ ہو کر وہ آنگن ہی میں میٹھی میٹھی دھوپ میں کرسی ڈال کر بنائی پر آیا ہوا سوئٹر بننے لگی۔ جو بس تیار تھا گلے کی گوٹ باقی تھی اس کی پس و پیش تھی وہ بنتی رہی اور سوچتی رہی۔ یہ اس کی اپنی بنائی ہوئی جنت ہے کتنا سکون ہے کتنی فارغ البالی ہے شوہر کی آمدنی اس کی آمدنی جو وہ گھر بیٹھے اپنی محنت و ہمت سے پاتی ہے۔ خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔

کاش کہ سب عورتیں ایسا ہی سوچیں ایسا ہی کریں، نہ کنوئیں کی مینڈک بنی رہیں نہ ترقی کی دوڑ میں اس قدر آگے نکل جائیں کہ مونھ کے بل گریں۔

۸ بجے کے قریب وہ اٹھ کر کسی کا [illegible] کی چائے بنانے چلی اتنے میں دونوں بچے آ گئے [illegible] پھول کی طرح کھلے بلبل کی طرح چہکتے [illegible]

جائے گی ان کا منہ ہاتھ دھلوائی اور کپڑے بدلوائی جائے گی ساتھ ہی اسکول کی باتیں پوچھتی رہے گی کیا پڑھا کیا رہا۔ مسز ایلکا کی چکنی سطح والی میز پر وہ چائے اور پھل لگا رہی ہوگی کہ میاں آجائیں گے "ہلو ڈیر اِکبر، دن کیسا گذرا؟" وہ پوچھیں گے۔

"بہت اچھا!" وہ ہنسے گی اور اس کا ہنستا ہوا کھلا ہوا چہرا دیکھ کر شوہر کی ساری تھکان دور ہو جائے گی۔ رات منہ دھو کر ہلکا پھلکا لباس پہن کر وہ بچوں کے ساتھ میز کے گرد بیٹھ جائیں گے نامرا چائے بنا بنا کر دیتی جائے گی خود بھی مزے لے لے کر پیتی رہے گی۔ کمرہ میں قہقہے گونج اٹھیں گے مسرور گفتگو ہنسی بکھر جائیں گی! نامرا کی دن بھر کی تھکن شوہر اور بچوں کے مسرور و مطمئن چہرے دیکھ کر غائب ہو جائے گی بڑی ہی پھرتی اور چستی سے وہ کھانا تیار کرے گی تب تک شوہر اخبار پڑھ لیں گے بچے ہوم ورک کر ڈالیں گے پھر وہ سب مل جل کر گرما گرم تازا بنا کھانا کھائیں گے گھر کی سنہری مرغی کے انڈے۔ سب خوش سب تندرست!!

ذرا دیر گپ شپ ہوگی ریڈیو سنا جائے گا کچھ دیر نامرا کچھ پڑھے گی کوئی رسالہ اچھی سی کتاب دماغ پھر سے تر و تازا ہو جائے گا۔ نیند بھی آجائے گی! تب نائٹ بلب کی ٹھنڈی روشنی میں صاف و شفاف بستروں پر دراز ہو کر وہ سب ایک نئی خوبصورت صبح کے انتظار میں نیند کی دیوی کی آغوش میں مدہوش ہو جائیں گے! کتنی خوبصورت قابل رشک اور سبق آموز زندگی ہے نامرا کی!! کاش کہ پڑوس کی بیگم اس زندگی سے سبق لیں۔ اپنے آپکو ٹکڑوں میں بٹی عورت نہ بنائیں۔ قابل فرزاں ہمدم و ہمراز بیوی اور کامیاب گرہستن بن جائیں۔ دفتروں میں کوئی مردہ فائیلوں سے سر مارنے کے بجائے اپنے ترسے ہوئے بچوں کو پیار دیں، یہ بچے ممتا اور توجہ کے بھوکے ہیں گھر کی جنت کو دوزخ نہ بنائیں خوشیوں کا گہوارہ بنائیں

ہندوستان کا ساری دنیا میں بول بالا ہو!

طالب چکوالی

شاعر گر عظیم حضرت جوش ملسیانی

وہ بے نظیر ماہر فن عروض شعر
دریا بہائے جس نے فصاحت کے عمر بھر
بخشی زبان شعر کو جس نے نئی جلا
جس کی نظر نے حسن بیاں کو دیا اثر
وہ باکمال شاعر و شاعر گر عظیم
جاری تمام عمر رہا جس کا فیض عام
اپنے چراغ فن سے جلاتا رہا دیئے
ذروں کو آفتاب بناتا رہا مدام
باوضع، پاک باطن و پر ہیزگار تھا
سادھو کا تھا مزاج تو پنڈت کا تھا دماغ
اردو کو جس پہ ناز ہے پنجاب کو ہے فخر
تھا جوش جس کو کہتے ہیں اب جانشین داغ
وہ داغ کی زباں کا امیں، جوش نکتہ داں
افسوس! اپنی بزم سے اٹھ کر چلا گیا!

طالب زبان حال سے کہتے ہیں فکر و فن
رحمت خدا کی اس پہ ہمارا کمند میں ایک تھا

خرداد - تیر - امرداد ۱۳۵۵ف   ہندستانی ادب   اپریل - مئی - جون ۱۹۷۶ء

سید صباح الدین عبدالرحمان، ایڈیٹر "معارف"

پاکستان میں چار مہینے

اقبال پر ایک اہم کتاب

بشیر احمد ڈار نے اقبال پر جو کتاب لکھی ہے وہ پانچ سو چھیالیس صفحے کی ہے، یہ جس محنت اور دیدہ وری سے لکھی گئی ہے۔ پاکستان میں ایسی تصنیف کم قلمبند ہوئی ہوگی، اسکے مطالعے سے اندازا ہوتا ہے کہ مصنف کی نظر کانٹ کے فلسفۂ استدلال اور قوت ارادی، نٹشے کی فکر خداگاہی، شوپنہار کے تخیل فکر، قوت ارادی اور قلبی معلومات، ملٹن کے نظریۂ شیطنت، برگساں کے تخیل عشق، گوئٹے کی روشن خیالی، نٹشے کے مستقبل کے خواب، جیمس وارڈ کے فلسفے پر سائنٹیفک اثر، عقلیت اور میکانزم کے خلاف میک ڈوگل اور لارڈ مورگن کی بغاوت، ولیم جیمس کے نظریۂ عملیت، کارلائل کے ہیروازم، براؤننگ کی نیچرازم، برنارڈ شا کے فلسفۂ قوت ارادی پر گہرے طور پر رہی ہے، مگر ان تمام فلسفیانہ نظریوں پر بحث کرکے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال ان فلسفیوں میں سے کسی ایک کی بھی کورانہ تقلید نہیں کی ہے، بلکہ ان کی اپنی ایک اہم حیثیت ہے جس کی مماثلت ان میں سے کسی ایک فلسفی سے بھی نہیں کی جاسکتی۔ (ص ۴۴۵)

مصنف کی حسب ذیل رائے بہت ہی غورو
فکر ...

مصنف کی حسب ذیل رائے بہت ہی غور وفکر پر مبنی ہے جس سے اس راقم کو بھی اختلاف نہیں ہے۔

اقبال نے زندگی کے مسائل کو اپنی انفرادی نظر سے دیکھا ہے، یہ اسلام کے بنیادی اصول پر مبنی ہے، ان پر مسلم کلچر کا رنگ چڑھا ہوا ہے، اس پر بحث بالکل فضول ہے کہ ان کے خیالات کی تنظیم کے لیے اجزا سے جن کے کچھ حصے کبھی ایک اور کبھی دوسرے مغربی مفکر سے مستعار لیے گئے ہیں، ان کے اپنے خیالات میں ایک خاص ترتیب و تنظیم ہے، جو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہیں۔ ان کے بعض خیالات بظاہر مغربی مفکرین سے لیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن دراصل یہ خیالات وہی ہیں، جو مسلمان مفکروں کے یہاں بھی گذشتہ دور میں پائے گئے ہیں، اس کا فرق ضرور ہے کہ سائنس کی نئی ایجادات اور خیالات کی تدریجی ترقی سے ان ہی خیالات کو زیادہ بہتر اور منطقیانہ طور پر مرتب کر دیا گیا ہے، اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جدید رنگ کے علم و فضل سے پورا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے ان فلسفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے، جو اسلام کے بنیادی عقائد پر مبنی تو ضرور تھے، لیکن وہ اس لیے نظر انداز ہو رہے تھے کہ لوگوں کو ان کی عام واقفیت نہ تھی، اور ان کے اظہار کرنے میں ترتیب نہیں دی گئی تھی۔ اقبال نے ان ہی خیالات کو اساسی ...

کرکے اس کو منطقیانہ ترتیب دے کر عجیب و غریب بنا دیا ہے۔ (ص ۔ ۵۴۵)

یہ کتاب خالص فلسفیانہ رنگ میں لکھی گئی ہے، فاضل مؤلف خود ایک اچھے فلسفی ہیں، اس لیے ان کے قلم سے بکثرت فلسفیانہ اصطلاحات نکل گئے ہیں، جن کا سمجھنا ایک فلسفی کے لیے تو آسان ہے، مگر عام ناظرین کے لیے مشکل ضرور ہے، اس لیے فاضل مؤلف ان اصطلاحات کی تعریفات بھی کرتے جاتے، تو اس کتاب کے مباحث کو سمجھنے میں زیادہ دقت نہ ہوتی۔ خود اس راقم کو بہت سی اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے اصطلاحات کی ڈکشنری کا سہارا لینا پڑا، اس طرح جن یورپی مفکرین کا ذکر اس کتاب میں آیا ہے وہ بہت ہی مشہور و معروف ضرور ہیں، لیکن مباحث کے اندر یا آغاز میں مختصر طور پر ان کے کچھ حالات زندگی درج کر دیے جاتے تو کتاب کی افادیت ان کے عام ناظرین کے لیے اور بھی بڑھ جاتی، جو ان سے بہت زیادہ واقف نہیں، یہ بزم اقبال، کلب روڈ لاہور سے شایع ہوا ہے۔ میرے سامنے اس کا دوسرا اڈیشن ہے جو ۱۹۶۵ء میں طبع ہوا تھا، اس وقت اس کی قیمت چھ روپے رکھی گئی تھی، اب تو اس کی قیمت بہت بڑھا دی گئی ہوگی۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام

راشدی صاحب کے نشان ہی پر کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ریاض الاسلام نے اپنی ایک انگریزی تصنیف انڈو پرشین ریلیشنز دی، اس کو بھی خالی اوقات میں پڑھتا رہا، یہ کتاب دراصل وہ مقالہ ہے جس پر ڈاکٹر صاحب موصوف کو ۱۹۶۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے D. Ph. پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی، اب یہ ایرانین کلچر فاؤنڈیشن تہران کی طرف سے بہت عمدہ کاغذ چھپائی کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ [illegible] دس ابواب کے علاوہ اگیارہ [illegible] ضمیمہ جات کا [illegible] الگ ہے، پانچ

تصویریں ہیں جن میں مغل اور صفوی خاندانوں کی تصویریں ہیں، ان میں ایک جہانگیر کے دربار کے مشہور مصور بشن داس کی بھی ہے، یہ ہندستان کے مغل بادشاہوں اور ایران کے صفوی حکمرانوں کے سیاسی تعلقات پر بڑی باوزن تصنیف کہی جا سکتی ہے، اس موضوع پر قدیم و جدید، قلمی اور مطبوعہ جتنے ماخذ مل سکتے تھے، مصنف نے ان سے پورا استفادہ کیا ہے۔ مغلوں کے پورے دور حکومت میں مختلف تاریخوں میں جو بکھرے معلومات تھے، وہ اس میں پوری محنت کاوش اور تحقیق کے ساتھ یکجا جمع کر دیے گئے ہیں، اس طرح اس موضوع کا بہت ہی واضح مفصل اور مکمل نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ اس کا انداز بیان نکھرا اور ستھرا ہے، سارے واقعات اس طرح ترتیب دیدیے گئے ہیں کہ ناظرین خود ان سے اپنی رائے آسانی سے قایم کر سکتے ہیں۔ تحریر میں کہیں نوک سوزن اور نیش خارسنیں، آخر میں نتیجے کے عنوان سے مصنف نے اپنی جس رائے کا اظہار کیا ہے، اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمایوں سے عالمگیر کے عہد تک قندھار کے لیے ہندستان اور ایران میں بڑی آویزش رہی، کبھی یہ مغلوں اور کبھی صفویوں کے قبضے میں آ جاتا آخرکار اورنگ زیب کو اس سے دست بردار ہونا پڑا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفوی حکمران مغل بادشاہوں سے فوجی حیثیت سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے، اس آویزش کے باوجود یہ پہلو بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے کہ دونوں ملکوں کے حکمران اپنے سفرا بھیج کر باہمی خوشگوار تعلقات بھی قایم کرنے کی کوشش کرتے رہے، گو ایران کی للچائی نظر ہندستان پر برابر پڑتی رہی، بعض صفوی حکمران تو ہندستان پر حملہ آور بھی ہونا چاہتے تھے۔ شاہ عباس ثانی نے تو [illegible] گولکنڈہ اور دکن کی ریاستوں کی پاسداری کر کے ان کو اورنگ زیب کے خلاف ابھارنے کی بھی کوشش کی۔

...طرح اورنگ زیب نے اپنے دو بھائیوں اور ...ن کی ریاستوں کے خلاف جو روش اختیار کی اس کا تجزیا اس روشنی میں بھی کرنے کی ضرورت ... ایران کے دبے ہوئے سیاسی جذبات نادر ...اہ کے بے سود اور لا حاصل حملے میں ظاہر ہوئے ...ں کے ساتھ ایک خونی تاریخ وابستا ہو کر رہ ...ئی ہے، لیکن اس حقیقت سے بھی چشم پوشی ...یں کی جا سکتی ہے کہ مغل حکومت کے عروج کے ...ند میں تمدنی، تہذیبی اور ثقافتی حیثیت سے ...ندستان اور ایران ایک گھر کے دو صحن بنے ...وئے تھے، ایرانی اثرات آج بھی ہندستان ...یں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، مگر مصنف ...ی کتاب کا یہ موضوع نہیں تھا، اس لیے اس ...کوئی سیر حاصل بحث نہیں، نویں باب میں اس ... ایک سرسری نظر ڈال دی گئی ہے، مگر ضرورت ...س کی ہے کہ اس عنوان سے بھی ایک اچھی اور ...وزن کتاب تیار کی جاے۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام نے اپنی اس کتاب کے ساتھ منشآت حسن خان شاملو کا بھی ایک نسخہ دیا ہے، جس کو انھوں نے برٹش میوزیم سے حاصل کر کے ایڈٹ کیا ہے، اور انسٹیٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشین اسٹڈیز کراچی یونیورسٹی نے شایع کیا ہے، جس کے وہ سکریٹری بھی ہیں۔ اس کے فاضل مرتب کا خیال ہے کہ یہ ایرانی سفارتی خط کتابت کا ایک بنیادی ماخذ ہے، مگر وہ اس کے مصنف کے تعین کرنے میں خود کامیاب نہیں ہوئے ہیں، اس میں ۲۶۳ مکتوبات جو ایران کے شاہ صفی اور شاہ عباس کے عہد میں ہرات کے گورنر اور خراسان کے بیگ لربیگی حسن خان شاملو اور عباس قلی خان شاملو کی طرف سے توران کے خوانین اور مختلف شخصیتوں کے نام لکھے گئے تھے، دو مکتوب جہانگیری عہد کے امیر ظفر خان حاکم کشمیر کے نام سے بھی ہیں، یہ مجموعا سنہ [illegible] کے بعد مرتب ہوا۔ فاضل مرتب اس کی انشا پردازانہ تحریر سے متاثر نظر نہیں آتے ہیں، [illegible] اس کو آورد سے بھری ہوئی شکل قرار دیتے ہیں۔ اس مجموعے کی افادیت پر بھی ان کا قلم زیادا نہیں چل سکا ہے، البتا اس کے شروع میں "بمناسبت جشن دو ہزار پانصدی شاہنشاہی ایران" درج ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایران کی طرف پاکستان کے صرف علمی خیر سگالی کے جذبے کے اظہار کے لیے اس کو ایڈٹ کر کے شایع کیا گیا ہے۔ اسی کتاب سے معلوم ہوا کہ اس کے مرتب نے ایسا مجموعا بھی تیار کر لیا ہے، جس میں ہندستان اور ایران کے سفارتی خطوط ہوں گے یہ اس برصغیر کے علمی حلقے کے لیے نسبتاً زیادا مفید کام ہوگا۔

اقبال اکیڈمی کے جلسے میں شرکت

۳؍ستمبر کو پاکستان کے مشہور ادارے اقبال اکیڈمی میں ایک علمی نشست تھی، جس میں علامہ ڈاکٹر اقبال پر ان کے ایک ہم جلیس شوق امرت سری صاحب اپنا ایک مقالا پڑھنے والے تھے، اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر معز الدین نے بڑے اصرار سے ساتھ مجھ کو بھی بلایا۔ ظفر الحسن صاحب معتمد اعزازی بیدل اکیڈمی خاص طور پر میری قیام گاہ پر آئے، اور مجھ کو وہاں لے گئے، وہاں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری سید الطاف بریلوی اور پاکستان کے بہت ہی پاکیزہ ذوق رکھنے والے شاعر اور فاران کے ایڈیٹر ماہر القادری سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ دونوں حضرات محبت سے پیش آئے، اسی مجلس میں ڈاکٹر [illegible] سے تعارف ہوا، ان کا آبائی وطن اجمیر تھا۔ ام۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے ۱۹۱۹ء میں [illegible] کیا، پھر آکسفورڈ جاکر مزید تعلیم حاصل کی۔ [illegible] میں جنگلات کے انسپکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ اقبالیات کا بڑا اچھا ذوق رکھتے ہیں، انھی نے "پیام مشرق" "اسرار خودی" کا ترجما عربی میں کرایا، جس کو ہز ہائینس آغا خان نے سراہا دیا۔ ان ہی کی مساعی سے اقبال [illegible]

بعض نظموں کے ترجمے اطالوی، جرمن، فرانسیسی زبانوں میں ہوا ہے۔ خود انہوں نے انگریزی میں اقبال پر حسب ذیل کتابیں لکھیں۔

(1) Iqbal His Art and Thought
(2) Studies in Iqbal (3) Glimpses of Iqbal (4) Thoughts and Reflection of Iqbal
(5) Introduction to Iqbal

ہندستان میں اقبالیات اقبال اور مقالات اقبال بھی مرتب کی ہیں۔ جلسے کی کارروائی شروع ہوئی تو شوق امرتسری نے اپنا مقالہ پڑھا جو بہت محنت اور خاص سلیقے سے لکھا گیا تھا۔ اس کے زیادہ تر حصے میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر اقبال نہ سوشلسٹ تھے اور نہ وحدت الوجودی، وہ سوشلسٹ تو یقیناً کسی لحاظ سے نہ تھے، البتہ جب فاضل مقالہ نگار یہ ثابت کر رہے تھے کہ وہ وحدت الوجودی نہ تھے، تو میرے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ اگر وحدت الوجود عشق الٰہی کی سرشاری اور وارفتگی سے مراد ہے تو ڈاکٹر اقبال وحدت الوجودی ضرور تھے۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی اور آخری دور میں شاہ ولی اللہ وحدت الوجود کے قائل رہے ہیں تو ڈاکٹر اقبال کیسے اس کے منکر ہو سکتے تھے۔ عام خیال یہ ہے کہ وحدت الوجود کے حامی اسلامی شریعت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، مگر یہ بزرگان دین تو وحدت الوجود کے قائل ہونے کے ساتھ اتباع شریعت کا بڑا لحاظ رکھتے، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری فرمایا کرتے کہ شریعت کے بغیر راہ طریقت میں غرور، جہل، پندار اور حمق پیدا ہو جاتا ہے، جس کے بعد شیطان [illegible] ایمان برباد کر دیتا ہے۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کا عقیدہ تھا کہ اولیاء اللہ فنا فی اللہ کے درجے کو نہیں پہنچ سکتے، جب تک کہ ظاہراً باطناً، قولاً فعلاً اور حالاً حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع نہ ہوں۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا قول ہے کہ جو وحدت الوجود کے ساتھ کفر و اسلام، امر و نہی، ثواب و عذاب، رحم و قہر اور نبوت کے قائل ہیں وہ تو صوفیا ہیں اور جو ان چیزوں کے قائل نہیں ہیں وہ سوفسطائیا ہیں، وہ سوفسطائیوں کو خارج از اسلام قرار دیتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا بیان ہے کہ ان کے چچا شاہ ابوالرضا وحدت الوجود کے قائل تھے، مگر اپنے تمام چھوٹے بڑے کاموں میں شریعت کی پابندی کا اہتمام کرتے، حتیٰ کہ سنت نبوی کی پیروی میں جب مسجد کے قریب پہنچ کر کھڑے ہو جاتے پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالتے پھر دایاں پاؤں بڑھا کر مسجد میں داخل ہوتے۔ اگر وحدت الوجود کے حامیوں کا یہی شیوہ اور مسلک رہا تو پھر ڈاکٹر اقبال کیسے اس کے مخالف ہو سکتے تھے۔

خیال آیا کہ ڈاکٹر اقبال کی کتاب "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" اور ان کی "اسرار خودی" میں ان کے ایسے خیالات کا وجود ضرور ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ وحدت الوجود کے نظریے کو پسند نہ کرتے تھے وہ واقعی ایسے وحدت الوجود کو تسلیم نہیں کرتے جو مسلمانوں کو ذوق عمل سے محروم کر کے ان میں رجائیت کے بجائے قنوطیت پیدا کرے اور ان کو اس راہ میں جو بیخودی حائل ہو اس سے وہ مذہب و اخلاق بیگانہ اور شرع کی پابندیوں سے آزاد ہو کر زندگی گزاریں یا رہبانیت پر عمل کر کے فرار اور گریز کو اپنا شیوہ بنا لیں۔ یہ وحدت الوجود کا بگڑا ہوا نظریہ ہے جس کے حامی ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت، نیکی و بدی، ثواب و عذاب کی تفریق مٹا دینے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ایسے وحدت الوجود کا رشتہ اسلام سے منسلک نہیں کیا جا سکتا، ڈاکٹر اقبال کو ایسے ہی وحدت الوجود سے اختلاف رہا ہوگا، ویسے ابن العربی وحدت الوجود کے بہت بڑے حامی تھے

جاتے ہیں، ڈاکٹر اقبال پہلے تو ان کے معترف نہیں تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ابن عربی نے اپنے نظریۂ وحدت الوجود کو قرآن و حدیث سے ہٹ کر ایک فلسفہ بنا دیا ہے، لیکن ڈاکٹر اقبال کے غور و فکر کی گہرائی جیسے جیسے بڑھتی گئی، وحدت الوجود کے متعلق بھی ان کا خیال بدلتا گیا، اور وہ وحدت الوجود کے فطری نظام کو قرآن اور حدیث ہی کے مطابق تصور کرنے لگے ان کی گلشن راز جدید، زبور عجم، جاوید نامہ، بال جبریل، ضرب کلیم، مسافر، پس چہ باید کرد اور ارمغان حجاز میں ایسے اشعار ملیں گے جن سے ظاہر ہوگا کہ جب وہ حقیقی وحدت الوجود سے آشنا ہوئے تو اس نظریے سے ان کی مخالفت جاتی رہی، بال جبریل کا ایک شعر ہے ؎

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمیا بی

ضرب کلیم میں ہے ؎

خرد ہوتی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

ابن عربی بھی بیخودی کے ذریعے سے خدا تک پہنچنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اقبال بھی خودی کے ذریعے سے خدا تک پہنچنے کی تلقین کرتے ہیں، دونوں کی منزل ایک ہے۔ صرف راہیں کچھ مختلف ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے اپنی کتاب "اقبال اور اس کا عہد میں" اس موضوع پر بہت اچھی بحث کی ہے جس سے مجھکو پورا اتفاق ہے۔

یہی ساری باتیں ذہن پر چھائی ہوئی تھیں کہ شوقی صاحب نے اپنا مقالہ ختم کیا۔ ڈاکٹر معز الدین نے فاضل مقالہ نگار سے سوالات کرنے کو کہا۔ کچھ سوالات و جوابات ہوئے۔ پھر ڈاکٹر معز الدین نے ایکایک مجھ کو اپنے خیالات کے اظہار کرنے کو کہا، میرا جی چاہا کہ میں اب تک جو کچھ سوچ رہا تھا، اس کو کہہ ڈالوں، مگر میرے پاس ہی ماہر القادری بیٹھے تھے جو وحدت الوجود کے مخالف ہیں

جائے۔ اس لیے اس کو نظر انداز کرکے میں نے اقبال سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میرے استاد علامہ سید سلیمان ندوی اقبال کے بہت قایل تھے۔ اپنی نجی صحبتوں میں ان کی فکر و نظر کی توصیف برابر کرتے رہتے تھے۔ جب ان کی وفات کی خبر سنی تو رنج و اضطراب میں دیر تک ٹہلتے رہے اس کے بعد "معارف" میں جو شذرات لکھے، وہ ان کی بہترین انشا پردازانہ تحریروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں، اس میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ ایسا عارف تلمیذ، عاشق رسول، شاعر فلسفی اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید یہ صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کی ہر پرواز بال جبریل تھا، اس کی فانی عمر ختم ہو گئی لیکن ان کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشا اللہ باقی رہے گا۔"

اسی سلسلے میں یہ بھی عرض کیا کہ ڈاکٹر اقبال بھی سید صاحب کے بڑے معتقد تھے، ان کو اپنے ایک مکتوب میں جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد کہا، اور ان سے علمی، ادبی اور مذہبی مسائل میں مشورے کرتے رہے، اور جب سید صاحب ڈاکٹر اقبال اور راس مسعود نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان گئے تو دونوں اس سفر میں اور بھی ایک دوسرے کے قریب تر ہوگئے ایک روز سید صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری باقی ہے ہندستان میں اسلام باقی رہے گا۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا نہیں جب تک ہندستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات باقی رہیں گی ہندستان میں اسلام باقی رہے گا، راس مسعود نے دونوں کو روک کر کہا کہ یہ کہیں کہ جب تک ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور دارالمصنفین کا لٹریچر ہندستان میں باقی رہے گا، یہاں اسلام بھی باقی رہے گا۔ یہ سن کر دونوں ہنس پڑے [illegible]

اقبال کامل شایع کر کے کی ہے، مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور ہندستان کے مشہور ادیب رشید احمد صدیقی صاحب نے کئی بار مجھ سے کہا کہ ہندستان کی یونیورسیٹیوں میں اقبال اسی اقبال کامل کے ذریعے سے سمجھے جا رہے ہیں، اس کے مصنف مولانا عبد السلام ندوی نے اقبال کے پیام اور فلسفے کو جس واضح اور صاف انداز میں سمجھایا ہے کوئی اور نہ سمجھا سکا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ بھی کہا کہ اس وقت ہمارے ملک ہندستان میں اقبال کی عظمت کا اعتراف ہر طرف سے ہو رہا ہے۔ اکبر علی خان صاحب جب یو۔ پی کے گورنر تھے تو انہوں نے اقبال پر ایک بہت ہی اچھا مقالہ پڑھا جو اخباروں میں کئی قسطوں میں شایع ہوتا رہا۔ ہمارا مرکزی حکومت اقبال کا سو سالا جشن پورے اہتمام کے ساتھ منانے والی ہے۔ اس کے لیے مختلف کمیٹیاں بھی بنائی گئی ہیں۔

پھر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی کہ اس برصغیر میں اقبال کا سب سے بڑا پرستار اگر کوئی ہے تو وہ جگن ناتھ آزاد ہیں جو ہندستان کے مشہور شاعر بھی ہیں، اور اس وقت حکومت ہندستان کے محکمۂ اطلاعات کے بڑے عہدیدار بھی ہیں وہ اقبال کی ہر چیز سے عشق رکھتے ہیں۔ آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ ڈاکٹر اقبال کی نظم قرطبہ سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کو قرطبہ دیکھنے کا شوق ہوا، وہ وہاں گئے اور جس جگہ ڈاکٹر اقبال نے دعا مانگی تھی وہ بھی ڈھونڈ نکالی اور پھر وہاں کی مسجد کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچے کہ اقبال نے اس کے در و بام میں ان عظیم شخصیتوں کے کردار کو جلوہ گر دیکھا جن کے عزائم نے یہ مسجد تعمیر کی، وہ میونخ بھی گئے جہاں ڈاکٹر اقبال نے تعلیم پائی تھی، انہوں نے ڈاکٹر اقبال پر ایک نمائش بھی مرتب کی ہے، جو ہندستان کے مختلف شہروں میں بڑے شوق سے دکھائی جاتی رہتی ہیں۔ وہ دارالمصنفین آئے تو انہوں نے اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط کا ایک مجموعہ دیکھا تو ان پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی کیونکہ اس سے پہلے ایک ساتھ اقبال کے اتنے خطوط ان کی نظر سے نہیں گذرے تھے۔ تہذیب مانع نہ ہوتی تو وہ خوشی میں رقص کرنے لگتے۔ اب وہ اس مجموعے کا فوٹو اسٹیٹ نسخہ شایع کرنے والے ہیں، وہ اقبال پر برابر مضامین لکھ رہے ہیں۔ بڑی جرات کے ساتھ وہ اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ اقبال پر الزام ہے کہ وہ مذہبی اور اسلامی شاعر تھے، مگر یہی ان کا سب سے بڑا وصف ہے جس سے وہ محروم نہیں کیے جا سکتے۔

دنیا کے بہت سے بڑے شاعروں نے مذہب کو اپنا موضوع بنایا ہے، ویاس، والمیکی، دانتے، ملٹن اور گیٹے تو مذہبی شاعر ہی تھے، مگر ان کے شاعرانہ کمالات سے کون انکار کر سکتا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا خیال ہے کہ اقبال کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، مگر ان کے خیالات کی عظمت سے انکار ممکن نہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ اقبال نے جو بات کہی ہے وہ اس نیت کی بلندی سے کہی ہے، وہ صرف مقصد کی عظمت ہی کے قائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے حصول کے لیے طریق کار کی عظمت کے بھی قائل ہیں عظمت کے اس تصور نے ان کی شاعری کو ایک آفاقی حیثیت اور عالمگیر قدر بخشی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کا خیال ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال وطنیت کے خلاف تھے وہ ان کو صحیح طور پر نہیں سمجھے، اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان کی وطنی نظموں میں اسلام کا ہمہ گیر تصور موجود ہے اور ان کے اسلام کے ہمہ گیر تصوریوں میں وطنیت پائی جاتی ہے، مگر یہ بات صرف غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی ظاہر ہو سکتی ہے، مگر وہ اس نیشنلزم کے ہرگز قائل نہ تھے، جس پر آج کل کی سیاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا خیال ہے کہ اقبال کو اسلامی شاعر کہنا بھی صحیح نہیں، کیونکہ ہومر، دانتے اور ملٹن کو عیسائی شاعر نہیں کہا گیا، کالیداس، تلسی داس، ٹیگور کو ہندو شاعر نہیں

کہلاتے، اقبال نے اسلامی تعلیمات ضرور پیش کی ہیں، مگر اس تعلیم کے ذریعے یہ پیش کیا ہے کہ انسان عظیم ہے، اور جادۂ عظمت پر گامزن ہے ان کے پورے کلام کو صحیفۂ عظمت آدم کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

میں نے آخر میں یہ کہا کہ اگر اقبال کو اسلامی شاعر ہی تسلیم کر لیا جائے تو وہ مسلمانوں کو جذبۂ لم یزل کا دست قدرت اور زبان دیکھنا چاہتے تھے اور انہوں نے ان کا مقام چرخ نیلی فام سے پرے متعین کیا تھا، کیا پاکستان کے مسلمان ان کے اس پیام پر عمل کر رہے ہیں۔؟

یہ سب کچھ کہکر بیٹھا تو ڈاکٹر معز الدین میرے پاس آئے اور بولے کہ جو کچھ آپ نے اس وقت کہا ہے، وہ قلمبند کر دیں، تاکہ یہ اقبال ریویو میں چھپ جائے، مگر کراچی کے قیام میں اس کو قلمبند کرنے کی فرصت نہ ملی، چائے کے بعد ڈاکٹر معز الدین نے اقبال اکیڈمی کے کتب خانے کی سیر کرائی، یہ اس کی اپنی عمارت نہ تھی، بلکہ کرایہ کی تھی۔ اس زمانے میں یہ اکیڈمی لاہور منتقل ہو رہی تھی، اسلیے اس کا سارا سامان بند پڑا تھا، مگر اس کی مطبوعات کی فہرست دیکھکر یہ معلوم ہوا کہ یہاں سے اب تک اقبالیات پر اردو، انگریزی، سندھی، گجراتی، پشتو، بنگالی، ترکی، جرمن اور عربی میں ۷۵ کتابیں نکل چکی ہیں۔ ڈاکٹر معز الدین نے لاہور پہنچ کر دارالمصنفین کو اس اکیڈمی کی تمام مطبوعات پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا، مگر واپسی میں لاہور میں نہ ٹھہر سکا، اس لیے یہ کتابیں نہ مل سکیں۔

ضیا ہانی

فراق

(۱۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو استاذی حضرت علامہ محوی لکھنوی کے بھوپال میں انتقال کی خبر سنکر)

ایک ایسا خواب نظر آیا مجھ کو پچھلی شب
فلک سے ٹوٹ رہے تھے ہزار ہا کوکب
تڑپ کے برق عجب ڈھا رہی تھی قہر و غضب
کھلی جو آنکھ تو ویران تھا گلستان ادب
بوقت صبح کسی نے خبر یہ پھیلا دی
وفات پا گئے علامہ محوی صدیقی
خبر یہ سنتے ہی بے کار ہو گیا تھا دماغ
خیال بھی نہ تھا اجڑے گا شاعری کا باغ
اٹھے گا قلب سے اب کس طرح جدائی کا داغ
کسے خبر تھی کہ بجھ جائے گا ادب کا چراغ
دفور صدمۂ جانکاہ سے چھلک ہی پڑے
کہ اشک آنکھ سے بے ساختہ ڈھلک ہی پڑے
وہ ہستی جو تھی زمانے کی "تاجدار علوم"
وہ ہستی جس کی تھی دنیائے شاعری محکوم
وہ چاند جس پہ تصدق تھی کائنات نجوم
وہ بادشاہ سخن جس کی ہر طرف تھی دھوم
چمن یہ جس سے چمن تھا وہ باغبان نہ رہا
"ریاض اردو" کی افسوس پاسباں نہ رہا
تصورات کا اندر سے کیف بار عالم
تخیلات کے ہر سو اڑا دیئے پرچم
جہان شعر پہ رحمت ہے ان کا زور قلم
زمانہ کیوں نہ پکار اٹھے "شاعر اعظم"
جو پھول باغ سخن میں کھلا گئے مرحوم
ضیاؔ نہیں کبھی مرجھا سکے گی "باد سموم"

[illegible]	خوار ستم خلد شد لٹ گیا در غم ہجراں تو کر لوٹ ہے یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من بے تبسم ساتھ عجب رو ٹھو ہے روئے تو رو نق شکل آفتاب سرو بہ پیش قد تو بوٹ ہے گامزن خستہ تو گفتہ کر بیٹھو وہ چمکنہ کھٹک مرا پھر ہے

کریمی الاحسانی

مشاعرے جشن جمہوریت لال قلعہ دلی

یہ ۲۴ر جنوری ۱۹۷۶ء کی برفیلی رات ہے میں لال قلعہ پہنچ گیا ہوں رات میں پاس دفتر شان ہند میں ہی رہ گیا۔ یہاں آکر جو دیکھا تو پنڈال ایوان عام کے قریب ہی بنایا گیا ہے۔ ایک ہجوم عالم اور ستاتا ہے، حالانکہ اس مشاعرہ کو سننے کے لیے بیرون دلی سے بھی ہندستانی کے چاہنے والے اور شاعروں کے شائقین شرکت کیا کرتے ہیں، لیکن آج ایک جمود طاری ہے پوسٹر میں آٹھ بجے کا وقت لکھا ہوا ہے اور میں بھی وقت پر آگیا ہوں۔ گیٹ پر جن لوگوں کو تعینات کیا گیا ہے ان پر زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم صادق آتا ہے۔ یہ حضرات خود مجھ سے دریافت کر رہے ہیں کہ یہاں کیا ہوگا ان کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ یہ حضرات [illegible] سے تعلق رکھتے ہیں، ان کو بتلایا کہ مشاعرہ ہوگا۔ مشاعرہ کیا ہوتا ہے میں نے سمجھایا کہ کویتا جانتے ہو۔ ہاں۔ تو یہ ہندستانی کی کویتا ہوگی۔ دیکھا تو محترم عرش ملسیانی صاحب [illegible] صاحب کے سہارے آرہے ہیں۔ [illegible] مزاج پرسی ہوئی اور ان کے ساتھ ہی میں آگیا ہوں۔ اسٹیج کے سامنے انور صابری [illegible] ہیں، ان کے پاس ہی بیٹھ گیا ہوں [illegible] اور آل انڈیا ریڈیو کے منتظمین [illegible] اور ریکارڈ کرنے کی تیاری [illegible] ہیں۔ سامعین کی تعداد بڑھ رہی ہے،

اور شعرا کرام بھی ٹولیوں میں آرہے ہیں۔ ۹ بج چکے ہیں اور ابھی تک شنکر دیال شرما جی وزیر حکومت ہند تشریف نہیں لائے اس لیے رادھا رمن صاحب چیف ایگزیکٹو دلی چیرمین کا صدارت کے لیے اسم گرامی پیش کیا جارہا ہے، آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے جارہے ہیں اور آپ فرماتے ہیں۔ ابھی شرما جی کے آنے میں دیر ہے مجھے یہاں کھڑا کر دیا گیا ہے، میں آپ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔ لال قلعے کا یہ مشاعرہ ایسا نمایاں ہو کہ اس کی یاد دلوں میں دیر تک رہے۔

یہ بھی ارشاد فرمایا ایسے مشاعرے بہت پہلے ہوا کرتے تھے، اب وہ نمائندہ شاعرے کہاں ہیں مختصر سی تقریر فرما کر تالیوں کی جھنکار میں اپنی جگہ آگئے ہیں تو اسی عالم شنکر دیال شرما جی تشریف لے آئے ہیں۔ آپ کا نام نامی افتتاح کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ آپ کا بھی پھولوں اور تالیوں سے استقبال کیا جارہا ہے۔ یہ تالیوں کا شور ذرا کم ہوا تو شرما جی نہایت پُر وقار انداز سے خالص اور شستہ ہندستانی میں فرماتے ہیں۔

بزرگوار اور ساتھیو۔ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ جشن جمہوریت کا مشاعرہ [illegible] کے قلعے میں ہو رہا ہے آج ہم ایسے وقت اکٹھے ہوئے ہیں کہ ہندستان ابھر کر سامنے آیا ہے۔ پہلے تقاریر کا کوئی مقصد ہوتا تھا لیکن شاعرے

کلام کا زیادہ اثر ہوتا ہے - کسی بھی ملک میں انقلاب ہوا ہو وہاں شعرا کرام کا زیادہ حصہ رہا ہے یا امید ہندستان کے شعرا سامعین سے رکھتا ہوں -

تالیاں - ہندستان زندہ رہے گی، ہندستانی بڑھے گی اور اس کو اس کا صحیح مقام ملے گا -

تالیاں - اندرا جی کی قیادت میں نیا اعتماد قایم ہوا ہے - تالیاں - ہم سب کو چاہیے کہ ان کے پروگرام میں ہاتھ بٹائیں - ہندستانی کا رشتہ ہر دور اور سماج کے ساتھ وابستہ رہا ہے - ہماری آزادی کی تحریک جن جن رستوں سے گذری ہندستانی نے اس کا ہر جگہ ساتھ دیا - تالیاں اور میں سوچ رہا ہوں جس ہندستانی نے آزادی دلائی آج ہم اس کو نظر انداز کر چکے اور وہ غریب الدیار ہندستانی اپنی شیرینی اور اپنے بل بوتے پر زندہ ہے - ہم ہندستانی کی تعریف سن کر صرف تالیاں بجاتے ہیں کیا اس طرح ہندستانی زندہ رہے گی ؟ کیا تالیوں سے ہندستانی کو اس کا صحیح مقام مل جائے گا ؟

لیجیے ملک زادہ منظور احمد صاحب شاعروں کو چلانے کے لیے مائک پر آکر شعرا کرام کا تعارف کرا کر بدم شری الحاج بیکل اتساہی صاحب سے اس مشاعرے کا آغاز کرا رہے ہیں - قبلہ بیکل یوں لحن داؤد میں جھوم رہے ہیں ؎

کوئی تھا ہندو نہ مسلم گنہ کس نے کیا
بتاؤ پیار کے گھر کو تباہ کس نے کیا
وہاں نہ ہم تھے نہ تم نہ اور کوئی تھا
تو پھر یہ شیشے کا چہرہ سیاہ کس نے کیا

ایک ہندی گیت کا خاتمہ ہے یہ ہنگامہ ختم ہوا تو بیکل صاحب مجھ سے داد وصول کرنے چلے ہیں ؎

نہ گلوں کی تازگی ہے نہ چمن کی دلکشی ہے
جو دلوں کو گرما دے روشنی وہی اصل روشنی ہے
اے حسین چاند تارو نہ سجاؤ میرے گھر کو
مرا دشمن جگمگانا وہی میری زندگی ہے

بیکل صاحب ایک حسین گیت سنا کر تالیوں کی زد میں ہیں، اسی ذرا سی پنسل سے اس مشاعرے کو لکھو گے ؟ میں نے عرض کیا نہ جانے کتنے مشاعرے اسی پنسل سے لکھ چکا ہوں اور یہ پنسل ابھی باقی ہے - دیکھا تو محترم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب کا تالیوں سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے اور عرش ملسیانی صاحب عطا کر رہے ہیں ؎

جو کم ہمت ہیں ان کو حوصلہ دینا بھی آتا ہے
ہمیں تم کہہ کے مردوں کو جلا دینا بھی آتا ہے
بزرگوں کا ادب آتا ہے اور خورد کی دلداری
دعا لینا بھی آتا ہے دعا دینا بھی آتا ہے
نگاہوں کا نگاہوں سے ملا دینا تو آساں ہے
جو دل ملتے نہیں ان کو ملا دینا بھی آتا ہے
حریم ناز میں رہتے بھی ہیں اے عرش ہم اکثر
حریم ناز کا پردہ اٹھا دینا بھی آتا ہے

عرش صاحب خوب خوب داد وصول کیے جا رہے ہیں اور منظور صاحب دعوت سخن دے رہے ہیں مسعودہ حیات صاحبہ ایم اے جنھوں نے ایک طویل نظم سنا رہی ہیں، جسے سامعین نے دلچسپی سے سنا - آیے آپ بھی سماعت فرمایے ؎

اب کوئی جبر کرے گا نہ کوئی لوٹے گا
مٹ گئے عدل کی برکت سے لٹیرے کتنے
کتنی برباد ہے اب اہل ہوس کی دنیا
اور آباد ہیں نادار کے ڈیرے کتنے
اب کہیں سے نہیں اٹھتا کسی الزام کا شور
حق و انصاف کی ہر سمت صدا پھیلی ہے
ہر طرف پھول نظر آتے ہیں نظم نو کے
گلشن ہند میں خوشبوئے وفا پھیلی ہے

حیات صاحبہ کا ارمان جا رہی ہیں، اور منظور صاحب مسکرا کر فرما رہے تھے - اب تشدد کے بعد ایک سنجیدہ شاعر یعنی کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اپنے کلام سے گرم فرمائیں گے - محترم کنور صاحب نے ایک طویل نظم عنایت کی ہے میں نے عرض کیا ہے پر اکتفا کیا یہ وہی فال تھا ہے کہ جہاں کے مشاعرے کو ... کی ... ہو ... سکتے ہیں لیکن

کی مہربانی اور کرم فرمائی ہے اگر ایسا ہے تو اس
تلاطم کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔ دیکھا تو محترم کنور
صاحب تانپوروں کی جھنکار میں ہانگ سے جدا
ہو رہے ہیں اور منظور صاحب فرما رہے ہیں
ہندستان کی آزادی اور ہندستان کی تشکیل
ہیں جن کا ہات رہا ہے اور وہ کنور صاحب کے
ہم شکل ہیں، انہیں علاما اور صابری کے نام سے
پکارتے ہیں۔ اب آپ کے سامنے آرہے ہیں
ان سے بھی کچھ سنیے گا۔ علاما بڑے ترنم سے
گرج رہے ہیں ؎

کہا یہ کس نے کہ تزئین لالہ زار نہ ہو
یہ شرط ہے کہ کوئی آنکھ اشکبار نہ ہو
قدم قدم پہ رہے ہوش قافلہ والو
چھپا ہو اگر کوئی رہزن پس غبار نہ ہو
چمن سے ربط محبت کا حق ادا کر دو
کلی کلی کو تبسم سے آشنا کر دو
خلاف مصلحت باغباں ہیں جن کے دماغ
انہیں بہار کے ماحول سے جدا کر دو
تجوریاں ہیں نہ روشن ہوں سیم و زر کے چراغ
دل غریب کی آہوں کو یوں رسا کر دو
دبے ہوئے تھے جو صدیوں سے بار غم کے تلے
بلند ان کے عزائم کا حوصلہ کر دو

علاما صاحب خوب خوب داد تحسین پا کر اپنی جگہ
بیٹھے رہے تھے اور منظور صاحب مینا قاضی کو دعوت
نغمہ دے رہے ہیں۔ مینا صاحبہ یوں محفل کو نغمگی
سے معمور بنانے چلی ہیں ؎

امید و یاس نے کچھ ایسے گل کھلائے ہیں
سنبھل سنبھل کے قدم اپنے ڈگمگائے ہیں
پنڈال میں ایک بھونچال سا آیا ہے، قدرے سکوت
کے بعد اسی پاکیزہ لے میں مینا رہی ہیں ؎
بقدر ہمت دل ان کے ناز اٹھائے ہیں
یہ اور بات ہے وہ آجکل پرائے ہیں
سب ہی ... شریک ... تھا - ایک آواز - ایک
... دیکھا تو ایک سوار ہی مینا صاحب کو پانچ
... ہیں جیسے سنگر سے
کے ساتھ واپس کر دیا گیا ہے اور آپ اسی سج
دھج سے محفل کو یوں جھنکار رہی ہیں ؎

خزاں بدوش ہواؤں سے دور رہو
ہمیں نہ چھیڑو بہاروں کے ہم ستائے ہیں
جہاں عشق و وفا میں بہت اندھیرا تھا
ہمیں نے اپنے لہو سے دیے جلائے ہیں
تمام عمر جنہیں ہم نے رائیگاں سمجھا
کبھی کبھی وہ آنسو بھی کام آئے ہیں

علاما صاحب مسکرا کر فرما رہے ہیں کہ لکھو
رہے ہو۔ دیکھا تو مینا صاحبہ مائک چھوڑ
رہی ہیں اور منظور صاحب فرما رہے ہیں کہ
صرف قومی نظمیں ہی نہیں، بلکہ شاعر کی رائے
پر چھوڑ رہے ہیں کہ وہ کیا سنانا چاہتے ہیں اس
اعلان پر اظہار خوشنودی کیا جا رہا ہے، حالانکہ
آج قومی شاعری ہی پیش کی جاتی۔ وہ دیکھیے
صوفی رام کشن مضطر صاحب بیداری لے کر
آرہے ہیں۔ ایک بند آپ بھی سنیے ؎

جب فتنہ گر چمن کو مٹانے پہ تل گئے
جب شر پسند آگ لگانے پہ تل گئے
ہر شاخ ہر شجر کو جلانے پہ تل گئے
بنیاد قصر امن کو ڈھانے پہ تل گئے

مضطر صاحب خوب خوب داد پا کر اپنی جگہ
آرہے ہیں اور منظور صاحب ڈاکٹر نثار احمد خاں
نثار سے درخواست کلام کر رہے ہیں۔ نثار
صاحب نہایت سنجیدگی سے عنایت کر رہے ہیں ؎

دل اسیر غم دنیا نہیں ہونے پاتا
شکر صد شکر کہ ایسا نہیں ہونے پاتا
خون دل سے جو جلاتے ہیں محبت کے چراغ
ان کی دنیا میں اندھیرا نہیں ہونے پاتا
لوگ اندھیر مچاتے ہیں تو پھر گلشن میں
صبح ہو کر بھی اجالا نہیں ہونے پاتا

ڈاکٹر صاحب تانپوروں کی جھنکار میں جا رہے
ہیں ادھر منظور صاحب رنگ محفل بدلنے کے
لیے ہلال رضوی رامپوری کو دعوت ... خوش مزاج
... رہے ہیں، علاما صاحب ...

عنایت کر رہے ہیں سنیے اور لطف لیجیے ؎

دیکھا ہلال میں نے یہ کل رات خواب میں
غالب کھڑے ہیں مسجد شاہ جہاں کے پاس
حیران ہو کے میں نے کہا آپ اور یہاں
جان جہاں کے پاس نہ پیر مغاں کے پاس
کہنے لگے کہ دوست بیاں کیا کروں میں حال
جنت میں جا کے ایسا پشیماں ہوا کہ بس
جب بادۂ طہور میں پینے پہ ڈٹ گیا
دو چار بوتلوں ہی پہ آئی صدا کہ بس
پھر بولے چھوڑو ذکر دیاں کا بتاؤ یہ
بے برق تھا یہاں پہ جو بازار کیا ہوا؟
وہ چاٹ والے اور وہ کبابی کہاں ہیں اب؟
میں چاہتا ہوں کہ سنبھل جائے ذائقہ
نظارۂ جمال نہ کیفیت سرور
ساقی کی چشم مست نہ رندوں کا اضطراب
آخر بتاؤ تو کہ یہ ہے انقلاب کیا
جب کہہ چکے تو میں نے کہا محترم جناب
بعد وصال بھی ہے وہی حسرت نگاہ
بقول اس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
ذوق طلب کا تھا یہ تقاضا کہ اب تلک
مسجد کے زیر سایۂ خرابات چاہیے
دلی ہے شاہراہ ترقی پہ گامزن
جو دے سکے بیاں کے وہ حالات اب نہیں
بقول اس آنکھ تو ہے جناب اسد مگر
مسجد کے زیر سایۂ خرابات چاہیے

ہلال صاحب محفل کو قہقہوں [illegible] شور و غل میں انھا کر تالیوں کے ہنگم شور میں جا رہے ہیں اور منظور صاحب اسی محفل غزل میں پکار کر جمیل تاباں دہلوی کو دعوت موسیقی دے رہے ہیں - تاباں صاحب رن جھم کر غزل سرا ہیں ؎

کیا اہل محبت نے یہ بات بھلا دی ہے
ہم نے لہو دے کے گلشن کو جلا دی ہے
اب [illegible] شہر میں اور دنیا تماشائی
دیوانے کی الفت کی کیا خوب سزا دی ہے
[illegible]
تم نے ہی تو کچھ اپنے دامن سے ہوا دی ہے
گلشن کے نگہباں تو کس خواب میں سوئے ہو
گلشن میں بہاروں نے اک آگ لگا دی ہے

تاباں صاحب خوب خوب محفل کو گرما کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور منظور صاحب بہار برنی سے درخواست کلام کر رہے ہیں۔ بہار صاحب ایک طویل نظم مبارکباد پیش کر رہے ہیں سنیے ؎

جہاں مشرق میں اک آفتاب نو ابھرا
جلوس رہے کے ضیا بار حال و مستقبل
نیا سماں نئی تابانیاں نیا منظر
قریب تر نظر آتی ہے رہ کی ہر منزل
مبارک ان کو جو حق میں ہیں حق نگر بھی ہیں
کہ پاش پاش ہوئی آج قوت باطل
جو سد راہ تھے وہ مسئلے تمام ہوئے
رہ سفر کے لیے راہ اب نہیں مشکل
بہار نو نئے منظر کھلائے گی ہر سو
ہر ایک سمت گلوں کی سجے گی اب محفل
بہ فیض جذبۂ صد اتحاد یک جہتی
رہے گا کوئی نہ اپنے چمن سے اب غافل

بہار صاحب داد و تحسین پا کر کامران پلٹ رہے ہیں اور منظور صاحب عزیز وارثی کو یاد فرما رہے ہیں - عزیز صاحب بانکے سجیلے بنے یوں سج دھج سے رواں دواں سنا رہے ہیں ؎

کس کوچہ میں حسن نہیں ہے کس محفل میں رنگ نہیں ہے
دیکھو تو اے نقاد زمانہ تیری نظر تو تنگ نہیں ہے

عزیز صاحب غزل سنا کر چلتے بنے اور دیکھا تو فتنۂ محشر گلزار دہلوی بھی رواں دواں بنا کر یہ جا لگے وہ جا ہیں آپ کا ترنم دیکھا کیجیے آپ عثمان عارف نقشبندی ایم - پی سے یہ حسین اشعار سنیے ؎

آ رہی ہے امن کی دیوی پیام آشتی لے کر
مدد کو اس کی بھارت کے نگہبانوں میں آ جاؤ
نہیں پر چم ہمہ کا دامن امن داماں لے کر
[illegible] آزادی کو [illegible]
[illegible]

سبق انسانیت کا دو کر انسانوں میں آباد
ترستے تھے کروڑوں روشنی کو زندگانی کی
چراغاں کیجئے غربت کے سب خانوں میں آباد

عارف صاحب تالیوں کی جھنکار میں جا رہے ہیں اور منظور صاحب یار غزل منیر جھنجھانوی کو دعوت غزل دے رہے ہیں۔ منیر صاحب پروقار انداز سے فرما رہے ہیں ؎

جان پر بنتی رہی لیکن وفا کرتے رہے
زندگی بھر زندگی کا قرض ادا کرتے رہے
حوصلہ مندانہ بڑھ کر چھین لی تیغ ستم
پست ہمت سر جھکا کر التجا کرتے رہے

داد نقطۂ عروج سے سوا ہے اور آپ کئی بار دعا کر ضابت کر رہے ہیں ؎

زندگی کی ناز برداری کوئی آساں نہ تھی
موج تیز و تند کو موج صبا کرتے رہے
رو دیئے ہم ان سے دنیا کے مناظر دیکھ کر
اپنی تنہائی پہ ہم شکر خدا کرتے رہے
ایک حلقہ ہر برس بڑھتا گیا زنجیر کا
اور ہم آزاد ہونے کی دعا کرتے رہے

منیر صاحب تالیوں کی جھنکار میں شاداں پلٹ رہے ہیں اور منظور صاحب رفعت سروش سے درخواست کلام کر رہے ہیں۔ سروش صاحب یوں گرج اور برس رہے ہیں ؎

آندھیوں کو ہم درس وفا دیتے ہیں
سینے میں نئی آگ لگا دیتے ہیں
تلواروں کے سائے میں پلے ہیں ہم لوگ
کانٹوں بھری راہوں پہ چلے ہیں ہم لوگ
منزل پہ پہاڑوں کا نہیں تھی آساں
طوفاں میں شعلوں پہ چلے ہیں ہم لوگ

سروش صاحب بھی داد و تحسین پا کر ایک طرف [illegible] ہو گئے ہیں اور منظور صاحب ملک کے [illegible] جگن ناتھ آزاد کو یاد فرما رہے ہیں۔ آزاد صاحب نہایت بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

[illegible] کا جو پیغام آ گیا
ایک [illegible] پیام آ گیا
اس رات کی نجات پنہاں نہ پوچھ تو
جب بےخودی میں لب پہ ترا نام آ گیا

داد کا عالم نہ پوچھیے اور آپ اسی انداز سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

اے دل میں اپنی فتح کو لے کر گزر گیا
اس معرکہ میں تو ہی اگر کام آ گیا

آزاد صاحب تالیوں کی جھنکار میں محفل کو گرما کر جا رہے ہیں اور منظور صاحب ممتاز مرزا دہلوی کو دعوت نغمگی دے رہے ہیں۔ محترمہ بیگم ممتاز مرزا صاحبہ نہایت دلکشی سے یوں محفل کو چونکانے چلی ہیں ؎

نکھر گئی ہے فضا پھول کھلتے ہیں
چمن کو موسم نشو و نما مبارک ہو
یہ دور دور سعادت ہے زندگی کے لئے
ہجوم رنگ و پیام صبا مبارک ہو
اندھیری رات کو تاریخ کے سپرد کیا
نئی سحر ہے نئی ابتدا مبارک ہو
خدا کا شکر ہے کہ تعمیر نو کا وقت آیا
نظر کو جلوہ در و بام کا مبارک ہو
حیات تازہ ملی جس کے عزم و ہمت سے
ہماری قوم کو وہ رہنما مبارک ہو

ممتاز صاحبہ محفل میں نغمگی بکھیر کر تالیوں کی جھنکار میں اپنی جگہ آ رہی ہیں۔ اور منظور صاحب درخواست کلام کر رہے ہیں عالم فتح پوری سے۔ عالم صاحب گرج رہے ہیں ؎

الیکشن کی شکستوں کی زخم کھائے ہوئے
ذلیل ہو کے بھرہ بزم سے اٹھائے ہوئے
مقام و مرتبہ و آبرو گنوائے ہوئے
خود اپنی ٹھوکروں سے اپنے دیئے بجھائے ہوئے
جبیں سنگ ندامت کی چوٹ کھائے ہوئے
حواس باختہ، بدحال سٹ پٹائے ہوئے
نظر میں تیر عداوت کے اور سینے میں
کچھ انتقام کی چنگاریاں چھپائے ہوئے
تمام فرقہ پرستی کی [illegible] سے
جو انجمن کے [illegible] اٹھ [illegible]

منافع خوروں کو غنڈوں کو، زرپرستوں کو
بعد خلوص و محبت گلے لگائے ہوئے
چلے تھے سیکڑوں بے چند و جعفر و صادق
وطن پرستوں کی کنجیاں چڑھائے ہوئے
یہ چاہتے تھے بجھا ڈالیں شمع بزم وطن
چھپے ہیں آج اندھیرے میں منھ چھپائے ہوئے
بغیر زہر نکالے نہ چھوڑنا ان کو
بلوں میں سانپ جو بیٹھے ہیں دم دبائے ہوئے

عالم صاحب کو ہر شعر پر وہ داد دی گئی کہ کیا عرض کروں محفل کو خوب خوب گرما کر تالیوں کے بے ہنگم شور میں مائیک چھوڑ رہے ہیں اور منظور صاحب مشہور غزل گو شاعر ساحر ہوشیار پوری کو زحمت سخن دے رہے ہیں - ساحر صاحب پوں زبان کے سادہ اشعار سے مشاعرا لوٹنے کی سعی فرما رہے ہیں ؎

پھول بکھرے ہیں زمیں پر یہ تماشا کیا ہے
چشم بینا یہ حقیقت ہے تو دھوکا کیا ہے
کھا کے سوگند تم تو اک پھول تبسم کا ملا
تم نہ سمجھو گے مرے شوق کی دنیا کیا ہے
رت جوانی کی جو بیتی تو سمجھ میں آیا
ڈھلتے سورج سے چڑھے چاند کا رشتا کیا ہے

ساحر صاحب داد تو ہر حال میں لے ہی لیتے ہیں ہر چند کہ آپ ترنم سے نہیں پڑھتے ہیں لیجیے اب ایک نیا انداز، نئی فکر اور منفرد غزل مخمور سعیدی سے سنیے ؎

ہر گزرتے ہوئے جھونکے نے کہا ہے مجھ سے
تم جو ناراض ہو موسم بھی خفا ہے مجھ سے
میری دہلیز پہ آ آ کے پلٹ جاتی ہے
سرگراں کیوں ترے قدموں کی صدا ہے مجھ سے
آگے بڑھ جاؤں کہ اس موڑ کا پتھر بن جاؤں
وہ پھر آنے کے لیے کہہ تو گیا ہے مجھ سے
خالی خالی نظر آنے لگی دنیا مجھ کو
وقت نے آج یہ کیا چھین لیا ہے مجھ سے

مخمور صاحب بھی داد وصول کیے جا رہے ہیں اور

ساغر صاحب رواں دواں سنا کر داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور منظور صاحب درخواست کلام کر رہے ہیں بسمل سعیدی سے قبلہ بسمل صاحب بھی رواں دواں سنا رہے ہیں آپ بھی اسی عجلت سے سن لیجیے گا۔

جستجو نے تری جس دن سے گنوایا ہے مجھے
جس نے ڈھونڈا ہے ترے نام سے پایا ہے مجھے

داد مطلع ہی سے شباب پر ہے اور آپ عطا کر رہے ہیں ؎

بیکسی کہتی ہے وہ تجھ سے جدا رہتے ہیں
بیخودی تو نے کبھی تنہا بھی پایا ہے مجھے
تھا میں اک نغمۂ عشرت اے دل تو نے
عشق کے ساز پہ اس درد سے گایا ہے مجھے
موت اگر تجھ سے ڈراتی تو کوئی بات بھی تھی
زندگی موت سے کیوں تو نے ڈرایا ہے مجھے

قبلہ بسمل صاحب مناسب داد وصول کیے تالیوں کی جھنکار میں مائیک سے کھسک رہے ہیں اور منظور صاحب ذکیا سلطانا نیر صاحبہ سے درخواست کلام کر رہے ہیں - نیر صاحبہ عنایت کر رہی ہیں ؎

اس طرح اے جرأت بھارت کی لگن ہے
جیسے سمویا ہوا خود اس میں وطن ہے
کہتا ہے جسے سارا جہاں اندرا گاندھی
وہ فخر وطن نازِ وطن روح وطن ہے
ظلم اور بغاوت کی بساط اس نے الٹ دی
دنیائے سیاست میں وہی ماہر فن ہے

نیر صاحبہ تالیوں کی جھنکار میں مائیک چھوڑتی ہیں اور منظور صاحب درخواست کلام [illegible] نظام کر رہے ہیں - الحاج پیرزادہ [illegible] بیکل اتساہی صاحب سے - قبلہ بیکل کا نام سنتے ہی تالیوں کے پرخلوص خیر مقدم کیا جا رہا ہے اور بیکل صاحب محفل کو جھنکانے اور گرمانے کا یوں کرشمہ فرما رہے ہیں ؎

نکلو دیر و کعبے سے جیسا کہ چھپے ہونگے
وہ تمھارے زمانے کا مقدر چھپے ہونگے
وہ جو سادہ ورق بکھرے تھے انکی محفل میں
وہی پھر اٹھنے کے بعد دفتر ہوگئے ہونگے

ہمارے گاؤں کے رستے برابر ہو گئے ہونگے
جنہیں تم توڑ کر خود گھر کے باہر پھینک آئے تھے
وہ آئینے کے ٹکڑے بھی خنجر ہو گئے ہونگے
مری دیوانگی کے بعد اتنا تو ہوا ہوگا
کسی کے ہاتھ کے کچھ پھول پتھر ہو گئے ہونگے

قبلہ بجلی صاحب تالیوں کے شور میں ائیک سے جدا ہو رہے ہیں، اور آپ کے ساتھ ہی سوا بارہ بجے یہ محفل شعر و سخن برخاست ہو رہی ہے۔ آج کا یہ مشاعرہ غنیمت ہے کہ اچھی طرح سن لیا گیا ورنہ سال ہا سال سے یہ مشاعرہ ہوٹنگ کی نذر ہو کر رہ جاتا تھا۔ مجموعی طور پر امسال یہ مشاعرہ اچھا جا اور سنا گیا۔ کاش تمام مدعو شعرا کرام شرکت فرماتے تو یہ مشاعرہ اور کامیاب ہوتا دیسے اس سرکاری مشاعرہ کو نمائندہ مشاعرہ نہیں کہا جا سکتا، حالانکہ اس مشاعرے کو مثالی اور تاریخی ہونا چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ میں بھی دل مخلوقے ترنگا پرچم کو سلام کرتا ہوا ہماتک جیش خان کا رخ کر رہا ہوں ذرا آرام کروں گا۔ آپ بھی آرام فرمائیے گا۔ خدا حافظ
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

سکندر علی وجد

پروین سلطانہ

کس رنگ میں ہے دلبر دلباز تو دیکھو
ہے موج ہلاہل نگہ ناز تو دیکھو
نغمات کی پرواز کا اعجاز تو دیکھو
خود ساز ہے بے حال یہ انداز تو دیکھو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو
خاموشی احساس میں اک دھوم مچا دی
چھیڑا کہیں برفاب کہیں آگ لگا دی

ہر بول کی سوئی ہوئی تقدیر جگا دی
ہر تان کی زنجیر تڑپا سے ملا دی
سرگم سے در ساز و نوا تول رہی ہے
سنگیت کی ایک ایک گرہ کھول رہی ہے

پر نور گلا وقت کے راگوں کا خزانہ
نیرنگیٔ الفاظ ہے رنگین بہانہ
جذبات کی لہروں کا جنوں خیز ترانہ
سن کر جسے سو بار پلٹ آئے زمانہ

پل کر تری آواز کا رس جھوم رہا ہے
محفل کی قدموں کے قدم چوم رہے ہیں

جال

آگ سے کھیلنے کی خواہش میں
بچوں جیسے اچھل رہے ہیں لوگ
زہر کا تو مسلہ ممکن تھا
آجکل کیا اگل رہے ہیں لوگ
ان کو شاید پھوڑتا ہے ضمیر
خود سے کیا بچ کے چل رہے ہیں لوگ
تمکنت سے جھکے ان کے گھر
سر جھکا کے نکل رہے ہیں لوگ
آج کیا بات ہو گئی ایسی؟
مجھ سے بچ کر نکل رہے ہیں لوگ
کس غضب ہے شعور ذات وقار
اپنے مقصد بدل رہے ہیں لوگ

[illegible]

صفدر آہ

امیر خسرو کی مادری زبان

امیر خسرو ہندستان کے بہترین فارسی گو شاعر ہیں۔ فارسی میں ان کا مرتبہ حافظ و سعدی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ خود اہلِ ایران ان کی استادی کے قائل ہیں اور انہیں "طوطیٔ ہند" کہتے ہیں۔ اس بلند حیثیت کے باوجود خسرو نے غالب کی طرح یہ کبھی نہیں کہا کہ غ

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ

اس زمانے کی غریب ہندوی تھی ہی کیا، لیکن اس کے باوجود خسرو ایسا بے عدیل فارسی شاعر اسی ہندوی کو یہ فخر اپنی مادری زبان بتاتا ہے۔

چوں من طوطیٔ ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

ترک ہندستانیم من ہندوی گویم چو آب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

ہندستانی ہونے پر جو فخر و ناز اور ہندستان کے جو شاندار اذکار خسرو کے کلام میں ہیں وہ معیار اور مقدار دونوں میں منفرد ہیں جن کا جواب سنسکرت سے لیکر ہندستانی تک کہیں نہیں مل سکتا۔

خسرو پٹیالی ضلع ایٹہ میں گنگا کے کنارے ۶۵۱ھ / ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے، اور شہر دلی میں جمنا کے کنارے ۷۲۵ھ / ۱۳۲۵ء میں مرگئے۔ خسرو کے [illegible]

کسی لڑائی میں مارے گئے جس کے بعد خسرو کی والدہ اپنے میکے دلی چلی آئیں۔ خسرو کی تعلیم و تربیت ان کے بکثرت پان کھانے والے سانولے سلونے ہندستانی نانا عماد الملک کے زیر سایہ ہوئی۔ اس وقت عماد الملک ایک بادشاہ گر امیر سمجھے جاتے تھے، اور ان کا گھر اعلیٰ ترین ہندستانی تہذیب کا مرکز تھا۔ خسرو کے نانا، ان کی والدہ اور ان کا سارا ننیال شائستہ ترین ہندوی بولتا تھا۔ جو شیر مادر کے ساتھ خسرو کے حصے میں آئی تھی۔

خسرو نے اپنی مادری زبان کو ہندوی کہا ہے۔ ہندوی یا ہندی ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی INDIAN انڈین ہیں۔ زبانوں کی تفصیل خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں اس طرح کی ہے۔

سندی و لاہوری و کشمیر و کبر
دھور سمندری و تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اودھ
دلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
این ہمہ ہندویست ز ایام کہن
عامہ بکار ... بہ گونہ سخن

(اس کے بعد یہاں کی علمی زبان سنسکرت کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے)

ہندستان کی عوامی زبان کے متعلق خسرو [illegible]

حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اوپر کی زبانیں جن میں غیر آریائی زبانیں تلنگی وغیرا بھی شامل ہیں، ہندوی کہلاتی ہیں اور عوام (اپنے اپنے حلقوں میں) انہی زبانوں میں کلام کرتے ہیں۔

سات سو سال کے بہن پر پھیلی ہوئی تحریروں میں اس زبان کو ہندوی، ہندی، ہندستانی زبان ہندستان، دہلوی، ترکوں کی بولی، مسلمانوں کی بولی، دکنی اور آخر میں اردو یا اردوے معلاے شاہجہاں آباد کہا گیا۔ نیز اسکی نظم کو ریختا کا نام دیا گیا، لیکن اس زبان کا رسم خط صنایع بدایع عروض اور قافیہ وغیرا ابتدا سے دکن تک اور دکن سے آج تک ہمیشا فارسی رہا ہے۔ ہمارے لغات اور قواعد کی کتابوں میں ہندوی یا ہندی کا لفظ اس زبان کے لیے اب تک رایج ہے ہم دیسی الفاظ کو اب تک "الفاظ ہندیا" دیسی اصوات کے حروف کو "حروف ہندیا" اور دیسی شکل میں متبدل اور غیر ملکی الفاظ کو "الفاظ ہند" کہتے ہیں۔ غالب کی "عود ہندی" اور انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" اسی روایت کی یادگار ہیں۔

محمود شیرانی مرحوم نے کہا ہے کہ لفظ ریختا سب سے پہلے امیر خسرو نے ایک اصطلاح موسیقی کے لیے استعمال کیا ہے لیکن یہ لفظ اوپر کے معنی میں خسرو کی کسی تصنیف میں نہیں ملتا۔ خسرو نے خدا کی جہارت موسیقی کا اقرار تو کیا ہے، لیکن اپنی وضع کی ہوئی اصطلاحات کہیں درج نہیں کی ہیں۔ ریختا کے متعلق اصطلاح موسیقی ہونے کی خبر ہمیں سب سے پہلے "تحفۂ چشتیہ" میں ملتی ہے۔ یہ کتاب خسرو کے انتقال کے ۳۰۰ سال بعد علا عابدین یونانی نے ۱۰۶۵ھ میں لکھی ہے۔ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم اس بیان کو درست ہی مان لیں۔ یہ ظاہر ہے اصطلاح فارسی آمیز اردو نظم کے لیے سب سے پہلے دکن

میں وضع ہوئی ہے۔

ہندستانی کی بنیاد ہی بہرحال ایک مخصوص ہندستانی بولی ہے، جسے فارسی کے اثرات نے اردو یا دہلوی ہندوی کی شکل دی۔ ہندی والوں نے اس بنیادی بولی کو کھڑی بولی کا نام دے دیا ہے، اس بولی کی نشانیاں یہ ہیں۔

ا - نا - گا - نا اِس - اُس - جس - کس پر - میں وغیرا۔

اس بولی کے سانچے میں فارسی کے زیر اثر دہلوی ہندوی ڈھلی ہے جو آخر میں آکر اردو کہلائی۔ کوئی لسانی نظریا نہیں بتا سکتا کہ ہندستانی غیر ملکی درآمد ہے۔ یہ بات حتمی اور قطعی ہے کہ وہی کھڑی بولی جو لکھی نہیں جاتی تھی صرف بولی جاتی تھی، ہندی مسلمانوں کو موافق آئی اور انہوں نے اس بولی کو اپنی زبان بنالیا۔ خسرو اس عہد کے ہیں جب یہ بولی فارسی میں ڈھل کر ہر جہ دا شکل اختیار کر چکی تھی۔

کھڑی بولی کے لیے یہ نظریا تو کسی طرح درست ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کا وجود جنوبی ہند میں پہلے سے تھا۔ تلگو، مراٹھی اور گجراتی کے حلقوں میں کھڑی بولی کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ یہ زبان جو بعد میں دکنی کہلائی قطعئے شمالی ہند سے جنوب میں گئی ہے، اور مقامی زبانوں کے زیر اثر اس نے ایک مخصوص شکل اختیار کی ہے۔ شمالی ہندو والے اور خصوصاً دلی والے اس دکنی زبان کو ہمیشا اپنی زبان کا چربا سمجھتے تھے، اور اسے اپنی زبان سے پست تر خیال کرتے تھے۔ چنانچے سعد اللہ گلشن دکنی کے سب سے اہم شاعر ولی کو مشورا دیتے ہیں کہ۔

"ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختۂ خود بکار ببر" -

"شمار زبان دکنی را گزاشتہ ریختہ موافق اردوے شاہجہاں آباد موزوں بکنید تا موجب شہرت و رواج و قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد۔"

گویا سعد اللہ گلشن کے نزدیک معیاری زبان دہلوی ہے نہ کہ دکنی۔ اسکے برعکس دکنی

کوئی بڑے سے بڑا ادیب دہلوی کے لیے اس قسم کا خیال ظاہر کرنے کی ہمت نہ کرسکا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی بڑے سے بڑا فارسی کا ہندستانی ادیب ایرانی فارسی کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکا۔

کھڑی بولی کی بعض نشانیاں پنجابی، ہریانی برج اور اودھی وغیرا میں مل جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ زبانیں شاید کھڑی بولی کی بہنیں یا ہمسایہ بولیاں ہوں، لیکن مواد کے فقدان کی وجہ سے ابھی تک صحیح طور پر یہ طے نہیں ہوسکا ہے کہ اس دہلوی ہندوی کی ماں کھڑی بولی کا حلقہ شمالی ہند کا کون سا مخصوص حصہ تھا۔

امیر خسرو کی قدیم ترین شہادت کی بنا پر ذاتی طور پر میں کھڑی بولی کا حلقہ دلی اور پیرامن دلی کو مانتا ہوں، لیکن یہ کوئی ایسا فیصلہ نہیں جسے ایک نظریے کی صورت میں پیش کیا جاسکے۔

جن متعصب اہل تحقیق نے ہندستانی کا رشتہ دراوڑی زبانوں سے جوڑنے کی کوشش کی ہے انہوں نے بلاشبہ غلط لسانی تاریخ وضع کرنے کے لیے توجیہہ تراشیاں کی ہیں۔ ہندستانی ہمہ جہت و ہمہ وجوہ ایک آریائی زبان ہے۔

سنسکرت کے بعد خسرو ہندستانی بولی کے سب سے پرانے شاعر ہیں جن کا نام آج بھی آفتاب کی طرح روشن ہے۔ خسرو نے اپنی کتاب در دیباچۂ غرۃ الکمال" میں بتایا ہے کہ ان سے بھی ڈیڑھ سو سال پہلے ایک اور ہندوی شاعر مسعود سعد سلمان ہوئے ہیں جن کا ایک فارسی، ایک عربی ایک ہندوی دیوان تھا۔ ان کے عربی اور ہندوی دیوان اب کالعدم ہو چکے ہیں، لیکن ان کا تقریباً ۹۰۰ صفحات کا فارسی دیوان رشید یاسمین نے تہران سے ۱۳۱۸ھ [illegible] ہے۔ مسعود سعد سلمان

لاہوری ہندوی یعنی پنجابی میں ہوگا۔

"تذکرۂ عرفات" میں اوحدی کا بیان ہے کہ خسرو کا ہندوی کلام بھی اتنا ہی تھا جتنا ان کا فارسی کلام تھا۔ ان کا فارسی کلام تین لاکھ ابیات سے زیادہ اور چار لاکھ ابیات سے کم بتایا جاتا ہے۔

خسرو کا تین اور چار لاکھ ابیات کے درمیان فارسی کلام ہونا ضروری ہے۔ اوحدی کے بیان کے مطابق ان کا اتنا ہی ہندوی کلام بھی ہونا چاہیے۔

خسرو کا فارسی کلام آج بھی اگر کل نہیں تو بیشتر موجود ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کی مادری زبان ہندوی کے تین چار لاکھ اشعار میں سے مع "خالق باری" زیادہ سے زیادہ چار سو شعر ہمارے پاس رہ گئے ہیں۔ پھر ان بقیہ اشعار کی اگر محققانہ جانچ پڑتال کی جائے (جو بہت مشکل ہے) تو یہ تعداد دو سو تک بہ مشکل پہنچ سکے گی۔ ہمارے ادب کا یہ جانکاہ ترین حادثہ ہے۔

خسرو نے اپنی ہندوی پر فخر و ناز کیا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ خسرو ہندستانی عوام کے گھر گھر میں اپنی فارسی کی بدولت نہیں اپنی ہندوی کی بدولت پہنچے ہیں۔

خسرو کا ہندوی کلام ضایع ہونے کا سبب یہ ہے کہ اس عہد میں کسی السنہ خصوصاً سنسکرت عربی اور فارسی کا تو احترام تھا، لیکن عوامی زبانیں ناخواندہ عوام کے ہاتوں میں تھیں جو ان زبانوں کے اشعار سے لطف تو لے سکتے تھے، لیکن ان کی تدوین اور حفاظت کی ذمے داری نہیں سنبھال سکتے تھے۔ عوامی زبانوں میں نہ جانے کتنے شاعر پیدا ہوکر مع اپنی تخلیقات کے کالعدم ہوگئے۔

یہ خسرو کی معلوم اور باوقار شخصیت کا اثر ہے کہ آج ان کا اتنا مختصر عوامی کلام بھی باقی ہے۔ عوامی ادب کی تدوین کا کام خسرو کے عہد سے بہت بعد شروع ہوا ہے۔ مذہبی [illegible]

مختلف مذاہب کے ہات میں آگئی تھی -
ہمارے پاس خسرو کا ہندوی کلام اہل ذوق کی بیاض سے بہت کم اور زیادا تو عوام کی سینا بہ سینا روایات سے آیا ہے - یہی وجہ ہے کہ اس میں تحریفی اور الحاقی اجزا بھی شامل ہو گئے ہیں - عوام کی غیر تربیت یافتہ یادداشت اور غیر محتاط روش کبھی تو ان اشعار کے لفظوں میں ہیر پھیر کر دیتی تھی اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ خسرو کے رنگ کی جو چیز بھی کسی کو یاد ہوئی اسے وہ اپنے اس محبوب شاعر سے منسوب کر دیتا تھا - عوام کی یہ تصرف گزاریاں بعد میں خواص کی تحریروں میں آگئی ہیں -

خسرو کے ہندوی کلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے -
(۱) ادبی رنگ کا کلام (۲) عوامی رنگ کا کلام (۳) خسرو کا تعلیمی نعت "خالق باری" - خسرو کے ادبی کلام میں میری نظر میں صرف دو دوہے ایک غزل اور ایک قطعہ قابل اعتبار باقی رہ گئے ہیں جو حسب ذیل ہیں -

دوہا - گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چہوں دیس

یہ دوہا معتبر ترین ہے - خواجہ نظام الدین کے عرس کا افتتاح اب تک ہر سال اسی دوہے سے ہوتا ہے -

دوہا نمبر ۲
خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرا من پیو کا دو بھئے اک رنگ

یہ دوہا بھی بہ ہر حیثیت معتبر ہے -
ان دوہوں کے علاوہ خسرو کا کوئی دوہا مستند نہیں -
اس کے بعد خسرو کی مشہور غزل "زحال مسکیں مکن تغافل" قطعی طور پر مستند ہے - اس غزل کو ریختہ کی قدیم ترین شکل سمجھنا چاہیے - ریختہ [illegible] اسی وقت تک [illegible] وضع ہوئی ہو - [illegible] سمجھا گیا ہے -

زر گر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گھڑئے سنوارئے پکارا
نقد دل من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

اس قطعے کا دوسرا اور چوتھا مصرع اس شائستہ زبان کا نمونہ ہے جو خسرو کے گھر میں بولی جاتی ہوگی -
مجھے اس سے زیادا خسرو کا معتبر ادبی کلام نہیں مل سکا - ہاں ان کے عوامی رنگ کے کلام کے تقریباً دو تین درجن نمونے ایسے ضرور موجود ہیں جنہیں متیقن طور پر ان کا کلام کہا جا سکتا ہے - اس کلام میں خسرو کی شاعرانہ اور صلاحیت، ذہانت اور اس عہد کی زبان کی جھلکیاں موجود ہیں -
خسرو کے عوامی کلام میں موضوعات کے اعتبار سے زبان کے کئی رنگ ہیں جیسے مسلمان لڑکیوں کا یہ گیت دیکھئے -

اماں میرے بابا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی ترا بابا تو بوڑھا ری کہ ساون آیا

"ری" کا لفظ یہاں گیت کی رعایت سے آیا ہے - ورنہ اس کی زبان مسلم گھرانے کی شائستہ گھریلو بولی ہے -
"مسلمان سکھیوں کی یہ کہرنی دیکھئے"

سگری رین موہے سنگ جاگا
بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
واکے بچھڑے پھاٹت جیا
اے سکھی ساجن نا سکھی دیا

بلکل مسلمان گھر کی گھریلو بولی ہے، لیکن چونکہ سکھیاں گیت کے مجاز میں باتیں کر رہی ہیں، اس لیے موہے، بچھڑن لاگا، پھاٹت، جیا وغیرہ آ گئے ہیں - گیت عوامی بولیوں کی قدیم ترین روایت ہیں - ان کے لفظ آج بھی ہندوستانی گیتوں میں آتے ہیں اور خسرو کے زمانے میں بھی رائج تھے -
نیچے کا گیت دیکھئے جو ہے تو خواجہ نظام الدین کے متعلق ہے لیکن ویشنو رنگ کا ہونہ ہے [illegible] میں عورت - عاشق اور مرد معشوق ہوتا ہے -

اس گیت میں بھی عورتوں کی زبان نظر آئے گی۔ جو ہے ٹھیٹ بولی۔

دیاری موہے بجو یاری
شاہ نظام کے رنگ میں
کپڑے رنگے سے کچھ نہ ہوئے ہے
یا رنگ میں نے تن کو ڈبو ری

غالباً یہ گیت گائکی کے لیے کسی راگ میں بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

خسرو کے ادبی اور عوامی کلام میں تعلیم نصاب ہندوی و فارسی کی کوشش خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ ان کی مکرنیاں پہیلیاں اور دو سخنے وغیرا ترتیب لغت کے دلچسپ سبق ہیں، بلکہ ان کا کافی حصہ گویا صرف تعلیم لغات ہی کے لیے لکھا گیا ہے۔

خسرو کا تعلیم لغات کا سب سے عظیم کارنامہ انکی کتاب "خالق باری" ہے۔ یہ کتاب خسرو کی مقبول ترین تصنیف ہے جسے پچھلے سات سو برس میں ہزاروں خطاطوں نے زیور کتابت سے آراستہ کیا اور مطبع کا رواج عام ہونے کے بعد پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اس کے درجنوں ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ بظاہر یہ مکتب کی ایک معمولی کتاب ہے لیکن ترویج زبان میں جو کام اس کتاب نے کیا ہے اس کا جواب نہیں ملتا۔ یہ اردو کا سب سے قدیم اور پہلا لغت ہے۔ میرے خیال میں خسرو نے یہ کتاب اوایل عمر میں لکھی ہے۔ اس انداز کی پہلی کتاب "نصاب الصبیان" ہے جو عربی الفاظ کی تعلیم کے لیے ابو نصر فراہی نے ۶۱۷ھ میں تصنیف کی تھی۔ خسرو نے یہ کتاب قطعی طور پر مکتب میں پڑھی ہوگی۔ "نصاب الصبیان" کے واضح نقوش "خالق باری" میں موجود ہیں۔

عہد کے اعتبار سے "خالق باری" اسی زمانے کی تصنیف ہے جب فارسی کا پہلا ایرانی لغت "فرہنگ فرس اسدی طوسی" تصنیف ہوا

نامہ قواس" "خالق باری" سے کئی سال چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔

"خالق باری" کی مقبولیت کا اندازا اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ پنجاب سے لیکر دکن تک اس انداز کی درجنوں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اس ڈھنگ کی پہلی تصنیف جو اس وقت بھی ملتی ہے "السدفہ الیٰ" ہے جسے تحلی نے ۱۳۰۱ء میں لکھا تھا۔ اس کے بعد تو یہ سلسلہ غالب کے "قادر نامے" تک، بلکے اس سے بھی آگے پڑا ہے

یہ حقیقت ہے کہ خسرو کی مادری زبان دہلوی ہندوی تھی جو انہیں فارسی سے زیادا عزیز تھی۔ اس زبان میں انہوں نے لاکھوں شعر گیت، پہیلیاں، مکرنیاں، ڈھکوسلے اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا ہے۔ یہ سب بیشتر ضایع ہو چکا ہے لیکن اس کا جو حصہ "مشتے نمونہ از خروارے" باقی ہے وہ ہمارے ادب کا قابل فخر سرمایا اور ہمارے ملک کی بے بہا دولت ہے۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں قومی سطح پر خسرو کا "جشن ہفت صد سالا" ہونے جا رہا ہے۔ اس جشن میں خسرو کی مادری زبان کی تحقیقات پر خصوصیت سے کام ہونا چاہیے۔ خسرو کے ایسا ہمہ رنگ جینیس ہندستان آج تک نہیں پیدا کر سکا ہے۔ آج ہم جو زبان بولتے ہیں وہ خسرو ہی کی زبان ہے۔

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی

روزنامچہ

۸ ربیع المحبوب ۱۳۵۰ مطابق ۲۴ اگست ۱۹۳۱ء یکشنبہ دلی

قرآن کا روزنامچہ

ذی عقل کیلیے وسایل عرفان — انٹھایا قران دیکھا پارہ ۳۰

پڑھیں سورہ فجر کی پانچ چھوٹی چھوٹی آیتیں جو شروع میں ہیں فجر - دس راتیں طاق اور جفت - جانے والی رات - یہ چار ہیں جن کی نسبت خدانے پوچھا کیوں؟ کیا ان چاروں میں عقل والوں کے لیے عرفان کے وسایل ہیں؟ ہاں حضور! آپ کی پردا والی سوہنی صورت کی قسم میں بے عقل بھی ان چاروں کے راز سمجھ گیا -

فجر محمد کا روشن چہرا ہے - دس راتیں آخری چاند کی راتیں ہیں جب آپ تاریکی میں اپنا جمال نمایاں کرتے ہیں - طاق وجفت اعداد حساب ہیں جن کے اندر ہماری حیات دارین کو پوشیدا کیا گیا ہے جانے والی رات تہجد کا وقت ہے - جب آپ اپنے جمال حقیقی پر صبح کے راز کی نقاب ڈال کر اس کو رخصت کرتے ہیں کہ اور بیان کرنا ہی آپ کہتے ہے بے عقلی کو سمجھنے کا

تا ذوق معرفت نے حق نہیں دیا اور جو جانتا ہے وہ کہتا نہیں اور جو کہتا ہے وہ جانتا نہیں -

علی امام الاولیا کا روزنامچہ

وہ کہو جو سمجھ میں آے بخاری نے پارہ اول میں روایت کی ہے کہ علی نے فرمایا لوگوں سے ایسی باتیں کرو جس کو وہ سمجھ سکیں - کہاں ہیں جناب مولانا صاحبان جو عربی زبان کے خطبے پڑھنے پر اصرار کرتے ہیں اور نہیں جانتے ہیں کہ جو چیز سمجھ میں نہ آے اس کا بیان کرنا فضول ہے -

معدوم ہستی نما کا روزنامچہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم سب معدوم و نابود ہیں مگر ہستی موہوم کی شکل میں موجود نظر آتے ہیں عجیب منزل میں میری موہوم شکل طلوع آفتاب سے پہلے عالم میں معروف ہو گئی اگرچہ آج تک اس کا وجود کوئی نہیں آیا -

حسین اور حسن الدین نظامی نے خطوط کے جواب لکھنے میں مدد کی تا [illegible]

مداد ناکام تھی۔ نگراں کی محنت سے جی خوش ہوا۔

دو بجے دل گیا بچے بھی ساتھ تھے آج بھیا شیخ احسان الحق صاحب فقیر عشقی اپنے گاؤں میں جا رہے ہیں بچے بیمار ہیں۔ خود بھی علیل ہیں تبدیل آب و ہوا مقصود ہے۔ واحدی صاحب قاری عباس حسین صاحب حسرت وغیرہ احباب جمع تھے، سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون اپنی موٹر میں ان کو گاؤں تک لے گئے۔ حاجی پور بیٹا گاؤں کا نام ہے، جہاں ایک بہت بڑے بزرگ کا مزار بھی ہے۔ یہ جگہ دلی سے چار پانچ میل دور ہے، مگر ضلع میرٹھ کا اور صوبہ یوپی کا ہے۔

آج خون نہیں آیا، مگر کل کے دورے کی کمزوری آج تک ہے۔ بیمار بیل کی طرح کام کی گاڑی کو بمشکل کھینچ رہا ہوں۔ توحید منزل اور ستار منزل اور مزمل منزل تیار ہے۔ بجلی کی فٹنگ کے لیے محمد احمد صاحب دلی سے آئے تھے۔

آج عباسی صاحب ایگزیکٹو انجینئر دلی نے تیراکی کے میلے کی دعوت دی تھی۔ میں تیراکی کو زندگی کا ایک ضروری ہنر تصور کرتا ہوں۔ میرے بچے تیرنا سیکھتے ہیں یہاں تک کہ میری لڑکیاں بھی تیرنا جانتی ہیں۔ میں عباسی صاحب کی اس تحریک کو بہت ہی مفید تصور کرتا ہوں۔ دلی میں اب تک اس فن کا شوق ہے یہ خوشی کی بات ہے۔

رات کو قریب کے گندے نالے اور گھوسیوں کی بھینسوں کے گوبر کی بہت بو آتی ہے، اگر "رات کی ملکا" پھول کی مہک اور خوشبو نہ ہو تو میں شاید جلد ہی مر جاؤں، کیونکہ میں بدبو کو بہت کم برداشت کرتا ہوں۔

آج ایک صاحب نے لکھا ہے کہ کابل نہ جاؤ، ایسا نہ ہو افغان آپ کو قتل کردیں میں تو روز قتل ہوتا رہتا ہوں، افغان قتل کردیں گے
[illegible]

نہیں ہوں جو اماں جان کی گود میں بیٹھ کر اپنی داڑھی میں کنگا کرتے ہیں اور اماں سے کہتے ہیں کہ ہم کو بھی چوڑیاں منگا دو اگر ماں کہتی ہیں کہ بیٹا اب تم جوان ہوئے خدا رکھے لمبی داڑھی ہوئی چوڑیاں نہ پہنو اور گھر کے باہر جاؤ تو جواب دیتے ہیں باہر قتل کا خوف ہے میں تو باہر نہیں جاتا۔

رائے دینے والوں کی ہمدردی اور پیش بینی کا شکریہ، لیکن میں نے آج تک موت کے ڈر سے کبھی اپنے کسی ارادے کو ترک نہیں کیا انسان تو دنیا میں مرنے کے لیے زندہ ہوا ہے۔ زندہ رہوں گا تب بھی زندگی ہے مر جاؤں گا تب بھی زندگی ہے۔

آج رات کو ساڑھے آٹھ بجے سویا تھا، صبح ساڑھے چار بجے تک آنکھ نہ کھلی۔ نیند خون کی کمی کو پورا کرنے کی تدبیروں میں مصروف معلوم ہوتی ہے۔

ذرا میرے پیارے پیارے بچے حسن جبرئیل کو دیکھنا کیا اچھا پھول ہے۔ "رات کی ملکا" بہت عمدہ پھول ہوتا ہے، مگر دیکھنے میں نہیں فقط سونگھنے میں اور انسان کا بچہ دیکھنے اور سونگھنے دونوں کے کام آتا ہے۔

حسن جبرئیل ایسا پیارا پھول ہے جس کو باپ صبح تہجد کے بعد بہت دیر تک دیکھا کرتا ہے اور جس کو اس کے بہن بھائی بہت پیار کرتے ہیں اور جس پر خاجا باز جیسی باوقار اور ہر وقت سنجیدہ رہنے والی عورت کو بھی کبھی کبھی پیار آجاتا ہے، اور وہ اس کے تبسم کا اپنے تبسم سے خیر مقدم کرتی ہیں۔

جس کو خدا نے چھوٹے بچے دیے ہوں وہ ان بچوں کی معصومیت سے لطف اٹھانا جانتے ہوں وہ ولی ہیں، اور جو بچوں کی کیفیت اٹھانے سے بےحس ہوں وہ دوزخ ڈاک خانہ جہنم ضلع عذاب دارین کے باشندے ہیں۔

میں اس بچے کو مرغی کے بچے سے زیادہ پیارا نہیں سمجھتا۔ مرغی کا بچہ جب چوں چوں کرتا بھاگتا ہے تو مجھے اس کی آواز میں ضمیر آواز
[illegible]

حرکت میں فیبی حرکت نظر آتی ہے۔

آدمی کا بچہ ان جلووں سے محروم ہوتا ہے، تاہم اس میں دوسری قسم کے جلوے ہوتے ہیں، مگر وہ بچہ کو زیادہ نظر آتے ہیں۔

٩ ربیع المحجوب ١٣٥٠ھ مطابق ٢٤ اگست ١٩٣١ء

دوشنبہ دلی

مشیت الٰہی کا روزنامچہ

ہندو بچے کے سانپ کاٹا تیرے گھر کے قریب ہندوکس زون کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے وہ سب تیرے پڑوسی ہیں، اور تیرے دکھ درد کے شریک ہیں اس گاؤں کے ایک غریب گھر میں ایک اپاہج اور اندھے بیمار مرد اور ایک دیوانی عورت کی سکونت ہے جن کے صرف ایک ہی لڑکا تھا جس کی عمر آٹھ برس کی تھی آج اس لڑکے کے سانپ نے کاٹا، گھر گاؤں والے پرانی لکیر کے فقیر ہوتے ہیں کسی نے کہا گھی پلاؤ کسی نے کہا جھاڑا پھونکی کراؤ اس میں مصروف ہو گئے کسی نے کہا نیم کے پتوں پر لٹا دو وہاں لٹا دیا۔ کسی نے کہا اس کے سامنے گانا کراؤ تاکہ سانپ اس کے سر پر آجائے اس کی تعمیل کر دی

یہ حالت سب بے علم قوموں کی ہے جو دوسرے بے عقل لوگوں کی رائے پر چلتی ہیں۔ خود اپنی عقل اور رائے سے کوئی کام نہیں کرتیں، اگر سانپ کے کاٹنے کی جگہ فوراً چیر دیا جاتا، اور بند باندھ دیے جاتے اور تمباکو کا چلم گرم کر کے لگا دیا جاتا، اور زخم پر تمباکو باندھ دیا جاتا تو بچے کی جان بچ جاتی، مگر ایسا نہ ہوا اور اندھے باپ اور دیوانی ماں کے گھر میں اندھیرا ہو گیا، بچے نے جان دیدی۔

تو یاد رکھ کہ تقلید اور پیروی اچھی چیز ہے [illegible] کی ایک حد مقرر ہے اور جو نکلے

ہندستانی تقلید کرتے کرتے تباہی کے کنارے پر آ گئے ہیں اس واسطے قرآن کو حکم دے کر وہ تقلید چھوڑ دیں اور اپنے مذہب اور سیاست اور خانہ داری کے سب کام اپنی عقل اور سمجھ سے کریں، اور یا کسی ایک ذی علم اور دانشمند اور ہمدرد آدمی کو اپنا پیشوا بنا لیں تو جو نظام ہر ا کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہے، اس میں ایک بڑی تقلید پوشیدہ ہے، مگر وہ تقلید نقصان رساں نہیں ہے، بلکہ فایدے کی چیز ہے۔ اگر سب نظامی ایک حکم کے ماتحت جمع ہو جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور سیرت کی پیروی کرنے لگیں تو ان کی ہر تکلیف دور ہو جائے گی اور وہ نہایت کامیاب اور خوش حال زندگی بسر کرنے لگیں گے۔

کائنات کا روزنامچہ

آخر وائسرائے نے دخل دیا سری نگر کا تار اخباروں میں شایع ہوا ہے کہ مہاراجا صاحب کے پاس مسلمانان ہندستان کے سات ہزار تار آئے ہیں، جن میں کشمیری مسلمان رعایا کی مظلومیت کا ذکر کر کے مہاراجا کو التفات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، لیکن ایک تار ایسا ہے جس سے حکومت کشمیر کے ایوانوں میں زلزلہ پڑ گیا، اخباروں نے پورا تار شایع نہیں کیا۔ صرف چند الفاظ شایع کیے ہیں جو یہ ہیں۔

"مسلمانوں کے مطالبات سنو اور بدامنی کو روکو۔"

یہ بھی شایع ہوا ہے کہ اس تار کے بعض الفاظ ایسے تھے کہ مہاراجا نے اس کے صدمے سے دو وقت کھانا نہیں کھایا، اور خود کشمیری مسلمانوں کے ڈیپوٹیشن کو بلا کر ملاقات کی اور وائسرائے کو جواب دیا کہ حکم کی تعمیل کی جائے گی۔

کشمیر کا عقلمند لیڈر

حریف کہتے تھے کہ کشمیری مسلمان بہت ہی جاہل اور بے عقل اور صابر و شاکر ہیں۔ یہ ساری شورش باہر کے مسلمانوں کی ہے، مگر خواجہ سعد الدین شال نے جو کشمیری ڈیپوٹیشن کے صدر تھے۔ مہاراجہ سے ایسی گفتگو کی جو ایک بڑے مدبر اور مخلص لیڈر کے شایان تھی۔ خواجہ سعد الدین شال نے مہاراجہ کی خدمت میں مسلمانوں کا کوئی مطالبہ پیش نہیں کیا، بلکہ صرف یہ کہا کہ ہم آپ کے وفادار ہیں ہم پر آپ کی ریاست کے وزیر اور اہل کار ظلم کرتے ہیں، اور ہماری اصلی حالت آپ کے کان تک نہیں پہنچنے دیتے۔ مسٹر ویکفیلڈ سابق وزیر نے جو وعدہ جموں اور سری نگر میں ہم سے کیا تھا۔ وہ پورا نہیں ہوا اور اس کے بدلے آپ کے نام سے ایک اعلان شائع کر دیا گیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ کو ہماری اصلی حالت کی اطلاع نہیں ہے اور آپ ہم سے بہت ناراض ہیں کشمیری پنڈتوں اور ہندو اخباروں اور برہمن وزیر اور غیر مسلم سی آئی ڈی نے ہمارے خلاف ایکا کر لیا اور ہم کو آپ کی نظروں میں باغی بنا دیا، حالانکہ ہم آپ کے ویسے ہی وفادار ہیں جیسے پہلے تھے۔ موجودہ وزیر اعظم کے بھائی سر دیا کشن کول نے آپ کی ولی عہدی کے خلاف اپنی سب کوششیں خرچ کیں، مگر ہم سب مسلمان آپ کی ولی عہدی کی حمایت میں سینہ سپر رہے مگر خدا کی شان ہے کہ سر دیا کشن کول کے بھائی وزیر اعظم بنا دیے گئے، اور ہم مسلمان باغی قرار دیے گئے ہم نے آپ کی حکومت کا خیر مقدم کیا مسجدوں اور میدانوں میں جمع ہو کر آپ کے لیے دعائیں مانگیں۔ آپ کے شہزادے کی ولادت کی خوشیاں منائیں۔ سفر یورپ کی واپسی کے وقت آپ کا ایسا خیر مقدم کیا جس کی مثال کسی ریاست میں نہیں ملے گی، مگر اس کے عوض ہم کو ایسی زندگی [illegible]

زیادہ بدتر ہے، ہم پر گولیاں چلائی گئیں، اور ہم کو جیل خانے میں بند کر دیا گیا اور کوئی سختی باقی نہ رہی جو ہماری عورتوں اور بچوں کے ساتھ نہ کی گئی ہو۔

مہاراجہ نے کیا جواب دیا

اس عمدہ بیان کے بعد اخباروں نے یہ نہیں چھاپا کہ مہاراجہ نے کیا جواب دیا شاید کل تک خبر آ جائے۔

چالیس کا عدد

اللہ تعالیٰ کو اور اس کے مقبول بندوں کو بعض عدد بہت پسند ہیں جن میں سات اور ستر اور چالیس کا عدد بھی ہے۔

حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر چالیس دن اعتکاف کیا تب ان کو توریت کتاب ملی۔ ہمارے حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چالیس سال کی عمر میں پیغمبری ملی۔

صوفیائے کرام ترقی باطن و روحانیت کے لیے چلے کرتے ہیں تو وہ بھی چالیس دن کے ہوتے ہیں اور اسی لیے ان کو چلا کہتے ہیں۔ حیدرآباد دکن میں ایک ولی امیر اور ایک عالم امیر نواب عزیز جنگ صاحب مرحوم رہتے تھے ان کے سب لڑکے خدا کے فضل سے ولی صفت ہیں۔ ایک صاحبزادہ مولوی غازی الدین احمد ورنگل میں سشن جج ہیں، اور روزنامچہ بہت توجہ سے پڑھتے ہیں۔ آج انہوں نے چالیس خریداروں کا چندہ بھیجا ہے، اور اپنی طرف سے ایک پرچہ کی قیمت دو روپے کے بدلے پانچ روپے بھیجی ہے اور ایک دلچسپ خط بھی لکھا ہے۔ مجھے چالیس کے عدد کو دیکھ کر خیال آیا کہ اربعین کا اثر ان کے ہر کام میں معلوم ہوتا ہے۔ مولانا [illegible] کا خطاب شاید عرصہ کا ملتا نہیں ہے، [illegible]

روزنامچے میں شائع ہوا تا کہ سخن شناس کی تحسین سے میرا نفس موٹا ہو جائے جو کم کھانے اور روز مرا یرا اسیر کا خون آنے سے ذرا دبلا ہو گیا ہے۔

کاتب کی بھول ۲۴ اگست کے بدلے ستمبر

گزشتہ پرچہ روزنامچے کے سرورق پر ۲۴ اگست کے بدلے کاتب نے غلطی سے ۲۴ ستمبر لکھ دی اور مکتوب الیہ نے اس غلطی کو نہ دیکھا۔ کسی کی آنکھ نے غلطی کی، کسی کے قلم نے اور اب سرورق لوح کی غلطی سے خریداروں کے دماغ غلطی کریں گے۔

بت خاک کا روزنامچہ

دو بجے تک دفتر میں کام کر کے کھانا کھایا پھر کوثر اور زید کے ساتھ دلی گیا داعدی صاحب سے ملا۔ دلی کے اور سب کام کیے مغرب کے وقت گھر میں واپس آیا۔

آج انبیٹھ سے ایک پیرزادا صاحب ملنے آئے تھے جو سورہ مزمل کے عامل ہیں رام پور کے ایک صاحب بھی ساتھ تھے۔ مولانا عبد الرؤف صاحب بھی ملنے آئے تھے۔ کہتے تھے جب سے روزنامچے میں احادیث چھپنی شروع ہوئی ہیں اہل حدیث (غیر مقلد) بھی روزنامچے کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں نے ان کو تازہ روزنامچہ سنایا، اور انہوں نے روزنامچے کے بعض حصوں کو سن کر بہت رو دے لاحول پڑھی اور کہا کہ تصوف کی باتیں ہمارا سمجھ میں نہیں آتیں۔ سیدھا سیدی حدیث کی باتیں لکھا کیجئے۔ آج بارش نہیں ہوئی۔ آسمان صاف ہے۔

شباب للت

چاندنی کے آبشار

کڑکتی دھوپ میں چلتے ہوئے صحرا سی ویرانی
در و دیوار پر چھائی ہوئی ہے نا خموشی
شاید احساس ہو جیسے فضا کو کھو کھلے پن کا
مسلط گھر کے ہر گوشے پہ بیہوشی سی بیہوشی
اداسی کی کڑی دوپہر میں یہ اونگھتا آنگن
یہ بے زاری کی میلی چادریں اوڑھے ہوئے لمحے
کوئی دم میں ابھی بیدار ہوں گے یہ ذرا ٹھہرو
ابھی یہ گنگنا ئیں گے خوشی کے جادوئی نغمے
ابھی اسکول سے ننھے فرشتے لوٹتے ہوں گے
ابھی کلکاریاں بچوں کی گونجیں گی اس آنگن میں
ابھی اک سیل رنگ و نور سے بھر جائیں گے کمرے
سہانے عکس نا چیں گے مری ممتا کے درپن میں
بکھر جائے گا بچوں کی مدھر مسکان گھر بھر میں
رسیلے قہقہے ہر سو فضا میں تیر جائیں گے
سمٹ آئے گی ٹھنڈی چاندنی بچوں کی آنکھوں میں
بھُمہ ان چاندنی کے آبشاروں میں نہائیں گے

وزیر آغا

میر انیس اور صبح عاشور

انیس صدی کے خاتمے پر جو سیمینار منعقد ہوا تھا، اس میں پاکستانی نقادوں کو بھی دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ اور دعوت کے ساتھ ہی ان کو ویزا کی رسید بھی بھیج دی، لیکن وہاں کی حکومت نے ان کو شرکت کی اجازت نہیں دی۔ ان حضرات میں سے دو نے اپنے مقالے بھیج دیے۔ ان میں سے وزیر آغا کے مقالے کو شایع کیا جا رہا ہے صرف تمہید کو اور بیچ کے ایک پیرے کو جس میں اساطیر میں روشنی کی اہمیت بیان کی گئی ہے، حذف کر دیا گیا ہے۔ ایڈیٹر " سب ساتھ "۔

میر انیس کے یہاں صبح عاشور، صبح تخلیق کا پرتو لیے ہوئے برآمد ہو رہی ہے۔ صبح عاشور میں آفتاب کا طلوع ہونا ایک نئی دنیا کی بشارت ہے۔ ایک ایسی دنیا جو سابقہ دنیاؤں سے زیادہ افضل اور رفیع ہوگی، اور آدمیت کو ایک بلند تر سطح تفویض کر دے گی جس طرح عہد نامۂ قدیم کے مطابق تخلیق کائنات کے پہلے دن خدا نے روشنی کو تاریکی سے الگ کیا اور پھر روشنی کے فیوض و برکات کو ہر ذی روح تک پہنچایا بالکل اسی طرح صبح عاشور نے نور ایمان کو تمام نفوس تک پہنچانے کا اہتمام کیا، تاکہ ایک حیات نو کا آغاز ہو۔ اس اعتبار سے صبح عاشور کو تجدید حیات کا محرک سمجھنا چاہیے۔ یوں بھی روشنی اور تاریکی کی آمیزش کا فی قدیم ہے تاریکی گھنی متعفن اور بے نظم قرار پائی ہے اور یہ تمام چیزیں روح کی پرواز کو منقطع کرنے کا باعث ہیں۔

جب روشنی اس تاریکی سے متصادم ہوتی ہے تو در اصل گناہ، جہالت اور انجماد سے لڑتی ہے۔ اور ظلم، منافقت اور فریب کے خلاف نبرد آزما ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں رات کی بدی سے صبح کے دامن عافیت میں آنے کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

(تو کہہ کہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی۔ ہر چیز کی بدی سے جو اس نے بنائی اور بدی سے اندھیرے کی جب سمٹ آئے۔)

میر انیس نے تاریکی کے قلعے پر صبح عاشور کی یلغار کو شعری زبان میں یوں بیان کیا ہے:

پھاڑا جو گریباں شب آفت کی سحر نے
پردے میں چھپا یار رخ روشن کو قمر نے
پیمانۂ خورشید لگا زر سے بھرنے
گردوں سے سفر زیج کواکب لگی کرنے
تاباں جو رخ نیر افلاک ہوا تھا
ذروں سے سرافشاں ورق خاک ہوا تھا

خورشید نے جو رخ سے اٹھائی نقاب شب
در کھل گیا سحر کا ہوا بند باب شب
انجم کی فرد فرد سے لیکر حساب شب
دختر کشائے صبح نے الٹی نقاب شب
گردوں پہ رنگ چہرۂ مہتاب فق ہوا
سلطان غرب و شرق کا نظم و نسق ہوا

مہتاب کا رات کے خاص مزاج کا حامل ہونا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ خصوصاً جدید لعینات نے چاند سورج اور ستاروں کو اسرارِیت کی علامت قرار دیکر اس کی رات سے وابستگی کو نمایاں کیا ہے اور اس سلسلے میں قدیم اساطیری اور قبائلی تصورات کو ایک مستحکم بنیاد فراہم کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آفتاب اور مہتاب کی آمیزش در اصل روشنی اور تاریکی خیر و شر کے تصادم ہی کی ایک صورت ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ میر انیس نے جا بجا نجوم کو افواج کی صورت میں دیکھا ہے۔ گمان گذرتا ہے کہ یہ شعری زبان میں افواج یزید کا ہی ذکر ہے، جنہیں عاشور کے دن امام حسین کی آفتاب سیرت شخصیت نے اخلاقی سطح پر شکست فاش دیکر نور ایمان کی تجدید کر دی تھی۔ صبح عاشور کی ابتدا علی اکبر کی اذان سے ہوتی ہے۔ اس اذان کی فرمائش خود امام حسین کرتے ہیں۔ ع

فرمایا سحر قتل کی ظاہر ہوئی بیٹا
لو اٹھو کہ اذان دو کہ شب آخر ہوئی بیٹا

اور پھر جب علی اکبر نے صوت حسن سے اذان دی تو ؎

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محو تھا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منہ نکالے ہوئے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبر شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

علی اکبر کی اس اذان کے تین پہلوؤں کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ پہلا یہ کہ ہر چند جمعیت نفس چند پر مشتمل تھی۔ تاہم یہ سب ایک ہی آفتاب کی کرنیں تھیں۔ اور وہ آفتاب خود امام حسین تھے۔ بقول میر انیس ؎

سب کے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

گویا جب علی اکبر نے اذان کے [illegible] کی ابتدا کی تو ان کی آواز در اصل امام حسین کی آواز تھی۔ دوسرا یہ کہ علی اکبر کی آواز صور اسرافیل کی آواز تھی، جو حشر کے روز ایک مرتبہ مارنے کے لیے اور دوسری دفعہ جلانے کے لیے نکالی جائے گی۔ واقعۂ کربلا کی تمثیل میں یہ اذان وہ چمک دار تلوار ہے جو ایک تو رات اور اس سے وابستہ گناہ، ظلم اور تشدد کی روایت کا خاتمہ کرتی ہے اور دوسری طرف اپنی چمک دمک سے ایک نئی دنیا کے ظہور کا اہتمام کرتی ہے۔

یوں بھی اذان نہ صرف ایک نئی سحر کی نوید ہے، بلکہ خواب خرگوش میں مبتلا نفوس کو جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو میر انیس نے صبح عاشور میں جس اذان کا ذکر کیا ہے وہ تخلیق کائنات کی قدیم روایات سے بھی ایک حد تک ہم آہنگ ہے۔

میر انیس کے مراثی میں صبح عاشور کے متعدد پہلوؤں کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک پہلو تو رات اور اس کے کرداروں کی شکست و ریخت سے متعلق ہے، اور دوسرا شگفتن حیات کی ساری تمثیل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ میر انیس نے موخر الذکر پہلو کو چمن اور اس کے جملہ مظاہر کی زبان میں پیش کیا ہے، چنانچہ وہ پھولوں کے کھلنے، طیور کے چہچہانے، اس کے قطروں کے دمکنے اور باد نسیم کے چلنے کے ذکر سے ایک ایسی باقاعدہ صورت حال تک آکر سانس لیتی ہوئی فضا کو خلق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ویسے بھی چمن میں آمد بہار کا منظر زندگی کے نمو کے سارے عمل کو علامتی زبان میں پیش کرتا ہے، اور میر انیس نے اس سے صبح عاشور کے تخلیقی رخ کی عکاسی کے لیے پوری طرح کام کیا ہے ؎

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دم بدم
مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ نور صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار
کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں
تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں
نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں
ہر نخل پر ضیا سے سر کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارش باران نور تھی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینا سے لاجورد
تھی سبزہ و گیاہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد
یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

صبح عاشور کا یہ منظر نمو حیات کی تمثیل کے طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں زندگی کو اس کے متنوع مراحل اور مدارج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ نباتات حیوانات، انسان حتیٰ کہ بے جان اشیا تک زندگی کی ایک ہی بے کراں کروٹ میں ضم ہوکر دکھنے لگتے ہیں۔ میر انیس کے یہاں یہ زندگی ہوا کی طرح لطیف اور روشنی کی طرح تب و تاب جادو اثر کی حامل ہے، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ سیال روشنی ایک نورانی دھارے کی طرح آسمان سے اترتی ہے اور جس کسی سے بھی ٹکرائی ہے، وہ کھل کر جی اٹھا ہے، حتیٰ کہ ساری کائنات از سر نو خلق ہوگئی ہے۔ میر انیس نے صبح عاشور میں جس حیات نو کا جلوا دکھایا ہے وہ چمن کی جملہ علامات کے ساتھ وارد ہوئی ہے، جس سے یہ گمان ہوسکتا ہے کہ میر انیس نے جب صحرا کے بیان میں ایک سرسبز و شاداب خطۂ ارض کی تصویر پیش کی، جہاں طاؤس کا رقص بھی ہے اور پھولوں کی مہک بھی اور جہاں جھومتے ہوئے درخت بھی ہیں اور فرش خاک پر مخملیں سبزا بھی بچھا ہوا ہے تو ان سے ایک اتفاقی غلطی سرزد ہوئی، لیکن اگر اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ انہوں نے قطعاً غیر شعوری طور پر چمن اور اس کی علامات سے تخلیق نو کے عمل کو پیش کرنے کا اہتمام کیا تو ان کا یہ اقدام ایک بڑی حد تک فطری نظر آتا ہے۔ دراصل صبح عاشور کا یہ سارا منظر تمثیل کی زبان میں ایک ایسی نئی اور منور دنیا خلق ہونے کی نوید دے رہا ہے جو ہرا، پھول، مہک، چہکار اور جنت غرض یہ کہ ان تمام عناصر سے مرتب ہوگی، جو سورج کی اولین شعاع کے لمس سے جاگ اٹھتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ صبح عاشور تخلیق کائنات کے واقعہ کی باز آفرینی ہے اور یہی اس کا سب سے بڑا وصف ہے۔

روشنی اور اس کی حرارت (آگ) کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ہر شے کو پاک صاف کردیتی ہے۔ بعض مذاہب میں آگ کے ذریعے قدیم مردہ

جہان کے راکھ ہونے اور پھر اس سے ایک نئی دنیا کے طلوع ہونے کا ذکر ملتا ہے جو آگ کی اس صفت ہی کو اجاگر کرتا ہے۔ مثلاً بہمن یشت کے مطابق مقدس آگ نازل ہوگی جو شر کو فنا کردے گی پھر مسرت کا ایک سنہری دور آئے گا جس کے باعث ایک عالمگیر آگ پھیلے گی اور ساری کائنات جل کر راکھ ہو جائے گی اور تب اس سے ایک نئی دنیا پیدا ہوگی۔ ایک ایسی کائنات جس میں مسرت اور آزادی و امن و انصاف کا بول بالا ہوگا۔

میر انیس کی بیان کردہ صبح عاشور میں بھی روشنی (حرارت) ہی کے طفیل سے ہر شے پاک اور صاف ہوتی ہوئی نظر آتی ہے ؎

چمکا صفت شعلۂ جوّالہ مہر جہاں تاب
شبنم کی طرح سیم کواکب ہوئی بے آب
مائل بہ سپیدی ہوا رنگ رخ مہتاب
اور دیدۂ مردم سے سفر کرنے لگا خواب
طاقت نہ رہی شمع میں سوز جگری کی
پروانے سے رخصت تھی چراغ سحری کی

پھیلا جو نور مہر امامت دم زوال
ذروں سے وان کے آنکھ ملانا ہوا محال
سارے نہال فیض قدم سے ہوئے نہال
اختر بنے جو پھول تو شاخیں بنیں ہلال
پتے تمام آئینۂ نور ہو گئے
صحرا کے نخل سب شجر طور ہو گئے

پر آ ملک ہوا جو رخ قبلۂ امام
مشہد ہو گئی وہ زمیں عرش احتشام
اور سنگ ریزے درِ نجف بن گئے تمام
صحرا کو مل گیا شرف وادی السلام
کعبے اور نجف سے بھی عزت سوا ہوئی
خاک اس زمین پاک کی خاک شفا ہوئی

ان چند بندوں سے واقعہ کچھ یوں ترتیب پاتا ہے کہ مہر جہاں تاب صفت شعلہ نازل ہوا اور پھر تمام اطراف میں طور کا سا سماں پیدا ہوا۔ نتیجتاً نکلا کہ خشک اور بے آب و گیاہ صحرا ایک سرسبز شاداب [illegible] میں ڈھل گیا اور خاک کربلا خاک شفا میں تبدیل ہوگئی۔ تطہیر PURIFICATION کا سب سے ارفع مقام وہ ہے جہاں ہر شے متبرک ہو جاتی ہے اور صبح عاشور نے یہی کام انجام دیا ہے، مگر اس تطہیر کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے باعث ظلم، تشدد، گناہ اور غلاظت سے دنیا پاک ہوئی۔ تشدد اور ظلم کا سب سے بڑا علاج قربانی ہے۔ حضرت امام حسین نے ظلم کے خلاف جہاد کیا اور یہ جہاد قربانی کی عظیم قوت کی مدد سے بڑا کامیاب ثابت ہوا۔ یزید اور اس کی افواج اس ظلم اور بے راہ روی کی نمائندہ تھیں جس نے دنیائے اسلام، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انسانیت کو ضرور ایک بہت بڑے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ امام حسین نے اپنے خون کا عطیہ دے کر اسلام کو اس خطرے سے بچا لیا اور انسان میں اس ظلم کے خلاف ایک ایسی قوت مدافعت پیدا کر دی جو آج تک باقی ہے۔

میر انیس نے صبح عاشور کی علامتوں کے ذریعے اس قربانی کے جملہ مراحل کو بڑے فنکارانہ حسن کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

دوارکا داس شعلہ

غزل

اب میری ہستی ناکام میں کیا رکھا ہے
نام باقی ہے مگر نام میں کیا رکھا ہے
جس ہوا و ہوس خام پہ دم دیتے ہیں
اس ہوا و ہوس خام میں کیا رکھا ہے
جو تری یاد میں کٹتی ہو مگر تیرے بغیر
آخر اس صبح میں اس شام میں کیا رکھا ہے
گردش جام کی نسبت سے ہے اس کی وقعت
ورنہ اس گردش ایام میں کیا رکھا ہے
دیکھ پیری میں نہ رکھ جان کو اس درجہ عزیز
شعلہ اس درد تہ جام میں کیا رکھا ہے

ظ - انصاری

خسرو نامہ

وسط ایشیائی ترکوں کا ایک قبیلا لاچین جو افغانوں سے ربط ضبط رکھتا تھا، سمرقند کے نزدیک شہر کش KOSH سے جو دو سو برس بعد شہر سبز کہلایا، چنگیز خانی خونخوار حملوں میں بے وطن ہوا اور بلخ میں آ بسا جو اس وقت تک زبردست قلعا بند اور تہذیبی مرکز شمار ہوتا تھا۔ ۱۲۲۰ء میں ایک زبردست منگول فوج خود چنگیز خان کی سالاری میں سمرقند اور بخارا کو تباہ اور مسمار کر کے بلخ کی طرف بڑھی اور اگلے سال ۱۲۰۰ مسجدوں اور ۲۰۰ حماموں کے اس شہر میں بھی کوئی چراغ جلانے والا نہ رہا۔ امیر سیف الدین محمود اپنے قبیلے کی ایک ہزارہ کا شاخ کے پناہ گزیں سردار حملے کے وقت یا حملے سے پہلے بلخ چھوڑ کر ہندستان کی طرف روانا ہو گئے۔ پنجاب اور دریائے سندھ کی وادی اس وقت چنگیزی خونخواری سے سہمی ہوئی تھی۔ دلی کے ہوشیار، موقع شناس سلطان شمس الدین نے، خوارزم شاہی ترک سپاہ سالار جلال الدین کو صرف یہ کہ مدد دینے سے انکار کر دیا، بلکہ حیلے حوالے اور فوجی تدبیر سے پنجاب میں اس کی سرگرمیاں توڑ دیں اور یوں بڑی حد تک علاقے کو خوفناک جنگی میدان بننے سے بچا لیا اور اپنے یہاں ادھر کے اجڑے ہوئے پست حال پناہ گزینوں کو ملازمت یا پناہ دینے کی راہ بھی ہموار کر لی۔ سیف الدین محمود انہی میں سے ایک تھے۔ چند سال معمولی خدمتوں پر رہنے کے بعد انہیں دلی سے ایٹا جانے والی شاہراہ پر گنگا کنارے پٹیالی قصبے (مومن آباد) میں چھوٹی سی جاگیر دے دی گئی۔ غالباً افغانوں سے دوری قائم رکھنے کو مد نظر رکھا گیا، یا پھر اس شورا پشت علاقے میں جہاں افغانوں کی تین گڑھیاں تھیں، ترک حکومت نے اپنا وفادار نگہبان بٹھا دیا ہو۔

سیف الدین محمود کی شادی ایک حیثیت دار ہندستانی امیر عماد الملک کی بیٹی دولت ناز سے ہوئی جو شوہر کی زندگی میں اور اس کے بعد بھی پٹیالی میں رہی۔ چار بچے ہوئے، تین لڑکے ایک لڑکی۔ یمین الدین محمود ان میں منجھلے تھے، ۶۵۲ھ (۱۲۵۳ء) میں پیدا ہوئے اور اپنے تخلص اور امیرانہ لیاقت کے جوہر کی بدولت امیر خسرو کہلائے۔

پس منظر کی یہ ہلکی سی تفصیل اس لیے ضروری ہوگئی ہے کہ بعض لوگ انہیں "بلخی" معروف بدلخی کہتے ہیں، بعض ان کے والد "شمسی غلام" مانتے ہیں امیر خسرو کے اپنے بیانات اور معاصر تاریخیں اور تذکرے اسکی تائید نہیں کرتے۔

یمین الدین نے سات برس کی عمر تک باپ کو دیکھا وہ بھی وقفوں سے کیونکہ وہ جنگی مہموں پر باہر جاتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی نانا نشین امیرزادی ماں کو ماحول کو نانا کو دیکھا، جانا، انہی سے باپ کے قصے سنے ہونگے کہ وہ کیسے ہیں۔

گویائی جو انسان کی بہترین صفت ہے انہیں غیب سے جی بھر کے ملی تھی، مگر خاموشی پسند آدمی تھے۔ ترک صرف سوتے میں فرشتا ہوتے مگر میرے باپ جاگتے بھی فرشتا تھے، ایسے نیک چلن تھے کہ کان آنکھوں والی حور کو نظر اٹھا کر نہ دیکھتے۔

اس سے کہیں زیادہ تفصیل نانا کے بیان میں ملتی ہے جو ایک سو تیرا برس کے ہوکر فوت ہوئے جب خسرو ۲۰ سال کے تھے۔ نانا عمادالملک کے بارے میں بتاتے ہیں کہ سلطنت کے چار ستونوں میں سے ایک تھے۔ نشتر سال عارض ملک (سکریٹری جنگ بخشی گری) رہے۔ دو سو ترک غلام، دو ہزار ہندو (پیدل) اور دو ہزار سواران کے جھنڈے تلے رہتے تھے۔ عماد کھانوں کے بڑے شوقین ہونگے، کیونکہ ہر ... دسترخوان پیش کیے جاتے تھے، اور چالیس ... آدمی صرف پاندان پر ملازم تھے۔ ... آدمی تھے۔

... بیانات سے یہ کھلتا ہے کہ عمادالملک ... اور قابل اعتماد امیروں میں سے ... یہ بھی کہ وہ ایک نو مسلم ... ہندستانی نژاد ہوں گے، ... مرتبے کا نایاب ذہن ... ہونگے

اور ستر سال میں غوریوں سے دور بلبن کے زمانے ۱۲۷۲ء تک پانچ بادشاہوں کا عروج و زوال نہ صرف دیکھ چکے تھے، بلکہ خود اونچے عہدے پر قائم رہے تھے۔

خسرو بالآخر انہی کے نواسے نکلے۔ ننھیال میں پلے تھے، ننھیال سے عشق تھا، اسی کے تربیت یافتہ اور طرفدار ثابت ہوئے۔ جس علاقے میں رہے وہ برج (یا برج) بھاشا کے لیے مسند کا درجہ رکھتا ہے کرشن بھگتی ہونے کے باعث برج کے گیت اور بھجن اپنی مٹھاس، وسعت، نفاست میں امتیاز اعتبار کر چکے تھے۔ نانا کا قیام دلی میں تھا، بڑی حویلی تھی باہر خدمتگاروں کے اور رشتے داروں کے مکانات باپ کے انتقال کے بعد خسرو اکثر دلی آئے گئے ان کی کتبی تعلیم بھی یہیں ہوئی، اچھی صحبت بھی یہیں میسر آئی۔ طبیعت میں بچپن سے کھلنڈرا پن تھا، دودھ کے دانت گرتے وقت منہ سے موتی جھڑتے تھے یا بھری محفل میں شعر سناتے سے نہیں ہچکچاتے تھے، کتاب کے بجائے چوری چوری حسینوں کے مکھڑے تکا کرتے اور پھبتیاں کسا کرتے۔

ظاہر ہے کہ ان عادات کا بچا گلیوں میں، نوکروں اور ہمسایوں میں گھومتا، دھوم مچاتا پھرے گا اور یہ تھا دلی ہر لی شہری کھڑی بولی کا علاقہ جسے وہ ہریانوی، ہندوی یا دہلوی کہتے ہیں۔ اس کی آوازوں میں ایسا کھردرا پن، بلکہ سپاہیانہ کھردرا پن تھا جو برج بھاشا (بھاکا) کی نرم آوازوں کی تکمیل کرتا ہے۔ ۱۲۷۲ء تک انہوں نے آزادی اور بے فکری کے دن گزارے، شعر کہے سنائے، داد پائی اور ذی علم عزیز دوستوں (مشفق) کے کہنے پر ایک دیوان "تحفۃ الصغر" کے نام سے تیار کر دیا۔ جب وہ اپنی عمر کے ۲۰ ویں سال آزادانہ تلاش معاش کے لیے نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک اچھا خاصا دیوان ان کے ساتھ تھا۔ جیو تیتے ہی سلطان کے بھتیجے علاء الدین کیشلو خان نے اپنے دربار کی زینت بنایا۔ کول (علی گڑھ) اس کی جاگیر میں تھا۔

ہاں بھی اس کے ہمرکاب جاتے ہونگے۔ شروع سے ہی اس کی نظروں میں چڑھے اور اس کا جشنوں سے فیضیاب ہوتے رہے۔ شام کو شراب و رباب، رقص و سرود کی محفلیں جمتیں اور خسرو ان میں اپنے کلام اور اپنے جام زر سمیت شریک ہوتے۔ محفل ان کے دم سے رونق پاتی اور وہ محفل کی خاطر نہ صرف غنائی شعر لکھتے، بلکہ اس کی غنائی ادائیگی کی تیاری بھی کراتے۔ سنگیت کی چاٹ انہیں پڑ چکی تھی۔

وہ ملک علاءالدین کشلی (کیشو، کشلو) ان کے ہاں شاعر خاص بن کر دو سال رہے۔ یہ وہ نوجوان تھا جس کے باپ اور چچا (بلبن) غلام کی حیثیت سے دلی میں داخل ہوئے تھے، اور اب منگولوں کی غلامی سے بچنے کے لیے مسلم ملکوں کے امرا، وزرا اور شاہی خاندانوں کے وارث سینکڑوں کی تعداد میں ان کا دامن تھامے پڑے تھے۔ چنگیز کے خزانے پنجاب، سندھ اور کشمیر کی راہ سے دلی اور نواح دلی میں پہنچ چکے تھے۔ بلبن نے تخت حکومت پر آنے سے پہلے ہی اپنے نیک نفس آقا ناصر الدین محمود کے اختیارات کی باگ ڈور سنبھال لی تھی اور اس کے جاہ و جلال کا یہ شہرہ تھا کہ خود ہلاکو (ہلاکو) نے اپنے سفیر بھیجے تو وہ دلی دربار کی شان اور قوت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایک زمانے سے چنگیز کے جو سلاسند بیٹوں پوتوں میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی دلی کی طرف بڑھنے کی۔

ایک طرف خزانوں کا ادھر ڈھلاؤ، دوسری طرف سرحدوں کی طرف سے اور ناگہانی انقلاب حکومت کے خطرات کا احساس، پھر یہ کہ بڑی بڑی جاگیروں کی آمدنی۔ اور ان سب پر طرّہ تھا دولت اور سیاسی قوت کی نئی نئی آمد۔ امیروں کے درمیان اندھا دھند خرچ اور سخاوت میں مقابلہ رہتا تھا۔ یہ شاعر شمس معین نے شاہی دربار میں اسی علاءالدین کشلو خان بیٹی کے وقت سلطانی سطربلا زبانی ایک نظم و غزل پیش کرائی تو ملک علاءالدین نے خوش ہو کر اپنی پائیگاہ (جاگیر خاص) کے تمام گھوڑے شاعر کو بخش دیے اور گانے والوں کو دس ہزار روپے کی رقم اوپر سے دی۔

خراسان و ہندستان میں اس کا نام اتنا مشہور خاص و عام ہو چکا تھا کہ بادشاہ اپنے گورنر بھتیجے سے جلنے لگا۔ امیر خسرو کو اپنا یہ پہلا ممدوح اتنا پسند تھا کہ وہ دوستوں سے کہا کرتے تھے۔

ملک علاءالدین محمد کشلی خان جیسا سخی، اندھا دھند لٹانے والا، نڈر، باز شکاری اور پولو کھیلنے کا ماہر، کوئی ماں کا لال ہو نہیں سکتا۔

بلبن کے مزاج میں درشتی تھی۔ وہ دراصل شاعروں، اور گویوں کو منہ نہیں لگاتا تھا، لیکن اس کے منجھلے بیٹے بھتیجے، گورنر اور امرا اپنی اپنی ڈیوڑھیوں اور حویلیوں میں عیش و عشرت کے تمام سامان رکھتے تھے اور فکر فردا سے بے نیاز دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتے تھے۔

دوسرا سخی جس نے اپنی بے نیازانہ طبیعت اور عالی ظرفی میں نام پایا خود بادشاہ کا بڑا بیٹا بغرا خان تھا، وہ اسی چچا زاد بھائی کے مکان پر اپنے خاص شاعروں اور علماء (شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر) کو ساتھ لیے ہوئے مہمان تھا۔ محفل جمی، سب نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ خسرو اپنے کلام اور ادائیگی دونوں سے چھا گئے اور ان پر اشرفیاں بھی برسیں، اور بغرا خان نے اٹھنے سے پہلے انہیں طشت بھر "نقرئی خام" بھی دیا۔ خسرو کی چاندی ہو گئی، لیکن کشلی خان کے چہرے کا رنگ بدل گیا، اور بہتاد ایسا بدلا کر

خواست کہ مرا نشانۂ بلا سازد۔ خیال آں ہم در دلم بگذشت۔ چوں تیر جستم و حیلہ کردم و بر عزم خدمت ملوک سامانی راہ سامانہ پیش گرفتم۔

کشلی خان کے غصے کا تیر چلنے سے پہلے ہی وہ تیر کی طرح نکلے اور سیدھے بغرا خان کے پاس سامانہ پہنچ گئے۔

سامانہ، پٹیالہ کے نزدیک پنجاب اور کشمیر کے رستے میں دلی سلطنت کی بڑی چھاؤنی تھی، وہاں مضبوط اور قابل اعتماد گورنر رکھا جاتا تھا کہ ہر دو بار منگول فوج حملہ آور سامانے کا قلعہ گرا کر دلی کی طرف بڑھے اور سامانے کی فوج نے ان کا سیلاب لاحق کیا۔

ناصر الدین بغرا خان نے انہیں اپنا ندیم بنایا مزے سے یہیں گزرتے تھے۔ یہیں انہوں نے پنجابی زبان سیکھی ہو گی، اور اس کے لوک گیتوں کا لے جو ہندستان اور خراسان دونوں کے سنگیت سے الگ اپنا بانکپن رکھتی ہے۔

ان کے مراتب بلند ہوتے جا رہے تھے کہ ناگاہ بنگال میں وہاں کے حبشی گورنر طغرل نے بغاوت کردی۔ لذیب کے [illegible] اور غزا نے لوٹ کر تمام علاقے پر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بڑی فوج جمع کر لی اور دلی کے کارندوں کو بلا لیا۔ اس نے بغاوت کا وقت بھی اپنے پیش رو باغیوں کو دیکھ کر چنا ہوگا کیونکہ بارش کا موسم سامنے تھا، دریاؤں میں طغیانی اور بنگال تک باہر کی فوج پہنچنے کے رستے بند۔

بغرا خان کو حکم ہوا کہ پنجاب کی فوج لے کر بنگال کی طرف بڑھے۔ نہ یہ تاریخ ہند کا پہلا واقعہ تھا، نہ آخری کہ مرکز سے فوج بنگال پہنچی۔ رستوں کو صاف کرتے پہنچتے پہنچتے سال بھر لگ گیا۔

سنہ ۱۲۸۱ء میں لکھنوتی، جو بنگال کے گورنر کا صدر مقام تھا، دلی اور پنجاب کی فوج کی ٹکڑیوں سے مسخر ہو گیا۔ معاصر ادب اور تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ لکھنوتی (موجودہ مرشد آباد) میں سر بازار پھانسیاں اور ٹکٹکیاں لگائی گئیں۔ جتنے [illegible] اور لوگ ملے کہیں بیل اور گدھے کی کھال میں [illegible] اور اتنی دہشت پھیلائی گئی کہ خود [illegible] بغرا خان تھرا گیا۔ اسے گورنر مقرر کر کے [illegible] بے رحمی" برتنے کی نصیحتیں کر کے [illegible] جب واپس ہونے لگا تو خسرو [illegible] تھے۔ قتل و غارت گری کا

یہ منظر اور پھر بنگال کی مرطوب آب و ہوا۔ جی نہ لگا۔ بغرا خان نے روک لیا۔ پھر بھی وہ چھ مہینے کے اندر اندر ماں اور عزیزوں سے ملنے کا عذر کر کے دلی چلے آئے۔

تیسرا اپنے دور کا سب سے فیاض ملک امیر علی سر جاندار جو حاتم خان کے نام سے مشہور ہوا، خسرو کا منتظر تھا، لیکن شاعر نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد قاآن ملک، [illegible] نظر میں ہے، اقبال مند بھی۔ سپاہ سالار بھی ہے اور ولی عہد بھی۔ سنہ ۱۲۸۰ء میں وہ ملتان سے دلی آیا تو امیر پٹیالی سے دلی پہنچے۔ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئے، کلام سنایا، شہزادے نے انہیں اور ان کے دوست امیر حسن سنجری کو چن لیا۔ ملتان پہنچ کر ان کی وہ قدر دانی ہوئی جو اندازے سے بڑھ کر تھی۔

ملتان، پنجاب اور سندھ دونوں کے لیے سرگرمی فوجی مقام، علما، صوفیا، شعرا اور عراق و عرب کے موسیقاروں کا گڑھ تھا۔ شہزادہ ذی علم بھی تھا، بہادر بھی، شاعری اور موسیقی دونوں کا رسیا۔ میدان جنگ اور محفل رنگ و آہنگ دونوں میں بے مثل شخصیت کے جوان سلطان محمد کا دربار دلی کے ان دونوں شعرا کے لیے اہم تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر نے اپنا دوسرا دیوان "وسط الحیاۃ" ترتیب دیا، یہیں قول (حدیث) کے عربی لحن کو ہندستانی موسیقی سے جوڑا، جو آگے چل کر قوالی (قلبانا) کہلایا، یہیں عربی اور ترکی سازوں کو پنجاب کے لوک گیتوں کے لیے استعمال کیا، یہیں انہوں نے بیک وقت عربی اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کی اور [illegible] قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے۔ یہیں پہلی انہیں ایک لائق ممدوح ملا تھا جس نے ملک سے وابستگی نے ہی سرحدی علاقوں کو منگولوں سے اور اپنے ماحول کو خشک ملاؤں اور [illegible] سے پاک کر دیا۔ بمشکل ساڑھے چار سال گزرے ہوں گے کہ ایران کے حاکم ارغون [illegible]

جن ہو لاگو (ہلاکو) خان نے ہندستانی سپاہ سے اپنے مقتولوں کا انتقام لینے کے لیے چنگیزی امیر تیمور خان کو ۲۰ ہزار (بقول بعضے ۳۰ ہزار) کا لشکر جرار دے کر لاہور اور دیبالپور کے رستے ملتان پر بھیجا۔ سلطان محمد کو غنیم کے حملے کی اطلاع دیر سے ملی تھی، پوری تیاری کیے بغیر اس نے دریائے راوی پار کیا، اور جان ہتیلی پر رکھ کر دشمن کو پسپا کر دیا۔ امیر خسرو میدان جنگ میں تلوار چلاتے ہوئے منگول سوار کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ امیر کہتے ہیں کہ فتح قریب تھی کہ ہار ہو گئی۔ دوسرے مورخین بتاتے ہیں کہ ہندستانی فوج (جس میں سرحد کے پٹھان شامل تھے) دشمن کا پیچھا کرنے میں بکھر گئی اور شہزادہ اور مغرب کی نماز شکرانہ میں لگ گیا کہ اتنے میں کمین گاہ سے حملہ ہوا اور منگول کے تیر نے اسے ہلاک کر دیا اس کا ہلاک ہونا تھا کہ ملتان فتح ہو گیا اور ہر طرف بربادی پھیل گئی۔

منگول سوار امیر کو قیدی بنا کر لے چلا۔ یوں تو منگول لشکر سردیوں میں حملہ آور ہوتے تھے، اس بار گرمی کا موسم تھا، اور سال ۱۲۸۵ء دوسرے دن وہ انہیں رسی میں کھینچتا، دوڑتا ہوا لے چلا پیاس کے مارے منگول نے دریا کنارے گھوڑا اٹھا سوار اور سواری دونوں نے ڈٹ کر خوب پانی پیا

ہم ز ہمیر لب شدہ، ہم مرکبش سبز
تشنہ دید لوحِ جان بر ددہ رادہ

دونوں تو وہیں ڈھیر ہو گئے اور امیر موقع پر جھٹکا مار کر، رسی کی گانٹھ کھول کر کنارے کنارے جنگل کی راہ سے دلی کی طرف بھاگ نکلے۔

اس معرکے کا نہایت دردناک مرثیہ انہوں نے دلی پہنچتے لکھ لیا اور آتے ہی عمر رسیدہ بلبن کو سنایا، دربار نے سنا، نو جیوں نے اسے دہرایا، مہینے بھر تک گھر گھر اور دربار میں دہرایا گیا اور پایا مجلس ماتم بپا ہوتی رہی، [illegible] کا [illegible]

بلبن اس غم سے جانبر نہ ہو سکا اور سلطان محمد (شہید) کے بیٹے کی تخت نشینی کی وصیت کر کے سال بھر کے اندر ہی ۱۲۸۶ء میں دنیا سے اٹھ گیا۔

خسرو کچھ دن ماں اور عزیزوں کے ساتھ پٹیالی میں رہے۔ دلی کے درباری حالات پریشان کن نظر رہی امرا نے سازش کر کے بغرا خان کے بڑے بیٹے معز الدین کیقباد کو تخت پر بٹھایا۔ اس کے کینہ پرور اور سازشی مشیر کا ملک نظام الدین سے خسرو کا دل نہیں ملتا تھا۔ اس سے کترا تے رہے اور بالآخر اپنے وقت کے تیسرے ملک بخش قدر دانِ علم و ادب امیر علی سر جاندار حاتم خان کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔

باپ، بغرا خان جب سنا کہ نوجوان بیٹے نے تخت پر بیٹھتے ہی دادا کے سارے طور طریق ڈسپلن، سخت گیری کو الٹ دیا، اور نیک چلنی اور بیدار مغزی کا رستا چھوڑ دیا ہے تو بڑی فوج لے کر آگے بڑھا، ادھر سے دلی کی شاہی فوج چلی۔ اجودھیا میں دریائے گھاگرا اور سرجو کے سنگم پر آمنا سامنا ہوا اور وزیر نظام الملک کی تمام ریشہ دوانیوں کے باوجود باپ بیٹے میں صلح صفائی ہو گئی۔ بغرا خان نے اپنے صاحب تاج و تخت بیٹے کو عین وہی نصیحتیں کیں جو صرف ۲ سال پہلے زبان دراز ہو کر باپ نے اسے اڑیسا اور بنگال کا انتظام سونپتے وقت کی تھیں۔

حاتم خان اس علاقے کا گورنر تھا، نوجوان بادشاہ کی واپسی پر وہیں اودھ (اجودھیا، فیض آباد) میں رہ گیا، خسرو بھی رہ گئے۔

اسی حاتم خان نے دادو دہش کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ قران نیا [illegible] سا جیسی یادگار اور خطاب مشہور یوں کے علاوہ جو کلام اس کی مدح میں ہے [illegible] [illegible] [illegible]

سامانا، چھانگا کے نزدیک پنجاب اور کشمیر کے رستے میں دلی سلطنت کی بڑی چھاؤنی تھی، وہاں مضبوط اور قابل اعتماد گورنر رکھا جاتا تھا کم سے کم دو بار منگول فوج حملہ آور سامانے کا قلعہ گرا کر دلی کی طرف بڑھے، اور سامانے کی فوج نے ان کا سپاہیانہ لاحق کالی۔

ناصر الدین بغرا خان نے انہیں اپنا ندیم بنایا، زمانے میں گذرے گے۔ یہیں انہوں نے پنجابی زبان سیکھی ہوگی، اور اس کے ترکی گیتوں کی لے جو ہندستانی اور خراسانی دونوں کے سنگیت سے الگ اپنا بانکپن رکھتی ہے۔

ان کے مراتب بلند ہوتے جا رہے تھے کہ ناگاہ بنگال میں وہاں کے باغی گورنر طغرل نے بغاوت کردی۔ لاڑلے کے ہاتھ اور غزا نے لوٹ کر تمام علاقے میں اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ بڑی فوج بھیج کر اور دلی کے کارندوں کو بلا لیا۔ اس نے بغاوت کا وقت ہی اپنے پیش رو باغیوں کو دیکھ کر چنا تھا کیونکہ بارش کا موسم سامنے تھا، جو بہاروں میں طغیانی اور بنگال تک باہر کی فوج پہنچنے سے رکتے تھے۔

بغرا خان کو حکم ہوا کہ پنجاب کی فوج لے کر بنگال کی طرف بڑھے۔ یہ تاریخ ہند کا پہلا واقعہ تھا، کہ آخری کو مرکز سے فوج بنگال پہنچی۔ رستوں کو صاف کرکے پہنچتے پہنچتے سال بھر لگ گیا۔

۱۲۸۵ء میں لکھنوتی، جو بنگال کے گورنر کا صدر مقام تھا، دلی اور پنجاب کی فوج کی ٹولیوں سے مسخر ہو گیا۔ سامراد ... تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ [illegible] (موجودہ مرشد آباد) میں سر [illegible] پھانسیاں اور ٹکٹکیاں لگائی گئیں۔ [illegible] حملہ کر [illegible] بیل اور گدھے کی کھال میں [illegible] اور اتنی دہشت پھیلائی گئی کہ خود [illegible] بغرا خان تھرا گیا۔ اسے گورنر مقرر [illegible] "برتنے" کی نصیحتیں کرکے [illegible] واپس ہونے لگا تو خسرو [illegible] ۔ [illegible]

یہ منظر اور پھر بنگال کی مرطوب آب و ہوا۔ چھ دن تک بغرا خان نے روک لیا۔ پھر بھی وہ چھ مہینے کے اندر اندر ماں اور عزیزوں سے ملنے کا عذر کرکے دلی چلے آئے۔

تیسرا اپنے دور کا سب سے فیاض ملک امیر علی سرجاندار جو حاتم خان کے نام سے مشہور ہوا، خسرو کا منتظر تھا، لیکن شاعر نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد تھا آن ملک، جس کی تقدیر ہی میں اقبال مندی۔ سپہ سالار بھی ہے اور ولی عہد بھی۔ سنہ ۱۲۸۰ء میں وہ ملتان سے دلی آیا تو امیر پٹیالی سے دلی پہنچے۔ شہزادے کی خدمت میں حاضر ہوئے، کلام سنایا، شہزادے نے انہیں اور ان کے دوست امیر حسن سنجری کو چن لیا۔ ملتان پہنچ کر ان کی وہ قدر دانی ہوئی جو اندازے سے بڑھ کر تھی۔

ملتان، پنجاب اور سندھ دونوں کے لیے سرگرمی فوجی مقام، علما، صوفیا، شعرا اور عراق و عرب کے موسیقاروں کا گڑھ تھا۔ شہزادہ ذی علم بھی تھا، بہادر بھی، شاعری اور موسیقی دونوں کا رسیا۔ میدان جنگ اور محفل رنگ و آہنگ دونوں میں بے مثل شخصیت کے جوان سلطان محمد کا دربار دلی کے ان دونوں شعرا کے لیے اہم تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر نے اپنا دوسرا دیوان "وسط الحیواۃ" ترتیب دیا، یہیں قول (حدیث) کے عربی لحن کو ہندستانی موسیقی سے جوڑا، جو آگے چل کر قول (قلبانہ) کہلایا یہیں عربی اور ترکی سازوں کو پنجاب کے لوک گیتوں کے لیے استعمال کیا، یہیں انہوں نے ایک وقت عربی اور فقہ کی تحصیل و تکمیل کی اور [illegible] قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے۔ پہلے پہل انہیں ایک لائق ممدوح ملا تھا جس نے دلی سے واپس آتے ہی سرحدی علاقوں کو منگولوں سے اور اپنے ماحول کو خوشامدیوں اور مجبوروں سے پاک کر دیا۔ بمشکل ساڑھے چار سال گزرے [illegible]

جن ہو لاگو (ہلاکو) خان نے ہندستانی سپاہ سے اپنے مقتولوں کا انتقام لینے کے لیے چنگیزی امیر تیمور خان کو ۲۰ ہزار (بقول بعضے ۳۰ ہزار) کا لشکر جرار دے کر لاہور اور دیپال پور کے رستے ملتان پر بھیجا۔ سلطان محمد کو غنیم کے حملے کی اطلاع دیر سے ملی تھی، پوری تیاری کیے بغیر اس نے دریائے راوی پار کیا، اور جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن کو پسپا کر دیا۔ امیر خسرو میدان جنگ میں تلوار چلاتے ہوئے منگول سوار کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ امیر کہتے ہیں کہ فتح قریب تھی کہ ہوا پلٹ گئی۔ دوسرے مورخین بتاتے ہیں کہ ہندستانی فوج (جس میں سرحد کے پٹھان شامل تھے) دشمن کا پیچھا کرنے میں بکھر گئے، بعد شہزادہ مغرب کی نماز پڑھانے میں لگ گیا کہ اتنے میں کمین گاہ سے حملہ ہوا اور منگول کے تیر نے اسے ہلاک کر دیا۔ اس کا ہلاک ہونا تھا کہ ملتان فتح ہو گیا اور ہر طرف بربادی پھیل گئی۔

منگول سوار امیر کو قیدی بنا کر لے چلا۔ یوں تو منگول لشکر سردیوں میں حملہ آور ہوتے تھے، اس بار گرمی کا موسم تھا، اور سال ۱۲۸۵ء دوپہر کے دن وہ انہیں رسی میں کھینچتا، دوڑتا ہوا لے چلا پیاس کے مارے منگول نے دریا کنارے گھوڑا تھاما سوار اور سواری دونوں نے ڈٹ کر پانی پیا۔

ہم او سیراب شد، ہم مرکبش سبز
تشنہ ماند اوّل جان بہر دو را دیر

دو مدتوں تو وہیں ڈھیر ہوئے، بعد امیر مرحوم پر جھپٹا مار کر، رسی کی گانٹھ کھول کر کنارے کنارے جنگل کی راہ سے دلی کی طرف بھاگ نکلے۔

اس بربادی کا نہایت دردناک مرثیہ انہوں نے دلی پہنچتے پہنچتے لکھ لیا اور آتے ہی بغرا دا بلبن کو سنایا (وہ بادشاہ کے ...)، تو جیوں نے ... اٹھ گیا، بیٹے بھر تک کیپ اور دربار میں ... اور ... حاتم ... رہی، ... کا ... [illegible]

بلبن اس غم سے جانبر نہ ہو سکا اور سلطان محمد (شہید) کے بیٹے کی تخت نشینی کی وصیت کر کے سال بھر کے اندر ہی ۱۲۸۶ء میں دنیا سے اٹھ گیا۔

خسرو کچھ دن ماں اور عزیزوں کے ساتھ پٹیالی میں رہے۔ دلی کے درباری حالات پریشان کن تھے، امرا نے سازش کر کے بغرا خان کے بڑے بیٹے معزالدین کیقباد کو تخت پر بٹھایا۔ اس نے کینہ پرور اور سازشی مشیر کار ملک نظام الدین سے خسرو کا دل نہیں ملتا تھا۔ اس سے کتراتے رہے اور بالآخر اپنے وقت کے تیسرے ملک بخش قدردانِ علم و ادب امیر علی سرجاندار حاتم خان کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔

باپ، بغرا خان جب سنا کہ نوجوان بیٹے نے تخت پر بیٹھتے ہی دادا کے سارے طور طریق ڈسپلن، سخت گیری کو الٹ دیا، اور نیک چلنی اور بیدار مغزی کا رستا چھوڑ دیا ہے تو بڑی فوج لے کر آگے بڑھا، ادھر سے دہلی کی شاہی فوج چلی۔ اجودھیا میں دریائے گھاگرا اور سرجو کے سنگم پر آمنا سامنا ہوا اور وزیر نظام الملک کی تمام ریشہ دوانیوں کے باوجود باپ بیٹے میں صلح صفائی ہو گئی۔ بغرا خان نے اپنے صاحب تاج و تخت بیٹے کو جو نصیحتیں کیں جو عرصے سال پہلے زمان روا ہے، باپ نے اسے از بیا اور تکیال کا انتظام ملو بیٹے وقت کی تھیں۔

حاتم خان اس علاقے کا گورنر تھا، نوجوان بادشاہ کی واپسی پر وہیں اودھ (اجودھیا، فیض آباد) میں رہ گیا، خسرو بھی رہ گئے۔

اسی حاتم خان نے داد و دہش کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ جو فراق تھا ... جیسی یادگار اور خطا یا مثنویوں کے علاوہ جو کلام اس کی مدح میں ہے ... [illegible]

آخری وقت تک پوری پڑتی، گو وہ ملک الشعرا نہ سہی، حاتم الشعرا ضرور تھے۔

دو سال اودھ میں رہے۔ برج بھاشا کے بعد اودھی بول چال کا یہ علاقہ رام بھکتی کی سرزمین اپنی لوچ دار تہذیب، خوش حالی اور نزاکت و نفاست کی بدولت انہیں پسند تو آیا، مگر وہ زیادہ دیر تک دلی سے زیادہ دور نہیں رہنا چاہتے تھے۔ مشہور کیا جاتا ہے کہ والدہ کی جدائی ستا رہی تھی، یہ بھی ہو گا، لیکن ایک سبب اور بھی تھا۔ نوجوان اور شوقین بادشاہ کی من موجی طبیعت، آزاد روی، عطا کا جذبہ اور اس کے دربار کا ملک الشعرا سے خالی رہنا۔

حاتم خان نے اودھ سے دلی، ایک مہینے کے سفر کا خرچ اشرفی بھر سے دو تھال دیے، اور رخصت کیا: یہاں پہنچے ابھی دو دن گزرے تھے کہ بادشاہ نے بلا بھیجا اور فرمائش کی کہ باپ بیٹے کی ملاقات، جو خونریز جنگ کی بجائے شفقت اور محبت میں بدل گئی تھی، ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کے وہ خود عینی گواہ ہیں۔ صلے میں اتنا "زر" دینے کو تیار ہوں کہ عمر بھر کوئی احتیاج نہ رہے۔

"مہرند" (شاہی اشرفی) اور "خلعت شاہی" سے بات اس پروجیکٹ کی مہورت بھی کر دی گئی۔ وہ تب تک اسی دن کے آرزو مند تھے، خوش خوش گھر آئے۔ مذکر دوستوں، عزیزوں، یہاں تک کہ "جن و انس" سے روپوش ہو کر کے اعتکاف کیا، اور پورے چھ مہینے بعد رمضان ۶۸۸ھ کے آخر میں ۳۹۴۴ شعروں کی مثنوی مکمل کر کے اور نقل کرا کے پیش کر دی۔

یہ مثنوی ان کی تمام تصانیف میں کئی حیثیتوں (خصوصاً فنی اور سماجی حیثیت) سے نہایت اہم ہے۔ اب وہ ۳۶ برس کے ہو گئے، جہاں دیدہ، پختہ کار شاعر بھی ہیں، اپنی برسوں کی مراد کو پہنچے ہیں۔ دربار میں کوئی شاعر ان کا مد مقابل نہیں [illegible]

قیاسی تصویر

خسرو اپنی مثنوی "قران السعدین" پیش کرنے شاہی دربار چلے ہیں۔ مثنوی کا زریں بستا خادم کی بغل میں ہے۔ آگے پیچھے دو دو خادم ہیں۔ دوہرا بالا قد، چوڑا سینا، گردن کشیدہ، پیشانی کشادہ، مونھ پر داڑھی، جو نہ گھنی ہے، فقیہوں کی طرح، نہ تکونی یا چھدری ہے، منگولوں تاتاریوں جیسی، رنگ سانولا جو پچھلے چند برسوں میں اور بھی سنولا گیا ہے، آنکھیں روشن، مگر ذرا بھوؤں کے اندر دھنسی ہوئی، گوشۂ چشم میں ہلکی سی شوخی یا بذلہ سنجی کی جھلک، چہرا باوقار، شانے کسے ہوئے، ایرانا پوز، گھٹنوں تک قبا جس کی گوٹ زرتار اور منقش ہے، اور کپڑا بنگال کا، نازک، نفیس اور باریک۔ سر پر صافا اور عمامے کی بیچ کی شکل والی دستار، جس کا ایک سرا گردن پر لٹکتا ہے، گھٹنوں سے نیچے برجس جیسی تنگ مہری ازار (شلوار) جو بے ایڑی کے سنہرے جوتوں (موزوں) کو چھوتی اور ٹخنوں کو ڈھک لیتی ہے، اور پہلو سے عطر کی بھینی مہک آ رہی ہے۔

اپنی ننھیال کی شاندار حویلی سے دربار تک پہنچتے ہیں، گردن موڑ کر دائیں بائیں دیکھتے اور کسی قدر جھک کر، مسکرا کر سلام کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ مسکراہٹ کے ساتھ چہرے پر بے تکلفی کی ایک لہر سی لہر آتی ہے جس میں ان کے چمکیلے دانت اور پتلے ہونٹ، مسواک کے باوجود، ہونٹوں پر پان کا لاکھا دکھائی دے جاتے ہیں۔

ایک تو خسرو کا کمال فن، پھر مثنوی ایسی کہ تب تک رزم، بزم، تاریخی تفصیلات، اندرونا زندگی، فنون، الٰہ صنعتوں، حرفتوں کا ایسا مرقع اور مکمل نقشہ کبھی کسی نے کھینچا تھا، اہل دربار اور خود بادشاہ عش عش کر گئے۔ معز الدین کیقباد کو ایک تاریخ تازہ [illegible] (جو شکروں کے [illegible]) تازہ تھا، پھر [illegible] بادشاہ زادا [illegible]

میں اپنا نام ثبت کرانے کا آرزومند - اس نے جی کھول کر داد بھی دی، اور سیم وزر بھی - چچا نے اسے ملتان سے جا کر مصحف دار (کتاب خواں اور شاہی لائبریرین) بنایا تھا، باپ نے محض ندیم اور قصیدہ گو - معزالدین نے ان دونوں سے بلند مقام ملک الشعرا دیا - اور شاعر، جسے ڈھیر سا (دیل بار) سونا چاندی ملنے کی توقع تھی، بظاہر مسکراتا، بباطن پیچ و تاب کھاتا ہوا آیا -

"وہ کوئی میرے کلام کی قیمت کیا دے گا بھلا، یہ تو محض کاغذ کے دام ہیں -" امیر نے ایک بار نظر اٹھا کر "چہرۂ مبارک" کی نقاہت سے بھانپ لیا ہوگا کہ عنقریب اس تخت پر کوئی اور براجے گا - وہ کوئی اور ایک عمر رسیدہ، بے باک نرم دل، بے لوث خلجی امیر تھا، جسے معزدشمن اور مہلک نظام الدین وزیر کی تنگ سامانی سے بلا کر شائستہ خاں کا خطاب، بلند شہر کی جاگیر اور خسرو کے مرحوم نانا کا عہدہ "عارض ممالک" دے دیا -

امیر خسرو نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا اور یوں گویا مستقبل کی راہ ہموار کر لی - سال نہ گذرا تھا کہ معزالدین کیقباد کی قضا کے خلاف اور ترک امرا کے منصوبوں کو شکست دے کر، ستر برس کا ایک خلجی امیر فیروز اپنا شاہی لقب جلال الدین اختیار کر کے بہابود (موجودہ نواح نئی دہلی) سے بادشاہی قصر کیلوکھڑی میں آیا - بلبن کے عہد میں شاہی چتر سیاہ ہوا کرتا تھا، پھر وہ سرخ ہوا، سادگی پسند جلال الدین نے چتر سفید کو شاہی علامت قرار دیا اور زندگی بھر ادب کے مارے بلبن کی تخت گاہ پر قدم نہیں رکھا -

غوریوں کی طرح خلجی بھی افغان تھے، لیکن وہ افغان جن کا خون سلجوقی ترکوں میں ملا ہوا تھا - ترکوں اور افغان کی پرانی کشمکش نے پھر زور پکڑا - بادشاہ اس عمر میں بھی رنگیلا تھا اور دربار میں [illegible] جشن منانے سے نہیں جھجکتا تھا، لیکن زمانہ پُر آفات پایا، سامنے تین برس جنگ و

نہیں بنایا، البتہ مصحف داری کے عہدے پر امیر کا آبائی خطاب دیکر بارہ سو روپے سالانہ مقرر کر دیا - امیر نے اس کی تخت نشینی پر یاد دلایا کہ میں آپ کا قدیم مداح اور آپ کی حکومت کا آرزومند رہا ہوں، تاہم دربار میں انہیں ایک مقررہ تنخواہ اور با ادب کھڑے رہنے کی جگہ سے زیادہ کچھ نہ ملا -

معلوم نہیں امیر خسرو کی شادی کب اور کہاں ہوئی، لیکن سنہ ۶۸۹ھ سنہ ۱۲۹۰ء میں ان کے ہاں پہلا بیٹا تولد ہوا اور اس کا نام مسعود رکھا گیا -

جلال الدین فیروز خلجی کو اس تھوڑی سی مدت میں تین جنگوں سے سابقہ پڑا - خسرو کے دو سابق ممدوح ملک کشلو خاں (عرف ملک چھجو) اور امیر علی حاتم خان (گورنر اودھ) یکے بعد دیگرے مقامی راجاؤں اور غیر مسلم جنگجو زمینداروں کو ساتھ ملا کر نہ صرف بغاوت پر آمادہ ہوئے، بلکہ فوج لیکر بدایوں تک چڑھ آئے -

ان دونوں کی مدح میں خسرو کے قصائد [illegible] تھے کہ انہوں نے جلال الدین فیروز کو خوش رکھنے کے لیے دونوں ترک امیروں کو برے لفظوں سے یاد کیا - وہ کڑا (مانک پور) کی فوجی مہم میں بادشاہ کے ساتھ بھی گئے - بعد میں راجپوتوں کے مضبوط قلعے جھاین رنتھمبور کی فوجی مہم میں ساتھ تھے - انہیں کی یاد میں بادشاہ کی جنگی مہموں پر ایک مختصر سی مثنوی مفتاح الفتوح بھی لکھی، جس کے شروع میں ہی جتا دیا ہے کہ میں واقعات کے نظم کرنے میں غلط بیانی اور مبالغہ سے کام نہ لوں گا - خلجی بادشاہ بھی اسی طبیعت کا آدمی تھا - ابھی وہ رنتھمبور سے واپس ہوا تھا - دم لینے نہ پایا تھا کہ ایک زبردست منگول تاتار فوج سنام اور ملتان کی سرحد پر [illegible] گھٹا کی طرح امنڈی، ارکلی خان کی [illegible] پر روانہ ہوا - بادشاہ خود بھی لشکر [illegible] کا بڑا شائق تھا، لیکن وہ [illegible] نہیں - امیر خسرو بھی پیچھے رہے -
حقیقت [illegible]

[illegible]" جو ماوراء النہر پر قابض تھی۔ ۵۰ سال کے رابطے کے بعد اب اسلام کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ اس نے قسمت آزمائی کے لیے یہ داؤ چلا کہ پوری قوت سے ہندستان پر حملہ کیا جائے۔ اگر افغانوں اور ترکوں کے نفاق میں لڑتے بادشاہ کا سنگھاسن ڈول گیا تو دو نسلوں کی منگول تاتار برادری آ جائے گی، اگر ناکامی ہوئی تو وہیں اسلام قبول کرنے کا اعلان کر کے رہ پڑیں گے اور ملت میں شریک ہو جائیں گے۔ ایک معاصر تاریخ میں ڈیڑھ لاکھ کے اس لشکر جرار کے سالار کا نام عبداللہ دیا گیا ہے، دوسری جگہ الغ خان۔ دونوں بہرحال ہولاکو (ہلاکو) کے پوتے تھے اور ابھی تک کہیں اپنا گھر نہیں بنا سکے تھے۔ چند روز معاندانہ طرفین جنگ میں مشغول رہے اور ایک جماعت کثیر قتل ہوئی۔ مغل بے شمار علف تیغ خون آشام ہوئے۔ جنگی معرکے بجائے گفت و شنید شروع ہو گئی۔ بادشاہ نے ان کے سردار کو جو قرابت ہلاکو خان سے رکھتا تھا اپنی زبان مبارک سے فرزند فرمایا، اس نے بادشاہ کو پدر کہا۔ بادشاہ نے ان کو انعام اکرام، جیب خرچ، تحفے تحائف دے کر جو رہ پڑنا چاہتے تھے، لاہور شہر اور دلی کے مضافات میں بسنے کی جگہ دکھا دی، یہی محلے بعد میں مغل پورے کہلائے۔

امیر خسرو کے ہاں اس واقعے کا ذکر سرسری ہے، لیکن جب ان میں سے کئی ہزار کو عہد علائی اور مبارک شاہی میں قتل کیا گیا تو امیر خوش ہوئے ہیں، اور یہ تنہا موقع ہے جب وہ قتل عام پر علانیہ اپنی بیزاری کا اعلان نہیں کرتے۔ خسرو دو سال جم کر دلی میں بیٹھے، اسی زمانے میں خواجہ نظام الدین اولیا کی خانقاہ پر آمد و رفت بڑھی۔ [illegible] دل [illegible] سے اچھ دیوان "غرة الکمال" [illegible] اور بزرگ دوستوں، مولانا شہاب الدین قاضی [illegible] سراج، تاج الدین زاہد اور علاء الدین [illegible] کے مشورے اور مدد سے ترتیب دیا۔ [illegible] بلند [illegible] دیباچہ لکھا۔

یہ پہلا دیوان تھا جس پر "شیخ الشیوخ عالم" نظام الدین کی مدح، خدا و رسول کے نور کے بعد آئی ہے اور تیسرا دیوان ہونے کے باوجود اس میں بھی اپنی غزلیں شامل نہیں کیں، اور دیباچے کے خاتمے اپنے بڑھے ہوئے موڈ کی فکری پرچھائیں یوں ڈالی —

"افسوس صد افسوس کہ ان چند شیفتہ دل میں جھوٹ کی اس لوٹ میں اپنی عمر کے نفیس ترین سانس خالی کر دیے، اور عمر عزیز ان پر ضائع کر دی۔ شعر سے میرے ہاتھ ہی آیا جو گرد و غبار سے آدمی کی مٹھی میں آتا ہے۔ اس خبط کے مارے اندھیرے میں کمر بستہ سے چلائے، اب چاہوں کہ ہاتھ دھو لوں (دامن پاک کر لوں) تو میں ہوا سے ہاتھ بھی نہیں دھو سکتا۔ یہ محض دل کے ارمان تھے کہ "سخن نام برینده فرض است" کفر و زندقہ میں اتنی فکر (یعنی فکر سخن) صرف کر دی، اسے کسی اچھے کام میں لگانا چاہیے تھا۔ "یعنی در عالم وحدانیت مصروف شدے۔"

اب تک انہوں نے کیریئر اور امارت کی تلاش کی، طشت زر کی امید رکھی، شاعرانہ مقبولیت چاہی، غزلیں لہک لہک کر سنائیں اور خوش آواز گانے والوں اور گانے والیوں کو تربیت دے کر گوائیں اور سنوائیں، گیت سنگیت، ناچ رنگ، جام و دلارام کی محفلوں میں جی بھر کے رچ چکے تھے، سفر کیے، کنیزیں رکھیں، زبان قلم اور تلواریں [illegible] کی تیزیاں سنوائیں، سیدازن اور جنگلوں کی چلچلاتی دھوپ رن میں بجتے نقارے اور چھلکتے جام و پازیب کہیں سے منہ نہیں پھیرا اور اب عمر کے چالیس سال پورے کر کے وہ ماضی کا تنقیدی جائزہ لے رہے ہیں، اگر ایک ہی سانس میں پورا موڑ کاٹنا ان کے مزاج اور تاریخی حالات کو منظور نہ تھا۔ [illegible] جلال الدین خلجی کے ہاں، ترک [illegible] پنجاب کی طرح دوست دشمن سب کا [illegible] اور گزر گیا۔

بدھو کے دن ۱۹ جولائی ۱۶ رمضان ۶۹۵ھ کو اولوالعزم، منچلے اور اپنی کامیابی کی خاطر سب کچھ کر گزرنے والے بھتیجے اور داماد علی گرشاسپ (بعد میں علاءالدین محمد) نے دھوکے سے مہربان چچا کا سر عام خاتمہ اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ کڑا (مانک پور) کے مقام پر، گنگا کنارے جہاں علاءالدین نے بادشاہ کے پرانے باغی ملا لیے تھے، باپ جیسے شفیق سلطان کا خون ناحق کرنے کے بعد جب وہ منزل بمنزل دلی کی طرف ہن برساتا گرہنوں سے روپے اشرفی کا بکھیرتا ہوا چلا تو بتیس برس کا کڑیل جوان، دکن کا پہلا فاتح افغان اپنوں اور غیروں کے لیے امیدگاہ بن گیا اور دشمنوں اور نکما چینیوں کے لیے سیلاب بے پناہ، لقول مخنے دیوگیری میں ہی علاءالدین نے دلی فتح کر لیا۔

علاءالدین نے اپنے سے پہلے کے دس سال معزالدین کیقباد اور فیروز خلجی کا دور گویا تاریخ ہندستان سے بالکل نظرانداز کرکے بلبن کی تخت گیر بے لوچ، منتقمانہ، انتقامی، مگر غیر شاعرانہ پالیسی اپنائی اسے آگے تک پھیلایا فرق صرف یہ تھا کہ بلبن بیس برس مرکز کو مضبوطی سے تھام کر بیٹھا رہا، علاءالدین نے دیوگری کی آسان فتوحات میں سونے کی کانیں دیکھ لی تھیں اور وہ ایک مضبوط مرکز کا دائرہ اختیار کرے گا زمین کے چپے چپے پر پھیلانے کا آرزومند تھا۔ کتاب کی معمولی شد بد رکھنے والے حوصلہ مند بادشاہ کو جس نے ترک امیروں کے باہمی اختلافات سے فیض اٹھایا بھی اور انہیں امید و بیم کی حالت میں رکھ کر فیض پہنچایا بھی، سکندر کی طرح فاتح اعظم بننے کی تمنا تھی۔

امیر خسرو نے اپنی بڑے ہوئے سیاسی موسم میں اپنے شاعرانہ مرتبے کا تعین تو دیکھ لیا اور ہی بچے مرتب کرے کسی عظیم مثنوی کی تصنیف کا خیال ایک نکال دیا۔ تاہم ان کی رگوں میں آباد [illegible] کے جلسے [illegible] کو سنا [illegible] گئی، اور جب اگلے ہی سال ۶۹۷ھ وسط ایشیا سے [illegible] ایک لشکل تاتار اور چینیوں کا زبردست لشکر بے در پے دریائے جہلم پار کرکے پائے تخت کی طرف بڑھا، اور اسے ظفر خان اور الغ خان نے شکست فاش دی، دوسری بار خود علاءالدین اپنے کی نذروں کرکے نکلا اور فتح مند لوٹا، بیس ہزار منگول مارے گئے، ہزاروں افسر اور فوجی پابہ زنجیر شہر شہر گھمائے گئے، ہاتی کے پاؤں کے تلے روندے گئے تو امیر خسرو کا جی ٹھنڈا ہو گیا، انہیں ملتان کی بربادی کی یاد رہ رہ کر ستایا کرتی تھی۔

ہد ہد سلیمانی

علاءالدین نے تین سال کے دوران منگول تاتار اور چینی فوج کے لگاتار پانچ اور ایک سے زیادہ خوفناک حملوں کو اس قوت کے ساتھ کچلا کہ کم سے کم ایک نسل کو شمالی سرحد کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ امیر خسرو کا درباری منصب اور درجہ قائم رہا، اس متحرک اور بے چین طبیعت کا ایک حال پر قائم اور مطمئن رہنا دشوار تھا۔ بادشاہ جہاں خود ملہو لشکر لے جاتا انہیں بھی ساتھ جانا پڑتا۔ ورنہ بادشاہ پوچھتے کہ میرا ہدہد کہاں ہے لہذا ہدہد کو غایب پاکر وہ اس کی گرفتاری کا حکم صادر کر دے، مگر یہ سلیمان وقت اپنے ہدہد سے بے نیاز تھا۔

راجپوتانے کی لمبی فوجی مہم کے علاوہ تین سال وہ پائے تخت سے باہر نہیں گئے۔ اب انہیں تحصیل فن کے علاوہ ایک فکر اور تھی۔ فارسی کے عالم ادب میں، ایران، توران کی ٹکسال میں اپنی قیمت آنکنے لعد اپنا سکا چلانے کی فکر۔ فردوسی کے بعد کسی نے مثنوی میں کمال دکھایا، بیان کے فن کو نظامی گنجوی نے [illegible] سب سے اہم یہ کہ شاہان وقت کو قصائد [illegible] کے مذہب میں اخلاقی سبق ملوے کا [illegible] نظامی گنجوی نے۔ وہ ایک عدیم المثال [illegible] تھا۔ خسرو نے اسی مینار پر کمند پھینکا۔ نظامی [illegible] کے جنوب سے الگ، دامن میں [illegible] صنعت [illegible] کے ساتھ [illegible] تب ۴۳ برس ۶۹۸ھ [illegible]

ایک قصہ بادشاہوں کو نذر کرکے اور ان سے نذریں لیکر دنیا کے آگے پیش کیا۔

خسرو نے یہ کام تین سال میں کر ڈالا ۱۲۹۸ء سے ۱۳۰۱ء وہ بھی روز کے معمولات اور دربار کی حاضری بجا لا کر یکے بعد دیگرے تینوں مثنویاں اپنے روحانی مرشد خواجہ نظام الدین کی محبت اور عقیدت کا اعلان کرتی ہوئی، انہی کی نذر۔ اب جاکر یہ رشتہ استوار ہوا تھا اور اس نے روحانی اور فکری قوت کا ایک تازہ سرچشمہ کھول دیا، سکونِ قلب بھی دیا اور وقت میں برکت بھی۔ دلوں کے بادشاہ درویشوں کے درویش، چشتی سلسلے کے چوتھے پیر اور دن بھر روزہ رکھنے پر بھی جوانوں کے جوان خواجہ نظام الدین، امیر خسرو سے عمر میں ۲۰ برس بڑے تھے۔ ان کے نانا کی ڈیوڑھی سے اٹھائے جا چکے تھے۔ ہر طرح کی آزمائشوں سے ثابت قدم گذر چکے تھے۔ خسرو کی شخصیت اور شاعری کے دلدادہ تھے۔ ان کا کلام انہی کی زبانی سننے اور داد دینے کے عادی تھے، مگر اب خسرو ان کے فقیری دربار میں حاجت مند کی طرح پہنچے تو عالم ہی کچھ اور ہوگیا۔ زہد و خلوت کے جس مقام پر روز کے آنے والے بڑے سے بڑے مرید نہ پہنچے تھے۔ خسرو وہاں پہنچ گئے اور دن بھر کی روداد مزے مزے میں سنانے لگے۔ نظامی کی مثنویاں نظام کو سناتے سناتے خسرو خود دل و جان سے "نظامی" ہو گئے۔ اس عشق کا اسرار بیان کرنا دشوار ہے، تاہم اسکی توجیہ پروفیسر محمد حبیب نے یوں پیش کی ہے۔

"مطلع الانوار" پہلی کوشش تھی، تصوف و اخلاقیات کے موضوع پر تھی، کچھ خشک رہا۔ شیریں خسرو میں پہلا قصہ تھا، ۳ کردار۔ شہزادہ شہزادی [illegible] ان کا [illegible] عاشق [illegible] خسرو نے اس [illegible] طبیعت زیادہ [illegible] سے دکھایا، [illegible] زیادہ جب تیسری مثنوی "مجنوں [illegible] ۱۲۹۹ء [illegible] اور [illegible] مثنوی میں [illegible] آیا ہے، شاعر [illegible]

پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ عجب نہیں جو کاغذ پر آنکھیں نہیں آنسو ٹپکائے ہوں۔ چوتھی "آئینہ سکندری" نظامی گنجوی کی دونوں مثنویوں (سکندرنامہ بری و بحری) کا سامنا کرتی ہے اور ہے بھی ان سے مختصر، لیکن ان کی پانچویں "ہشت بہشت" واقعی بے مثال، رواں دواں، خشکوار اور گہری مثنوی ہے۔ علامۂ دہر، مولانا جامی متوفی ۸۹۸ھ جنہوں نے ایک جملے میں دو ٹوک فیصلہ دیا تھا کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ انہوں نے اسی راہ کو اپنایا، مگر "ہشت بہشت" کے مضامین اور طرز بیان سے کترا کر۔ دنیا میں آج اسی مثنوی کے مصور نسخے زیادہ ملتے ہیں، اور ایسے کہ آنکھیں روشن ہو جائیں۔"

"یہاں نہ حاشیہ آرائی کی ضرورت تھی نہ مدح سرائی کی، بیان کیے ہوئے افسانوں کو انہی یا دوسری تفصیلات یا ترمیم و اختصار کے ساتھ اپنے رنگ سخن میں ڈھالنا اور تازگی بخشنا شاعر کا کام تھا۔ عام پسند غزل گوئی سے کہیں زیادہ دشوار۔ ہندستان سے باہر کی دنیا نے قصے کے میدان میں ان کا لوہا مانا، سو برس آگے نظامی ہیں سو برس پیچھے جامی اور نوائی، لیکن ہندستان میں ان کا نام تاریخی مثنویوں اور غزلوں نے پھیلایا۔ پھر ہم ان کی کہانیت شعار ممدوح کی طرف آتے ہیں۔"

علاء الدین خلجی نے اندرون ملک پہلی مہم گجرات کو بھیجی جہاں سے سمندر کے مغربی کنارے تک ہر طرح ہر تی پھیل گئی۔ اسی فتح میں راجا کرن کی رانی کنولا دیوی اور ایک سیاہ فام پھرتیلا دور اندیش مانک قیدی بنا کر لائے گئے۔ خسرو خان (جس نے قبول اسلام کا اعلان کرکے یہ نام اختیار کیا) علاء الدین کے زمانے میں بڑھتے بڑھتے بالآخر اس کے بیٹے قطب الدین مبارک شاہ کا راز دار اور بعد میں اس کا قاتل بنا۔ چند روز کے لیے صاحب تاج و تخت بھی بنا۔ ایک عظیم الشان سپہ سالار اور [illegible] کے نام سے تاریخ ہند میں [illegible]۔ رانی کنولا دیوی نے اپنی قوت [illegible]

پاس بلوانے کی جو ضد کی وہ بعد میں رنگ لائی۔ اور انسی کے واقعات پر امیر خسرو کا بہترین شعری کارنامہ مثنوی "دول رانی خضر خان" مبنی ہے۔ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ علاء الدین کے خاندان کا چراغ گل ہونے میں گجرات کے ان تینوں "قیدیوں" کا ہاتھ ہے۔ اگرچہ ۱۲۹۷ء کے یہ تینوں گجراتی قیدی سماج کی الگ الگ پرتوں سے آئے تھے، لیکن خلجی شاہی خاندان میں اعتبار اور اقتدار حاصل کر کے انہوں نے واقعات کو وہ رخ دیا کہ جب ۱۳۲۱ء میں خسرو خان کی شکست اور خاتمے کے بعد شاہی خاندان کے وارث کی تلاش ہوئی تو ڈھونڈے سے کہیں نام و نشان نہ ملا، اور غازی ملک تغلق کو مجبوراً تخت شاہی پر قدم رکھنا پڑا۔

امیر خسرو ان تمام واقعات کے عینی گواہ ہیں، لیکن یہ محض اتفاقی امر نہیں کہ علاء الدین جیسے اولوالعزم حکمران پر انہوں نے کوئی تاریخی مثنوی خرچ نہیں کی۔ وہ اس کی مدح تو جی جان سے کرتے ہیں، مگر کمال فن کے اظہار میں پہل نہیں کرتے۔ اسے کسی اور دن کے لیے اٹھا رکھتے تھا۔

علاء الدین خلجی نے دغا اور دولت سے دلی کی وسیع سلطنت قبضائی تھی، اور پورے بیس سال اسے دلیری، ہمت سخت گیری اور انتظامی قابلیت کے ساتھ چلایا۔ اپنے "خمسے" کی ہر ایک مثنوی میں امیر خسرو بڑھ چڑھ کر اس کی مدح کرتے ہیں۔ کبھی براہ راست، کبھی ادھر ادھر رکھ کر نصیحتیں کرتے ہیں اور نظامی گنجوی کی طرف خود بھی سکندر ثانی، علاء الدین والدنیا فاتح عالم، نایب خلیفا سے ملا انعام اور قدر دانی کی امید رکھتے ہیں، لیکن سلطان نے ان کا اپنے دربار کو زینت [illegible] نظامیا سے [illegible] زیادہ اہمیت نہیں دی۔ امیر [illegible] ہمارا پنا [illegible] ظریف [illegible] گرایا [illegible] کہ یہاں مبالغہ [illegible] نگاری [illegible] ۴ اور [illegible] اس [illegible]

کی حقیقت پسند ہو گئے۔

دو عظیم الشان ہستیاں صرف تکلف، احتیاط اور احتراف کے رشتے برت کر ہی ایک مقام پر رکھتی تھیں، اس لیے امیر خسرو بار بار درخواست کرتے ہیں کہ انہیں "حاضری" سے مستثنا کر کے شاعرانہ مصروفیت کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

امیر نے جا بجا علاء الدین کو اس کارنامے کی داد دی ہے کہ غلے کے سرکاری گودام بھرے ہوتے ہیں، قحط کا خطرا نہیں رہا، ضرورت کی تمام چیزوں کی قیمتوں پر کنٹرول ہو گیا ہے، ناپ اور ماپ میں دکانداروں کی بے ایمانی کا خاتمہ کر دیا گیا۔ پتھر کے بجائے لوہے کے باٹ آ گئے۔ سازشی گروہ اور گروہی سازشیں دونوں کا ناطقہ بند ہے۔ زمین کی لگان بندی، تنخواہوں اور اجرتوں کی شرح مقرر ہونے سے زمینداروں [illegible] کا زور گھٹا عالم میں خوشحالی ہے، چوروں [illegible] رہی نہ گنجایش ساحل سندھ سے بنگال اور [illegible] (تا مل ناڈو) تک رستے محفوظ، انصاف کا [illegible] اور حنفی شریعت کا حکم رواں ہے، شاہی [illegible] مغل، تاتار اور چینی حملہ آوروں کو ایسی [illegible] دکھائیں کہ آیندہ ادھر اس طرف کا رخ نہیں کریں گے اور جنوب کے راجا باج گزار اور دوست ہو گئے یا ان کا زور ٹوٹ گیا۔

علاء الدین خلجی ان کے لیے محض ایک [illegible] نہیں رہا تھا، بلکہ اولوالعزمی، پامردی، بے رحم [illegible] اور زبردست وسیع سلطنت میں رعایا کے جان و مال کی حفاظت کا نشان بن گیا۔ وہ اس کی [illegible] کو اول اول نجل سے کی کیدا خاطر ہے۔ [illegible] اس پالیسی کی قدر و قیمت جانی [illegible] صرف قصیدوں میں خمسے کی مثنویوں کی تمہید [illegible] بلکے عہد علائی کو بارہ برس جا [illegible] اور جینے کے بعد اپنے قلم کا پہلا نثری کارنامہ "خزائن الفتوح" [illegible] کر دیا۔ [illegible] آخری [illegible] کے بعد جب علاء الدین کے [illegible]
[illegible]
[illegible]

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندستان کی اس کی قوت مرکزی سلطنت کے جبروقہر، شان وشکوہ، ناپ تول اور دور اندیشی پالیسی کی تہہ میں اترنے کے لیے" خزائن الفتوح " کی تہہ دار نثر ایک زینے کا کام دیتی ہے۔ آج تک ہندستان کی کوئی ایسی معتبر تاریخ نہیں لکھی گئی جس میں عہد علائی کے واقعات کی سند کے لیے امیر خسرو کی تصانیف، خصوصی خزائن کو نظر انداز بنایا گیا ہو۔

راجپوتانے کی جنگوں میں جہاں جہاں بادشاہ بذات خود گیا، امیر خسرو ہمرکاب تھے۔ دکن کی فوجی مہموں میں ۱۱-۹-۱۳۰ء امیر خسرو نہیں گئے تھے، لیکن انہوں نے ایک ایک تفصیل ریکارڈ کی۔ معاصر مورخوں سے زیادہ صداقت کے ساتھ فتوحات کی تاریخی اور سماجی اہمیت کو ابھارا۔

امیر خسرو کی زندگی میں ہندستان پر دس بار منگول حملے ہوئے، جن میں سے پانچ حملے، بلکہ جان توڑ حملے علاءالدین کے شروع پانچ سال کے دوران ہوئے آخری حملے میں وہ لاک فوج تھی جس میں دو دربار کے تجربے کار منگول سپاہ سالار موجود تھے۔ دو بار دشمن دلی کی فصیلوں تک آگیا، اور وہاں سے پسپا ہوا۔ امیر خسرو کے نزدیک ان فتوحات میں علاءالدین خلجی کی پالیسی مردانگی اور طریق جنگ کے علاوہ آپ کے پیر حضرت نظام الدین کی برکت بھی شامل تھی، لیکن وہ خزائن میں یہ نہیں جتاتے۔

امیر خسرو کے نزدیک اس دور کی اہمیت یہ ہے کہ [illegible] کے زمانے میں غریب اور پست حال کسان زمینداروں [illegible] عاملوں کی زبردستیوں سے محفوظ ہے، اور جنگ کے زمانے میں لشکر کی گزرگاہ کے قریب، دیہات اور [illegible] سب آبادی سے محفوظ ہیں۔ ان کے نزدیک [illegible] اہمیت یہ ہے کہ جہاں گیری کے ساتھ جہاں [illegible] بادشاہ اس سے اس سے تک [illegible] کے علاوہ انتظام میں بھی کامیاب ہے۔ [illegible] [illegible]

یہی خیال انہوں نے اپنی مثنویوں میں بھی ابھارا ہے، اور صاف نظر آتا ہے کہ امیر اب دربار میں ایک مصحف دار اور منصب دار شاعر کی حیثیت سے نہیں خود کو ایک سخت گیر مدبر کی حیثیت میں دیکھتے ہیں، اور خالی خولی مدح سرائی کو فعل عبث شمار کرتے ہیں۔

مثنوی " لیلیٰ مجنوں " انہوں نے سنہ ۱۲۹۹ء میں تمام کی ہے۔ یہ علاءالدین کا جنگی زمانہ ہے جب علی اور مغلوں کی زبانیں اس کے آگے بند تھیں، وہ مثنوی کے ختم پر بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں ؎

ترکا نہ زمو، گرہ کشائی
چوں من نشوی کہ ہرزمانے
پیشہ نکنی ستا سرائی
سازم بدروغ داستانے

یعنی شاعری اور مداح سرائی پر بسر نہ کرنا، آبائی پیشہ شمشیر زنی اور نشانہ بازی اختیار کرنا۔ قوت بازو کی کمائی کھانا۔ انہیں معلوم ہے کہ مثنوی دوست اور دشمن سبھی تک پہنچے گی۔ مدحیہ بیان ہے تو ممکن ہے علاءالدین پر اثر ہے، پھر بھی کھلا کھلا بے باکی سے کہہ جاتے ہیں۔

در ہیچ جہاں " مسکین " حاجت مند، بے سروسامان جو کھولتی دیگ کی طرح تپ رہا ہے، رات سے صبح تک صبح سے شام تک " گرفتہ غم " میں چین نہیں پاتا۔ خودغرضی کے ہاتھوں یہ ذلت اٹھاتا ہوں کہ اپنے جیسے ایک آدمی کے سامنے (ادب سے) کھڑا رہنا پڑتا ہے، جب تک پالا ہے سر کر خون نہیں چڑھ جاتا کسی کے پانی (معاوضے یا اجرت) سے میرا ہات تر نہیں ہوتا "

یہ ہے خسرو ان کی زندگی اور تصورات کا جو عہد علائی کی فتح مندی اور عہد قطبی اور گریں کی شکست نے ساز ش کرکے انہیں سکھایا، اور جس کی بدولت " ہمیں " ممکن ہوا بعد کی تین اہم مثنویاں لکھیں اور [illegible] دیا گیا، افضل الفوائد، قوائد الطرت [illegible] رسائل الاعجاز [illegible] تکمیل پائی۔

علاءالدین کی فتح دیو گڑھ کے [illegible] جنگیں لڑی گئیں، جن میں بعض [illegible] حاصل ہوئیں، ان فتوحات میں [illegible]

راجپوتوں اور ان سورماؤں کا ہاتھ تھا، جنہیں مختلف تدبیروں سے نیا نیا سیاسی اقتدار نصیب ہوا تھا۔ ملک کافور اور خسرو خان، اور اس کے ہم قبیلہ لوگ انہی میں شامل تھے۔ انہوں نے شاہی خاندان کا مستقبل اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آیندہ پانچ سال میں رفتہ رفتہ اسے بے دخل کر دیا۔ امیر خسرو ان امرا میں بعض کو وقت آنے سے پہلے ہی خوش کر چکے تھے۔

۴ر جنوری ۱۳۱۶ء ۶ر شوال ۷۱۶ھ کو جب علاء الدین کی آنکھ بند ہوئی اس سے ذرا پہلے ملک کے دور دراز علاقوں میں بغاوت یا شورش پھوٹ پڑی تھی۔ علاء الدین کے انتقال اور اس کے ناز پرور راجے قطب الدین مبارک شاہ کی تخت نشینی ۱۸ر اپریل ۱۳۱۶ء کے درمیان پائے تخت میں کئی نشیب و فراز آئے، لیکن امیر خسرو خانہ نشین ہو کر "دول رانی خضر خان" کی تصنیف میں مصروف رہے۔ خود کہتے ہیں کہ چار مہینے میں مثنوی تمام ہوئی۔ چار مہینے خانہ نشین تو رہے، مگر انہوں نے یکسوئی سے اپنا بہترین کارنامہ "دول رانی خضر خان" مکمل کیا۔

شہزادہ خضر خان امیر خسرو کا قدردان، خواجہ نظام الدین کے مرید کی حیثیت سے ان کا خواجہ تاش اور دل عہد تھا۔ اسی زمانے میں اپنی داستان عشق منا کر یادداشتیں حوالے کر کے اسے نظم کرنے کی فرمایش کی تھی۔ وہ فرمایش پر لکھ رہے تھے اور چاہتے ہوں گے کہ بادشاہ کے آخری دنوں میں ہی مکمل کر لیں۔ واقعات کا تفصیلی بیان بھی اس کی شہادت دیتا ہے، مگر حالات پلٹ گئے اور امیر خسرو نے مثنوی روک کر بعد کے حالات بھی، جو صاحب اختیار ملک کافور کے خلاف پڑتے تھے اس میں شامل کر دیے۔

خواجہ نظام الدین کی درگاہ و پیران کی حاضری اور مستقل ارادت میں خصوصیت بھی ایک حد تک زیبے دار ہوگی۔ اس جرات کی غیر معمولی طور سے اس مثنوی پر حاشیہ ہے۔

شہ آنچنان کہ گفت از جہان آزاد
ترک بخل و خشم و لہو و بیداد
[illegible] کشش چار ترک کلاہ نیست

بیاید ترک از گفتن کہ شرط نیست

ان اشعار کے پیچھے کونسا ذہن اور تجربہ کام کر رہا ہے وہ بھانپ سکتے ہیں جب ہم اس سے ذرا پہلے کا یہ اندراج پڑھتے ہیں۔ امیر خسرو ۱۳۱۲ء ۴ر ذی الحجہ ۷۱۲ھ کو حضرت نظام الدین کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے اس روز حضرت کے قدم چومے اور انہوں نے۔

"کلاہ چار ترکی بر سر بندہ نہادند و بیعت مشرف گردانیدند الحمد للّٰہ۔"

پھر وضاحت کی کہ ٹوپی میں چار گوشے ہیں اول شریعت کا خانہ دوسرا طریقت کا، تیسرا خانہ معرفت کا اور چوتھا خانہ "حقیقت" مزید تفصیل یہ بتائی کہ رسول اللہ نے ایک ترک والی ٹوپی ابوبکر صدیق کے سر پر، دو ترک ٹوپی حضرت عمر خطاب کے سر پر رکھی تین ترک والی حضرت عثمان کو بخشی اور چار ترک والی علی مرتضیٰ کو عطا کی۔ پھر ہر ایک کے الگ الگ مرتبے بیان کر کے فرمایا چار ترکی والی ٹوپی "اصحاب اہل صفا و سادات و طبقات مشائخ کرام بر سر نہادہ اند۔"

"و مراد از ترک چہارم آنست کہ طہارۃ القلب من حب الدنیا یعنی پاک گردانیدن دل را از دوستی دنیا و آنچہ در دست۔"

اگر افضل الفوائد خود امیر خسرو کی تالیف نہ ہو، تب بھی یہ حقیقت کہ انہیں ۱۳۱۲ء میں پیر و مرشد نے چار ترک والی ٹوپی کا اعزاز بخشا، دونوں کے سوانح نگار کے لیے نہایت اہم ہے کیونکہ اس سے ان کے روزمرہ معمولات، خیالات، اور فکر و فن پر ان کے اثرات کا سراغ ملتا ہے۔

انہی تین برسوں میں انہوں نے اپنا چوتھا دیوان "بقیہ نقیہ" مرتب کیا اور پہلی مرتبہ اپنے دیوان میں غزلیں شامل کیں۔ یعنی غزلیں جنہیں وہ محض تفریح یا بزم آرائی کا سامان اور کمتر درجے کی شاعری شمار کرتے تھے، لیکن خانقاہ کے اہل محفل قوالوں (یا سماع) کے وقت غزلیں ہی ان سے اور لوگوں کے ساتھ سنائی جاتی تھیں، عام لوگ ان سے لطف اندوز ہوتے تھے، اور اپنے طور پر گاتے پھرتے تھے

جن کے ترنم میں، یقینی طور پر طبلے کی تھاپ اور ساز کے سرگم در پردہ موجود تھے۔

انہی برسوں میں امیر خسرو نے وہ پانچ ضخیم اور قاموسی (انسائیکلو پیڈیائی) رسالے ترتیب دیے جن میں اپنے دور کے نثر و نظم، معاشرت و معیشت، رزم اور بزم کے نکات یوں بکھیر دیے ہیں جیسے ریت میں چاندی کے ذرے۔

اسی زمانے میں انہوں نے اپنا ترکانہ عصبیت کو زیر کیا، اور اس کی لگام گہری انسانی ہمدردی کے ہاتھ میں دی۔ اور یہی زمانہ ہے جب انہوں نے اپنی سب سے مفصل، مکمل، رنگین اور دل نشین مثنوی، "دول رانی خضر خان" (بعد کے اضافوں کے ساتھ) ایسے وقت اپنے عام قدر دانوں کے سامنے رکھی جب اس مثنوی کا ہیرو خضر خان تہ تیغ کیا جا چکا تھا، اور اس کی اصل ہیروئن "دول رانی" نئے بے درنغ بادشاہ (قطب الدین مبارک شاہ) کے قید حرم میں لائی جا چکی تھی اس لڑکی کا تعارف جس اہتمام سے کرایا ہے، وہ بھی غور طلب ہے۔

برسم ہندوی از نام دیا بش
در اصل بود "دیول دی" خطابش
بنام آں پری چوں دیر رہ داشت
فسون بندہ از دیوش نگہداشت
یکی علت درو انگندم از کار
کو نہ دیول "ما دول" کردم بنہار
دول چوں جمع دولتہاست درشیع
ہدیں نام است دولت ہا بجمع
چو رانی بود صاحب دولت و کام
دول رانی مرکب کردمش نام
خطاب این کتاب عاشقی بہر
"دول رانی خضر خان" ماند در دہر
دگر چوں "لیلی و مجنوں" بہ ترتیب
"دول رانی خضر خان" کرد ترکیب

عجیب بات ہے کہ شیخ کی فرمائش تو شہزادے نے کی تھی مگر خسرو نے سرچڑھا "دول رانی" اور نام میں پہلے ترتیم کر کے امیر نے اسی کی معنویت و عظمت بڑھا دی۔ اسی طرح قصے کی ایک مثنوی کا نام "شیریں و خسرو" ہے۔ دوسری کا اگرچہ نظامی کے برعکس "مجنوں و لیلا" رکھا تھا، تاہم حوالا دیتے وقت لیلا مجنوں، لکھ جاتے ہیں یعنی اول لیلا، بعد مجنوں، جب امیر نے امیر وقت سے بے نیازی برت کر ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء میں خمسے کی نیت باندی اور پہلی مثنوی "مطلع الانوار" تمام کرنے لگے تو اپنی زعم بیٹی "مستورہ میموں" سے یوں خطاب کیا۔

اے رخ تو شمع و چراغ دلم
خوب ترین میوۂ باغ دلم
اگر چہ کہ اخوان تو نیک اخترند
نے ز تو در دیدۂ من بہتر اند

یہی حال خمسے کی دوسری مثنویوں کا بھی ہے کہ بیشتر نسوانی کردار اپنی خوبیوں میں مردوں سے بڑھ جاتے ہیں۔ بعد کی تحریروں خصوصاً "نہ سپہر"، "رسائل الاعجاز" اور "تغلق نامہ" میں عورت مظلوم ہے، با وقار، پاکباز اور جاں نثار ہے۔ اور مصیبت کے وقت مردانہ وار ہے۔ یہاں تک کہ ستی اور جوہر کی دہشتناک رسموں میں بھی وہ عورت کی قربانی کے نغمہ سرا نظر آتے ہیں۔ ایک دو حکایتی مثالیں چھوڑ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امیر خسرو میں (اپنے ہم عصر "ولایتی" شعرا کے برخلاف) عورتوں سے ہمدردی، بلکہ طرفداری کا جذبہ جو پوشیدہ تھا، وہ بروئے کار آگیا ہے۔ ماں کی ممتا کی لطیف تاثیر خواجہ نظام الدین کی شفقت و محبت نے اور تیز کردی اور گویا ساری محبتوں اور شفقتوں کے سرچشمے کو ایک وسیع انسانی دھارے میں بدل ڈالا۔

مادر وطن ہندستان سے ان کا الفت بھی اکا پاٹ والا دریا کی ایک موج ہے، یہ موج اس لیے متلاطم ہو گئی کہ نو وارد "ولایتی" تاتھانا رعونت میں آکے دن ہندستانی ماحول، نیز ادا اہل قلم پر طنز کیا کرتے تھے، ان کے جہل کی حقیقت جاننے کے علاوہ خسرو نے چاروں کھونٹ گھوم کر مفتوح، مغلوب اور تباہ حال ہندستان کی مشاقی، باریکی، ذہنی اور فنی کمال، تہذیبی گہرائی اور رنگا رنگی کے جلوے دیکھ لیے، پھر یہ جاننا کہ چھوٹے چھوٹے [illegible] اور

تہذیبی اکائیوں (یا اس وقت کے تصور سے کہیے کہ تہذیبی خلوتوں) کو بزورِ شمشیر مٹا کر تاراج کر کے جو سیاسی اور انتظامی وحدت (مرکزیت) قایم ہوتی تھی وہ دیرپا نہیں نکلی - بیرونی حملے اور مرکزی حکومت میں معمولی سے خلفشار کے ظاہر ہوتے ہی ہر طرف شورش اور بغاوت کے شعلے اٹھنے لگتے تھے - علاءالدین خلجی نے دور و نزدیک کی ان سیاسی اور تہذیبی کوٹھریوں کو مسمار نہیں کیا انھیں مغلوب کر کے ساتھ ملا لیا - تب علاقوں کے بجائے ملک کا ایک نقشہ ابھرا اور سرحدیں محفوظ رہ سکیں -

امیر خسرو بادشاہ کے دم قدم کے ساتھ تھے اور اس عمل کے محض خاموش تماشائی نہیں تھے - وہ دیکھتے ہوں گے کہ جارحانہ رد کا وقت گذر رہا ہے یا گزر چکا ہے - مصالحانہ قبول کی ضرورت اور گنجایش پیدا ہوتی جا رہی ہے، رد و قبول کے اس دیرینہ عمل میں ان کا دل قبول کے ساتھ ہو گیا -

تصوف کو محض ایک شغل بنانے کے بجائے اپنے وجود کے رگ و پے میں بھر لینے کی مشعل خانقاہ سے اور اس بزرگ کی نظر آبیاری کرتی رہی جس کی آنکھیں دن بھر کے روزے اور رات بھر کی عبادت سے سرخ رہتی تھیں جس کے لنگری خان سے شب و روز سیکڑوں مہمان پیٹ بھر کر یا جھولی بھر کر اٹھا کرتے تھے، جہاں مذہب و ملت، رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہ تھا - مقناطیس نے کچے سونے کو کھینچ لیا اور اسے کندن بنا دیا -

ادھر قصر ہزار ستون میں سلطان علاءالدین کی آنکھ بند ہوئی - ادھر ملک نایب (چیف سکریٹری) سیاہ فام کافور نے بڑے شہزادے خضر خان کی آنکھیں نکلوائیں (جو بحکم سلطانی گوالیار کے قلعے میں نظربند تھا) اور سات سال کے بچے کو تخت نشین کر کے عنان حکومت سنبھالی کمسن شہزادے شہاب الدین کی ماں جھاتیا پالی راے رام دیو کی بیٹی تھی، اس سے نکاح کر کے کافور نے غالباً بادشاہ کے سوتیلے باپ کا سا اعتبار حاصل کرنا چاہا - خضر خان کا ہم عمر سوتیلا بھائی مبارک قید کر دیا گیا، اور جب اس کو اندھا کرنے کے لیے چار "پیک" "باڈی گارڈ" بھیجے گئے، وہ شہزادے کے حامی بن کر پلٹ پڑے اور محل میں گھس کر ملک نایب کا ہی خاتمہ کر دیا - چند روز بعد ۱۸ اپریل سنہ ۱۳۱۶ء مطابق ۲۴ محرم سنہ ۷۱۶ھ کو یہی مبارک خاں قطب الدین کا لقب اختیار کر کے تخت نشین ہوا -

یہ تین مہینے امیر خسرو پر بے نیازانہ جینے کے باوجود کتنے سخت گذرے ہوں گے، اندازا ہو سکتا ہے - ملک کافور اور خضر خان دونوں ان کے ممدوح رہ چکے تھے، دونوں معتوب ہوئے - کچھ اور ممدوح اور قدر دان ادب میں آ گئے ہوں گے -

نئے بادشاہ نے تخت نشین ہوتے ہی خضر خاں کو خط لکھا کہ تم نے باپ کی عزت کو بٹا لگایا کہ گجرات کی ایک کنیز کے سامنے سر جھکاتے ہو، اسے توڑ دلی بھیج دو - ظاہر ہے کہ خضر خان نے اپنی اس مونس تنہائی کی حمایت کی اور وہ قتل کر دیا گیا -

خسرو کی عام مقبولیت اور خاص سرپرستی نے ان کے حاسد اور دشمن بھی پیدا کر دیے تھے - خصوصاً سعد منطقی اور عبید شاعر - دونوں دربار کے حاضر باش تھے اور فوجی مہموں میں بھی جایا کرتے تھے -

خواجہ نظام الدین حسن کی درگاہ پر اب خسرو قریب قریب ہر شام بعد مغرب حاضر رہنے لگے تھے، علما کے تو محسود تھے ہی، رفتہ رفتہ بادشاہ کی نظر میں کھٹکنے لگے جو نوجوانی، اقتدار، زور دولت کے نشے میں بدمست تھا - والیان حکومت یکے بعد دیگرے تخت سے اتارے مارے یا سازش کا نشانہ بنتے، لیکن پایہ تخت میں ایک سفید ریش درویش کی خانقاہ پر مرادیں مانگنے اور زیارت کرنے والوں کی ایسی چہل پہل رہتی کہ رستے میں جا بجا زائرین کے لیے سایہ دار چبوترے اور پانی کی سبیلوں کا انتظام رہنے لگا - ان کے بڑھتے ہوئے حلقۂ اثر کے خلاف بھی بادشاہ کے کان بھرے جانے لگے -

امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھا تھا کہ مجھ سے پہلے صرف ایک شاعر گذرا ہے جس نے تین دیوان چھوڑے، مسعود سعد سلمان (لاہوری) مگر اس نے ایک عربی میں، دوسرا دری (فارسی) میں تیسرا ہندوی میں لکھا، لیکن میں تنہا شاعر ہوں جس نے ایک ہی زبان (دری) میں تین دیوان مرتب کر دیے -

ہمارا انکسار کے باوجود ان کے ہاں شاعرانہ تعلی بھی کم نہیں۔ اسی قسم کے تعلی سے چڑ کر مسعود سعد سلمان (متوفی سنہ ۱۱۲۱ء) کو اس کے ہم عصر شعرا نے حسد کا نشانہ بنایا اور بادشاہ کے کان ایسے بھرے کہ وہ امارت کے مقام سے اتار کر سیدھے قید خانے بھیج دیا گیا۔ دس سال جیل کاٹنے کے بعد رہا ہوا، جالندھر کا حکمران اور پنجاب کا گورنر بنایا گیا۔ غزنی کی حکومت میں انقلاب آیا تو پھر اس پر مصیبت آئی۔ اور دوبارا قید ہوا۔ عمر کے تیرا سال جیل کی سختیاں کاٹنے کے بعد باہر نکلا تو اس کی عمر ۶۰ سال تھی جس عمر میں خسرو کو یہ سارے خطرے درپیش ہیں۔

مسعود سعد سلمان اور عمید فقیہ۔ جن کا کلام اور ذکر امیر خسرو کی زبان پر آیا، دونوں اپنی بے باکی صاف گوئی، درباری تعلق اور شاعرانہ مقبولیت اور مرتبے کی بنا پر حریفوں کی سازش کا شکار ہوئے اور جیلوں میں جوانی کاٹ کر مرے۔ امیر نے صورت حال کا جائزہ لیا ہوگا اور جوں ہی سنا کہ قطب الدین مبارک شاہ نے اپنے دربار میں دعوا کیا ہے کہ میں اہل قلم کو اتنا دوں گا جتنا کبھی کسی بادشاہ نے نہ دیا ہو۔

زگنج گراں مایۂ بے شمار
دہم بار پیلش نہ اپیل بار

امیر خسرو نے جھٹ سے خواب میں بشارت پائی اور وہ "زمین بوسی" کے لیے پہنچے۔ بعد میں عرض کیا کہ

شہا گنج بخشا کرم گسترا
معانی شناسا، سخن پرورا
مرا عمر کز شصت بالا گذشت
ہمہ پیش شاہان والا گذشت
بے بندگی کردم از عون بخت
کمر بستہ در خدمت چار تخت

پچھلے بادشاہوں کا نام لینے کے بعد کہتے ہیں

شد اکنوں کہ اقبال ہمدم مرا
نوازندہ شد قطب عالم مرا
چنیں [illegible] زرحم ناخستہ

یعنی قطب الدین مبارک شاہ کے دربار میں بھی اقبال مندی نے ان کا ساتھ دیا اور جب بادشاہ نے سنہ ۱۳۱۸ء میں باپ کے نقش قدم پر چل کر اگلے سال دیوگری کا رخ کیا تو امیر خسرو کو ساتھ رکھا تاکہ وہ ان واقعات پر نظر رکھیں اور آگے چل کر نظم کر دیں۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جب دلی کے باہر اس مہم کے لیے فوج نکالی گئی تو ۱۶ سولہ کلومیٹر میں پھیلی ہوئی تھی۔ جنوبی ہندستان کی طرف یہ امیر خسرو کا پہلا سفر تھا اور حقیقت ہے کہ بڑھاپے کی اس یک سالہ زحمت سفر کا حاصل زبردست نکلا۔

بادشاہ کا "سیاہ چتر" دیوگری پہنچ کر ایلورا کے قریب ٹھہر گیا، خسرو خاں اور خکار ملک تلبغ اور کئی امیروں کو شاہی لشکر سمیت ورنگل کی طرف روانہ کر دیا۔ امیر خسرو آگے نہیں گئے، لیکن انہوں نے ایک ایک تفصیل کرید کر معلوم کر لی

چنیں کردہ ام مشکل فتح راحل
ز داننده کان غزاے ارنگل

یہ فوج تلنگ، ارنگل اور جنگل سے فتح مند واپس آئی۔ خراج اور مال غنیمت میں سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات کے انبار، سینکڑوں ہاتھی اور ہزاروں گھوڑے، قیمتی سامان اور کپڑے لادے ہوئے شاہی لشکر سے آ کر مل گئی۔

امیر خسرو نے واپسی پر ۴۵۰۹، اشعار کی ایک بیش بہا مثنوی "نہ سپہر" لکھ کر پیش کر دی۔ معلوم نہیں اس شاہ جم شاہ سے کیا اور کتنا صلہ ملا، لیکن خسرو کو دربار سخن سے جو صلہ ملا وہ بے مثال تھا، مورخین مثلاً برنی اور فرشتہ کے بیان کو مد نظر رکھ کر آج بھی اس مثنوی سے سند لی جاتی ہے۔

گشت ہر پردہ نقش مستقیم
چوں خیال شاعر و ذہن حکیم
صورتے بنمود بہ ہر سو جمال
کانچناں صورت نہ بندد در خیال

یہ اشعار انہوں نے سپہر ہفتم میں جشن نوروز کے بیان میں لکھے ہیں جب سجاوٹ و زیب و حسن و رنگ
ز نورات، آ [illegible]

جادو تلوار کے ہنر اور سازوں (شہنائی، چنگ، بربط، عود، رباب، دف اور جھانجھ کے باج دلی میں اکٹھا ہو گئے ہیں۔ بالکل یہی معرعے خسرو کی مثنوی پر صادق آتے ہیں، جس میں جوش بیان کے بجائے سلاست واقعیت اور مبالغے کے بجائے بیان حقیقت اور عام استعاروں کی جگہ اشیا اور اسامی تفصیل، بلکہ تصویر کھینچی ہوئی ہے۔

ہندستان کی طرف سے خم ٹھونک کر وہ پہلے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے، لیکن یہاں (سپہر سوم) کے تقریباً چار سو اشعار میں، دلی، اہل دلی اور ہندستان کی حمایت میں علمی دلیلیں قایم کی ہیں۔ جتنی سنجیدگی، ہمدردی اور کرید سے البیرونی متوفی ۱۰۴۸ء نے ہندستانی سماج، اس کے علوم اور رسوم کی تلاش کی اور جن نتیجوں پر وہ پہنچا ڈھائی سو برس بعد امیر خسرو بھی اسی راہ سے، اپنی نتیجوں پر پہنچے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جن معنوں میں ابوریحان محمد بن احمد الخوارزمی البیرونی آخری کڑی تھا۔ عربوں کی تلاش ہندستان کے تین صدی طویل سلسلے کی، انہی معنوں میں امیر خسرو پہلی کڑی ہیں۔ ہندستان کے نئے سیاسی حالات میں ہمدردانہ نقطۂ نظر کی، جس نے صوفیا اور فارسی شعرا کی صفوں میں اپنے ترجمان پائے۔

اس مثنوی میں جس کے اشعار بعد کے اساتذہ کے ہاں بھیس بدل بدل کر آتے ہیں خسرو نے نجوم، ہیئت، فلکیات، لباس، تیر تلوار، مختلف زبانوں، گھوڑوں، کھیلوں، راستوں، لوگوں، موسموں اور فیلوں کے بارے میں معلومات کا انبار لگا دیا ہے "ہندستانی معاشرہ عہد وسطیٰ میں" کے مصنف کے لیے امیر خسرو سب سے اہم ماخذ بن گئے ہیں۔

یہاں پہلی بار انہوں نے شراب کی مذمت کی ہے، وہ بھی شراب میں دھت رہنے والے بادشاہ کو دعائیں دے کر ؎

دوستے صافی مزاج و تند خوئے

بادشاہ کو خسرو کے پیر و مرشد سے جو پرخاش تھی، اس کی پرواہ کیے بغیر یہاں اتنی ہی شدت سے نظام الدین کی مدح سرائی کی ہے۔

یہیں وہ روحانی محبت، خدا اور مخلوق کے قریب ترین رشتے، انسانی الفت اور تصوف کی تعلیم میں پوشیدہ خدمت خلق پر زور دیتے ہیں۔ یہیں انہوں نے اپنے ہم عصر شعرا کا بڑھ چڑھ کر ذکر کیا ہے۔ ان کی فنی کمالات کو سراہتے ہوئے یہاں تک آ گئے کہ خسرو جیسے خوش گو شاعر کی زبان سے، اگر کبھی پہلے سنا ہوتا تو ادبری معلوم ہوتا ع

کمترین ہمہ مسکین خسرو

وہ ان قلعوں، شہروں، مندروں، فنکاروں اور ہنرمندوں کی ستایش کرتے ہیں جن پر بیداد ہوئی، مگر داد نہ ملی۔ وہ بادشاہ کی مدح کو تمہید بنا کر اسے کھلے لفظوں میں نصیحت کرتے ہیں کہ ؎

پنج بنا شرط جہانداری است
آید از دکش ز خدا یاری است

پھر پانچوں شرطیں گنائی ہیں (۱) سلطنت کی پالیسی مضبوط اور انتظامی مشین سچی ہونی چاہیے۔ (۲) اندر عزم ہو، باہر سکون۔ یعنی امتحان کے وقت ارادہ اٹل اور چہرا پر وقار رہے (۳) دور اندیشی میں ڈھیل یا غفلت نہ ہونے پائے (۴) پرجا کو انصاف ملے کہ کسی کی فریاد بلند نہ ہو (۵) خاص و عام کی آسودگی یا فلاح پیش نظر رہے ؎

بر ہمہ دارد بہ بیایاں و کاخ
با خوشی ورہ ایمن و نعمت فراخ

پھر ایک نکتے کو تفصیل وار تاریخی قصے اور مثالیں دے کر بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ پانچ چھ صدی قبل دلی کے راجا اننگ پال کو دیوڑھی پر جو دو شیر بنے ہوئے تھے جو ترجمان انصاف کی علامت تھے، اور ان کے پہلو میں ایک گھنٹا لٹکا ہوا تھا جسے فریادی آ کر بجاتے اور انصاف طلب کرتے تھے

پر مردانگی خرچ کرنے اور بدمست ہو جانے کی عادت تھی، صاف صاف جتاتے ہیں کہ ؎

تا جو را نے کہ تنعم کنند
حزم خود از عیش و طرب کم کنند

اور بالآخر بادشاہ کے چٹکی بھر لیتے ہیں ؎

پرسش بر آں دار کہ در زیر پوست
دشمن خود باز شناسی ز دوست

ان دو کے علاوہ خاص اس مثنوی کو پڑھ کر جو بات سمجھ میں آتی ہے کہ کیوں پہلے دن سے مثل شہزادہ خضر خاں کے امیر خسروؔ کی مثنویاں لفظاً بلفظاً پڑھائی جاتی تھیں اور خوش خطی کی مشق میں وہ انہیں نقل کیا کرتے تھے۔

نظام الدین اولیا کے مرید خسروؔ نے شاعری کے تقریباً آخری کارنامے سے وہ کام لیا جو ہمیشہ سے اس کا آخری اور بیمارانہ فریضہ ہے، مگر زمانہ پہ جدا بادشاہ نہیں جیتا۔ پہلا سال اس نے شاہوں کے دورے اور اپنا میدان صاف کرنے میں گذارا دوسرا سال طمطراق، شغال اور نوچ کھسوٹ میں تیسرا دور تھا وہ کمال کے "اندر دشمن" پالنے اور اس کی خاطر بے حیائی کی حد تک اپنے دوستوں کو بے دخل اور ذلیل کرنے میں۔

آخر ۵ ربیع الثانی ۷۲۰ھ مطابق ۱۳۲۰ء جمادی الثانی کی چاند رات کو قطب الدین مبارک شاہ اپنے منہ چڑھے غلاموں کے ہاتوں اسی قصر ہزار ستون میں قتل کر دیا گیا۔ جہاں اس نے اپنے عزیزوں اور مشتبہ بے قصور ملزموں کے قتل کے فرمان جاری کیے تھے ؎

ہمیں ملک از پے فتنہ کہ برخاست
بجز زیں گوتہ دارم راستا راست

ٹھیک چار سال چار مہینے بعد، اس رات کو جس کا یہ فیصلہ تھا یا نظام الدین کو حکم تھا کہ بادشاہ کے سلام کے لیے حاضر ہوں، یا حاضر کیے جائیں، خاجا پورے اطمینان قلب کے ساتھ خانقاہ میں موجود تھے۔ بادشاہ نہیں تھا، جیسے خدا ان کی حالت کہ اس نے اپنا سیاہ شاہ لیے ہی ہونا کی گودا کے ذر اپ ہمیشہ کا سرد سے اور ادھر بیٹھے کا ایک انجانا ذوالقرنین

حسن جو خسرو خان کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ علائی خاندان کے کم سن بچوں کو راتوں رات قتل کرا چکا تھا۔ امیر خسروؔ نے ان دردناک واقعات کی پوری تصدیق کرکے یہاں تک تفصیل درج کر دی ہے کہ کونسا بچہ اس خونیں واقعے کی شام کونسا سبق پڑھ چکا تھا، اور کس حال میں تھا۔ ورنگل و معبر میں امیر خسروؔ اپنی پچھلی مثنوی میں کچھ تو بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر اور کچھ محاکات کا فرض ادا کرنے کے لیے اسی خسرو خان کی فوجی فتوحات پر داد دے چکے تھے۔

خسرو خان نے اپنی ان پڑھ مگر جنگجو برادری "براد" کے لوگوں کو ہر قسم کی چھوٹ دے دی، قصر ہزار ستون اور کوشک سرخ لال قلعہ کے اندر اور باہر انہوں نے چند روز اپنی کرنی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، لیکن چند روز کے بعد ہی ایک بے چین سا امن قائم ہو گیا اور جن امرا سے کوئی فوری خطرا نہیں تھا، وہ اپنی اپنی جگہ بحال رہے۔

قاعدہ تھا کہ بڑے بڑے قلعے داروں اور گورنروں یا باج گزاروں کے بیٹے بھتیجے مرکز میں رہ کر خدمت انجام دیں۔ وہ والی وقت کی ہمراہی میں جاں نثاری کی تربیت پانے کے علاوہ دور دراز کے طاقتور امیروں کی طرف سے وفاداری کی ضمانت بھی بنے رہتے تھے۔ دیپال پور چھاؤنی کے قلعے دار غازی ملک کا بیٹا فخر الدین جونا خان جسے خان نے آخور بیگ داروغہ اصطبل کا عہدا دیا، ایک اندھیری رات میں تیز رفتار گھوڑے اور چند آدمی ساتھ لے کر دلی کی حدود سے نکل کر دیپال پور کی طرف فرار کر گیا۔ باپ نے بیٹے سے تمام عبرتناک حالات سنے اور پیغام بھیج بھیج کر دو مہینے کے اندر حلیف تیار کرکے دلی کی طرف لشکر بڑھا دیا۔ ہریانا کے مقام حصار پر اسے دلی کی فوج نے گھیرا اور شکست کھائی، اور جب وہ نمک حرام خسرو خان غازی ملک کے آنے سے خبردار ہوا اور دروازا خزانے کا کھول کر بعض سپاہیوں کو سہ سالہ اور بعض کو چار سالہ اور بعض کو ڈھائی سالہ پیشگی تنخواہ دی اور شاگردوں کو بھی زر خطیر تقسیم کرکے ایک حبہ خزانے میں نہ چھوڑا اور جواہرات آدمیوں کو بانٹ دیے۔ اس

نقد رقم کا قابل ذکر حصہ خواجہ نظام الدین کی درگاہ پر بھی پہنچا اور انہوں نے حسب عادت محتاجوں اور سائلوں میں تقسیم کرا دیا، اور جب خسرو خان کے پنچ ماہ اقتدار کا خاتمہ کرنے کے بعد غازی ملک نے حکومت کا چارج لیا اور خزانہ خالی پایا تو جن جن خاندانوں یا خانوادوں میں رقم پہنچنے کی اطلاع تھی، وہاں سے بجبر طلب کیا، یہاں تک کہ دسش فیصدی فوری واپسی کی شرط عاید کر دی۔ خسرو کے پیر و مرشد کے پاس کیا بچا تھا کہ دیتے۔ انہوں نے ادائیگی سے مجبوری ظاہر کی تو نئے بادشاہ کے دل میں کدورت بیٹھ گئی۔

کدورت کی دو وجہیں اور بھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جن تنگ نظر علما کے اثر میں رہتا تھا وہ خواجہ کی خانقاہ پر چلے کی دھوم دھام اور "سماع" کی "غیر شرعی" ما رو نق سے ناخوش تھے۔ دوسرے یہ کہ خواجہ باللہ نے اس انقلاب حکومت علائی خاندان کی تباہی اور خسرو خان کے خلاف زبان نہ کھولی تھی، اور ایک حلقہ ان کے سیاسی و سماجی اثر پر انگلی اٹھا چکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ خسرو خان، فاتح دکن سے خوش تھے، قطب الدین مبارک شاہ کی شہوت پسندی کے شکار خسرو خان سے ہمدردی رکھتے تھے، لیکن اس کے قبیلے کی افراد ہندو سفاکی نے ان کا دل پھیر دیا، چنانچہ ان کی زبان پر برادو، اور ہندو، کافر اور مرتد کا لفظ بار بار آیا۔

۶ ستمبر ۱۳۲۰ء ۱ شعبان ۷۲۰ھ کی چاند رات کو دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے آئیں۔ حوض شمسا پر جہاں اب حوض خاص ہے ارادت کے میدان میں ملک غازی کی فوج نے صف بندی کی۔ یہ جنگ جو غازی ملک تغلق کی فتح پر تمام ہوئی۔ دلی کی سب سے خون ریز جنگوں میں تھی۔ اس جنگ نے جہاں ہندستان کو آنے والی خانہ جنگی سے نجات دے کر کافی عرصے کے لیے مرکزی طاقتور سلطنت بخشی، وہیں اس کی بعض تفصیلات جن کی تصدیق امیر خسرو کے بیان سے ہوتی ہے تاریخ ہندستان کے طالب علم کے لیے بے حد اہم ہیں۔

دلی کی فوج میں کم از کم دس لاکھ مسلح سوار موجود تھے جن میں سے چالیس ہزار صرف ہراول میں بھیجے گئے۔

ملتان اور دیپال پور کی طرف سے جو فوج بڑھی اس کی تعداد بھی کم تھی، اور اسے اپنی فتح کا یقین بھی نہیں تھا۔ فتح کا نقارا بجنے تک لڑائی برابر کی رہی۔ ملتان کی فوج میں عرب، ترک، منگول، تاجیک اور روسی شامل تھے۔ روس کے منگول سلطنت میں شامل کیے جانے کے بعد روسیوں کا "ادھر کی فوج" میں بھرتی ہونا یا سرحدی ملکوں میں فوجی ملازمت کے لیے جانا اس لیے بھی قرین قیاس ہے کہ "تودیر" کے شہر کا ایک خاص تکین ایران کے رستے اسی تغلق خاندان کے دور حکومت میں بیجا پور اور بیدر تک پہنچا۔ تاجیک اور خراسانی سپاہیوں کے ساتھ "پاک اصل" کہہ کر امیر خسرو جتاتے ہیں کہ۔

"ہمہ نگشتہ اصل بد یا اصل شان وصل"

یعنی وہ تازہ ولایت تھے، ان کا خون ہندستانی خون میں نہیں ملا تھا۔ یہی نہیں، بلکہ ؎

سواراں بیشتر ز اقلیم بالا
نہ ہندوستانی و ہندو و لالا

مطلب یہ ہے کہ ادھر سے آنے والے سوار مقامی فوج سے زیادہ طاقتور اور جنگجو ہوتے تھے۔ ان کی ایک صفت یہ تھی کہ

؎ "بے صف اشے تا تاراں شکستہ"

اس جنگ کو اگرچہ بعض شعرا اور مورخین نے "جہاد" کا خطاب دیا، تاہم دلی اور پنجاب دونوں لشکروں میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے۔ دلی کے لشکر میں آدھے آدھ ہندو اور مسلمان تھے، پنجاب کے لشکر میں کئی رجمنٹیں غیر مسلموں رشتی کھوکروں کی۔ حسن برادو خسرو خان کے حمایتیوں میں جہاں خاندان بلوک آخری دم تک اس کے ساتھ رہے، وہیں سلطان دلی بھی شریک تھے، اگر اس کی ایک رجمنٹ سے نعرۂ تکبیر بلند ہوتا تو دوسری سے نعرہ "نارائن"۔

ایک زمانے کے بعد اب یہ جنگی اصول برتا جانے لگا تھا کہ رستے میں فوجی سپاہی بھی قیمت دے کر خریدا جائے، ملک غازی نے ؎

ہمہ کالا بقیمت می خریدند
بریں سال رہ بہ تیزی می بریدند

یہ بات کہ خسرو خان کے ساتھ اس کے غیر مسلم نہیں ذات

شہباز صدیقی امروہوی

طوطیِ ہند

اے امیر نامور اے خسرو عالی وقار
علم و عرفاں کا ہے تو دریائے ناپیدا کنار
تیرا ثانی کم ہی دیکھے گی یہ دنیا اب کہیں
گرم ہے تیرے نفس سے محفلِ شعر و سخن
زمزموں میں ہے ترے وہ دلکشی وہ بانکپن
چہکے بلبل کیا تری رنگیں بیانی دیکھ کر
جملہ اصنافِ سخن پر ہے ترا انعامِ عام
انوری کا تجھ کو حاصل ہے قصیدہ میں مقام
تیرا خمسہ بر نظامی کے ہے خمسہ کا جواب
ہر پہیلی ہے تری طبعِ رسا کا شاہکار
تیری انملیاں دکھاتی ہیں جدا اپنی بہار
کس قدر دلچسپ ہے چٹکلہ یہ تیرا وہ مشغول
مرثیہ تا کا تو نے تھا وہ درد ناک
چاک ہیں جیب و گریباں ڈالی زرتن در رخ پہ خاک
واہ وا گفتار میں تیری اثر کا یہ کمال
شاعرو! تیرا کبھی کا زوال نہ ہو ہندستان
مستند ہے فارسی اس درجہ تیری بے گمان

صدر بزمِ عارفاں ملکِ سخن کے شہریار
حکمت و دانش کو تیری ذات پر ہے افتخار
"عمرہا باید کہ روزگار آید چنیں"
شاعروں کی محفلوں میں تو ہے صدرِ انجمن
دم بخود ہے جن کو سن کر طوطیِ شکر شکن
خوش نوائی، نغزگوئی، نغمہ خوانی دیکھ کر
مرثیہ، قطعہ، رباعی میں ہے نامی تیرا نام
عطر آگیں ہے غزل سے تیری سعدی کا مشام
آج تک ہے بے مثال و بے عدیل و لاجواب
تیرے دو سخنے ہیں گویا زعفران کے کشت زار
کہہ مکرنی کا تری کہہ کر مکرنا ہے شعار
جن میں باہم ہیں معنیٰ سے جڑا کتا، کھیر، ڈھول
قلبِ غمگیں ہو گیا زہرِ الم سے چاک چاک
ہو گیا آخر جواں فرزند کے غم میں ہلاک
راست تو یہ ہے اسی کا نام ہے سحرِ حلال
ذات ساری ہے تری مروت و شہرِ جمال
لیتے ہیں اشعار سے تیرے سند اہلِ زباں

مرزا غالب جو کسی ہندی کا قائل ہی نہیں / خاک پر گھستا ہے تیرے روبرو لوح جبیں
تو نے ملک ہند میں اردو کی ڈالی داغ بیل / فارسی ہندی کا آپس میں کرایا خوب میل
ابتدا میں شغل تیرا گو نظر آتا تھا کھیل / لیکن آخر میں منڈھے چڑھ ہی گئی بولی کی بیل
ہندوی در ریختہ مبنی ہوئی اردو نئی / جو کرے ہر قلب کو تسخیر وہ جادو بنی
گائکی کے فن میں اپنے عہد کا ہے تو امام / مطربان دہر لیتے ہیں ادب سے تیرا نام
اللہ اللہ قصر موسیقی میں تیرا یہ مقام / راگنی لونڈی ہے تیری راگ ہے تیرا غلام
باربد بھی تیرے آگے بار پا سکتا نہیں / تان کوئی تان سین اپنی لگا سکتا نہیں
مختلف آلات موسیقی ہیں تیری یادگار / تیری ہی ایجاد کا ثمرہ ہے طبلہ اور ستار
آئی تیری [illegible] سے نغمہ زنی میں بہار / تیرے ممنون کرم ہیں مطربان روزگار
سرنگوں تھے راگ کے طائر جو زیر خاک پر / [illegible] سے اڑنے لگے افلاک پر
سینۂ شفاف تیرا مخزن اسرار ہے / روح جاں [illegible] تیرا مطلع انوار ہے
قلب تیرا نور ایماں سے تجلی زار ہے / [illegible] بادۂ دیدار سے سرشار ہے
نور حق سے سربسر معمور ہے تیرا دماغ / خانۂ عرفاں [illegible] ہے ایک تابندہ چراغ
گونہ گوں اوصاف کا ہے ذات میں تیری قران / فقر ہوتا ہے تری شان امارت سے عیاں
مرحبا یہ عسرت و عشرت کا دو گونہ سماں / ذوق درویشی بھی ہے ملبوس شاہی میں نہاں
بارگاہوں میں کبھی شاہوں کا تو دمساز ہے / خانقاہوں میں کبھی ولیوں کا تو ہمراز ہے
جب ہوئی صحبت نظام الدین کی تجھ کو نصیب / جاگ اٹھے برکت سے ان کی تیرے خوابیدہ نصیب
رفتہ رفتہ ہو گیا مرشد سے تو اتنا قریب / تجھ کو محبوب الٰہی نے کہا اپنا حبیب
شیر و شکر پھر تو یوں مطلوب اور طالب ہوئے / ساری دنیا کہہ اٹھی یکجاں دو قالب ہوئے
جرأت و ہمت پہ تیری حبذا صل علیٰ / دین کی کی خدمت بھی تو نے دنیا سے مطلب بھی رکھا
معرفت کی راہ میں ہر مرحلہ بھی طے کیا / شغل میں تصنیف کے بھی محو روز و شب رہا
کام لے کر آخر اپنے خسروی اعجاز سے / لکھے ملفوظات مرشد دلربا انداز سے
بزم اہل حال میں ہوتا ہے تو نغمہ زن / وجد کے عالم میں آ جاتی ہے ساری انجمن
نشہ ہو جاتا ہے دنیا کی محبت کا ہرن / دل کو لگ جاتی ہے معشوق حقیقی کی لگن
تیرا نغمہ اس لیے تاثیر سے خالی نہیں / شرع کے حلقہ سے باہر تیری قوالی نہیں
الفت پیر طریقت میں نہ تھا تیرا جواب / مرگ مرشد کی خبر سن کر نہ آئی تجھ کو تاب
چل دیے بنگالہ سے پہنچا شہر دلی میں شتاب / تربت محبوب پر گریاں رہا مثل سحاب
چھ مہینے شور و شیون کر کے ساکت ہو گیا / پا در خاک میں اپنا [illegible] چھپا کر سو گیا
گویا ہے شہباز صنعت میں تیری جو ارمغاں / تحفۂ درویش برگ سبز [illegible] ہے ترجماں
صرف اظہار عقیدت پر ہے مبنی یہ بیاں / مدح گوئی کا تری مقدور ہے یارا کہاں

یہ حقیقت تجھ پہ روشن ہے آخر الکتاب
ذرہ کر سکتا ہے کوئی کیا ثنائے آفتاب

ترقی کی منزلیں طے کر چکے تھے۔

ہندستانی ماحول کا زمانے کے قوم کا موجودہ تصور اس وقت کے مفکرین کے ذہن میں نہیں تھا) امیر خسرو کے کلام پر گہرا اثر پڑا وہ غالباً ہندستان کے پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے ملک میں اتحاد قومی کے لیے ہندستانی شاعری کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ خسرو نے کہانیاں، پہیلیاں، انمل، کہ مکرنیاں، ڈھکوسلے، گیت، سندھا، اور دو سخنے کہے جنہوں نے عوام اور خواص دونوں کو متاثر کیا۔ اس سلسلے میں کامیابی کی بنیاد یہ حقیقت تھی کہ خسرو کی مادری زبان ہندستانی تھی، اور وہ انہیں فارسی سے کم عزیز نہ تھی، وہ اس پر نازاں تھے۔

حضرت امیر خسرو کے ہندستانی کلام کے متعلق "تذکرۂ عرفات" میں اوحد یہ لکھتے ہیں کہ "ان کا ہندستانی کلام بھی اسی قدر تھا، جس قدر ان کا فارسی کلام ہے" کہا جاتا ہے کہ ان کا فارسی کلام تین لاکھ ابیات سے زیادہ، اور ہم لاکھ ادبیات سے کم تھا۔ اسے ہندستانی ادب کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو کے ہندستانی کے تین چار لاکھ اشعار میں سے صرف کوئی چار سوا اشعار برباد ہونے سے بچ رہے ہیں، جس میں "خالق باری" بھی شامل ہے، اگر ان اشعار کو تحقیق اور استناد کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم نہیں ایسے کتنے اشعار نکل سکیں گے جنہیں یقین کے ساتھ امیر خسرو کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ہندستانی کلام زیادہ تر نسلاً بعد نسلٍ اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے، اور اہل ذوق کی ریاضتوں کے ذریعے بہت کم دستیاب ہوا ہے۔

امیر خسرو کی شخصیت یقیناً ایک ذہین ترین شخصیت تھی۔ وہ ایک ہی وقت میں فارسی اور ہندستانی دونوں زبانوں میں اعلیٰ شاعری تخلیق کرتا، انہیں جیسے کسی اعلیٰ ذہین فن کار کا کمال ہو سکتا ہے۔

حضرت شیخ سعدی ایران کے عظیم غزل گو شاعر تھے۔ ان کا نیچے کا شعر امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت پر تصدیق ثبت کرتا ہے:-

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت
شیرہ از خمخانۂ سعدی کہ در شیراز بود

اور سعدی ہی کیا حافظ و جامی جیسے ممتاز اور عہد ساز فارسی شعرا نے بھی ان کی تعریف اور توصیف کی ہے۔

حضرت امیر خسرو فن موسیقی میں بھی موجد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خسرو نے تال، سم، بحر اور اوزان کے قواعد مقرر کیے، اور پکھاوج کے بجائے ڈھولک اور طبلا ایجاد کیا۔ اسی طرح بین کی بجائے ستار ایجاد کرنے کا سہرا بھی خسرو ہی کے سر ہے۔

گوپی ناتھ امن

نذرِ خسرو

کوئی پیتا ہر یا جامۂ احرام میں آئے
محمد کی گلی یا کوچۂ گمنام میں آئے

خدا شاہد ہے سر جھکتا ہے اہل دل کے قدموں پر
مئے صافی سے مطلب ہے کسی بھی جام میں آئے

نیاز آگیں جبیں لے کر جو بزم ناز میں آئے
تصوف کی نگاہیں تو اسے پہچان ہی لیں گی

کسی بھی بھیس میں آئے کسی انداز میں آئے
مبارک اس کا جینا جو تری سرکار میں آئے

صفائے قلب لیکر صدق سے دربار میں آئے
نگاہ اہل عالم میں جو عزت ہو تو کیا عزت

وہ قسمت کا دھنی ہے جو نگاہ یار میں آئے
مقام ان کا بھی اونچا ہے جو تیری راہ میں آئے

اور ان کی بات ہی کیا جو تری درگاہ میں آئے
عبادت اور سجدوں کی بھی عزت دل میں ہے لیکن

عبادت وہ عبادت ہے مزہ جب آہ میں آئے

ڈاکٹر صفدر علی بیگ

حضرت امیر خسرو اور انکے افکار

حضرت امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود بلخ کے امرا اور سرداروں میں شمار کیے جاتے تھے، جب چنگیز خان اور اس کے ساتھیوں نے ایشیا کے بڑے حصے کو مسلسل حملوں سے زیر وزبر کر دیا تو سیف الدین کے قبیلے اور خاندان کے افراد کو بھی طرح طرح کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سبب سے انہیں ہندستان میں پناہ لینی پڑی۔ انہوں نے دلی سے قریب ضلع ایٹا کے ایک قصبے پٹیالی یا مومن پورا میں سکونت اختیار کر لی۔ کچھ ہی مدت میں وہ بادشاہ کے مشیر خاص ہو گئے۔ نواب عماد الملک کی لڑکی سے عقد کیا جن کے بطن سے سنہ ۱۲۵۳ ع مطابق سنہ ۶۵۲ھ میں ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو کی ولادت ہوئی۔

امیر خسرو کو بچپن ہی سے شاعری، فلسفہ اور علوم باطنی سے دلچسپی تھی، اور خوش قسمتی سے انہیں حضرت نظام الدین اولیا جیسا مرشد کامل اور روحانی رہنما مل گیا جن کے فیض صحبت نے امیر کی صلاحیتوں، شوق اور انہماک کو خوب ابھارا۔ غیر معمولی ذہانت، فطری [illegible] اور علوم باطنی کی کشش نے رفتار فتا

امیر کو وہ مقام عطا کیا کہ ان کے مرشد ان پر فخر کرنے اور کہنے لگے کہ اگر بروز حشر خدا مجھ سے سوال کریگا کہ دنیا سے کیا لائے ہو تو میں ترک اللہ کو پیش کرونگا۔ وہ امیر کو محبت سے ترک اللہ پکارا کرتے تھے۔ امیر کو خدا، رسول اور اپنے مرشد سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ انہوں نے علوم باطنی سلوک، طریقت اور شاعری کے علاوہ تقریباً تمام فنون لطیفہ میں وہ کمال حاصل کیا کہ درباروں اور بادشاہوں میں امرا اور روسا میں، حکما و شعرا میں، اہل شریعت و طریقت میں فقرا اور عوام الناس میں بے حد مقبول و مشہور ہوئے۔ بڑے بڑے شاہوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ انہیں دولت شاہ سمرقندی نے "دریائے عرفان" کہتے ہیں۔ شبلی نعمانی کا خیال تھا کہ ہندستان نے چھ سو سال کے عرصے میں ایسی غیر معمولی شخصیت پیدا نہیں کی۔ شاید ایران کو ہزاروں سال میں مشکل سے ایسی دو یا تین شخصیتیں پیدا کر سکے۔ خود ایران کے علما اور فضلا اور شعرا نے امیر کی عظمت کو مانا ہے۔

جب ہم [illegible] میں آپ کو ستایا [illegible]

نانا عماد الملک نے ان کی پرورش اپنے ذمے لی۔ عماد الملک صاحب بصیرت اور علم و فضل تھے۔ امیر کی تعلیم و تربیت میں انہوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ امیر ابھی بیس ہی برس میں تھے کہ ان کے نانا کا انتقال ہو گیا۔ فکر معاش اور سرپرستوں کی حاجت نے انہیں درباروں کی طرف راغب کیا۔ وہ زمانہ قصیدہ خوانی کا تھا، جس سے امیر کو فطری لگاؤ نہ تھا۔ پھر بھی کسب معاش کی خاطر وہ قصیدے لکھنے پر مجبور ہو گئے جن کے صلے میں انہیں تحفے تحائف، زر و جواہر، اور سونا چاندی سب کچھ ملتا رہا، لیکن اس کا بیشتر حصہ وہ غریبوں، فقیروں، محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے اور اپنے لیے کچھ تھوڑا سا ضرورت زندگی کی تکمیل کے لیے رکھ چھوڑتے تھے۔ انہیں نہ کسی قسم کا غرور و تکبر تھا نہ عیش دنیوی کا خیال۔ اگرچہ وہ بادشاہوں اور امرا و روسا کے منظور نظر تھے، لیکن کہتے تھے "غرہ بہ نزدیکیٔ سلطان مشو" یعنی بادشاہوں کی قربت پر مغرور مت ہو۔ انہوں نے قصیدہ خوانی ضرورت کی، لیکن ان کے بیشتر قصاید پند و نصائح کے دفتر تھے۔ وہ خوشامد سے سخت نفرت کرتے تھے۔

"بحوال برار" میں انہوں نے شاہی دربار داری پر اس طرح طنز کیا ہے

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش درد سر است
ہر کہ قانع شد بہ خشک و ترشہ بحر و بر است

(بادشاہ کا نقارا اندر سے خالی ہوتا ہے، اور اس کے شور و غل سے سر میں درد ہوتا ہے، ہر وہ شخص جو لقمۂ خشک و تر پر قناعت کرتا ہے، بحر و بر کے بادشاہ کے برابر ہے)

خسرو صوفی منش ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی آدمی تھے، اور درباری کی حیثیت سے انہیں ملک کے دور دراز علاقوں میں سفر کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ انہیں ہندوستان سے محبت ہو گئی تھی۔ انہوں نے دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور دلی سے انہیں عشق تھا۔ اپنی مثنوی "قران السعدین" میں دلی کی اتنی تعریف کرتے ہیں کہ یہ "مثنوی در صفت دلی" کے

نام سے بھی یاد کی جاتی تھی۔ امیر دلی کو بغداد، مصر، خراسان، تبریز، بخارا وغیرہ پر ترجیح دیتے اور کہتے تھے

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن است کہ آباد باد

(دلی کے دین و انصاف کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ عدن کی جنت ہے اور خدا کرے کہ ہمیشہ آباد رہے)

امیر کو تمام ہندستان اور تمام اہل ہند سے بے انتہا عشق تھا۔ وہ بقول سلیمان ندوی کے ہندستان کی مٹی کو اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی صباح الدین عبدالرحمان کی نظر میں عاشقان ہند کے لیے ایک پیغام تھی۔ امیر ہندستان کو ایک جنت ارضی قرار دیتے اور کہتے تھے "کشور ہند است بہشتی بہ زمین" انہیں یہاں کے خوبصورت، خوشبودار پھول، میوے، ترکاریاں، درخت، جانور اور یہاں کے دلفریب موسم بے حد پسند تھے، وہ بے اختیار کہہ اٹھتے

فلک گفت ہر چہ از زمین کشور آمد
ازآن جملہ ہندستان برتر آمد

(آسمان نے کہا زمین سے جتنے ممالک پیدا ہوئے، ان سب میں ہندستان بالاتر و برتر ہے)

وہ ہندستان کے انسانوں کی تعریف و توصیف میں لکھتے ہیں

مردم او جملہ فرشتہ سرشت
خوش دل و خوش خوی چو اہل بہشت

(اس کے تمام فرشتوں کی سی خصلت رکھتے ہیں۔ وہ سب بالکل اہل بہشت کی طرح خوشدل اور خوش خو ہیں)

وہ ہندستان کے علم و ہنر اور حکمت و دانائی پر اس طرح فخر کرتے ہیں

حکمت و دانائی و علم و ہنر
وانچہ کہ در ہند معاینست و گر

وہ کہتے تھے کہ یہاں کے لوگ علم و ادب، صنعت و حرفت، ساز و آہنگ، سرود و نغما، اور تیرد تیرے ہنر میں بے مثل و لاجواب ہیں۔ وہ دلی کو پورا بابل کا مرتبہ سرانہ پر اترتے ہیں۔ صباح الدین عبدالرحمان کا خیال ہے کہ "معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حضرت تما با

نظام الدین اولیا کے مرید، ندیم اور ہم راز بھی تھے، بلکہ بعض حسن و عشق کے کوچے کے رہ نورد تھے۔ امیر کہتے ہیں ؎

خورشید پرست شد مسلمان
زین ہندوگان شوخ و سادہ

(مسلمان سورج (یعنی سورج نما چہروں) کی پوجا کرنے لگا، کیونکہ ان ہندی شوخ اور سادہ محبوباؤں کے سبب سے وہ مجبور ہوگیا۔)

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی سفید رو فرنگی نے ان کے آگے ہندستانیوں کے کالے رنگ پر طنز کیا تھا، ان کو یہ بات ناگوار گذری اور انہوں نے اپنے دیوان "غرۃ الکمال" میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ؎

ہندرا ای مدعی طعنہ بہ تاریکی مزن
زانکہ اندر ظلمت او آب حیوان مدغم است

(ہندستانیوں کی سیاہ رنگت پر طعنہ زنی کرنے والے خاموش ہو جا، اس رنگ میں آب حیات کی آمیزش ہے)

ایک اور جگہ "دول رانی خضر خان" نامی مثنوی میں کہتے ہیں ؎

سیہ را خود بدیدہ جایگاہ ہست
کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است

(سیاہ رنگت کو آنکھ میں جگہ دی گئی ہے، کیونکہ آنکھ کے اندر کی پتلی بھی سیاہ رنگ کی ہوتی ہے)

خسرو کو ہندستانی موسیقی سے بھی عشق تھا۔ وہ "نہ سپہر" میں کہتے ہیں کہ ہندستانی موسیقی ایک آگ ہے، جو قلب اور روح دونوں کو جلاتی ہے، اور دوسرے تمام ممالک کی موسیقی سے بہتر ہے۔

امیر خسرو کو مذہب اور ملک و قوم سب سے بے انتہا محبت تھی، ان کو یقین تھا کہ کوئی شخص مذہب پر جان دیتے ہوئے اپنے ملک پر بھی جان دے سکتا ہے۔ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کرتے تھے کہ "حب الوطن من الایمان" یعنی وطن کی محبت مذہب کی محبت کے مثل ہے۔ امیر کہتے تھے ؎

[illegible] نہ رسولی آمدہ کائی زمرۂ دین
حب وطن ہست ز ایمان بہ یقین

تصوف عموماً خدا، اور مخلوق خدا سے عشق و محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ امیر خسرو نے اپنی عملی زندگی اور شاعری دونوں میں خدا اور مخلوق خدا سے عشق و محبت کا ثبوت دیا ہے، وہ ہر مذہب اور ہر ملک کے لوگوں سے خلوص کے ساتھ ملتے اور تمام مخلوق خدا سے محبت و ہمدردی رکھتے تھے۔ وہ صوفیا کے اس خیال کی تائید کرتے تھے کہ خدا سے سچی محبت کرنے والا اس کی مخلوق خصوصاً انسان سے خواہ وہ کسی ملک اور مذہب کا ہو۔ خواہ وہ دیندار یا بے دین ہو، وہ نیک ہو کہ بد، غریب ہو کہ امیر محبت کرتا ہے، امیر کہتے ہیں ؎

نزدیک اہل بینش کوراست و کور بیک
عاشق کہ بے چشمش زنگی صنم نباشد

(جن کو قدرت نے نظر دی ہے ان کے نزدیک وہ شخص نابینا ہے، قطعی نابینا ہے کہ عاشق تو شہ ہو، لیکن سیاہ فام شخص کے حسن کا پرستش نہ کر سکے)

عموماً صوفیا اور صوفی شعرا وسیع نظر اور وسیع القلب ہوتے ہیں، انہیں خالق کی ہر تخلیق سے محبت ہوتی ہے، وہ ہر طرف خدا کے جلوے دیکھتے اور اپنے محبوب کو ہر شے میں اور ہر طرف پاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کو کعبہ و کنشت اور بت کدہ اور کلیسا میں ہر طرف دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کعبہ، کلیسا اور بت کدے کی تخصیص صرف نگاہ ظاہر بین کے لیے ہے نگاہ باطن بیں ہر رنگ میں بے رنگ کا جلوہ دیکھتی ہے۔ مشہور صوفی شیخ محی الدین العربی کہتے ہیں "میرا دل ہر ایک روپ سے مناسبت رکھتا ہے وہ چراگاہ ہے غزالوں کے لیے اور خانقاہ ہے۔ عیسائی راہبوں کے لیے اور مندر ہے بتوں کے لیے اور کعبہ ہے سفر حج کرنے والوں کے لیے اور تختی ہے توریت کی اور مصحف ہے قرآن کا۔ میں مذہب عشق کا پیرو ہوں خواہ کسی راستے پر اس کا شتر مجھے لے جائے۔ میرا مذہب میرا عقیدہ ایک سچا مذہب ہے [illegible]

"محبت تمام مذہبی عقاید کا جوہر ہے، ہر عابد محبت ہی سے پرستش کرتا ہے، اور محبت ہی نے اسے اپنا بندا بنا لیا ہے۔" خواجا بندا نواز رقم طراز ہیں کہ "اگر عشق کی کوئی صورت ہوتی تو انسان کی صورت ہوتی۔ عشق بت پرستوں کا پیشوا ہے زاہدوں اور عابدوں کا قبلا ہے۔" ایسے ہی تخیلات کا اظہار کرتے ہوے ایران کے مشہور صوفی شاعر ابوسعید ابوالخیر کہتے ہیں ؎

رفتم بہ کلیسائے ترسا و یہود
ترسا و یہود جملگی رو بتو بود
بر یاد وصال تو بہ بتخانہ شدم
تسبیح بتاں زمزمۂ عشق تو بود

خواجا فرید الدین عطار کا بھی یہی خیال ہے کہ "عشق باقی ہے کفر و دین باشد"۔ غرض کلیسا ہو کہ کنشت اگر عبادت کے وقت توجہ حقیقت مطلق کی طرف ہو اور مقصود عبادت اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسا ہو تو اگرچہ ہزار سنگ راہ ہی کیوں نہ ہوں منزل تک رسائی مشکل نہیں عشق حقیقی ایمان کی بنیاد ہے۔ عبادت میں سچا خلوص، گہری عقیدت اور بے لوث محبت جس قدر زیادہ ہو اسی قدر ایمان پختا ہوگا۔ عشق کا گرمی ایمان کی پختگی کا سبب بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو کہتے ہیں ؎

ما و عشق یار اگر در قبلا گر در بتکدہ
عاشقاں دوست را با کفر و ایمان کار نیست
بسوئے کعبہ و بت خانہ رہنمائے ہوں است
کہ ہر کس از پئے معبود خود بہ پیکار است

قرآن حکیم کی ایک آیت ہے کہ
لکل جعلنا منکم شرعة و منھاجا ۃ ولو شاء اللہ لجعلکم امة واحدة و لکن لیبلوکم فی ما آتاکم فاستبقو الخیرات ۔
(۴۸-۵)

(ہم نے تم میں سے ہر ایک کے واسطے (حسب ضرورت) ایک شریعت اور خاص طریقہ دیا ہے اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی (شریعت کی) امت بنا دیتا مگر (مختلف شریعتوں سے) خدا کا مقصود یہ تھا کہ تمہیں جو کچھ دیا ہے اس میں تمہارا امتحان کرے پس تم نیکیوں میں ایک سے آگے بڑھ جاو۔)

خواجا نظام الدین اولیا کہتے تھے ؏

"ہر قوم راست راہی، دینی و قبلہ گاہی"

(یعنی ہر قوم کے لیے ایک طریقا ہے، ایک دین ہے اور ایک قبلا گاہ ہے)

امیر خسرو کا خیال تھا کہ انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی خدائے تعالیٰ کے لیے وقف کر دے اور ہمیشا نیک اور عبادت گذار لوگوں کی صحبت میں رہے جس قدر ممکن ہو اشرار سے دور رہے اپنے دل اور جذبات کو قابو میں رکھے۔ عقلا کے دلوں میں غیر ضروری خواہشات نہیں پیدا ہوتے۔ امیر خسرو بے حد نرم دل منکسر المزاج، ہمدرد، نیک دریا دل، خدا ترس اور بے نواوں سے شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو شخص صرف اپنے آپ ہی کو دیکھتا ہے، وہ خدا کو نہیں دیکھتا، اس شخص سے لوگوں کو ڈرنا چاہیے جو خدا سے نہیں ڈرتا۔

فلسفیانا اور صوفیانا تخیلات خسرو کے کلام میں ہر جگہ نظر سے گذرتے ہیں، بصیرت اور عشق کے ساتھ ساتھ ان کا واضح قسم کا انداز بیان ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے کلام میں ہر جگہ صوفیانا اشارات اور اصطلاحات پائے جاتے ہیں۔ فلسفا اور تصوف میں سب سے زیادا دلچسپ اور اہم بحث اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی حقیقت کے تعلق سے پائی جاتی ہے۔ قدیم یونانی مفکرین اور ہندو حکما سے کر موجودا زمانے کے فلسفیوں، سائنسدانوں اور علما اور حکما تک سب کو خدا کی حقیقت نے سرگرداں اور حیران کر رکھا ہے، لیکن خدا کی حقیقت کو سمجھنا اس کی ذات کا ادراک و شعور انسان کے احاطۂ علم و عقل سے باہر ہے۔ فلسفی منطق کے اور سائنسداں تجربے کے ذریعے ذات خداوندی کی حقیقت کا شعور حاصل کرنا چاہتا ہے، لیکن یہ دونوں ذرایع عرفان حق کے لیے ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن

م وعقل اور ادراک زمان ومکان کی حدوں
ے آگے نہیں جا سکتے، اور ذات باری تعالیٰ ماورا
ان ومکان کی حدوں سے آگے نہیں جا سکتے،
ر ذات باری تعالیٰ ماورائے زمان ومکان
یقت ہے اسی لیے ماورائے زمان ومکان انلا
بدی اور عالم روحانیت کا عظیم اور مقتدر قرآن
عرفان کے لیے الہام، وجدان، مکاشفہ اور
ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں، ماموں،
یا اور اوتار کے ذریعے خدائے تعالیٰ کے اسرار
ہر ہوتے ہیں۔ امیر خسرو کہتے ہیں ؎

حکیم گفت شناسم بہ عقل یزداں را
زہی کمال حماقت دریں چہ گفتار است

حکیم کہتا ہے کہ میں عقل کے ذریعے خدا کو سمجھ سکتا
ہ۔ یہ گفتار محض حماقت کی انتہا پر مبنی ہے)
ـ اور جگہ وہ خدا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

در ثنائے بہ فہم عالمیاں
در زمینش بہ وہم آدمیاں

خدا انسان ایک عجیب وغریب معما ہے۔ اس کی
ح، روحانی قوتیں، بصیرت، الہام ووجدان کا ملاحسب
یقت مطلق سے اس کا ربط وتعلق، ذہنی قوتیں
ساسات وجذبات وغیرا نے اس کو ایک راز نہاں
دیا ہے یا عبدالکریم جیلی کے الفاظ میں وہ بجائے
ایک جہان اسرار ہے۔ غرض انسان اپنی تمام تر قوا
کا کے ذریعے خدا اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتا، اسی
ے رسول خدا صلعم نے ارشاد فرمایا تھا کہ" ومن
رفہ نفسہ فقد عرفہ ربہ (یعنی جس
اپنے آپ کو پہچانا اس نے خدا کو پہچانا)" امیر
سرو کہتے ہیں کہ جو انسان مخلوقات کو نہ پہچان سکے
خالق کو کس طرح پہچان سکتا ہے ؎

آنکہ خود را شناخت نتواند
آفرینندہ را کجا داند

جو اپنے آپ کو نہ پہچان سکا وہ اپنے پیدا کرنے
ے کو کس طرح پہچان سکتا ہے)
اس میں شک نہیں کہ عقل اور علوم ظاہری کو

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بار بار کائنات مادی کو
ہر شئے کو پہچاننے اور اس کا علم حاصل کرنے کی طرف
توجہ دلائی ہے۔ مثال کے طور پر چند آیتیں حسب ذیل ہیں۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔
والی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال
کیف نصبت۔ والی الارض کیف سطحت
(۲۰-۱۷ – ۸۸)

(تو کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف غور نہیں کرتے کہ کیا
وعجیب) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کی طرف کہ کیسا
بلند بنایا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح
کھڑے کیے گئے ہیں، اور زمین کی طرف کہ کس طرح
بچھائی گئی ہے)

اس میں شک نہیں کہ اس میں غور کرنے والوں
کے واسطے (قدرت خدا) کی بہت سی نشانیاں
ہیں آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں
اور رنگتوں کا اختلاف بھی ہے۔

سورۂ الروم میں ۲۱ سے لے کر ۲۷ تک تمام آیتیں
اسی ضمن میں ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی آیتوں میں
مطالعۂ کائنات فطرت کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔
کائنات فطرت کے فکری مطالعے اور عملی تجربے کی
طرف راغب کرنے کا انجام یہ ہوا کہ اشاعت اسلام
کے بعد عرب اور اسلامی ممالک میں سائنس کے علوم
مثلاً فلکیات، طبیعیات، کیمیا، ریاضی وغیرا کو عروج
نصیب ہوا اور جس وقت مغربی ممالک تاریکی کے دور
DARK AGES سے گذر رہے تھے۔
اسلامی ممالک میں تمام علوم وفنون کو ترقی دی جا رہی
تھی، حتیٰ کہ خود مغربی ممالک نے ان سے خوشہ چینی
کی۔ کائنات فطرت کا مطالعہ انسان کو حقیقت
مطلق سے قریب تر کر دیتا ہے، کیونکہ کائنات فطرت
کا علم در اصل خالق کے عمل تخلیق کا علم ہے اور اللہ
تعالیٰ کی قوتوں کے اظہار کی تفہیم کا ذریعہ ہے لیکن
مطالعہ کرنے والا صاحب بصیرت ہو تو طبیعیاتی
علوم بھی ماورائی حقائق کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔
علوم ظاہری کی مدد سے حقیقت مطلق تک رسائی

حسن عباس فطرت

دکن اور امیر خسرو

"پری خصلت حسینان عشوہ طراز بخوبی واقف ہیں کہ دیوگیری (مہاراشٹرا) کا کپڑا کتان سے زیادہ باریک ہوتا ہے۔ کبھی تمہیں اس پر آفتاب کا دھوکا ہوگا کبھی ماہتاب کا اور پھر تم کہو گے کہ یہ تو خدا اپنا ہی سایا ہے۔"

نکو دانند خوبان پری کیش — کہ لطف دیوگری از کتان بیش
زلطف آں جامہ گوئی آفتاب است — و یا خود سایۂ یا ماہتاب است

امیر خسرو اصلاً عہد خلجی کے شاعر تھے، جبکہ دلی سلطنت کی حدیں کشمیر سے کنیا کماری تک پہنچ گئی تھیں اور صدیوں بعد ایک مکمل نقشہ ہندستان کا طور جغرافیائی پردے پر ہوا تھا۔ خسرو امیر تو تھے ہی، مگر اس سے زیادہ فطرت کے پجاری یا سیلانی اور قلندر تھے۔ بنگال ہو کر چتوڑ اور ملتان، اودھ ہو کر دلی اور دو آبا، انہوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا، ہر باغ و چمن میں بسیرا کیا، ہر شاخ پہ چہکے اور ہر پھول پر اڑان بھری۔ "طوطیٔ ہند" کا [illegible] لقب ان کی حیات اور خصائل کی بہت [illegible] ہے۔ امیر خسرو کی وہ شاعری جس کا طول و عرض [illegible] اور پانچ لاکھ ابیات [illegible] جاتا ہے۔ اس کا تمام مواد یا مال [illegible] سے نہیں، بلکہ ہندستان کے [illegible] سے کی گرج [illegible] تال اور بنگلے کی وصول مٹی سے فراہم ہوا تھا۔ ورنہ آج ہمارے سامنے ان کی وسعت بیان اور جامعیت کمال کا وہ سیل رواں ہرگز نہ ہوتا جس کی لہر لہر گنگنا دیدہ وروں کے لیے سمندر منتھن بن گیا ہے ان کا وطن ہندستان، زبان ہندوی، وہ خود ترک ہندی اور طوطیٔ ہند۔ نہ وہ دلی کے نہ دکن والے نہ چین و ماچین کی ان کی نظر میں کوئی سمائی تھی۔

بتان ہند را نسبت ہمیں است
بہر یک موئے شاں صد ملک چیں است

(ہند کے حسینوں کا ایک بال تمام چینی پر بھاری ہے)

لائق توجہ بات یہ ہے کہ امیر دو آبے کو ہندستان اور پورے برصغیر کو ہند سے موسوم کرتے تھے۔

یوں تو خسرو کے بہت [illegible] سفر کا حال ہمیں [illegible] سفر کا

تو کہیں ذکر نہیں ہے، مگر جس انداز سے وہ اپنے اشعار اور مثنوی و قصائد میں مادر وطن کا تقابل دوسرے ممالک سے کرتے ہیں، اور جز جز کی تفصیل، اعتماد اور پختگی سے مدلل طور سے ظاہر کر کے ہندستان کو افضل قرار دیتے ہیں وہ بلکل آنکھوں دیکھی لگتی ہے اور یہی ان کا شاعرانہ اعجاز ہے۔ اسی طرح جب خسرو فضائل ہند کا شمار اور گنتی کراتے ہیں تو کتنے ہی عنوان، موضوع، انسان، چرند، پرند، میوے پھل علم و فن، رسم و رواج وغیرا ایسے ملتے ہیں جن کا وجود اور چلن دکن ہی میں ہے اور شمالی ہندستان کے لیے اس کی حیثیت بدیسی جیسی ہے، اور یہ سب کچھ دکن سے پوری وابستگی، بلکے والہانا شغف اور طویل قیام دگر سے مشاہدے ہی سے ممکن ہے، مگر تمام ماٰخذ کو کھنگا لنے کے بعد ضعیف و قوی روایتوں کو ملا کر ان کے دو باتیں سفر دکن ثابت ہوتے ہیں۔ صرف ایک سفر تو یقینا ہے جو انہوں نے علاءالدین خلجی کے بیٹے شاہ مبارک قطب الدین اور ملک خسرو خاں کی ہمرکابی میں ۱۳۱۸ء میں کیا تھا، اور اس کا اعتراف و اقرار قوی انداز میں مثنوی نہ سپہر کے اندر امیر خسرو نے بھی کیا ہے ؎

من از دیدۂ خویش گویم سخن
نہ از افسانہ و داستان کہن

بہر حال اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس صورت میں ان کے کمال فن پر اعتقاد اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

مطرب ہندستان

عہد خسرو میں دنیائے اسلام کا آفتاب علم و کمال، فکر و فن نصف النہار پر تھا۔ قرطبا اور غرناطا مصر اور بغداد، ایران اور سمرقند، بلخ اور ہرات ایشیا کی ایک حکمت اور فلسفا، سائنس اور ادب فنون لطیف کا مخزن اور تعبائے گوناگوں سے معمور تھا۔ سو سال ماضی علوم و فنون کے ۱۲۔۱۳ ہ کی چوٹی لگی ہوئی تھی۔ فلسفۂ یونان کی توضیح اور تشریح میں اسلامی فلاسفا کا سکا چل رہا تھا۔ اصفہان نصف جہان تھا۔ قاہرا اور اندلس جنت نگاہ و فردوس گوش، رسل و رسائل کے وسیلے آسان تھے ہندستان کی شہرت سن کر فول کا غول وسط ایشیائی مسلمان چلا آ رہا تھا اور یہاں آنے کے بعد خد کو برتر اور اہل ہندستان کو حقیر سمجھ کر زندگی بسر کرتا تھا۔ اکثر ہندستانی نژاد مسلمان بھی احساس کمتری کے جذبے سے مجبور ہو کر اپنا رشتا جھوٹ موٹ کے شجروں کا سہارا لے کر باہر کی سلاطین کی کسی نہ کسی عالی شاخ سے جوڑ لیا کرتے تھے۔ اس پس منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ امیر خسرو ہندستان کی مدح سرائی اتنے اونچے سر میں کرتے ہیں کہ تمام عالم پر ہندستان کی فوقیت ثابت کرتے ہیں تو ان کے حوصلے اور خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انہوں نے ہندستانی ہونے پر فخر کیا۔ اپنے اور بیگانوں دونوں سے ان کی ٹکر جبو تک چلتی رہی، اور پورے اعتماد، شیرینی و لطافت، منطقی دلیلوں، شاعرانا ترنم و خوبصورتی کے ساتھ حب وطن کے "نغمۂ الہی" کو قاف سے تا قاف پہنچا دیا۔ اور یوں کہ دنیا گوش بر آواز ہو گئی، مسحور ہو گئی۔ تو کسی حجت کا یارا رہا نہ انکار کی گنجایش۔ قادر کلامی کا حال یہ ہے کہ خسرو نے اپنی شاعری میں ایسی ایسی چیزوں سے دلیل کا کام لیا ہے، جن کی بظاہر بہت معمولی حیثیت ہے، بلکے اس کی ہنسی اڑائی جاتی تھی اور دوسری بات یہ نے یہ پائی ہے کہ مجموعی طور پر اکثر ان اشیا کی فوقیت و حسن و خوبی بیان کر کے مخالف کا منہ بند کیا ہے جو دکنی تھیں۔

وابستۂ دکن

ا مداد کے مشہور جادوگر "سامانجن" کی حیرت انگیز ذہانت کے قصے سن کر ہم اندازا لگا سکتے ہیں کہ جب امیر خسرو ہندستان کے دیسی دانش، جیوتشیوں اور نجومیوں کی فضیلت بیان کرتے ہوئے

نظر اول اول دکن ہی پر پڑتی ہوگی۔ جس طرح وہ چاند گروں کی تعریف کرتے ہیں تو پہلے بنگال کا خیال آتا ہے، اسی طرح سپیروں اور جوگیوں کا بیان دکن کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے جہاں آج بھی ل بچے سے وہ بچے لڑے سانپوں کے ساتھ دیرینہ رفیقوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ جانوروں میں ان کا ممدوح خصوصیت کے ساتھ ہاتی اور اس کی ذہانت ہے جو اہل ایران کے لیے ہندستان کا اثر کہا جاتا ہے ہی، مگر میسور کے جنگلات اس کا خاص مسکن ہیں۔ اس کے بعد ہند کا ذکر آتا ہے اور رامائن کی کہانیوں کے مطابق جنوب ہی اس کا اصل مرز بوم ہے۔ پھلوں میں کیلے کی تعریف میں امیر خسرو نے قلم توڑ دیا ہے جو بلاشبہ دکن کا سدا بہار پھل ہے، اور پان جس کے دکنی ہونے کی گواہی مارکوپولو والبیرونی اور ابن بطوطا سبھی نے دی ہے ؎

برگ صاف میوۂ بے خستہ مگر
برگ ز تنبول نگہ ناشِ خور

جہاں امیر خسرو خربوزے اور آم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں، اور دل کے اہل قلم کو دنیا بھر کے ارباب علم سے بہتر قرار دیتے ہیں، وہاں دکن کے ہر پھل اور میوے کو بھی مقابلے کے لیے سامنے لاتے ہیں، اور فلاسفۂ ہندستان کو یونانیوں سے برتر بتاتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہندستان کے نادر تحفے دو ہیں۔ ایک کیلا، دوسرا پان۔ ہندستان میں خراسان کے سب میوے پیدا ہوتے ہیں جبکہ خراسان میں ہندستان کا ایک میوہ بھی نہیں ہوتا، اور وہ انھیں الائچی، لونگ کا فوکر ہی امرود اور انگور کے ساتھ شامل کرتے ہیں ؎

جنبش آں کاں طرف از میوہ تر
نیست چوں امرود چو انگور دگر
میوہ دگر کم نگر ہاں کر کشش
[illegible] دیگر فندق و ترکش بدخش

[illegible] کا ذکر ہے۔ آج کا سارے [illegible] کا تصور توام تھا

سویدائے دکن

حسینان ہند کی فضیلت امیر خسرو کا محبوب موضوع ہے۔ اس شاعر حسن شناس کی نظر میں ساری دنیا کے حسینوں میں کوئی نہ کوئی کمی ہے، مثلاً ختن والوں میں ملاحت نہیں، سمرقند و بخارا کے حسینوں میں شیرینی مفقود ہے، خراسانیوں میں دلآویزی کی کمی تو معروف روم کے معشوق چست و چالاک نہیں، مگر خوبان ہند کا کیا کہنا، ان میں ملاحت، صباحت، غمزا و ادا اور لبوں پر تبسم بھی ہے، چہل بل ہے، اور عجز و انکساری۔ ہندستان کے حسن کی ایسی جامع اور مکمل صورت گری وہی کر سکتا ہے جس نے حسن بنگالہ اور کشمیر کے ساتھ ساتھ مہاراشٹرا، تلنگانا اور مالابار کی سیاہ فام سندریوں کی انگ انگ پھڑکتی جوانی کو دیکھا ہو اور شوخی و شرارت کے ساتھ ان متانت اور سیدھی سادی تندرست و توانا حسیناؤں سے بھی نظر ملائی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ اس وقت کسی حاسد نے خوبرویان ہند کے سیاہ رنگ پر طنز کر دیا۔ امیر خسرو کے دل پر بڑی چوٹ لگی نہ تھا اس لیے کہ اہل دکن کی اکثریت سیاہی مائل ہوتی ہے، بلکہ ساتھ ہی شاید ان کو اپنے نو مسلم نانا کی یاد آگئی جن کا رنگ بھی گورا نہ تھا۔ ماں سے بے پناہ محبت کی وجہ سے وہ اس رنگت پر اعتراض سن کر آپے سے باہر ہو گئے، اور معترض کو اس طرح منہ توڑ جواب دیا ؎

ہند را اے مدعی طعنہ بہ تاریکی مزن
زانکہ اندر ظلمت آب حیوان مدغم است

(ہندستانیوں کی سیاہ رنگت پر طعنہ زنی کرنے والے، خاموش، اسی رنگ میں آب حیات کی آمیزش ہے)

دوسری جگہ "دول رانی خضر خان" نامی مثنوی میں ہے ؎

سیہ را خود بدیدہ جایگاہ است
کہ اندر دیدہ ہم مردم سیاہ است

(سیاہ رنگت کو تو آنکھوں میں جگہ ملتی ہے اس لیے کہ

کی پتلی میں تو ہر شخص سیاہ ہی نظر آتا ہے)

وہ اپنے نانا کی سیاہ رنگت کا بیان فخریہ انداز میں کرتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ میں ان کا بیٹا ہوں ؎

زنسل عارض اسود منم آں نسخت معنی
کسی کز اصل خوشیتی یک یکی نشانے باز دارم من

امیر کا عہدہ اس زمانے میں تیسرے نمبر پر ہوتا تھا۔ سب سے بڑا الغ یا خان خاناں جو لاکھ سواروں کا افسر ہوتا، دوسرے ملک یا ملک غازی اس کے ماتحت دس ہزار سوار ہوتے۔ تیسرا نمبر امیر کا تھا جو ہزار سواروں پر حاکم ہوتا۔ امیر خسرو کو دوسو ترک اور دو ہزار ہندستانی غلام دیے گئے جن پر انکو بڑا ناز تھا ؎

خساں را می کنم غرق دگہر رامی دہم اجرہ
ازاں ابر سیہ بیں طرفہ دریائے کہ زادم من

دکن کا مستند مورخ

میگسھتنیز کے بیان سے قبل اسلام دکن میں علی الترتیب تین حکمراں خاندانوں کا پتا چلتا ہے۔ چیروں، چولوں، پانڈیوں۔ بعد کے مورخین سات واہن، چالوکیا اور راشٹرکوٹ کی ہلکی سی معلومات دیتے ہیں۔ مارکوپولو جو تیرویں صدی میں یہاں آیا، گھوما پھرا، وہ تو نام ہی نہیں بتاتا۔ کہتا ہے کہ پانچ بھائیوں کی "عہدا" حکومت تھی اور خوب عیش اڑا رہے تھے، البتا ہیرے جواہرات کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ بوتھ میں پانی بھر آئے، اس لیے ہم ہر تفصیل سے دامن بچاکر راشٹرا کوٹ کی سلطنت میں آجائیں تو بہتر ہے، جن کی سلطنت کے حدود بنگال سے لنکا تک پہنچ گئے تھے۔ فارغ البالی اور مال و دولت کی کثرت کا صحیح اندازا ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک عرب سفیر اس خاندان کے ایک راجا کی تعریف یوں کرتا ہے کہ روے زمین پر بس تین بادشاہ ہیں۔ خلیفۂ بغداد، چین کا بادشاہ اور بھارت کا امو گھ ورش۔

دیوگیری کا یادو راج جس پہ راشٹرا کا آخری حال مرتبا سلسلا تھا، جسے راشٹرکوٹ کا معنوی وارث کہہ لیجیے۔ اس خاندان نے تاریخ، تمدن اور تہذیب میں بہت نمایاں رول ادا کیا۔ سنسکرت اور مقامی زبان کو بہت ترقی دی۔ نقاشی، صورتگری، سنگتراشی موسیقی و شاعری کی خصوصی سرپرستی کی اور برآمدی تجارت کو بہت فروغ بخشا۔ سنگھن اس خاندان کا سب سے عظیم بادشاہ ہوا ہے، جو بہت بہادر اور علوم و فنون کا قدر داں تھا۔ اسی کے عہد حکومت میں دیوگیری کا شہرا دور دور تک پھیل گیا تھا۔ یادو راج ہی میں مراٹھی زبان کو سرکاری درجا حاصل ہوا۔ مشہور جیوتشی بھاسکر آچاریا، شاعروں میں نام دیو، مکند راج کے علاوہ سوامی چکر دھر، سنت گیانیشور، پنڈت ہیمادری اسی سلطنت کے چاند تارے تھے جو خلجی حملے کے قبل و بعد دوسو برس تک قایم رہی۔

دیوگیری خود دولت کا خزانا تھا، اور دکن کا دروازہ بھی۔ اس شہر کی فوجی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ ہر رہنما جنوب کی طرف جاتے ہوئے دلی کے لشکر نے یہی رستا اختیار کیا۔ اس کی صنعت و حرفت، تجارت اور مال و دولت کی فراوانی میں اتنی زبردست کشش تھی کہ علاء الدین خلجی کڑا کی آرام دہ صوبیداری چھوڑ کر خفیا طور پر کئی مہینے غیر معروف راہوں کا دشوار گزار و پہاڑی سفر کر کے ۱۲۹۴ء میں یہاں آدھمکا۔ راما رام دیو کے عہد میں اس نے دیوگیری کو تسخیر کیا، اور اس قدر مال غنیمت لیکر واپس ہوا جس کی تفصیل پڑھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں، اس کی خوش حالی کی سب سے بڑی وجہ بیرونی تجارت اور تاتاری حملوں سے محفوظ رہنا تھا۔

یہاں سے دکنی تہذیب اور شمال کے دھاروں کا ملان شروع ہو جاتا ہے۔ خلجیوں کے حملے اور آمد و رفت ۱۳۱۳ء تک جاری رہتے ہیں اور آندھرا، تلنگانا، میسور تقریبا پورا دکن ان کا ہو جاتا ہے۔ دیوگیری کا نام قطب اباد پھر محمد بن تغلق کے زمانے میں اپنی دولت و ثروت کے باعث دولت اباد ہو جاتا ہے۔ دلی اور دولت اباد ایک ڈوری سے مل کر بے جیسے ہو جاتے ہیں۔ یہاں نئی راجدھانی بنتی ہے، اور پھر اجڑ تی ہے، لیکن کتنے ہی

بس جاتے ہیں۔ صوفیائے کرام میں حسن سنجری، برہان الدین غریب، راجو قتال اور بہت سوں کو یہ ملی اتنی بچا جاتا ہے کہ مرکز بھی نہیں چھوٹتی۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی درگاہ آج بھی خلایق کی زیارت گاہ ہے۔ بعد میں صوبے دار خود مختار ہو جاتے ہیں۔ بہمنی سلطنت قایم ہو جاتی ہے، اور بیجا پور، بیجا نگر، عادل شاہی ایسی کئی حکومتیں قایم ہو جاتی ہیں، اور اندر اندر تہذیبی لین دین کا زور و شور سے جاری رہتا ہے۔

امیر کا احسان تاریخ پر

اگر شکسپیر نہ ہوتا تو ملکۂ الزبتھ کے دور کے سماجی، سیاسی اور تمدنی حالات کی بھرپور اور رس بھری معلومات سے دنیا تشنہ لب رہ جاتی۔ یہی حال امیر خسرو کا ہے۔ خلجی اور تغلق حکمرانوں کی تمام مہمات اور دکن کے نخشا بہ نکا حالات ہمارہ دسترس سے بالکل باہر ہوتے۔ امیر خسرو اپنی جملا خوبیوں کے ساتھ ہی اپنے عہد کے پہلے مورخ اور شاہد ہیں، جنھوں نے مروجہ رسوم صنعت و حرفت، معیشت اور معاشرت، علوم و فنون و عقاید پر بیش قیمت اور سچی معلومات کا خزانہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ دکن کے بعض اہم واقعات کی تاریخ کا تعین امیر خسرو کے علاوہ اس عہد کے کسی مورخ نے نہیں کیا ہے۔ امیر خسرو کی مشہور نثری تصنیف "خزاین الفتوح" یا "تاریخ علائی" تمام تر تمام حالات دکن کا کچا چٹھا پیش کر دیتی ہے۔ مثنوی "نہ سپہر" کا تیسرا سپہر "افضلیت ہند بر سایر عالم" کے موضوع کو سمیٹے ہے تو پہلا اور دوسرا حالات دکن کا بہترین عکاس و نقاش ہے۔ آج کا ہر بڑا مورخ فخر سے یہ کہتا ہے کہ امیر خسرو کی تصنیفات ہی اس عہد کی مستند دستاویز ہیں۔ [illegible] میں ملک کافور ورنگل اور تلنگانے کے [illegible] اور دیوگیرہ میں قیام کرتا ہے۔ [illegible] رعایا اور فوج سمیت [illegible]

رکھ کر مہم ورنگل کے لیے مزید کمک کا انتظام کرکے لشکر کو رخصت کرتا ہے "خزاین الفتوح" میں امیر خسرو نے اس کی نقشہ کشی یوں کی ہے۔

"جب لشکر شاہی شہر میں داخل ہوا تو ایسا لگا کہ وہ قصر شداد میں پہنچ گئی ہو۔ باغ و بہار، سر سبز و شاداب مسرت انگیز اور تعجب خیز دہلی کی ہر شاہراہ چمنستان تھی جہاں صراف سونے چاندی کے سکے اچھال رہے تھے۔ قسم قسم کے کپڑے تھان کے تھان دکانوں میں موجود تھے۔ جو بہار اور بنگال سے لے کر خراسان تک کہیں نہیں مل سکتے تھے۔ ایسے ملایم اور خوش رنگ کہ جیسے پہاڑوں پر گل لالا یا چمن میں ریحان و نسرین۔ عمدا اور نفیس قسم کے میوے، تازا تازا رس بھرے پھلوں سے سارا بازار معطر اور لالا زار بنا ہوا تھا۔ سوتی، اونی اور چرمی ملبوسات، تانبے، پیتل اور فولاد کی زرہیں سپاہیوں کے لیے تیار رکھی تھیں۔ طرح طرح کے برتن قرینے سے سجے ہوئے تھے، جو بھی چاہے مناسب قیمت پر خرید لے عدل و انصاف ایسا تھا کہ ؎

نہ ترکے کرد بر ہندو جفائے

نہ ہندو را مخالف بود رائے

ملک کافور دیوگری سے تلنگانے کی راجدھانی ورنگل آیا، تاکہ پرتاپ رودر کو شکست دے (امیر خسرو کے الفاظ میں لدر دیو) وہاں اسے عظیم الشان فتح حاصل ہوئی اور بہت سے ہیرے جواہرات اور کثیر مال غنیمت ہاتھ آیا۔ ان ہیروں میں ایک ہیرا ایسا بھی تھا جس کا مثل و نظیر دنیا بھر میں نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہیرا "کوہ نور" رہا ہو جو چند مورخین کے بیان کے بموجب دکن سے حاصل ہوا تھا۔

دکن کی موسیقی اور رقص

چودھویں صدی کا سیاح ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ

۱۳۰۰ء زمانے ۳۰۷۰ء خسرو [illegible] وفات [illegible]

گھبرارا تھا۔ امیر خسرو ایسا ماہر موسیقی اور راگ رنگ کا رسیا جہاں پہنچے وہاں گیت کے شعلے بھڑکنے لگیں تو پھر ایسی فضا ریز زمین پر آکر کیا کیا نہ ہوا ہوگا اور کتنی گرما گرم صحبتیں رہی ہوں گی۔ غرض یہ سننے میں آیا ہے کہ امیر خسرو یہاں کی موسیقی اور رقص پر مرمٹے اور لکھا کہ یہاں کے چنگ کی آواز سے زہرا بھی نالہ و فریاد کرنے لگتی ہے، یہاں کی موسیقی آہوان صحرا کو مدہوش کر دیتی ہے، اور یہاں کے نغمے سے مردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں ؎

دگر سرود چناں کز خراش ہر زخمہ
چو چنگ خویش کند زہرہ نالہ و فریاد
عجب مباد اگر مردہ زندہ گردد ازآں
کہ نفخ در دل ہر نغمہ جان باز نہاد

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ہندی موسیقی ایک ایسی آگ ہے جو قلب و روح دونوں کو جلا دیتی ہے، اور دوسرے تمام ممالک سے بہتر ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر جب وہ رقاصاؤں کا نقشہ کھینچتے ہیں تب تو قیامت ہی سر پر ناچتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ رقاصائیں خضر خاں فرزند علاء الدین خلجی کی شادی میں بلائی گئی تھیں، آپ بھی کچھ سنیے کہ وہ کیسی تھیں۔

در ان کے مژگاں سے سینے چھلنی ہو جائیں، ان کی دزدیدہ نگاہوں سے غم کافور ہو جائے۔ وہ پلکیں جھپکائیں تو جوان ہائے کہ ٹھنڈے ہو جائیں اور نہیں تو جانیں تلف ہو جائیں۔ ان کے تل جیسے موتی کی ڈبیا، ان کے ابرو کی کمان پر جانیں قربان ان کے گیسوؤں میں ایسے پیچ و خم جیسے سانپ صندل میں لپٹا ہوا۔ ان کی نیم خواب و نیم بیدار آنکھوں کو دیکھ کر نیند حرام ہو جائے۔ ان کے دہن غنچہ کی طرح کبھی بند ہوں کبھی شگفتہ، ان کے زنخدان سیب جیسے، اگر ان کا سینہ دیکھیے تو اس میں ان کی ناز و ادا شامل ہو کر دکھائی دے ؎

بہ مژگاں نے بچے صد سینہ سفتہ
بچشم دلہا فرا خندہ و گفتہ

عرق کز روے مہ پر ملناز مے می ریخت
کرشمہ می چکید و ناز می ریخت

اسی سے ملتا جلتا انداز گانے والیوں کی تعریف میں ملتا ہے، اور موسیقی کی ایک ماہر دکنی خاتون ترتی کا ذکر بھی انہوں نے بڑے رومانی پیرائے میں کیا ہے۔

دیوگیری

ملک کافور کے قتل کے بعد دیوگیری کی حکومت دلی کے حلقۂ اطاعت سے نکل گئی تو ۱۳۱۸ء میں علاء الدین خلجی کا بیٹا مبارک شاہ قطب الدین لشکر لیکر دیوگیری پر حملہ آور ہوا۔ راجہ دیو کا نایب راگھو اور اس کا داماد راجپال پہاڑیوں میں چھپ گئے، مگر خلجی تلوار سے بچ نہ سکے۔ امیر خسرو بادشاہ کے ہمرکاب تھے انہوں نے اس معرکے کا حال نہ سپہر میں درج ہے، اور اس کے بعد جب لشکر دیوگیری سے ورنگل گیا تو وہاں بھی امیر خسرو موجود تھے؟ اس کا بیان بھی مثنوی میں موجود ہے۔ دیوگیری کا نام قطب آباد رکھا گیا۔ امیر خسرو ہی ہمیں بتاتے ہیں کہ قلعے دیوگیری کی دیواریں اتنی شفاف و عمودی تھیں کہ اس پر کیڑا بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔

"نہایت الکمال" امیر خسرو کا آخری دیوان ہے جس میں تغلق سلاطین کے قصائد ہیں، اس میں ایک مثنوی "در تعریف تغلق آباد" ہے جس میں دلی کی نئی آبادی کا ذکر ہے۔ مثنوی "تحفۃ الاوصاف" جو تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے اس میں قطب آباد (دیوگیری) کا حال درج ہے۔

امیر خسرو کا دوسرا سفر دکن غیر مستقلہ [illegible] انداز اس وقت ہوا جب غیاث الدین تغلق تخت دلی پر بیٹھا اس نے سلطنت کی [illegible] ترقی کو [illegible] کرنے کی خاطر ۱۳۲۱ء [illegible] بیٹے جونا خان محمد بن تغلق کو دکن کی مہم [illegible]

لیا، تا کہ دکن (تلنگانا) کے سرکش راجا پرتاب رُدر دیو کو دوبارا اپنا مطیع [illegible] - اب دیوگری پوری طرح دلی سلطنت [illegible] چکا تھا۔ شہزادا خنز لیں مارتا ہوا دیوگری پہنچتا ہے، اور پھر آگے نکل جاتا ہے۔ فتحیاب ہونے کے بعد جو قصیدا امیر خسرو نے اس کی شان میں کہا، وہ دیوان "بقیۃ النقیہ" میں ہے - ان کے انداز بیان سے قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ شاید خسرو ساتھ رہے ہوں، عجیب وجد آفریں انداز ہے -

دکن جنت کا نمونا

"گل وگلزار، شاد و آباد جیسے جنت شداد رستے اتنے صاف وشفاف پاک و پاکیزا کہ خدا رہتے ہیں کہ ہم اسلامی حکومت کی جنت ہیں اس کی خبرت سن کر رشک وحسد نے معرنے اپنا پیرہن اتار کے نیل کے دریا میں پھینک دیا۔ بغداد کا دل دو پارا ہو گیا ہے - ہوا ایسی خشگوار کہ اس دنیا میں اس کی مثال نہیں بلکہ دوسری دنیا میں ممکن ہے جس کا وعدا نیکوکاروں سے کیا گیا ہے ایسا معطر ہوا ہے کہ جس کی خشبو سے [illegible] پھولوں میں مہک جاگ اٹھتی ہے - ہر باغ [illegible] معلوم پڑتا ہے یہاں کے میووں اور پھلوں کا [illegible] یہاں پر [illegible] دنیا بھر کے میووں کے لیے باعث [illegible] یہاں کے سپیلے چاند کے چھلکے ہیں، اور [illegible] طرح نشاط اور لطف انگیز - آم اور [illegible] جیسے شہد اور دودھ سنہری سیبوں [illegible] اور یہاں ایک [illegible] پایا جاتا ہے جس کا نام تنبول [illegible] کر خشبو دار کرتا ہے، اور دل کو فرحت [illegible] یہاں موتی اور بیش قیمت نگینوں [illegible] شاید اب سمندر اور معادن میں [illegible] پیدا کرنے کی صلاحیت ہو [illegible] کا بیان مشکل ہے۔

اگر چاند کی جلد کو کوئی جلاد اس سے علحدا کر سکے اور پھر اس جلد سے دیوگیری (مہاراشٹرا) کے کپڑے کا موازنا کیا جائے تو یہ باریکی میں بازی جیت لیگا۔ اس کا سوگز سوئی کے ناکے میں سما سکتا ہے - یہ اتنا باریک ہے کہ جب لباس بنا کر پہنا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بدن پر صاف شفاف پانی پڑ رہا ہے -

بساں قطرۂ آبے تراش گفتن اگر
چکد ز چشمۂ خود قطرہ ہا معتاد۔

دکن کے شہروں کے علاوا امیر خسرو نے بعض ہندستانی قدیم قلعوں کا بھی ذکر کیا ہے، اور ان کی خوبصورتی، پائیداری اور تعمیری محاسن کو بیان کیا ہے - ایک قلعے کی تعریف یوں کرتے ہیں - وہ آسمان کی طرح بلند اور سنگ خارا سے منقش تھا - گویا ہندوؤں کی بہشت ہو در و دیوار کی تصاویر مانی کو شرمندا کرتی تھیں، پتھر کی سنگتراشی سے ایسی دیکھنے میں آئیں جو موم سے نہیں بنائی جا سکتیں۔ اس کے باغ میں کئی مندر تھے جن پر سونے چاندی کے کلس تھے -

جس طرح امیر خسرو نے شہر دیوگیری کی آبادی، جغرافیائی خوبیوں اور موسم کی دلکشی کا ذکر بار بار کیا ہے اسکے پیش نظر یہ نتیجا نکالنا غلط نہ ہوگا کہ جب محمد بن تغلق نے دیوگیری کو دارالسلطنت کی شکل دینی چاہی تو امیر خسرو کے پیش کردا خیالات کی پرچھائیں اسکے ذہن میں رہی ہو۔

"خزائن الفتوح" صرف فتح دکن و مہمات علاءالدین ہی پر مشتمل نہیں، بلکے اس میں بہت سے دلچسپ مباحث آ گئے ہیں - یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کی تصنیفات صلے اور انعام کی لالچ وطلب کے زیر اثر ظہور میں آئیں - وہ دنیا کو [illegible] سمجھتے تھے، اور زر و جواہر کو کنکر پتھر - انہوں نے کہا ہے کہ "میرا سخی بجائے خود ایک گنجینا ہے، اس کے سامنے گنج زر کی [illegible] - شاعری سے مجھے جو ملتا ہے وہ سب میں غربا میں بانٹ دیتا ہوں - اگر سلطان بھی زر و دولت [illegible] کا خزانہ [illegible] کا صلہ ہو گا۔"

انجمن ترقی ہندستانی کا ترجمان

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا دنیا کا واحد علمی ادبی ماہوار رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۶) جلد (۳۶) نمبر (۱۰ - ۱۱ - ۱۲)

شہریور - مہر - آبان سنہ ۱۳۸۵ف جولائی - اگست - ستمبر سنہ ۱۹۷۶ء

چندا سالانا سولا روپے

ہندستانی ادب

سعادت ولا - ۱۷ - ۱۱ - ۱۶ - سلیم نگر کالونی ۲ - ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶ - آندھرا پردیش - انڈیا

ایڈیٹر

جی - ام - خان، ام - اے (عثمانیا)

جی - ایم - خان نے دائرا پریس - چھتا بازار - حیدر اباد ۲ میں چھپوا کر
مکان نمبر ۱۷-۱۱-۱6 - سلیم نگر کالونی - ۱ - ملک پیٹ - حیدرابا ۳٦ سے شائع کیا -

ہمارے خیالات

عصمت چغتائی کی "لحاف" اور سعادت حسن منٹو کی "بو" کا نام ترقی پسندی ہے!

جیسا کہ جنید احمد نے اپنے مضمون "مشاہدے" میں لکھا ہے، انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں لندن میں ہوئی تھی، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

" ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ ۱۹۳۵ء میں ہندستانی طلبا نے لندن میں قایم کیا تھا۔ انجمن کے مینی فسٹو کا مسودا وہیں تیار ہوا، جس کی تیاری میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور سجاد ظہیر شامل تھے۔ ان کے ہم خیال ڈاکٹر محمد اشرف، محمود ظفر، ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر یوسف حسین خان اور ہتی سنگ ان سے پہلے ہندستان واپس آ گئے تھے۔

اس کے بعد جنید احمد نے یہ بھی لکھا ہے کہ "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا اعلان نامہ ہندستان میں ۱۹۳۶ء میں شایع کیا گیا، اور اس کے الفاظ حسب ذیل تھے، اور اس اعلان نامے کے الفاظ ملاحظہ کیجیے۔

" ہمارے ملک میں بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پرستی کو اگرچہ موت کا پروانا مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ روپ بدل کر یہ ہلاک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے، اس لیے ہندستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پسند رجحانات ابھر رہے ہیں، ان کی ترجمانی کریں، اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں۔"

آگے چل کر اس اعلان نامے کی اور بھی یوں وضاحت کی گئی ہے۔

" ہندستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر و قوا مضمحل ہو گئے ہیں۔ اس کا پتا اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں اقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔ ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کے ہلاک گرفت سے نجات دلائے، جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔"

انجمن ترقی پسند مصنفین کے اعلان نامے میں اور جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے، ہم اس کی لفظ بہ لفظ تائید کرتے ہیں اور نیچے اس سلسلے کی کڑی کے طور پر جو بھی بیان کیا گیا ہے، اس سے بھی ہمیں پورا پورا اتفاق ہے، چنانچہ اعلان نامے کا باقی حصہ ان الفاظ میں شروع ہوتا ہے۔

" ہم ہندستانی تمدن کی اعلا ترین روایتوں کے وارث ہو جانے کا دعوا کرتے ہیں، اس لیے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل کے آثار پائیں گے انہیں اخذ کریں گے، ہم اس انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان کا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسایل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسایل ہیں ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھار رہی ہیں، اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، اور ترقی کا ذریعہ فراہم کرتی ہیں۔"

اس کے بعد انجمن کے مقاصد ان الفاظ میں گنائے گئے ہیں۔

" (۱) [illegible]

(۲) ترقی پذیر مضامین پر لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا، اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

کانفرنس کے اوپر گنائے گئے چار اہم مقاصد سے ہمیں اختلاف نہیں، بلکہ خود ہم بھی ان سے پورا پورا اتفاق کرتے ہیں۔ اس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی ایک دوسری کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی تھی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انہوں نے زریں خیالات ظاہر کیے تھے، اور وہ خیالات یہ ہیں۔

"ادب آرٹسٹ کے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے، اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں، وہ ہم میں وفا، خلوص، اور ہمدردی، انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو و نما کرتا ہے، زندگی ہے، جہاں اس کا فقدان ہے، وہاں افتراق و خود پروری ہے، ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے، اس کی بدولت نفس کی تحریک ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے۔"

کتنے ہی اعلیٰ درجے کے اور بلند پایہ خیالات ہیں پریم چند کے۔ سوال یہ ہے کہ آیا انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس کے مقلدین یا پیروؤں نے ان اصولوں پر عمل بھی کیا یا نہیں۔ جواب نفی میں ملتا ہے کہ نہیں۔ اگر ان پر عمل کیا ہوتا ساری دنیائے ادب اس کی مقلد اور پیرو بن جاتی اور ہم خود بھی اس سے اختلاف نہ کرتے، اور مضمون "مشاہدے" کے مضمون نگار، جنید احمد بھی اس سے اختلاف نہ کریں، چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون کے شروع ہی میں لکھا ہے کہ "مجھ سے یہ بھی پوچھا گیا کہ ترقی پسند ادیب اور شعرا جن سے میں بہت قریب رہا ہوں، آخر ان سے گریز کیوں کیا۔۔۔؟" گریز اس لیے کیا کہ ترقی پسندی کے نام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی پسند ادیب "لحاف" اور "بو" جیسے گندے افسانے لکھنے لگے، جن کے پڑھنے کے بعد گردن شرم سے جھک جاتی ہے، اور ترقی پسند ادیب سے سخت ترین نفرت ہونے لگتی ہے۔ جن لوگوں نے عصمت چغتائی کا افسانہ "لحاف" پڑھا ہوگا، وہ بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ ترقی پسندی کی آڑ میں اس بداخلاق اور بدتمیز عورت نے اخلاق بدتمیزی کا مظاہرہ کر کے ترقی پسند ادب کو بدنام کر دیا ہے، اور بالکل اسی طرح جن حضرات نے سعادت حسن منٹو کا افسانہ "بو" پڑھا ہوگا، وہ بھی بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ منٹو نے اپنے افسانے "بو" میں بداخلاقی اور بدتمیزی کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ صرف ان دونوں پر ہی منحصر نہیں، بلکہ ہندستان کے عموماً اور بمبئی کے خصوصاً پچاسوں ہی افسانہ نگاروں نے ترقی پسند ادب کے نام سے ایسے ہی گندے، لچر، پوچ اور حیا سوز قسم کے افسانے لکھنا شروع کر دیے تھے۔ اس لیے بعض قسم کے لوگوں کو ترقی پسند ادب سے نفرت ہو چلی تھی، جن میں ہم خود بھی شامل ہیں۔

جنید احمد نے حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا ذکر تو کیا ہے، لیکن سنہ نہیں بتایا ہے۔ اس کانفرنس کا سنہ ہم بتلائے دیتے ہیں۔ یہ کانفرنس ۱۹۴۲ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بانیوں میں عابد علی خاں، عالم خوندمیری، اور اختر حسن جیسے نوجوان تھے۔ یہ تینوں اور ان کے ہم خیال نوجوان احباب ترقی پسندی کی لپیٹ میں آگئے، اور انجمن ترقی پسند مصنفین (شاخ حیدرآباد) بنا ڈالا۔ اس کی پہلی کانفرنس ریڈی ہاسٹل، گل باغ میں ہوئی تھی۔ مقررین میں ان لوگوں نے ہم کو بھی منتخب کیا۔ عابد علی خاں خود تو نہیں آئے، بلکہ عالم خوندمیری اور اختر حسن کو ہمارے گھر بھیجا یا کہ ہم بھی اس پہلی کانفرنس میں تقریر کریں۔ ہمارا رسالہ "ہندستانی ادب" جو ۱۹۴۱ء میں جاری ہوا تھا، اس لیے اس سنہ میں ہم اپنے آبائی مکان اور محلہ چپل گوڑہ سے نئے محلے اعظم پورا شرقی (یہ نام ہم نے دیا تھا) میں منتقل ہو چکے تھے، اور یہ دونوں بھی ہمارے نئے مکان سے واقف تھے، اسی لیے عالم اور اختر دونوں مل کر کانفرنس سے ایک ہفتہ پہلے ہمارے گھر آئے تھے اور کانفرنس میں شرکت اور تقریر کرنے کی خواہش ظاہر کی، اور صدر انجمن عابد علی خاں کا پیام بھی پہنچایا، اور یہ کہا کہ [illegible] مصروفیتوں کے باعث وہ خود آپ کے گھر نہ آ سکے، اس لیے انہوں نے ہم سے کہا کہ ہم ان کی طرف سے آپ کو [illegible] آپ اس کانفرنس میں ضرور بالضرور شریک ہوں، اور وہاں اپنے خیالات کا اظہار بھی کریں۔ ہمیں کانفرنس [illegible] کرنے کے لیے مدعو کرنے کی اصل وجہ یہ تھی بلدیہ، یا میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد کے

اجلاسوں میں ہماری تقریری ہنگامہ آرائیوں کی شہرت اور دھوم تھی - اجلاس کے دوسرے ہی روز حیدرآباد کے روزنامہ اخبار ہماری تقریروں سے بھرے پڑے رہتے تھے - اس وقت کا کارپوریشن صرف (۳۶) ارکان پر مشتمل تھا - (۲۳) سرکاری نامزد تھے' اور (۱۳) ارکان (۱۳) حلقوں کی نمائندگی کرتے تھے - ہمارے دور میں حزب مخالف یا OPPOSITION کا وجود ہی نہیں تھا' مگر ہم اور نواب میر احمد علی خان ہر وقت اور ہر مسئلے میں بجا طور پر بعض مسائل کی مخالفت میں تقریریں کرتے تھے - ہم سب ارکان ۱۹۳۶ء میں صرف تین سال کے لیے منتخب ہوئے تھے' لیکن ۱۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالم جنگ چھڑ گئی تو ۱۹۴۲ء میں زمانے کے ذریعے ایک ایک سال کی توسیع ملتی رہی' اس طرح ہم بلدیہ میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک پورے چھ سال تک رہے - احمد علی خان پورے چھ سال تک نہیں رہے' بلکہ ناظم بلدیہ سے تحت اختلافات کی بنا پر بطور احتجاج یا PROTEST سنہ ۱۹۴۱ء میں استعفا دیدیا تھا - اس کے بعد ان کے حلقے سے ایک دوسرے رکن منتخب ہو کر آئے' مگر مخالفت میں انہوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا - حلقہ (و) کے منتخب رکن کے مرجانے کے باعث اس حلقے کا پھر سے انتخاب ہوا' اور عبدالرحمان رئیس (عثمانیا) ایڈیٹر روزنامہ اخبار "وقت" منتخب ہو کر آئے - رئیس کے ہمارے قدیمانہ دوستانہ تعلقات تھے' اور یہ ہم سے بھی زیادہ دھواں دھار تقریریں کرتے تھے' اس لیے ہمارے ان کے ستارے مل گئے تھے' اور ہم دونوں بجا طور پر مخالفت میں تقریریں کرتے ناظم بلدیہ یا میونسپل کمشنر کی بری طرح سے خبر لیتے تھے' چونکہ رئیس کی تقریروں میں سنجیدگی نہیں ہوتی تھی' اس لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں نے عبدالرحمان رئیس ایڈیٹر "وقت" کو مدعو نہیں کیا' بلکہ ہماری سنجیدگانہ مخالفت اور تقریری شہرت کے باعث ہمیں خاص طور پر مدعو کیا تھا -

عالم خوندمیری اور اختر حسن دونوں سے ہماری بے تکلفی تھی اس لیے بعض ترقی پسند مصنفین خصوصیؔ عصمت چغتائی کی "لحاف" اور سعادت حسن منٹو کی "بو" کی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان دونوں کا اور ان کی ترقی پسندی کا بری طرح سے مذاق اڑایا' لیکن اس کے باوجود ان دونوں نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم کانفرنس میں ضرور شرکت کریں' اور اپنے خیالات کا اظہار وہاں اپنی تقریر میں کریں - ہم نے ان سے دریافت کیا' کانفرنس میں شرکت کے لیے آپ نے اور کن حضرات کو مدعو کیا ہے' انہوں نے جواب دیا کہ مدعو تو بہت سے حضرات کو کیا ہے' اور مہمان خصوصی قاضی عبدالغفار ایڈیٹر "پیام" رہیں گے - ہم نے کہا کہ ہم اس شرط پر آتے ہیں کہ سب سے آخر میں ہم تقریر کریں گے' انہوں نے ہماری شرط منظور کرلی' اور ہم حسب وعدہ کانفرنس کے روز ریڈی ہاسٹل گئے - قاضی صاحب سے پہلے ہی سے ہماری ملاقات تھی' اس لیے ان کے بازو بیٹھ گئے' اور ہماری ان کی باتیں ہوتی رہیں' موضوع بلدیہ اور ہماری دھواں دھار تقاریر تھیں - کانفرنس کی صدارت کسی اور صاحب نے کی تھی (۳۴) سال بعد ہمیں ان کا نام یاد نہیں آتا - ڈائیس پر صدر جلسہ کے علاوہ' قاضی عبدالغفار' اور ہم اور بانیان کانفرنس عابد علی خان' عالم خوندمیری اور اختر حسن وغیرہ بیٹھے تھے - عابد علی خان اس نئی انجمن کے بانی سکریٹری تھے' اس لیے انہوں نے سب سے پہلے تقریر کی' اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کس طرح سے لندن میں اس انجمن کی ابتدا ہوئی تھی' اس کے بعد لکھنؤ میں بھی ایک کانفرنس ہوئی تھی' اور بمبئی میں بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کام ہو رہا ہے - اس کے بعد عالم خوندمیری اور اختر حسن نے بھی اپنی تقریروں میں اس بات کو دہرایا' اور حیدرآباد میں ایک ایسی انجمن کی ضرورت پر زور دیا' اور دوسرے نوجوانوں نے بھی تقریریں کیں' جن کے نام ہمیں یاد نہیں ہیں - صدر جلسہ نے قاضی صاحب سے تقریر کرنے کی درخواست کی تو قاضی صاحب نے بھی کھڑے ہو کر تقریر کی اور [illegible] انجمن ترقی پسند مصنفین کے سلسلے میں کیا ہو رہا ہے [illegible]
[illegible] انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد کو مبارکباد دیتے ہوئے [illegible]

ضرورت جتائی۔ قاضی صاحب کے بعد صدر جلسا نے ہم سے اپنے خیالات ظاہر کرنے کی خواہش کی تو ہم کھڑے ہوے، اور صدر جلسا، اور بانیان کانفرنس، اور حاضرین جلسا کو مخاطب کرتے ہوے کہا کہ ابتدا میں بانی کانفرنس اور سکریٹری عابد علی خان، عالم خوندمیری، اختر حسن، اور دوسرے مقرروں نے، نیز قاضی عبدالغفار صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ابتدائی تاریخ اور پھر لکھنؤ اور بمبئی میں کانفرنسوں اور ہندستان کے دوسرے شہروں میں اس کے کارناموں سے ہم ناواقف نہیں ہیں، اس لیے کہ انگریزی زبان کے روزانا اخباروں کے علاوا، ہم متعدد ہندستانی زبان کے رسالوں کا باقاعدا مطالعا کرتے ہیں۔ لندن میں جو ابتدائی کانفرنس ہوئی تھی، اور اس میں جو اغراض و مقاصد گنائے گئے تھے، ان سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے، اس کے بعد ہندستان میں، لکھنؤ میں، منشی پریم چند کی صدارت میں سنہ ۱۹۳۶ء میں جو کانفرنس ہوئی تھی، اور اپنے خطبۂ صدارت میں پریم چند نے جن زرین خیالات کا اظہار کیا، اس سے بھی ہم متفق ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ آیا ترقی پسند تحریک کے پیرو ان زرین اصولوں اور خیالات کو عملی جاما پہنا بھی رہے ہیں یا نہیں؟ ہم نے کہا کہ بمبئی اور ہندستان کے دوسرے شہروں میں ترقی پسند مصنفین اور افسانا نگاروں کے افسانے پڑھ کر ہم شرم سے زمین میں گڑے جاتے ہیں، اور خاص طور پر اس وقت ہم نے عصمت چغتائی کے مشہور افسانے "لحاف" اور سعادت حسن منٹو کے بھی دوسرے مشہور افسانے "بو" کی مثالیں پیش کیں۔ اور صدر جلسا، بانیان کانفرنس، اور خصوصاً قاضی صاحب سے سوال کیا کہ محترم آپ ہمیں اس وقت جواب دیں کہ آیا اس کا نام ترقی پسندی ہے۔ ہم نے کہا، اسے ترقی پسندو، صرف انہیں دو افسانوں پر منحصر نہیں ہے، بلکہ نام نہاد ترقی پسندوں کے تمام رسالے ایسے ہی گندے اور ناپاک لٹریچر سے بھرے پڑے ہیں۔ ہم نے کہا کہ "ہندستانی ادب" کو جاری ہوے ابھی ایک سال ہوا ہے، اور ہم نے اس ایک سال کے عرصے میں اپنے رسالے میں پچاسوں ہی افسانے شایع کیے ہیں، لیکن ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ آج تک ہم نے ایک بھی ترقی پسند مصنف کا کوئی بھی افسانا شایع کیا، اور آج ہم اس اسٹیج پر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ جب تک "ہندستانی ادب" جاری ہے، اور جب تک ہم زندا ہیں "ہندستانی ادب" کے پاک دامن کو ایسی گندگی سے آلودا نہ ہونے دینگے۔ اس نوبت پر ہمیں دلی مسرت اور خوشی سی محسوس ہو رہی ہے کہ ہم نے اپنے پہلے وعدے اور مشن کو پورا کیا، اور آج (۳٦) سال بعد بطور گواہ یہ کہنے کے لیے زندا ہیں کہ "ہندستانی ادب" کی (۳٦) جلدوں میں، اور ہر جلد کے بارا نمبروں میں آپ ایک بھی ایسا ناپاک افسانا نہیں پائینگے، جس میں گندگی اور عریانی بھری ہوئی ہو! بعض وقت ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر ہمیں کوئی معیاری اور اچھا افسانا نہیں ملا تو ہم نے وہ نمبر بغیر افسانے ہی کے شایع کر دیا۔

قاضی صاحب تو چل بسے، مگر سنہ ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانی اور پہلے سکریٹری عابد علی خان، ایڈیٹر "سیاست" اور عالم خوندمیری، نیز اختر حسن تو حیدرآباد ہی میں بقید حیات ہیں۔ اس نوبت پر ہم ان سے سوال کرتے ہیں کہ اگر ان کی یہ تحریک اچھی تھی تو اسی کو انہوں نے جاری کیوں نہیں رکھا؟ اپنے روزانا اخبار "سیاست" کے ذریعے اس کا پرچار کیوں نہیں کرتے؟ اختر حسن اور عالم خوندمیری اس اخبار میں مضامین کیوں نہیں لکھتے؟ جو ان تینوں بانیان انجمن کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ ہمارے قول کے مطابق اس انجمن کے اصول اور ہی اصول کے اصول ہیں، اسی لیے ان لوگوں نے نہ صرف کنارا کشی کر لی، بلکہ اس انجمن کو ہی اسے نکال دیا ہے!

کہیے جنید احمد! آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں - آیا پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ کہ بھی نہیں، میرا تو تعلق نام نہاد انجمن ترقی پسند مصنفین ہی سے ہے - !

جنید احمد نے اپنے اس مضمون میں لکھا ہے کہ بابائے اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے حیدرآباد کی کانفرنس میں شرکت کی تھی - یہ سراسر غلط اور سو فیصد جھوٹ ہے - ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس کانفرنس میں ہم خود ہی شریک تھے جس میں ہمارے علاوہ، دوسرے بڑے آدمی صرف قاضی عبدالغفار، ایڈیٹر "پیام" نے شرکت کی تھی، باقی تمام شرکائے کانفرنس حیدرآباد کے نام نہاد ترقی پسند افراد وغیرہ تھے - اس کانفرنس کے سلسلے میں ہندستان کے بعض مشہور شخصیتوں کے بیانات بھی آئے تھے، جن میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کا پیام بھی تھا - یہ تمام بیانات کانفرنس کے بانی اور سکریٹری عابد علی خان نے پڑھ کر سنائے تھے - ٹیگور کا پیام ملاحظہ ہو

"آج ہمارا ملک ایک لق و دق صحرا ہے، جس میں شادابی اور زندگی کا نام و نشان تک نہیں ہے - ملک کا ذرا ذرا دکھ کی تصویر بنا ہوا ہے - ہمیں تو اس غم و اندوہ کو مٹانا ہے، اور از سر نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے - ادیب کا فرض ہے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے - بیداری اور خوشی کے گیت گائے - انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سنائے، اور کسی کو ناامید اور ناکام نہ ہونے دے - ملک اور قوم کی بہی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض ہونا چاہیے - قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سرگرمیاں جب تک ہر انسان خوددار نہ بنے اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا، اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تم کو پہلے اپنی متاع کھلے ہاتوں لٹانی ہوگی، اور پھر کہیں تم اس قابل ہوگے کہ دنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو، لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ -"

آگے چل کر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے یوں نصیحت فرمائی ہے -

"کہ تخلیقی ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے - سچائی اور حق کی تلاش کرنا ہے تو پہلے "انا" خود پرستی کی کینچلی کو اتار دو - کیل کی طرح سخت ڈھنڈل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو - پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سہانی ہے، اور پانی کتنا لطیف ہے -"

اس کے بعد ہم نیچے مولوی عبدالحق کا پیام بھی دیے دیتے ہیں، مولوی صاحب فرماتے ہیں -

"ترقی پسند جماعت کو اپنے نقاصد کے عمل میں لانے کے لیے اخلاقی جرات سے کام لینا ہوگا - اگر آپ نے مقبولیت یا ہر دلعزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے کے لیے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے -"

دیکھا جنید احمد آپ نے مولوی عبدالحق نے تو ترقی پسندوں کو شال میں لپیٹ کر گن گن کر یعنی ایک، دو، تین، دس، اور ہزاروں جوتے مارے ہیں - ان کے پیام کے ہر ہر لفظ سے ترقی پسندوں کے حق میں غضب آلودگی اور غصہ ٹپک رہا ہے - غور فرمایا آپ نے ترقی پسند دوسروں کو یعنی خود مولوی عبدالحق کو رجعت پسند کہتے تھے تو انہوں نے خود ترقی پسندوں کو رجعت پسند قرار دے کر ان کی ترقی پسندی کا ناس کر دیا ہے!

ہوش سنبھالو جنید احمد کہ تم کہتے ہو کہ مولوی عبدالحق نے ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں اپنے خطبے میں نصیحت فرمائی تھی - عبدالحق کا ترقی پسندوں کی کسی بھی کانفرنس میں [illegible] ہوا تک نہیں لگنے دیتے تھے اور یہی کان کھول

سنو جنید احمد کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں جب مولوی عبدالحق، صدر شعبۂ اردو تھے، روزانا ام - اے ابتدائی اور آخری دو نوں کو دو گھنٹے پڑایا کرتے تھے - جہاں ام - اے اور بی - اے کی تعلیم ہوتی تھی اس کا نام "بیلی منزل" تھا، اور مولوی صاحب نے اس کو "بھوت منزل" کا نام دیا تھا - اس منزل اور باغ عام کے درمیان صرف سڑک حایل تھی - صرف پانچ منٹ میں طلبا باغ عام پہنچ جایا کرتے تھے، اور مولوی صاحب اپنے مکان بنجارا ہلز سے اپنی موٹر میں باغ عام پہنچ جایا کرتے تھے - مولوی عبدالحق بڑے ہی با اصول شخص تھے، وہ خود بھی وقت کی پابندی کرتے تھے، اور طلبا کو بھی ہدایت تھی کہ ہر وقت پابندی کا لحاظ رکھیں - وہ ام - اے کے دونوں سال کے کورس کی کتابیں روزانا اپنے ساتھ ضرور لایا کرتے تھے، وہ کتابیں ان کا شوفر مولوی صاحب کے سامنے لاکر رکھ دیتا تھا لیکن مولوی صاحب نے کبھی بھی کتاب کھولنے کی زحمت گوارا نہیں کی - ہمیشا زبانی ہی لکچر دیا کرتے تھے - لکچر کے دوران موقع محل سے انجمن ترقی پسند مصنفین اور ترقی پسندوں کے ادب کا مذاق اڑایا کرتے تھے، اور کہتے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیا بک رہے ہیں، اور پاک ادب پر کیسی گندی کیچڑ اچھال رہے ہیں - معلوم ہوتا ہے، ان کے دماغوں کے تہوں میں تک گندگی بس گئی ہے - تم لوگ بمبئی کے ہفتا وار اور ماہوار رسالے ضرور پڑتے ہونگے، اور تم نے ان رسالوں میں گندے افسانے بھی پڑھے ہونگے، یہ لوگ ترقی پسندی کی آڑ میں فحشیات پر اتر آے ہیں، مجھکو تو ان کی ایسی ترقی پسندی سے گھن سی آتی ہے!

ترقی پسند جماعت، ترقی پسندوں، اور ترقی پسند ادب کے بارے میں مولوی عبدالحق کے اوپر گنا ے گئے نفرت آمیز خیالات کے بعد اب آپ کا کیا خیال ہے جنید احمد، یعنی مرغ کی ایک ٹانگ، جی نہیں مولوی صاحب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں شرکت کی تھی، اور انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں یوں نصیحت فرمائی تھی!

جنید احمد! آپ کا منبع علم مانگے تانگے کے رسالوں سے لیے گئے بے بنیاد خیالات ہیں، اور ہم مولوی عبدالحق کے ایک معتقد شاگرد کی حیثیت سے کئی سال بعد موقع محل سے مولوی صاحب کے خیالات اور جذبات کو بطور ثبوت پیش کر رہے ہیں!

جنید احمد کے علاوا ہم دوسرے نام نہاد ترقی پسندوں اور ترقی پسندی کے جھوٹے علمبرداروں سے بھی سوال کرتے ہیں کہ آخر ان کی بے معنی اور لغو و مہمل ترقی پسندی کس چڑیا کا نام ہے؟ اس ترقی پسندی سے ان کا کیا مطلب اور مفہوم ہے؟ کیا ہم ترقی پسند نہیں ہیں؟ کیا ہمارا رسالا ترقی پسندی کا حامل نہیں ہے - ہم میں اور ہمارے لاجواب اور بے مثال رسالے میں کونسی رجعت پسندی ہے - اگر ان نام نہاد ترقی پسندوں کے دماغ اور قلم میں اتنی صلاحیت ہے تو اپنے کسی بھی اردو کے چاہے روزانا ہو یا ہفتا وار، ماہوار یا سہ ماہی میں ہمارے رجعت پسندانا عمل اور ہمارے (۳۶) سالا قدیم رسالے کی رجعت پسندی کو ایک ایک کرکے گنائیں تو ہم قایل ہو جائینگے اور ہار مان لینگے!

"ہندستانی ادب" پایندا باد!

جنید احمد

مشاہدے

مشاہدات کے عنوان سے تیس قسطوں کے
مضامین انقلاب میں اور دو "صبح امید" میں شایع
ہوئے۔ کئی سال گذر گئے۔ ان میں سے بعض
مضامین پر بحث بھی ہوئی۔ مجھ سے یہ بھی پوچھا
گیا کہ ترقی پسند ادیب اور شعرا جن سے میں
بہت قریب رہا ہوں آخر ان سے کیوں گریز
کیا۔ دراصل یہ میرا گریز نہیں تھا، بلکہ میں
ترقی پسند تحریک پر تفصیلی مضمون لکھنا چاہتا
تھا جس کے لیے مجھے ہزاروں صفحات کا دوبارا
مطالعہ ضروری تھا۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء
میں شروع ہوئی تھی۔ پندرہ بیس برس جتنا
اور جیسا لکھا گیا اس کا جائزہ کتابی شکل میں
تحریک کے موافق اور مخالف میں دونوں جانب
سے کئی جلدیں شایع ہو چکی ہیں، لیکن پڑھنے
والوں کا ایک بڑا حلقہ ایسا ہے جس کی نظروں
سے وہ کتابیں نہیں گذریں۔ کتنے ایسے ہیں
جن کی مصروفیتیں سینکڑوں صفحات کی کتابیں
پڑھنے میں مانع آتی ہیں۔ اس لیے مختصر مضمون
کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جوں جوں انسانی زندگی آگے بڑھتی جاتی
ہے نئے نئے مسایل اور نظریات وجود میں آتے
ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی سرگرمیاں ختم ہوئی
تھیں کہ پچھلے دس بارا برسوں سے جدید ادب
کے [illegible] نہ صرف نثر و نظم لکھی جانے لگیں،
بلکہ فنون لطیفہ کی دوسری شاخیں مصوری اور
رقص میں بھی نئے تجربے ہمارے سامنے آنے
لگے۔ جدیدیت کیا ہے؟ جدید ادب کیا ہے؟
اس پر سیمینار منعقد ہوئے، مضامین لکھے گئے
کتابیں شایع ہوئیں، لیکن جدیدیت کے نہ
تو اصول مرتب کیے جا سکے اور نہ واضح تشریح
ہوئی۔ جدیدیت کو ایک نیا رجحان بتایا گیا ہے۔
فی الحال ہماری گفتگو ترقی پسند تحریک
اور ادب سے ہے تو پہلے ترقی پسند مصنفین کا
اعلان نامہ دیکھیے۔

ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ ۱۹۳۵ء
میں ہندستانی طلبا نے لندن میں قایم کیا تھا۔
انجمن مینی فسٹو کا مسودا وہیں تیار ہوا، جس
کی تیاری میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک
راج آنند، پرمود سین گپتا، ڈاکٹر محمد دین
تاثیر اور سجاد ظہیر شامل تھے۔ ان کے ہم خیال
ڈاکٹر محمد اشرف، محمود ظفر، ڈاکٹر رشید جہاں،
ڈاکٹر یوسف حسین خان بھی [illegible] ان سے
پہلے ہندستان واپس آ گئے تھے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ ہندستان
میں ۱۹۳۶ء میں شایع کیا گیا، اور اس کے الفاظ
حسب ذیل تھے۔

ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی
ہیں۔ پستی اور رجعت پرستی کو اگرچہ موت کا

پروانا مل چکا ہے، لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے، اس لیے ہندستانی مصنفین کا فرض ہے کہ ملک میں جو نئے ترقی پسند رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں، اور ان کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں۔

ہندستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر و قوا مضمحل ہو گئے ہیں۔ اس کا پتا اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں اصلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔ ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کے مہلک گرفت سے نجات دلائے، اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے، جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔

ہم ہندستانی تمدن کی اعلا ترین روایتوں کے وارث ہو جانے کا دعوا کرتے ہیں، اس لیے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل کے آثار پائیں گے انہیں افشا کریں گے، ہم اس انجمن کے ذریعے سے ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب و تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندستان کا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں، ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے۔

(۱) تمام ہندستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشورتی جلسے منعقد کرکے اور لٹریچر شائع کرکے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

(۲) ترقی پذیر مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا، اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد اہلِ ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

(۳) ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

(۴) آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے اپریل میں لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ انہوں نے اپنے خیال کی وضاحت ان الفاظ میں کی۔ ادب آرٹ سے روحانی توازن کی ظاہری صورت ہے، اور ہم آہنگی حسن کی تخلیق کرتی ہے، تخریب نہیں، وہ ہم میں وفا، خلوص اور ہمدردی، انصاف اور مساوات کے جذبات کی نشو و نما کرتی ہے، جہاں یہ جذبات ہیں وہیں استحکام ہے، زندگی ہے، جہاں ان کا فقدان ہے وہاں افتراق و خود پروری ہے، ادب ہماری زندگی کو فطری اور آزاد بناتا ہے، اس کی بدولت نفس کی تہذیب ہوتی ہے۔ یہ اس کا مقصد اولیٰ ہے

مولوی عبدالحق نے ترقی پسند مصنفین کی ایک کانفرنس میں اپنے خطبے میں نصیحت فرمائی۔

"ترقی پسند جماعت کو اپنے مقاصد کے عمل میں لانے کے لیے اخلاقی جرأت سے کام لینا پڑے گا۔ اگر آپ نے مقبولیت یا ہردلعزیزی یا کسی قسم کی امداد حاصل کرنے کے لیے یا اپنی تعداد بڑھا کر دکھانے کی خاطر ذرا بھی رجعت پسندی کی طرف میلان ظاہر کیا تو یاد رکھیے کہ معقول پسند اور حقیقی ترقی پسند لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں گے۔"

ترقی پسند مصنفین نے ٹیگور سے ملاقات میں اپنے خیالات کی وضاحت کی تھی اور اپنی کانفرنس کے لیے پیغام کی درخواست کی تو انھوں نے یہ تحریر بھیجی۔

"آج ہمارا ملک ایک لق و دق صحرا ہے جس میں شادابی اور زندگی کے تمام نشانات [illegible] ہے۔ [illegible] کا خوراک اور ذرائع کی تعمیر [illegible]

اس غم و اندوہ کو مٹانا ہے، اور از سر نو زندگی کے چمن میں آبیاری کرنا ہے۔ ادیب کا فرض ہونا چاہیے کہ ملک میں نئی زندگی کی روح پھونکے۔ بیداری اور خوشی کے گیت گائے۔ انسان کو امید اور مسرت کا پیغام سنائے اور کسی کو ناامید اور ناکارا نہ ہونے دے۔ ملک اور قوم کی بھی خواہی کو ذاتی اغراض پر ترجیح دینے کا جذبہ چھوٹے بڑے میں پیدا کرنا ادیب کا فرض ہونا چاہیے۔ قوم سماج اور ادب کی بہبودی کا سوگند جب تک ہر انسان نہ اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا، اگر تم یہ کرنے کے لیے تیار ہو تو تم کو پہلے اپنی قناعت کھلے ہاتھوں لٹانی ہوگی، اور پھر کہیں تم اس قابل ہو گے کہ دنیا سے کسی معاوضے کی تمنا کرو، لیکن اپنے کو مٹانے میں جو لطف ہے اس سے تم محروم نہ رہ جاؤ۔"

"یاد رکھو کہ تخلیقی ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ سچائی اور حسن کی تلاش کرنا ہے تو پہلے "انا" خدپرستی کی کینچلی کو اتار دو۔ کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو۔ پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے، روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔"

ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کو پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی خطاب کیا تھا۔

ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے اپنے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے رکھے تھے، اس میں نہ کسی سیاسی جماعت کی، لیکن یہ صحیح ہے کہ اشتراکی خیال کے ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کے لیے بہت کام کیا، بہت ایثار کیا، سختیاں جھیلیں، بعضوں نے دس پندرہ برس معاشی تکلیفوں کو غیر معمولی صبر سے برداشت کیا۔ شراب اور جنسی بداعتدالیوں سے اپنا دامن محفوظ رکھا۔ عطیات اور چندے کو کبھی ذاتی صرف میں نہیں لائے۔ بعض ادیبوں میں روایتی منشا نے اور شعرا میں غزل کے معیار کو بلند کرنے کی صلاحیتیں تھیں، لیکن انہوں نے یہ طے

کر لیا تھا کہ ایسے افسانے اور نظمیں لکھیں گے جنہیں عام طالب علم، مزدور اور کسان سمجھ سکیں، اور ان میں واقعی مسائل کی جھلک ہو۔

ایسے ادیب اور شعرا اگر بلند خیالی ندرت اور طرز ادا ہی پر نظر رکھتے تو زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل کرتے، لیکن انہوں نے مقصدیت اور عوام کے فائدے کو ترجیح دی۔ نوجوانوں میں ترقی پسند ادیب اور شاعر بھی بہت مقبول ہوئے۔ شہرت کا بھی نشہ ہوتا ہے اور اس سے بچنا مشکل کام ہے۔ شاگردوں نے استادوں کا محاسبہ کیا، ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور نیاز فتحپوری کو رجعت پرست کہا، الفاظ میں اتنی تلخی اور شدت تھی کہ دونوں بزرگ جلسے سے اٹھ کر چلے گئے۔

بعض نے اقبال اور ٹیگور کو بھی رجعت پرستی کی پرچھائیاں پڑتی دکھائی گئیں۔ اختر الایمان کو مستند ترقی پسند نہیں سمجھا گیا۔

ہندستان میں جہالت، تعصب، بے روزگاری افلاس آج بھی کچھ کم نہیں ہے، لیکن جن ادیبوں نے اپنے کردار کو ڈسپلن کا پابند بنایا تھا آج وہ کسی نہ کسی سرمایہ دار سے منسلک ہیں۔ سادگی جنہوں نے اپنا شعار بنایا تھا شراب کے بغیر کوئی شام ان کی نہیں گذرتی۔ انقلاب، مزدور اور کسان جن کے موضوع تھے، تصوف، بھگتی، مرثیہ نگاری، اخلاق اور روحانیت پر بصیرت افروز مضامین ان کے قلم سے ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

فنون لطیفہ کے متعلق اگر یہ بیان درست ہے کہ دوئم درجے کی کوئی جگہ نہیں تب تو ہندستانی ادب میں میر، غالب، مومن، اقبال، اصغر، ابوالکلام اور رشید احمد صدیقی کے بعد فیض، فراق، اختر الایمان، منشی پریم چند، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور قرۃ العین کے سوا تو بمشکل اور ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہیں۔

ہندستانی زبان کا ساری دنیا میں بول بالا ہو!

شہریور۔ مہر۔ آبان ۱۳۸۵ ف — ہندستانی ادب — جولائی۔ اگست۔ ستمبر ۱۹۶[illegible]ء

عصمت چغتائی

چارپائی

میرن میاں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے اس طرح زناٹے کے ساتھ نکلے جیسے بندوق سے گولی۔ ڈگمگاتے ہوئے وہ مسجد کی سیڑھیوں پر ڈھے گئے۔ ان کے چہرے پر یتیمی سی برس رہی تھی۔ گلی کے کتے نے ان سے چھیڑ خانی کرنے کی کوشش کی، مگر انہوں نے تمتما کر ایسی لات رسید کی کہ وہ بھنبھناتا ہوا سرکہ والے کی دوکان کی سیڑھی کے نیچے دبک گیا۔

مرزا اپنے اسٹور میں تالا مار کر میرن میاں کو نرم نرم نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے میرن میاں؟" مرزا نے کندھے پر پڑے ہوئے رومال سے سیڑھی پر وار کیا اور میرن میاں کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

میرن میاں نے ایک لمبی سی ڈور مغلظات کی کھینچی اور اپنے خضاب آلود بالوں کو جھٹکے دینے لگے۔

"اس کی بہن — چارپائی ٹوٹ گئی۔"

"چارپائی؟"

"تم نہیں سمجھو گے میاں۔"

مرزا نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی، اور میرن میاں کو تھمادی اور دوسری اپنے لیے کھینچنے لگے۔ دو چار کش لے کر میرن میاں نے تمام سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بڑی حسرت سے بولے۔ "اجی کمبخت ہو صاحب نادے،

اونٹ پہاڑ کے نیچے نہیں آیا۔ میری مانو تو بیٹے کبھی بھول کر بھی بیاہ نہ کرنا۔"

"مگر بی اماں ہر خط میں لکھتی ہیں، بیٹا تیرے سہرے کے پھول میرے جیتے جی وغیرہ وغیرہ۔"

"جی — اور؟"

"وہی پوتا کھلانے کا ارمان۔ بس یہی دو چار ہتھکنڈے ہیں جنہیں دنیا بھر کی عورتیں استعمال کرتی ہیں۔" مرزا کہتے کہتے ہنسنے لگے۔

"سب عورتیں جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔" مرزا جی نے بیڑی کا دھواں نتھنوں سے نکالتے ہوئے اس کبوتر کی طرف خفگی نظروں سے دیکھا جو کبوتری کے آگے مٹک رہا تھا۔ "نر کی ذات بڑی احمق ہوتی ہے۔" انہوں نے جوتا اتار کر کبوتروں کے کھینچ مارا۔ دونوں کبوتر اڑ کر سرکہ والے کی ممٹی پر جا بیٹھے۔ وہ نر کبوتر پھر ڈھٹائی سے کبوتری کے آگے ناچنے لگا۔ "مرزا کبھی عورت کے چکر میں نہ پڑنا، سمجھے! دیکھو میاں زندگی ایک چارپائی کی طرح ہے۔ چار پائے میری چاروں بیویاں، جھلنگے میں میری لاش پڑی ہے۔ جب چار پائے نکل گئے تو میری میت اوندھی ہو جاتی ہے۔"

"تو پھر آپ نے چار شادیاں کیوں کر ڈالیں؟" مرزا پھر ہنسنے لگے۔

"قسم لے لو میاں، خدا کی ایک [illegible]

پہلی تو ٹھیکرے کی مانگ تھی - والدہ صاحبہ، اللہ انہیں جنت نصیب کرے، اپنی بھتیجی میرے سر منڈھ گئیں - دو سال مجھ سے بڑی ہوگی -"

"وہ کیسے؟" "ٹھیکرے کی مانگ تو!"

"ارے میاں مانگ والی تو اللہ کو پیاری ہوگئی - اس کی بڑی بہن میرے پلے پڑی - سولہویں سال میں تھا کہ نکاح پڑھا دیا -"

"مگر دوسری تو آپ نے اپنے شوق سے کی -"

"ارے نہیں میاں - دنیا جانتی ہے، دوسری نے مجھے پھانس لیا -"

"اور آپ پھنس گئے؟"

"بڑی سے کبھی میرا دل نہ ملا - سال کو بچے دینے ہی سے فرصت نہ تھی - جب دیکھو ایک گود میں دوسرا کوکھ میں جدھر دیکھو موت میں بھیگے پوتڑے - نیک بخت خدا ایک پوتڑا بن گئی - جی گھنا ہوگیا، اور پھر طلاقن سے شادی کرنا کار ثواب بھی تو ہے -"

"تو پھر آپ نے کمایا جی بھر کے ثواب -"

"خالہ جان نے جینا دوبھر کر دیا - رو رو کے سمندر بھر ڈالے - بچڑے جوت دیا کولہو میں اور اندھیر دیکھو خصم نے اسے بانجھ کہہ کر طلاق دی تھی - میرے گھر آتے ہی انٹھیاں لگ گئیں - پتا نہیں اسے خواہ مخواہ شادیاں رچانے کا شوق کیوں چراتا ہے، سالے نے تیسری بھی کر ڈالی، مگر پھر ٹسڑا بھی پیدا نہ ہوا - ادھر یہ حال ہے کہ سالی کسی عورت کے پاس سے بھی گزر جائیں تو اس کی گود ہری ہو جاتی ہے -"

"اور تیسری؟" "دوسری کو جاپے میں بخار لگ گیا - وہ بچے میں بڑی جوجھ رہی تھی - منجھلی نے نہ جانے کیسے پٹی پڑھائی اور پھنسوا دیا -"

"یعنی سوت ہی سوت لے آئیں!" مرزا نے قہقہہ لگایا - "یہ عورت ذات بھی عجیب شے ہوتی ہے -"

"ان دنوں اپنی آمدنی بھی خوب تھی - ریلوے میں اوپر کی آمدنی کے ہزاروں طریقے ہیں - آ گیا گھسے میں - دوسری نے سنا تو سر پیٹتی بھاگی آئی -"

"مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا" مرزا نے منہ میں دھرنے کے لیے پان بھرا اور مسجد کی مدری پر بیٹھ گئے -

"اور منجھلی نے اپنی کان اترتے دیکھی تو اپنی خالہ کی لڑکی بھڑا دی - سلطان میاں پانچ بچیاں چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوگئے تھے - بیوہ عورت کی چھاتی پر پانچ سلوں کا بوجھ - پھانسنے میں آگئی - منجھلی خار کھائے بیٹھی تھیں - وہ اپنا کینڈا ڈھونڈ کے بیاہ لائیں - اب ہوتا یہ ہے کہ دو ایک طرف ہو جاتی تھیں اور دو دوسری طرف - بیچ میں بجر بٹو - یار، شرع میں چار کا حکم ہے - اگر پانچ یا تین ہوتیں تو کچھ فیصلہ ہو جاتا، مگر اس چار پائی نے تو چاروں اور سے گھیر کر مجھے مارنے کی قسم کھائی ہے -"

"معاف کیجیے گا میاں، یہ چوتھا نکاح آپ نے پندرہ برس کی لونڈیا سے کیا - یہ تھوڑی زیادتی ہوگئی -"

"ارے یار کوئی مائی کا لال پندرہ برس کی لونڈیا سے انکار کر سکتا ہے - میاں عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے - میں نے کوئی ناجائز بات تو نہیں کی اور پھر مجھے سالا کیا معلوم تھا کہ اس سبز قدم کے آتے ہی مجھے قبل از وقت ریٹائر ہونا پڑے گا -"

"پھر بھی سب سے چھوٹے میاں، ہاتھ تو آپ نے بڑا زبردست مارا تھا -"

"تو کیا سب میں اکیلا ہڑپ گیا؟ اور پھر مجھے کیا خبر تھی کہ نیا افسر بڑا حرامی ہے - اور مجھے پھانسنے کی تاک میں لگا ہوا ہے - بھول کس سے نہیں ہوتی میاں؟"

"سب نصیب کے پھیر ہیں" مرزا نے ٹھنڈی سانس بھری - زر دو نوں نے منت باندھ لی -

کم نصیب چھوٹی بیٹھی جھانوے سے ایڑی پر سے میل چھڑا رہی تھی - بڑی بیگم برآمدے میں بیٹھی سینی میں بڑیاں توڑ رہی تھیں - منجھلی بیگم پلنگ کی ادوائن کس رہی تھیں اور سنجھلی [illegible] میں بڑی لمبی لمبی جمائیاں لے رہی تھی - [illegible] کی باری تھی اور حسب معمول وہ چھوٹی [illegible] کے منہ کو اڑوں کو دل ہی دل میں کوس رہی تھی [illegible] چھوٹی کچھ بچ سبز قدم تھی - پہلا [illegible]

نے اس کی کوٹھری میں قدم رکھا تو ان پر پہلی بار اختلاج کا دورہ پڑ گیا تھا، اس دن سے میاں کچھ بجھے بجھے سے رہنے لگے تھے۔ ہفتوں کسی بیوی کی بھی باری نہیں نمٹائی۔ مسجد میں سونے لگے تھے۔ حکیم صاحب نے ڈنڈ بیٹھک کو بھی منع فرما دیا تھا۔ بڑی تو اللہ والی بن چکی تھیں۔ ہر دم وظیفے پڑھا کرتی تھیں۔ انہوں نے شاید کوئی ایسا جناتی چلا کھینچا تھا کہ میاں کا دم درود ہی ختم ہو گیا تھا۔

چھوٹی بیٹھی جھالرے سے کھیل رہی تھی۔ دنیا جانتی تھی کہ وہ کیوں ہر دم خلا میں تکا کرتی تھی۔ اور بڑبڑا کر اپنے جی سے باتیں کرتی تھی۔

مہترانی آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ کچھ ڈری ڈری سہمی وہ بار بار بیگموں کی طرف دیکھ رہی تھی جب وہ موری میں جھاڑو لگا رہی تھی تو اس نے ادھر ادھر دیکھ کر جیب سے ایک کاغذ کا گولا چھوٹی کی گود میں ڈال دیا اور بیری کے پیڑ کے نیچے پتے سمیٹنے لگی۔

چھوٹی کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے۔ جیسے کسی نے بم کا گولا اس کی گود میں ڈال دیا ہو۔ کندھے سے دوپٹا سرکا کر اس نے گود میں بھر لیا اور پھر اس کے کان سرخ ہو گئے۔ بڑی چالاک دستی سے اس نے کاغذ کا گولا گریبان میں اڑس لیا۔ پھر پانی کا لوٹا اٹھایا اور بڑی بے پروائی سے بیت الخلا میں گھس گئی۔

بڑی نے سنجھلی کی طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا، وہ کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔

"شاکرا بیگم کو آج پھر دست لگے۔" انہوں نے سنجھلی کو آنکھ ماری اور تسبیح کے دانے گھمانے لگی۔ سنجھلی نے اور اٹھن کو آخری جھٹکا دیا۔

اور کمر پہ ہاتھ رکھ کر میدان میں ڈٹ گئی۔

"جھوٹے بہتان لگانے والوں کی قبر میں کیڑے پڑیں گے۔"

"اے کیڑے پڑیں جھوٹوں کے۔" سنجھلی پھنکاری۔

"معصوم کا صبر پڑے گا۔"

"ان بیگموں اک آدھ خون ہو کے رہے گا۔"

میاں کے کان میں بھنک پڑ گئی تو بس دیکھنے والے دیکھیں گے۔" بڑی نے جائے نماز کا کونا پلٹ دیا۔

شاکرا نے اندر سڑتے، بدبو کے بھبکے اڑاتے پاخانے میں منہ میں آنچل ٹھونس لیا اور لرزتے ہاتھوں سے کاغذ کا گولا دبوچا، جیسے گولا پھٹ کر اس کے چیتھڑے اڑا دے گا۔ اس نے ذاکر میاں کو کتنا کتنا سمجھایا کہ اب وہ پرائی امانت ہے۔ اب ان کا خیال بھی جی میں لانا گناہ تھا، مگر ان کے سر پہ تو جنون سوار تھا۔

ذاکر حسین کی خالہ اس کی سگی پھوپی تھیں۔ ہمیشہ اسے "میرے ذاکر کی بہن" کہا کرتی تھیں۔ مگر ذاکر تین سال تک دنیا بھر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ قسمت کی بات تھی کہ ادھر شاکرا کا نکاح ہوا، ادھر چھ مہینے کے اندر انہیں اسکول میں نوکری مل گئی۔ اگر وہ نکاح کے وقت موجود ہوتے تو غدر مچا دیتے، لیکن وہ تو کسی انٹرویو کے لیے بھرت پور گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو شاکرا پرائی ہو چکی تھی۔ بے چارے سر جھکا کر رہ گئے۔ پھر کسی شادی میں ان کی شاکرا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ انہیں دیکھتے ہی جلدی سے پلٹ کر بھاگی اور بھیڑ میں گم ہو گئی، مگر شادی کے بلڑ میں ڈھونڈنے والا پا ہی لیتا ہے۔ شاکرا جدھر مڑتی، ذاکر میاں کی آنکھیں اسے دبوچ لیتیں۔ مگر وہ تو اب بیاہتا تھی۔ شاکرا نے کاغذ کا گولا منہ میں ٹھونس لیا سسکیاں بھر بھر کر اسے پیس پیس کر لگدی بنائی پھر موری میں تھوک کر اسے پانی سے بہا دیا۔ اس کے بعد اپنے آنسو پونچھے اور نکل کر مٹی سے ہاتھ پاک کرنے لگی۔

آوارہ لونڈوں کا ایک گلّی نیم کے پیڑ کے نیچے آ کر گرا اور لاتوں گھونسوں کا ایک طوفان بپا ہو گیا۔

میرن میاں نے گالیوں کی ایک لمبی سی ڈوری بچوں کی ماں بہنوں کے حساب میں کھینچی اور سلیپر پکڑ کر گھسان پر ٹوٹ پڑے۔ بچے پھر اڑ [illegible]

دم اسی پہ بس پڑے۔ غفورا دودھ والا تھوڑی دیر دم بخود دیکھتا رہا۔ پھر دکان سے کود کر میرن میاں سے بھڑ گیا۔

"بہاتی کو کیوں مار رہے ہو جی؟" اس نے سلیپر چھین کر دور پھینکا۔

"تو کون ہوتا ہے بے!" میرن میاں گرجے۔

"یہ حرام زادہ اپنا ہے۔ ہٹ جاو غفورے آج میں اس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

"ہر کا ہے کر؟"

"اس کی زبان۔"

"زبان سنبھال کے میاں" غفورا الجھنے لگا۔

"زبان کے بچے! تو کون ہوتا ہے؟"

"میں کون ہوتا ہوں؟ یہ بھی اچھی کہی! ارے میں اس کا باپ ہوں۔" "کیا بکتا ہے؟ یہ منجھلی کا پلا ہے اور۔" "ارے میاں، یہ تو میرا فرزند ہے۔"

"تیرا فرزند؟ مگر۔" میاں ڈھیلے پڑ گئے۔

"اپنے لونڈے کو بھی نہیں پہچانتے۔" لونڈا چھوٹ کے بھاگا۔ "بہت بیری کی! بھائی میں سمجھا میرا ہے۔"

میرن میاں ہانپتے ہوئے سیڑھیوں پر ڈھے گئے۔

"میاں تم تو بالکل سٹھیا گئے ہو۔" مرزا اسٹور کھولتے ہوئے چلائے۔ میرن میاں گھٹنوں پر ہات رکھے بیٹھے رہے جیسے کوئی ان کی تصویر کھینچ رہا ہو۔ قسمت نے اس بڑھاپے میں انہیں کہاں لاکر پھینکا تھا۔ گھر کیا تھا ایک بھیانک جنگل تھا جس میں چار شیرنیاں ضروریات زندگی سے محروم فرمایا کرتیں۔ خیر بڑی تو جائے نماز پر جا بیٹھی تھیں۔ وہ کرتے کارڈ کاڑھ کر ہانڈی چڑھا لیتی تھیں۔ چھوٹی انہیں ہمیشہ سوتی ہی ملی۔ انہیں اسے جگانے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ مکر کیے پڑی ہے اور ساری رات پلنگ پر بند آنکھوں سے جاگ کر گزارے گی۔ کبھی جی چاہتا کہ کہہ دیں، "چین سے سو جا بدنصیب کہ جگانے کی خواہش کا ختم ہو چکا ہے۔ اب اس جنم میں تو شب بیداری کا ڈر رہا نہیں،" مگر بیچ والیاں بڑی بےشرم تھیں۔ طعنوں تشنوں سے کلیجا چھلنی کر دیتیں۔ وہ یہی سمجھتی تھیں کہ چھوٹی کے نصیب جاگ رہے ہیں۔ کیا غضب کی تنہائی تھی۔ جب بڑی کو بیاہ کر لائے تھے تو زندگی کیسی بھری پری تھی۔ کمسن دبلی پتلی دلہن ایک رس بھری کی طرح دل و دماغ کو معطر کر ڈالتی۔ آنکھوں میں رت جگے کا خمار دیکھ کر اماں جلی کٹی سنانے لگتیں۔ باقی کی تین شادیاں غصے میں آکر کر ڈالیں، مگر وہ رس کسی میں نہ ملا اور چھوٹی نے تو زندگی میں زہر گھول دیا جو ہم پوتے تو اسے کھلانے کی تھی وہ حکیم ڈاکٹروں کی دہلیز کی خاک لینے میں گزر رہی تھی۔

"طلاق" "اے ذاکر بھائی کیا کہہ رہے ہو تم؟ ہمارے خاندان میں آج تک کوئی طلاق نہیں ہوئی۔ اماں کا دم نکل جائے گا ویسے ہی کھاٹ سے لگ گئی ہیں۔" "میں انہیں سمجھا لوں گا شاکرا۔"

"تمہاری اماں تو حشر ہو جائے طلاق سے بیاہ نہ کرنے دیں گی۔" "پھر دنیا کیا کہے گی؟" "میں دنیا کو لات مار دوں گا۔ میری دنیا تو تم ہو شاکرا۔"

"تمہیں اللہ کا واسطہ ایسی باتیں نہ کہو۔ کسی کو خبر ہو گئی تو یاد رکھنا کچھ کھا کے سو رہوں گی۔"

"تم اس وقت بھی میری ہی رہو گی میں تمہارے ہی پاس پہنچ جاؤں گا۔" "خدا نہ کرے جو تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو۔ پھوپی جان کے بڑھاپے کا ایک تم ہی تو سہارا ہو، اور پھر تمہاری بہنوں۔"

"میں نے اپنی بہنوں کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔ انہوں نے میرے لیے کیا کیا ہے؟ تم پرائی ہو گئیں، میرا حق چھن گیا اور وہ بیٹھی دیکھتی رہیں۔" "پھوپی!" منجھلی کی آواز سن کر شاکرا نے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔

"تیری موت آئی ہے حرام زادی۔" منجھلی نے شاکرا کی کنپٹی پر وہ زناٹے کا تھپڑ جڑا کہ اس کا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ "میاں کو پتا چل گیا بامراد تو ناک چوٹی کاٹ کر ہتھیلی پر دھر دیں گے۔" منجھلی آواز دبا کر بول رہی تھی۔ اس خیال سے کہ بڑی نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔ شاکرا چپ کھڑی [illegible] بہا رہی تھی۔

پورا ہفتہ ہونے کو آرہا تھا۔ میرن میاں چارپائی سے جان چرائے مسجد میں [illegible]

کرتا اور تہمد چیکٹ ہو گیا تھا، مگر انہیں ہوش نہ تھا۔ سکینہ بار بار لونڈوں کو بھیج رہی تھیں، مگر میاں وہ بیٹھے رہتے۔ مسجد میں کوئی بھوکا نہیں مرتا بھنڈ ادھر ادھر سے کھانا آجاتا تھا۔ کبھی مرزا کے ہاں جاکر کھا لیتے۔ کبھی رجو حلوائی کی دکان پر حلوا پوری کھا لیتے۔ یہ خانہ بدوشی کی زندگی انہیں بڑی راس آرہی تھی، مگر رکنی بائی شہر سے ایک نیا مال پہچان کر لائی تھی۔ اس کے ہاں مجرا تھا۔ آج حساب سے چھوٹی کی باری پڑتی تھی۔ ایسی کی تیسی ان باریوں کی، وہ انسان تھے کہ تماشا! پہلے ہی کئی دفعا روٹھ کر چلے آئے تھے۔ پھر خود ہی مڑ گئے تھے۔ کپڑے بدلنے کے لیے جانا ہی پڑے گا۔

ایک دم ان کے پیروں میں جیسے اژدہا لپٹ گیا۔ ٹھٹکا تو وہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ سامنے کوٹھے میں بائیسکوپ چل رہا تھا۔ سلاخوں سے آدمی تو نہیں گزر سکتا، مگر پر شوق بات اور ہونٹ روکے نہیں رکتے۔ شاکرا کو ذاکر میاں بھینچے نہ جانے کس دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ میرن میاں کو ایسا لگا جیسے سارے جسم کا خون سمٹ کر آنکھوں میں اتر آیا ہو۔ اسی لمحہ شاکرا نے آنکھیں کھولیں۔ ایک گھٹی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور کھڑکی کے پٹ بند ہو گئے۔

اس سے پہلے کہ ذاکر میاں مڑ کر دیکھتے، میرن میاں جھٹ ایک گلی میں سرک گئے۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ میرن میاں تیزی سے نکل کر چوک میں آ گئے۔ انہیں کچھ ہوش نہ تھا، لوگ انہیں دھکا دیتے گزر جاتے مگر انہیں تو خبر ہی نہ تھی کہ کون ہیں کہاں ہیں۔ انہوں نے اڑتی اڑتی خبر تو سنی تھی، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ معاملہ ان حدوں کو چھو رہا ہے۔ منجھلی کئی بار رابعا کے بیٹے ذاکر حسین کا ذکر بے تکے سن چکی تھی۔ لڑکا ہونہار تھا۔ یہ پتا نہ تھا کہ ادھر پھنسا ہوا ہے۔ چلتے چلتے تھک گئے تو منڈیر پر بیٹھ گئے۔ نہ جانے کب تک بیٹھے رہے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو انہیں ہوش آیا۔ اذان کی آواز پر ان کے قدم خود بخود مسجد کی طرف اٹھنے لگے۔ نماز کے بعد دیر تک دعا کچھ پڑھتے رہے۔

"رکنی کے ہاں چلے گا؟" مرزا نے پوچھا۔

"تم چلو، ہم ابھی آتے ہیں۔ ہم بھی آج وہ مجرا ضرور دیکھیں گے۔ نئی چھوکری ہے نہ جانے کون ہے۔ کسی کی بیٹی، کسی کی بہن اور بہت ممکن ہے کسی کی بیوی ہو" یہ کہہ کر وہ استغفار پڑھنے لگے۔

رکنی کے کوٹھے سے دھوم دھماکے کی صدائیں آرہی تھیں، مگر میرن میاں اپنے گھر کی طرف چلتے رہے۔ کورا کرتا اور تہمد نکال کر وہ نل پر خوب مل مل کر نہائے جیسے آج وہ کوئی اہم ترین فرض ادا کرنے جا رہے ہوں۔ انہوں نے طاق سے حسن کی عطر کی شیشی اٹھا کر آدھی ہتھیلی پر انڈیل لی۔ دونوں ہاتھ مل کر شانوں کو لگائے اور داڑھی پر پھیر لیے۔ یوں بن سنور کر وہ چھوٹی کی کوٹھری میں پہنچے چھوٹی حسب عادت تکیے میں منہ دبائے پڑی تھی۔

میرن میاں مونچھوں ہی مونچھوں میں مسکرائے۔

"شاکرا بی۔" انہوں نے گلا صاف کر کے دھیمے سے پکارا۔ "آج مکر گانٹھے سے کام نہ چلے گا۔ بی بی۔ آج تمہیں جاگنا ہی پڑے گا، بابی شاکرا۔ سنو لڑکی، آج سے تم مجھ پر حرام ہو گئیں۔ میں نے تمہیں طلاق دی۔ طلاق۔ طلاق۔" مگر شاکرا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ویسے ہی کروٹ سے پڑی رہی۔

"شاکرا بی!" میرن میاں نے ذرا زور سے پکارا۔

جواب ندارد!

میرن میاں کچھ چڑ گئے۔ اٹھ کر اس کا شانہ ہلایا۔

"شاکرا بی!"

شاکرا بی کی گردن ڈھلک گئی۔ جھک کر میرن میاں نے مالش کی زہریلی دوا کی خالی شیشی تکیے کے پاس سے اٹھائی اور چپ چاپ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئے۔

قبرستان میں جنازہ جب اتارا کندھوں کا ہوا، قبر سے دس قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو میرن میاں کو ذاکر میاں نظر آ گئے۔ ان کی آنکھیں خون کبوتر کی سرخ ہو رہی تھیں۔ میرن میاں نے پلنگ کا پایا انہیں تھما دیا اور ان کی امانت ان کے سپرد کر کے الگ ہو گئے۔

شہریور - مہر - آبان ۱۳۸۵ف ہندستانی ادب جولائی - اگست - ستمبر ۱۹۷۶ء

مرزا ظفر الحسن، بی - اے (عثمانیا)

جامعۂ عثمانیا اور حیدرآباد

"ذکر یار چلے" ممتاز عثمانین مرزا ظفر الحسن کی باغ و بہار ضخیم تصنیف ہے، جس کا محور "جامعۂ عثمانیا" حیدرآباد اور مخدوم ہے - بقول فیض احمد فیض "یہ کتاب ایک بے حد شگفتہ داستان ہی نہیں، ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے"۔ ظفر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "محبت کی چھاؤں" ۱۹۳۹ء میں "ادارۂ ادبیات اردو" سے شایع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ہم ذیل میں "ذکر یار چلے" (مطبوعہ پاکستان) دوسرے باب کے چند اقتباسات شکریے سے شایع کر رہے ہیں ——— (و - خ)

جس زبان کو میں نے دکنی کہا ہے اس سے بہت پرانی زبان کو ہی ملا وجہی، ابن نشاطی اور نصرتی دکنی کہتے تھے - ولی دکنی کے نزدیک وہی زبان ریختا تھی ؎

یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو
رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

ایک طرف حضرت میر تقی میر ہیں کہ چپ چاپ سفر کیے جا رہے ہیں - ہمسفر سے بات ہی نہیں کرتے کہ میر صاحب کی زبان خراب ہو جائے گی، مگر فرماتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو اپنا تھا باشندہ دکن کا تھا

ایک دن ولی جنوب سے شمال گئے معشوق ہو گئے۔ سالہا سال بیت گئے اور ایک دن کوئی شیطان شمال سے جنوب پہنچا محبوب ہو گیا ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم لکھنو والوں کے
محبوب جو ہے اپنا باشندہ لکھنو تھا

یہ باشندۂ لکھنو سبط حسن تھا جس نے میرا انجا[illegible] سناتے پھر اہل دکن کو لوٹ لیا - وہی سبط حسن [illegible] "نگاراں" بن گئے ہیں۔ اس

وقت کسے خبر تھی کہ اس سفر سے میری زندگی کا رخ ہی بدل جائے گا، اور میں وطن کو بھول کر دکن کے گن گانے لگوں گا" سبط حسن حیدرآباد پہنچے تو انہیں حیرت ہوئی کہ یہ لوگ ابھی اٹھارہویں صدی کی زبان بولتے ہیں (اور انہیں) یوں محسوس ہوا گویا پل جھپکتے میر اور مصحفی کے دور میں پہنچ گئے ہیں۔"

سبط شہر ہی میں رہے کبھی گاؤں نہیں گئے [illegible] انہیں پڑھے لکھے لوگوں سے پڑا - ان بیٹ لوگوں اور خاص طور پر گاؤں والوں سے تو بالکل ہی پالا نہ پڑا ورنہ سبط کو معلوم ہوتا کہ دکن میں عادل شاہی دور کے بعض الفاظ بھی ابھی تک نہیں [illegible] باہر کو "بار" کہتے ہیں - شہر کو ابھی [illegible] میں "لوز" اور [illegible] [illegible] جاتا ہے - کیا چاہتے ہیں" اور " [illegible] زبان سے نکلتا ہے اور [illegible]

[illegible] ان کی ناقدری [illegible] اس بات کے [illegible]

یا کمال پوت کا پھا پروتی ہے کہ یہ پھا کہ اس کے سہاگ کی علامت ہے علی عادل شاہ ثانی کے عہد کا شاعر سید میران ہاشمی کہتا ہے ؎

سجن آدیں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتیاں کا پروتی ہار بیٹھوں گی
اتوں یاں آ دیکھیں گے تو کہوں گی کام کرتی ہوں
اشلی ہور مشلی چپ گھڑی دو چار بیٹھوں گی

اہل دکن ملا وجہی کو تو بھلا بیٹھے مگر "جلدی" یا "تورے" کے لیے اس کا استعمال کیا ہوا لفظ "بیگی" یاد رکھ لیا ؎

طاقت نہیں دوری کی اب تو بیگی آ مل رے پیا
تج بن نہجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا

طاقت کا نام اکثر دکنیوں نے نہیں سنا مگر "تو رے" کی بجائے ان کی زبان سے آج بھی لفظ "نوو" ہی نکلتا ہے ؎

زمانا ان کا نو وسال کا ہے
نہیں کچھ آج کل اور حال کا ہے

سانو سنگت نبے لیے "سنگات" ہم کہتے ہیں، مگر یہ نہیں جانتے کہ تنفرقی بھی یہی کہتے تھے ؎

ادھر سات تھی ماکے مدماوتی
ایدھر مان کے سنگات چمپاوتی

زبان کا ذکر طویل ہے ۔ خشک ہے، اگر زبان ہی زندگی ہے ۔ زبان نہیں تو زندگی نہیں۔ پرانے دکن میں یہاں اردو کا نام دکنی تھا۔ محمد تغلق کے دولت آبادی عہد حکومت میں یہ زبان استعمال ہو چکی ہے ۔ بہمنی دور میں حضرت خواجہ بندا نواز گیسو دراز نے ہدایت نامہ اسی دکنی میں لکھا۔ بہمنی بادشاہوں نے اسے سرکاری زبان قرار دیا ۔ مورخ فرشتہ نے جسے ہندوی لکھا وہ دراصل دکنی ہے ۔

قطب شاہوں میں سلطان علی نے "آش خانا" کے نام سے ایک محل بنوایا جہاں صاحبان علم و ادب جمع ہوا کرتے تھے ۔ دکنی کے عظیم شاعر وجہی اور ابن نشاطی وغیرہ اسی کی وجہ سے اس [illegible] ہوا ۔ عادل شاہوں [illegible] عادل شاہ نے ہندستانی کی بڑی سرپرستی کی ۔

اس زبان پر ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بھی بڑے احسانات ہیں ۔

گولکنڈے کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنتوں کے مقابلے میں احمد نگر کی نظام شاہی مملکت کو زبان و ادب کی ترقی کا ویسا موقع نہیں ملا کہ وہ ہمیشا سلطنت مغلیہ کی زد میں رہی ۔

سلطنت آصفی میں اس زبان کی ترقی کی داستان دلچسپ مگر طویل ہے، اگر جامعۂ عثمانیہ قایم نہ ہوتی تو کلام میر و زبان مرزا کے باوصف ہم یہ کہنے کے قابل نہ ہوتے کہ ہماری اپنی تاریخ و تہذیب کی طرح ہماری اپنی علمی زبان بنی ہے ۔

جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد میں قایم ہوئی، مگر وہ صرف حیدرآبادیوں کی نہیں، بلکہ ہندستان والوں کی میراث تھی ۔ جامعۂ عثمانیہ پر سب نے اور جامعۂ عثمانیہ نے سب پر فخر کیا ۔ سلطنت آصفی کی سرکاری زبان ہندستانی تھی ۔ بول چال کی زبان میں قدیم دکنی کی ملاوٹ رہی، اور آج بھی ہے، مگر جامعۂ عثمانیہ نے علمی زبان کی طرح ڈالی ۔ تب ہی تو پروفیسر قاضی محمد حسین مرحوم نایب معین امیر جامعۂ عثمانیہ نے فرمایا تھا ۔

"علم نامانوس زبانوں میں قید تھا
سرزمین جامعۂ عثمانیہ پر آزاد ہوا، عام ہوا۔"

برصغیر پاکستان اور ہندستان کی علمی اور سائنسی زبان پر آج بھی عثمانیہ کی چھاپ ہے، عثمانیہ نے علوم و فنون کو نئی زبان عطا کی، اُن کے لیے نئے راستے متعین کیے نئے رستے متعین کیے خود ان رستوں پر گامزن ہوئی اور دوسروں کے لیے مشعل راہ بنی ۔

اب میں جامعہ کی فکر اول اور خشت اول کی کہانی مختصر پس منظر کے ساتھ بیان کر دوں گا ۔ سالار جنگ اول دکن کے وزیراعظم تھے ۔ ہندستان کی سیر کے لیے نکلے تو حیدرآباد کا رزیڈنٹ ان کے ہمرکاب رہا، اور جب وہ بیرون ہند گئے تو [illegible] [illegible] نے اس کا استقبال کیا [illegible] یہ علم

تھا کہ یورپین ان کے دربار میں حاضر ہوتے تو ان کے آگے اپنے معروضے بیٹھ کر نہیں کھڑے ہو کر بیان کرتے تھے۔ رزیڈنٹ سے خط و کتابت فارسی میں، اور گفتگو ہندستانی میں کرتے اور کہتے تھے انگریزی میں بات چیت کریں تو رزیڈنٹ ان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اسے مرعوب اور متاثر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سے ہندستانی میں گفتگو کی جائے۔

دکن کے امیر اور رئیس وزیر اعظم سے اجازت حاصل کیے بغیر رزیڈنٹ سے ملاقات نہیں کر سکتے تھے، مگر اس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہی انگریز حیدر آبادیوں کو خطابات دینے لگا، اور حیدر آبادی ان خطابوں سے خوش بھی ہونے لگے، انگریز نے خطاب دینے کا یہ سلسلہ نیچے سے نہیں اوپر سے شروع کیا۔

افضل الدولہ پہلے والیٔ دکن تھے، جنہیں انگریز نے خطاب دیا - جی سی ایس آئی - مشہور ہے کہ جب خطاب کا خریطہ پیش ہوا تھا، افضل الدولہ نے اس خریطے کو اپنے پاؤں سے روند ڈالا، مگر اصل روندنے والا تو انگریز تھا جس نے رفتہ رفتہ آصفی اقتدار کو روندنا شروع کر دیا۔

میر محبوب علی خاں کو لفٹننٹ جنرل بنایا گیا۔ جی سی ایس آئی اور جی سی بی کیا اور "ہز ہائی نیس دی نظام آف حیدر آباد اینڈ برار اور پھر "فیتھ فل الائی آف دی برٹش ایمپائر" یعنی "یار وفادار سلطنت برطانیہ" بنائے گئے۔

انگریزی اقتدار کی پہلی چوٹ یہ تھی کہ انگریز نے خطاب دیا اور دوسری ضرب یہ کہ خطاب چھین لیا کہ تم بادشاہ نہیں نظام ہو۔ صرف "نظام آف حیدر آباد"۔ جب میر محبوب علی خان کی تخت نشینی کا اعلان اس وقت کے رزیڈنٹ اور گورنر جنرل سے استمزاج کیے بغیر کیا گیا تو رزیڈنٹ نے دربار میں حاضر ہو کر تخت نشینی کی توثیق کرنے کے لیے شرط لگائی کہ مسند اور تخت کا تھوڑا سا [illegible] [illegible] اور مسند کا فاصلہ [illegible] آدھا ہٹا دیا جائے [illegible] تخت

اٹھا دیے گئے - کرسیاں بچھا دی گئیں۔

تاہم یہ سمجھ کر جوتے اتار کر فرش پر بیٹھنے سے رزیڈنٹ کے گھٹنوں میں درد ہوتا ہوگا، اس لیے وہ کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے، مگر یہ محسوس نہ کیا کہ آج دونوں پاؤں کی قینچی بنا کر کرسی پر بیٹھنے والا انگریز کل سے حیدر آبادی اقتدار کی کتر بیونت شروع کر دے گا اور اقتدار کی کرسی پر بجلی پہنچا کر ایک ہی جھٹکے میں دکن کی آزادی کا کام تمام کر دیگا۔

سیاسی آزادی کے لیے معاشی آزادی کے لیے معاشرتی آزادی کے لیے زبان کا فروغ نہایت ضروری ہے۔ ماں کی چھاتی سے نکلے ہوئے دودھ کی دھار اور ماں کی زبان سے ادا ہونے والے لفظ کا اثر یکساں ہوتا ہے۔ دکن کی چھاتی پر انگریز نے مونگ دلنا شروع کیا، اور دکن کا دماغ زبان کی الجھن میں گرفتار ہونے لگا جس کا نتیجہ آگے چل کر دوہرے نظام تعلیم کی صورت میں نظر آیا، یعنی ذریعۂ تعلیم انگریزی بھی رہا اور ہندستانی بھی۔

نواب فخر الدین خان نے اپنے خرچ سے مدرسۂ فخریہ قایم کیا۔ یہ پہلا مکتب اور اپنی نوعیت کا نہ صرف حیدر آباد، بلکہ پورے ہندستان میں انوکھا مدرسہ تھا جس میں مغربی علوم کی تعلیم ہندستانی میں ہوتی تھی۔ اس کے بعد دار العلوم کی بنیاد پڑی جو بعد میں سب سے بڑی درس گاہ بن گیا۔ مدرسۂ عالیہ کی بنیاد ڈال گئی، مگر اسے انگریزی نام بھی عطا ہوا۔ عالیہ ہائی اسکول حیدر آباد میں ایک جامعہ قایم کرنے کی اولین تحریک سی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں اور اس کے مقابلے میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کا نظام کالج وجود میں آ گیا۔ دار العلوم جامعۂ پنجاب سے ملحق تھا - دوسری طرف جب مدرسۂ عالیہ کا الحاق جامعۂ مدراس سے ہوا تو انگریزی اپنے پیٹ سے پاؤں نکالنے لگی - حیدر آباد میں ہندستانی کے ساتھ انگریزی کی بھی تعلیم [illegible]۔

انیسویں صدی میں جو خواب دیکھا [illegible] بیسویں صدی میں [illegible] - جامعۂ عثمانیہ کا قیام [illegible] مستقل کا جیتا تھا - [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

انہوں نے ایک ایسے مدرسے کے قیام کی تجویز پیش کی جو اپنی ہیئت ترکیبی میں جامعہ کے برابر تھا - وہ اگر ختت اول نہیں تو فکر اول ضرور تھی - سالار جنگ نے اس تجویز کو پسند بھی کیا اور منظور بھی ، مگر رفعت یار جنگ کا نام صرف مدرسے اعزازیے بانی کی حیثیت سے ہی یاد رہا اور بات ختم ہو گئی -

میر محبوب علی خان والیٔ دکن اور سالار جنگ وزیر اعظم تھے - والیٔ ریاست کی صدارت میں ہونے والے ایک جلسے میں تجویز پیش کی گئی کہ ریاست میں نظام یونیورسٹی بنائی جائے ، مگر یہ تجویز بھی بجلی کی طرح چمک کر غایب ہو گئی جلسے کی روداد نقش بر آب ثابت ہوئی - سب بھول گئے کہ کل کیا طے ہوا تھا - سر وقار الامرا وزیر اعظم نے تقسیم انعامات کیے اس جلسے میں نظام یونیورسٹی کی تجویز دہرائی جس کی صدارت میر محبوب علی خان کر رہے تھے ، مگر یہ تجویز بھی دھری کی دھری رہ گئی -

نواب میر عثمان علی خان کے عہد حکومت میں سر اکبر حیدری ابتدا ہی سے نہایت با اثر شخصیت تھے - ان کی مادری زبان ہندستانی نہ تھی - ہندستانی سے ان کی واقفیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اپنی تقریر رومن میں لکھوا کر پڑھتے تھے - کسی ایسی ہی تقریر میں لفظ " دایرۂ اثر " استعمال کیا گیا تھا - ٹائپسٹ نے انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندستانی میں بھی " دایرۂ اثر " لکھ دیا تھا - حیدری صاحب اس وقت تک واقف ہو چکے تھے کہ ہندستانی میں اضافت [illegible] جاتی ہے - انگریزی میں ٹایپ شدہ تقریر پڑھتے ہوئے جب لفظ " دایرۂ اثر " پر پہنچے اور انہیں یہ لفظ پہلے ہندستانی میں لکھا ہوا ملا تو انہوں نے اسے " اثر دایرہ " پڑھ دیا کہ بائیں طرف سے پہلے لفظ " اثر " لکھا ہوا تھا ، اور اس کے بعد لفظ " دایرہ " ہندستانی [illegible] - حال ، مگر سر اکبر کو ہندستانی سے شغف ہو گیا [illegible] کا سبب مولوی عبدالحق بنے - عبدالحق نے [illegible] یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں -

[illegible] تھا کہ

ابتدا کیسے ہوئی - ہوا یہ کہ ایک بار سر اکبر اورنگ آباد آئے اور میں نے ان کی صدارت میں ایک تقریر مروجہ تعلیم اور طریقہ تعلیم پر کی - اس سے وہ بہت متاثر ہوئے اس کا اعتراف خود انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کیا جو انہوں نے اورنگ آباد کے ایک سالانہ جلسے میں کی تھی وہ نورس (کالج کا رسالہ) میں چھپی تھی - خیر حیدری صاحب تو آمادہ ہو گئے وہ خود اس کی تحریک نہیں کر سکتے تھے ، البتہ ان کے سامنے یہ تحریک آئے تو وہ کارروائی کرنے کو تیار تھے - المالطیفی ڈائرکٹر صاحب کے ذریعے اس تحریک کو پیش کرنا خلاف مصلحت تھا - وہ اس کے مخالف تھے - اس زمانے میں دار العلوم کے پرنسپل مولوی حمید الدین مرحوم تھے - انہوں نے میرے متواتر اصرار پر یہ عہدہ قبول کیا تھا - میں نے انہیں ہم خیال بنا لیا اور ان سے کہا کہ آپ بحیثیت پرنسپل دار العلوم یہ تحریک کیجیے - انہوں نے کہا تم لکھ دو میں دستخط کر دوں گا - میں نے ہوم سکرٹری کے نام پر چند سطریں لکھ کر دوں پیش کر دی - ہوم سکرٹری اس وقت سر اکبر حیدری تھے اب بموجب انگریزی قاعدے کے گیند لڑھکنا شروع ہوئی - مجھے اورنگ آباد سے اسپیشل ڈیوٹی پر بلایا کام دھیرے دھیرے شروع ہوا - عرض داشت جو اعلیٰ حضرت کے سامنے منظوری کے لیے پیش کی گئی وہ میری ہی لکھی ہوئی تھی - "

مولوی صاحب کی لکھی ہوئی عرضداشت پر اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان آصف سابع کا فرمان ممالک محروسہ کے لیے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے - اس یونیورسٹی کا نام " عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد " ہوگا -

کلیۂ جامعۂ عثمانیہ یعنی عثمانیہ یونیورسٹی کالج قائم ہو گیا - یہ آج سے پچاس سال پہلے کی بات ہے -

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے صدر منتخب ہوئے ، مگر افسوس کہ حیدرآباد آنے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا - [illegible] نواب مسعود جنگ اور نواب [illegible] کے [illegible] انتخاب ہے - [illegible]

میں نظام کالج کے پروفیسر عبدالرحمان خان صاحب صدر تھے ۔

تدریس لیاقت منزل اور قریب کی دوسری عمارتوں میں شروع ہوئی جو کرائے پر حاصل کی گئیں، جن کے نام سائنس منزل، قانون منزل، تاریخ منزل، اور دینیات منزل وغیرہ تھے ۔ انٹرمیڈیٹ کی پہلی جماعت میں ایک سو بیالیس لڑکوں نے داخلہ لیا۔ اور یہی گریجویٹ آج سے کوئی بیتالیس سال پہلے نکلنا شروع ہوئے ۔ یوں تو ہر سال چند طالب علموں نے کوئی نہ کوئی امتیاز ضرور حاصل کیا، مگر تیسرے چوتھے اور ساتویں سال فراغت پانے والے تین عثمانین ایسے ممتاز تھے کہ وہ خود جامعات کے سربراہ بنے ۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی جامعۂ عثمانیا، پشاور، جامعۂ سندھ اور جامعہ اسلام آباد کے پروفیسر حمید احمد خان جامعۂ پنجاب کے اور ڈاکٹر عترت حسین زبیری جامعۂ راجشاہی کے شیخ الجامعہ یعنی وائس چانسلر مقرر ہوئے ۔

ہندستانی کی اس عظیم الشان جامعہ میں رجسٹرار کو معتمد اور چانسلر کو امیر جامعہ کہتے تھے، مگر اس جامعہ کی ساری ڈگریوں کے نام انگریزی تھے ۔ بی - اے، بی - ایس سی، ایم - اے، ایم - ایس سی، ایم - بی بی - ایس وغیرہ - اس کی وجہ یہ تھی کہ جامعۂ عثمانیہ سے فراغت پانے کے بعد یہ لڑکے دوسری جامعات میں داخلہ لیتے اس لیے ڈگریوں کے نام منشی یا منشی فاضل وغیرہ نہیں رکھے گئے ۔ البتہ فرزندان جامعہ نے ان میں صرف اتنا ردوبدل کیا کہ ام - اے کو ام - اے اور ایل ایل - بی کو ال ال بی وغیرہ لکھنے لگے - اسی طرح گریجویٹس کو طیلسان کہنے اور اس کی جمع طیلسانین بنانے لگے، مگر توقع کے مطابق یہ الفاظ مقبول نہیں ہوئے ۔

ہماری طالب علمی میں ریاست حیدرآباد دوہری سرکاروں کے تابع تھی - ایک "سرکار عالی" یعنی حضرت بندگان اقدس شہریار دکن و برار کی حکمرانی دوسری "سرکار عظمت مدار" کا اقتدار یعنی صاحب عالی شان نواب رزیڈنٹ بہادر کا جو پانسا نہیں دخل -

حکومت ہند کے قبضے میں بلارم اور ترمل گری کی فوجی چھاؤنیاں تھیں، جن میں گورے بندوقیں سنبھالے بیٹھے تھے ۔ شہر سکندرآباد کا سارا نظام بھی گوروں کے تحت تھا، اور حیدرآباد کا رزیڈنٹ ان کا افسر اعلا تھا۔

رزیڈنٹ کا دفتر حیدرآباد کی جس عمارت میں تھا اسے رزیڈنسی کہتے تھے ۔ رزیڈنسی کے آس پاس کا علاقہ سلطان بازار بھی گوروں کے زیر اختیار تھا۔

اعلاحضرت میر عثمان علی خان شام کے وقت کنگ کوٹھی سے نکلتے عابد روڈ پر سے گزرتے اور رزیڈنسی کے سہ راہے پر سے ہوتے ہوئے گاڑی گوڑے کے رستے پرانے شہر جاتے اور روزانہ جاتے تھے رزیڈنسی کی اپنی پولیس تھی - خاکی وردی پہنے ہوئے پولیس کے یہ جوان بڑی آسٹن کار پر یونین جیک لہراتا ہوا دیکھتے تو فوراً تمام سواریوں کو روک دیتے تاکہ رزیڈنٹ بہادر کی موٹر سہولت کے ساتھ گزر جائے ایک دن اسی سہ راہے پر اعلاحضرت کی موٹر پہنچی، اور اسی خاکی وردی والے سپاہی نے آپ کی موٹر روک کے دوسری سواریوں کو گزار دیا۔ بس دن سے اعلاحضرت نے اپنا رستا بدل دیا، اور اب رزیڈنسی کی بجائے ترپ بازار کی تنگ گلی سے ہو کر شہر جانے لگے - یہی سڑک دور سے آئی ہوئی ہوتی، مگر کوئی بات نہیں علاقہ اپنا تھا- نیلی وردی والے پولیس کے سپاہی اس سڑک پر موجود نہ ہوتے، مگر یہ جو اطمینان تھا کہ ہوتے بھی تو خاکی وردی والے کی طرح سرکار کی موٹر کو روکیں گے نہیں، بلکہ چار سیٹیاں بجائیں گے اور سلامی دیں گے - دیکھتے دیکھتے عابد روڈ سے ایک نئی اور کشادہ سڑک نکالی گئی جو معظم جاہی مارکٹ سے ہوتی اور پل کھاتی ہوئی افضل گنج سے جا ملی - اعلاحضرت اب اسی سڑک سے جانے لگے۔

اعلاحضرت کو سقوط حیدرآباد کے دن دیکھا۔ فرمانروائے دکن نشر گاہ حیدرآباد سے [illegible] نشر کرنے آئے اور یہی ان کی آخری تقریر تھی - ان کے پاؤں تلے قالین [illegible] اسی وقت [illegible]

سے دس سال پہلے میرے بمبئی، لکھنو، کانپور اور لاہور وغیرہ کے سفر کے زمانے میں وہاں کے رہنے والے مجھ سے بصد اشتیاق سن سن کر آمین ثم آمین کہتے تھے۔ نشرگاہ حیدرآباد سے قومی ترانے کی نشر شروع ہونے سے پہلے یہ اسی دعا پر نشریات کے اختتام کا اعلان کرتا تھا۔ بیرون دکن کے سامعین روزانہ حیدرآباد کی نشریات سننے کی وجہ سے اس دعا سے واقف ہو گئے تھے، اس لیے کئی احباب نے مجھ سے سنانے کی فرمائش کی تھی۔ دعا یہ تھی۔

"اعلیٰ حضرت بندگان اقدس شہریار دکن و برار شہزادگان والاشان، اور شہزادیاں فرخ فال کی درازیٔ عمر و اقبال اور ریاست ابد مدت کی فلاح و بہبود کی دعا پر آج کی نشریات ختم کی جاتی ہیں۔"

سروجنی نائیڈو نے میر محبوب علی خان کا دور بھی دیکھا تھا، اور میر عثمان علی خان کا بھی۔ ایک دن اعلیٰ حضرت نے پوچھا "سروجنی تم نے مجھ میں اور میرے والد میں کیا فرق دیکھا۔ سروجنی نے فوراً جواب دیا "مرحوم اعلیٰ حضرت کو اللہ نے دل عطا کیا تھا، اور آپ کو دماغ دیا ہے۔" اعلیٰ حضرت اس جواب پر بے حد خوش ہوئے کہ واہ کیا خوب تجزیہ کیا ہے۔

حیدرآباد صرف حسین شہر ہی نہیں، بلکہ حسینوں کا شہر بھی تھا۔ خوبان دکن اور خوبرویان دکن کو جس نے دیکھا اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ جو حسن تو جامہ والی پری فریفتہ ہو گئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس شہر کے اعظم جاہ اور معظم جاہ جیسے شہزادوں کے محلوں میں روزانہ پریوں کے تختے کیوں نہیں کرنے تھے؟ مگر جب اعلیٰ حضرت کی زندگی پر عبدالحلیم شرر کا ناول "حسن کا ڈاکو" یاد کرتا ہوں تو معاملہ حل ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ میر عثمان علی خان کے ذاتی کردار نے حیدرآبادی زن بچوں کو محفوظ رکھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ عثمان علی خان نہ ہوتے تو شاید لارڈ ریڈنگ کے زمانے ہی میں سقوط حیدرآباد ہو جاتا۔

> ہندستانی زبان کا ساری دنیا میں بول بالا ہو!

علقا شبلی

علم

میں ہوں دنیا، میں ہوں دیں
مجھ سے روشن ہر جبیں
میں ہوں اک روشن چراغ
جس سے دل میں روشنی
جس سے روشن زندگی
میں ہوں اک کومل کلی
رنگ سے آنکھوں میں نور
روپ سے دل میں سرور
اک مدھر نغمہ ہوں میں
روح جس سے شاد ہے
زندگی آباد ہے
میں ہوں ایک چنچل ندی
پیڑ ہیں جس سے ہرے
زندگی کے باغ کے
میں ہوں اک ہنستا گلاب
جس سے راہوں میں مہک
جس سے ہونٹوں پر لہک

میں سراپا زندگی
روشنی ہی روشنی

مرتضیٰ حسین بلگرامی

ڈاکٹر عبدالعلیم کے آخری دن

پروفیسر عبدالعلیم صاحب، جن کی پیدائش موضع بھیتا ضلع غازی پور (اترپردیش) میں مولوی محمد عظیم صاحب صدیقی کے گھر ۲۵ راگست سنہ ۱۹۰۵ء کو ہوئی تھی۔ جو کبھی چشمۂ رحمت غازی پور کے طالب علم رہے، پھر محمدن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ اور بعد میں جامعۂ اسلامیا کے فارغ التحصیل ہو کر جرمن جاکر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی، پھر کبھی جامعۂ ملیا کے اساتذا میں شریک ہوئے، اور کچھ عرصا لکھنؤ یونیورسٹی اور چیرمین ترقی اردو بورڈ مشیر وزارت تعلیم حکومت ہند مقرر رہ کر ولنگڈن شفاخانے نئی دلی میں صرف دو دن علیل رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے —

غالباً سنہ ۱۹۵۰ء کے ماہ اگست کی ایک شام تھی۔ مسلم یونیورسٹی اسٹاف کلب کے سامنے نہایت وجیہہ، شکیل، حسین و جمیل، سرخ و سپید، ہلکے سرخ رو، جامہ زیب شخص کو سفید پینٹ اور سفید شرٹ میں ملبوس، نگاہ خاموش کے ساتھ ہاتھ میں سگار لیے باد نسیم کی طرح خراماں خراماں، مگر پرکیف انداز میں جاتے دیکھا۔

مارسین کورٹ کی طرف سے انگلش ہاؤس کو جو رستا جاتا ہے اس پر خلیل الرحمان اعظمی (حال ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ریڈر شعبۂ اردو) مشتاق حسین صاحب مرحوم (انچارج اردو سکشن لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی) اور خاکسار ہم سفر تھے۔ میں نے پوچھا "یہ کون ہیں؟" مشتاق صاحب مرحوم نے اپنے انداز پر بات رکھتے ہوئے کہا "یہ ڈاکٹر عبدالعلیم ہیں" تعارف تشنہ تھا۔ میں نے پھر خلیل صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنی نگاہ بلند کی، اپنا ہاتھ ذرا سا اپنے بالوں کی طرف کیا اور کہا۔ ڈاکٹر علیم شعبۂ عربی کے استاد ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا منشور اول سمجھیے۔ بس ذہن کے تمام گوشے کھل گئے۔ یہ میری پہلی دید تھی —

ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب سے میری پہلی باقاعدہ ملاقات مکتبۂ جامعہ دلی کی ملازمت کے دوران آخر اپریل سنہ ۱۹۵۱ء ہوئی۔ مرحوم حامد علی خان، جنرل منیجر مکتبۂ جامعہ نے ایک کتاب کا مسودا مجھے دے کر ہدایت کی کہ ڈاکٹر علیم صاحب کو دے کر ان کی بات اپنے ہمراہ لیتے آنا۔ یا اس کی رسید لے کر مسودا ان کے حوالے کر دینا۔ میں حسب عادت سنیچر کی شام کو علی گڑھ پہنچا، اور اتوار کی صبح ان کے مکان پر حاضر ہوا۔ معلوم ہوا ناشتا کر رہے ہیں۔ [illegible] چند لمحوں میں بیٹھ گیا۔ چند ساعت بعد [illegible]

غلطہ دار پاجامے میں چپل پہنے، نظریں نیچی کیے ہوئے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے بڑھ کر (سلام کیے بغیر) مسودہ دے دیا۔ مدعا بیان کیا۔ جواب ملا "رسید بھیج دوں گا" حجت کی ہمت نہ پڑی۔ خاموشی سے واپس ہونے لگا تو آواز آئی۔ "آپ؟" میں نے کہا۔ "احسن صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار میرے پھوپا اور خسر ہیں۔" زیر لب مسکرائے اور بس۔ میں نے اب سلام کیا اور رخصت ہوا۔ میں خیر چاہی کہ لیکن اس کے بعد سے ملاقاتوں (اگر اسے ملاقات کہا جائے) اور یادوں کا سلسلہ ہے جو ۸ فروری ۱۹۷۶ء کی دوپہر کو ایک بجکر پچاس منٹ پر ولنگڈن ہسپتال نئی دلی میں تمام ہوتا ہے۔

یادوں کا لا متناہی سلسلہ ہے۔ حیران ہوں کہ ابتدا کس رستے، کس مادے، کس سفر کی داستان اور کس انجمن کی روداد سے کروں!

علی گڑھ میں ریاض الرحمان صاحب شروانی (ریڈر شعبۂ عربی) سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مشورہ دیا تھا، بلکہ مطالبہ کیا کہ آخری ایام کے حالات ضرور قلم بند کرو، کیونکہ اس دور کے واحد عینی شاہد تم ہو۔ آخری ایام سے ان کی مراد ترقی اردو بورڈ کی چیرمینی کا دور تھا، لیکن اس دور کے واقعات کو بھی ایک مضمون میں بیان کر دینا ناممکن ہے، اس لیے میں ڈاکٹر صاحب کی چیرمینی کے آخری چند دنوں کی مصروفیات کے بیان تک محدود رکھوں گا۔

۴ فروری ۱۹۷۶ء کی صبح دس بجے دلی سے چندی گڑھ کے لیے روانگی ہوئی۔ دلی سے نکلتے ہی میں نے اپنے بیگ سے انیس نمبر اور ڈراما نمبر (آج کل دلی) نکال کر پیش کیا۔ انیس نمبر مجھ سے لے لیا۔ کرنال تک سفر اسی طرح گذر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے بریف کیس کو دریافت کیا۔ میں نے کہا، میرے پاس [illegible]۔ ذرا دیر کے لیے چہرے پر خفگی کے آثار [illegible] آپ گھبرائیں نہیں،

صبح ہوتے ہی بریف کیس آجائے گا۔" سفر بڑھ گیا اور رستہ کم ہوتا گیا یہاں تک کہ چندی گڑھ کی حدود نظر آنے لگے۔ مقرر کردہ منزل پر ہمارے دفتر کے ساتھی عثمانی اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فزکس کے استاد شری واستو صاحب مل گئے۔ ان کی رہنمائی میں پنجاب یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ پہلے سے ہی کمرہ نمبر ۶ مقرر تھا۔ میرے لیے کمرہ نمبر ۱۲ (بالائی منزل) بک تھا۔ جب علم ہوا تو فرمایا "آپ کو آنے جانے میں دقت ہوگی۔" اس اخلاق اور اخلاص پر دل تڑپ اٹھا۔ عرض گذار ہوا۔ "آپ تردد نہ کریں۔ میرا بیشتر وقت آپ کے پاس ہی گزرے گا۔" کمرے میں سامان رکھ کر رجسٹرار آفس آگیا۔ وہاں سے ڈاکٹر شارب ردولوی کو فون پر پیغام دیا کہ کسی کی معرفت بریف کیس روانہ کر دیں جو صبح سویرے تک یہاں پہنچ جائے۔

شام کو ۶ بجے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر پال نے گاڑی بھیج دی، اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ایک گھنٹہ بعد خوش خوش واپس آئے۔ اردو سے متعلق جو گفتگو ہوئی اسے اختصار سے بیان کیا۔

۷ فروری کی شام کو انجمن ترقی اردو شاخ چندی گڑھ کے ممبران نے حاضر ہو کر ایک یادداشت اردو کے مسائل کے سلسلے میں پیش کی۔ ۸ فروری کو پریم چند اور نذیر احمد پر سمپوزیم، گاندھی بھون میں ہونا تھا۔ پریم چند پر ڈاکٹر نامور سنگھ (صدر شعبۂ ہندی جواہرلال نہرو یونیورسٹی) کو اپنا مقالہ پڑھنا تھا۔ اس جلسے کی صدارت کے لیے ذمے داران یونیورسٹی نے آپ کو مجبور کیا۔ ڈاکٹر نامور سنگھ نے اپنی تقریر میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ پریم چند پر صدر جلسے کی موجودگی میں ایک لفظ بولنا سورج کو چراغ دکھانا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ نامور سنگھ کی تقریر بہت جامع اور پر مغز تھی۔ شام کی نشست میں ڈاکٹر قمر رئیس (ریڈر شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی) کو مولوی نذیر احمد پر مقالہ پڑھنا تھا۔ [illegible] پروگرام کی وجہ سے اس میں شرکت [illegible] ۸ فروری کو [illegible] سپرد [illegible] گیانی ذیل سنگھ [illegible]

سے ملاقات کا وقت طے تھا (تفصیل کے لیے ۲۲ر مارچ کا شمارا ہماری زبان ملاحظہ ہو) ۱۰ر مارچ کو وزیر تعلیم ہریانا سے ملاقات کی۔ اس کے بعد شعبۂ ہندی پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ نے استقبالیہ دیا۔ شام کو شعبۂ اردو جامعۂ شبینا اور انجمن ترقی اردو شاخ چنڈی گڑھ اور مختلف السنہ کے مدیران نے استقبالیہ دیا۔ ہر جلسے میں شرکت کی، خطاب کیا اور اپنی جامع شخصیت سے لوگوں کو متاثر کیا۔ چنڈی گڑھ کا یہ سفر ترقیٔ اردو بورڈ کی وضع اصطلاحات کمیٹی (قانون اور فزکس) میں شرکت و سربراہی کے لیے کیا تھا۔ ۸ر فروری کی صبح کو دلی کے لیے روانگی مقرر تھا۔ ۱۰ر فروری کو پہلے قانون کی کمیٹی میں تھوڑی دیر بیٹھے۔ پھر فزکس کی کمیٹی میں گئے اور آخر وقت تک وہیں بیٹھے رہے۔ ڈیڑھ بجے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی گاڑی پہنچ میں شرکت سے لیے آ گئی۔ میں نے اطلاع دی — فزکس کی کمیٹی سے رخصت ہو کر قانون والی کمیٹی کے ممبران کے پاس آئے۔ لوگ احترام کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے فرمایا۔ "آپ لوگ زحمت نہ کریں۔ میں تو آخری سلام اور آپ سے رخصت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ خدا حافظ" اس کمیٹی کے اراکین میں مرزا احمد علی صاحب سابق جج، رضا علی خان صاحب سابق جج راجستھان، پروفیسر مصباح حسن، صدر شعبۂ قانون مسلم یونیورسٹی اور ڈاکٹر معین الیقین اور قاضی ارشد مسعود گنگوہی شریک تھے۔ سب سے رخصت ہو کر رضا علی خان صاحب کی معیت میں بات کرتے ہوئے اور دلی آ کر ایڈمنسٹریٹو کو آخری شکل دینے کی ہدایت کرتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سہ پہر کو جامع مسجد چنڈی گڑھ کی عمارت دیکھنے گئے۔ ذاکر حسین روز (گلاب) گارڈن اور روک (چٹان) گارڈن کے مناظر سے لطف اندوز ہوئے۔

۱۱ر فروری کو صبح ۹ بجے روانا ہو کر ۲ بجے دن میں پہنچے۔ ۱۲ر فروری کو گھر پر ہی دفتر کے ضروری کاغذات دیکھے۔ ۱۳ر فروری کو ترقیٔ اردو بورڈ کے دفتر تشریف لے گئے۔ پچھلے کاموں کا جائزہ لے رہے تھے کہ ٹیلی فون پر کسی [illegible] سے بات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اتنے

دریافت کیا "تم نے نورالحسن صاحب کو خبر دی؟" "اچھا میں شام کو آؤں گا" پھر ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے استفسار کیا "کون تھا؟" جواب دیا۔ سجاد ظہیر مرحوم کی لڑکی تھی۔ رضیا کو قلب کا دورا پڑا ہے۔ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہیں۔" ۱۴ر فروری کی صبح کو اردو ویلو گرافی سیمینار میں شرکت کے لیے جامعۂ ملیہ جانا تھا۔ میں پہنچا تو غسل خانے میں تھے۔ تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلے تو سامنے ہی پوسٹ مین کھڑا تھا۔ ڈاک میں چند رسائل اور دو خط تھے۔ میں نے ایک لفافہ چاک کر کے خط حوالے کر دیا۔ ابتدائی سطر پڑھتے ہی کلمات تاسف منھ سے نکلے۔ میں نے سوادِ تحریر سے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ کیا ہے۔ چنانچہ مسئلے کی اہمیت کم کرنے کی خاطر میں نے کہا۔ "جی ہاں، ہفتے دو ہفتے سے نزلہ زکام اور بخار میں مبتلا تھے۔ پرسوں شب اچانک انتقال ہو گیا۔ میرے کہنے پر ایک نظر مجھے دیکھا، گویا شکوہ کر رہے ہوں کہ مجھ سے پہلے ذکر کیوں نہ کیا؟ چند لمحے کے لیے میں ہٹ گیا کہ چپراسی نے کہا "صاحب بلا رہے ہیں۔" میں قریب آیا تو بولے "تار بھیج دوں یا فون پر تعزیت کروں؟" میں نے کہا "نہ تار دیجیے نہ فون پر بات کیجیے۔ آپ کے پروفیسر پی۔ اے خان صاحب سے ذاتی مراسم تھے اس لیے آپ رضیا خان کو تعزیت کا خط لکھ دیجیے گا۔" اتنے میں گاڑی آ گئی اور ہم لوگ جامعۂ ملیہ کے لیے روانا ہو گئے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ رضیا سجاد ظہیر کی علالت اور پی۔ اے خان صاحب کی اچانک وفات کی اطلاع نے قلب پر ایسا تاثر پیدا کیا کہ تاب ضبط نہ رہی۔ جامعہ پہنچ کر بھی بے کیف رہے۔ میں نے پروفیسر مسعود حسین خان صاحب سے اس حادثے کی اطلاع اور دل گرفتہ کو سنبھال کر رکھنے کی استدعا کی۔ موصوف نے میرے اشارے کو سمجھا اور اپنی ذ[illegible] دلداری اور مصروفیتوں کے باوصف نزاکت وقت کا احساس کرتے ہوئے قریب ہی قریب رہے۔

سیمینار کی نشست اول [illegible] بجے ختم ہوئی [illegible] اور بے آب و رنگ سا کھانا [illegible] دیر آرام کے لیے مسعود صاحب اپنے [illegible]

لاج لے گئے۔ میں ہم رکاب تھا۔ مسعود صاحب نے کافی یا چائے کے لیے پوچھا۔ جواب نفی میں دیا پھر مجھ سے کہا "لائیے خط لکھ دوں"۔ میں نے پیڈ اور قلم دیا۔ رضیہ بیگم، پرنسپل گرلس کالج مسلم یونی ورسٹی کے نام آخری خط لکھا، جس میں بے ساختہ یہ مصرع لکھا کر ع

آج وہ کل ہماری باری ہے

۱۶ فروری کی صبح کو میں گھر پہنچا تو بے کیف اور خستہ حال دیکھا۔ بیگم۔ بیگم علیم صاحبہ سے دریافت حال کیا تو معلوم ہوا صبح چار بجے نیند آسکی۔ ابھی سو کر اٹھے ہیں۔ میں نے فوراً ڈاکٹر اسحاق صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ وہ خبر سنتے ہی آ گئے۔ معائنہ کیا۔ آرام کی ہدایت کی۔ اتنے میں ڈاکٹر سکسینا صاحب گاڑی لے کر آ گئے۔ جامعہ میں لائبریری سائنس پینل کی میٹنگ تھی۔ اس میں شرکت ضروری تھی۔ اسی دن سہ پہر ۳ ½ بجے وزارت تعلیم میں مخطوطات کے سلسلے کی اہم میٹنگ ہونی تھی۔ دونوں میں شرکت لازمی تھی، لیکن طبیعت کی بے کیفی اور ڈاکٹر کی ہدایت کے بموجب میں نے کہا۔ "آپ جامعہ نہ جائیے۔ شام کی میٹنگ میں چلے جائیے گا"۔ رد و قدح کے بعد میری گذارش مان لی۔ جامعہ کا جانا ملتوی کر دیا۔ ٹھیک تین بجے گاڑی آ گئی۔ وزارت تعلیم کی میٹنگ میں شرکت کے لیے گئے۔ وہاں پروفیسر ممتاز الدین احمد ڈاکٹر عابد رضا بیدار کو پٹنہ سے اور عرشی زادے اکبر علی خان کو رام پور سے خصوصی طور پر بلایا تھا تقریباً دو گھنٹے تک میٹنگ کی صدارت بھی کی اور ضروری مشورے و ہدایات بھی دیں۔ ۵ ½ بجے شام کو قیام گاہ پر واپس آ گئے۔ میں ہمراہ تھا۔ طبیعت بظاہر ٹھیک تھی، مگر چہرے پر تکدر اور بے چینی عیاں تھی۔ میں نے دو سال کی مدت میں پہلی بار یہ کہا کہ آج شب کو میں یہیں قیام کروں گا۔ چہرے پر بشاشت آ گئی۔ جیسے جیسے رات بڑھتی گئی، سردی زیادہ ہوتی گئی۔ بارش بھی ہونے لگی اور تکلیف تنفس میں اضافہ ہو گیا۔ نہ لیٹے چین نہ بیٹھے سکون۔ آخر ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا۔ اس نے دوائی دی، مگر افاقہ نہ [illegible] رات جیسے اذیت ناک گذرتی ہے۔ گذرنے لگی [illegible] تو مدد ہوئی۔ آخر شب میں ذرا آنکھ

ذرا آنکھ لگی، مگر چند منٹ سے زیادہ نہیں۔ یہاں تک کہ ۱۷ فروری کی صبح کا سورج طلوع ہو گیا۔ ۸ بجے میں نے ڈاکٹر اسحاق صاحب کو پھر زحمت دی۔ وہ آئے معائنہ کیا اور مشورہ دیا کہ ہسپتال میں داخل کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔ میں نے معالج قدیم ڈاکٹر ملہوترا سے ربط قائم کر کے ولنگڈن ہسپتال میں کمرا نمبر ۱۶ بک کرایا اور ڈاکٹر صاحب کی مدد سے ان کی معیت میں ان ہی کی اپنی گاڑی میں ۱۲ بجے دن کو ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ علی گڑھ ان کے اعزا کو فون کر دیا تھا۔ شام کا گاڑی سے زاہدا آ گیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر ملہوترا نے کہا کہ "ان کو خون دینے کی سخت ضرورت ہے"۔ میں نے کہا کہ آپ خون کا بندوبست کر دیجیے جو رقم ہوگی وہ ادا کر دی جائے گی"۔ ڈاکٹر نے کہا یہاں خون قیمت پر نہیں ملتا۔ خون کے بدلے خون دیا جا سکتا ہے۔ تب میں نے کہا میرا خون حاضر ہے"۔ چنانچہ میرا خون جانچ کیا گیا اور 'بی' گروپ تجویز پایا۔ مریض کا گروپ 'او' تھا۔ ڈاکٹر نے ساڑھے تین سو سی سی 350cc میرا خون لیا۔ غذا میں دودھ اور موسمی کا عرق بتایا۔ وہ خشی لینے لگے۔ ہسپتال میں داخل ہوتے ہی آکسیجن اور خون دیا جانے لگا۔ اس سے ان کو سکون ملا۔ نیند آئی اور لیٹنے میں بھی کوئی تکلیف نہ تھی۔ رات ۹ بجے تک بہت سے لوگ ملنے اور عیادت کی خاطر آئے۔ دفتر کے لوگ بھی اور دوسرے ہمدرد بھی۔ آخری فرد جو ان کے پاس سے رخصت ہوئے وہ شہباز صاحب تھے۔ بارش کی ابتدا شام سے ہی ہو گئی تھی جس کا سلسلہ رات کے گیارہ بجے تک جاری رہا۔ مجھ سے پوچھا "کھانا کھایا"۔ میں نے نفی میں جواب دیا اور کہا "دوپہر کو کھانا تاخیر سے کھایا تھا، اس لیے قطعی خواہش نہیں ہے"۔ ٹھیک کی بجے میں نے خاموشی میں بات ٹال دی، رات کو دس بجے نرس نے دوا دی۔ آکسیجن اور خون کی نلکیاں لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد سو گئے۔ ۲ بجے رات کے قریب سینہ سے پیر کی انگلیوں تک اینٹھن اور درد کی شکایت ہوئی۔ پہلے برداشت کرتے رہے پھر اظہار تکلیف کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو بتایا۔ اس نے درد کی خوراک دی، مگر اس سے بھی افاقہ نہ [illegible] ۶ بجے خون کی بوتل کا سلسلہ ختم ہوا [illegible] کی اذیت

چلی گئی۔ اب ۱۸ فروری کی صبح ہو گئی، طبیعت ٹھیک تھی۔ میں نے نماز صبح کمرے ہی میں ادا کی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کہا کہ کموڈ چارپائی کے پاس ہی لگوا دیجیے۔ نرس نے ایسا ہی کیا۔ کموڈ پر خود گئے، کوشش کی، مگر سابقہ دو روز کی طرح اجابت نہیں ہوئی، واپس چارپائی پر آکر لیٹ گئے۔ گرم پانی آیا۔ اسپنج کیا۔ کپڑے بدلے، دودھ اور چائے کا پورا پیالہ پیا۔ ۸½ بجے کے قریب اخبار دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اخبار گذشتہ دن کا رکھا گیا تھا۔ وہ دے دیا۔ دیکھنے لگے۔ میں نے شیروانی کی جیب سے چشمہ نکال کر دینا چاہا تو معلوم ہوا کہ چشمہ گھر سے آیا ہی نہیں ہے۔ سرخیاں دیکھ کر اخبار واپس کر دیا۔ مجھ سے ناشتا کرنے کے لیے کہا۔ نہ جانے کیوں میرے اپنے قلب کی طمانیت ختم ہو گئی تھی۔ نہ رات کچھ کھایا، نہ صبح خواہش ہوئی۔ وقت اسی طرح گذر گیا۔ ۹ بجے ڈاکٹروں کی پوری ٹیم معائنے کے لیے آگئی۔ رات کی سرگذشت تکلیف، درد اور اس کے خاتمے کے لیے اسباب سب کچھ خود بیان کیا۔ ڈاکٹر جہلوترا نے معائنے کے بعد خطرا ظاہر کیا اور دوبارہ خون دیے جانے کے بارے میں کہا۔ انتظام کیا اور سلسلہ شروع کرا دیا۔ ڈاکٹر تشویش ظاہر کر رہے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ لمحے لمحے بڑھتا جا رہا تھا، مگر دل کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ میرا ایک قدم کمرے میں اور دوسرا باہر ہوتا، مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ مریض اپنے طور پر کسی طرح کی بے چینی یا تکلیف کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ ہاں رات بھر ایک ہلکی [illegible] رہی، اس سے میرا ذہن سوا ہو گیا تھا۔ نرس سے میں نے کہا بھی۔ اس نے جواب دیا کہ زیادہ کھانا لینے سے بھی بی اپنی تکلیف سے رویا کرتی ہے۔" لیکن تشفی اس وقت بھی نہیں ہوئی جب ڈیوٹی والے ڈاکٹر سے میں نے ۱۱ بجے دن کے قریب دریافت کیا۔ "آخر آپ لوگ پریشان کیوں ہیں؟ مریض تو ویسے ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر نے ایک منٹ رک کر جواب دیا۔ "حالت کسی طور سے اطمینان بخش نہیں ہے۔" یہاں تک کہ ۱۲ بجے دن میں [illegible] پروفیسر [illegible] آئے، [illegible] انھوں نے سلام کیا۔ اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ دن کے ڈیڑھ بجے تک وہ ہسپتال [illegible] مرض [illegible] دیا۔ پھر [illegible]

کے لیے روانہ ہو گئے۔ ماجد صاحب کی روانگی کے بعد میں پھر کمرے میں آ گیا۔ دو ڈاکٹر ایک نرس ڈیوٹی پر موجود تھے، ایکایک میں نے دیکھا کہ مریض کے چہرے کا رنگ بدل گیا ہے، آنکھیں چڑھ گئی ہیں، تنفس تیز ہو گیا ہے، خون اور آکسیجن کی نلکیاں لگی ہیں، اس کے باوجود حالت غیر ہو گئی ہے۔ میں نے بڑھ کر آنکھ کے پپوٹے چھوئے، مگر خلائی نگاہیں پھر چھت کی طرف ہو گئیں۔ یہ شعور کی چھٹی حس نے کہا کہ زندگی کی شمع اب خاموش ہونے والی ہے۔ اس احساس نے بیدار کر دیا اور میں نے چیخ کر کہا۔ "اللہ کہیے، اللہ کہیے، اللہ" یہ الفاظ ادا ہونے کے ساتھ ہی دیکھا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ سننے کی طاقت تھی، بولنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔

دلی میں موت کی اطلاع سنتے ہی سب سے پہلے پروفیسر نورالحسن صاحب وزیر تعلیم تشریف لائے۔ اس کے بعد پروفیسر اخلاق الرحمان قدوائی صاحب مع بیگم اور کوٹھاری صاحب سابق چیرمین یو۔جی۔سی اور کرنل بشیر حسین زیدی، حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ، شاہد علی خان (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ) پروفیسر سید عابد حسین صاحب، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر سید مونس رضا عابدی، کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلی یونیورسٹی، جواہر لال یونیورسٹی کے اساتذہ نے شرکت کی۔ صدر جمہوریہ ہندستان نے اپنی مصروفیت اور بارش کی وجہ سے زحمت نہیں کی، مگر تعزیتی پیغام اور پھولوں کا گلدستہ ارسال کر کے شرکت فرمائی۔ وزیر اعظم ہند نے بھی اپنے تعزیتی پیغام میں پروفیسر عبدالعلیم مرحوم چیرمین ترقی اردو بورڈ کی علمی، ادبی، ملکی خدمت کی تعریف کی اور ان کے یکایک انتقال کو ملک و قوم کے لیے ایک سانحہ قرار دیا۔

قطعہ — رگھونندن راج سکسینا ابرام

دانا سمجھا ... وہ دیوانہ تھا
اپنا جانا ... [illegible]
جب آنکھ کھلی تو [illegible] میں آیا
[illegible] خواب تھا [illegible]

نسیم انہونوی

لکھنؤ سے کلکتا، بمبئی اور لکھنؤ

۲۶ر تا ۲۹ر نومبر کلکتہ میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس منعقد ہونے کا اعلان ہوا ہے جدید وقت تاسے اور لاؤڈ اسپیکر کا۔ آج کی دنیا پروپیگنڈے پر ہی چلتی ہے، اور دانا اور نادان سب پروپیگنڈے سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ لکھنؤ میں ہونے والی ایڈیٹرس کانفرنس دیکھ چکا تھا۔ ہندو بین کر اس شمالی اور اخلاقی شہر میں بھی بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن نہ جانے کیوں کلکتہ کی کانفرنس کے سلسلے میں ایک طرح کی خوشی پیدا ہوئی اور مجھ جیسا سفر چور آمادۂ سفر ہو گیا۔ لکھنؤ سے متعدد حضرات کے جانے کا پروگرام تھا، ان میں میرے دیرینہ دوست ایم سلیم رضوی اور حکیم عبد القوی صاحب بھی تھے، لیکن سفر میں ان حضرات کا ساتھ ممکن نہ ہو سکا۔ میں نے ۲۵ر کو روانگی کا پروگرام بنایا تھا، تاکہ ۲۶ر کو پہنچ کر آرام کرنے کے بعد ۲۷ر کو کانفرنس میں شرکت کی جائے۔ البتہ صباح الدین عمر صاحب سکریٹری اردو اکیڈمی یو پی کی برتھ بھی ۲۵ر ہی کے لیے ریزرو تھی میں نے کوشش کر کے ایک کرہ حاصل کیا۔ اس طرح یہ سفر نہایت دلچسپی کے ساتھ گذرا۔

بیچ میں ایک اسٹیشن پر میں نے دیکھا کہ ایک سکنڈ کلاس میں کمرشیل کے رستے سے چند قلی ایک سامان کو [illegible] کی طرح اندر ڈھکیل رہے ہیں، اندر [illegible] حالت [illegible] تھا، پھر علی ظہیر [illegible] گیا۔ میں نے صباح الدین [illegible]

کو یہ منظر دکھا کر کہا، اس جمہوری دور میں بھی اس فرق کو ملاحظہ فرمایئے۔"

کلکتہ جانے سے پہلے ہی میں نے حسب عادت واپسی کے ٹکٹ کا انتظام کرتے ہوئے عثمانی صاحب مالک عثمانیہ بکڈپو کو لکھ دیا تھا کہ وہ میرے لیے بمبئی میں تھری اپ سے ایک برتھ کا رزرویشن ۳۰ر نومبر کے لیے بمبئی کرا دیں اس لیے کہ مجھے براہ راست بمبئی جانا تھا، جہاں میری خوشدامن صاحبہ کے کینسر کا آپریشن ہونا تھا، لیکن اس کے بعد مجھے عزیزی مظفر سلمہ نے فون پر یہ خبر دی کہ وہ پہلی دسمبر کو ۱۱ بجے دن کے ہوائی جہاز سے فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے اپنی دلہن اور والدہ و خوشدامن صاحبہ کے ساتھ روانہ ہوں گے۔ کانفرنس ۲۹ر تک تھی اس لیے اگر میں ۲۹ر کی شب میں اس میل سے سفر کر سکتا جو براہ ناگپور بمبئی جاتا ہے، اور صبح ۸ بجے وہاں پہنچ جاتا ہے تو ان عازمان حج کو رخصت کر سکتا تھا۔ تبدیلی تاریخ ریزرویشن کے لیے میں نے پھر عثمانیہ بکڈپو کو لکھ دیا تھا لیکن ایسا ہو سکا یا نہیں اس کی اطلاع نہ مل سکی۔

پنجاب میل وقت مقررہ پر چھوڑ اپنا، میں تقریباً ۳۰ سال بعد کلکتہ گیا۔ میرا سابقہ سفر [illegible] کے آل [illegible] صاحب کے رقعے کی شادی کے سلسلے میں ہوا تھا۔ اس [illegible] ساتھ تھیں،

اور ہمارا قیام ایک حریمی بہن شہو وہاب صاحب کے یہاں پارک اسٹریٹ میں ہوا تھا۔

کلکتا میں حریم کے بہت زیادہ خریدار ہیں۔ انہیں میں ایک ہندو بہن نلیا سنہا صاحبہ بھی ہیں جو نہ صرف عرصے سے حریم کی خریدار ہیں، بلکہ ایک بہن کے ناتے ہر سال رکشا بندھن میں مجھے راکھی بھیجتی رہتی تھیں، اور اس سال تو وہ رکشا بندھن کے روز اپنی بیٹی سنگیتا سلہا کے ساتھ خود لکھنؤ آگئی تھیں۔

نلیا بہن کا ایک عرصے سے تقاضا تھا کہ میں کلکتہ کا سفر کروں، وہ خود کئی بار لکھنؤ آ چکی ہیں اور اپنے قیام کے لیے اس حقیر بھائی کے گھر کو پسند کرتی ہیں، اس لیے، اگر میں یہ کہوں کہ اس کانفرنس میں شرکت میں بڑی کشش بہن نلیا ہی کی تھی تو غلط نہ ہوگا، میں نے بہن نلیا کو اپنے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا، اور وہ اپنی کار لے کر تشریف لے آئی تھیں۔ ہوڑا اسٹیشن کے دو پلیٹ فارم ایسے ہیں جن کے درمیان سڑک ہے، اور پرائیویٹ کاریں ٹرین کے بالکل ہی سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

اس وقت کی بہن نلیا اور بیٹی سنگیتا کی خوشی دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔ کانفرنس کی جانب سے بھی چند حضرات اسٹیشن پر موجود تھے، لیکن ہمیں کانفرنس کی قیام گاہ میں ٹھہرنا تھا، اس لیے ہمارا سامان نلیا بہن کی کار میں رکھا گیا، لیکن جب ہم کار میں بیٹھنے کے لیے اس کے قریب پہنچے تو سنگیتا بٹیا نے کہا دیکھیے یہ پوچھ رہے ہیں کہ اس پیکٹ میں کیا ہے دکھائیے۔

ہمارے ساتھ صباح الدین صاحب کا ایک پیکٹ تھا جس میں موصوف نے اردو اکیڈمی کی مختصر روداد اور خدمات کا کتابچہ اسٹینسل کرا کے ساتھ لے لیا تھا کہ انہیں کانفرنس میں تقسیم کریں گے۔

میں نے ایکسائز والوں سے کہا جناب اطمینان رکھیے اس پیکٹ میں افیون، چرس یا گانجا نہیں ہے، ہم اطہر پرویز کانفرنس میں شرکت [illegible] آپ [illegible] سے کھول کر دیکھ لیں،

لیکن اس کے بعد وہ اپنی ناکامی پر مسکراتے ہوئے [illegible]
بہن نلیا نیو مارکیٹ کے متصل ہی ایک عالیشان فلیٹ میں رہتی ہیں۔ صباح الدین صاحب کو میں نے اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دی تھی اور انہوں نے قبول بھی کر لیا تھا، اور میرے خیال سے یہ اچھا ہی ہوا تھا اس لیے کہ کانفرنس کے پروگرام روداں بنا ہوا احمد سعید خاں صاحب ملیح آبادی [illegible] جو عین وقت پر ایسا علیل ہوئے کہ ان کی عیادت بھی نہ کی جا سکتی تھی، غالباً یہی وجہ ہے کہ سارا نظام درہم برہم تھا، اور آنے والے مندوبین کو طرح طرح کی شکایتیں رہیں، ان کے قیام کے لیے اسلامیہ اسکول کی عمارت حاصل کر لی گئی تھی لیکن ان کے لیے پلنگوں کا بھی انتظام نہ تھا۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی حضرات فرش پر بستر لگانے پر مجبور تھے۔

ہم نے ناشتا کیا، صباح الدین صاحب آرام کرنے گئے، بہن نلیا کے شوہر سنہا صاحب بھی [illegible] کی کالکا سے آنے والے تھے، سنگیتا انہیں لینے جا رہی تھیں اسی کے ساتھ میں بھی عثمانیہ بکڈپو آ گیا، تاکہ بمبئی کے رزرویشن کا علم ہو سکے۔ عبداللہ صاحب بغرض علاج حیدرآباد تشریف لے گئے تھے، لیکن ان کے فرزند ارجمند آغا سلیم موجود تھے انہوں نے ازراہ سخاوت سندھ بمبئی کے لیے تاریخ کا رزرویشن تھری اپ سے کرا دیا تھا، مگر واپسی ناگپور جانے والے میل سے ۹ بجے [illegible] میری ہدایت کے مطابق آغا صاحب نے [illegible] اے۔ پی بخشی کمپنی کے ذریعے روداں جناب حکیم [illegible] صاحب کو بھجوا دیا تھا۔ آغا صاحب نے [illegible] تھی، اسے [illegible] کر میں بخشی کمپنی گیا۔ یوسف صاحب موجود تھے لیکن بیحد مصروف، اس لیے [illegible] کے خازن سے خود موصوف کو اپنی [illegible] کم رہتی ہیں کہ یہ صعوبت بھی ان کے [illegible] تبدیل کرانے میں [illegible] کامیاب نہ ہو سکے تھے اس لیے [illegible] کے یہاں آ گیا۔ سنہا صاحب [illegible] سنہا صاحب قریب [illegible]

چکے ہیں نہایت ہی خوش اخلاق ملنسار اور ہمدرد انسان ہیں - کھانے کی میز تیار تھی اور نلیما بہن اور ان کی والدہ محترمہ نے اتنا تکلف کیا تھا کہ اسے بیان کرنا بھی دشوار ہے -

کھانے کے بعد فواکہات کا دور چلا - اس کے بعد ہم نے تھوڑا آرام کیا - شام کی چائے کے بعد ہم دونوں بینی میں صباح الدین عمر صاحب بنیا پوکھر کے اسلامیہ اسکول گئے جہاں ہندوستان کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے اردو اخبارات کے ایڈیٹرس کے قیام کا انتظام تھا - یہاں کی بے سرو سامانی کا جو عالم تھا وہ اسے بیان کرنے سے کیا حاصل - بہرحال مجھے اپنے ٹکٹ کو تبدیل کرانے کی دھن سوار تھی - معلوم کیا کہ رزرویشن کے سلسلے کا کام کسی صاحب کے سپرد ہے - ان کا پتا چل گیا، وہ دوسرے ایڈیٹرس کی واپسی کے لیے رزرویشن کروا رہے تھے اور معلومات حاصل فرما رہے تھے، میں نے کہا کہ آپ میرا کام کر دیجیے مجھے بڑی آسانی ہوگی -

کانفرنس کی طرف سے ان کے لیے کسی سواری کا انتظام تھا نہ کوئی رقم دی گئی تھی - ہوڑا اسٹیشن وہاں سے کئی میل دور تھا، اس لیے انہوں نے میری دعوت قبول فرمائی، اور ہم تینوں روانہ ہو گئے -

خیال تھا کہ جن صاحب کو ذمے دار بنایا گیا ہے، وہ معلومات رکھتے ہوں گے، لیکن وہ بالکل اناڑی تھے، تین گھنٹے تک ہمیں نہ جانے کہاں کہاں لے گئے، مگر بے سود انہیں یہ بھی علم نہ تھا کہ رزرویشن ہوڑا اسٹیشن سے نہیں ہوتا - اس کا آفس شہر ہی میں موجود ہے، بہرحال ۸ بجے رات کو ان سے پیچھا چھڑا کر ہم بہن نیلما سنہا کے یہاں پہنچے اور کھانا کھا کر T.V دیکھتے رہے، اور اس کے بعد گفتگو کا دور چلا - سنہا صاحب سے باتیں ہوتی رہیں اور پھر ہم سو گئے، اور صبح کھلی تو بیٹی موجود تھی شاید ہماری بیداری کی انتظار ہی میں تھی -

ناشتے وغیرہ سے فراغت کے بعد ہم کو یہ خبر ملی کہ بہن سنہا کے شوہر ڈاکٹر محمود صاحب کو نمونیا ہو گیا ہے اس لیے وہ آ نہ سکیں گے بہن سنہا کا گھر چھوڑ کر ہم شاید وہاں سے دو گھنٹے

آدھ گھنٹے سے زیادہ ڈیوٹی انجام دینا پڑتی ہو، لیکن ہم لوگوں کے آتے ہی اسے صبح سے رات کے ۹ بجے تک مسلسل ڈرائیونگ کرنا ایک آرام طلب ڈرائیور کے لیے ایکدم سے اتنی محنت ایک مصیبت ہی تھی اس لیے ہو سکتا ہے کہ نمونیا کا اس نے حیلا تراشا ہو بہرحال ہم کو اس خبر سے خود نمونیا میں مبتلا ہونے کا شبہ ہونے لگا، اس لیے کہ کلکتہ بمبئی جیسی جگہ میں کار کے بغیر آدمی بے کار ہو کر رہ جاتا ہے -

بہرحال ہم دونوں ٹیکسی کر کے رابندرا سدن ہال پہنچے جہاں کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہونے والا تھا - ہمارے لکھنوی رفقا امین سلونوی مولانا شمس لکھنوی، حکیم عبدالقوی وغیرہ اس وقت تک ہال میں نہ پہنچے تھے -

اجلاس کا وقت صبح ۹ بجے کا تھا، لیکن شیر کشمیر شیخ عبداللہ صاحب اس وقت تک تشریف نہ لا سکے تھے، اس لیے اجلاس شروع نہ ہو سکا، اور شروع اس وقت ہوا جبکہ اس کو ختم ہو جانا چاہیے تھا - اجلاس شروع ہونے سے پہلے کانفرنس کے صدر منتخب جناب حیات اللہ انصاری صاحب کو مخاطب کر کے اسٹیج لاؤڈ اسپیکر سے کہا گیا کہ حیات اللہ انصاری صاحب صدر منتخب اسٹیج پر تشریف لے آئیں، اور انصاری صاحب اٹھ کر اسٹیج پر پہنچ گئے - حیرت ہے کہ منتظمین کانفرنس کا یہ سلیقہ بھی نہ تھا کہ صدر کو کس طرح رونق افروز کر کے صدارت کیا جاتا ہے - بہرحال یہی اجلاس اس کانفرنس کا ایک کامیاب اجلاس کہا جا سکتا ہے -

مغربی بنگال کے وزیر اعلا جناب سدھارت شنکر رائے نے اپنا افتتاحی خطبہ پڑھا جس میں اپنی اردو دوستی کا ہی نہیں اردو کی ہر دلعزیزی کا بھی ذکر تھا - یہ خطبہ اردو دوستوں کے لیے بڑا ہی ہمت افزا تھا - موصوف کی تقریر سے یہ بھی اندازا ہوا کہ وہ ایک بیدار مغز وزیر اعلا ہی نہیں، بے تعصب انسان بھی ہیں اور انہیں اردو کے ساتھ ہی مسلم اقلیت کے ساتھ بھی دلی ہمدردی ہے -

عبداللہ صاحب نے سلیس اور دلکش اردو میں تقریر کی۔ موصوف اس کانفرنس میں مہمان خصوصی کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ نے لسانی تعصب سے بچنے کی ہدایت کرتے ہوئے اردو کے سلسلے میں بڑی ہمت افزا باتیں کیں۔ آپ کی تقریر میں ماضی اور حال کی سیاست کا بھی تذکرہ تھا آپ نے بنگالیوں کے جذبۂ حب الوطنی اور ان خدمات کا بھی اعتراف کیا جو جنگ آزادی سے متعلق تھیں۔

صباح الدین عمر صاحب نے اردو اکیڈمی روداد کا بنڈل گذشتہ ہی روز کانفرنس کے آفس میں ایک صاحب کے حوالے کر دیا تھا، تاکہ وہ اسے کانفرنس کے اجلاس میں تقسیم کرا دیں، لیکن وہاں کوئی کاپی تقسیم نہیں کی گئی۔ چند پمفلٹ صباح الدین صاحب نے احتیاطاً اپنے پاس رکھ لیے تھے اس لیے اسٹیج پر جاکر انہوں نے اسے خود تقسیم کیا۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہم دونوں اس لنچ میں شرکت کے لیے نہیں گئے جو گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں وزیر اعلا کی جانب سے دیا گیا تھا اس لیے کہ بہن نلیما صاحبہ کی اجازت ہی نہ تھی کہ ہم کہیں اور کھا پی سکیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کھانے پینے کا جو لطف نلیما بہن کے یہاں تھا وہ کہیں اور ہو ہی نہ سکتا تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد ہم نے قیلولا کیا، اور شام کی چائے پی کر پرشین ہال گئے جہاں سبجکٹ کمیٹی کی میٹنگ اور اردو مطبوعات کی نمائش تھی۔ میٹنگ میں کچھ ہنگامہ سا ہو رہا تھا، اور ہم دونوں ہنگاموں سے دور رہتے ہیں اس لیے نمائش دیکھنے لگے جسے شانتی رنجن بھٹاچاریا جی نے سجایا تھا۔ نمائش کامیاب تھی بنگال میں اردو کی قدیم مطبوعات کے نسخے دیکھنے میں آئے ساتھ ہی نیشنل بک ٹرسٹ دلی کا بھی اسٹال تھا جس میں اعلا معیار کی اردو مطبوعات تھیں۔

کچھ دیر وہاں ٹھہر کر ہم ریلوے آفس چلے گئے، اس لیے کہ صباح الدین عمر صاحب کی واپسی کا رزرویشن ابتک نہ ہو سکا تھا، حالانکہ انہوں نے پہلے ہی احمد سعید خاں صاحب کو لکھ دیا تھا جو اس کانفرنس کے روح رواں تھے، بہرحال خوش قسمتی سے دون ایکسپریس میں ۲۹ کے لیے صباح الدین عمر صاحب کو ایک برتھ مل گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر ہم جائے قیام پر واپس آگئے کھانے اور کافی وغیرہ سے فراغت کے بعد میں لیٹ گیا۔ صباح الدین صاحب اپنے پسندیدہ شغل سے دلچسپی لیتے رہے۔

صبح ناشتے سے فراغت کے بعد مجھے اپنی ایک قدیم بہن نور النسا سے ملنے جانا تھا جو مضافات کلکتہ ہارڈ فورڈ لین میں رہتی ہیں، ان بہن صاحبہ کا ایک ناشتے دان میرے ساتھ تھا تقریباً ۲۰ سال قبل وہ لکھنؤ آئی تھیں اور ہمارے ہی یہاں قیام کیا تھا۔ واپسی کے وقت وہ اپنا ناشتے دان مع ناشتا ہمیں بھول گئیں۔ گذشتہ سال ان کے صاحبزادے (نام بھول رہا ہوں) بسلسلے گیمس لکھنؤ آئے، قیام ان کا اسٹیڈیم ہی تھا۔ ملنے آئے تو میں نے واپسی کے سلسلے میں معلومات حاصل کرکے ناشتا تیار کرایا اور اسی ناشتے دان میں رکھ کر اسٹیشن گیا، لیکن ان سے ملاقات نہ ہو سکی اسی طرح وہ ناشتے دان پھر میرا مہمان بنا رہا اب کلکتہ جاتے وقت اسے میں نے ساتھ رکھ لیا تھا، تاکہ بہن نور النسا کو پہنچا دوں اور ان سے مل بھی لوں تاکہ انھیں شکوا نہ ہو۔

نلیما بہن کے ڈرائیور صاحب کو شاید علم تھا کہ ہم ابھی تک کلکتہ ہی میں ہیں اس لیے ان کا بخار اترا نہیں تھا ٹیکسی پر اتنی دور جانا اور ڈاڑی کی حیثیت سے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اسی کلکتا میں ایکبار زکریا اسٹریٹ سے میں بخشی کمپنی کو [illegible] گیا تو اس نے کافی رقم لے لی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ ہمارے اس سفر کا فاصلہ صرف ایک فرلانگ تھا بہرحال ہم نے ٹرام کے ٹکٹ لیے اور روانا ہو گئے پھر بس سے سفر کیا اور بمشکل تمام ہارڈ فورڈ لین تک پہنچ سکے ہماری اچانک آمد نے نور النسا بہن کے گھر میں ہلچل پیدا کر دی، ایک طویل مدت کے بعد ملنا ہوا تھا، خدا کے فضل سے اب ان کا خاندان کافی بڑا ہو گیا ہے، لڑکیاں بہت سے بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔

ہمیں کانفرنس میں جانے کی عجلت تھی [illegible] چائے پلائے بغیر جانے کی اجازت [illegible] ہم نے وعدہ کیا کہ ہم چائے پینے [illegible]

بڑی مشکل سے انہیں ان کا تاریخی ناشتے دان دکر ہم دونوں روانہ ہو گئے، لیکن برش ہال پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میٹنگ اسکول ہی میں ہو رہی ہے، جہاں سندوبین کا قیام تھا، نمائش البتہ مکمل ہو گئی تھی، لیکن دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ یہاں سے ٹیکسی کرکے ہم بین سنہا کے یہاں آگئے، اس لیے کہ بنیا پکر جانے کا آ شاید میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد میں آرام کرنے لگا اور صباح الدین صاحب نلیا بہن اور ان کی والدہ کے ساتھ تاش کھیلنے لگے۔

شام کو ہم ٹیکسی سے بنیا پکر گئے تاکہ لکھنؤ کے اپنے مخصوص احباب کو اپنے ساتھ لاکر نلیا بہن کے گھر چا پلاؤں، لیکن افسوس کہ جائے قیام پر صرف میرے دیرینہ ساتھی امین سلونی اور فروغ اردو کے روح رواں مولانا شمس کے سوا کوئی نہ مل سکا۔ بہرحال انہیں دو حضرات کے ہمراہ ہم نے واپس آکر نلیا بہن سے متعارف کرایا۔ سب کے ساتھ ہی چائے پی اس کے بعد ٹیکسی کرکے امین صاحب اور شمس صاحب واپس چلے گئے۔ میں نے اور صباح الدین صاحب نے نیو مارکٹ کا ایک جائزہ لیا جو ہمارے قیام گاہ کے برابر ہی ہے اور اپنی نوعیت کا ہندستان میں واحد مارکیٹ ہے جہاں نمک سے لے کر ہیرا تک مل سکتا ہے۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز یہاں فروخت ہوتی ہے اور ان کے علاحدہ علاحدہ اسٹیج ہیں۔

نلیا بہن کے یہاں اتنے پرتکلف کھانے ہوتے ہے اور انہیں زبردستی کھلایا جاتا تھا کہ میرا معدہ خراب ہو گیا تھا، میں پرہیزی کھانا کھانے کا عادی ہوں، اور خوراک اتنی مختصر ہے کہ میرے چند لکھنؤ کے احباب نے یہ شبہ کر رکھا ہے کہ میں ہومیو پیتھک دوز میں کھاتا ہوں۔ ۴۰ سال قبل میں جب کلکتہ گیا تھا مرحوم دوست خواجہ زاہد حسن صاحب نے کلکتہ کے زمیندار جرم کے بیٹے تھے، مرحوم کو میری [illegible] تھی کہ وہ میرا اور میرے ادارے [illegible] مرحوم کی وساطت سے [illegible] دعوت ہوئی تو مجھے یاد ہے کہ

دستر خوان پر تیس قسم کی مٹھائیاں تھیں، نمکین کوئی شے نہ تھی۔ نلیا بہن کئی کئی میٹھی چیزیں کھانے کی میز پر میری اشتہا بڑھانے کے لیے رکھتی تھیں، ان میں راج موہن مجھے اس درجہ پسند آیا کہ میں کئی کئی کھا جاتا ان کی لذت اب تک مجھے یاد ہے۔ نلیا بہن نے یہ راج موہن رخصت کرتے وقت بھی ساتھ کر دیے تھے، اور میں انہیں بمبئی پہنچ کر بھی کھاتا رہا۔ بہرحال اس وقت میں نے کھانا نہیں کھایا اور اس کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے روز میں ٹھیک ہو گیا تھا، لیکن نلیا بہن کے اصرار کے باوجود کھانے پر احتیاط برتنے لگا تھا، اس لیے کہ بمبئی کا طویل سفر ہمارے سامنے تھا۔

۲۹ کو ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم گریٹ ایسٹرن ہوٹل گئے یہاں احمد سعید خان صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کی صحت بہتر ہو چکی تھی، اس وقت سنٹرل کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہونے والی تھی۔ تماشا دیکھنے ہم دونوں بھی ہوٹل میں داخل ہو گئے کلکتہ کا یہ ہوٹل کافی شاندار ہے۔ پر پیچ رستوں والا ہوٹل بازار کی سیر کرتے ہم ہال میں پہنچے تو ہنگامہ آرائی کا منظر دیکھ کر میں واپس ہو گیا، اور صباح الدین عمر صاحب سے یہ طے پایا کہ وہ کھانے کے وقت تک نلیا بہن کے یہاں آجائیں گے۔

مجھے ان چند معتدد بک سیلرس سے بھی ملنا تھا جن سے ہمارا کاروباری رشتہ ہے، اس لیے میں سید کرو ڈالا اسٹریٹ اپنے ہمنام نعیمی نسیم بکڈپو پہنچا (مجھے افسوس ہے کہ جس ڈائری پر میں نے ان تمام حضرات کے نام نوٹ کیے تھے جن سے میں مل سکا تھا وہ بمبئی میں کہیں کھو گئی اور حافظے کی کمزوری کے باعث نام یاد نہ رہ سکے) اس کے پروپرائٹر ایک اچھے دوست نوجوان ہیں انہوں نے میری بڑی مدد کی اور میرے ساتھ ہے ان کے برادر [illegible] سوسائٹی بک ہاؤس ہے وہاں بھی چند منٹ بیٹھا چائے پی [illegible] پھر مدرسہ آ گیا جہاں عثمانیہ بکڈپو، تاج بکڈپو، ہلال بکڈپو، صدیقیہ بک ڈپو اور اقرار بکڈپو وغیرہ آ گیا۔ میں چند چند منٹ سب [illegible] میں گیا

چائے پر چائے پلا اور پھر سرسری ملاقات کا سلسلہ ختم کر کے واپس ہوا۔ نسیم بکڈپو کے پروپرائیٹر برابر میری رہنمائی کرتے رہے اور پھر ٹیکسی بلا کر دی جس پر میں کھانے کے وقت نیلما بہن کے گھر پہنچ گیا۔ اسی روز شام کو گریٹ ایسٹرن میں مشاعرہ تھا، اور اس سے پہلے ہی صباح الدین عمر صاحب کو روانہ ہونا تھا ویسے بھی میں اپنی صحت کی خرابی کے باعث اب مشاعروں وغیرہ میں شرکت نہیں کرتا۔ شام کو کھانا جلد کھا کر ہم ہوڑا اسٹیشن چلے گئے۔ صباح الدین صاحب کو جس فرسٹ کلاس میں کمپارٹمنٹ میں جگہ ملی تھی اس کی کھڑکیاں کھلتی ہی نہ تھیں، کنڈکٹر سے رپورٹ کی مگر بے سود ٹرین چھوٹنے کے بعد میں واپس آ گیا اور اب کچھ عجب سا لگ رہا تھا، سفر میں کسی کا ساتھ نہ ہو دل نہیں لگتا۔ لکھنؤ سے روانہ ہونے کے بعد سے شب و روز صباح الدین صاحب کا ساتھ رہا تھا۔ اب میں تنہا رہ گیا تھا اتنے بڑے بیڈروم میں تنہائی بے چین کن تھی۔ بہرحال کمپوز کی ایک گولی کھا کر سو گیا۔ صبح چائے سے فراغت کے بعد ہی میں نے اپنا وعدہ وفا کرنے کے لیے بہن نورالنسا کے یہاں چائے کا پروگرام بنایا اور نیلما بہن کے نوکر نے مجھے اس بس پر بٹھا دیا جو براہ راست براڈن فیلڈ رو جاتی ہے۔ بس سے اترنے کے بعد مجھے وہ سڑک یاد نہ رہی جس پر بہن نورالنسا کا مکان تھا، اب میرے حافظے کی خرابی دیکھیے کہ وہاں بس میں لوگوں سے ہارٹ فورڈ لین پوچھنے لگا جو بہن نیلما سنہا کی گلی کا نام ہے۔ لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی اب میں حیران تھا کہ بس والے نے مجھے کہاں اتار دیا کہ جہاں لوگوں کو اس سڑک کا پتا نہیں۔ کافی دور تک میں ہارٹ فورڈ لین کو ڈھونڈتا پھرتا رہا، لیکن پھر اچانک ایک اپنی اس بھول کا خیال آ گیا اور اپنے حافظے پر لعنت بھیج کر براڈن فیلڈ رو پر پہنچا، اس وقت بہن نورالنسا کا گھر ان کی لڑکیوں اور نواسوں نواسیوں سے بھرا ہوا تھا، مجھے کوئی غیر آ گیا ہو۔ میں ناشتہ کر کے نکلا تھا مگر میں نے ناشتہ کیا چائے پی اور دیر تک بیٹھا [illegible] محسوس ہوتی تھی یہاں۔ مرحوم

ام۔ ایچ خان صاحب بھی یاد آتے رہے جو بہن نورالنسا کے شوہر تھے اور جن کے ذریعے نورالنسا میری بہن بنی تھیں نورالنسا بہن کی والدہ بھی یاد آ گئیں جو ایک بار ان کے ساتھ لکھنؤ بھی آئی تھیں۔

یہاں سے رخصت ہو کر نیلما بہن کے یہاں پہنچا تو خوش خبری سنی کہ نیلما بہن کو ان کی کسی سہیلی نے ایک ڈرائیور دے دیا ہے، لیکن کچھ ہی دیر بعد پتا چلا کہ وہ گاڑی گیراج سے نکال ہی نہ سکا، اس لیے چلا گیا۔ نیلما بہن نے اپنی کئی سہیلیوں سے کہہ رکھا تھا، اس لیے کسی دوسری سہیلی کا فرستادہ آ گیا اور اس نے موٹر نکالا اس میں پٹرول کے ساتھ پانی کی آمیزش کسی نے کر دی تھی اسے بدلوایا گیا اور پروگرام بنا کہ اب شام تک کلکتہ کی سیر کی جائے، لیکن کلکتہ کی سیر قسمت میں لکھی نہ تھی۔ موٹر میں کوئی اور خرابی آ گئی، اس لیے پھر گیراج بھیجا گیا، لیکن وہ ۵ بجے تک ٹھیک ہو کر آئی۔ پانچ بجے عبدالاحد عثمانی صاحب مالک عثمانیہ بکڈپو سے ملنے جانا تھا۔ موصوف حیدرآباد سے اسی وقت آنے والے تھے، میں ٹیکسی لے کر لوور چیت پور روڈ گیا۔ بازار بند تھا، لیکن نسیم بکڈپو تو ذرا سا کھلا تھا اس لیے پروپرائٹر صاحب کو پھر زحمت اور ان کی رہبری میں عثمانی صاحب کے مکان پہنچ گیا موصوف اسی وقت حیدرآباد سے تشریف لائے تھے، ایک طویل مدت کے بعد ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میرے انکار کے باوجود موصوف نے مجھے ناشتہ کرنے اور چائے پینے پر مجبور کیا وقت کم تھا مجھے اسی شام کو بمبئی میل سے روانہ ہونا تھا، اس تشنہ ملاقات ہی پر اکتفا کر کے واپس ہو گیا نیلما ان کی والدہ اور سنگیتا بیٹی کے ساتھ مختصر سا کھانا کھایا اس درمیان کار درست ہو کر گیراج سے آ گئی تھی اس لیے میرا سامان رکھا گیا۔ نیلما بہن کی والدہ ضعیف اور خرابیٔ صحت کے باعث بہت [illegible]

میرے ناشتے کے ساتھ رکھا گیا تھا اس میں کپڑا بھگو کر اس کی گرمی دور کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ چلی لیکن کچھ ہی دور جا کر پھر رک گئی۔ بمشکل تمام وہ پاؤڈر بریج تک پہنچ سکی، اور پھر اس نے چلنے سے قطعی انکار کر دیا۔ ثریا بہن نے ٹیکسی کی فکر کی جو بس اتفاق ہی ہے کہ اسی وقت اس جگہ مل گئی وقت بہت کم تھا میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کہ نہ جانے ٹرین مل سکے یا نہیں بہر حال خدا کا شکر ہے کہ ہم وقت پر پہنچ گئے۔ میری جدائی ثریا بہن اور شکیلہ بیٹی کے لیے تاثر انگیز تھی، ہماری آنکھیں نم تھیں لیکن آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری ہی رہتا ہے۔ ٹرین کسی کے تاثرات کی فکر نہیں کرتی رسل ہوئی اور روانہ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد میں نے تھرمس سے کافی انڈیل کر پی اور لیٹ گیا، پھر سفر جاری رہا۔ صبح ہوئی تو مغل سرائے کا اسٹیشن آ گیا تھا، یہاں ہم نے ناشتا کیا، ناشتے میں میوہ جات بسکٹ مکھن اور بہت سی چیزیں میرے ساتھ تھیں، صرف چائے ہی مجھے منگانا پڑی، گاڑی مغل سرائے سے چل کر الہ آباد پہنچی تو میں نے ٹرین سے اتر کر امرود خریدے۔ الہ آباد کی دو ہی چیزیں مشہور ہیں۔ اکبر الہ آبادی جن کا اب صرف کلام ملتا ہے، دوسری امرود، مگر نام ہی نام تھا اس سے بہتر امرود میرے لکھنؤ میں ملتے ہیں۔

ہمسفر تینوں بنگالی تھے جن سے افسوس کوئی بے تکلفی نہ ہو سکی، اس لیے ہم گونگے کی طرح سفر کرتے تھے آخر کار ۱۳ دسمبر کو ۱۱ بجے کے قریب دادر پہنچ گئے جہاں قاسم بھائی [illegible] تمام متعلقین مع نجم السحر اور اس کی لڑکیا کے موجود تھے۔ گاڑی قبل از وقت پہنچ گئی تھی جس کا علم نہ تھا۔ منا طرسلا قدرے تاخیر سے پہنچے، اس لیے میں قاسم بھائی کے ساتھ باندرے چلا گیا، حالانکہ میرا [illegible] منا طرسلا کے یہاں جانے کا تھا۔ ہمارے [illegible] منا طرسلا یہاں بھی آ گئے، لیکن اب میں باندرا [illegible] اس لیے میں نے ان سے کہا کہ یہاں آ گیا [illegible] یہاں آ جاؤں گا۔ [illegible] اسپتال میں داخل ہو چکی

تھیں غزالہ جو ایک روز قبل لکھنؤ سے یہاں آ گئی تھیں کھانے سے فارغ ہو کر میں کچھ دیر اپنی نور نظر لخت جگر نجم السحر سلمہا سے باتیں کرتا رہا، اور اس کی سلمہا سے کھیلتا رہا جس نے اسٹیشن پر مجھے دیکھتے ہی میری طرف انگلی اٹھا دی تھی چند ماہ قبل جب وہ لکھنؤ آئی تھی تو میں اسے بہلانے کے لیے کھڑکیوں سے باہر اشارا کر کے کہتا "وہ کرا" اور وہ بھی ادھر بات بڑا اشارا کرنے لگتی یہ بات اسے اب تک یاد تھی اور میرے کچھ کہے بغیر ہی اس نے انگلی سے اشارا کر دیا تھا۔

۱۴ دسمبر کا دن اسی کے سلسلے میں ایک یادگار دن ہو گا، اس لیے کہ اسی روز اس نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ چلتی اور گرتی، چلتی اور گرتی، لیکن چلنے کا شوق گرنے کی چوٹ سے زیادہ پیارا تھا، اس لیے وہ اتنی ہی نہ تھی۔ معلوم ہوا کہ اب وہ شیر بن کر ڈراتی ہے اور خوں خوں کی آواز نکالتی ہے، اور یہ شغل اسے اس درجہ پسند ہے کہ اگر رو رہی ہو تو بھی کوئی کہہ دے کہ ڈراؤ تو وہ رونا بھول کر شیر کی سی آواز نکالنے لگتی مجھے بھی ڈرایا گیا اور پھر میں نے خوف زدہ ہونے اور بھاگنے کی ایسی ایکٹنگ کی کہ وہ بس ہر وقت مجھے ڈراتی ہی رہتی۔ اس کے خیال سے مجھ سے زیادہ ڈرپوک شاید اور کوئی نہ ہو گا۔

شام کی چائے پی کر منصور سلمہ مجھے ہسپتال لے گئے بانو بیگم وہیں تھیں، غزالہ میرے ساتھ تھیں۔ ہسپتال ہی سے میں قاسم بھائی کے ساتھ ان کے عزیز دوست ابراہیم بھائی سے ملنے گیا جو ہارٹ کے مریض ہیں اور جن کے انتقال کی خبر حریم کے سنانے میں جھجک ہے۔ ابراہیم بھائی گو ذی ہوش تھے لیکن ان کی آواز کی کڑک میں کوئی کمی نہ آئی تھی، مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے کچھ روز پہلے وہ قاسم بھائی ہی کے یہاں مقیم تھے، اس لیے کہ بڑے ہی لاپروا قسم کے انسان ہیں اور قاسم بھائی ان کی صحت سے فکر رکھنا چاہتے، اس لیے انہوں نے کوٹھی میں انہیں قید کر دیا تھا۔ کسی روز انہوں نے میرا کوئی ناول پڑھا تو ان الفاظ میں مجھ کو [illegible] تعریف کی، "تیرے باپ کا کیا جاتا ہے [illegible] تو اور کسی [illegible]

میں گھر میں اپنی بڑھیا (بیوی) اور بچوں کو بھی پڑا دوں گا۔

نجم السحر کے لکھنے پر میں نے اپنی کتابوں کا سیٹ مرحوم کو بھجوا دیا تھا۔ اس وقت ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے میری کتابوں کی بھولی تعریف بھیا زبان میں کی، اور دیر تک باتیں کرتے رہے دوبارا آنے کا وعدہ کر کے ہم رخصت ہوے۔

آپریشن کے لیے ۱۴ر دسمبر کی تاریخ طے پا گئی تھی، اور وہ دن کہیے کہ میرے لیے قیامت کا دن تھا۔ زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا۔ اس سے پہلے جب غزالا کا یوٹرس کا آپریشن ہوا تھا تو میں نے انھیں آپریشن تھیٹر میں نہ صرف جاتے، بلکہ عالم بیہوشی میں نکلتے بھی دیکھا تھا، لیکن اس آپریشن نے دل پر کوئی زیادہ تکلیف دہ اثر نہ ہوا تھا، اس لیے کہ آپریشن کی جگہ پوشیدہ تھی، لیکن اسی جان کاکینسر کا آپریشن اتنا بھیانک تھا کہ میں نہ جانے کیسے اسے دیکھ سکا۔ ۶ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں رہنے کے بعد جب ان کا اسٹریچر باہر نکلا تو غزالا کی بہن مسز ناہید عرف بانو بیگم بیچ بیچ کر رونے لگیں۔ غزالا بڑے ضبط صبر کا عالم ہیں۔ وہ صرف آنسو ہی بہا رہی تھیں اور میرا عجیب حال تھا۔ کیسے میں نے یہ منظر دیکھا اور ضبط کر سکا شاید، اس لیے کہ میں راہ فرار اختیار نہ کر سکتا تھا ورنا معلوم نہیں اس کا کیا مطلب سمجھا جاتا۔ خدا کی پناہ ایک طرف کا گال جبڑا اور ہونٹ کاٹ کر پھینک دیے گئے تھے۔ سر اور ماتھے کی کھال لے کر اسے پلاسٹک سرجری سے گال اور ہونٹ پر لگایا گیا تھا۔ ران کی کھال لے کر سر میں لگا دی گئی تھی۔ حلق میں سوراخ کر کے سانس لینے کے لیے ایک سیٹی لگا دی گئی تھی اور گردن ہی میں چھید کر کے ایک نلکی بلغم خارج کرنے کے لیے لگائی گئی تھی، زبان ایک طرف ٹانک دی گئی تھی، اور ناک میں ایک قیف ایسی لگا دی گئی تھی جس سے نلکی پیٹ تک گئی تھی۔ خدا کی پناہ بڑا ہی عبرت انگیز منظر تھا! اور اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا کمالی اور بد معاشوں کی دنیا میں کمی ہے جو ایسا نیک بندہ کو ایسی تکلیف دہ مرض میں مبتلا کیا۔ اسی طرح کسی [illegible]

کی بھی تکلیف نہ دیکھ سکتی تھیں۔ بلی کے بیمار ہونا تو تمام رات اس کے پاس بیٹھ کر گذار دیتیں کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی۔ نیکیوں کا ٹھکانا نہیں اسے خدا یہ تیرا کیا انصاف ہے کہ تو ایسے بندوں کو ایسی تکالیف میں مبتلا کرتا ہے۔

پرائیوٹ نرس کا انتظام کر لیا گیا تھا پھر بھی غزالا اور بانو بیگم دونوں اس رات ہسپتال میں رہیں بڑی سختی ہے، اس ہسپتال میں ایک سے زیادا تیمار دار رہنا چاہے تو بیس روپے روزانہ ادا کرے۔ بستر نہیں لا سکتا۔ پرائیوٹ وارڈ میں بھی مریض کے ساتھ زمین پر لیٹے۔ کھانا نہیں آسکتا باہر کے ہوٹل میں یا کینٹین میں جا کر کھائے۔ دونوں بہنوں نے یہ سب تکالیف اٹھائیں رات میں غزالا رہتیں اور دن میں بانو بیگم، اس لیے کہ صرف نرس اسی جان کے ساتھ رہ کر نباہ نہیں کر سکتی۔ بڑا ہی نورانی مزاج ہے ان کا۔ بہر حال ان تکالیف کے بعد بھی مرض جاتا رہتا یا چند سال ہی کے لیے وہ صحت مند رہ سکتیں تو سب کو گوارا ہوتا۔ افسوس کہ ایک ماہ تک ہسپتال میں رکھ کر آخر کار ڈاکٹروں نے انھیں رخصت کر دیا اور کچھ غیر ملکی قیمتی انجکشن دیدیے کہ گھر پر لگاتی رہو۔ آپریشن کے چند ہی روز بعد کینسر کے دانے پھر ابھرنے لگے تھے، اور اب وہ لکھنؤ آگئیں اللہ ان پر رحم کرے اور ان کی تکلیف کو دفع کرے، آمین!

۵ر دسمبر کو حسب وعدہ میں شاذ سلمہ کا مہمان ہو گیا۔ شاذ میاں میرے مرحوم دوست منظور الزماں جیلانی کے فرزند اوسط ہیں۔ منظر میاں اپنی والدہ دلہن اور خوشدامن صاحبہ کے ساتھ حج بیت اللہ شریف جا چکے تھے پھر بھی ماشا اللہ گھر بھرا تھا۔ دونوں بھائیوں کے بچوں سے خوب چہل پہل تھی وہیں کھانا کھا کر میں نے تھوڑی دیر آرام کیا پھر ان کی دلہن [illegible] بیٹا [illegible]

[illegible]

[illegible] منظر [illegible]

بمبئی میں تمام وقت میرے لیے وقف رہتی ہے' اس لیے کوئی دشواری نہیں ہوتی ورنہ بمبئی میں کہیں آنا جانا بے حد دشوار مرحلہ ہوتا ہے۔

باندرا سے غزالا کو لے کر ہسپتال پہنچا وہاں آٹھ بجے تک رہا۔ حالانکہ ۷ بجے بعد مریض کی اجازت نہیں۔ مقصود میاں، نجم السحر اور ان کی ممی یعنی قاسم بھائی کو لے کر آئے تھے' اس لیے باز بیگم انہیں لیا تو باندرا چلی گئیں' اور غزالا رات کی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے وہیں رک گئیں۔

۸ / تک میں مناظر سلسلہ کا بیان رہا' ہر کو دن کا کھانا کھانے میں اکبر جہاں سلمہا کے یہاں چلا گیا۔ یہ بچی ہے مرحوم دوست منظور صاحب مرحوم کی بچی ہے جسے میاں نے گود میں کھلایا ہے' اور پالا پوسا تھا۔ نجم السحر سے بعد اسی کو بیٹی کی حیثیت سے چاہتا ہوں۔ یہ پانچ منزل کی بلڈنگ میں آخری منزل پر رہتی ہے۔ سانس کی تکلیف کے باعث کئی سال سے اس منزل تک چڑھ نہ سکتا تھا' لیکن مرتا خدا کے فضل سے اس قابل تھا کہ کسی طرح اوپر پہنچ گیا۔ اکبر جہاں مجھے دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھی جو بچی تھا بیٹی کے یہاں کھایا اور اس سے رخصت ہو کر ہسپتال آگیا۔ اسی روز فلمی دنیا کے مشہور کہان جی آنند جی کی لڑکی کی شادی تھی۔ قاسم بھائی نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔

مجھے آج بہن طاہرا انصاری سے ملنے دلشاد جانا تھا اور ابراہیم بھائی سے بھی رخصت ہونا تھا' اس لیے میں نے کہا ٹھیک ہے پہلے تینوں جگہ چلیں گے اور ہسپتال ہی سے قاسم بھائی کے ساتھ چلا گیا۔

بہن طاہرا انصاری بیچ [illegible] سے آگئی تھیں اور [illegible] کی عیادت کے لیے ہسپتال ہی تشریف لائی تھیں [illegible] ولادت کی خوشی میں لڈو کھلائے۔

اور ڈبوں میں بھرے حصے ساتھ بھی کر دیے۔

طاہرا بہن سے مل کر میں فلمی شادی میں گیا' اس شادی کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بمبئی کے عظیم الشان ریس کورس میں منعقد ہوئی تھی اور میرا خیال ہے کہ اتنی بڑی شادی اور کسی جگہ ہو بھی نہ سکتی تھی' چونکہ فلمی دنیا کے تقریباً بیشتر ستارے اور متعلقین اس میں شریک تھے' اس لیے تماشائیوں کا عجیب عالم تھا۔ بڑے بڑے سنجیدہ لوگ بھی ان ستاروں کو دیکھنے کے لیے صف بستہ تھے۔ افسوس کہ اندھیرے میں دیکھ پاتا ہوں' اب نہ تیز روشنی میں' اس لیے میں ان ستاروں کو نہ دیکھ سکا جو محبوب کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ صرف دولہا دلہن سے متعارف کیے جانے کے وقت اشوک کمار کو ضرور دیکھ سکا جو اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے انہیں جوانی میں اس وقت دیکھا تھا' جب اردو کے سب سے مشہور فلمی رسالے کا ناشر تھا' اور اس کے سبب ہی فلمی ستاروں سے متعارف تھا۔

دولہا دلہن کے تعارف کے بعد صاحب تقریب نے قاسم بھائی کے لیے آئس کریم منگائی۔ میں نے کئی سال سے آئس کریم اور ٹھنڈا کھانا چھوڑ دیا ہے' اس وقت نہ جانے کیوں میں نے آئس کریم کا پیالہ اٹھالی اور کھانے لگا۔

شادی سے واپسی پر ہم شیر خان صاحب سے ملنے گئے جو صرف ریلوے میں عالا عہدے پر فائز ہیں' قاسم بھائی کے اچھے دوستوں میں ہیں۔ میں پہلے کئی بار بھی نیاز حاصل کر چکا ہوں۔ [illegible] شیر خان صاحب بھی قلب کے مریض ہو گئے ہیں [illegible] تھا بغیر ملے نہ جاؤں' لیکن وہ [illegible] موجود نہ تھے' اس لیے ہم ابراہیم بھائی کے [illegible] آگئے [illegible] شاید یہ آئس کریم کا [illegible]

ساتھ جانا [illegible] گئی لیکن ٹھیک رہیں
صبح ۸ بجے جنجرہ جانے کا پروگرام تھا قاسم بھائی
نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے وہاں لے چلیں جہاں میری
ایک بہت پرانی حریف بہن رضیہ سلطانہ رہتی ہیں
اور بڑے خلوص سے مجھے جنجرہ آنے کی دعوت
دیتی رہی ہیں اس مرتبہ میں نے طے کر لیا تھا کہ جنجرہ
ضرور جاؤں گا، لیکن آب و دانے نے اس مرتبہ بھی
نہ جانے دیا۔ صبح اٹھا تو حرارت تھی اور طبیعت گری
گری سی تھی۔ دوسرے ہی روز بمبئی سے روانا ہونا
تھا، اس لیے اس طویل سفر کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔
اور اچھا ہی ہوا کہ آرام کرنے کے باوجود بخار ایک
سو تک پہنچ گیا تھا شام کو بہر حال میں کسی طرح ہسپتال
گیا واپسی پر بخار اور بڑھ گیا کولڈن پر کولڈن کھاتا
رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

بمبئی میں ۹ روز گذر گئے تھے، لیکن میں اپنے
مرحوم دوست کی قبر پر فاتحہ پڑھنے نہ جا سکا تھا، آج
واپسی کا دن تھا ناظر میاں نے گاڑی حسب معمول بھیج دی
تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں عز الا کے ساتھ ہسپتال
گیا، ان کے پاس داخلے کا پاس تھا۔ میں نے اس
ناواقف داخلے کے سیلے ایک روپے کے نوٹ کو پاس
کی شکل میں استعمال کیا اور اندر پہنچ گیا، تاکہ ان جان
سے رخصت ہو لوں۔

ہسپتال سے سیدھا قبرستان گیا، خیال تھا کہ
قبر تلاش کرنے میں دشواری نہ ہوگی، لیکن بینائی
کی کمی اور بخار کی حالت میں آدھ گھنٹے تک
[illegible] تلاش کی لیکن نہ مل سکی [illegible]
[illegible]

بانو نے بہت کھانا تیار کیا تھا، قاسم بھائی اور منصور
سلمہ و سلیم سلمہ سب آ گئے تھے تھوڑا بہت کھا کر میں
نے چند منٹ آرام کیا۔ عز الا ہسپتال سے آ گئی تھیں
ہم سب گھر سے روانا ہو کر وی۔ ٹی کے عظیم اسٹیشن
پہنچے ٹرین لگ چکی تھی دو روز قبل ہی میں نے رزرویشن
کرایا تھا، پھر بھی اوپر کی برتھ ملی بہر حال بخار کی وجہ
سے اوپر کی برتھ آرام دہ تھی۔ اسٹیشن پر مجھے
رخصت کرنے قاسم بھائی، بہن ساجدہ، مسز قاسم
عز الا، عزیزی [illegible] سلمہ، منصور سلمہ، سلیم سلمہ، نجم
السحر سلمہا، شاہدہ سلمہا۔ پیاری گڑیا اسمیٰ اور
شاہد اکی گڑیا نیرو وغیرہ آئے تھے۔
نجم السحر کا سخت تقاضا تھا کہ میں بخار کی حالت
میں تنہا سفر نہ کروں وہ مسلسل رو رہی تھی لیکن ملازمت
حریم کی وجہ سے مجھے جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا تھا۔ ویسے
اگر اس ہفتے میں نہ روانا ہوتا تو نہ جانے کتنے روز بعد
رزرویشن ملتا اس لیے میں نے سفر کا پروگرام نہیں
بدلا۔ اس مرتبہ میں کوشش کے باوجود بہن تہذیبا
خانم صاحبہ اور ان کے شوہر محترم منشی صاحب سے
نہ مل سکا تھا۔ زہے نصیب کہ منشی صاحب اپنی بیوی کو رخصت
کرنے اسٹیشن تشریف لے آئے تھے اور موصوف سے میری
ملاقات ہو گئی تھی۔ بہن تہذیبا خانم صاحبہ پہنچ گئی سے
۱۳ اکتوبر کو آنے والی تھیں، اس لیے ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔
نجم السحر کو رخصت کرتے وقت یا اس سے رخصت
ہوتے وقت میرے جو جذبات ہوتے ہیں انہیں لکھنا
آسان نہیں بس مجبوری کا نام صبر ہے، اور اس جبر کی سل
سینے پر رکھ کر چلا آتا ہوں کاش نجم السحر کا ہونا
العزیز سے مرتے دم تک میرے ساتھ رہتا۔
ٹرین روانا ہو گئی — دادر، پھر کلیان اسٹیشن پر
گاڑی پہنچ گئی۔ [illegible] کلیان سے آگے [illegible]
[illegible]

آغا سہیل

بازیگر

میں ہوائی سفر تو کرتا ہی رہتا ہوں، لیکن کبھی ہوائی بیمے کی نوبت نہیں آئی یوں بھی موت و زیست اللہ کے ہاتھ ہے۔ بیمہ کرائیے یا نہ کرائیے کیا فرق پڑتا ہے، اس لیے نہیں کہ بیمے کی ضرورت میں آپ کو کچھ رقم فوری طور پر دینا پڑتی ہے بلکہ چاہے نہ چاہے تمام سفر ناخوشگوار گزرتا ہے، اور ذرا ذرا سی بات پر موت کا تصور بندھا رہتا ہے، اس وقت سے جبکہ آپ سفر کی تیاری میں پیٹیاں باندھ لیتے اور جہاز ایک غیر معمولی تیزی سے اٹھتا ہے، اور جب موسم کی خرابی کے باعث اس میں بمپنگ ہوتی ہے یا کسی مقام پر فضا میں کسی ہوائی خلا کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ زمین پر واپس آتے آتے۔ انسان چاہے نہ چاہے ہولیں کھاتا رہتا ہے، اور سفر کا مزا نہیں آتا، لیکن اس بار جیسے ہی میں نے گاڑی کو [illegible] چھوڑ کر ہوائی اڈے پر لاؤنج میں قدم رکھا کہ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہونے لگا کہ ڈھاکے کی پرواز کے لیے جہاز تیار ہے۔ میں جیسا جب تمام مراحل طے کر کے جلدی سے جہاز تک پہنچنا چاہتا تھا کہ اسی وقت ایک نوجوان خوبصورت دوشیزہ مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی اور بڑی خوش خلقی سے بیمے کے لیے درخواست کرنے لگی۔ ایسا بارہا ہوا ہے اور میں نے بیمے والوں کو جھڑک جھڑک دیا ہے، لیکن اس قدر عجلت کے باوجود مجھ سے اس درخواست کو رد نہیں کیا [illegible] فوری طور پر معلوم رقم اس کے [illegible] [illegible]

"شکریہ" حتیٰ کہ جہاز زمین سے اٹھا، فضا میں آیا اور نہ معلوم کتنی قسم کی آوازیں میں نے اور بھی سنیں، لیکن ان تمام آوازوں پر جیسے وہ آواز چھائی ہوئی تھی، "شکریہ"

ایسی من موہنی صورتیں بھی کم دیکھی ہیں جیسی اس بیمہ کمپنی کی ایجنٹ نے پائی تھی۔ لیکن [illegible] تو بچ بھی نہیں، وہی حوا کی بیٹی رنگ روپ کی اچھی اور ناک نقشہ کی درست اللہ اللہ خیر سلا، لیکن کوئی ایک بات اس میں ایسی منفرد تھی کہ ایک بار دیکھ کر پھر دیکھنے کو بے تحاشا ضرور جی چاہتا تھا اور آج بیمے کی رسیدات لیے ہوئے ذہن میں موت کا تصور ستا رہا تھا اور نہ مجھے موت کا تصور ستا رہا تھا اور نہ مجھے کسی طرح کی کوئی وحشت ہو رہی تھی، میں تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ میرے ساتھ ہے، اس کی خوشبو میرے اندر جذب ہے اور وہ لمحہ جو انتہائی اضطراری اور عجلت کی کیفیت کا حامل تھا اور حقیقت میں بے حد مختصر تھا۔ میرے لیے بے حد طویل اور فرحت ناک محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لمحہ جس میں وہ میرے پاس آئی۔ درخواست کی رقم دیکر رسید دے اور چلی گئی اپنے اندر بہت کچھ رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک وہ میرے ساتھ ساتھ تھی، اس کی مسکراہٹ اس کی چال اور ہرنی کی طرح آنکھوں کی چمک جس میں کیا کیا کیفیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ [illegible] ممکن نہیں میرے سفر پر وہ چھائی ہوئی تھی [illegible] [illegible]

کراچی، پنڈی میرے لیے کوئی خاص معنی نہیں رکھتے، لیکن اس بار ڈھاکے کے چند دن گذارنے دشوار ہو گئے۔ لاہور کے ہوائی اڈے کا لاؤنج مجھے برابر کھینچتا رہا اور کام پورا کرکے اپنی جان چھڑا کے میں بھاگا تو سیدھا لاہور پہنچ کر میں نے دم لیا۔ دھڑکتے ہوئے دل سے لاؤنج میں قدم رکھا۔ میری طرح نہ معلوم کتنے مسافر اور بھی آئے تھے۔ بیما کمپنی کے چھوٹے سے اسٹال نما دفتر پر نگاہ ڈال ادھر ادھر نگاہوں میں اسے تلاش کیا، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ میرا سامان باہر نکل آیا۔ میں نے آوارہ نظروں سے تمام ہجوم میں اسے تلاش کیا، لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی اور اس لیے گھر واپس آ گیا۔

حسن اتفاق سے مجھے پنڈی جانا پڑ گیا۔ میں یہ سفر ریل یا موٹر سے بھی کر سکتا تھا لیکن عمداً میں نے ہوائی سفر کو ترجیح دی۔ کچھ دیر پہلے ہی سے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا اور لاؤنج میں پڑے ہوئے، ایک صوفے پر جا بیٹھا اور اسے نگاہوں ہی نگاہوں میں تلاش کرنے لگا۔ معاً کوکا کولا کے اسٹال پر وہ مجھے نظر آئی۔ اس کے ہمراہ ایک اور لڑکی تھی، دونوں کوکا کولا پی رہی تھیں، کسی نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ اس وقت کوئی جہاز آیا ہوا تھا۔ مسافر مسلسل باہر آ رہے تھے۔ آنے والے مسافروں سے بیٹھے والوں کو بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، اس لیے وہ بڑے اطمینان سے مسکرا مسکرا کر کوکا کولا پی رہی تھیں اور باتیں بنا رہی تھیں۔ میرے جی میں آیا کہ جاؤں اور کچھ نہیں تو ایک کوکا کولا لے کر پاس کھڑے ہو کر پینے لگوں۔ مجھے یہ بات بڑی بھونڈی اور [illegible] معلوم ہوئی، میں بد قسمتی سے جس ماحول میں رہا ہوں اس میں ہر بات کو وقار اور سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں اس وقار اور سلیقے پر غور کرنے لگا۔ معاً اس نے مجھے دیکھا اور یوں دیکھا جیسے [illegible] کہیں دیکھا ہے، شاید اس نے مجھے نہ پہچانا ہو۔ بھلا ہزاروں مسافروں کو ایک پل میں کوئی کب تک کسی کسی کو یاد رکھ سکتا ہے۔ [illegible] اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہو۔ [illegible] ایک

دھکا رسید کیا اور وہ اس طرح کھلکھلا کر ہنسی کہ نقرئی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں، اس کے باوجود [illegible] طرح بے باکی سے اس کا ہنسنا اچھا معلوم نہ ہوا۔ اس کی دوست پر بھی غصہ آیا جو بلا وجہ بھی [illegible] سی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ کوکا کولا ختم کر دونوں بیما کمپنی کے اسٹال نما دفتر میں چلی گئیں کیبن کے اندر غائب ہو گئیں۔

لاؤنج اب صاف ہو گیا اور آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ معاً اس لڑکی کی سہیلی باہر بیمے کے لیے لوگوں سے درخواستیں کرنے لگی۔ میں [illegible] ہوا بیما کمپنی کے اسٹال پر چلا گیا اور اندر جب نگہ دیکھا تو وہ بڑی دلجمعی کے ساتھ بیٹھی ہوئی کچھ [illegible] رہی تھی۔ کاغذات اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے "ابھی بہت وقت تھا" اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ میرے اور اس کے درمیان شیشے کی ایک دیوار حائل تھی، اس نے اٹھ کر چھوٹا سا دروازہ کھولا اور بڑے اخلاق سے بولی۔

"اندر تشریف لے آیئے۔"

میں چلا گیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا کہ وہ میری کیا خدمت کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے یہ سارا اخلاق اور تمام باتیں کاروباری نوعیت کی تھیں۔ میں نے بیما کرا لیا اس نے شکر ادا کیا لیکن اس شکریے میں جیسے یہ اشارا تھا کہ اب بس ملاقات ختم ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بیما کمپنی کا دفتر تھا۔ نہ کلب تھا، نہ ڈرائنگ روم اس لیے میں نے بھی خوش اخلاقی سے شکریہ ادا کیا اور مسکراتا ہوا باہر آ گیا۔ اعلان کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ وہ بھی آ گئی۔ اس نے میرا بریف کیس سنبھال رکھا تھا۔

"مسٹر غنی یہ آپ کا بریف کیس۔"

آپ یقین کیجیے میں نے عمداً بریف کیس وہاں نہیں چھوڑا تھا، کیونکہ اس میں بے حد قیمتی کاغذات تھے۔ اس بریف کیس کو تو میں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا، لیکن اس کی مسرور حسین شخصیت میں کچھ ایسا جادو تھا کہ میں [illegible]

[illegible]

...کہا، اس بریف کیس کے بغیر یہ سفر بالکل فضول ثابت ہوتا۔

"شکر ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میری نگاہ آپ کی کرسی پر پڑ گئی۔"

"میں ممنون ہوں، باقاعدہ شکریہ پنڈی سے واپسی پر ادا کروں گا۔"

میری یہ بات سن کر وہ مسکراتی ہوئی اپنے کیبن میں واپس چلی گئی، اور جب میں دوسرے دن لوٹا وہ وہاں نہیں تھی، نہ لاؤنج میں، نہ کیبن میں۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں باہر نکلا تو بیما کمپنی کی ٹیکر وین میں نے اسے سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ بالکل اتفاقیہ میری کار بھی اسی وین کے پیچھے چلتی رہی۔ گلبرگ کے ایک عالی شان بنگلے میں وہ وین داخل ہو گئی اور میری کار آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد جب وین واپس ہو کر میری کار کے پیچھے پیچھے چلنے لگی تو میں نے دیکھا وہ اس میں نہیں تھی، یعنی وہ اس عالی شان مکان میں رہ گئی تھی۔

اس طرح گویا مجھے اس کا مکان تو معلوم ہو گیا تھا، لیکن دو قباحتیں تھیں۔ ایک تو یہ یقین کرنے کو دل کسی طرح بھی تیار نہیں تھا کہ اتنے عالی شان مکان میں رہنے والی بیما ایجنٹ ہو سکتی ہے، دوسرے یہ کہ رسید پر اس کے دستخط واضح نہ ہونے کے سبب اس کا نام معلوم نہیں تھا، لیکن پہلی بات بہت گمبھیر تھی۔ یہ طلسم سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس مکان کی اگر وہ مالکہ ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ لکھ پتی ہو گی اسے بیما ایجنٹ بننے کا شوق چرایا تھا اور اگر وہ کرایے دار تھی تو وہ ہزاروں روپے ماہوار [illegible] لائق ہو گی۔ جو سینکڑوں روپیا ماہوار [illegible] کا کرایا ادا کر سکے یہ بھی ہو سکتا ہے وہ کسی سہیلی [illegible] ہو اور وہ اس کا مکان نہ ہو یا جیسے [illegible] ملاقات کرنے گئی ہو۔ بہر حال کوئی [illegible] نہ ہو سکا اور میں سوچ میں پڑا رہا [illegible] کے بعد ایک اور سفر درپیش ہوا [illegible] کیبن میں [illegible] کو میز کے سامنے [illegible] کے ٹکٹ اس

کے سامنے رکھتے ہوئے بیما کمپنی کی مطلوبہ رقم اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور ایک ادا سے اس نے مجھے سلام کیا اور میں بولا محترما میں آپ کا دوہرا شکرگزار ہوں۔

"وہ کیسے؟" اس نے پوچھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بیمے کا قایل نہیں تھا، لیکن ہونا پڑا۔

"اچھا؟" اس نے کہا، "مگر وہ کیسے؟"

بس نہ پوچھیے۔ ہو گیا ایک روز قایل۔

"اچھا چھوڑیے دوسری بات۔" اس نے دلچسپی سے کہا۔

دوسری بات، وہی بریف کیس۔

بات اصل میں یہ ہے کہ مجھے آپ کا مکان تو معلوم ہے۔

اتنی بات سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا میں گھبرا گیا اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں وہیں گلبرگ میں رہتا ہوں، بس ذرا آپ سے آگے۔ اصل میں میں آپ کے گھر جا کر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن ڈرا کہ مبادا آپ کو بن بلائے مہمان کا آنا۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، شکریے کی کیا بات ہے غنی صاحب، وہ تو میرا فرض تھا۔ گھر آپ کا ہے جب جی چاہے آیئے امی کو آپ سے مل کر بڑی خوشی ہو گی، لیکن ابھی تو آپ کراچی جا رہے ہیں۔"

"میں چار روز کے بعد واپس آ جاؤں گا،" میں نے بڑی بے چینی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر بولا۔

"معاف کیجیے گا، آپ نے اپنا نام تو بتلایا ہی نہیں۔"

"نام کی کیا ضرورت ہے، ویسے مجھے فوزیا کہتے ہیں۔" وہ بولی۔

"بس فوزیا آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، میں ضرور آؤں گا۔"

یہ کہہ کر میں اٹھ بیٹھا، اس نے بریف کیس اٹھا کر میرے ہاتھ میں دیا اور میں بے اختیار ہنسنے لگا اور اسے بھی ہنسی آ گئی اور آج غالباً پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں [illegible] نہیں تھیں۔ میں ہنستا ہوا لاؤنج کے آخر [illegible] پہنچ گیا

ایک بار پھر گھوم کر پیچھے نہ دیکھا، لیکن مجھے یہ
محسوس ہوا کہ وہ نگاہیں مجھے برابر دیکھ رہی ہیں،
میری نگراں ہیں، میری پیٹھ میں گڑی ہوئی ہیں اور
میں نے مڑ کر بھی دیکھ لیا تو سیدھی دل میں جا کر پیوست
ہو جائیں گی۔ لاؤنج سے رن وے کی طرف جاتے ہوئے
میں نے ایک بار دیکھ ہی لیا۔ اُف میرے اللہ وہ
سچ مچ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے رن وے کی طرف
مڑنے سے پہلے بھرپور نگاہوں سے اسے دیکھا تو
اس نے ہاتھ اٹھا کر الوداع کہا۔ میں ذرا سا جھکا
اور ہاتھ ہلاتا ہوا چل دیا۔ سفر اچھا گذرا۔ کراچی
ہمیشہ میرے پاؤں جکڑ لیتا تھا۔ وہاں کے عمدا عمدا
نفیس ہوٹل، وہاں کے کھانے، رقص اور شرابیں
میرے لیے بڑے جذب و کشش کے حامل ہوتے تھے،
لیکن اس مرتبہ تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ یار
دوستوں نے بہت کچھ لالچ دیے۔ ایک بڑے اچھے
ڈنر کی دعوت ملی، وہ رد کر دی اور سیدھے لاہور
آ پہنچا، اور میری توقع کے عین مطابق فوزیا میری
منتظر تھی۔ اس نے آتے ہی مجھ سے کہا۔

"آپ آ گئے۔ بڑا اچھا ہوا۔ پرسوں شام
کو آپ میرے غریب خانے پر چائے نوش کیجیے
اماں اور بھائی احسان آپ کے منتظر ہوں گے۔"

میں پھولا نہ سمایا۔ یہ کیا مژدہ تھا۔ وقت
کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ آخر کار اللہ اللہ کر کے
وقت معینہ سے کچھ پہلے ہی تیار ہو کر ٹہلنے لگا۔
گاڑی تیار کھڑی تھی۔ میں لپکتا ہوا پورٹیکو میں گیا۔
شوفر کو گاڑی میں نہ بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود ہی
گاڑی میں جا بیٹھا اور چند ہی منٹ میں فوزیا کا
گھر آ پہنچا۔

جیسا میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک عالی
شان مکان تھا جن لوگوں نے لاہور دیکھا ہے اور
گلبرگ کے مکانات بھی دیکھے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ
گلبرگ میں مکانات کس قدر پرتکلف اور اچھے بنے
ہوئے ہیں جس وقت کسی ایک مکان کو دیکھیں اور
غور سے جائزہ لیں تو یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اب اس
[illegible] آپ دیکھتے

دیکھتے تھک جائیں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ گلبرگ
میں مکان اچھے ہی اچھے ہوتے ہیں برے ہیں ہی نہیں
سو یہ مکان بھی گلبرگ میں واقع تھا۔ باہر سے دیکھیے
تو سبزہ زار پر سپید سپید شبنم کے قطرے کی طرح
دمکتا نظر آئے گا، اندر آ جائیے تو قدم قدم پر حسن و
خوبصورتی کے جلوے بکھرے نظر آئیں گے، اور آپ
کی توجہ کو جذب کر لیں گے۔ پورٹیکو میں داخل
ہوتے ہی شیشے کے دروازے سے ملازم برآمد ہوا
سرکار کا دروازہ کھولا، مجھے خوش آمدید کہا، دروازہ
کھول کر مودبانہ انداز سے اندر جانے کے لیے تھوڑا
جھک کر ہاتھ سے رستہ بتایا۔ میں اندر داخل ہوا
تو ایک وسیع و عریض برآمدہ تھا جہاں جا بہ جا
سنگ مرمر کے مجسمے دھرے تھے، قالین بچھے تھے
چھتوں پر جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے اور
پورے ماحول میں عجیب رعب کن سناٹا چھایا
ہوا تھا جہاں خود بخود انسان تکلف پر مائل ہونے
لگتا ہے۔ قدم بھی ناپ کر تول تول کر اٹھاتا
ہے اور پھونک پھونک کر چلتا ہے۔ میں جہاں
پر کھڑا سوچ رہا تھا اور عالم محویت میں تھا کہ اس
کی بغل سے ایک بڑا ہی نفیس چوبی زینہ جس پر
قالین بچھے ہوئے تھے اوپر چلا گیا تھا۔ فوزیا میری
طرف آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے صرف نیلگوں ساری
باندھ رکھی تھی، نیلگوں بلاؤز اور نیلے آویزے کانوں
میں ہلکورے لے رہے تھے۔

"ہلو مسٹر غنی۔ آئیے۔ آئیے۔"

بڑی مترنم آواز گونجی، کچھ میں بڑھا، کچھ وہ بڑھی اور ہم
نے خلاف توقع بے تحاشا ہاتھ ملائے اوپر کا ماحول
اس سے بھی زیادہ پرتکلف تھا۔ ہم ڈرائنگ روم
میں پہنچے جس کے [illegible] تھے اور بہترین
بلوریں دیواریں تھیں [illegible] کا نفیس فرش جس پر
قالین بچھے ہوئے کہ چلیے تو آواز سنائی نہ دے اور
ڈرائنگ روم اس قدر کشادہ اور وسیع [illegible]
پھر [illegible] یہاں بھی جھاڑ فانوس [illegible]
اور قیمتی آرائشی سامان [illegible]
[illegible]

میں سوچنے لگا۔ صوفا دیکھے تو دیکھتے ہی رہ جایئے قدیم اور جدید دونوں وضعوں کے مختلف سیٹ، بہر آرام دہ فوم کے کشنوں سے آراستہ۔ تو یہ ہے فوزیا۔

میں سوچنے لگا اور آج پہلی بار خود ناز [illegible] کرنے لگا کہ ابھی تک مکان کو باہر سے دیکھ کر اسے ایک پتی سمجھا تھا، اب تو اس کے ہونے میں کلام نہیں اور ایک میں ہوں کہ سال کے سال محض دو تین لاکھ کما لیتا ہوں تو گویا زمین پر پاؤں نہیں دھرتا۔

"آپ تشریف رکھیے، میں ذرا اماں کو بلا لوں انہیں آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔"

"ضرور ضرور۔ مجھے بھی ہے۔"

میں بیٹھ گیا، اور بڑے غور سے دیکھنے لگا، میرے سامنے سے فوزیا گزر گئی ساڑی میں ملبوس وہ ایسی سبک روی سے چلتی ہوئی دروازے تک گئی جیسے دریا کی سطح پر موج۔ فوزیا میرے لیے بڑی پراسرار بن گئی تھی۔ کہاں ایک بیما ایجنٹ اور کہاں یہ عالی شان محل اور یہ ساز و سامان۔ ڈرائنگ روم میں وسیع و عریض پینٹنگز لگی ہوئی تھیں جو قیمتی غیر ملکی مصوروں کے موقلم کا نتیجہ تھیں۔ ان میں سے کسی بھی پینٹنگ کی قیمت دس پندرہ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ اصلی ریشم اور مخمل کے پردے پڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ پر ایسا نفیس آرائشی سامان چنا ہوا تھا کہ دیکھتے رہیے۔ اٹھ کر شمالی پردوں کو اٹھایا تو ایک ہال نظر آیا جہاں بیک وقت چالیس پچاس آدمی کھانا کھا سکتے ہیں۔ طرح طرح کے قیمتی شیلوز اور کراکری اور کٹلری سے آراستہ اور تصاویر سے مزین۔ جنوبی پردا اٹھایا تو کونے میں بار بنا ہوا تھا جہاں عمدہ عمدہ شرابوں کے قرابے لگے ہوئے تھے اور نفیس بوتلوں [illegible] پیمانوں سے چھلکتے ہوئے۔ سامنے چار [illegible] اسٹول دھرے ہوئے تھے۔ گویا فرنٹ شمالی [illegible] کھینچ دیے تو ڈرائنگ روم [illegible] ہو سکتا تھا۔

[illegible] میں نے سوچا کہ اس مکان کا [illegible]

اتنا قصور ہے کہ بدقسمتی سے اسے مشرق بعید کے ایک ایسے حصے میں بنایا گیا ہے جہاں فضاؤں میں ہواؤں میں مشرقیت ہے۔ مکان کی ایک ایک تہہ میں مغربیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ آپ یورپ کے کسی امیر کبیر گھرانے میں آ گئے ہوں۔ تو یہ فوزیا ہے کی بلا۔ اور میں کہاں آ گیا ہوں۔ اللہ اللہ ہمارا ملک کتنی ترقی کر چکا ہے، سچ ہے جو قوم تاج محل، لال قلعہ، فتح پور سیکری لاہور اور کشمیر کے باغات لگا سکتی ہے، وہ ایسے مکانات بھی تعمیر کرا سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ میں بلاوجہ حسد میں مبتلا ہو گیا ہوں ہو سکتا ہے کہ چند سال میں میں بھی لکھ پتی سے کروڑ پتی بن جاؤں اور ایک ایسا ہی مکان میں بھی بنوا سکتا ہوں، لیکن فوزیا ایک بیما ایجنٹ کیا وہ ایسے مکان کی مالک ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ مکان فوزیا کے بھائی کا بھی تو ہو سکتا ہے۔ ابھی میں یہ باتیں بیٹھا سوچ ہی رہا تھا کہ فوزیا اپنی اماں کو ساتھ لے کر داخل ہوئی، اس کی اماں سفید ساڑی میں ملبوس تھیں پینتالیس اور پچاس کے بیچ میں ہوں گی۔ سبک سبک ناک نقشہ جو پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ جوانی میں فوزیا سے مشابہ تھا۔ سرخ و سپید رنگت، وہ سراپا خلوص و محبت کا پیکر تھیں۔ میں سرو قد کھڑا ہو گیا صاحب سلامت کی اور بیٹھ گیا، اور تھوڑی ہی دیر میں ایک باوردی ملازم ٹرالیاں ڈھکیلتا ہوا آیا اور سامان سج گیا۔

فوزیا کی اماں نے میرا انٹرویو لینا شروع کیا۔

"فوزیا نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے میاں۔"

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں میں نے ماشاء اللہ اس سے بھی زیادہ نفیس اور قیمتی ماحول دیکھا ہے، لیکن یہ سب کچھ خلاف توقع تھا، اکثر تجارتی وفود میں شامل ہو کر غیر ملکوں کی سیر بھی کرتا رہا ہوں اور سرکاری اور غیر سرکاری دعوتیں ہزاروں کی تعداد میں کھا چکا ہوں، لیکن فوزیا کے بارے میں جو تصورات میں نے قائم کیے تھے اور مستقبل کے [illegible] بلند تھے وہ [illegible]

نظر آرہے تھے۔ میں نے جواب دیا۔

اصل میں میں فوزیا کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ۔ میں خود ہی سٹپٹا گیا کہ اب کیا کہوں اور یہ کہ میں کہنے والا کیا تھا بھلے کو زبان رک گئی۔ میں نے میزوں پر پھیلے ہوئے چائے کے پر تکلف سامان کی طرف اشارا کیا۔ آپ لوگ اتنا تکلف کریں گے۔

"تکلف کیا ہے بیٹا۔ ذرا سی نگوڑی چائے پیے آدمی تو کچھ داڑھ تو گرم کرے۔"

سامان اس قدر وافر تھا اور اس قدر متنوع کہ ایک نہیں اکٹھا بارہ آدمیوں کے پیٹ کا تنور بھی اس سے گرم کیا جاسکتا تھا۔ داڑھ کا ذکر کیا ہے۔ خیر میں نے تھوڑا بہت کھایا۔ چائے پی اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی اثنا میں ایک نوجوان نے پردا ہٹا کر جھانکا۔ مجھے خیال آیا کہ اسے کہیں میں نے دیکھا ہے۔ نوجوان نے مونھ اندر ڈال کر کہا۔

"اماں میں، کلب جا رہا ہوں، فوزیا تم وہیں آجانا۔"

"اچھا" فوزیا نے اثبات میں گردن ہلادی۔ اماں کچھ نہ بولیں اور نوجوان چلا گیا۔

فوزیا بولی "یہ میرے بھائی جان ہیں۔ کلب کے بڑے رسیا ہیں۔" پھر بولی "غنی صاحب آپ کلب نہیں جاتے۔"

میں فوزیا کے بھائی جان کی بد اخلاقی پر غور کرتے ہوئے بولا۔ کبھی کبھار چلا جاتا ہوں۔

اماں بولیں۔ "احسان تو کلب کے پیچھے دیوانا ہے، اپنے ساتھ فوزیا کی مٹی بھی پلید کر رہا ہے، کیا کہوں؟"

اماں کچھ کہنا چاہتی تھیں، مگر کہہ نہ سکیں، فوزیا نے اسی لمحے انہیں گھورا، وہ چائے کی پیالی میں چینی ملا کر گھمانے لگیں۔ چائے پی کر میں نے چلنے کا قصد کیا تو فوزیا بولی۔

"غنی صاحب کیا آپ مجھے کلب تک پہنچا دیں گے؟"

"کیوں نہیں" میں نے خوش اخلاقی سے کہا، لیکن احسان کی بد اخلاقی مجھے بدستور کھٹک رہی تھی،

وہ مغرور تھا، وہ مجھے حقیر سمجھتا تھا۔ بہرحال میں نے اماں سے اجازت لی اور گاڑی میں میرے پہلو بہ پہلو فوزیا آبیٹھی اور جب میں کلب اسے چھوڑنے گیا تو بات مجھے اور بھی بری لگی۔ طوہاً و کرہاً میں نے اسے وہاں پہنچایا۔ اور خود چلا آیا۔ گھر واپس آیا۔ جس خوشی سے فوزیا سے ملنے گیا تھا وہ خوشی کافور ہوچکی تھی معلوم نہیں کیوں فوزیا کی شخصیت میں مجھے گرہیں پڑی ہوئی نظر آرہی تھیں اور ان گانٹھوں کو کھولنا اچھا خاصا مسئلا تھا۔ میں دیر تک گھر میں ٹہلتا رہا۔ اماں نے پریشانی کا سبب بھی پوچھا۔ میں ٹال گیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر میں نے دوسرا لباس تبدیل کیا، گاڑی لی اور کلب جا پہنچا۔ اب رات ہوچکی تھی۔ گھنے گھنے تناور درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کلب کی سادا عمارت کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھے۔ میں نے نہ بلیرڈ کی طرف رخ کیا نہ پنگ پانگ اور دوسرے اسی قسم کے کھیلوں کی طرف سیدھا بار روم کی طرف چلا گیا۔ سامنے ہی مجھے دو مردوں کے بیچ میں جو تیسری ہستی نظر آئی وہ فوزیا کی تھی، لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا، میں گردن جھکائے بار پر جا پہنچا اور اسٹول پر جا بیٹھا چند جرعے چڑھا کر رخصت ہو جانا چاہتا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ کے پیچھے جو آواز سنائی دی وہ احسان کی تھی۔ وہ فوزیا کو لے کر ایک طرف ہوگیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے تو بلکل چڑی کا غلام لگتا ہے۔"

فوزیا بولی۔ "نہیں۔ لک پتی ہے۔"

پیچھے سے ساتھ آواز آئی "سچ کہو۔"

"بلکل سچ بھیا۔"

"پھر تو سونے کا چڑیا ہے۔"

"ہاں مگر۔"

"آدمی شریف ہے۔"

"بس۔" یہ مرد کی آواز تھی۔ خیر سیدھا انگلیوں گھی نہ نکلے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنا ہی پڑتی ہیں۔"

پھر دونوں کی آوازیں آنا بند ہوگئیں لیکن دونوں پر ایک مردانا آواز غالب آگئی۔

ہو نہ ہو۔ یہاں کوئی سازش کی جا رہی

تم دونوں ۔"

"مجھو بھو ۔ فوزیا بولی ۔" آئیے آئیے جناب
اللہ والا کب آئے آپ کراچی سے ۔ سازش تو آپ
کے خلاف ہو رہی ہے ۔
اللہ والا کا قہقہا گونجا ۔ " اچھا اچھا ۔ بھئی
میں آج ہی آیا ہوں، کل چلا جاؤں گا ۔"
"جی ہاں جناب! کیا آپ ناچیں گے ؟ "
فوزیا نے پوچھا ۔
جب تم نچاؤ گی تو بھلا کیوں نہ ناچیں گے ،
آخر کتنوں کو نچایا ہے تم نے ۔ کیوں احسان میاں ؟"
احسان نے بے حیائی کے ساتھ ایک قہقہا لگایا ۔
اب میری باری تھی ۔ میں نے جام تو میز پر دھرا
اور مڑ کر دو قدم چل کر ان کے پاس پہنچ گیا اور مجھے دیکھتے
ہی فوزیا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے زرد پڑ گئی
"آپ ۔ آپ یہاں کب آئے ؟ "
پھر اس نے میرا سب سے تعارف کرایا، اور
میں معذرت کر کے باہر چلا آیا ۔ گاڑی میں بیٹھا تو سر
چکرا رہا تھا کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں ۔ مجھے
نہیں معلوم کہ کس طرح میری کار خود بخود ایک بار پھر
فوزیا کے گھر جا پہنچی خلاف توقع صرف پورٹیکو کی بتی
جل رہی تھی اور سارے گھر میں سناٹا تھا ۔ پہرے
دار دوڑ کر آیا اور اندھیرے میں مجھے پہچان نہ سکا
میں بھی گاڑی میں بیٹھا رہا اس نے گاڑی میں مونھ
ڈال کر کہا کہ ۔" صاحب لوگ تو بہت دن سے
ولایت گئے ہوئے ہیں ۔
کون صاحب لوگ ؟ میں نے پوچھا ۔ وہ
بولا ۔" وہی صاحب جو ہمارے مالک ہیں، علی فتح جنگ
اور کون ۔ جن کا مکان ہے ۔"
اب مجھے خیال ہوا کہ شاید میں کسی غلط مکان
میں آ گیا ہوں میں نے پہرے دار سے کہا ۔
اچھا اچھا ۔ تو وہ احسان اور فوزیا کہاں
ہیں [illegible]
[illegible] ۔ وہ [illegible] پہرے دار نے کہا اور کی [illegible]
[illegible] صاحب وہ تو اس مکان کے پیچھے
[illegible] تھا اس میں رہتے ہیں لیکن

وہ اس وقت آپ کو ملیں گے نہیں ۔ ماں ان کی اماں
ہوں گی ۔ وہ بڑی نیک بی بی ہیں ۔ آئیے میں لے چلوں ۔
میں گاڑی سے نکل آیا، چلو میں نے کہا، اور
گیراج کے پاس پہنچ کر جو شئے مجھے سب سے پہلے
یاد آئی وہ توبۃ النصوح کے مرزا ظاہر دار بیگ
کی مضحکا خیز حالت تھی ۔ پہرے دار کو رخصت کرنے
سے پہلے میں نے اس سے کہا، سنو آج اس بڑی
کوٹھی میں ایک نوجوان آیا تھا، اس کی دعوت ہوئی
تھی ۔ وہ بولا ۔" ہاں ہوئی تھی ۔" پھر زور سے
ہنسا اور راز دار انداز میں بولا ۔" احسان میاں
کی صاحب سے دوستی ہے نا، کبھی کبھی ان کا کوئی دوست
یہاں آ جاتا ہے ۔"
" اچھا ۔"
دروازہ کھٹکھٹایا ۔ بوڑھی عورت نے آ کر پوچھا
" آپ کون صاحب ہیں ؟ "
میں نے کہا غنی ۔"
دیر تک کوئی جواب نہیں ملا یا عورت بے چاری
پہچان ہی نہ سکی یا سناٹے میں آ گئی ۔
میں بولا، اماں کیا میں اندر آ سکتا ہوں ؟
رندھے ہوئے گلے سے بولی ۔" آ جاؤ بیٹا ۔"
میں اندر چلا گیا ۔ گیراج میں تین چار پائیاں
ایک نماز کی چوکی، دو ٹوٹی پھوٹی کرسیاں! ایک
میز، چند ٹرنک اور کچھ کپڑے پڑے ہوئے تھے ۔
عورت جو آج ہاتھ سے ایک عالی شان ڈرائنگ
روم میں مل چکی تھی، اس اچانک تغیر پر نہایت پریشان
تھی اور ضبط نہ کر سکی، رونے لگی ۔
میں نے کہا، اماں اس میں دکھ کی کوئی بات
نہیں بڑے بڑے بادی اور نبی بھی غریب رہے ہیں ۔"
دکھ کی بات یہ نہیں غنی میاں " اس نے بھیگے
ہوئے دوپٹے سے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا " دکھ
کی بات یہ ہے کہ فوزیا اور احسان کو اپنی اس حالت
پر شرم آتی ہے، اور اس حالت کو ظاہر کرتے ہوئے
وہ ڈرتے ہیں ۔ وہ کہتے کہ کوئی ان کی عزت نہیں
کرے گا ۔ انھیں وہ مرتبہ نہیں ملے گا جو آج انھوں نے
اپنی چالاکی سے حاصل کر لیا ہے ۔"

میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ہمیں یہ تو دکھ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بڑا کھوکھلا پن ہے۔ ہم اسی نمایش اور دکھاوے میں کچھ سے کچھ بن گئے ہیں، جو ہم نہیں ہیں نہیں بن سکتے۔ وہ ہم بننے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔ آخر جو ہم ہیں وہی کیا برے ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔

"بیٹا" اماں نے نماز کی چوکی پر پاندان کھول لیا، ڈلی کترتے ہوئے بولیں۔

"تم سے اب کیا پردا۔ ہم پہلے بھی رئیس ان رئیس نہیں تھے۔ چٹنی روٹی کھا کر موٹا جھوٹا پہن کر مگن رہتے تھے۔ یہاں یہ دونوں بھائی بہن ہزار بارہ سو کما لیتے ہیں، لیکن کس کام کے کپڑے، پارٹیاں کلب، یہ وہ، خاک دھول، بلا اور گھر دیکھو تو خاک پر بسم اللہ خاک اتنے نہ ہلے، پانی سے پیٹ بھرے، کہو کر بھائی کیا غضب کرتے ہو، جوان جہان بہن ہے اس کا شادی بیاہ کرنا ہے تو اسے صاحبزادے بھی لڑتے ہیں اور صاحبزادی بھی قائل معقول کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔" عورت نے ڈلی پھانک کر زور سے بات بھاڑے۔ "اچھا بابا تم جانو تمہارا کام جانے ہمارا کام سمجھانا تھا سو بتا دیا۔ اب تم لوگ خدا اپنے بات مونھ کے ہو اپنے خود مالک و مختار ہو جو چاہو سو کرو، ملمع ملمع ہی ہوتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اترتا ہے تو آدمی کی ساکھ ختم ہو جاتی ہے۔ سو بیٹا تم ہی ذرا کہو انصاف سے کہ ملمع کی گاڑی کب تک چلے گی۔ علی فتح جنگ کے رحم و کرم پر کب تک یہ دھندا چلے گا۔ اور یہ کلب جانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" عورت دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ جب ذرا تھمی تو میں نے وہ بات جو ہر شخص کہنے کی ہمت نہیں رکھتا میں نے کہا۔

اماں میں کوئی بڑا آدمی تو نہیں ہوں۔ ہاں اللہ نے اس قدر دیا ہے کہ کھا پہن سکتا ہوں، اگر آپ مجھے نوزیا کے لیے اپنی فرزندی میں لے لیں تو میں خود کو بے حد خوش نصیب سمجھوں گا، شاید اس طرح سارے حالات ٹھیک ہو جائیں۔

میری یہ بات سن کر عورت پر خاص اثر ہوا رقت طاری ہو گئی، لیکن اسی حالت میں وہ اٹھی اس نے مجھے گلے سے لگا لیا پیشانی چومی، صدقے قربان گئی اور کہا۔

"مجھے ہر طرح منظور ہے۔"

میں نے محبت یا عشق کے ماتحت یہ سودا کر ڈالا نہیں ایسا ہرگز نہیں، بلکہ نوزیا کے خاندان کو تباہی سے بچانے کا میرے نزدیک اس سے بہتر کوئی اور طریقا نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ میں رخصت ہو کر گھر آیا اور تمام نتایج و عواقب پر غور کرتے ہوئے سو گیا۔

صبح جب میری اماں نے ناشتے پر بلایا تو میز پر میرے اور میری اماں کے علاوہ نوزیا بھی موجود تھی۔ وہ سویرے ہی سویرے آ دھمکی تھی، اور اس کے چہرے پر ایک خاص سرخی دوڑی ہوئی تھی جو صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی کنواری عورت سے اظہار محبت کیا جائے، لیکن اس کی نگاہیں جھکی جھکی سی تھیں۔ ایک اصلی جذبے کے ظاہر ہونے کی شرم تھی۔ دوسرے بار حیا نے پلکوں کو جھکا دیا تھا۔

ناشتے کے بعد ہم تیار ہو کر گھومنے کو نکلے۔ ایک جگہ سناٹے میں کار کی روک کر میں چند باتیں اس سے کرنا چاہتا تھا کہ وہ بولی۔

"غنی صاحب تمہاری محبت سے مجھے خوشی ہے مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

کیوں؟

میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

"شادی" اس نے کہا۔ اور ذو پٹے کے آنچل کو مروڑتے ہوئے کہا "شادی شاید میری کبھی نہ ہو سکے اور اتنا کہہ کر وہ خود بھی رونے لگی۔

لیکن آخر کیوں۔ جب میں شادی کر رہا ہوں تو تم کو۔

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "غنی تم یہ جو کہتا کر شادی کر رہے ہو نا۔ مجھے کسی ... پر ترس کھا کر تم ایک ... کی جگہ ... دے ڈالتے ہو، مجھے یہ ترس نہیں چاہیے۔

اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے، اس لیے یہی قدم اٹھایا گیا ہے کہ ہم آج ان کی یاد کو تازہ کر کے ان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔

مولانا کو میں نے بچپن میں دیکھا۔ وہ میری نسل کے لڑکوں اور نوجوانوں کے بڑے زبردست ہیرو تھے۔ ہم تو ان کی پرستش کرتے تھے۔ ایک تو اس لحاظ سے کہ وہ میری ابتدائی عمر میں ایک سیاسی ہیرو تھے دوسرے اس لحاظ سے بھی کہ ان کا وطن رامپور تھا، جس سے میرا گہرا اور قریبی تعلق رہا ہے۔ مجھے مولانا کی زندگی سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ مجھے ان کے خاندانی حالات اور خود ان کے بہت سے حالات سے واقفیت رہی ہے، اور اس لیے چند باتیں مختصر آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ یہاں وہ حضرات بھی موجود ہیں جو مجھ سے بہت بہتر طریقے پر ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مولانا بہت بلند حوصلہ، عالی ہمت اور شیر دل انسان تھے، جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے وہ ایک بلند قامت شخصیت کے حامل تھے۔ تحریر ہو یا تقریر، وہ دریا بہایا کرتے تھے جس کے جوش میں ہم جیسے نوجوانوں کا بہہ جانا فطری تھا۔

انہوں نے اس زمانے میں جبکہ مسلمان خاص طور پر انگریزی حکومت کی وفاداری کے جال میں گرفتار تھے، اور سرکار کی سرپرستی کی طرف ہماری نگاہیں مرکوز رہتی تھیں، مسلمانوں کو خود اعتمادی سکھائی اور سرکار کی بے جا خوشامد اور سرپرستی کی امید سے ہم کو الگ کیا، قومی ولولا اور جوش پیدا کیا، اور ایک نئی لگن سے ہندستان کے مسلمانوں کو روشناس کرایا۔

جس طرح انہوں نے (مولانا محمد علی نے) قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، جس طرح ان پر سختیاں کی گئیں اس کا آپ کو بخوبی علم ہے اور اب وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہت کم لوگوں پر اتنی سختیاں کی گئیں جن کا مولانا محمد علی کو شکار ہونا پڑا، لیکن وہ بڑے پامرد اور ہمت والے انسان تھے، انہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ ان تمام مصیبتوں کا مقابلہ کیا، اور انگریزوں کے سامنے کبھی اپنا سر تسلیم خم نہ کیا۔

مولانا کی وطن دوستی، ان کی حریت پسندی اور آزادی کے لیے جوش و ولولا، یہ سب چیزیں تو اپنی جگہ تھیں ہی، لیکن اس کے ساتھ ایک دوسری چیز بھی ان کی زندگی میں نمودار ہوئی تھی وہ تھا مذہبی قیادت کے لیے ان کا جذبہ۔ جب میں نے مولانا کو پہلی مرتبہ دیکھا تو میں عربک دل میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا، میرے ذہن میں محمد علی بی۔ اے آکسن (یہ کامریڈ کے صفحے پر لکھا ہوتا تھا) کا تصور یہ تھا کہ ایک نہایت اچھے سوٹ میں ملبوس ایک شخص ٹائی باندھے ہوئے مشین، شاندار آدمی ہمیں دکھائی دیگا لیکن ایک لمبا آدمی عربی عبا پہنے ہوئے، ٹوپی لگائے ہوئے جس پر لکھا ہوا تھا "خدام کعبہ" اور دونوں کاندھوں پر بھی لکھا ہوا تھا "خدام کعبہ" وہ جھومتا ہوا ہمارے اسکول میں آیا، اور معلوم ہوا کہ یہ ہیں مولانا محمد علی۔ یہ ان کی زندگی کا دوسرا پہلو تھا۔ میں اس کو مذہبی قیادت تو نہ کہوں گا، لیکن مسلمانوں کی مذہبی تنظیم کا شوق اور نہ صرف مسلمانان ہندستان کی تنظیم کا شوق بلکہ مسلمانان عالم کی تنظیم کا شوق ان کو اس درجے تھا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

مولانا بجا طور پر ترکوں کے حامی تھے انہوں نے The Times کو مضمون لکھ کر لوگوں کے دل ہلا دیے اور ترکوں کے لیے تمام ملک میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کی وجہ سے پر انہیں جیل جانا پڑا۔ ترکوں کے ساتھ جو ہمدردی تھی، جو جذبہ تھا وہ بجا تھا، لیکن جبکہ کعبے کے خدام یعنی کعبے میں رہنے والے حجاز میں بسنے والے ترکوں کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار پھینک رہے تھے، اور جبکہ عرب ترکوں کے خلاف ہو گئے تھے، اگرچہ اس میں انگریزوں کی سازش شامل

حال اس وقت مولانا ترکوں کے لیے جوش کے
تہ ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے، اور بجا طور پر
رکر رہے تھے یہاں تک ان کے ساتھ اتفاق
، لیکن اس کے بعد ایک زمانا آیا کہ جب خود
رلا نے خلافت کو ختم کر دیا، لیکن ختم نہ کیا تو صرف
ستان کے مسلمانوں نے، جن کے ایک زبردست
در خود مولانا محمد علی تھے، کسی عرب ملک
، خلافت کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا، کوئی
راز بلند نہیں کی - خود ترکوں نے خلافت کو ختم
دیا، لیکن ختم نہ کیا تو ہندستانی مسلمانوں
، ہم کھڑے ہو گئے - تحریک خلافت کو لیکر
ں سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ مسلمان قومی
موں کے دھارے میں شریک ہو گئے اور
لڑائی مہاتما گاندھی نے شروع کی تھی مسلمان
یا میں شرکت کے لیے دل و جان سے آمادہ
گئے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا نے حالات
سی مطالعا اور حقیقت پسندی سے کام نہیں لیا -
ر وقت تک وہ یہ کوشش کرتے رہے کہ
ں نہ کسی طریقے سے ترکوں کی طاقت اور حکومت
م رہے، اور خلافت کا مرکز ترکوں کے پاس
ہے، کیونکہ ان کے خیال میں اس کے بغیر مسلمانوں
طاقت باقی نہیں رہ سکتی تھی - یہ اسلامی
- کی نہ سہی نبض شناسی تھی نہ واقعیت پسندی
. اسی لیے جو نتایج ظہور میں آئے ان کی وجہ سے
نا صاحب کا دل ٹوٹ گیا، جیسا کہ آپ کو معلوم
آخر عمر میں ان کی صحت نے بھی جواب دیدیا
- کی مالی پریشانیاں بھی تھیں، اور انہیں اس
. ناکامیوں کا مونھ دیکھنا پڑا کہ ان کے مزاج
چڑچڑا پن پیدا ہو گیا، وہ لوگوں کے ساتھ کام
کر سکتے تھے، ان کے رفقا علحدا ہونے لگے، اور
نا میں ایک مبہم بیزاری سی پیدا ہو گئی -
میں یہ سب باتیں اس لیے عرض کر رہا ہوں
، ہمارے لیے ایک سبق آموز بات ہے کہ
بات کا بھی اندازا کرنا، حقیقت سے مونھ
موڑنا، اور اپنی طاقت کا بھی اندازا کرنا - بھلا

ہندستان کے مسلمان جو خود غلام تھے، ان کی دنیا میں
کیا حیثیت تھی کہ وہ ترکی کو بچاتے یا خلافت کو قایم
کراتے، چنانچہ یہاں سے ڈیلیگیشن گیا جس
میں مولانا محمد علی بھی تھے، مولانا سلیمان ندوی بھی
تھے - اس وقت میں کیمبرج میں پڑھتا تھا - لائیڈ
جارج سے بڑی مشکل سے ملاقات ہوئی - زیادا
تر ملاقات تو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا
سے ہوتی رہی، لیکن بغیر کسی کامیابی کے وہ وفد
ہندستان لوٹ آیا، اس کے باوجود ہم خلافت
کے خیال کو سینے سے لگائے رہے - مولانا مرحوم
نے یہ سوچا کہ اچھا اب نجدیوں نے حجاز پر قبضا کر لیا
ہے تو شاہ سعود کو کوشش کرکے خلیفا بنایا جائے -
کچھ دنوں تک جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ تحریک
بھی چلی کہ شاہ سعود کو خلیفا تسلیم کیا جائے، لیکن
سعودیوں کی طرف سے کچھ باتیں ایسی ہوئیں کہ مولانا
کا دل کھٹا ہو گیا - ہندستان کے مسلمان بھی
ناراض ہو گئے - سعودیوں سے اور وہ خیال بھی
ان کو ترک کرنا پڑا، اس طریقے سے مولانا کی کوششیں
بہت بڑی حد تک کم ہو گئیں - انہوں نے اپنی تمام
تمام طاقت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیا
تھا، اور وہ تھی خلافت اور ترکی اور اس میں ان
کو کامیابی نہ ہوئی - مولانا ایک ابلتا ہوا چشما تھے،
ایک مواج دریا تھے، لیکن دریا کا رخ شہر کی طرف
پھیر دیجیے تو وہ تمام مکانوں کو گرا دے گا، شہر
کو تباہ کر دے گا، اور اس کو کام میں لائیے،
Clemenceau کہیے تو پھر وہ کھیتوں کو سیراب
کرے گا، اور آپ کے لیے رزق فراہم کرے گا -
مولانا کے اولوالعزم، باہمت، اور شیر دل ہونے
میں کوئی شک نہیں - ان کے محب وطن، آزادی
پسند اور حریت پسند ہونے میں کسی کو کلام نہیں
ہو سکتا، لیکن انہوں نے اپنا خداداد قوتوں کا استعمال
اس طرح کیا کہ وہ ایک طرف لگ گئے - میں سمجھتا
ہوں کہ یہ قوم ان کی کمی تھی یا اگر آپ اجازت
دیں تو عرض کروں کہ یہ ان کا [illegible]
تھا - مسلمان آج بھی [illegible]

بدوضعیت سے باہر نکلنا پڑے گا۔ جب میں کیمبرج سے لوٹا تو خیر مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تو مولانا تھے ہی، لیکن آصف بھائی سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ مولانا آصف علی بن گئے، علی گڑھ گیا تو اپنے دوست عبدالمجید خواجہ سے ملا دیکھا کہ ان کی اچھی لمبی سی داڑھی ہے اور مولانا معلوم ہوتے ہیں۔

مولانا آصف علی مرحوم نے مجھے اپنا قصہ سنایا کہ بھائی میں متھرا گیا تھا، وہاں لوگوں نے مجھے گھیر لیا کہ ابھی ہم آپ کو جانے نہ دیں گے۔ میں نے کہا، "کل عید ہے، میرا دلی میں ہونا ضروری ہے۔ کہنے لگے "نہیں صاحب، عید آپ ہمارے ساتھ منائیے، خیر بہت اصرار کیا تو میں راضی ہوگیا" جب عیدگاہ کے میدان میں پہنچے ہوئے تو لوگوں نے کہا، "مولانا آپ تشریف لائیے، عید کی نماز آپ ہی پڑھائیے۔" بھائی میں مولانا نہیں ہوں، ارے، ہم جانتے ہیں کہ آپ مولانا آصف علی ہیں" آصف بھائی کہنے لگے، صاحب مصیبت ہوگئی۔ لوگوں نے پریشان کر دیا، اب میں یقین دلا رہا ہوں کہ میں مولانا نہیں ہوں۔ میرا بلا وجہ بھی یہ نام رکھ دیا ہے مولانا، مگر وہ نہیں مانتے، اس وقت ایک نیا رنگ پیدا ہوگیا ہندستان میں مذہبیت کا تب سے اب تک ہمارے ہندستان کی سیاست میں ایک خاص قسم کی مذہبیت شامل ہوگئی اور ہماری سیاست بہت کچھ علما کے ہاتوں میں چلی گئی۔

میں علما کے خلاف نہیں ہوں، بلکہ جمعیت علماء ہند نے خاص طور پہ بہت شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ آزادی حاصل ہونے کے بعد مختلف موقعوں پر جس طرح انہوں نے پریشان حال لوگوں کی حمایت کی ہے، میں اس کا بے حد ممنون، لیکن بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ سیاست کا علما کے ہاتھ میں اس طرح ہونا (تحریک خلافت کے نتیجے میں) کوئی اچھی بات نہ تھی، دوسری بات یہ کہ اب تک ہماری دلچسپیاں ہندستان کے باہر کے مسلمانوں سے بھی زیادہ ہیں۔ پچھلے سال کی بات سناؤں الجمعیت [illegible] اشتہار چھپا تھا روزانہ بقرعید سے آٹھ دس روز پہلے سے "مسلمانو! بقرعید قریب ہے، اپنے غریب عرب بھائیوں کو نہ بھولو قربانی کی کھالوں کی قیمت عربوں کے ریلیف فنڈ میں جمع کرائیے۔" خدا — Palestine کے عربوں کے لیے جب فنڈ قائم کیا گیا تو اتفاق سے میں ہی اس کا ٹریژرر تھا، ہم نے کئی لاکھ روپے جمع کر کے عربوں کی امداد کے لیے بھیجے، کمبل، ڈیرے، خیمے، چائے، دوائیں اور مختلف سامان روپیا ہم نہیں بھیج سکتے تھے، لیکن جہاں تک ہوسکا عربوں کی امداد کی، لیکن لاکھوں لوگ بہار میں اس وقت پریشان ہیں طوفان اور قحط کی وجہ سے ان لاکھوں میں چند لاکھ مسلمان بھی ہوں گے، لیکن میں نے کسی اخبار میں نہیں پڑھا کہ "بہار کے چلیے سب کے لیے نہ سہی غریب مسلمانوں کے لیے جو آفت زدہ ہیں پریشان حال ہیں ان کے لیے چندہ جمع کیجیے" سب کو معلوم ہے کہ بنگلادیش میں اس وقت وہ تباہی مچی ہوئی ہے کہ خدا اس سعودی عرب نے جس نے بنگلادیش کو اب تک بطور ایک آزاد ملک کے تسلیم نہیں کیا ہے، سب سے پہلے شاہ فیصل نے امداد کی، لندن کو کافی روپے بھیجے، خود ہندستان نے پہلے پانچ کروڑ روپے کی امداد دی، کل آپ نے پڑھا ہوگا کہ پانچ کروڑ روپے کی مزید امداد ہندستان کی طرف سے کی گئی ہے، لیکن آپ نے کسی مسلم اخبار میں پڑھا کہ۔ بنگلادیش کے مسلمان اس وقت مصیبت میں گرفتار ہیں ان کی امداد کے لیے کچھ کیجیے؟ نہیں معلوم کیا بات ہے کہ خود اپنے ملک کے مسلمانوں کے لیے اور آس پاس کے مسلمانوں کے لیے ہماری ہمدردیاں بہت کم ہیں، اور ہماری نگاہ جب اٹھتی ہے تو بیچارے غریب عربوں کی طرف۔ بحیثیت مسلمان کے مجھے عربوں سے پوری ہمدردی اور محبت ہے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اپنے ملک کے مسلمانوں سے کم محبت اور ہمدردی ہو۔ ہمیں اپنے تمام کاموں میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایک تو — Sense of Proportion یعنی تناسب کا

احساس رہنا چاہیے، پھر حقیقت پسندی یہ ہو، ہم اندازہ کرلیں کہ ہم جو پروگرام بنا رہے ہیں وہ ہمارے بس کی بات ہے یا نہیں اور زندگی کا جو مقصد ہم بنا رہے ہیں وہ قابل حصول مقصد ہے یا نہیں، اور اس میں ایک حد تک ہمیں کامیابی ہوگی یا نہیں یا ہمیں ناکامی کا موقع دیکھنا پڑے گا، اگر آپ حقیقت پسندی سے کام نہیں لیں گے تو آپ دل شکستہ ہوں گے آپ پریشان حال رہیں گے بھلا کچھ عرشی مولانا مرحوم کی، جیسے وہ انتقال فرما گئے ؟ ملک و ملت کی کتنی امیدیں ان سے وابستہ تھیں، لیکن وہ بہت جلد جلد ہم سے جدا ہو گئے، اور جلد اس لئے جدا ہو گئے کہ طرح طرح کی پریشانیوں اور ناکامیوں نے انہیں گھیر لیا تھا، خدا کرے کہ ہم سب اس طریقے سے اپنے لیے لائحہ عمل تیار کریں کہ امداد خدا شامل حال ہوتے ہوئے ہمیں ناکامیوں کا موقع نہ دیکھنا پڑے اور حقیقت پسندی اور احساس تناسب کے ساتھ ہم اپنے عمل کی تنظیم کریں۔

کیف احمد صدیقی

اندرا گاندھی

عظمت ہند کا معیار ہیں اندرا گاندھی
امن عالم کی پرستار ہیں اندرا گاندھی

پیش کردی یہ سند ہم نے وزیر اعظم
عورتیں بھی نہیں مردوں سے کسی بات میں کم
شاخ گل ہو کے بھی تلوار ہیں اندرا گاندھی
عظمت ہند کا معیار ہیں اندرا گاندھی

راہ گاندھی کی نہ نہرو ہی کا رستہ چھوڑا
پھر بھی بھارت کو نئی راہ کی جانب موڑا
راہبری میں بڑی ہشیار ہیں اندرا گاندھی
عظمت ہند کا معیار ہیں اندرا گاندھی

آج تک سازش دشمن کی بھی پرواہ نہ کی
ظلم پر ظلم سہے اور کبھی آہ نہ کی
مسکراتا ہوا کردار ہیں اندرا گاندھی
عظمت ہند کا معیار ہیں اندرا گاندھی

فرقہ واری کے جنازے میں لگا کر کاندھا
ایک دھاگے میں ہر اک اہل وطن کو باندھا
قصر جمہور کی معمار ہیں اندرا گاندھی
عظمت ہند کا معیار ہیں اندرا گاندھی

جو امیروں کے تشدد سے ہیں پامال ابھی
تنگ دستی و غریبی سے ہیں بدحال ابھی
ایسے لوگوں کی طرفدار ہیں اندرا گاندھی
عظمت ہند کا معیار ہیں اندرا گاندھی

کیف جمہوری اصولوں کی حفاظت کے لئے
ایک جہتی کے لئے امن و اخوت کے لئے
جان دینے کو بھی تیار ہیں اندرا گاندھی
عظمت ہند کا معیار ہیں اندرا گاندھی
امن عالم کی پرستار ہیں اندرا گاندھی

سعید احمد اکبرآبادی، ایڈیٹر "برہان"

سیرِ پاکستان

پاکستان کی بین قومی سیرت کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ یوں تو ہندستان میں متعدد اصحاب کے نام آیا تھا، لیکن شریک ہم چار ہی شخص ہو سکے، میں سب سے پہلے یعنی ۱ر مارچ کو ہی پہنچ گیا تھا، جناب حکیم عبدالحمید صاحب مع بیگم صاحبہ کے ۸ر کو لاہور پہنچے اور اس تاریخ سے آخر تک برابر شریک رہے، مولانا قاری محمد طیب صاحب اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب علی الترتیب [illegible] کو پہنچے اور صرف کراچی کے جلسوں میں شرکت کر سکے، دوسرے حضرات کی طرح مجھکو دعوت نامہ جلسہ کے شروع کی تاریخوں میں ہی مل گیا تھا۔ پاسپورٹ میرے پاس پہلے سے موجود تھا، وہاں جانے کے لیے [illegible] کی اجازت ضروری تھی، اس لیے ایک طرف گورنمنٹ کو اس دعوت نامے کی اطلاع بھیج دی گئی اور دوسری طرف دعوت نامے کی منظوری اور اسی سلسلے کے دوسرے کاغذات [illegible] کی معرفت پاکستان بھیج کر میں اطمینان [illegible] اب اگر [illegible] آتا ہے تو جانا [illegible] VISA [illegible] کی درخواست

روانگی

دن گذرتے جارہے تھے، لیکن ویزا کی کوئی خیر خبر نہیں تھی، جب کانفرنس کے شروع ہونے کی تاریخ سر پر ہی آگئی تو بعض دوستوں نے کہا کہ مجھکو دعوت نامے کی منظوری کے ساتھ ہی ویزا کی درخواست کا فارم خانہ پری کرکے بھیجنا چاہیے تھا، اگر اسے نہیں بھیجا ہے تو پھر ویزا کیسا؟ مگر میں کہتا تھا کہ ہر داعی ملک کا فرض ہے کہ از خود ویزا بھیجے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یکم مارچ کو سوئیز ایمبیسی نے اچانک مطلع کیا کہ ویزا آگیا ہے۔ میں چار بجے کے بعد وہاں پہنچا، اور فارم کی رسمی خانہ پری کے بعد اسے لے آیا۔ دوسرے دن یعنی ۲ر مارچ کو میں نے ہرچند کوشش کی کہ فرنٹیئر میل میں رزرویشن مل جائے، لیکن ۷ر مارچ سے پہلے اس کا امکان نہ تھا۔ آخر ۳ر مارچ کو نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے بارہ بجے دن کے ایک بہت تیز رفتار اور آرام دہ ٹرین امرتسر فلائنگ میل کے نام سے چلنے لگی ہے، میں اللہ کا نام لے کر اسی سے روانہ ہو گیا۔ نئی دلی کے اسٹیشن پر منشی عتیق الرحمان صاحب عثمانی اور مولانا عبدالحلیم صاحب فاروقی اور میرے بچوں نے الوداع کہا۔

سفر میں سامان ہمیشہ بہت ہلکا پھلکا رکھتا ہوں، کھانے کا وقت ہوا تو کسی اسٹیشن پر کچھ پھل خرید کر گذارا کر لیا۔ ٹرین ٹھیک نو بجے امرتسر پہنچ گئی۔ پلیٹ فارم پر اتر کر ارادا کیا کہ ریلوے ریفائرنگ روم چلوں، مگر معلوم ہوا کہ وہاں کوئی جگہ خالی نہیں ہے، اس لیے اسٹیشن سے متصل ہی پیلیس نام کا ایک وسیع اور کشادہ ہوٹل ہے وہاں چلا گیا اور ایک کمرا لیکر مقیم ہو گیا۔

ط

بور در

شب بھر آرام سے سویا، صبح اٹھ کر اپنے معمولات پورے کیے ناشتے سے فارغ ہوا، اخبار پڑھا، جو کتاب ساتھ تھی اس کا مطالعہ کیا، اور (وقتاً "ایران" میں جو کتابیں برائے تبصرہ آتی ہیں ان کا مطالعہ عموماً سفر میں کرتا ہوں) نو بجے ایک ٹیکسی لے کر بورڈر پہنچا، خیال تھا کہ میں سابقین اولین میں سے ہوں گا، مگر یہاں دیکھا مسافروں کا کافی ہجوم ہے اور ان میں اکثریت افغانستان جانے والوں کی ہے، اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ساز و سامان کا انبار ہے، میں اپنا پاسپورٹ حوالہ کر کے کسٹم کے انتظار میں باہر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹے تک انتظار کھینچنے کے بعد جب میری باری نہیں آئی تو میں اندر گیا۔ اور کسٹم آفیسر سے جو ایک شریف اور ہمدرد سکھ تھے گفتگو کی، انہوں نے ذرا مسکرا کے کہا "بہت اچھا! سامان لے آیئے" میرا سامان ہی کیا تھا ایک سوٹ کیس اور ہینڈ بیگ، میں نے اٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے دونوں پر ایک نگاہ ڈالی اور کسی عدد کو کھولے بغیر اسے پاس کر دیا۔ میں ان کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوا اور ارض غیر متعلق No man's Land میں سے گذرتا ہوا پاکستانی بورڈر میں داخل ہوا یہاں سب سے پہلے سابقہ ہیلتھ سکشن سے ہوا، افسر متعلقہ نے کہا، "ہیلتھ سرٹیفکیٹ دکھائیے" میں نے کہا غلطی [illegible] گیا ہوں، اس لیے حاصل نہ کر سکا، اس نے مونہہ بنا کر کہا تو آپ واپس جائیے" سرٹیفکیٹ کے [illegible] بغیر جانا نہیں" میں نے نہایت

سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا، بہت بہتر ہے، میں ابھی واپس جاتا ہوں، لیکن آپ میرا یہ پیغام [illegible] کوثر نیازی کو پہنچا دیں کہ میں ان کی دعوت پر یہاں آیا تھا، اور اب تندرستی کا سرٹیفکیٹ نہ ہونے کے باعث واپس بھیجا جا رہا ہوں، میری طرف سے معذرت۔ موصوف نے یہ سن کر فوراً کہا کہ "اچھا! تو اب آپ تشریف لے جائیں"۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھا۔

مسٹر غلام محی الدین صابری

اس عمارت میں داخل ہوا جہاں کسٹم وغیرہ کے بہت سے دفاتر ہیں اور جہاں پاسپورٹ کی جانچ ہوتی ہے وہاں جا کر پاسپورٹ حوالے کیا افسر متعلقہ دوسرے لوگوں کے پاسپورٹ دیکھ دیکھ کر واپس کر رہے تھے، لیکن انہوں نے میرا پاسپورٹ واپس نہیں کیا اور کسٹم کے ہال میں انتظار کرنے کو کہا۔ میں ابھی ہال میں کھڑا ہی تھا کہ ایک وجیہ، خوش وضع، اعلا درجے کے سوٹ میں ملبوس ایک صاحب ہال میں داخل ہو کر میری طرف بڑھے اور بڑے تپاک سے "السلام علیکم مولانا!" کہہ کر مصافحہ کیا اور مجھے ساتھ لے کر دفتر میں آ گئے۔ دفتر میں داخل ہوتے وقت میں نے ان کے نام کی پلیٹ پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان کا نام مسٹر غلام محی الدین صابری ہے اور کسٹم کے افسر اعلا ہیں، کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد جب گفتگو شروع ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ مشرقی یو۔ پی کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی پیدائش وہیں کی ہے، علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں، انہوں نے کہا کہ میرے آپ سے دو رشتے ہیں ایک یہ کہ میں آپ کا [illegible] عرصے سے پڑھ رہا ہوں، آپ کی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور ریڈیو پر آپ کی جو تقریریں [illegible] ہیں وہ سب سنی ہیں [illegible] لے کر آئے [illegible]

(لاہور) میرے عزیز دوست ہیں۔ اس وقت یہاں چند اور اصحاب بھی بیٹھے ہوئے تھے، صابری صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا تھا۔ ان میں ایک صاحب چودری برکت علی تھے جو فیرنگی ڈاک کے سپرنٹنڈنٹ ہیں، انہوں نے اپنا کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ میرا تعلق اسی محکمے سے ہے جس کے ذریعے آپ کا "برہان" اور ہندستان کے دوسرے اخبارات اور رسایل پاکستان پہنچتے ہیں اور آپ نے ابھی صابری صاحب سے شکایت کی ہے کہ "برہان" نہیں معلوم کیوں پاکستان نہیں پہنچ رہا ہے، اس لیے میں اس مسئلے کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا، فرمایے، وہ بولے کہ ایک عرصے کے تعطل کے بعد جب ہندستان اور پاکستان میں اخبارات اور رسایل اور کتابوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوا تو بعض لوگوں نے اس کا ناجایز فایدہ حاصل کرنا شروع کر دیا، مثلاً اس آڑ میں فلمیں وغیرہ اسمگل کرنے لگے، جب ہمارے علم میں یہ بات آئی تو ہم نے ڈاک بندکشی شروع کر دی، نتیجا یہ ہوا کہ چند مہینوں میں اخبارات اور رسایل کے انبار لگ گئے اور ہمارے کئی کمرے ان سے اٹ گئے۔ اب ہم نے گورنمنٹ کو اس صورت حال سے مطلع کیا تو ابھی پچھلے دنوں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے حکم خاص ہم کو بھیجا ہے کہ ڈاک کی آمد و رفت حسب سابق جاری کر دی جاے، چنانچہ میرا محکما اس پر تیزی سے عمل کر رہا ہے، اور مہینوں کی رکی ہوئی ڈاک کو سرانجام دینے کے لیے ہمیں عملے میں عارضی طور پر کچھ اضافا بھی کرنا پڑا ہے۔ چودری صاحب نے یہ داستان سنانے کے بعد مجھکو یقین دلایا کہ اب کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ آپ اطمینان رکھیں۔ جناب چودری صاحب سے ملاقات پر اظہار مسرت [illegible] بے تکلفی اور گرم جوشی سے انہوں نے [illegible] کا شکریا ادا کیا اتنے میں کافی [illegible] لازم ہے آگے [illegible] ہم سب نے اس سے

لاہور میں

اب صرف مرحلا ایک یہ باقی رہ گیا تھا کہ لاہور کس طرح پہنچنا ہوگا، کیونکہ رواروی میں چلنے کے باعث میں کسی کو کوئی اطلاع نہیں دے سکا تھا، صابری صاحب نے میاں اسلم کو ٹیلیفون بھی کیا، مگر وہ کلاس روم میں تھے اس لیے بات نہ ہو سکی، لیکن کارساز مطلق کی کارسازی کے قربان جایے کہ آج صبح جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے اپنے برادر خرد حکیم محمد سعید صاحب جو اس وقت اسلام آباد میں تھے ان سے ٹیلیفون پر گفتگو کی اور اسی میں ازراہ کرم ان کو میرے پہنچنے کی اطلاع بھی دے دی۔ اب حکیم محمد سعید صاحب نے فوراً اپنے ہمدرد آفس، لاہور کو ٹیلیفون کیا، اور میرے لیے بورڈ پر کار بھیجنے کا حکم دیا، چنانچہ صابری صاحب نے ابھی ٹیلیفون ہات سے رکھا ہی تھا کہ گھنٹی بجی اور ہمدرد آفس نے کار بھیجنے کی اطلاع دی، تھوڑی دیر میں ہمدرد آفس سے ایک نہایت شائستا و باشائستا افسر جناب اصغر خان صاحب کار لے کر پہنچ گئے اور میں صابری صاحب کی عنایات و الطاف کا شکریا ادا کر کے اور ان سے رخصت ہو کر لاہور کے لیے روانا ہوا، پہلے سیدھا ہمدرد آفس آیا جو مال روڈ پر ایک شاندار بلڈنگ میں قایم ہے۔ یہاں جناب اشرف صبوحی صاحب اور عملے کے دوسرے اصحاب منتظر تھے ان سے ملاقات ہوئی۔ اشرف صبوحی صاحب میرے دیرینا عزیز دوست ہیں، دل کی بیگاتی اور ٹکسالی زبان کے ماہر اور اس سلسلے میں کئی کتابوں اور بے شمار مقالات کے مصنف ہیں، بے حد بذلا سنج اور لطیفا گو ہیں۔ بات بات میں لطایف و ظرایف کہتے ہیں، [illegible] کے بعد ان سے اور ہمدرد آفس کے دوسرے احباب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اگر میں چاہتا تو اسی وقت اسلام آباد جا سکتا تھا، لیکن اپنی [illegible] ملاقات کی تشنگی [illegible]

لاہور میں ہو رہی ہے، میں نے لاہور میں ہی ٹھہر جانے کا فیصلہ کر لیا، چنانچہ اب میں ہمدرد کی ہی کار میں حسن ابدال اپنی بچی ریحانہ (اہلیہ ڈاکٹر محمد اسلم) کے گھر آیا، بلا اطلاع کے اچانک پہنچ جانے سے سب کو بے حد خوشی ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد میاں اسلم بھی یونیورسٹی سے آ گئے۔

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

کھانا کھا کر ابھی ذرا کمر سیدھی کی ہی تھی کہ مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواروی تشریف لے آئے، مولانا نہایت وسیع النظر عالم اور بلند پایہ مصنف ہیں ان کا شمار آزاد خیال علما میں ہوتا ہے۔ کسی کو ان کے افکار سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو کچھ لکھتے تحقیق سے اور حوالے سے لکھتے ہیں، پھر بڑی بات یہ ہے کہ معلومات مستحضر ہیں اس لیے گفتگو بھی مدلل کرتے ہیں۔ ہندستانی زبان کے نامور ادیب ہیں، ایک عرصے تک ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور سے وابستہ رہے، اب اس سے سبکدوش ہو کر کراچی منتقل ہو گئے ہیں۔ مجھ سے ان کو دیرینہ اخلاص و محبت کا تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی ان کو میرے آنے کی اطلاع ہوئی از راہ کرم فوراً تشریف لے آئے۔ مولانا کی گفتگو ہمیشہ علمی ہوتی ہے، آج کل پاکستان میں شیعہ اور سنی تنازعہ اور کشمکش بہت زوروں پر ہے، اور اس سلسلے میں شیعوں کی طرف سے عدالت میں ایک مقدمہ بھی چل رہا ہے، اثنائے گفتگو میں اس کا ذکر آ گیا مولانا نے اس کشمکش کے مذہبی اور تاریخی اسباب پر مختصر، مگر جامع اور مدلل تقریر کی اور تفصیل میں جو کسر رہ گئی تھی اس کو میاں اسلم کی عالمانہ اور فاضلانہ تقریر نے پورا کر دیا۔ میں دونوں کی تقریریں خاموشی سے سنتا رہا، لیکن امت کی [illegible] حالت زار اور مستقبل کے اندیشوں کے خیالات سے دل خون کے آنسو رو رہا تھا، مگر [illegible] خدا ہی جانتا ہے آج یہ کیا

بات نہیں، پوری تاریخ اسلام میں یہ کیجیے اس سے بھی عظیم فتنے ہر دور میں برپا رہے ہیں۔ اللھم اعاذنا اللہ عنہا۔

شام ہمدرد

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ۳½ بج گئے، میاں اسلم نے کہا کہ چار بجے شام ہمدرد ہے اس میں جانا ہے شام ہمدرد کے نام سے ہمدرد فاونڈیشن کی طرف سے ایک نہایت مفید علمی اور ادبی مجلس کا سلسلہ سالہا سال سے جاری ہے۔ یہ مجلس باری باری سے ہر ہفتے کراچی، پشاور، اسلام آباد اور لاہور [illegible] اہتمام و انتظام سے مقامی انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد ہوتی ہے۔ پروگرام یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے مقرر کیے ہوئے عنوان پر کسی ماہر فن اور اسکالر کا مقالہ ہوتا ہے، اس کے بعد اس پر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور پھر نہایت پر تکلف چائے اور اس کے لوازمات سے شرکائے مجلس کی تواضع ہوتی ہے۔ کم و بیش ڈیڑھ سو دو سو ارباب علم اور اصحاب ذوق مدعو ہوتے ہیں۔ مقالہ یا تقریر کا موضوع عموماً اسلامی اور علمی ہوتا ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب اگر پاکستان میں ہوتے ہیں تو شہر بشہر ہر مجلس میں خود شریک ہوتے [illegible] اس روز صبح سے شام تک وہاں مطب بھی کرتے ہیں جس سے ہزاروں بندگان خدا کو فائدہ ہوتا ہے۔

مولانا سے رخصت ہو کر میں اور میاں اسلم ایک دوست کی کار میں انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل پہنچے (یہ وہ ہوٹل ہے جس میں سیرت کانفرنس کے سب مندوبین اسلام آباد سے آ کر مقیم ہونے والے تھے اور کانفرنس بھی اس کے ایک ہال میں منعقد ہونے والی تھی) میں ۱۹۶۹ء میں جب پاکستان آیا تھا اس وقت بھی لاہور اور کراچی کی شام ہمدرد میں شریک ہوا تھا۔ آج یہ تیسرا موقع تھا، ہال میں داخل ہوا ہی تھا کہ اچانک لفٹننٹ جنرل خواجہ عبد الرشید سے آنکھیں دو چار ہوئیں وہ [illegible] کرسی سے اٹھے اور فرط مسرت سے [illegible] ہوئے بیچ سے بغل گیر ہو گئے (ان کا ذکر آ چکا ہے) پھر چند اور اصحاب سے علیک سلیک اور

مزاج پرسی ہوئی میں اور خواجہ صاحب کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ مجلس کی کاروائی شروع ہو گئی۔

قرآن مجید کی تلاوت کے بعد حکیم محمد سعید صاحب کی اسلام آباد میں مصروفیت کے باعث ان کی قائم مقامی میں ایک مختصر تقریر صدر جلسہ پروفیسر سراج الدین پروفیسر انگریزی پنجاب یونیورسٹی، وپرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور اور آج کی شام کے فاضل مقرر (جن کا نام افسوس ہے ٹھیک یاد نہیں رہا۔ غالباً "کارنیالس" تھا یہ پاکستان ہائیکورٹ کے ریٹائرڈ جج تھے) کے تعارف اور ان کے شکریے میں اشرف صبوحی صاحب نے کی۔ اب مقالہ شروع ہوا جو انگریزی میں تھا اور اس کا موضوع تھا "ریاست اور اخلاق" مقالے میں افلاطون کے نظریے سیاست اور مغربی مفکرین کے افکار وآرا سے بحث کرنے کے بعد قرآن مجید کی آیات اور امام غزالی اور حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی کے بیانات وتصریحات کی روشنی میں موضوع بحث پر سیر حاصل گفتگو کی گئی تھی۔ فاضل مقرر اگرچہ عیسائی ہیں ان کا اسلامیات کا مطالعہ وسیع اور ٹھوس ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ ریاست کے لیے اخلاق کا پابند ہونا ضروری ہے۔ پورا مقالہ پر مغز اور مدلل تھا۔ سب نے اسے کامل توجہ اور غور سے سنا۔

اس کے بعد جناب صدر کی تقریر ہوئی اور پھر صدر کی طرف سے رسم شکریہ کے بعد نشست ختم ہو گئی۔ اب حسب معمول چائے کا دور شروع ہوا۔ لاہور کے اور بہت سے قدیم وجدید احباب سے ملاقات ہوئی۔ لاہور میں علمی اور ادبی رشتے سے میرے مخلص دوستوں اور قدر دانوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ان میں سے اس وقت جن حضرات کے نام یاد رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں، ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر رانا احسان الٰہی، جسٹس ایس۔ اے رحمان، ڈاکٹر سید شیخ، (ڈائرکٹر ادارۂ ثقافت اسلامی) ڈاکٹر [illegible] (ڈائرکٹر اقبال اکاڈمی) شاہد حسین صاحب [illegible] چودھری، [illegible]

عابدی، یہ وہ حضرات ہیں جن کو لاہور کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کا روح رواں کہنا چاہیے۔

ہوٹل میں

ان دوستوں سے مل ملاکر یہاں اسلم کے ساتھ میں گھر واپس آیا اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر ٹیکسی سے مع سامان کے پھر اسی ہوٹل میں واپس آگیا، چونکہ کل صبح سے لاہور کا کانفرنس سیشن شروع ہونے والا تھا۔ ہوٹل میں ایک کمرا میرے لیے پہلے سے ریزرو تھا، میں اس میں مقیم ہو گیا، ہوٹل میں سکیورٹی کے انتظامات اعلیٰ قسم کے تھے کوئی شخص جو ہم سے ملنے آتا تھا اس پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی اور چوبیس گھنٹے پہرا رہتا تھا۔

لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

خواجہ صاحب میرے نہایت دیرینہ عزیز دوست ہیں ان کے تعلقات مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی کے ساتھ بھی ایسے ہی اس زمانے سے ہیں جبکہ تقسیم سے قبل وہ گورنمنٹ سروس کے سلسلے میں میرٹھ چھاؤنی میں ایک شاندار کوٹھی میں رہتے تھے۔ تقسیم کے وقت برما میں تھے، وہاں سے پاکستان چلے گئے۔ ابھی چند برس ہوئے کہ لاہور کے میو اسپتال کے چیف اڈمنسٹریٹر کے عہدے سے سبکدوش ہو کر لاہور میں رہ پڑے ہیں یہاں چھاؤنی میں الرشید کے نام سے ایک شاندار اور خوبصورت کوٹھی بنوا لی ہے، اس میں رہتے ہیں۔ پاکستان کی اعلیٰ علمی اور سرکاری سوسائٹی میں خواجہ صاحب کا بڑا وزن اور وقار ہے۔ علمی ذوق نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں سائنس اور [illegible] تو ان کے فنی مضمون ہی ہیں، اسلامیات تاریخ، فلسفہ، لغویات اور انگریزی اور ہندستانی وفارسی شعر وادب کا بھی بہت وسیع اور تحقیقی مطالعہ رکھتے ہیں۔ قرآن مجید کی تلاوت اور اس میں تدبر وتفکر سے بے حد شغف ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھی سے باقاعدہ درس قرآن لیا ہے [illegible]

کے نام کے بھی عاشق اور مداح ہیں، اور والا و شیدا اقبال کے بھی ہیں، اس سلسلے میں ایک مرتبہ اپنے ان تینوں ممدوحین کا موازنہ کرتے ہوئے انہوں نے بڑی پر لطف بات کہی، کہنے لگے، مولانا عبیداللہ سندھی میں علم ہے، مگر شخصیت نہیں، اس کے برخلاف اقبال میں شخصیت ہے، مگر علم (قرآن) نہیں، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد میں علم بھی ہے اور شخصیت بھی۔ خواجہ صاحب کا اسلامی فکر ان تین حضرات کا ہی تعبیر کردہ ہے۔

خواجہ صاحب "برہان" کے شروع ہی سے نہ صرف خریدار، بلکہ بے حد قدر دان اور ادارے کے معاون بھی ہیں۔ "برہان" میں متعدد علمی مقالات بھی آپ کے قلم سے نکل چکے ہیں، اور ادارے نے عرصہ ہوا آپ کی ایک بلند پایہ علمی کتاب "معارف الآثار" کے نام سے شائع کی تھی۔ انگریزی، ہندستانی اور فارسی میں ایک درجن سے زیادہ کتابوں اور کم و بیش دو سو مقالات کے مصنف ہیں جو برصغیر ہندستان اور پاکستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے اخبارات و رسائل میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کتابوں اور اسلامی تہذیب و تمدن کے نوادر کے جمع کرنے کا بڑا شوق ہے، چنانچہ ان کا ذاتی کتب خانہ اور میوزیم دونوں قابل دید ہیں — مشاہیر عالم نے ان کو دیکھا اور داد دی ہے۔ غرض کہ ہر اعتبار سے بڑی عجیب و غریب اور قابل قدر شخصیت کے مالک ہیں، اگرچہ وضع قطع اور رہن سہن بالکل یورپین ہے، لیکن نماز پنجگانہ اور وظائف اور تلاوت کلام مجید کے سختی سے پابند ہیں۔ رمضان میں باقاعدہ شب بیداری کرتے ہیں۔ میں نے کبھی ان سے پوچھا تو نہیں اور نہ میں کسی سے ایسی بات پر تجسس کرتا ہوں کہ خود کبھی انہوں نے اس کا اظہار کیا، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تہجد کی نماز کے بھی پابند ہیں۔ میں حیدرآباد دکن میں ایک گھرانے سے واقف ہوں جس کی [illegible] یہاں تک کہ

لڑکے اور لڑکیاں سب گھر میں بھی انگریزی بولتے ہیں، لیکن اس کے باوجود پورا گھر پابندی سے تہجد کی نماز پڑھتا ہے اور اس کے بعد یہ سب مل کر ذکر کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے ایک سفر میں میں ان کی عالی شان کوٹھی میں قیام کر چکا ہوں۔ "برہان" میں اس سفر کی روئیداد کے ذیل میں میں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی دین سے بے خبری اور بے چینی کا کتنا درد ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے ہوگا جس سے میں خود بھی بے حد متاثر ہوا۔

شام ہمدرد کی تقریب سے فارغ ہو کر جب خواجہ صاحب جانے لگے تو مجھ سے بولے، اب کل (۵ مارچ) سے تو کانفرنس لاہور میں ہو رہی ہے، آپ صبح سے شام تک اس میں مصروف رہیں گے، پھر اطمینان کی ملاقات اور گفتگو کیسے اور کب ہو؟ اس کے بعد کہا، آپ کو سحر خیزی کی عادت ہے اور یہی عادت میری بھی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں روزانہ علی الصباح پانچ بجے آ جایا کروں۔ میں نے کہا، بہت خوب! اس سے بہتر ملاقات کا وقت اور کون سا ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی قرارداد کے مطابق خواجہ صاحب کار میں بیٹھ کر صبح منہ اندھیرے ہی پہنچ گئے اور اسی وقت ان سے ادھر ادھر کی ڈھیروں باتیں ہوئیں، نظیری نے اسی جیسے موقع کے لیے کہا ہے ؎

چہ خوش است از دو یک دل سر حرف باز کردن
سخن گذشتہ گفتن، گلہ ہا دراز کردن

وحشت کلکتوی نے اسی مضمون کو ہندستانی میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

مزا آتا اگر گذری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے

یہاں سنانے کے قابل جو بات ہے کہ خواجہ صاحب اس وقت آئے تو میرے لیے ایک قیمتی تحفہ اور انگریزی کی ایک نایاب مطبوعہ کتاب ساتھ لائے تھے۔ یہ کتاب کافی ضخیم ہے اور اس کا نام ہے "اسلامی فکر کے اقدار کا از سر نو جائزہ"

[illegible]

چند مقالات کا مجموعہ ہے جو پاکستان کا مختلف رسالوں میں نکلتے رہے تھے ـ ان میں سب سے بڑا مقالہ جو کئی ابواب پر مشتمل ہے یہی ہے، اس لیے کتاب کا نام اسی سے منسوب ہے ـ خواجہ صاحب نے اس کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کیا ہے، اور اس سلسلے میں جو عبارت لکھی ہے ہندستانی میں اس کا خلاصہ اور ترجمہ یہ ہے ـ

"انتہائی عاجزی اور نیاز مندی کے ساتھ
یہ کتاب ایک حقیر نذرانہ ہے مقدس
پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں
جو قیامت کے دن امت کے خلاف
فریادکناں ہو کر فرمائیں گے ـ "یرب
ان قومی اتخذوا ھذا القرآن
مھجورا" (الفرقان) اے میرے
رب میری امت نے اس قرآن کو ترک
کیے ہی رکھا"

میں اس کتاب کو کھول کر اس کا انتساب پڑھنے لگا اور ابھی مندرجۂ بالا آیت پڑھنی شروع کی ہی تھی کہ اچانک خواجہ صاحب کی چیخ نکلی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور دیر تک روتے رہے ـ میں نے بہت ضبط کیا ـ آخر کار میرے اشک بھی رواں ہو گئے میں نے دل میں کہا ـ اسلام کا درد، حضور سے عشق و محبت اور مسلمانوں کے دین سے بعد اور دوری کا غم اور کرب! یہ سب اللہ کی دین ہے، جبۂ و دستار اور جامۂ زہد و پارسائی سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد خواجہ صاحب چلے گئے اور کانفرنس میں شرکت اور دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر گئے ـ

میرے مشاہدات اور تاثرات

خواجہ صاحب کے جانے کے بعد میں غسل اور ناشتہ کر کے بیٹھا ہی تھا کہ ہمدرد کے منتظمین میں سے ایک صاحب لاہور کے تازہ پھلوں کی ایک بڑی ٹوکری لے آئے اور اس کے بعد ایک اور صاحب آئے اور رجسٹریشن کے بغیر ہی میرے نام کا تھیلا کمرے پر پہنچا گئے، یہ تھیلا پلاسٹک سے بنے ہوئے اعلا قسم کے سیاہ چمڑے کا تھا اسے کھول کر دیکھا تو حیرت میں رہ گیا ـ کانفرنس سے متعلق ہر قسم کی معلومات کا پورا لٹریچر، دعوت نامے، پروگرام، اسٹیشنری کا پورا سامان یہاں تک کہ گوند دانی، چھوٹی بڑی پنیں، اور پھر ایک کیس میں بند پلاسٹک کی خوبصورت جانماز، اس کے ساتھ تسبیح اور ٹوپی بھی، یہ معمولی اور چھوٹی باتیں ہیں، لیکن حسن انتظام اور خوش سلیقگی کا اندازہ انہیں چیزوں سے ہوتا ہے، کہتے ہیں فرانس میں تو لوگ ایک آدمی کے کلچر کا اندازہ اس سے کرتے ہیں کہ وہ روزانہ کتنا صابن استعمال کرتا ہے ـ

کیجیے اب صدر ضیا اسلام آباد سے اڑ کر لاہور پہنچنے والے ہیں، اس لیے ہوٹل کے صحن زرین میں ایک ہماہمی اور سرگرمی پیدا ہو گئی، آپ شروع سے اس کی روئیداد سنیے ـ

شریک ممالک

اس کانفرنس میں ۴۳ ملکوں کے نمایندوں کے نمایندوں نے شرکت کی، کانفرنس کی طرف سے شایع شدہ تعارف نامے کی ترتیب کے مطابق ان کے نام یہ ہیں ـ افغانستان، الجزائر، آسٹریا، بحرین، بنگلا دیش، بلجیم، بنگلادیش، جزائر کومرو، سائپرس ـ مصر، فن لینڈ، فرانس، گھانا، انڈیا، انڈونیشیا، ایران، جاپان، اردن، کینیا، کویت، لبنان، لیبیا، قینیا، موریتانیا، ماریشس، مراکو، مسقط، نیدرلینڈ، نائیجیریا، پاکستان، سعودی عرب، سینیگال، سری لنکا، سودان، شام، جمہوریہ تیونس، ٹرینی گواڈ اور ٹوباگو، تیونس، ترکی، متحدہ عرب امارات، متحدہ امریکہ، برطانیہ، مغربی جرمنی، شمالی یمن اور ترکستان،

بیرونی ممالک کے مندوبین کی تعداد مختلف
تھی کہیں سے دو، کہیں سے پانچ، چھ مجموعی طور پر دو
سو کے لگ بھگ ہوں گے، ظاہر ہے خود پاکستان
کے مندوبین کی تعداد بہت زیادہ ہونی چاہیے تھی
لیکن ان کو عملاً تہ دار تقسیم کر دیا گیا تھا، اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو اسلام آباد میں مندوب
ہیں وہ لاہور، پشاور اور کراچی میں نہیں اور
جو مثلاً لاہور میں مندوب ہے وہ دوسرے
شہروں میں نہیں، ایسا کرنے سے دو فائدے
ہوئے، ایک یہ کہ مجمع کم ہو گیا، دوسرے یہ کہ
پاکستانیوں کے قیام کا انتظام ہوٹل میں کرنے کی
ضرورت نہ ہوئی، ورنہ سخت دشواری پیش آتی۔
بیرونی ممالک کے مندوبین میں بعض حضرات
مع اپنی بیویوں کے آئے تھے، کانفرنس نے دعوت
نامے میں اس کی اجازت دی تھی۔

مندوبین میں امریکا اور برطانیہ کے مستشرقین
اور خواتین کی بھی خاصی تعداد تھی اور مندوبین
آگے پیچھے ادھر ادھر سے ۲ مارچ کی شام تک
کراچی پہنچ گئے۔ شب ہوٹل میں بسر کی اور دوسرے
دن دوپہر تک اسلام آباد آگئے۔ یہاں شام
کو کانفرنس کا افتتاحی جلسہ ہوا۔ اس میں قرآن
مجید کی تلاوت کے بعد پہلے مولانا کوثر نیازی
وزیر اوقاف و امور مذہبی (مفصل تعارف اور
تذکرہ آگے آئے گا) نے تقریر کی۔ کانفرنس کی
اصل زبان عربی اور انگریزی تھی۔ ان میں سے
کسی ایک میں تقریر یا مقالہ ہوتا تھا تو دوسری زبان
میں اس کا ترجمہ ہو جاتا تھا، اور یہ خدمت پوری
کانفرنس میں دو صاحبوں نے انجام دی، ایک کویت
کے سید یوسف ہاشم الرفاعی اور دوسرے امریکا
کے ڈاکٹر محمد عبدالرؤف۔ رفاعی صاحب کئی مرتبہ
ہندستان آچکے ہیں اور یہاں کے باخبر لوگوں سے
جانے پہچانے ہیں، موخر الذکر اصلاً مصری ہیں
اور آج کل واشنگٹن میں اسلامک سنٹر کے
ڈائرکٹر ہیں، جامعۂ ازہر سے فارغ التحصیل ہونے
کے بعد [illegible] اور انگلینڈ میں تعلیم پائی، اس لیے
انگریزی اور فرانسیسی دونوں پر تحریر اور تقریر کی قدرت
رکھتے ہیں۔

وزیر اعظم مسٹر بھٹو کی افتتاحی تقریر

مولانا نے تقریر انگریزی میں کی اس میں انہوں
نے وزیر اعظم کا استقبال کیا اور کانفرنس کی
اہمیت، اس کے اغراض و مقاصد اور اس سلسلے
میں آئندہ جو کام پیش نظر ہیں ان پر روشنی ڈالی
اس کے بعد مسٹر بھٹو نے حسب معمول ایک طویل
تقریر کی اور اس میں کہا۔ "مقدس پیغمبر صلی اللہ
علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی تعلیمات میری
گورنمنٹ کی داخلہ اور خارجہ پالیسی، نیز تعلیم
اور دوسرے بہت سے امور سے متعلق ہماری
پالیسی کا سرچشمہ رہی ہیں۔ پاکستان کی عوامی
پارٹی جس کی قیادت کا مجھے شرف حاصل ہے
اس کی رہنما بھی یہی دو چیزیں ہیں، اسی بنا پر
جو کچھ اچھائیاں ہمارے پاس تھیں، یا جو اچھی
چیزیں ہم نے حاصل کی ہیں، خصوصاً ہمارا مساوات
انسانی اور سماجی عدل و انصاف کا تصور یہ
سب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دین ہے
یہ سیرت کانفرنس جب آں حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کی سیرت پاک اور آپ کی تعلیمات
کے ان پہلوؤں پر غور و خوض کرے گی تو اس
کو معلوم ہوگا کہ ماڈرن انسان کے دماغ میں اس
موقع پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ
اگر مساوات انسانی، سماجی انصاف اور اتحاد
و اتفاق واقعی اسلام کی تعلیمات ہیں اور حضور
ان کا نمونہ تھے، تو پھر آج ہمارے ملک کی اکثریت
کیوں سماجی ناانصافی، ظلم و تشدد، عدم مساوات
باہمی بغض و عناد، نفرت، استحصال، جبر اور
رنگ و نسل کے امتیاز اور تعصبات کا شکار
ہے؟ تعلیم، فی کس آمدنی اور دوسرے ترقیاتی
امور میں ہمارا تناسب دوسری بہت سی قوموں
کے مقابلے میں کیوں کم ہے؟ [illegible]

ہم سے کہیں غلطی ہوئی ہے۔ یا ہم حضور کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سیرت کانفرنس کے آیندہ دنوں میں آپ ان مسائل پر غور کریں گے۔

اس سلسلے میں میرے نزدیک پہلی چیز جس پر سیرت کانفرنس کو توجہ کرنی چاہیے سیرت کا وہ حصہ ہے جو روایاتی اور افسانوی انداز کا ہے، اور جس میں بحیثیت ایک عالی انسان کے حضور کا کیرکٹر اور کردار غیر اہم ہو کر رہ گیا ہے، اس بنا پر مسلمان علما اور فضلا کا یہ فرض ہے کہ وہ سیرت سے اخذ کر کے حضور کا پیغام اور عمل جدید انسان کے سامنے بالکل صاف اور واضح شکل میں پیش کریں۔

دوسری چیز جو آپ حضرات کی توجہ کی مستحق ہے وہ مغرب کے علماے اسلامیات سے متعلق ہے مغرب میں حضور کی تصویر کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اس میں نفرت، عناد اور تعصب کی آمیزش ہے، یہ بات بڑی افسوسناک اور تکلیف دہ ہے کہ مغرب کا جدید انسان دنیا اور اس کے پڑوسی سیاروں کے بارے میں اس درجہ روشن خیال ہے، لیکن دوسری طرف اسلام اور اس کے بانی کے متعلق وہ اب بھی قرون وسطیٰ کی تنگ نظری اور تاریک دماغی کا شکار ہے۔ سیرت کانفرنس کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ ان وسائل اور ذرائع پر غور کرے جو مغرب کے ان قدیم العہد تعصبات کو دور کرنے اور سیرت مقدسہ کو اس کی صحیح شکل و صورت میں پیش کرنے میں کامیاب ہوں، ہمیں حضور کی سیرت مقدسہ کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرنا چاہیے کہ وہ مختلف مذہب اور ملت کے درمیان مفاہمت اور ان میں باہمی اشتراک و تعاون کی بنیاد بن سکے اور اس سے عالم میں امن و امان قائم کرنے میں مدد ملے۔ مجھ کو امید ہے کہ سیرت کانفرنس ان مقاصد کو پیش نظر رکھے گی، میں دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کا حامی اور ناصر ہو، بس ان الفاظ کے ساتھ میں بڑی خوشی سے اس پہلی عالمی سیرت کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں۔

اس تقریر کے بعد وزیر اعظم کے شکریے کا ایک ریزولیوشن جس کو حکیم محمد سعید نے پیش کیا تھا، منظور ہوا، اور جلسہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن یعنی ۱۴ مارچ کو صبح کے وقت سیرت کانفرنس کا ابتدائی جلسہ نیشنل اسمبلی پاکستان کے اسپیکر صاحبزادہ فاروق علی اور ڈاکٹر عبد الرؤف (امریکا) کی مشترکہ صدارت میں منعقد ہوا، اور مختلف حضرات نے سیرت کانفرنس کی اہمیت اور اس کے لیے پاکستان گورنمنٹ کی پیش قدمی پر اظہار تحسین کیا۔ مقالات کا جلسہ سہ پہر میں ہوا۔ اس کے صدر ترکی کے وزیر امور مذہبی جناب حسن اکسوے Aksoy تھے اس میں دس مقالات پڑھے گئے ترکی کے مندوب جناب عصمت بزدا نے "اسلام اور سوشل جسٹس" پر اپنا مقالہ پڑھا، اور اس میں کہا کہ اب "تلوار کی جنگ کا زمانہ ختم ہو گیا" اور افکار و نظریات کی جنگ کا زمانہ ہے، اس میں بھی اسلام کو وہی رول ادا کرنا ہے جو اس نے تلوار کی جنگ کے دور میں ادا کیا تھا۔ قبرص کے مفتی ڈاکٹر رفعت مصطفا نے اپنے مقالے میں ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبرص کو اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنانا چاہتے تھے، چنانچہ ۲۸ھ میں مسلمانوں کا سب سے پہلا بحری بیڑا یہاں پہنچا تھا۔ حضرت ام حرام جن کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی والدہ کی طرح عزیز رکھتے تھے ان کا مزار بھی یہیں ہے، لیکن ترک مسلمانوں کو اس جزیرے سے بے دخل کرنے کی غرض سے یونانیوں نے وہاں جو قیامت برپا کر رکھی ہے، اس کی وجہ سے مسلمانوں کے معابد اور مقابر کے ساتھ حضرت ام حرام کے مزار کی بھی بے حرمتی کی گئی ہے۔ پروفیسر چارلس گڈیس [illegible] ڈائرکٹر امریکن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ڈینور یونیورسٹی نے اپنے مقالہ "اسلام امن اور صلح کی ایک طاقت" میں اس حقیقت کا صاف اعتراف کیا کہ اسلام امن کا مذہب ہے اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات کو

لازمی طور پر عالمگیر سمجھا جا ہیے، انہوں نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ عیسائیوں اور یہودیوں نے عام طور پر اور خصوصاً مغربی ممالک میں نہ اسلام اور پیغمبر اسلام کو بالکل سمجھا نہ درجا تا ہی نہیں یا ان کو غلط جانا اور ان کی غلط تشریح کی ہے۔

پوری کانفرنس میں جو مقالات پڑھے گئے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، پھر سب مقالات یکساں معیار کے تھے بھی نہیں، بعض بلند پایا اور غور و فکر اور تحقیق سے لکھے ہوئے اور بعض ایسے کہ گویا میلاد النبی کے جلسے میں وعظ ہو رہا ہے اس کے علاوہ چونکہ کانفرنس کی طرف سے کسی کو کوئی معین عنوان نہیں دیا گیا، اور ہر مقالا نگار کو اس کی آزادی تھی کہ وہ جس عنوان پر چاہے مقالا لکھے اس بنا پر ایک ہی عنوان پر کئی کئی مقالے جمع ہو گئے۔

ہمارے فاضل اور عزیز دوست جناب سید صباح الدین عبد الرحمان صاحب نے اپریل کے معارف میں اس کانفرنس کی جو روئیداد لکھی ہے اس میں انہوں نے ہر مقالے کے عنوان کے ساتھ مقالا نگار کا نام بھی لکھ دیا ہے - یہ بڑا طول عمل تھا جسے انہوں نے گوارا کر لیا، اس لیے جس کسی کو مقالات اور مقالا نگاروں کی مکمل فہرست دیکھنی ہو معارف کو دیکھے - میں صرف خاص خاص مقالات کے ذکر اور ان کے خلاصے پر اکتفا کروں گا، البتہ چونکہ ایک مورخ کے قلم سے جو چیز نکلتی ہے تاریخ بن جاتی ہے، اس لیے یہ تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ سید صاحب نے اپنے سامنے مطبوعہ پروگرام رکھا اور اس سے یہ فہرست مرتب کر لی، حالانکہ اس پروگرام میں بہت کچھ تغیر تبدل ہوا ہے، اگر وہ پروگرام کے بجائے کانفرنس کی طرف سے جو بلیٹین شایع ہوتے رہے اگر وہ ان کو پیش رکھتے تو یہ غلطی نہ ہوتی، مثلاً پروگرام میں حکیم عبد الحمید صاحب کی صدارت اور مقالا دونوں موجود ہیں، چنانچہ معارف میں بھی اس کا ذکر ہے، لیکن اس تاریخ دس مارچ تک حکیم صاحب لاہور پہنچے ہی نہ تھے، اس لیے نہ صدارت ہوئی اور نہ مقالا،

بہر حال اسلام آباد میں کل دس مقالات پڑھے گئے۔

لاہور میں

۴ر کو کانفرنس کا اجلاس اسلام آباد میں ختم ہو گیا - شب وہاں گذار کر ۵ر کی صبح کو مندوبین لاہور پہنچے، آج جمعہ تھا، اس لیے مقالات کا کوئی پروگرام نہیں تھا - مندوبین دیر سے پہنچے تھے، پھر اپنے کمروں تک پہنچنے اور کپڑے وغیرہ بدلنے میں دیر ہو گئی، اس لیے جلدی جلدی کچھ زہر مار کر کے ایک بجے کے قریب شاہی مسجد کے لیے روانا ہوئے - یہ مسجد اورنگ زیب عالمگیر کی بنائی ہوئی ہے، اور وسعت میں آگرا اور دلی کی جامع مسجدوں سے بڑی ہے - تقسیم سے پہلے یہ شکستا حالت میں تھی، لیکن اب مرمت کے بعد نئی جیسی ہو گئی ہے - مسجد میں مندوبین کے لیے امام کے پیچھے کی دو تین صفیں خصوص تھیں مسجد میں ان کے داخلے کا انتظام بھی مغربی دروازے سے تھا، جہاں پیادا اور سوار پولیس تھے اور اسکورٹی کے انتظامات بہت بڑے پیمانے پر تھے۔ شاہی مسجد کے مستقل امام اور خطیب مولانا عبد القادر صاحب ہیں بڑے جوش و خروش اور ہوش و گوش کے عالم اور مقرر ہیں - مجھ سے ان کو غائبانا بڑی محبت اور خلوص کا تعلق تھا، روس کے سفر میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں جو دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس ہوئی تھی تو اس موقع پر جمعہ کی نماز مولانا عبد القادر صاحب نے پڑھائی تھی، لیکن آج امام حرم کعبہ شیخ عبد اللہ بن سبیل ہمارے ساتھ تھے، اس لیے ان کے سوا اور کس کو امامت کا حق ہو سکتا تھا - شاہی مسجد کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کے بام و در امام حرم کعبہ کی خطابت و تلاوت کلام مجید کی دل نواز و روح پرور صدا سے گونج رہے تھے۔ نمازیوں پھر جن کی تعداد دس بارہ لاکھ سے بیش کم نہ ہو گی اس تصور اور بخت کی یادگار سے عالم وجد

طاری ہوگیا، خود میرا حال یہ ہوا کہ

دل میں اک درد اٹھا آنکھ میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

نماز ختم ہوچکی تو جلسۂ عام شروع ہوا۔ قرآن مجید کی تلاوت کے بعد مولانا کوثر نیازی، شمالی یمن کے وزیر اوقاف محمد الصباحی، اور شام اور لبنان کے مفتی شیخ حسن خالد اور شیخ احمد کفتارو نے تقریریں کیں، میں کچھ دیر جلسے میں بیٹھا۔ پھر اٹھ کر دیوار قبلا کی پشت پر ایک بڑا چبوترا ہے اس پر متعدد صوفاسٹ اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر بہت سے مندوبین پہلے سے براجمان تھے، میں یہاں چلا آیا اور سب سے الگ ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنے عہد ماضی کے تصورات میں غرق ہوگیا۔

شاہی مسجد اپنے دامن میں تاریخی عظمت کے بہت سے گوہر ہائے گرانمایہ رکھتی ہے، اس کی مشرقی دیوار کے نیچے علامہ اقبال کے مقبرے نے اس مقام کی عظمت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ مقبرے سے متصل ایک پارک ہے، جس کی وجہ سے یہ پورا علاقہ حضوری باغ کہلاتا ہے۔ مجھ کو اس مقام اور اس کے ماحول سے ایک قسم کا جذباتی لگاو ہے، کیونکہ عنفوان شباب کی بہت سی یادیں اس سے وابستہ ہیں۔ سنہ ۱۹۲۷ء اور سنہ ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے کہ میں دیوبند سے فارغ التحصیل ہوچکا تھا، اور پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا، اور اب انگریزی تعلیم کے اورینٹل کالج، لاہور میں داخلہ لیا تھا۔ اس وقت تک کالج کا ولنر ہوسٹل نہیں بنا تھا، اس لیے ہندو، مسلمان اور سکھ سب طلبا اسی حضوری باغ میں بڑے دروازے کے اوپر دونوں جانب جو بارکیں بنی ہوئی ہیں ان میں بطور ہوسٹل کے رہتے تھے۔ یہیں نمبر ۶ کے کمرے میں میں تنہا رہتا تھا، کم وبیش نو مہینے یہاں قیام رہا ہوگا۔ اس زمانے میں لاہور علم و فضل اور شعر و ادب کا قرطبا اور بغداد تھا اور پورے ملک میں اسی کی عظمت اور شہرت کا ڈنکا اس طرح بج رہا تھا کہ دلی، لکھنو اور حیدر اباد کی عظمت دیرینہ کے ترانے مدہم ہوگئے تھے۔ اکابر علم وفن اور محققین میں علامہ عبد اللہ یوسف علی، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال، حافظ محمود شیرانی، علما میں مولانا احمد علی، مولانا نجم الدین، مولانا سید طلحہ، ارباب صحافت و ادب میں مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر، عبد المجید سالک، سر عبد القادر، احمد شاہ بخاری، امتیاز علی تاج، اور شعرا میں تاجور نجیب ابادی، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری تر لوک چند محروم اور محمد دین تاثیر، یہ سب حضرات وہ تھے جو اس زمانے میں غیر منقسم ہندستان کی علمی اور ادبی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ کسی سے کم، کسی سے زیادہ میل جول اور ملاقات تو سب سے ہی تھی، لیکن علامہ اقبال اور مولانا احمد علی سے سب سے زیادہ استفادہ کیا۔ ان دونوں حضرات کو اس کا علم تھا کہ حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ کشمیری) سے مجھکو صرف شرف تلمذ ہی حاصل نہیں، بلکہ حضرت مجھ پر شفقت خاص بھی رکھتے ہیں اس بنا پر یہ دونوں بزرگ بھی التفات خاص سے نوازتے، اور مختلف مسایل پر بے تکلف اظہار خیال کرتے تھے، اس سے عصری مسایل پر غور کرنے اور دنیا کا رخ سمجھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ ہم احباب میں ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی اور ڈاکٹر سید عبد اللہ جیسے اہل علم و ارباب ذوق شامل تھے، ان سے اکثر مجلسیں اور صحبتیں رہتی تھیں، پھر لاہور زندا دلان پنجاب کا وطن تھا، اور یہاں زندا دلی کے تمام سامان موجود تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ دامن کبھی آلودۂ معصیت نہیں ہوا لیکن مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونے میں کوتاہی نہیں ہوئی، ان وجوہ کی بنا پر لاہور میں میرے تعلقات اس درجا وسیع تھے اور لاہور اتنا عزیز ہوگیا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد بھی تقسیم سے ایک سال پہلے تک کوئی برس ایسا نہیں ہوا کہ میں گرمیوں کی تعطیلات میں کم سے کم دس پندرا دن کے لیے یہاں

تہ آیا ہوں۔

میں عہد گذشتا کی ان یادوں اور تصورات میں غرق تھا ہی کہ جلسا ختم ہوگیا، اس کے بعد علامہ اقبال کے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کا پروگرام تھا، مگر شاید تاخیر ہو جانے کے باعث وہ ملتوی ہوگیا، اور سب مندوبین یہیں قریب میں ایک اسلامی میوزیم ہے وہاں پہنچ گئے۔ یہ میوزیم میں نے بھی اب تک نہیں دیکھا تھا، اس لیے جی بھر کر دیکھا، یہاں مسلمانوں کے آرٹ، فنون لطیفا خطاطی، برتن سازی اور پارچا بافی کے عالا نمونے اور نوادر اور مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرا موجود تھا۔ ایک کونے میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے دوست خواجا عبدالرشید کے کلکشن کا بھی ایک حصا مع ان کے نام اور فوٹو کے رونق میوزیم تھا، جو انہوں نے وقف کر دیا تھا، یہیں میوزیم کی طرف سے عصرانے کا انتظام تھا جو بہت پرتکلف اور شاندار تھا، یہاں یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ کانفرنس کے دوران کوئی استقبالیا کوئی لنچ اور کوئی ڈنر ایسا نہیں ہوا جو نہایت پرتکلف اور شاندار نہ ہو، اس لیے اب میں آئندا صرف استقبالیا لنچ یا ڈنر لکھوں گا اور اس کو کسی صفت سے موصوف نہ کروں گا میں عادتاً لنچ اور ڈنر کے درمیان چائے کی ایک پیالی کے سوا کچھ نہیں کھاتا، لیکن یہاں چکن پیٹی جو پیسٹری کے اقسام میں مجھے سب سے زیادا مرغوب ہے اس قدر عالا قسم کی اور گرم تھی کہ اس کے تین پیس نوش جان کر گیا اس کے بعد مغرب کے قریب ہم سب ہوٹل واپس آ گئے۔

ان اجتماعات کا ایک بڑا فائدا یہ ہوتا ہے کہ بہت پرانے دوستوں سے ملاقات ہو جاتی ہے، اور بہت نئے لوگوں سے تعارف اور ان میں سے بعضوں سے دوستی ہو جاتی ہے۔ حکیم محمد سعید صاحب سے تو ملاقات صبح جب مندوبین اسلام آباد سے آئے تھے اسی وقت ہو گئی تھی۔ ان سے اور ان کے خاندان سے گہرے اور دیرینا تعلقات ہیں، مندوبین میں متعدد حضرات میرے پہلے سے جانے پہچانے اور بعض ذاتی دوست بھی ہیں مثلاً ڈربن کے ڈاکٹر صالح نال اور انکی بیگم، جاپان کے عبدالکریم اسٹو، ایران کے مجتہد زادا، کویت کے شیخ یوسف رفاعی، امریکا کے پروفیسر منٹگمری واٹ، مصر کے ڈاکٹر عبدالحلیم محمود شیخ ازہر، وغیرا وغیرا، مغرب کی نماز کے بعد ان سب حضرات سے ملاقات اور بات چیت ہوئی۔

مولانا کوثر نیازی

مولانا کوثر نیازی سے اب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی، اگرچے ان کا قیام میرے کمرے کے سامنے والے کمرے میں ہی تھا، مگر ان کے کمرے پہ پہرا تھا، اس لیے میں نے وہاں جا کر ملنا مناسب نہیں سمجھا، پھر وہ باہر نکلے تو بھیڑ میں رل مل گئے اور مجمع میں گھس کر کسی سے ملنا میری افتاد طبع کے خلاف ہے، البتا یہیں ہوٹل میں پنجاب کے چیف منسٹر یا گورنر کی طرف سے جو ڈنر تھا اس میں ایک موقع پر میرا آمنا سامنا ہوگیا اور میں نے ان کو اپنا نام بتایا تو نعرے اخاہ! کہتے ہوئے بغلگیر ہوگئے، مولانا فیڈرل گورنمنٹ میں اوقاف اور امور مذہبی کے وزیر ہیں، نہایت ذہین، طباع اور بڑے وجیہ اور فاضل ہیں، انگریزی عربی اور ہندستانی تینوں زبانوں کی تحریر و تقریر پر قادر ہیں، اب تک ایک درجن سے زاید کتابیں جن کا تعارف آئندا کرایا جائے گا ان کے قلم سے نکل کر شایع ہو چکی ہیں، اور وہ تینوں زبانوں میں ہیں۔ کانفرنس میں انہوں نے تینوں زبانوں میں تقریریں کیں، اردو زبان کے پرجوش خطیب اور مقرر ہیں اور پنجابی تو ان کی مادری زبان ہے، اس کے تو ہوں گے ہی، مولانا نے جیسا کہ انہوں نے بیان کیا۔ میری سب کتابیں پڑھی ہیں اور ان کے قدر دان ہیں، علی الخصوص ایک محبت میں

صدیق اکبر کی بے حد تعریف کی اور فرمایا "میرے نزدیک اسلامی لٹریچر میں اس کتاب کا جواب نہیں" اور یہ فرما کر دعائیں دیں، "برہان" کا شروع سے بڑے شوق اور پابندی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ چنانچہ احمد سعید صاحب ملیح آبادی نے اپنی کتاب "مد آج کا پاکستان" میں مولانا کوثر نیازی سے انٹرویو کے سلسلے میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ کئی سال کے تعطل کے بعد ہندستان اور پاکستان میں رسائل اور مجلات کی آمد و رفت کا راستہ کھلا تو وزارت کے سکریٹری زاہد ملک صاحب نے مولانا کی طرف سے ایڈیٹر "برہان" کو خط لکھا کہ "اب رستا کھل گیا ہے، رسالہ جاری کر دیجیے، اور زر چندہ بھیجنے تا جب امکان ہوگا اس وقت بھیج دیا جائے گا" دفتر کی جانب سے جواب گیا کہ رسالہ جاری کیا جا رہا ہے، اب آئندہ یہ آپ کے اس اعزازی آتا رہے گا آپ چندے کا خیال نہ کریں، "برہان" کے ساتھ اس درجا تعلق کے باعث مولانا کو میرے ساتھ بھی محبت اور اخلاص کا گہرا تعلق ہے جس کا اظہار کانفرنس کے دوران میں اور اس کے بعد بھی بار بار ہوا، اس وقت مجھے یہ ملاقات پہلی تھی، مگر مولانا اس طرح ملے کہ گویا برسوں کے ساتھی اور دوست ہیں۔ پنجاب کے گورنر اور چیف منسٹر اس وقت تھے مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا تو یہی کہہ کر کہ یہ اس رسالے کے ایڈیٹر ہیں جسے میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ مولانا علم اور ادبی کمالات کے ساتھ بڑے خوش اخلاق، شگفتہ طبع اور بذلہ سنج بھی ہیں، اور شعر بھی کہتے ہیں، ان کی غزلیں اور نظمیں قوال گاتے ہیں اور ریڈیو سے نشر ہوتی ہیں۔

ہندستانی بولو
ہندستانی سیکھو
ہندستانی پڑھو

بسمل سعیدی

منزل ایک ہے

کشتیاں ہیں مختلف دھاروں پہ ساحل ایک ہے
اپنی اپنی راہ پر رہ رو ہیں منزل ایک ہے

ایک ہی گرمی سے گرمایا ہوا ہے سب کا دل
اپنا اپنا دل ہے لیکن جذبۂ دل ایک ہے

ایک فصل گل میں جیسے مختلف رنگوں کے پھول
رنگ شعلوں کے جدا ہیں رنگ محفل ایک ہے

لاکھ مجنوں ہیں مگر ہے ایک انداز جنوں
کتنی ہی لیلائیں ہیں ان سب کا محمل ایک ہے

مشرق و مغرب کہاں سے کیا جنوب اور کیا شمال
مختلف سمتوں کا مرکز ماہ کامل ایک ہے

مشترک شیخ و برہمن کا ہے اقرار وجود
کفر ہو اسلام ہو دونوں کا حاصل ایک ہے

ایک ذات پاک کے چاہے ہزاروں نام ہوں
دیر میں اور حرم میں وہ ذات شامل ایک ہے

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں
ملتیں کتنی بھی ہوں ایمان بسمل ایک ہے

علی احمد جلیلی

جلیل کی درباری شاعری

درباری سرپرستی اور سخن ور و سخن سنج بادشاہوں کی ادب نوازی نے ہندستانی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو حصہ لیا وہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ قطب شاہی سلاطین سے لے کر شاہان مغلیہ، نوابان اودھ، تاجداران رام پور اور دکن کے حکمرانوں میں نواب میر عثمان علی خاں کے دربار تک جو طویل سفر اردو نے کیا اس سفر میں کیسی کیسی مہمان نوازیاں اس کے شامل حال رہیں۔ سخنور سلاطین نے جن شاعروں کو اپنا استاد بنایا ان اساتذۂ سخن نے دیگر اصناف کے ساتھ اپنے محسن و مربی بادشاہوں کی مدح میں جو کچھ لکھا وہ آج بھی ہندستانی کلاسکس کا بڑا سرمایہ ہیں، درباری شاعری چاہے کسی صورت میں، ادبی دستاویزات کا درجہ رکھتی ہے۔

استاد ذوق کے جس طرح شاہ ظفر کا نام لیا جاتا ہے، اسی طرح استاد جلیل کے ساتھ شاہ عثمان کا نام بھی آتا ہے۔ شاہ عثمان سے پہلے وہ میر محبوب علی خان آصف کے بھی استاد تھے۔ اس طرح جلیل کی درباری شاعری دو سلاطین کے دربار سے وابستہ ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جلیل گو شاعر ہونے کے علاوہ ایک باکمال قصیدہ گو شاعر تھے۔ جس وقت جلیل حیدرآباد آئے، (۲) وقت مرزا داغ دہلوی، محبوب علی خان آصف کے استاد تھے۔ داغ کے انتقال کے بعد ان کی جگہ جلیل کو منصب استادی ملی۔ جس طرح استاد شاہ ہونے کی حیثیت سے جلیل کی حقیقی درباری شاعری کا آغاز یہیں سے ہوا۔

فی زمانا اگرچہ قصیدا کی ضرورت باقی نہیں رہی، پھر بھی یہ اعتراف کیے بغیر چارا نہیں کہ ادبی، فنی و شعری نقطۂ نظر سے قصیدے ہمارے ادب عالیہ کا جزو ہیں، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قصیدے اپنی دشواری کی وجہ سے بدنام ہیں، لیکن جلیل نے اس میں جس اجتہاد سے کام لیا وہ قصیدا گوئی میں ایک نئے موڑ کی نشان دہی کرتا ہے۔ جلیل نے قصیدے کے روایتی انداز کو بدلا اور بلاغت کی جگہ سادگی کر دی، نہ صرف یہ، بلکہ ایک اور قدم آگے بڑھ کر اس کو غزل سے اس قدر قریب کیا کہ اکثر شعروں پر غزل کے اشعار کا دھوکا ہوتا ہے۔

داغ دہلوی کے انتقال کے بعد منصب استادی ملنے سے پہلے جلیل کا ایک قصیدا قابل ذکر ہے۔ شاہ آصف کی جشن جوبلی کے موقع پر مہاراجا سرکشن پرشاد شاد نے چندو لال کی بارادری میں ایک خصوصی مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرے میں قدردان حضرت [illegible] بھی موجود تھے۔ [illegible] جلیل نے جو قصیدا پڑھا

اسے ان کا پہلا قصیدا سمجھنا چاہیے، مطلع تھا ؎

جشن شاہی میں عجب رنگ اچھلتے دیکھا
ساغر عیش کو بے پاؤں کے چلتے دیکھا

اس قصیدے نے شاہ آصف کو اتنا متاثر کیا کہ کچھ ہی دنوں بعد منصب استادی عطا ہوا۔ اس سرفرازی پر جلیل نے جو زبردست مدحیہ قصیدا لکھا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ؎

جو دن پھرتے ہیں تو ساماں پیدا ہو ہی جاتا ہے
شب غم لاکھ طولانی ہو تڑکا ہو ہی جاتا ہے
چمن میں پھولنے پھلنے کی نوبت آ ہی جاتی ہے
دکن میں بار در نخل تمنا ہو ہی جاتا ہے

پھر مختلف مواقع پر قصیدے گزارنے جاتے رہے۔ دلی کے دربار کے موقع پر جو قصیدا لکھا اس کی تشبیب کا پہلا شعر یوں ہے ؎

دیر ہی ہے کیا مژہ آنکھوں میں نیند آئی ہوئی
واہ رے ہم بے پیے مستی سی ہے چھائی ہوئی

ایک دن سر دربار ایک اصلاح پر خوش ہو کر شاہ آصف نے برجستہ یہ مصرع پڑھا ع

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا

یہ فی البدیہہ منہ سے نکلا ہوا مصرع ایک اور قصیدے کی تخلیق کا باعث بنا۔ جلیل نے ایک قصیدا یوں موزوں کیا ؎

جلیل القدر ہو صاحب تمہاری بات کیا کہنا
یہ وہ مصرع ہے جس پر چاہیے صد مرحبا کہنا

شاہ آصف کی مدح میں بے شمار رباعیاں کہیں سو رباعیوں کا مجموعہ "گل صد برگ" کے نام سے شائع ہوا، دو رباعیاں دیکھیے ؎

ہونے کو ہوئے خسرو قیصر پیدا
آصف کا ہوا کوئی نہ ہمسر پیدا
جس خاک پہ سرکار کا سایہ پڑ جائے
اس خاک سے ہوں لاکھ سکندر پیدا

کس نے نہیں اس در پہ ٹھکانہ پایا
دامن کو جو چھو لیا خزانہ پایا
کیا پوچھتے ہو پایا [illegible] اس نے جلیل
جس نے شہ آصف کا زمانہ پایا

جلیل کی درباری شاعری کا پہلا دور یہاں ختم ہوتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں آصف نے رحلت کی، اور نواب میر عثمان علی خان تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے بھی جلیل کو منصب استادی پر برقرار رکھا۔ پھر جب تخت نشینی کا دربار عام ہوا تو جلیل نے ایک قصیدا اور ایک قطعۂ تاریخ پیش کیا، قصیدا تھا ؎

بزم عشرت میں نئے رنگ کا ساماں دیکھا
عالم وجد میں ساغر کو بھی رقصاں دیکھا

قصیدے کے ساتھ تخت نشینی کی جو تاریخ کہی گئی وہ آصف سابع ہونے کی رعایت سے (۷) اشعار پر مشتمل تھی۔ پہلے شعر میں آصف جاہ اول کا ذکر دوسرے میں آصف ثانی اور اسی طرح سات شعروں میں سات سلاطین دکن کے نام ہیں۔ مادۂ تاریخ سے ۱۹۱۱ء برآمد ہوتے ہیں، جو تخت نشینی کا سال ہے، آخری دو شعر یوں ہیں ؎

میر محبوب علی آصف سادس کا تھا نام
تھے جو محبوب دکن روح دکن جان دکن
اٹھ گئے جو تو بفرمان خداوند جلیل
میر عثمان خان ہوئے سلطان دکن
۱۹۱۱ء

جب شاہ دکن کی کتخدائی کا دربار سجایا گیا تو شاعر دربار ہونے کی حیثیت سے جلیل نے سہرا لکھا، یہ سہرا اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ جس زمین کو ذوق اور غالب نے اپنی طبع رسا سے روند ڈالا تھا، اسی زمین کو جلیل نے بھی اپنا فکر سخن کی جولانگاہ بنایا، چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

شاہ نوشاہ نے باندھ کے سر پر سہرا
آج کرے گا زمانے کو مسخر سہرا
شوخ ایسا ہے کہ چہرے سے الجھ پڑتا ہے
مجھکو حیرت ہے کہ گوندھا گیا کیونکر سہرا
دیکھیے اس کو تو پتلی میں سما جاتا ہے
ناپیے اسکو تو ہے قد کے برابر سہرا

موتیوں کا ہے جو سہرا سر نوشہ پہ جلیل
ہم بھی لکھ لائے ہیں گنجینۂ گوہر سہرا

دربار آصفی کی یہ روایت تھی کہ عطائے شاہی سے مصاحبین کو نوازا جاتا پھر جلیل کی حیثیت تو استاد کی تھی، شمشیر عطا ہوئی تو قطعۂ تاریخ کہا۔

تیغ خوش آب عنایت کر کے
آبرو میری بڑھا دی شہ نے
لکھ چکتی ہوئی تاریخ جلیل
آج شمشیر عطا کی شہ نے

۱۹۱۱ء

تلوار کے ساتھ انگوٹھی بھی عطا ہوئی تھی، اس لیے ایک ہی قطعے میں دونوں کا ذکر یوں ہے

تیغ اس شہ نے عنایت مجھے فرمائی ہے
جس کے حصے میں جہانداری و دارائی ہے

آگے کے شعروں میں تلوار کی تعریف میں لکھا ہے

چیونٹک کھا کر ہوئی سیدھی جو چمکتی تلوار
میں یہ سمجھا کسی معشوق کی انگڑائی ہے

انگوٹھی کی توصیف میں کہا ہے

انگلیاں اٹھتی ہیں خاتم پہ زمانے بھر کی
عید سے چاند کی شہرت مرے ہاتھ آئی ہے
ہے وہ خوش رنگ انگوٹھی کا نگینہ جس پر
لعل و یاقوت نے ہیرے کی کنی کھائی ہے

گھڑی مرحمت ہوئی تو لکھا ہے

گھڑی گھڑی میرے سرکار کو خوشی ہو نصیب
مجھے گھڑی وہ عطا کی جو ہے عجیب و غریب

باغ شاہی کے انگور اور سیب عنایت ہوئے تو قطعہ موزوں ہوا ہے

ہونے کو بہت لوگ ہیں قسمت والے
پاتے ہیں یہ پھل حسن و عقیدت والے
ہے دافع آسیب ہر ایک سیب جلیل
انگور کی ہیں تاک میں سب متوالے

شاہ عثمان کی ولادت رجب کے مہینے میں ہوئی جشن سالگرہ کے موقع پر مبارک بادیوں دی ہے

دن آج وہ ہے جس پہ سعادت کو ناز ہے
جشن آج وہ ہے جس پہ مسرت کو ناز ہے
معراج مصطفےٰ پہ ہے ماہ رجب کو ناز
ماہ رجب پہ شہ کی ولادت کو ناز ہے

عید قرباں کے موقع پر یہ قطعہ لکھا ہے

بخت نازاں ہے فدائے شہ عثماں ہو کر
فخر کرتا ہے فلک تابع فرماں ہو کر
سات حرفوں سے بنی اس لیے عید اضحیٰ
کہ رہے آصف سابع پہ یہ قرباں ہو کر

عید صیام کے جشن کے موقع پر بے شمار قطعات لکھے، دو قطعات آپ بھی دیکھیے

اشارہ آصف سابع کا پا کے عید آئی
مہ صیام کا پردہ اٹھا کے عید آئی
ہے نظارۂ دربار اپنے چہرے سے
مہ صیام کا پردہ اٹھا کے عید آئی
ہم نے اس بزم کو آئینۂ عرفاں دیکھا
جلوۂ قسمت بیضائے درخشاں دیکھا
تھی جو سیپارۂ قرآں کی تلاوت منظور
تیس دن صوم میں پارہ کر رخ عثماں دیکھا

اس مدحیہ شاعری کے علاوہ دور عثمانی کے اہم کارنامے، تاریخی یادگاریں، استاد جلیل کی نکالی ہوئی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ عثمان ساگر جب بن کر تیار ہوا تو اس کے سنگ بنیاد کی تاریخ نکالی آخری شعر یہ ہے

سنگ بنیاد کی تاریخ یہ اچھی ہے جلیل
موج زن چشمۂ فیض شہ دریا دل ہے

۱۹۱۳ء

نظام ساگر کی تعمیر کی تاریخ اس شعر سے نکلتی ہے

آب در جو آمد و تاریخ گفتم اے جلیل
در دکن آمد ز عثمان چشمۂ آب حیات

۱۹۳۲ء

سلور جوبلی کے موقع پر جوبلی ہال کی تعمیر باغ عامہ میں ہوئی تو جلیل کا جو قطعۂ تاریخ اس کی دیوار کی زینت بنا، اس کا مادۂ تاریخ یہ ہے

ہست قصر جوبلی بنگر کو جنت در دکن

۱۹۳۶ء

اسی دور عثمانی میں علاقہ سکندر آباد برٹش گورنمنٹ سے نظام کو واپس ملا تو اس واقعے کو شاعرانہ

ایک قطعۂ تاریخ میں محفوظ کیا، آخری شعر جس سے تاریخ نکلتی ہے یوں ہے ؎

ہوئی تاریخ بامولد الہٰی یہ جلیل
پایا اسکندر ثانی نے سکندر آباد
۱۹۴۶ء

غرض استاد شاہ اور درباری شاعر ہونے کی حیثیت سے مدح گوئی کی جو روایتی ذمے داری جناب جلیل پر عاید ہوئی، اس سے عہدا برا ہونے کی خاطر انہوں نے جو کچھ بھی لکھا، اور جس قدر لکھا اس کے نتیجے میں مدحیا شاعری کا ایک ضخیم سرمایا اپنے پیچھے چھوڑا ہے جس کے ذکر کے بغیر جلیل کی شاعرانہ عظمت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

کالی کالی جو گھٹا چھائی ہے
زلف ساقی مجھے یاد آئی ہے
تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں
دو قدم کر چھٹ رسوائی ہے
اب نہیں کا نہیں موقع ساقی
بھول لا پھول بہار آئی ہے
حسن اور عشق میں ہے فرق یہی
یہ تماشا وہ تماشائی ہے
وہ ہے پردے میں مگر پھر بھی جلیل
سارے عالم سے شناسائی ہے

غزل

آرزو شاہین

ڈٹے ہوئے آئینے پہ ہوتا ہے گماں اور
ملتے ہیں مجھے عہد شکستہ کے نشاں اور
آئے تھے سنگانے کو صدا شہر طرب میں
دھندلا گئے آواز کے آئینے یہاں اور
بکھرے ہوئے ہر سمت تمنا کے کھنڈر ہیں
تہذیب کے معمار کا شاید ہے جہاں اور
ہم جتنا چھپائیں گے زمانے کی نظر سے
چمکیں گے مرے خون کے یہ سرخ نشاں اور
اے آرزو شعلوں کا مجرہ ہی نہ رہا ہوں
حسرت کے پرستار کو دو دن گی نہ اماں اور

صابر کوسگوٹی

بیس نکاتی پروگرام

بہاروں کے حسین دن رات لے کر سامنے آیا
نشاط و کیف کے دن رات لے کر سامنے آیا
حرم شوق نے تھاما ہے درمان عقیدت کو
بڑے پاکیزہ احساسات لے کر سامنے آیا
لب شیریں پہ جو نغمات رنگیں رقص کرتے تھے
وہی اٹھے ہوئے جذبات لے کر سامنے آیا
درخشاں ہیں ابھی تک آئینہ خانے "جواہر" کے
شعاع مہر سے ذرات لے کر سامنے آیا

دلوں کی وادیوں میں پیار کے چشمے ابلتے ہیں
خلوص و مہر کی برسات لے کر سامنے آیا
مصور کی مکمل ہو گئی تصویر رعنائی
حدیث عشق کے آیات لے کر سامنے آیا
یہ نکھتے ماہ و انجم ہیں یہ نکھتے ہیں گل و لالہ
سکون قلب کے برکات لے کر سامنے آیا
نگاہیں رفعت شام و سحر کو چوم لیتی ہیں
بلندی کے کئی درجات لے کر سامنے آیا
اجالے جیسی نکتوں کے ابھرتے ہیں، نکھرتے ہیں
پیام زندگی سات لے کر سامنے آیا
ایمر جنسی مکمل ہے مقدس ہے، مبارک ہے
بڑی گہری سمجھ کی بات لے کر سامنے آیا
سکون و آشتی جو دوستنا، انقلاب صابر
نظام ہند یہ سوغات لے کر سامنے آیا

ڈاکٹر سمیع الدین احمد - لکچرار - شعبۂ فارسی -
مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

فارسی زبان و ادب کی علمی اور ثقافتی حیثیت

ہمارے ملک کی سرزمین کئی سو سال سے فارسی زبان اور ادبیات کا گہوارا رہی ہے، اس لیے فارسی زبان اور ادب کی تاریخ کے مطالعے کے وقت برصغیر ہندستان کی علمی اور تہذیبی کوششوں اور اس کے اہم رول سے انکار یا صرف نظر ممکن نہیں - یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کے نتیجے میں نہ صرف ایرانی زبان اور ادبیات کا ایک بلکل جداگانہ مستقل اور آزاد باب جس کو ہم ہندستانی فارسی ادبیات کا باب کہہ سکتے ہیں - وجود میں آیا ہے بلکہ اس نے تہذیبی سطح پر ایسے لافانی اثرات اور نشانیاں چھوڑی ہیں جو ہند ایرانی تہذیب کا سرمایا بھی جا سکتی ہیں۔ فارسی آج بھی مختلف حیثیتوں سے ہماری تہذیب کے رگ و ریشے میں پیوست ہے، اور ہمارے کلچر کا کم و بیش ہر گوشہ اس کی فعالیت سے متاثر ہے، عام درسیات، علم و فضل، شعر و ادب، اور دوسری علمی و ادبی تخلیقات کا وسیلا ہونے کے علاوہ فارسی زبان کے اثرات اور نقوش بہ حیثیت مجموعی ہندستان کی سیاسی و ملکی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق پر بہت نمایاں طور سے مرتسم نظر آتے ہیں - محمود غزنوی سے پہلے کر تیموری حکومت کے زوال کے دور تک تاریخ عالم اور تاریخ ہندستان کا کم و بیش سارا سرمایا اسی زبان میں قلمبند ہوا ہے، خالص علمی یا ادبی کارناموں کے علاوہ مختلف قسم کے افکار و خیالات، معتقدات، نظریات، روایات اور داستانوں کو ہندستان کے تہذیبی اور فکری دھاروں میں سمو دینے کا کام بھی اسی زبان کے ذریعے عمل میں آیا ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر متاخرین کے عہد تک شعرا فارسی کے بے شمار دواوین اور دوسرے قسم کے شعری و ادبی آثار کے علاوہ مختلف موضوعات پر اور مختلف علوم سے متعلق فارسی میں لکھی ہوئی کتابیں اتنی کثرت سے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور اندازا ہوتا ہے کہ علوم و ادبیات کا کس قدر ضخیم اور قیمتی سرمایا ہمارے ملک کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے کے طور پر موجود باقی ہے - اس کا ثبوت ہندستان اور دوسرے ممالک میں بکھرے ہوئے علمی ذخیروں کی وہ مشروح یا غیر مشروح فہرستیں اور دوسرے ماخذ ہیں جن میں ان علمی آثار کا ذکر ملتا ہے۔ خوش قسمتی سے اس بیش بہا سرمایا کا بیشتر حصہ مخطوطات یا مطبوعات کی شکل میں محفوظ ہے اور اس کی تحقیقاتی تدوین اور ترتیب سے ہندستان کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ کے بہت سے مسائل پر روشنی پڑ سکتی ہے اور نئی تعبیریں پیش کی جا سکتی ہیں -

ہندستان کے طول و عرض میں قلعوں، [illegible]

مساجد، خانقاہوں، مناروں اور دوسری تاریخی عمارتوں پر جابجا فارسی میں کھدے ہوئے کتبات، نقوش اور طغرے اس زبان کی وسیع دولتِ زوال ناپذیر کا کھلا ہوا ثبوت ہیں - بقول پروفیسر نذیر احمد "اگر کوئی شخص نیشنل آرکائوز میں جاکر بچشم خود ملاحظہ کرے تو اس کو اس زبان کی وسعت وہمہ گیری کا اندازہ ہوگا - سیاسی اثرات کی شکل یہ ہے کہ سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے سارے کاروبار اسی زبان کے توسط سے عمل میں آتے تھے - سرکاری فرامین، دستاویز اور دوسرے اہم کاغذات فارسی میں لکھے جاتے تھے -

ہندستانی زبان کی ابتدا اور تدریجی ارتقا میں مقامی حالات، مختلف بولیوں اور ہندستان کے مخصوص تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی ماحول کے علاوہ فارسی زبان اور اس کے ادب نے جو خصوصی اور اہم رول ادا کیا ہے، اس کا بین ثبوت ہندستانی زبان اور اس کی زندہ تاریخ ہے، اور اس روشن حقیقت سے ہر صاحب نظر شخص بخوبی واقف ہے - ہندستانی کے علاوہ ہندستان کی دوسری علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی، سندھی، کشمیری، گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، تامل، تلیگو، ملایالم وغیرہ کے افکار اور ادب عالیہ کا اگر بہ نظر تلاش و تحقیق مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں فارسی کے نفوذ و تاثیر کی کارفرمائی ملے گی -

برصغیر ہندستان اس زبان اور اس کے ادب کی ترقی و فروغ میں سیاسی اور ملکی حالات کو بڑا دخل رہا اس اجمال کی تفصیل پیش کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اشاعت اسلام سے قبل ہندستان اور ایران کے باہمی تعلقات سیاسی اور خاص طور سے تہذیبی، لسانی، علمی اور ادبی سطح پر بہت استوار تھے اور آریائی نسل کی یگانگت نے ان دونوں ملکوں کو قدیم زمانے سے ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا - مختلف ذرایع سے اور مستشرقین کی کوششوں میں ان باہمی روابط کے وجود اور ان کی قدامت کا قطعی ثبوت ملتا ہے - بہت پہلے ایرانی یا زردشتی تہذیب کی روایات ہمارے ملک میں داخل ہو چکی تھیں اس کے علاوہ قراین یہ بتاتے ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کے اواسط میں عربوں کے حملے اور فتح ایران کے بعد زردشتی عقاید کے ماننے والے پارسیوں کی کچھ تعداد نے (غالباً) اس حملے کے اثرات سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لیے ہندستان کا رخ کیا، اور مغربی اور جنوب مغربی علاقوں یعنی سندھ، گجرات اور موجودہ مہاراشٹر کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئے اور آخرکار وہیں بس گئے - اس خیال کی تصدیق پروفیسر عباس مہرین شوشتری کے بیان سے ہوتی ہے - وہ لکھتے ہیں کہ "دراں گیرودار برخی از مردم فارس بہ کران دشتستان ہجرت کردند و اندکی بہ فرزند پسر یزدگرد کہ بہ چین پناہندہ شدہ بود، پیوستند و تحقیقاً ہفت صد تن خود را بہ کاتیاوار (ہند) رسانندند - برخی از راہ دریا بہ ساحل جنوب ہند ہجرت کرد -"

اس طرح ہندستان میں ایرانی نژاد لوگوں کے ورود اور دونوں ملکوں کے درمیان زمانۂ سابق کے مقابلے میں زیادہ جدید اور وسیع انداز پر ثقافتی رابطہ کا ثبوت تو فراہم ہو جاتا ہے، لیکن ہندستان میں فارسی دری (جو زیر نظر سطور میں ہمارا موضوع سخن ہے) کی ترویج و فروغ کے امکانات اور مواقع گیارہویں صدی سے پہلے وجود میں نہیں آئے - حقیقت یہ ہے کہ فارسی کی نشر و اشاعت میں سلاطین غزنہ کی کوششوں کو دخل تھا جن کے سیاسی مقاصد نے اس زبان کا نقش ادبی اس ملک میں قایم کیا - محمود غزنوی کی شخصیت بڑی متنوع تھی - باذوق اور صاحب کمالات ہونے کے ساتھ وہ بیک وقت سیف و قلم کا دلدادہ تھا - اس کے ہمسفر جو صف شکن اور شمشیر زن سپاہی ہوتے تھے، ایسے علم و ادب، شعر و فن اور اکتسابات سے بہرہ ور علما، خطیبوں، دانشوروں، اور ارباب کمال حضرات کی تعداد اور بھی خاص ہوا کرتی تھی اور مقبوضہ علاقوں کے نظم و نسق

اور امور سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں ان کے انشا اور تحریر اور قلم و بیان کی ضرورت ناگزیر طور پر رہا کرتی تھی۔ محمود کے دربار کا جلیل القدر اور باکمال عالم، منجم، فلسفی، ریاضی دان اور مورخ ابوریحان البیرونی خوارزمی ۳۶۲ھ تا ۴۴۰ھ جو اس کے خاص مصاحبین میں سے تھا، ہندستانی معرکوں میں اس کے ساتھ رہا تھا بیرونی نے متعدد تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ خیال ہے کہ وہ سنسکرت کا بھی عالم تھا اور ریاضی کے موضوع پر لکھی ہوئی کتاب سدھانت کے کچھ اجزا اور چھٹی صدی عیسوی کے مشہور ہندستانی ریاضی دان عالم وراہا مہرا کی ایک تصنیف کا ترجمہ اس نے عربی میں کیا تھا، ہندستان میں قیام کے دوران اس نے ہندستانی علوم، تاریخ، جغرافیا، مذہب اور معاشرت، معتقدات اور سماجی حالات کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اور یہاں کے دانشمندوں اور علما کی صحبتوں میں شریک رہا تھا۔ غالباً ہندستانی تمدن و تہذیب سے اسی شناسائی کی بنیاد پر اس نے ایک اہم اور مشہور تصنیف بنام "تحقیق ماللہند" (عربی) جس کا عام فہم نام "کتاب الہند ہے" مرتب کی تھی جو ایک وقیع علمی کارنامہ ہے، اور ہندستان کے بارے میں اطلاعات کا ایک بیش بہا مخزن اور ماخذ۔ اس کتاب میں ہندوؤں کے رسم و رواج۔ مذہبی عقاید و خیالات، فلسفے اور حکمت، رہن سہن اور دوسرے تاریخی اور اجتماعی مسایل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ملک الشعرا عنصری اور فرخی سیستانی جیسے شاعروں کو بھی ہم سفر اور ہم رکاب ہونے کا فخر حاصل رہا۔ محمود کو مخاطب کرتے ہوئے فرخی کہتا ہے کہ

ز بار یا تو بدریائی بیکرانہ شدم
نہ موج دیدم و نہ ز...ہیبت و نہ شور و نہ شر
با ... مرار ... و خستگی رہ قنوج

گوفتہ کردہ است وغیرہ سفر و سکبار عنصری کے قصیدوں میں ہندستان کے واقعات اور معرکوں کے بارے میں اہم تاریخی حوالے ملتے ہیں۔ فرخی نے بھی اپنے کلام میں ہندستان کی فتوحات مقامات اور واقعات وغیرہ کے بارے میں شہادتیں پیش کی ہیں جو تاریخ اور ادب دونوں کے لحاظ سے بڑی اہمیت اور دل چسپی رکھتی ہیں۔

بعد میں لاہور جو نئے مقبوضات کا مستقر تھا، مرکز علم و فن بھی قرار پایا۔ علم دوست اور معارف پرور حکمرانوں، شہزادوں اور امرا کی ادب نوازیوں کے سایۂ عاطفت میں نئی زبان اور اس کے ادب کو پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ غزنوی اور غوری سرداروں نے نہ صرف فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت دے رکھی تھی بلکہ وہ علوم اور ادبیات کی سرپرستی اور ترویج کی روایت بھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی اور ملکی مصالح اور ضروریات کے تحت بھی اس زبان کا ترقی پذیر ہونا ناگزیر تھا، اسی بنا پر مسلم اقتدار کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ شمالی مغربی علاقوں میں اور پھر تیرھویں صدی عیسوی کے اوایل میں دلی سلطنت کے قیام کے دوش بدوش فارسی کی ترقی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوگئی، اور جابجا علم و ادب، درس و تدریس اور علوم و فنون کے مراکز قایم ہونا شروع ہوئے تحقیق کی روشنی میں ہمارے سامنے متعدد ایسے علما اور فضلا، ادیبوں، شاعروں اور اہل علم حضرات کے نام آتے ہیں جن میں سے اکثر کے کارنامے آج بھی محفوظ ہیں، اور جن کے وسیلے سے تاریخی تسلسل کی رعایت کو قایم رکھتے ہوئے ہندستان کی مربوط اور تا حال قایم مشدہ فکری اور ثقافتی تاریخ کی تدوین میں بڑی مدد ملتی ہے۔

کسی زبان کی اہمیت اور وسعت کا اندازا اس کی ادبی، درسی اور علمی حیثیت کے علاوہ عام مقبولیت کے لحاظ سے بھی لگایا جا سکتا ہے، اگر ایک طرف سیاسی ضروریات کے تحت فارسی کو

ایک مدت دراز سے مسلم حکمرانوں کے عہد اقتدار میں سرکاری زبان کا درجا حاصل رہا تھا تو دوسری جانب خالص عوامی اور معاشرتی سطح پر بھی اس کے جاننے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے والے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ آج بھی جبکہ بادی النظر میں اس کے بازار میں بے رونقی کا سکہ چل رہا ہے، اور وہ اپنا گذشتا وقار کھو بیٹھی ہے "در آثار پدید است صنادید عجم را" کے مصداق اس کی عظمت کے آثار اور نشانات کی تلاش ناممکن نہیں، یہ زبان ہندستانی ادب کے متعدد ممتاز ترین ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا طرۂ امتیاز اور خیالات کے اظہار کا وسیلا بھی رہی ہے یہاں تک کہ چند عظیم المرتبت شاعروں نے اپنے کلام کو فارسی سے مزین اور آراستا کرنے میں فخر محسوس کیا ہے۔ غالبؔ زندگی بھر اپنے فارسی کلام ہی کو سرمایۂ حیات سمجھتے اور اس پر فخر کرتے رہے۔ شاعر مشرق اقبالؔ کے افکار و نظریات کی شرح و بسط میں فارسی نے جو کردار ادا کیا ہے اس سے ہر باعلم شخص بخوبی آگاہ ہے۔ اس کے علاوا آج بھی ایسے موزوں طبع افراد مل جائیں گے جو اس زبان میں سخنوری کے جوہر دکھا سکتے ہیں۔

ہندستان میں ایک بیرونی زبان کی حیثیت سے داخل ہونے کے باوجود اپنی شیرینی، تر و تازگی، دل کشی اور ہمہ گیری کی صفات کی بنا پر بہت جلد اس زبان نے ایک تہذیبی اور علمی درجا حاصل کر لیا اور نہ صرف یہاں کے ثقافتی سرچشموں سے کسب فیض کیا، بلکے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اپنے فکری، علمی اور ادبی سرمایے کو بہ حیثیت مجموعی ہندستانی ثقافت کے مخزن میں ایک بیش قیمت اضافہ کی شکل میں منجذب کرنا شروع کیا۔ مختلف جماعتوں، فرقوں اور مذاہب کے ماننے والوں کی تہذیبی اور مذہبی زندگی میں فارسی ادب کے وسیلے سے ایسے خیالات اور نظریات کی درآمد ہوئی جنہوں نے فکری اعتبار سے ہند اور ایران کو ایک کر دیا۔ تصوف کے افکار و نظریات کسی نہ کسی شکل میں فارسی ادب ہی کے ذریعے سے یہاں زیادا واضح صورت میں جڑ پکڑ گئے، اور ویدانت کے فلسفے نے ایک نیا روپ دھارا۔ مثال کے طور پر گرو نانک اور دوسرے پیشواوں کی تعلیمات میں وحدت ذات اور عرفان کا فلسفا اسی دھارے کے وسیلے سے مکمل مل گیا۔ اس کے علاوا ہندستان کے دوسرے حصوں میں بھی اس قسم کے عناصر کی آمیزش وجود میں آئی۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس زبان نے غیر مذاہب کے لوگوں کو بھی متاثر کرنا شروع کیا۔ ہندستان کی تاریخ میں (غالبؔ) پہلی بار لودی عہد میں ہندوؤں نے نہ صرف اس زبان کو پڑھنا لکھنا سیکھا، بلکے اس کے ادب کی سرزمین میں اپنے جوہر اور کمالات دکھلائے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ہندستان میں فارسی زبان اور علوم کی روایت اور اس کا نقش اولین امرائے غزنی کی علم دوستی، سیاسی مصالح اور ادب نوازی کا نتیجا تھا اور اس حیثیت سے وہ بانی کا درجا رکھتے ہیں۔ ہندستانی فارسی کے اولین معمار انہیں کے عہد میں نہ صرف زندا تھے، بلکے ان کے خوان کرم کے خوشا چین بھی تھے۔ تذکرۂ لباب الالباب کے مصنف سید بدر الدین محمد عوفی نے ان ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا ہے جن میں سے متعدد کے اشعار غزنوی سرداروں کی مدح میں ہیں۔ اس سلسلے میں ابوعبد اللہ النکتی، ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان کے نام سر فہرست ہیں اور قابل ذکر۔ اس کے علاوا تصوف کے موضوع پر فارسی میں پہلی کتاب کشف المحجوب غالبؔ ہندستان ہی میں غزنویں کے زمانۂ حکمرانی میں لاہور میں لکھی گئی۔ اس اہم کتاب کے مصنف شیخ ابوالحسن علی بن عثمان الجلابی الہجویری متوفی

۱۰۷۳ء ملقب بہ داتا گنج بخش اگرچہ غزنین میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اپنی زندگی کا بیشتر حصا انہوں نے لاہور میں گزارا جہاں ان کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ہندستان میں مسلمان فاتحین کی آمد کے بعد گویا تمدن اسلامی اور فارسی زبان و علوم کی درآمد کا سلسلا شروع ہو گیا، اور علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذیل میں فارسی زبان میں تصنیف اور تالیف کے امکانات اور حالات سازگار ہوئے۔ جابجا مدرسے، کتاب خانے اور مراکز علم کھلنے گئے اور علم و ادب کا پرچار وسیع پیمانے پر شروع ہو گیا۔ جب محمود غزنوی کے ورثا نے بجائے غزنا لاہور کو اپنا مرکزی مقام بنایا تو علم و ادب کی روایات بھی وہیں منتقل ہو گئیں، اور لاہور "غزنین خرد" کہلانے لگا۔ ۱۱۸۶ء میں آخری غزنوی حکمران خسرو ملک کی شکست کے بعد غوریوں کا اقتدار ان علاقوں میں مسلم ہو گیا اور مرکز حکومت لاہور سے ملتان اور "اچہ" اور پھر بعد میں دلی منتقل ہو گیا۔ غوری سردار بھی بڑے علم پرور تھے۔ حسن نظامی نیشاپوری (مصنف تاج المآثر) کے قول کا حوالا دیتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری نے اجمیر میں متعدد مدرسے قایم کیے تھے جو ہندستان میں اپنی نوعیت کے پہلے مدرسے تھے۔ اس کے علاوا ناصرالدین قباچا، التمش اور بعد کے اکثر و بیشتر مسلم فرمانرواؤں نے اپنے دائرۂ عمل میں درسی و علمی اداروں کے قیام کے سلسلے میں اقدامات کیے اور یہ روایت تیموریوں (مغلوں) کے عہد تک قایم رہی۔

غوریوں کے نایبین سلطنت قطب الدین ایبک اور ناصرالدین قباچا نے علما و فضلا کی تربیت و نوازش میں نمایاں حصا لیا۔ محمد بن منصور المعروف بہ فخر مدبر نے اپنی تصانیف شجرۂ انساب اور آداب الحرب والشجاعت بالترتیب قطب الدین ایبک اور التمش کے نام معنون کی تھیں۔ بدایونی نے منتخب التواریخ (ج ۱، ص ۵۵) میں لکھا ہے کہ ایبک جود و کرم میں ضرب المثل تھا اور لاک روپے بطور انعام دینے کی رسم اسی نے جاری کی تھی۔

تیرویں صدی عیسوی کی چند دوسری اہم فارسی کتابوں میں جو ہندستان میں تصنیف یا ترجما ہوئیں حسن نظامی نیشاپوری کی تاریخ موسوم بہ تاج المآثر - محمد علی بن حامد بن ابی بکر کوفی کی تاریخ کا عربی سے فارسی میں ترجما بنام چچ نامہ (یا فتح نامۂ سندیا تاریخ ہند اور سند)، فرید بن محمد جاجرمی کے قلم سے امام غزالی کی مشہور عربی تصنیف احیا العلوم الدین اور ابوبکر کاسانی کے قلم سے بیرونی کی کتاب صیدنہ (موضوع طب یا دار شناسی) کا ترجما تاریخی اہمیت کے لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ اسی عہد میں ۶۲۳ھ سے قبل اور التمش سے وفد کے ذرا بعد) شیخ شہاب الدین سہروردی کی مشہور تصنیف عوارف المعارف کا ترجما فارسی میں قاسم داود نے ملتان میں کیا اور اسے تاج الدین ابوبکر نامی ایک سردار کے نام معنون کیا جو کچھ مدت کے لیے اس علاقے میں بادشاہ ہو گیا تھا۔

اس عہد کا ممتاز ترین شخصیتوں میں سدید الدین محمد عوفی کا شمار ہوتا ہے۔ عوفی کے بارے میں (مرحوم) شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ وہ واعظ خطیب اور ایک قادر الکلام شاعر بھی تھا اور یہ کہ دربار قباچہ کے علم پرور لعد ادب نوازما حول میں اس نے الفرج بعد الشدۃ کا فارسی میں ترجما کیا۔

غوری اور مملوک سلاطین کے وزرا بھی اپنی علم دوستی میں کچھ کم نہ تھے۔ ناصرالدین قباچہ کا وزیر عین الملک اشعری ذاتی طور پر صاحب کمال اور باذوق ہونے کے ساتھ ساتھ ارباب علم و فن کی سرپرستی کی صفت میں بھی ممتاز تھا۔ اسی کے سایۂ حمایت میں عوفی نے شعرا کا مشہور تذکرہ لباب الالباب پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ عوفی کے متعدد قصاید قباچہ اور عین الملک کی مدح

میں ملتے ہیں - اس کی دوسری تصنیف جوامع الحکایات و لوامع الروایات کا آغاز قباچہ ہی کی خواہش پر ہوا تھا - اس مشہور ادیب کو سلطان شمس الدین التمش کے دانشمند اور علم دوست وزیر قوام الدین نظام الملک محمد جنیدی کی سرپرستی بھی حاصل رہی - احیا العلوم کا تھا (جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) حقیقتاً اسی وزیر کی خواہش کا نتیجہ تھا - غوریوں کے عہد اقتدار میں جس کا اختتام التمش کے ہاتھوں قباچہ کی شکست پر ہوتا ہے - ہندستان (خاص طور سے شمالی اور مغربی علاقہ) فارسی زبان اور علوم کا اتنا بڑا گہوارا نہیں بن سکا تھا جتنا کہ تیرہویں صدی عیسوی میں دلی سلطنت کے قیام کے دوران اور اس کے بعد ہوا - گویا ایک مرکزی حکومت کے قیام نے علم و ادب کی پیشرفت کے لیے بڑے مساعد حالات پیدا کر دیے اور تہذیب و تمدن کی راہیں زیادہ روشن کر دیں - اس زمانے میں ایران اور دوسرے بلاد اسلامی پر تاتاری حملے نے جو قیامت کی تباہی، غارتگری و خون کی مصیبت نازل کی، اس کے نتیجے میں بالعموم ایرانیوں اور خصوصاً خراسانیوں اور ترکوں نے ایک بہت بڑی تعداد میں ہندستان کو اپنی گریزگاہ اور ملجا و ماوی قرار دیا - التمش کے مراحم خسروانہ اور دار الخلافہ دلی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے طبقات ناصری کا مصنف منہاج سراج جوزجانی لکھتا ہے کہ

"واین شہر بکثرت انعامات و شمول
کرامات آں پادشاہ دیندار مختار رجال
(رحال ؟) آفاق گشت، وہرکہ از
جوالی حوادث بلاد عجم و نکبات کفار
مغل بفضل ایزدی خلاص یافت،
ملاذ و ملجا و مہرب و مامن حضرت جہاں
پناہ آں پادشاہ ساخت "

ان شاعروں کے علاوہ جن کا ذکر لباب الالباب میں ملتا ہے، جیسے حمید الدین مسعود بن سعد شالی کوب (حصہ اول)، محمد الکاتب البلخی، فضلی ملتانی (ص ۲۴۳)

اور ضیا الدین سنجری (ص ۲۴۴) اور ناصری اور امیر روحانی وغیرہ (عہد و دربار التمش) سلطنت دلی کے اولین اور ممتاز شاعروں میں سراج الدین خراسانی المتخلص بہ سراج یا سراجی - جمال الدین ہانسوی اور تاج الدین ریزہ کا نام لیا جا سکتا ہے -

ان حضرات نے فارسی شعر و ادب کی ترقی کے لیے زمین ہموار کی اور کاروان فن و سخنوری منزل ارتقا کی سمت چل پڑا - اس عہد میں عام طور سے صنف قصیدہ کا چلن زیادہ تھا اور شعرا کے کلام کا بیشتر حصہ مدحیہ شاعری پر مشتمل ہوتا تھا - ان سخنوروں کے علاوہ جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے، اس صدی کے دوسرے شعرا یعنی شہاب مہرہ، عمید سنامی - شمس دبیر وغیرہ کے کلام میں بیشتر یہی رنگ غالب ہے -

اس روش عام سے ہٹ کر ہندستانی فارسی ادب، علوم اور خاص طور سے شاعری کو حیات تازہ عطا کرنے والی شخصیت امیر خسرو سنہ ۱۲۵۳ء تا سنہ ۱۳۲۵ء کی تھی - جنہوں نے اس زمین کو آسمان بنا دیا - بقول شیخ اکرام " ہندستان میں اب شعر و سخن کی زمین تیار تھی، فقط کسی صاحب کمال کا انتظار ہو رہا تھا جو اس زمین کا رتبہ آسمان تک پہنچا دے - وہ کمی امیر خسرو نے پوری کر دی جو اقبال سے پہلے پاکستان اور ہندستان کے سب سے برگزیدہ شاعر تھے اور جن کا سکہ ماننے والوں میں سعدی اور جامی جیسی مشہور ہستیاں تھیں -

کون سا میدان ادب و شعر تھا جس کو اس صاحب کمال ادیب، انشا پرداز اور شاعر نے تشنہ چھوڑا ہو - خارجی شاعری کے علاوہ داخلی اور کیفیاتی شاعری کے لیے انہوں نے غزل اور مثنوی سے کام لیا - صاحب ارمغان پاک نے جامی کا بیان یوں نقل کیا ہے -

" امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمت در شعر
مستثنا است، قصیدہ و غزل و مثنوی
را بہ درجہ کمال رسانیدہ - خصوصاً
اور براسطہ معنی آشنائی کہ ارباب عشق و
محبت عجب ذوق و وجدانی خواہد

می یابند، مقبول ہمہ کسی افتادہ است۔
خمسہ نظامی را بہ ازوی کسی در جواب نگفتہ۔"

دولت شاہ سمرقندی نے تذکرۃ الشعرا (ص ۲۴۸) میں لکھا ہے کہ (تیمور کے پوتے اور شاہرخ کے بیٹے) سلطان سعید بایسنقر نے اپنے ذوق ادبی کی بنا پر امیر خسرو کے کلام کی جمع آوری، تدوین اور ترتیب میں بڑا اہتمام کیا تھا، اس کو امیر کی ذات اور کمالات سے اس قدر شغف تھا کہ وہ خاص خسرو کے خمسۂ نظامی گنجوی پر ترجیح دیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس الغ بیگ (شاہرخ کا دوسرا بیٹا جو اس کے بعد تخت نشین ہوا) چونکہ شیخ نظامی کا معتقد تھا لہذا خمسۂ نظامی کو برتر اور بہتر خیال کرتا تھا، اور بایسنقر کی رائے سے متفق نہ تھا۔ متعدد بار ان دو عالم و فاضل شہزادوں کے درمیان اس اختلاف رائے نے شدت اختیار کی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں خمسوں کے ہر ہر بیت کا باہم موازنہ اور مقابلہ کرنا پڑا۔

نکتہ سنجان علم و فن اور نقادان شعر و سخنوری بہ اتفاق رائے ان کو ہندستان کا سب سے بڑا فارسی گو شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی ساحرانہ شخصیت میں مجاز اور معنویت کا حسین سنگم ملتا ہے۔ سلطان المشایخ حضرت سلطان جی نظام الدین اولیا کے چہیتے مرید اور ایک صاحبدل صوفی کی حیثیت سے سلوک اور طریقت کے مدارج بھی انہوں نے طے کیے تھے۔ فن موسیقی میں مہارت، ذوق و وجدان اور درک معنوی نے ان کی شخصیت کے جمال و کمال کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ایک نہایت کامیاب ندیم اور درباری بھی تھے۔ محمد قاسم ہندو شاہ استرابادی جو ان کو ہندستان کے مشایخ میں شامل و شمار کرتا ہے لکھتا ہے کہ وہ ۹۹ (بے دو) کتابوں کے مصنف تھے۔ "برکات آں مجدی ظاہر شد کہ نود و دو کتاب در سلک نظم کشیدہ۔"

بقول اسعدی اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ان کے آثار کا بیشتر حصہ زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ بہر نوع اس جامع کمالات ادیب اور شاعر کے علمی اور ادبی کارناموں میں حسب ذیل آثار آج بھی محفوظ ہیں اور ہماری دسترس سے باہر نہیں۔

۱- پانچ دواوین۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایت الکمال۔
۲- خمسہ نظامی کی تقلید میں پانچ مثنویاں یعنی مطلع الانوار، شیریں و خسرو، مجنوں لیلی، آئینہ سکندری اور ہشت بہشت۔
۳- نثر مرصع یا فن و اصول ترصیع نگارش پر رسائل الاعجاز یا اعجاز خسروی۔
۴- کتاب افضل الفواید۔ اقوال و ملفوظ حضرت نظام الدین اولیا (اس کی نسبت خسرو کی جانب مشکوک ہے)
۵- تاریخی منظومات میں مثنویات بعنوان قران السعدین، مفتاح الفتوح، نہ سپہر اور تغلق نامہ
۶- خزاین الفتوح (یا تاریخ علائی) میں سلطان علاءالدین خلجی کی فتوحات کا تذکرہ بڑی مرصع نثر میں پیش کیا گیا ہے۔
۷- مثنوی دول رانی خضر خان (یا عشیقہ یا عشقیہ) میں علاءالدین خلجی کے بیٹے خضر خان اور راجہ کرن کی بیٹی کے معاشقے کا حال نظم کیا ہے۔

اس فہرست سے اندازا ہوتا ہے کہ امیر کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی اور وہ مختلف موضوعات پر قلم اٹھانے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔

صاحب تاریخ فرشتہ ان کو نادرۂ روزگار کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل بیان کی روشنی میں خسرو کی ذات اور صفات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"در دولت شعرای وقت پادشاہ علاءالدین کہ دار الملک دہلی تمام ہندستان بوجود عدیم المثال ایشان زیب و زینت داشت و صیت سخنوری ایشان عالم را فرا گرفتہ بود چہ

کسی کہ درپاے تخت بودند، سرآمد ایشان امیر خسرو بود کہ در فنون سخن داختراع معانی ید بیضا داشت و آثار فضل و مناقب او از تصنیفاتی کہ در نظم و نثر کردہ واضح و لایح است، مع‌ہذا صوفی صاحب وجد و حال بود و اکثر اوقات لعد صوم و صلواۃ گذشتی و از عشق و محبت نصیبہ تمام داشت۔"

خسرو کی شخصیت میں ہمیں اپنی گنگا جمنی تہذیب کی تصویر پوری برنائی کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے۔ حقیقت وہ اس مشترکہ کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں جس کی اساس ہند ایرانی ثقافت کے لطیف ترین عناصر کی باہم آمیزش پر قایم ہے وہ خود کو "ترک، ہندستانی" کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے تنہا اپنی ذات سے ہندستانی تہذیب کو مختلف حیثیتوں سے بہت کچھ دیا ہے۔

وجد و حال کی محفلوں میں ان کی غزلیں اور گیت آج بھی جس ذوق و شوق سے گائے جاتے ہیں اس سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے ملک کے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ان کو کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔

سلوک و تصوف، عشق معنوی اور عرفان و آگہی نے جو سوز دروں ان کو بخشا تھا وہ ان کی مترنم اور والہانہ غزلوں کے روپ میں جھلکا۔ ان کے روحانی تاثرات اور مسلک وحدت پرستی نے جس میں مذہب و ملت کی تفریق نہ تھی اور جو انسان دوستی کے مستحکم سکون پر قایم تھا ہمارے ملک کے مختلف صوفی رہنماؤں کے اقوال اور افکار و نظریات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔

ہندستانی بولو

ہندستانی سیکھو

ہندستانی پڑھو

شمیم آنولوی

غزل

مسکراتے ہوئے جی رہے ہیں مگر اس تبسم میں راحت کا پہلو کہاں
دل پہ تاریکیٔ غم ہے چھائی ہوئی کھو گئے جانے قسمت کے جگنو کہاں

دعوت سیر گل کا بہت شکریہ لیکن اے باغباں یہ بتا دو ہمیں
صحن گلشن میں جانے سے کیا فائدہ اب گلوں میں وہ پہلی سی خوشبو کہاں

تیر کہہ لیجئے برق کہہ لیجئے شعلہ کہہ لیجئے جام کہہ لیجئے
یہ تو اپنے ہی احساس کی ہے افسوس ورنہ اس شوخ نظروں میں جادو کہاں

ہم سے نظریں بچا کر وہ گزرا کریں ہم انہیں چشم حیرت سے دیکھا کریں
ایسی فرصت میں اشکوں کا رکنا محال ایسے حالات میں دل پہ قابو کہاں

نقش حسن ادا پہچانتے ہیں ہمیں ان نگاہوں کا رخ جانتے ہیں ہمیں
لا عشق دل باختہ کی نظر کے سوا حسن کی اور کوئی ترازو کہاں

اے شمیم اب وہ پہلی سی رنگینیاں اپنی فکر و نظر میں بیشک نمایاں نہیں
اپنے حالات میں خود ہیں الجھے ہوئے آج کل شوق خمدار گیسو کہاں

ڈاکٹر انوار الاسلام انور

اندرا گاندھی کے نام

فخر ہندوستان ہیں اندرا — جسم بھارت ہے جاں ہیں اندرا
ہر طرح سب نے آزما دیکھا — عزم کی اک چٹان ہیں اندرا
ہند کی آن بان ہیں اندرا — ویسے تو دھان پان ہیں اندرا
اب تو دشمن بھی ان کے کہتے ہیں — واقعہ ہے مہان ہیں اندرا
دوستوں کی بھی ترجمان ہیں یہ — دشمنوں پر بھی مہرباں ہیں اندرا
جس طرف دیکھو ذکر اندرا ہے — گویا جمہور کی زباں ہیں یہ
اقلیت کا مطالبہ مانا — دکھ غریبوں کا اپنے پہچانا
ان پہ لوگوں نے پھینکے پتھر بھی — اور اندرا نے پھول ہی جانا
ہم نواؤں نے ساتھ چھوڑ دیا — عہد و پیمان کو اپنے توڑ دیا
ہو کے تنہا بھی ایسے عالم میں — ہند کو ارتقا کا موڑ دیا
خشک سالی کی قہر سامانی — کہیں سیلاب کی تھی طغیانی
آفت ناگہاں میں گھر کر بھی — کی ہے اس دیس کی نگہبانی
تری قربانیاں ترے ایثار — جیسے فن کار کا کوئی شہکار
تو سلامت رہے ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
چند ایسے وطن میں ہیں نادان — اب بھی جن کی ہے بے لگام زبان
ذہن تو ہے شعور سے عاری — ویسے نامی ہیں یہ سیاست داں
ہر طرف دفتروں میں سرکاری — رشوتوں کا تھا سلسلہ جاری
نفع خوری پہ آ گیا تھا شباب — تھی سوا حد سے چور بازاری
دعوت فکر بھی دی اندرا نے — سر پھرے لوگ تھے نہیں مانے
اور تشدد پہ بھی اتر آئے — نیا خطرہ لگا تھا منڈلانے
ایمرجنسی کا تب کیا اعلان — کیوں کہ خطرے میں تھا امن امان
افراتفری تھی ہر طرف پھیلی — اور خائف تھا ایک اک انسان
ایمرجنسی کا پھر بڑھا بازو — غنڈہ گردی پہ پا لیا قابو
اور حالات پرسکون ہوئے — پھیلی موج نشاط ہر سو
تو نے اپنے یقین محکم سے — سرد شعلہ کیا ہے شبنم سے
اہل بھارت کے دل بھی جیتے ہیں — تو نے سعی خلوص پیہم سے
لوگ لیتے ہیں جب بھی نام ترا — دل میں ہوتا ہے احترام ترا
ناز بھارت کو ہی نہیں تجھ پر — ساری دنیا میں ہے مقام ترا
ترا جذبہ ترا شعار بلند — تو نے سب کا کیا ہے معیار بلند
اندرا جی کے دم سے ہے اور — آج بھارت کا بھی وقار بلند

دو حسین کنول

شہریار پرواز

کھلے ہیں زیست کے گلشن میں دو حسین کنول
ہے ایک گود میں اک اپنے گھر کے آنگن میں
یہ دو حسین کنول ہیں بہار کا حاصل
انہیں سے نسل چلے گی حسین کنولوں کی

مری انیس غم زندگی چراغ حیات
ترا جمال فروزاں ہیں یہ حسین کنول
انہیں میں دل میں نظر میں چھپا کے رکھوں گا
کہیں لگے نہ زمانے کی تند و گرم نظر
انہیں زمان و مکاں سے بچا کے رکھوں گا
سراج بزم بہاراں ہیں یہ حسین کنول
یہ دو حسین کنول ہیں بہار کا حاصل
انہیں سے نسل چلے گی حسین کنولوں کی

مرے حسین کنول میرے یوسف و جاوید
ظہور جیسے ہوں فردوس کے بہاروں کے
انہیں کے چاند سے مکھڑوں سے یہ چراغاں ہے
روش روش پہ انہیں سے چراغ جلتے ہیں
ہے قلب و روح میں جھنکار ان کے نغموں سے
نفس نفس میں ہے اک ساز نغمگی ان سے
رخ حیات پہ ہے نور تازگی ان سے
نئے زمان و مکاں ان سے نقش پائے نئے
نئے خیال لیے اور نئے جہاں لیے
ادا ادا میں ہے خوابوں کی دلنشیں تعبیر
نظر نظر میں ہے قسمت نئے زمانے کی
ابد تلک یونہی ہنستے رہیں حسین مکھڑے
کہ ان گلابوں سے ہے اعتبار فصل بہار
عجب نہیں کہ مہک ان حسیں گلابوں کی
بنا دے عہد کو مستقبل حسین دیدے

مری شریک سفر اے مری شریک حیات
تری جبیں کا یہ مہر جبیں دمکتا رہے
تری نگہ کے کنول حشر تک رہیں شاداب
ترے گلاب صفت عارضوں کی یہ سرخی
یونہی گلاب کھلاتی رہے بہاروں میں
ترے یہ ہونٹ یہ شہد و شراب کے ساغر
یوں ہی چھلکتے رہیں کیف کے تلاطم سے
صراحی دار یہ تیری حسیں حسیں گردن
یونہی چھلکتی رہے میکدے میں یہ مینا
یہ تیرا قد کہ گلستاں میں جیسے سرو کوئی
کبھی جھکے نہ یہ باد خزاں کے جھونکوں سے
جو تیری گود سے خورشید و ماہ ابھرے ہیں
انہیں سے نور رہے میرے گھر کے آنگن میں
ترے نفس سے مہکتا رہے مشام حیات
نئے کنول کی نہیں اب نہیں ہوس مجھ کو
کھلے ہیں زیست کے گلشن میں جو حسین کنول

یہ دو حسین کنول ہیں بہار کا حاصل
انہیں سے نسل چلے گی حسین کنولوں کی!

جگن ناتھ آزاد

ہم تیرے ساتھ ہیں

روشن کیے جو بیں دیے تو نے ہند میں
چاروں طرف اب ایک تجلی کا دور ہے

اس نور سے نہیں ہے سیاست ہی مستفید
نزدیک و دور دیکھ کے ہوتا ہے یہ گماں
سوتے ہوؤں کی نیند کھلی ہے کچھ اس طرح

رفتار کہہ رہی ہے کہ دن ہو کہ رات ہو
بیداریٔ حیات کا چھیڑا یہ کس نے ساز
ماحول میں ہے ایک نئی زندگی کا لمس
اعضا کہ جن کو وقت نے کچھ کر دیا تھا شل
جو عزم ہو گئے تھے ذرا سست چال میں
تو نے دوا جو دی ہے وہ کر دی سبھی نے گر
تو قوم کا مریض ہے چارہ ساز بھی

اہل قلم ہیں اہل نوا ہیں کہ اہل دل
جو لوگ غیر ہیں نظر انداز کر انہیں
اب اور کیا کہوں میں ترا لائحۂ عمل
وہ فتنۂ و فساد کا جنگ و جدل کا دور
قائم کیا ہے تو نے ہمارے دلوں پہ جو
لکھا ہے تو نے باب جو تاریخ ہند میں
شاعر کا دل ہے آج نہایت ہی مطمئن

"بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ

ظلمت میں نور پھیل گیا دور دور تک
میری نظر سے میرے دل ناصبور تک

یہ نور اب ہے زیست کی ہر بارگاہ میں
اے زندگی! ہے نور تری بارگاہ میں

فردا پہ ان کی آنکھ ہے امروز پر نہیں
کوئی بھی ان پہ خواب گراں کا اثر نہیں
انساں کے ساتھ ساتھ مشینیں بھی جاگ اٹھیں
سوئی ہوئی تھیں جو وہ زمینیں بھی جاگ اٹھیں

پھرتی میں آج موج رواں سے بھی تیز ہیں
پھر ایک بار باد وزاں سے بھی تیز ہیں
نسخہ ہے لاجواب ترا اے طبیب قوم
محبوب بھی ہے قوم کی تو اے حبیب قوم

یہ آج سب قدم بہ قدم تیرے ساتھ ہیں
غیروں کا خوف کیا ہے کہ ہم تیرے ساتھ ہیں
ہندوستاں کا جیسے نصیبہ سنور گیا
ہر اک یہ پوچھتا ہے کہ آخر کدھر گیا؟
یہ نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا
اب یہ مورخوں سے بھلایا نہ جائے گا
راہ عمل پہ تیری یہ رفتار دیکھ کر

لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر"

ناول

"شہزادی کا رومان"

ناول "شہزادی کا رومان" پر تبصرے اور رائیں

ہمارے ناول "شہزادی کا رومان" کی مکمل تیاری کے بعد ہم نے ۱۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو پہلی بار جنرل پوسٹ آفس G.P.O. مابدسہو کل، حیدر اباد ع۱ سے جملہ (۹۵) کاپیاں UNDER CERTIFICATE OF POSTING پوسٹ کیں، جن میں (۱۲) پیکٹ ڈبل تھے، اور باقی (۸۳) پیکٹ سنگل تھے۔ بارہ ڈبل پیکٹ تبصرے کی غرض سے حیدرآباد کے دو بڑے روزنامہ اخبار "سیاست" اور "ملاپ" کے نام بھجوائے گئے ہیں، اور ایک ماہوار رسالہ "سب رس" کے نام بھی ڈبل پیکٹ روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ، "صبح امید" - بمبئی - "معارف" اعظم گڑھ - "زیبد" "بیتنا" - "حریم" "لکھنو"، نیز "شان ہند" - "برہان" - "کتاب نما" "رہنمائے تعلیم" اور "سب ساتھ" "نئی دلی" اور دلی کے نام بھی تبصرے کی غرض سے دو، دو کاپیاں روانہ کی گئی ہیں، لیکن آج تک کسی بھی اخبار یا رسالے میں ہماری کتاب پر تبصرا نہیں ہوا۔ آگے چل کر جو بھی تبصرے چھپے ہوں یا ہوئے "ہندستانی ادب" کے انہیں صفحوں میں پورے کے پورے شایع کیے جائیں گے۔

(78) سنگل پیکٹ حیدرآباد اور ہندستان کی اہم اور بڑی شخصیتوں کے نام رعایتی طور پر روانہ کیے گئے تھے۔ ناموں کی اس طویل فہرست میں، پریسیڈنٹ آف انڈیا - پرائم منسٹر آف انڈیا - یونین منسٹرس آف انڈیا - چیف منسٹرس آف انڈیا کے علاوہ تین موجودہ اور ایک سابق گورنر آف انڈیا کے نام بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ، باقی نام بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں، ہم ایک ایک کر کے ان سب کے نام کہاں تک گنائیں، اور اگر بعض اہم شخصیتوں کے نام گنا دیں، اور دوسروں کے نام کو نظر انداز کر دیں تو ان لوگوں کو شکوے اور شکایت کا موقع ملتا ہے کہ فلاں فلاں کے نام تو گنائے گئے ہیں، اور ہمارے نام کیوں نہیں گنائے گئے؟ ان (۸۳) منفی (۸) یعنی (۷۵) کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے تمھیں تمھاری بددماغی کی سزا دی ہے۔ (۸۳) میں سے جو بچے (۷) منت خوری کے مرتکب نہیں ہوئے، اس لیے ان کے خطوط کے متن کے ساتھ ان کے نام شاندار طریقے پر ایک نہیں، بلکہ تین مرتبہ گنائے جا رہے ہیں، اور باقی (۷۶) ناموں کو ہم نے قصداً اور عمداً نظر انداز کر دیا ہے!

آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ناول "شہزادی کا رومان" نے دو نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ ایک یہ کہ اس ناول کے ٹائیٹل کا کاغذ ایک ہزار روپے رِیم کا نادر اصلی آرٹ پیپر ہے، اور اس کتاب کا دوسرا نیا ریکارڈ یہ ہے کہ ہم نے یہ کتاب (۱۵۰) کی تعداد میں چھپوائی تھی، جس کی (۸۳) کاپیاں رعایتی اور (۶۷) کاپیاں تبصرے کی غرض سے پہلے ہی روانہ کرائی گئیں۔ اس کے بعد بھی فری یا رعایتی کاپیوں کا سلسلہ جاری ہے، اور آخر وقت تک تمام کاپیاں تبصرے کی غرض سے اور رعایتی طور پر فری تقسیم کر دی جائیں گی، اس لیے کہ ہم نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس یادگار اور تاریخی ناول کی ایک کاپی بھی قیمتاً فروخت نہیں کریں گے فروخت کیسے کریں؟ ابتدا میں اس کتاب کی قیمت ہم نے صرف (۵) روپے مقرر کی تھی، اور جملہ خرچ کے بعد

اس کی قیمت اصل میں (۶) روپے سے بھی زیادہ ہے۔ جب نقصان ہی ٹھیرا تو ادھورا کیوں؟ پورا نقصان کیوں نہ برداشت کیا جائے؟ جو ہم یہ سمجھے ہیں کہ دنیا بھر میں اب بھی اس ناول کا ایک نیا ریکارڈ ہے کہ ایک بھی کاپی بیچے بغیر تمام کاپیاں مفت تقسیم کر دی گئیں! تین کرم فرماؤں نے خود اپنے طور پر ناول کی قیمت پانچ پانچ روپے کے تین منی آرڈر بھجوا دیے تھے، مگر ہم نے تینوں منی آرڈر شکریے کے ساتھ واپس کر دیے!

اس ناول کی چھپی ہوئی قیمت (۵) روپے کو قیمت قرار دیتے جسے ہم نے ان تمام مفت خوروں کے نام (۵) روپے کی کتاب اور (۲۰) پیسے رجسٹری اسٹامپ، اندر سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ کا خرچ برداشت کرتے ہوئے بھجوائی تھی، لیکن سوائے سات کے ان میں سے کسی نے بھی (۲۵) پیسے کا خط تو رہا ایک طرف، (۱۵) پیسے کا پوسٹ کارڈ لکھ کر کتاب کے پہنچنے کی اطلاع تک نہ دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگ عادی مفت خوروں نے اپنی مدت تک یہ سمجھ رکھا تھا کہ مرحوم حیدرآباد کی اصطلاح میں، کتاب کا مترجم یا کتاب شائع کرنے والا ان کے باپ دادا، پڑدادا اور سگڑ دادا کا قرض باقی تھا، جو اب چکایا جا رہا ہے! ان کنجوس یا مطلق نے (۱۵) پیسے تک خرچ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی! مگر ان ناحق شناسوں اور لوٹ کھسوٹ کرنے والے پرلے درجے کے بد دماغوں اور نااہلوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم پر تمہارے جیسے بزرگوں کا ہرگز ہرگز قرض باقی نہیں تھا اپنی ایک لاجواب اور سرمایہ آرا، نیز تاریخی اور یادگار کتاب "شہزادی کا رومان" بھیج کر تم جیسے مکھی چوسوں، کوڑھیا مغزوں، فرعونوں، بنیاؤں اور بقالوں پر احسان عظیم کیا تھا، ورنہ سچ پوچھو تو تم اس قابل کہاں تھے کہ ہمارے اس عالی مرتبت اور عظیم ناول کے درشن کر سکیں۔ اے بقالو اور اے بنیاؤ، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ "انجمن ترقی ہندستانی" کی سرپرستی میں ہماری دوسری کتاب "خاقانی میر تقی دہلوی" کچھ عرصہ بعد منظر عام پر آئے گی اور ہم نے قطعی طور پر یہ طے کر دیا ہے کہ اس سرمایہ آرا کتاب کی ایک بھی کاپی تم جیسے بنیاؤں اور عادی مفت خوروں کے نام ہرگز ہرگز نہ بھجوائی جائے! جن سات کرم فرماؤں نے ناول کے بارے میں اپنی رائیں بھجوائی ہیں، ان کے نام یہ ہیں: (۱) سید رحیم الدین، بی۔ اے، ایل ایل۔ بی (عثمانیہ) ایڈوکیٹ (۲) [illegible] سنگھ، بی۔ اے (عثمانیہ) سابق اسسٹنٹ کمشنر (۳) [illegible] کامل، بی۔ اے، ایل ایل۔ (عثمانیہ) ایڈوکیٹ (۴) مرزا سرفراز علی، سابق نائب ناظم تعلیمات، (۵) [illegible] جاگیردار، بی۔ اے، ایل ایل۔ (عثمانیہ) (۶) شیخ محمد، بی۔ اے (عثمانیہ)، اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر، گورنمنٹ آف انڈیا، (۷) محمد حفیظ، بی۔ ایس سی، ام۔ اے (عثمانیہ) انفارمیشن بیورو، گورنمنٹ آف انڈیا۔ ہم ان سات کے خطوط نیچے بہ تدریج وار شائع کر رہے ہیں۔

[illegible] سید رحیم الدین کا خط [illegible] ناول کے [illegible] (D) [illegible] (۱۲۰) [illegible] DOTRING TYPE [illegible]

انتہائی دل چسپی کے ساتھ پورا ناول ختم کر ڈالا، بلکہ واقعہ تھا شاید کہ ناول ان کے لیے BORING ثابت نہیں ہوا، اور چونکہ اس ناول میں پہلے ہی صفحے سے آخر صفحے تک دل چسپی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، جس سے وہ واقعی طور پر اور حقیقی معنی میں آخر تک لطف اندوز ہوتے رہے۔

اس ناول میں حیدر آبادی تہذیب اور کلچر، رہن سہن اور ملنے جلنے کے طریقے، شادی بیاہ کی رسمیں اور دعوتوں میں دستر خوان کا سلیقہ - حضور نظام، ریذیڈنٹ حیدر آباد، امرائے پائیگاہ، وزیر اعظم حیدر آباد، اور دوسرے بڑے عہدے داروں اور بڑے بڑے جاگیرداروں اور متوسط طبقے کے لوگوں کے آپس میں ملنے جلنے کے ڈھنگ اور طور طریق کا کامیاب نقش، ہماری ذہانت، طبع اور جدت قلم کا نتیجہ ہے، جس پر ہم کو بجا طور پر فخر حاصل ہے!

جی - آر نیلڈ فرنانڈز نے اپنا ناول ROMANCEOFAZENANA سنہ ۱۹۱۰ء میں لکھ کر شائع کیا تھا جس کو HOWE & CO-MADRAS نے چھاپا تھا - ہوسکتا ہے کہ یہ دل چسپ ناول اس زمانے میں عام پسند اور مقبول رہا ہو! کسی نے بھی اس کے ترجمے کی طرف توجہ نہیں دی - بڑے سائز کا، چار سو چوراسی (۴۸۴) صفحے کا یہ ناول ہمیں جمعرات کے بازار میں ملا تھا - ہم نے اس کو پڑھ ڈالا تو نہایت دل چسپ اور معلومات آفریں پایا - ہمارا خیال ترجمہ کرنے کا تھا، مگر وہ خیال پورا نہ ہوسکا، اور یہ ناول دوسری کتابوں کے ساتھ برسوں گھر میں پڑا رہا - ایسے میں وہ ناول دوسری متعدد کتابوں کے ساتھ ہمارے گھر سے چوری گیا، اور پھر ہمیں اس کا خیال تک بھی نہ رہا۔

ایک ہندستانی کی حیثیت سے ہم یہ فخریہ طور پر کہتے ہیں کہ ایک غیر زبان انگریزی کو ہم نے دو نئے لفظ دیے ہیں، (۱) CANTEL اور MEATARIAN اور یہ دو نئے لفظ ہیں CANTEL ہم نے CANTEEN-CUM-HOTEL سے بنایا ہے، یعنی CANTEEN کے CAN لیا اور HOTEL کے TEL لیا، اس طرح سے ایک نیا لفظ CANTEL بنایا ہے، جس کے معنی ہیں ایسا ہوٹل جو دفتر، کالج اور کارخانے وغیرہ کے اوقات میں CANTEEN کا کام دے، اور دوسرے اوقات میں ہوٹل کا کام دے۔

دوسرا نیا لفظ ہم نے MEATARIAN بنایا ہے، یہ لفظ MEAT سے بنایا ہے، اور یہ لفظ VEGETARIAN کے وزن اور اصول پر بنایا ہے۔ VEGETARIAN کے معنی ہیں سبزی یا ترکاری خور، اس طرح MEATARIAN کے معنی ہیں گوشت خور، کیونکہ انھوں نے گوشت خور کے معنی میں NON-VEGETARIAN کا لفظ کو سو فیصد غلط ثابت کیا ہے - اس سلسلے میں ہم نے باقاعدہ ریسرچ کی ہے، اور متعدد لائبریریوں میں انگریزی [illegible] زیادہ ڈکشنریاں دیکھ ڈالی تھیں - ان کا ریسرچ کے سلسلے میں ہم سالار جنگ میوزیم لائبریری [illegible] اس کا اس پر ختم ہوئے - ہم نے لائبریرین سے دریافت کیا، آیا آپ کے پاس انگریزی ناول ROMANCEOFAZENANA ہے؟ انھوں نے کہا، ہاں ہے، [illegible] [illegible] اس کا ایک ایک صفحہ علیحدہ ہو گیا ہے - یہ سنتے ہی ہم خوشی سے اچھل پڑے [illegible] [illegible] 15 [illegible] انھوں نے اسی وقت ہمیں ناول دیا [illegible] [illegible] یہ ناول ہم کئی سال [illegible] [illegible] دل چسپ ناول [illegible] سے بہتر ہے کہ حیدر آبادی تہذیب اور کلچر کا [illegible] [illegible] ناول کا ترجمہ کرنے کے [illegible] کا سبب [illegible] [illegible] انھوں نے خوشی سے [illegible] [illegible] اس کا ترجمہ شروع کر دیا - اب ہم اس کا ترجمہ کر رہے [illegible]

کی ایک دوسرے ذریعے سے ہمارے پاس آئی تو باقی ترجمہ ہم نے اپنے گھر ہی پر کیا، اور وہ کاپی ہمارے دفتر میں محفوظ ہے۔ اس ناول کے ترجمے کے بعد ہم نے اس پر ایک معرکہ آرا مقدمہ لکھا، ادب دنیا ناول میں یہ پہلا مقدمہ یا INTRODUCTION ہے۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں کسی بھی ناول پر آج تک مقدمہ نہیں لکھا گیا ہے، صرف ہمارے ناول "شہزادی کا رومان" پر پہلا مقدمہ ہے، مقدمہ لکھنے کے بعد ہم نے اس ناول کی پہلی قسط "راز دار خان یادگاری نمبر" میں دی۔ یہ نمبر ہم نے اپنے والد مرحوم راز دار خان صاحب، منصب دار اور عہدہ دار حکومت آصفجاہی حیدرآباد کی یادگار کے طور پر نکالا تھا۔ یہ نمبر اکتوبر - نومبر - دسمبر ۱۹۷۲ء کا ملا جلا نمبر تھا۔ یہ پورا ناول "ہندستانی ادب" کی ۲ قسطوں میں ختم ہوا تھا۔ اس کے بعد ہمیں خیال آیا کہ یہ معرکہ آرا ناول حیدرآبادی تہذیب اور کلچر کا واحد علمبردار ہے، اس لیے اس ناول کو کتابی شکل دے کر یادگار بنانا چاہیے، چنانچہ کتابی شکل دینے کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد ہم نے ۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو یہ ناول شائع کر کے واقعی ایک یادگار کارنامہ انجام دیا ہے! ہم نے اس ناول کے صفحہ (۲) پر تاریخ اشاعت ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ء رکھی تھی، مگر چھپائی اور جلد بندی کے مراحل طے کرتے تک یہ ناول ۸ اپریل ۱۹۷۶ء سے پہلے جاری نہ ہوا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اس ناول کی (۹۰) کاپیاں ہم نے پہلے روز بھجوائی تھیں اور اس سے متعلق کرتے ہیں، سات خط موصول ہوئے، جو چھپے دیے جا رہے ہیں۔ تاکہ کسی کو یہ بھی گلے شکوے کا موقع نہ ملے کہ فلاں کا خط پہلے کیوں، اور ہمارا خط بعد میں کیوں؟

ایڈوکیٹ رحیم الدین کے پہلے خط کا تفصیلی جائزہ ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔ دوسرے خط میں ایشور سنگھ بی۔ اے (عثمانیہ) نے ناول کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے خط سے ظاہر ہے، مگر انہوں نے دو قوں کی تکرار کے بارے میں ان الفاظ میں شکایت کی ہے، وہ کہتے ہیں۔ "شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو چیزیں پیش کی گئی ہیں اس دور کے لوگوں کے لیے ایک تعجب کی چیز ہے۔ خصوصاً نواب میر محبوب علی خان بہادر کا زنانا دو قوں کے سلسلہ میں جو چیزیں متعدد بار دہرائی گئی ہیں، وہ میرے خیال میں طویل ہو گئی ہیں۔"

بھائی ایشور سنگھ، بی۔ اے (عثمانیہ) وظیفہ یاب اسکاوٹ ماسٹر، ہم دونوں اور شنکر جی نمائش والا، اور پریم جی لکڑی والا وغیرہ وغیرہ اسی کالج میں میٹرک جماعت میں کلاس میٹ تھے۔ شنکر جی کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا، مگر ہم دونوں اب تک زندہ اور باقی ہیں، اور جب کبھی ہم دونوں شہر کے کسی حصے میں سڑک پر یا گلی کوچے میں ملتے ہیں تو بے ساختہ ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں، اور آج کل ہم یا کسی ہوٹل میں بیٹھ کر پرانی باتیں اور داستانیں دہرایا کرتے ہیں۔

ایشور بھائی، دو قوں کی تکرار کے بارے میں آپ کو کچھ بھول سی ہوئی ہے۔ دو قوں کی یہ تکرار اصل ناول "رومانس آف اے زنانا" میں موجود ہے، اگر اصل ناول میں یہ تکرار نہ ہوتی، اور ہم سے ترجمہ زرا بھی بھول کر جاتا تو ہم خود اس تکرار کا اعادہ کر دیتے، اور یہ تکرار اس لیے ضروری ہے کہ نواب سر آسمان جاہ بہادر، افسر پائیگاہ اول یا نمبر ایک کی عظمت اور برتری کو ظاہر کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ کو بہتر طریقے پر جانتے ہیں کہ مرحوم ریاست حیدرآباد میں تین پائیگاہ تھے۔ ۲۱، ۲۱ لاکھ کے دو اور ۲۲ لاکھ سالانہ آمدنی کا ایک پائیگاہ، اور اس پائیگاہ کے مالک سر آسمان جاہ بہادر تھے۔ اس وقت کے ۲۲ لاکھ آج کے ۲۲ کروڑ کے برابر ہیں۔ اسی وقت کے روپے کی قدر و قیمت کا اندازہ ... آسمان جاہ کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا، ان کے دوستوں اور ...

سے بڑے بڑے عہدے دار، امراء، پائیگاہ اور جاگیردار نیز سکندرآباد کے تمام اعلیٰ عہدے دار
اور بڑے بڑے انگریز افسر وغیرہ شامل ہوتے اور ان سے ریزیڈنٹ حیدرآباد تک ان کے گہرے
دوستانہ تعلقات تھے۔ سال میں کئی مرتبہ کسی نہ کسی بہانے ان کے محلوں میں بڑے ہی شاندار ایٹ ہوم
اور ڈنر وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ راجا پرتاب گیرجی بہادر (مرحوم) اکثر بہ تقریب گیرجی کی کوٹھی چکڑ
روڈ، سلطان بازار کو بھی آسمان جاہ بہادر کی طرح سال میں کئی مرتبا دعوتیں دیتے اور کھلانے پلانے
کا شوق تھا۔ آپ ہی ایک ایسا حیدرآباد جانتا ہے کہ آج سے پچاس سال پہلے راجا پرتاب گیرجی
بہادر کو اپنے حصے کا ایک کروڑ روپیہ ملا تھا، انہوں نے نئی کوٹھی بنائی اور اس کوٹھی میں سال میں
کئی مرتبا شاندار ایٹ ہوم اور ڈنر ہوا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر زمانے میں مقروض ہو گئے
تھے، اور بارہ لاکھ روپے میں اپنی کوٹھی حکومت حیدرآباد کے ہاتھ بیچ دی تھی، اس کوٹھی میں اب –
E.N.T ، کان – ناک اور حلق کا دواخانہ ہے۔

برسبیل تذکرہ پرتاب گیرجی کا نام پہلے آ گیا، حالانکہ سب سے پہلے یمین السلطنت سر مہاراجا
کشن پرشاد بہادر مرحوم، سابق مدارالمہام اور دور سابق صدر اعظم، اور سابق پیشکار حکومت حیدرآباد
کا نام آنا چاہیے تھا۔ ان کی دیوڑھی میں زیادہ تر ایٹ ہوم، اور ڈنر وغیرہ کا ایک تانتا
بندھا رہتا تھا۔ آسمان جاہ کی طرح مہاراجا بہادر کے تعلقات بھی تمام بڑے بڑے عہدے داران،
حیدرآباد اور سکندرآباد سے تھے۔ ان کی جاگیرات کی سالانہ آمدنی بارہ لاکھ سے زیادہ تھی۔
مہاراجا کا اسٹیٹ لاکھوں روپے کا مقروض تھا، جس کا خود انہیں بھی علم تھا، مگر اس کے باوجود
مرتے دم تک انہوں نے اپنی خاندانی اور موروثی آن بان اور شان بات سے جانے نہ دی۔ مرنے
کے بعد قرضوں کے ذریعے جب اسٹیٹ کورٹ ہوا تو پتا چلا کہ اسٹیٹ کئی لاکھ کا مقروض ہے۔
مگر سر آسمان جاہ بہادر کا اسٹیٹ مقروض نہیں تھا، وہ بڑے ہی قابل، لائق، فائق اور
دانشور شخص تھے۔ اسٹیٹ کی آمدنی اور خرچ کو خود اپنے کنٹرول میں رکھتے تھے۔ وہ ایک بہترین
حساب داں بھی تھے، اور اپنے اسٹیٹ کا سالانہ بجٹ خود ہی بناتے تھے۔ اس کے ثبوت سے کچھ دیکھیے

PICTORIAL HYDERABAD

حیدرآباد کی یہ مصور داستان، مہراج کا ایک اہم اور یادگار کارنامہ ہے۔ یہ کتاب بہت
بڑے سائز کی ضخیم [illegible] دو جلدوں میں چھپی تھی۔ انہیں دونوں جلدوں سے بہت سے اقتباس
کے ساتھ [illegible] کیا تھا۔ [illegible] نے لکھا ہے کہ آسمان جاہ امیر پائیگاہ اور حیدرآباد
کے [illegible] امیر تھے۔ [illegible] کے انتقال پر وہ وزیر اعظم حیدرآباد بنائے گئے تھے۔ اس لیے
[illegible] اور ان سے ان کے تعلقات [illegible]
[illegible] ان کی دیوڑھی میں آئے دن [illegible]
[illegible]

[illegible] ان کے سالے [illegible]
[illegible] وزیر اعظم حیدرآباد، اور [illegible]
[illegible] اور اس کے [illegible]
[illegible]
[illegible]

کا تھا — ان کی خاطر تواضع کی تھی۔ آستان جاہ کے سوا، کوئی دوسرا بڑے سے بڑا جاگیردار بھی ایسی
شاہانہ خاطر تواضع نہیں کر سکتا تھا، اور اگر خود آستان جاہ خاطر تواضع کی ایسی تکرار نہ کرتے تو آج ہم
آستان جاہ کو آستان جاہ نہ کہتے، اور ایک واقعی بڑے آدمی کی حیثیت سے ان کی مدح سرائی نہ کرتے
اگر وہ صرف حضور نظام کی، یا زیادہ سے زیادہ ریذیڈنٹ حیدرآباد، اور وزیر اعظم حیدرآباد کی خاطر
تواضع کرتے اور عام سرداروں کو نظر انداز کر دیتے تو آج ہم اپنے اس قلم سے ان کی بڑائی اور برتری
کی تعریف کے گیت نہ گاتے۔ یہ ممکن کہ آپ نے دعوتوں کی تکرار کہا ہے، اصل میں وہ دعوتیں نہیں
نہیں تھیں، بلکہ وقتیہ معمولی سی خاطر تواضع یا ضیافت تھی۔ ان کی دعوتیں وہی ہیں، مہاراجا بہادر کی
دیوڑھی میں ہوئیں، اور مہاراجا پرتاب گیر جی کی کوٹھی میں ایسی شاندار دعوتیں ہوا کرتی تھیں، جس کی نظیر سارے
ہندوستان میں نہیں مل سکتی! اب خود آپ ہی ٹھنڈے دل اور انصاف سے فرمایئے کہ ناول
"شہزادی کا رومان" میں ہم نے جس خاطر تواضع کو ضرورت سے بار بار دہرایا ہے، وہ حقیقت
پر مبنی ہے یا نہیں ——؟ سچ کہئے، آپ ایشور سنگھ ہی کو اس ناول میں آستان جاہ کی خاطر تواضع
کی تکرار اہمیت رکھتی ہے، اور نہایت ضروری ہے یا پھر سے "مرغ کی ایک ٹانگ" — یعنی
دعوتوں کی تکرار غیر ضروری ہے!

تیسرا خط زاہد علی کامل کا ہے۔ کامل سے ہمارے تعلقات تقریباً (۳۰) سال سے ہیں۔ کامل
عثمانیہ یونیورسٹی کے بی۔ اے، ایل ایل۔ بی ہیں، اور حیدرآباد کے سابق دور میں ان کا شمار حیدرآباد
کے مشہور اور کامیاب وکلا یا ایڈووکیٹس میں تھا۔ اب تو یہ گھر بیٹھ گئے ہیں، اور اللہ اللہ کا
ورد ہمیشہ ان کی زبان پر رہتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خط کی ابتدا ہی "السلام علیکم و
رحمۃ اللہ و برکاتہ" سے کی ہے، اس کے معنی ہیں، "سلامتی ہو تم پر اور اللہ کی
رحمتیں اور برکتیں تم پر نازل ہوں"۔ اللہ کی سلامتی کے بعد یہ عرض ہے کہ ۲۰ جنوری ۱۹۷۶ء
ڈاکٹروں نے تشخیص کے بعد مرض T.B. بتایا تھا ... X - RAY ... تو معلوم
ہوا کہ بائیں پھیپھڑے خراب ہو گئے ہیں ... [illegible]
T.B. کا یہ پہلا دورہ تھا، اس پر ... روزانہ (۲) CAPSULES اور دوسرے
... TABLETS ... [illegible]
دوا پابندی سے لینا اور غذا پرہیز سے کھانا، اور ہمارے افلاس کا یہ وہ زمانہ تھا،
... [illegible]
کہ بستر نصیب نہ تھا۔ ... ڈاکٹر ... [illegible]
ڈاکٹر صاحب، ہم آپ کے حکم کی ... تعمیل کر رہے ہیں ... [illegible]

[illegible]

درد کی شدت کی اس سے بہتر وضاحت کسی سے بھی ممکن نہیں۔ اس تفصیل کے باوجود ہو سکتا ہے کہ مل بدمرغ کی ایک شاہنگ ما کے مصداق یہی کہیں کہ یہ بھی اللہ کی طرف سے سلامتی کی ایک شکل ہے۔ خیر! سلامتی کی اب دوسری شکل کو سن لیجیے کہ ایک سال سے ہمارا سیدھا پیر بے کار ہو گیا ہے، یعنی ایسا بیکار نہیں کہ ہم چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ پنجے سے لے کر ٹخنے تک چلتے وقت پیر میں درد ہوتا ہے، اور اسی پیر کی ایڑی میں درد مستقل طور پر جڑ پکڑ گیا ہے۔ چلتے وقت ہم اپنی ایڑی زمین پر ٹیک نہیں سکتے۔ اگر اس ایڑی کو ہاتھ سے دبائیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ہمارے دونوں گھٹنوں کا لعاب خشک ہوا جا رہا ہے، اسی لیے پہلے چلتے وقت دونوں گھٹنوں کے جوڑوں میں سخت درد اور شدت کی تکلیف ہوتی ہے۔ ہم دواؤں سے تنگ آ گئے ہیں، اسی لیے دوا لینی چھوڑ دی ہے۔

ہماری سلامتی کی ایک دو مثالیں اور بھی بیان کیے دیتے ہیں۔ ہم موجودہ مکان میں پہلی جولائی ۱۹۷۵ء کو منتقل ہوئے، اور ۲۱ نومبر کو سیڑھیاں اترتے ہوئے ہمارا پیر پھسل گیا، اور سیدھے پیر کی انگلی ٹوٹ گئی تھی اور ساتھ ہی پنجا بھی بری طرح سے موچ کھا گیا تھا۔ دیسی جراح سے ہم نے علاج کروایا، جس پر تقریباً ڈیڑھ سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ پہلی جنوری ۱۹۷۶ء کو پٹی کھلی اور ہم نے غسل صحت کیا، اور ۲ جنوری کو پھر سے اس مقام پر ہمارا پیر پھسل گیا، اور ہم بری طرح سے گھائل ہو گئے۔ اب کی دفعہ ہمارے سیدھے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹی تھی اور پنجا بھی موچ کھا گیا تھا۔ اس دفعہ بھی اسی جراح کا علاج کروایا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا تو ہمارے ایک کرم فرما نے عثمانیہ دواخانے جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ ہم عثمانیہ دواخانے گئے اور وہاں جراح کی پٹی نکال کر پلاسٹک کی پٹی باندھ دی گئی، اور ہم سے کہا گیا کہ ہم (۲۷) روز بعد آئیں۔ ہم (۲۷) روز بعد گئے تو ہمارے ہاتھ کی پٹی الکٹرک آری سے کاٹ کر پھینک دی گئی۔ ہم نے کہا آپ کی پٹی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، آیا آپ کوئی دوا وغیرہ لگانے کے لیے دیجیے تو ہمیں ٹکا سا جواب دیا گیا کہ ہمارے ہاں کسی قسم کی دوا یا مرہم وغیرہ نہیں ہے، اس کے بعد ہم سے کہا گیا کہ ہم گھر کو دن میں چار سو مرتبہ اپنے ہاتھ کے پنجے کو کھولیں اور بند کریں، بس اسی ورزش سے آپ کا ہاتھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں، ہم نے (۲۷) روز میں دو بار عثمانیہ دواخانے میں پلاسٹک سرجری کا وارڈ بھی دیکھا تھا۔ اس وارڈ میں ہر وقت ایک سو مریض رہتے ہیں، اگر کوئی پرانا مریض خارج کیا جائے تو نئے شکار کو ایک بڑ دے کر ناکردہ گناہ کی سزا کا مستحق قرار دیتے ہیں، کسی کو ایک ہفتے کی سزا ملتی ہے، اور کسی کو (۵۰) روز یا دو ہفتے کی۔ وہ اسی بڑ سے ہل نہیں سکتا۔ ہم نے دیکھا کہ کسی کا ہاتھ لٹکا دیا گیا ہے تو کسی مریض کا پیر لٹکا ہوا ہے، اگر کسی کا [illegible] یا ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی ہے تو اس کو اوندھا لٹا دیا جاتا ہے، بہر حال عجیب و غریب منظر ہوتا ہے پلاسٹک سرجری وارڈ کا، جو صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان مستقل مریضوں کے علاوہ روزانہ بھی سو مریضوں کے ہاتھوں اور پیروں کو پٹیاں باندھ کر انھیں گھر واپس کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ مریض ہوتے ہیں، جن کی ہڈیاں [illegible] نہیں ہیں بلکہ FRACTURE یا کریک آ جاتی ہے۔ ان کو سے [illegible] نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا تو ہم [illegible] واپس [illegible] اسی [illegible] کے پاس گئے۔ یہ جراح [illegible] اسٹیشن کے پیچھے [illegible] BONESETTING CENTRE [illegible] ان کی [illegible]

کا پیٹ کھایا ہے۔ ہم نے انہیں شروع سے آخر تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔ جب ہماری باری آئی
تو انہوں نے ہم سے شیروانی نکالنے کے لیے کہا، ہم نے فوراً شیروانی اتار کر رکھ دی، ہماری قمیص کی آستین
آدھی پھٹی ہے، اس لیے قمیص کے اتارنے کی نوبت نہ آئی۔ وہاں موجود ایک صاحب سے انہوں
نے کہا کہ ان کے پیٹ کے اطراف ہاتھ ڈال کر دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیجیے، اور چھوڑنا نہیں
چنانچہ یہی ہوا، اور انہوں نے ہمارا سیدھا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا، اور پنجے کو دونوں ہاتھ
سے مضبوطی سے پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ ہمارے ہاتھ کی سرکی ہڈی کٹ سے بیٹھ گئی، اور ا[ن]
صاحب سے کہا کہ اب انہیں چھوڑ دیجیے، اور خود سفید مرہم لگانا شروع کیا کہنی سے پنجے اور انگلی
تک وہ بار بار مرہم لگاتے رہے اور ہاتھ میں جذب بھی کرتے رہے۔ اس کے بعد کپڑے کی پٹی باندھ
اور پٹی کو دھاگے سے سی دیا، تاکہ پٹی کھلنے نہ پائے۔ ان کے کہنے پر ہم نے انہیں تین روپے
دیے، اور تیسرے روز آنے کے لیے کہا۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے گھر چلے گئے۔ تین
روز میں ہمیں کافی افاقہ ہو گیا تھا۔

ہم تیسرے روز پھر سے گئے اور جاتے ہوئے اپنے ساتھ "ہندستانی ادب" کا ایک نمبر لیتے
گئے۔ وہ نمبر دیتے ہوئے ہم نے ان سے کہا کہ یہ ہمارا علمی ادبی ماہوار رسالہ ہے، جو (۳۶) ر[سال]
سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس کے بعد سے نمبر کی نکاسی ختم ہو رہی ہے، اس لیے آپ ا[ز راہ]
خصوصی دل چسپی سے ہمارے مریض ہاتھ کو اس قابل بنا دیجیے کہ ہم اسی ہاتھ سے آئندہ نمبر کا
اداریہ لکھ سکیں۔ انہوں نے کہا کہ کتنے روز دے سکتے ہیں آپ مجھکو، تو ہم نے جواب میں
کہ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے۔ اس کے بعد انہوں نے ہمیں اطمینان دلایا، اور وعدہ کیا
کہ دو ہفتے کے اندر ہی آپ کے ہاتھ کو اس قابل بنا دوں گا کہ آپ اسی ہاتھ سے اداریہ
لکھ سکیں۔ اس پر ہم نے رسالہ دینے کا شکریہ ادا کیا، اور جب ہماری باری آئی تو پرانی
پٹی کھول دی، اور پھر سے مرہم بار بار لگا کر مالش کی اور دیر تک مرہم کو ہاتھ میں جذب کرتے رہے
اس کے بعد ہاتھ کو [illegible] کر سی دیا۔ ہم نے انہیں تین روپے دیے، اور ان کا شکریہ ادا
کرتے ہوئے اپنے کام سے باہر چلے گئے۔ پھر سے تیسرے روز گئے تو انہوں نے ہمارے رسالے
کی بہت تعریف کی کہ [illegible] مضامین کے اعتبار سے آپ کا رسالہ بڑا ہی معیاری ہے،
کتابت و طباعت بھی بہتر ہے، اور کاغذ بھی عمدہ ہے اور ٹائٹل بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ انہوں
نے کہا کہ میری بیوی بھی آپ کے رسالے کی مداح ہیں، اور بازو میں سیکل کی دکان ہے۔
[illegible] آپ کا رسالہ انہیں بھی دیا تھا، پڑھنے کے بعد انہوں نے بے حد تعریف کی۔ اس
[illegible] ان سے شخصی تعلقات ہو گئے تھے، اس لیے انہوں نے تین روپے اجرت [illegible]
[illegible] ہم نے کہا کہ اگر آپ [illegible] روپیہ نہیں لیں گے تو ہم آپ کے پاس آنا [illegible]
[illegible] وہ تین روپے [illegible] جیب میں رکھ لیے۔ اس کے بعد پٹی نکالی
[illegible] آپ [illegible] آ سکے [illegible] مرہم کی مالش کرتے تھے، جب [illegible]
[illegible] کے قابل ہو جائے گا [illegible] ہم روزانہ جاتے رہے، اور [illegible]
[illegible]
[illegible] ایک روپیہ پیش کرتے تھے۔ اپنے [illegible]
[illegible]
[illegible]

بند ہو گیا، مگر ان کے ہمارے شخصی تعلقات آج تک بھی قائم ہیں، مجھے بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ ہم ان
نے ہم پوسٹ کے ذریعے "ہندستانی ادب" کا ہر نمبر بھجوایا کرتے ہیں اور ۱۸ اپریل کو سب کے
ساتھ اپنے ناول "شہزادی کا رومان" کی ایک کاپی بھجوائی تھی، جس کے پڑھنے کے بعد انھوں کا
ظاہری اور معنوی خوبیوں کی انہوں نے بے حد تعریف کی۔

ہمارے بجائے کمال، تمہارے پیارے اللہ اور "ارحم الراحمین" کی ہم پر سلامتی کے شب و ستم

ایک تیسری مثال بھی سن لو! ہم اپنے مستقل اور PET اخبار STATESMAN
نئی دلی کے علاوہ، روزانہ دو ایک دوسرے معیاری انگریزی اخبار، کسی کے جو رستے یا
جائد شاپ سے خریدتے ہیں۔ ایک روز فروری ۱۹۷۶ء کے مہینے میں، نہ معلوم کس تاریخ
رات کے آٹھ بجے دو تین اخبار لینے کے بعد ہم کراچی بیکری، منظم جاہی مارکٹ کی طرف جا رہے
تھے جوں ہی ہم سندھ کے ہوٹل کے قریب پہنچے تھے، ہمارا سیدھا پیر پھسلنا شروع ہوا، ہم نے اس
پر قابو پانے کی کوشش کی، مگر پیر اس تیزی سے پھسلا کہ ہم فوراً گر پڑے۔ ہمارے ہات سے اسٹیل کی
چھڑی اور تھیلی بھی سڑک پر گر گئی تھی۔ فٹ پاتھ پر کھڑے دو چار حضرات نے آکر ہمیں اٹھایا تو ہم
نے ان سے کہا کہ ہمارا پنجا مروڑ گیا ہے، اور سخت تکلیف ہو رہی ہے، اس لیے آپ ہمیں فٹ پاتھ
پر بٹھا دیجیے، چنانچہ ایک پھل والے کی دکان کے سامنے ایک اسٹول پر ہمیں بٹھا دیا۔ ان لوگوں نے
پنجے کو سہلانے اور رگڑنے کی کوشش کی تو ہم نے ان سے کہا کہ براہ کرم آپ ہمارے پنجے کو ہات
نہ لگائیے اور سلیم نگر جانے کے لیے ایک رکشا چکا دیجیے، وہ جو بھی لے ہم دینے تیار ہیں، اس
وقت ہم سخت کرب اور بے چینی کی حالت میں مبتلا تھے۔ سامنے ہی ایک رکشا کھڑا ہوا تھا، اس
نے ڈیڑھ روپیہ مانگا تو ہم نے کہا، منظور ہے، پھر ہم نے کہا کہ آپ میں سے دو حضرات ہمیں رکشا میں
بٹھا دیجیے، چنانچہ ان میں سے دو حضرات نے ہمیں رکشا میں بٹھا دیا، تو ہم نے سب کا بار بار شکریہ
ادا کیا، اور چھڑی اور تھیلی بھی رکشا میں رکھ دی۔ ہم نے اس تکلیف کی حالت میں ان سے
دریافت کیا، ہم تو سڑک پر سے آہستہ جا رہے تھے، کیا کوئی پتھر وغیرہ آ گیا تھا، جس کی وجہ
سے ہم گر پڑے؟ تو ان میں سے ایک شخص نے کہا، پتھر نہیں، کیلے کا چھلکا آ گیا تھا، جس کی
وجہ سے آپ کا پیر پھسل گیا۔ ہم کو پھسلا سامنے کیوں آیا ہے، معلوم ہوتا ہے کسی نے کیلا کھا کر
چھلکا پھینک دیا تھا، اس پر آپ کا پیر پڑ گیا، اس لیے آپ کا پیر پھسل گیا، اور آپ اس طرح
سے گر پڑے۔ ان سب حضرات کا ہم نے ایک بار شکریہ ادا کرتے ہوئے ہم اپنے مکان
کے لیے چل پڑے، اور ہمارے پیر میں سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ جوں ہی پہلا شفاخانہ جراح صاحب
کی گلی کے مقابل پہنچا تو ہم نے دیکھا کہ گلی کھلی ہے، اور مغرب [illegible] ہم نے رکشا والے
سے کہا سامنے جراح صاحب کی گلی کے قریب لے جاتا وہ فوراً ہی رکشا وہاں لے گیا، ہم نے دیکھا
ان کے سامنے دو چار حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے رکشا والے سے کہا کہ تم جا کر جراح صاحب
سے کہو کہ [illegible] ایم۔ خان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، اس لیے وہ آ نہیں سکتے، اللہ آپ کو رکشا
[illegible] آئے، [illegible]
[illegible] ہمارے پیر کی ہڈی [illegible]
[illegible] چنانچہ رکشا والے [illegible]
[illegible] رکشا [illegible]
[illegible] جراح صاحب کا سارا [illegible]

جانب رجوع ہوئے اور سیدھے پیر کا شور اور آنا نکالنے کے بعد پٹیکے کو اوپر چڑھا دیا، اور وہاں بیٹھے ہوئے حضرات میں سے ایک صاحب سے کہا کہ ان کے پیٹ کے اطراف اپنے دونوں ہات ڈال کر انہیں مضبوطی سے پکڑ لیجے، اور جب تک میں نہ کہوں چھوڑنا نہیں، چنانچہ ان حضرات میں سے ایک صاحب نے ہمارے پیٹ کے اطراف دونوں ہات ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لیا، اور جراح صاحب نے ہمارے مجروح پیر کا پنجا اپنے دونوں ہاتوں میں لیکر اس زور سے کھینچا کہ کٹ سے سرکی ہوئی ہڈی اپنی اصلی جگہ بیٹھ گئی، تو ان صاحب سے کہا کہ اب انہیں چھوڑ دیجیے۔ اس کے بعد اور پیر کو بار بار مرہم لگا کر مالش شروع کردی، اور کچھ دیر بعد کپڑے کی پٹی باندھ کر اس کو کس دیا، اور ہم سے کہا کہ آپ کے پیر کی ہڈی ٹوٹی نہیں، بلکہ سرک گئی تھی۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ رکشا منگوا کر ہمیں بٹھا دیجیے، تاکہ ہم گھر جا سکیں، تو یہ سن کر انہوں نے کہا کہ آپ کو تکلیف زیادہ ہے، اس لیے آٹو میں، میں خود ہی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ یہ حضرات یہ ملنے آئے ہیں، میری واپسی تک یہاں بیٹھے رہیں گے، چنانچہ آٹو آیا، اور اپنے احباب کی مدد سے انہوں نے ہمیں آٹو میں بٹھایا، اور خود بھی بیٹھ گئے۔ آٹو ہمارے کمرے تک لے جایا گیا، اور آٹو والے کی مدد سے انہوں نے ہمیں آٹو میں بٹھایا، اور خود بھی بیٹھ گئے۔ آٹو ہمارے کمرے تک لے جایا گیا، اور آٹو والے کی مدد سے انہوں نے ہمیں بستر پر لٹا دیا، اور تاکید کی کہ پیر کو ترچھا نہیں کرنا، پیر کے نیچے ایک تکیا رکھ کر کہا کہ اس تکیے سے آپ کو آرام ملے گا۔ ہم نے ان سے کہا کہ آپ کی پٹی کی اجرت تین روپے اور آٹو کا دو طرفہ کرایا ہم آپ کو آئندہ پٹی پر دینگے، اس لیے اس وقت کرایا خود آپ دے دیجیے۔ ہم نے ان کا بے حد شکریہ ادا کیا، اور وہ آٹو میں واپس چلے گئے۔ ہم تین روز بعد رکشا میں بیٹھ کر گئے، اور اپنی تکلیف کا سارا حال احوال کہہ سنایا۔ انہوں نے وہ پٹی کھول دی اور مرہم مالش کرنے کے بعد دوسری پٹی باندی۔ ہم نے دونوں پٹیوں کی اجرت چھ روپے اور آٹو کے کرایے کے سلسلے میں چار روپے، اس طرح سے جملہ دس روپے دیے، اور ان کا بار بار شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے رکشا منگوایا، اور ہم رکشا میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گئے، اس لیے کہ پیر میں تکلیف زیادہ زیادہ تھی، اور ہم کام سے باہر جانے کے قابل نہ تھے۔ دو مہینے تک پٹی کا سلسلہ جاری رہا، اس عرصے میں، ہم رکشا میں بیٹھ کر اپنے کام سے باہر جایا آیا کرتے تھے۔ جراح صاحب کی بات چیت اور ان کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا لحاظ کرتے ہم نے انہیں "ماسٹر جراح" کا لقب دیا ہے، جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ جراح صاحب غالباً (۷۰ برس) کے لگ بھگ ہیں۔ چہرے پر داڑھی ہے، اور وہ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں ہی خوبیوں سے متصف ہیں، خود اپنی ذات میں حسن اخلاق کا درجہ ہے ہر ایک کا دل موہ لیا ہے! اصل ہے کہ [illegible] معلوم نہ ہو [illegible] کو بچانے کے بجائے اللہ میاں کی دوا اور [illegible] دو دن بیمار

[illegible] کی شکل میں نازل ہوئی تھی۔ پہلی بار [illegible] HEART ATTACK [illegible]

نے ہمیں اٹھایا اور لفٹ کے ذریعے نیچے لے گئے، ٹیکسی منگوائی اور ہمیں بٹھایا دوا خانے لے گئے۔ وہاں ڈاکٹروں نے ہمیں انجکشن دیا، اور اسی وقت ہمارا کارڈیوگرام لیا گیا۔ کارڈیوگرام دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں حضرات سے کہا، دل پر حملہ بہت سخت تھا، یہ بچ بھی کیسے سکے؟ مریض کو آپ لوگ اسی وقت دوا خانے میں شریک کرا دیجیے، میں چٹھی لکھے دیتا ہوں، چنانچہ ڈاکٹر نے INPATIENT کی چٹھی لکھ کر انہیں دیدی۔ ہم اسٹریچر پر لیٹے ہوئے تھے، ہمارے ساتھیوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو دوا خانے میں شریک ہو جانے کی ہدایت کی ہے، اور چٹھی لکھدی ہے، آپ اسی وقت شریک ہو جائیے۔ یہ سن کر ہم نے ان دونوں سے کہا کہ ہم دوا خانے میں ہرگز ہرگز نہیں رہ سکتے، ہمیں دوا خانے سے سخت نفرت ہے، اور یہاں کی بدبو سے ایک گھن سی آتی ہے، اگر مرنا ہی ٹھہرا تو ہم اپنے گھر ہی میں مریں گے، اس لیے اسی وقت آپ ہمیں ٹیکسی میں گھر پہنچا دیجیے، چنانچہ ڈاکٹر کو اطلاع دیے بغیر وہ لوگ اسٹریچر پر ہمیں ٹیکسی تک لے گئے اور پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم تینوں اپنے گھر کے لیے روانا ہو گئے۔

ہم نے کنجیاں ان کے حوالے کیں ان میں سے ایک صاحب نے تالا کھولا، اور پھر دونوں نے ہمیں اٹھایا، اور ہمارے پلنگ پر لے جا کر لٹا دیا۔ ہم نے کنجیاں ان میں سے ایک صاحب کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ سامنے کے کمرے میں صندوق ہے تفل کھولیے، اس میں نوٹ رکھے ہیں، ٹیکسی کا کرایا آپ کا میوزیم واپسی تک ادا کر دینا، اور کنگ کیمپ، افضل گنج سے آپ نے ڈاکٹر کی لکھی ہوئی جو دوائیں اپنے پیسے سے خریدی ہیں وہ پیسے بھی لے لیجیے، ان میں سے ایک صاحب باہر گئے اور ٹیکسی والے سے واپسی تک کا کرایا معلوم کر کے اس کو بیس یا بائیس روپے دیدیے اور فارمیسی کی خرید کی بابت دس یا بارہ روپے لے لیے۔ انہوں نے واپسی کی اجازت چاہی تو ہم نے ان دونوں سے کہا، آپ دونوں نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے، ہم دل کی گہرائیوں سے آپ دونوں کے شکر گزار اور آپ کے احسانات کا بار بار شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم سے ہاتھ ملا کے جیسے وہ دونوں حضرات ٹیکسی میں واپس چلے گئے۔ ہمارے دل پر اس قسم کا دوسرا حملہ عدالت دیوانی کے کمرے میں ہوا تھا۔ اس کی تفصیل سن کر پہل تم گھبرا جاؤ گے، اس لیے ہم تفصیل سے گریز کرتے ہیں، مختصر یہ کہ تدبیر پر تدبیر کی، اور گھر پہ رہ کر ڈاکٹروں سے علاج کروایا، اور فرشتۂ اجل کو دھوکا دے کر بچ گئے!

کرمہ عقل و فہم والے کاول، یہ رہی تمہارے "آ رہے چلے" "السلام علیکم" کی تشریح، جس کی وضاحت میں ہم نے کئی صفحے کالے کر ڈالے، اب تمہارے لا یعنی اور بے معنی جملے کے دوسرے ٹکڑے "رحمت اللہ و برکاتہ" کی بھی وضاحت سن لیجیے۔

کاول، تمہاری طرح مذہبی ہم بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ اللہ، انسان پر [illegible] بھیجتا نہیں نازل کرتا ہے، بلکہ کرتا ضرور ہے، مگر کس پر — گدھوں، [illegible] [illegible] اپنے نا [illegible] جن کو شک سے قلم تک پکڑنا نہیں آتا۔ اللہ [illegible] [illegible] بنا دیا ہے، اگر کسی کی فاقہ کشی نہیں ہے تو وہ گدھے [illegible] اور [illegible] "RITE" [illegible] "تحریر" [illegible] جیسے بڑے ہوٹلوں میں روزانہ لنچ اور ڈنر کھاتے ہیں [illegible] کی طرح بہاتے ہیں۔ اس کے برعکس اللہ ہم جیسے [illegible] اس قابل نہیں بنا تا کہ ہم کار خرید سکیں یا ٹیکسی اور آٹو [illegible] [illegible] کے باعث ہم ہر مہینا دو سو روپے کا [illegible] [illegible]

کا ل، نہ صرف سواری کی حد تک، بلکہ خدا نے اپنی گوناگوں اور بے شمار نعمتوں کے باعث ہی اچھی
زا، روغن کھا ؤں، اور ادران نعمت سے بھی محروم کر رکھا ہے - کال، اب قدرتی ہی انصاف سے کہیں
. آیا خدا کا یہ جبر و تشدد ہم پر بجا ہے، اور کیا خدا ہمیں اس قابل نہیں بنا سکتا تھا کہ ہم اچھی غذائیں
ماکر - B - T - یا دق جیسے موذی اور لعنتی مرض سے نجات حاصل کر سکیں! مگر عقل کا ل، تہذیب
ہ کے صرف ایک جملے کی تشریح اور وضاحت میں ہم نے بیسوں صفحے کالے کر ڈالے ہیں، اور
، ہم تمہارے پورے خط کے ہر ہر جملے کی اس طرح تشریح اور وضاحت کریں تو نہ معلوم کتنے سو
ے درکار ہوں، اس لیے کاغذ کا کوٹا ختم اور تمہارے پہنچے جملے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"
ے جواب میں اپنی ترمیم کے ساتھ اقبال کا یہ مشہور شعر نقل کیے دیتے ہیں آ

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو بے چارے ایڈیٹروں پر

چوتھے نمبر پر راجا گرو داس کا خط ہے - راجا گرو داس نہایت ہی قابل آدمی، اور
مانیا یونیورسٹی کے - بی - اے، ال ال - بی ہیں - گرو داس کا تعلق حیدر آباد کے ایک کایستھ گھرانے
سے ہے، اور ان کے نانا جاگیردار اور منصب دار بھی تھے، اسی لیے گرو داس نے ملازمت یا وکالت اور
وکالت کو اپنا پیشہ بنایا، بلکہ ایک سوشل ورکر کی حیثیت سے ساری عمر گزار دی، اور اب اپنے بنگلے
شانتی کنج "میں بھگوان کی مالا جپتے بیٹھے رہتے ہیں - گرو داس سے ہمارے تقریباً ۴۵-۴۶
کا تعلقات ہیں، اور ہم دونوں نے سوشل ورکر کی حیثیت سے کام کیا ہے، اور عثمانیہ گریجویٹس
سوسائٹی اے سشن اور نمائش کمیٹی میں بھی ایک ساتھ کام کیا ہے - گرو داس اپنے زمانے یا عہد کے
بے حد خوش پوش انسان تھے، جن کا شمار حیدر آباد کی "کریم آف دی سوسائٹی" میں ہوتا تھا -
گرو داس کا نہ یہ خط ہے، اور نہ کتاب کے بارے میں کوئی لکھا ہے، جیسا کہ خدا انہوں نے
لکھا ہے، یہ تحریر کتاب پہنچنے کی رسید ہے، اس چٹھی کے ذریعے انہوں نے اپنے خادم کے ہاتھ پانچ روپے
کتاب کی قیمت بابت بھجوائے تھے، مگر اس وقت ہم نے شکریے کے ساتھ واپس کر دیے، اور خادم سے
کہہ دیا کہ راجا صاحب کو آداب کہنا، اور ساتھ ہی یہ بھی کہنا کہ کتاب آپ کو بطور تحفہ بھجوائی تھی، ہم نے
کسی سے بھی قیمت نہیں لی ہے، اس لیے آپ سے بھی قیمت لینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا - خادم
پیسے لے کر واپس چلا گیا، اور دو چار روز بعد ہم نے پوسٹ کے ذریعے ان کا شکریہ ادا کیا، اور
بیت نہ لینے کے سارے اسباب و علل گنا دیے -

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، راجا گرو داس کا یہ خط ہی ہے، اور نہ کتاب پر رائے ہے، پھر ہم نے
اس تحریر کو یہاں کیوں جگہ دی ہے، اس لیے جگہ دی کہ انہوں نے تحریر یا جو کچھ لکھا ہے، جو [illegible]
ہے، یعنی یہ لکھا ہے کہ -

"مکرم زاہد آداب، تسلیم! جناب کا رسالہ ایک پارٹ "شہزادی کا رومان" موصول
ہوا - اس عمدہ طریقے سے پیک کیا گیا تھا، مجھے ہندستان سے باہر کسی ملک سے بھیجا گیا
ہے - آپ کی سلیقہ مندی اور محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا! [illegible]
ہے - ہم نے یہ دعا کیا تھا کہ ناول "شہزادی کا رومان" [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] لیکن حقیقی قیمت [illegible]

[illegible] کیا کہ یہ اس لیے ہم نے یہ طے کیا کہ قیمت ایک کتاب بھی نہ بھیجی جائے، چنانچہ اس پر پورا پورا عمل ہو رہا ہے، اور آج تک جتنا کا پیاں فری یا مفت روانا کی جا چکی ہیں، اور جو باقی ہیں، وہ بھی بلا قیمت روانا کردی جائینگی ۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ صحت ہو جانے کے بعد راجا گرودواس داس جی جناب اور بے نظیر اور تاریخی ناول کو پڑھنے کی زحمت گوارا فرمائینگے، اور اپنی قیمتی رائے جلد سے جلد روانا فرمائینگے، تا کہ " ہندستانی ادب " کے کسی بھی آیندہ نمبر میں شایع کی جا سکے !

مرزا سرفراز علی، بی ۔ اے (آنرز) ایچ ۔ ڈپ ایڈ (ڈبلن) سابق نائب ناظم تعلیمات حکومت آندھرا پردیش کی قابلیت خود ان کی عالا ترین ڈگریوں سے ظاہر ہے ۔ یہ اپنے حسن کارکردگی کی وجہ سے سارے محکمۂ تعلیمات اور خصوصی اپنے ماتحتین میں بے حد مقبول اور ہر دلعزیز رہے ۔ ہم نے اپنے تیسرے خط میں زاہد علی کامل کا ذکر کیا ہے، کامل سے ہمارے تعلقات ۱۹۲۶ء سے رہے ہیں، جبکہ ہم نے عثمانیہ یونیورسٹی کی پہلی جنرل اسٹرائیک لیڈ کی تھی، مگر مرزا جی سے ہمارے تعلقات [illegible] سے ہیں جبکہ ہم جنیت صدر انجمن اتحاد، طلباے جامعۂ عثمانیہ، (۳۰) طلبا کو شمالی ہندستان کے تعلیمی دورے پر لے گئے تھے، ان (۳۰) میں سرفراز علی بھی تھے ۔ اس کے دو سال بعد ۱۹۲۸ء میں کامل کی طرح سرفراز نے بھی اسٹرائیک میں ہمارا ساتھ دیا تو ہم تینوں کے تعلقات اور بھی بڑھ گئے، اور آج تک برابر قایم ہیں، اور آخری سانس تک بھی قایم رہینگے !

جس طرح کامل اور سرفراز دونوں ہی ہندستانی زبان اور فارسی کے گریجویٹ ہیں، اسی طرح سرفراز نے ایک نرالی ادبیانا شان کے ساتھ ایک اچھوتے شاعرانا انداز میں " شہزادی کا رومان " کا تعارف، ستایش اور مدح سرائی میں قلم کا توڑ دیا ہے ۔ ہم سرفراز کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تعارف کی جادو گری اور ساحرانا رائے پڑھتے وقت جنگل ہی کھوے گئے تھے، اور ہمیں سوچ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا اس سے بہتر اور کوئی دوسری رائے بھی ہو سکتی ہے ؟ سرفراز حیدرآباد کے مشہور شاعر ہیں، اس لیے انہوں نے اپنی رائے بالکل ہی نرالے انداز میں لکھی ہے، جس کو پڑھ کر ہر شخص مسحور سا ہو جاتا ہے ۔ انہوں نے ناول کی مدح و ستایش میں جو تعریفی گیت گائے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا جی نے ناول " شہزادی کا رومان " کا گہرا اور غائر مطالعا کیا تھا، اس لیے انہوں نے ناول کے [illegible] حسن اور خوبیوں کے جواہر پارے، اپنی قیمتی اور گراں قدر رائے کی شکل میں [illegible] بکھیر دیے ہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ناول " شہزادی کا رومان " کے بارے میں اتنی دلچسپ رنگین، ادبیانا اور شاعرانا رائے آیندہ شاید و باید ہی ممکن ہو !

[illegible] شیخ محمد کا ہے ۔ شیخ محمد بی ۔ اے (عثمانیہ) اسسٹنٹ الیکشن آفیسر [illegible] آف انڈیا ہیں ۔ ان کا دفتر مبارک منزل [illegible] روڈ پر واقع ہے ۔ کامل اور سرفراز کی طرح شیخ جی سے بھی ہمارے تعلقات اچھے ہیں، اور قدیمانا ہیں ۔ کامل تو اپنے گھر سے باہر نہیں نکلتے [illegible] روزانا شیخ صاحب کے آفس پر حاضری دیا کرتے ہیں ۔ ہم دونوں [illegible] " خطرات صحافت " اپنی قرضی اداروں سے [illegible]

[illegible]

ہم اور سرفراز دونوں ہی پان نہیں کھاتے، اس لیے ہم دونوں کی پان کی حد تک شیخ صاحب کو کوئی زیر باری نہیں ہے۔ سرفراز چرٹ پینے کے عادی ہیں، اور چرچل کی طرح CHAIN SMOKER ہیں، اس لیے ایک سلگا ہوا چرچیلین چرٹ ان کے ہات میں رہتا ہے، اور کش پر کش لے کر ہر وقت چرٹ پر مزے اڑاتے رہتے ہیں۔

اپنی دفتری اور گھریلو گوناگوں معروفیات کے باوجود شیخ صاحب نے ناول "شہزادی کہلوانی" پڑھنے کے لیے وقت نکال ہی لیا، چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ "ترجمہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ناول کا پلاٹ ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں بناوٹ نہیں معلوم ہوتی، اور شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔"

آگے چل کر شیخ صاحب نے بلکل ہی ادیبانا انداز میں یوں مدح سرائی کی ہے "یہ اداکاری اور محاورہ بندی ترجمے میں اب بہت کم دیکھنے میں آتی ہے، خاص طور پر دور آصفیا کی تہذیبی زندگی کو انگریز مصنف نے جس طرح سے مسخ کرنے کی کوشش کی تھی، اس کو بڑی خوبی سے ناول کے آخر میں بتادیا ہے" شیخ صاحب نے سو فیصد طریقے پر سچ کہا ہے کہ فرنانڈز نے اپنے ناول میں حیدرآبادی تہذیب کو بلکل ہی مسخ اور ملیا میٹ کردیا تھا، مگر ہم نے اس کا ازالہ کیا ہے، اور یہی ہمارا زبردست کارنامہ ہے، جس پر ہمیں فخر حاصل ہے!

اس کے بعد شیخ محمد نے ہماری جدت طبع، یعنی [illegible] کی تعریف اور مدح وستائش اپنے ان الفاظ اور قابل قدر جواہر پاروں میں کی ہے کہ ــ "مترجم نے ناول کے کرداروں کے تعارف کے ذریعے ناول کو اور بھی مفید بنا دیا ہے۔ یہ جدت نہایت مفید اور قابل تقلید ہے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے تاریخی مرحوم کی تفصیلات موجودہ عہد کے پڑھنے والوں کے لیے دل چسپی کا موجب ہوگئی ہیں۔ اس تفصیل سے حیدرآباد کی تہذیبی تاریخ کا ایک یادگار باب بھی نئی نسل کے لیے محفوظ ہوگیا ہے۔"

آخر میں قابل احترام شیخ محمد نے ناول میں کتابت کی جن غلطیوں کو گنوایا ہے، ہم ان غلطیوں کو تسلیم کرتے ہیں، ان کے توجہ دلانے کے بعد ہم نے صفحہ بہ صفحہ اور سطر بہ سطر ان غلطیوں کو دیکھا، وہ غلطیاں موجود ہیں جس کا ہمیں افسوس ہے۔ آخر میں شیخ صاحب کا یہ ریمارک کہ "یہ جملہ کچھ ان کھٹکتا ہے" رحیم النسا اس کو بھی بہر کر اس طرح سے دیکھ رہی تھی کہ گویا زچہ اس کو کچا ہی کھا جائے گی" مترجم نے جہاں اپنی زبان وبیان میں تہذیبی قدروں کا لحاظ رکھا ہے، وہاں شہزادی کے جذبات کا ایسے الفاظ میں ظاہر کرنا شایان شان نہیں ہوسکتا۔"

شیخ صاحب، آپ کچھ بھول سی ہوگئی ہے، اور آپ کا یہ بے معنی اور بے جا اعتراض نظر ثانی کا محتاج ہے۔ شہزادی ہو یا بادشاہ زادی، جی۔ ام۔ خان نے رحیم النسا کے گھورتے ہوئے جذبات کے متعلق سے "کچا ہی کھا جانا" جو محاورہ استعمال کیا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ کھٹکتا ہی ہو، آپ کو اور سارے لوگوں کو ہمارا یہ کھلا چیلنج ہے کہ وہ اس محاورے کو مرقع محل کے اعتبار سے غلط ثابت کردیں تو ہم اپنی ہار مان لینگے!

اس سلسلے کا آخری خط محمد عتیق، ایم۔ اے۔ ایم۔ اے (عثمانیہ) کا ہے۔ عتیق سے ہمارے گہرے تعلقات ہیں۔ [illegible] کی نہایت [illegible] [illegible] اور عربی کے [illegible] [illegible] [illegible] الفرسٹین [illegible] PHOTOGRAPHER [illegible] اور شیخ صاحب کے [illegible] ناول کے بارے میں انہوں نے بھی اچھی رائے ظاہر کی ہے، جو ان کے خط [illegible] کو آپ بھی پڑھیے!

انہوں نے [illegible] اور مطالعے کے بعد [illegible] [illegible] کرتے [illegible]

رائیں

خط ۱

3-5-1976

سید رحیم الدین

سید رحیم الدین، بی - اے، ال ال - بی (عثمانیہ)
ایڈوکیٹ - 5-3-876
کوچہ دیانت اللہ - قریب معظم جاہی مارکٹ
حیدرآباد ۱

جناب خان صاحب!

آداب عرض ہے، آپ کی یاد فرمائی کا شکریہ!

زمانۂ طالب علمی میں ناول بینی میرا محبوب مشغلہ تھا، اور ہر روز کوئی نہ کوئی نئی ناول زیر مطالعہ رہتی - جب تعلیم ختم ہوئی اور پیشۂ وکالت میں داخل ہوا تو یہ مشغلہ بھی ختم ہوگیا - اکثر ناول فرضی قصے اور من گھڑت کہانیوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، اور ناول نگار اپنے ناول کے کردار کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے اور ناول میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے اپنے ناول کے ہیرو کو اس قدر بلند پیش کرتا ہے، اور اس قدر مبالغے سے کام لیتا ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن ناول کے ختم ہونے پر غور کرنے لگتا ہے کہ واقعی ناول کا یہ ہیرو انسان تھا یا کوئی فوق البشر؟ ایسی فرضی اور غیر فطری ناولوں کی وجہ سے مجھے ناولوں کے مطالعے سے سخت نفرت پیدا ہوگئی، اور اب میں ناول کو ہاتھ بھی لگانے سے کتراتا ہوں، اگر کوئی دوست ناول کی تعریف کرتے ہوئے اپنی کتاب دے بھی دیا تو دس پندرہ منٹ کے بعد ہی شکریے کے ساتھ واپس کر دیا - اس ذہنیت کے حامل شخص کے پاس آپ کا ناول "شہزادی کا رومان" ٹھیک ساڑھے دس بجے پوسٹ مین نے لاکر دیا - صفحۂ اول پر لفظ ناول دیکھتے ہی دماغ میں وہی پرانے خیالات کا سلسلہ شروع ہوا - ٹائیٹل کو دیکھا - کاغذ اچھا اور عمدہ ہے تصویر بھی جاذب نظر ہے - غور سے دیکھتا رہا - موسم گرما کی تعطیلات کی وجہ سے فرصت بھی تھی پنکھا چل رہا تھا، حسب عادت اس ناول کو بھی آٹھ - دس منٹ میں ختم کرنے کی نیت سے پڑھنا شروع کیا - ناول کے آغاز ہی میں نواب میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم اور سر آسمان جاہ مرحوم کے نام نظر آئے - سابقہ ریاست حیدرآباد کے کون ایسے لوگ ہیں جو ان ناموں سے واقف نہیں - دلچسپی ہوئی، کچھ دیر پڑھتا رہا - پڑھتا رہا - پڑھتا رہا ناول ختم ہوئی، گھڑی کی طرف دیکھا تو گھڑی میں سوا پانچ بج رہے تھے -

حیدرآباد کے نوابوں، امیروں اور امراء کی ڈیوڑھیوں میں ماماؤں اور خانہ [illegible] کافی دخل رہتا تھا - ماما جمیلا اور ماما دل آرام جو فرضی [illegible] اور خان ساماں [illegible] خان وغیرہ سے حیدرآباد میں کون واقف نہیں؟ یہ وہی مامائیں اور خان ساماں [illegible] لڑکیوں اور [illegible] میں کافی دخل رہا ہے - اور یہی لوگ بڑی بڑی جاگیرات کی مالک [illegible] [illegible] میں سازشیں کرتے تھے، اور بھولے بھالے شہزادوں اور شہزادیوں کو

زیب اور حیل سے پریشان کرتے تھے۔ ایسی ہی قسم کی ماماؤں اور خان ساماؤں کی سازش کا شکار اس ناول کی ہیروئین معصوم رحیم النساء بھی بن گئی۔ ناول شروع سے آخر تک انتہائی دلچسپ اور فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ ناول کے پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ ذہنی ناول تھی یا حقیقی تاریخی واقعہ تھا۔ اصل واقعات کا علم تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

زبان میں بلا کی روانی اور شیرینی ہے، محاوروں کے برجستہ استعمال نے اس پر چار چاند لگا دیے ہیں، اور یہ قطعاً محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ایک انگریزی کا ترجمہ ہے۔ حیدرآباد کی قدیم تہذیب و تمدن پر بھی اس ناول میں کافی روشنی ڈالی گئی ہے، بہر حال اس ناول کا مطالعہ سنجیدہ لوگوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا فقط

سید رحیم الدین

خط ۲

8 - 5 - 1976

ایشور سنگ

ایشور سنگ، بی۔ اے (عثمانیہ)
سابق اسکاٹ ماسٹر، حکومت
آندھرا پردیش - 5 - 3 - 76
گوشہ محل - پی - او بیگم بازار حیدرآباد ۱۲

جناب خان صاحب!

آپ کا بیحد شکریہ کہ آپ نے "شہزادی کا رومان" جو آپ کا ترجمہ کیا ہوا ہے بجوا کر مجھے بیحد ممنون و مشکور فرمایا۔ ناول اچھا ہے، ترجمہ دلچسپ ہے اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو ایک ناول میں ہونی چاہئیں پیش کیے گئے۔ جو کمیاں تبصرے کے لیے بجوائی گئی ہیں ان میں تو آپ نے پہلے سے سب طرح پیش بندی کردی ہے۔ حیدرآباد کے پرانے حرم خصوصاً لنگر کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ میں بھی چونکہ ایک قدیم حیدرآبادی آصف جاہی نوبی عہدے دار کی اولاد سے ہوں اور سب چیزوں سے واقف ہوتے ہوئے آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو چیزیں پیش کی گئی ہیں اس دور کے لوگوں کے لیے ایک عجیب سی چیز ہے۔ خصوصاً نواب میر محبوب علی خان بہادر کا زنانہ دوروں کے سلسلے میں جو چیزیں متعدد بار دہرائی گئی ہیں وہ میرے خیال سے طویل ہو گئی ہیں۔ اس قصے کی تاریخ اگر پیش کی جاتی تو مناسب ہوتا۔ مگر آپ کو چھان بین زیادہ کرنی پڑتی۔ نیز حسن کی چھپر کے مکان کا پتا بھی ملجاتا تو اور اس قصے میں چار چاند لگ جاتے۔ پہلے پلنگ کا جو آپ نے ذکر کیا ہے اس کا بھی نسخہ دیا جاتا تو کیا کہنے۔

بہرحال میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے اور ساتھ ساتھ بجوانے کا شکریہ۔

آج کل میں مکان میں خرابی مزاج کی وجہ سے پریشان ہوں۔ اگر آپ کسی دن شام میں مقام تعین فرمائیں تو خود مبارکباد پیش کروں گا۔ وقت اور تاریخ سے مطلع فرمائیں۔

آپ کا

ایشور سنگھ (دستخط)

خط ۳۰ ۱۹ / مئی ۱۹۷۶ء

زاہد علی کامل

زاہد علی کامل، بی۔ اے،
ال ال۔ بی۔ (عثمانیہ)
ایڈوکیٹ - ایڈیٹ -
حیدرآباد ۔۔۔

محبی خان صاحب!

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہٗ ۔

آپ نے تبصرے کی ایسے شخص سے (معاف کرنا میں اپنا ذکر کرتا ہوں) خواہش کی ہے جس نے مدرسے میں شرر، کرشن چندر اور نذیر احمد کی ناولیں پڑھی تھیں؟ اور اس کے بعد ہندستانی کا شاید ہی کوئی ناول پڑھی ہو - مگر انگریزی ناول P.G. Wodehouse اور ARTHUR BILEY کے پڑھا ہوں - آپ کی ناول بھی اصل میں انگریزی ناول ہی تو تھی جسے آپ نے "بقول خود" ہندستانی میں منتقل کرتے کرتے اسے سولائی جامہ پہنا دیا، اور بعض مقامات کو جسے انگریز مصنف نے غیر شعوری طور پر اپنی ذہنیت اور ماحول کے اثر میں لکھے تھے، آپ نے خوبصورتی سے اسے مرحوم حیدرآباد کی تہذیب کے مطابق کر دیا - یہ ایمانداری سے مترجم کا کام تو نہیں تھا، لیکن اگر آپ ایسا نہ کرتے تو حیدرآباد کی تہذیب و روایات مسلمان لڑکیوں کی فطری شرم و حیا، عفت و خود داری کا ناس ہو گیا ہوتا - اور شاید آپ کے ترجمے کو ہندستانی کی دوسری ناولوں کی طرح پڑھ کر پھینک دیا ہوتا - آپ کے اس احساس نے ناول کو حقیقت اور تاریخ بنا دیا، اور معیاری انگریزی ناولوں کی طرح یہ کوئی فرضی قصہ نہیں رہتا -

زبان کی سلاست اور روانی، اس زمانے کی جامعہ عثمانیہ کے قابل اساتذہ مولوی عبدالحق، وحید الدین سلیم اور ڈاکٹر زور کی تربیت اور آپ کی انتھک محنت و مشق کی آئینہ دار ہے میں بھی آپ ہی کے زمانے کا ہندستانی فارسی کا طالب علم رہ چکا ہوں، مگر اب ہندستانی ادب سے کوئی واسطہ باقی نہیں رہا، اس لیے ترجمے کی ادبی خوبیاں اور خامیاں گنانے کے موقف میں نہیں ہوں، پھر بھی اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ناول شروع سے آخر تک دلچسپ ہے، اور محسوس نہیں ہوتا کہ ترجمہ ہے -

کتابت اور طباعت ہندستانی کی عام کتابوں سے بدرجہا بہتر ہے - ایک نایاب کتاب کو ہندستانی میں منتقل کر کے آپ نے ہندستانی ادب کی قابل قدر خدمت کی ہے۔ مگر ڈرتا ہوں کہ آپ کی دوسری خدمات کی طرح زمانہ کہیں اس کو بھی نظر انداز نہ کر دے -

اللہ کرے زور قلم اور بہت تصنیف و خدمت ادب زیادہ -

مخلص - میر زاہد علی کامل

خط ۳۱ 14-5-1976

راجا گرو داس

راجا گرو داس، بی۔ اے،
ال ال۔ بی (عثمانیہ)
"درشانت کنج" 16-11-20
سلیم نگر کالونی ملک پیٹ، حیدرآباد ۳۶ -

محترم جناب خان صاحب! سلام - خان صاحب!

[illegible] صفحات کا رسالہ بک پاسٹ "شہزادی کا رومان" دو ہفتہ قبل موصول ہوا [illegible]

اس عمدا طریقے سے پیاک کیا گیا تھا، مجھے گمان ہوا ہندستان سے باہر کسی مقام سے بک پوسٹ آیا ہے - آپ کی سلیقہ مندی اور محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا - میں دو ہفتے سے دوران سر اور چکر میں مبتلا ہو کر بستر پر ہوں - ڈاکٹر پڑھنے لکھنے آنکھوں پر بار لینے سے منع کیا ہے - جونہی اسکی اجازت ہوگی میں پڑھ کر اپنی حقیر رائے ارسال کروں گا -

اس کی قیمت آپ نے صرف =/5 مقرر زبانی ہے جو اسکی نفاست اور بہترین طباعت کا بدل نہیں ہو سکتا - بہر حال گزران رہا ہوں "گر قبول افتد زہے عز و شرف"

باوجود خرابی صحت آپ کی دلچسپی اور محنت کا معترف ہوں - زیادہ والسلام!

خیر اندیش راجا گرو داس

خط ۵

10 - 6 - 1976

مرزا سرفراز علی

مرزا سرفراز علی، بی - اے (آنرز)
ایچ - ڈپ ایڈ (ڈبلن)
موظف نایب ناظم تعلیمات،
حکومت آندھرا پردیش
15 - 5 - 4/A.
ماصاب تالاب - حیدر آباد ۲۸

جی - آر ناالد فرنانڈز "رومانس آف اے زنانا" کے مصنف ہیں، یہ ناول انگریزی زبان میں، سر آسمان جاہ کی صاحبزادی رحیم النسا کے افضل خان نامی، یوسف طلعت اور عالی خاندان نوجوان سے بے اندازہ تعلق خاطر، فدائیت اور جیتی جاگتی الفت کا، قد آور، اور ہو بہو مرقع ہے - آرنالڈ فرنانڈر کا، اس خاندان سے نہایت قریبی اور رات دن کا ربط اور بالخصوص سر آسمان جاہ سے، دن رات کا میل ملاپ تھا -

شاہزادی کے عشق صادق کی داستان، شروع سے آخر تک دلچسپ، اور اثر انگیز تصویر حیات ہے - اس میں کہیں کوئی وکالت نہیں، جملا بہت سے شرمندگی کا ایک شوشا بھی نہیں پایا جاتا - حالانکہ کردار کی کہیں شمالت نہیں ہوتی - ہم نے یورپ کی ملکاوں اور شاہزادیوں کے عشق کی کہانیاں بھی پڑھی ہیں، جن سے حیا اور انسانیت کی گردن جھک جاتی ہے - اس ناول کو ایسی شوخ نظر سوز، رنگا رنگی سے مبرا پایا، یہاں دو اور دو، چار ہیں - نہایت پاکیزہ، دلسوز اور جاں افزا - فطرت کی حقیقتوں، اور دل کی آوازوں سے عطر انگیز -

آصفی درباری، تہذیبی، تمدنی، علمی اور بہبودیٔ انسان کی دربار ریاں، خاص و عام کا زبان زد ہیں - عمائدین سلطنت، دوسری ریاستوں کے راجاوں اور تاجداروں کے ہم پیالے، مغلیں فخر انسانیت ہوتیں، داد و دہش، حاتمی انداز پیدا رہتی، دعوتیں ضرب المثل بن جاتی کو دلی اور لکھنو کا انداز کی ٹھاٹ اور تہذیب ع -

"ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

کا ورد رکھتی تھی -

یہ ناول ان باتوں کا ایک سچا اور قریبی نقشہ ہے - اسے پڑھ کر ع

"اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی"

جیسی بات زبان پر آجاتی ہے -

پلاٹ مکمل اور بے عیب، ترتیب باسلیقا اور تہذیب لسان پر منطبق ہے -

یہی حرف بہ حرف اور لفظاً بہ لفظاً ترجمے کی خامی (از ذہن) اصطلاح کا قایل نہیں - بے جان، چہرہ، بوم کی مورت ہوتا ہے - پارسی تھیٹریکل تمثیل بن جاتا ہے - دوسری زبان کے مزاج سے میل نہیں کھاتا -

جی - ایم - خان صاحب کا ترجما سونے پر سہاگا معلوم ہوا - ناول شروع کرکے ادھورا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - لفظ، محاورے، استعارے اور اشارے، جاندار اور ذہن افروز ہیں - چالیس سال سے زیادا، ہندستانی زبان کی بے لاگ، بے لوث اور بے ریا، خدمت نے اس زبان کو ان کا اوڑنا بچھونا بنادیا ہے - حیدرآباد اور سلطنت آصفی سے والہانا لگاؤ ان کی رگ و پے کا سند لیا ہے، اور ان ہی امور اور زبان پر قدرت نے اس ترجمے کو مرصع اور مصفا ہی نہیں اصل سے برتر اور بہتر بنا دیا ہے - یہ ترجما، ہندستانی ناول اور دکن کی تہذیبی تاریخ میں قدر افزا، اضافا ہے -

وقت کی قلت، زندگی کے جھمیلے، اور عصر حاضر کے تھیٹرے، ترچھے، ترنگوں کے باعث ناول، افسانوں کے ڈھانچے میں سکڑ آئے ہیں، لیکن "شہزادی کا رومان" اس صورت حال کے باوجود، تقاضاے معروفیت، مشغولیت، اور محبوبیت رکھتا ہے -

باری تعالا، جی - ایم، خان صاحب کے قلم کی روانی کو، بعد جلوۂ نو رواں دواں رکھے، تاکے پڑھنے والے، اسی طرح ہمیشا شاد کام و فرحاں رہیں - ؎

ہوا، ہدایہ درد رومان ہے، جی - ایم، خان کا ناول
زبان اچھی، قلم اچھا، حشم اچھا قدم اچھا
بہرہ مند ہو سرفراز، ان کاوشوں سے ایسی خدمت سے
چراغ علم روشن اور ادب میں ہے بھرم اچھا

مرزا سرفراز علی

خط ۶

10 - 6 - 1976

شیخ محمد، بی - اے (عثمانیا)
اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر گورنمنٹ آف انڈیا -
انفرمیشن بیورو، مبارک منزل - عابد روڈ -
حیدرآباد ۱

شیخ محمد

شہزادی کا رومان

ناول کا چلن اب بہت کم ہوگیا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اچھے لکھنے والے بھی کم ہوگئے ہیں، اور پڑھنے والے بھی - جی - آر ناولڈ فرنانڈز کا انگریزی ناول "رومانس آف زنانا" کا ترجما [illegible] خوشی ہوئی - ناول کا پلاٹ ہی کچھ ایسا ہے کہ اس میں بناوٹ نہیں معلوم ہوتی اور [illegible] ختم کیے بغیر طبیعت سیر نہیں ہوتی -

جی - ایم - خان صاحب کا ترجما سونے پر سہاگا ہے - یہ روانی اور محاورا [illegible] [illegible]

ہندستانی اور خاص طور پر دور آصفیا کی تہذیبی زندگی کو انگریز مصنف نے جس طرح سمجھنے کی کوشش کی تھی، اس کو بڑی خوبی سے ناول کے آخر میں نبھایا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہے جس پر مترجم بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مترجم نے ناول کے کرداروں کے تعارف کے ذریعے اس تاریخی ناول کو اور بھی مفید بنا دیا ہے۔ یہ جدت نہایت مفید اور قابل تقلید ہے۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے تاریخی محرم کی تفصیلات موجودہ عہد کے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا موجب ہوگی۔ اس تفصیل سے حیدرآباد کی تہذیبی تاریخ کا ایک یادگار باب بھی نئی نسل کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔

ناول کتابت کی غلطیوں سے پاک نہیں ہے، جس کا مترجم نے خود اعتراف کیا ہے۔ تاہم بعض ایسی غلطیاں رہ گئی ہیں جو بہت زیادہ کھٹکتی ہیں مثلاً صفحہ ۹ سطر ۹ "ہم بلا مبالغہ خفی اچھل پڑے" غالباً "دو" سے "ہم" چھوٹ گیا ہے۔ صفحہ ۱۰ سطر ۲۶، ۱ - ۲ = ۴ اور سطر ۲۴ "یہ ایک آسمان جاہ سے ملنے کے ساتھ، مگر ہم چونکے لپٹتی۔" صفحہ ۱۱ سطر ۲۶ "اور انکے بیٹے ایڈورڈ" کی بجائے "بیٹے" ہونا چاہیے تھا۔ صفحہ ۳۰ سطر ۱۹ پہلا لفظ "جوانت" غالباً "جوانب" ہے۔ صفحہ ۲۲ آخری سطر "حیدرآباد میں ۸ رمحرم" غالباً ۵ رمحرم ہے۔

اسکے علاوہ صفحہ ۱۴۱ پر سطر ۲۹ میں یہ جملہ بھی گراں گزرتا ہے "رحیم النسا اس کو جی بھر کر اس طرح سے دیکھ رہی تھی کہ گویا نوجوان کو کچا ہی کھا جائے گی" مترجم نے جہاں اپنی زبان و بیان میں تہذیبی قدروں کا لحاظ رکھا ہے، وہاں شہزادی کے جذبات کو ایسے الفاظ میں ظاہر کرنا شایان شان نہیں ہو سکتا۔

مختصر یہ کہ ناول "شہزادی کا رومان" جناب جی - ام - خان صاحب کا ایک اعلیٰ ادبی کارنامہ ہے جو ہندستانی ادب میں ان کا نام زندہ رکھے گا۔

خطاء

10-6-1976

محمد عتیق

محمد عتیق، بی - ایس سی، ام - اے (عثمانیا)
گیلی گرامر، انفرمیشن بیورو، گورنمنٹ
آف انڈیا - مبارک منزل - عابد روڈ -
حیدرآباد

شہزادی کا رومان

شہزادی کا رومان اصل میں ایک انگریزی ناول "رومانس آف اے زنانا" جسکے مصنف جی۔ بنالڈ [illegible] ہیں۔ اس انگریزی ناول کا جناب جی - ام، خان صاحب نے اپنے سہل اور صحیح ہندستانی زبان میں ترجمے کے ذریعہ پرانے دور کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ جب ناول کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اس [illegible] کا زمانہ برابر سمجھا پڑتا ہے۔ جناب جی - ام، خان صاحب نے بھی ترجمہ کرنے میں کوئی کسر [illegible] مترجم نے اس ناول کو ہندستانی زبان میں ترجمہ آزادی [illegible]
[illegible]

...ہی نہ سکا کھینچا گیا ہے۔ کتابت تو بالکل ٹھیک ہے، مگر بعض جگہ املے میں غلطیاں ہیں۔ شاید یہ کاتب کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اس ناول میں پرانے زمانے میں حیدرآباد کا محرم کس طرح منایا جاتا تھا خاص کر لنگر کس طرح نکالا جاتا تھا، اسطرح سے پیش کیا جیسا وہ منظر ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ناول کے پڑھنے سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ الغرض جناب جی۔ ام۔ خان صاحب نے اس ناول کو پیش کرکے اپنی علمی قابلیت کا زمانے میں سکہ بٹھا دیا ہے۔ اس ادبی کارنامے کے باعث ان کا نام ہندستانی ادب میں ایک خاص مقام پیدا کرلیا ہے۔ دعا ہے کہ مترجم کی علمی صلاحیتوں میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو — فقط

محمد عتیق

فقط:- تاریخ نہیں ہے — : یہ کتاب پر رائے نہیں ہے بلکہ کتاب پہنچنے کی رسید ہے   پتا نہیں ہے —

اس لیے کہ اس میں غیر متعلق اجزا کو زبردستی ٹھونس ٹھانس ہے —

جی۔ ام۔ خان صاحب!

شہزادی کا رومان قسط وار آپ کے جریدے میں نظر سے گذرا اور اب عمدہ کاغذ اور بہتر چھپائی میں کتابی شکل میں دیکھ کر آپ کی بہتر سالہ عمر اور گرتی ہوئی صحت کے ساتھ زبان و ادب سے آپ کی لگن کا اندازہ کرکے جذبۂ تحسین سے آنکھیں نم ہوگئیں۔

خواجہ حسن نظامی کی روزمرہ کی دلی کی زبان اور خواجہ عبدالرؤف عشرت کی لکھنؤ کی زبان سے جو لطف اٹھا چکے ہیں۔ آپ کی حیدرآبادی بول چال اور لب و لہجے حسن و عشق کی داستان سرائی اور حیدرآبادی تہذیب کی جھلکیاں دیکھیں گے۔ ریاست کے امرا کے تکلفات، ملازمین کی فریب کاریاں، خلوص اور منافقت کی کارسازیاں اگلے چند برسوں میں وہ آنکھیں اب دیکھنے کو نہ ملیں گی جنہوں نے یہ سب دیکھا بھاتا ہے۔ مجھ میں اتنی بصیرت نہیں کہ فن ناول نگاری اور اس ناول کی فنی خوبیوں یا خامیوں پر اظہار رائے کرسکوں۔ ذرا سچ پڑ جاتا ہے جب یہ معلوم ہے کہ ناول کی جلدیں تقریباً سارے مستند جرائد اور تنقید نگاروں کو بھیجی جا چکی ہیں۔

میرے باغ میں طرح طرح کے پھول ہیں، سب کے رنگ اور خوشبو جدا جدا ہے۔ میرے کتب خانے میں موپاساں، گورکی، پریم چند، عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا سے لیکر قرۃ العین حیدر تک کے شاہکار موجود ہیں۔ انہیں پڑھ کر لطف اٹھا لینا اور بات ہے اور تنقید و تبصرہ ایک علحدہ فن ہے۔

ترقی پسند مصنفین کی ایک نشست میں عادل رشید نے اپنا افسانہ پڑھا۔ اسکے بعد حسب دستور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر تنقید ہونی چاہیے تھی۔ کیفی اعظمی نے کہا پہلے یہ تو فیصلا کرلیا جائے کہ جو کچھ ہمیں سنایا گیا ہے، اسے افسانہ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں؟

اسلیے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اگر کچھ عرض کروں تو یہ سوال اٹھے کہ یہ تنقید و تبصرے میں شامل بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ میں تو جی۔ ام۔ خان صاحب کے عزم پرستش کا مداح ہوں۔ ساری عمر انہیں ادب کا سودا رہا۔ انہوں نے اپنی ایک وضع خاص قایم کی اور عمر عزیز اسکی نذر کردی۔ مولوی عبدالحق بابائے اردو تھے۔ خان صاحب ان کے معنوی شاگرد اور عاشق ہندستانی ہیں۔ لطف یہ کہ خان صاحب کوچۂ عاشقی سے گذرے اور عزت سادات بھی محفوظ رہی۔

جنید احمد